تلاش

اللہ ماورا کا تعیّن

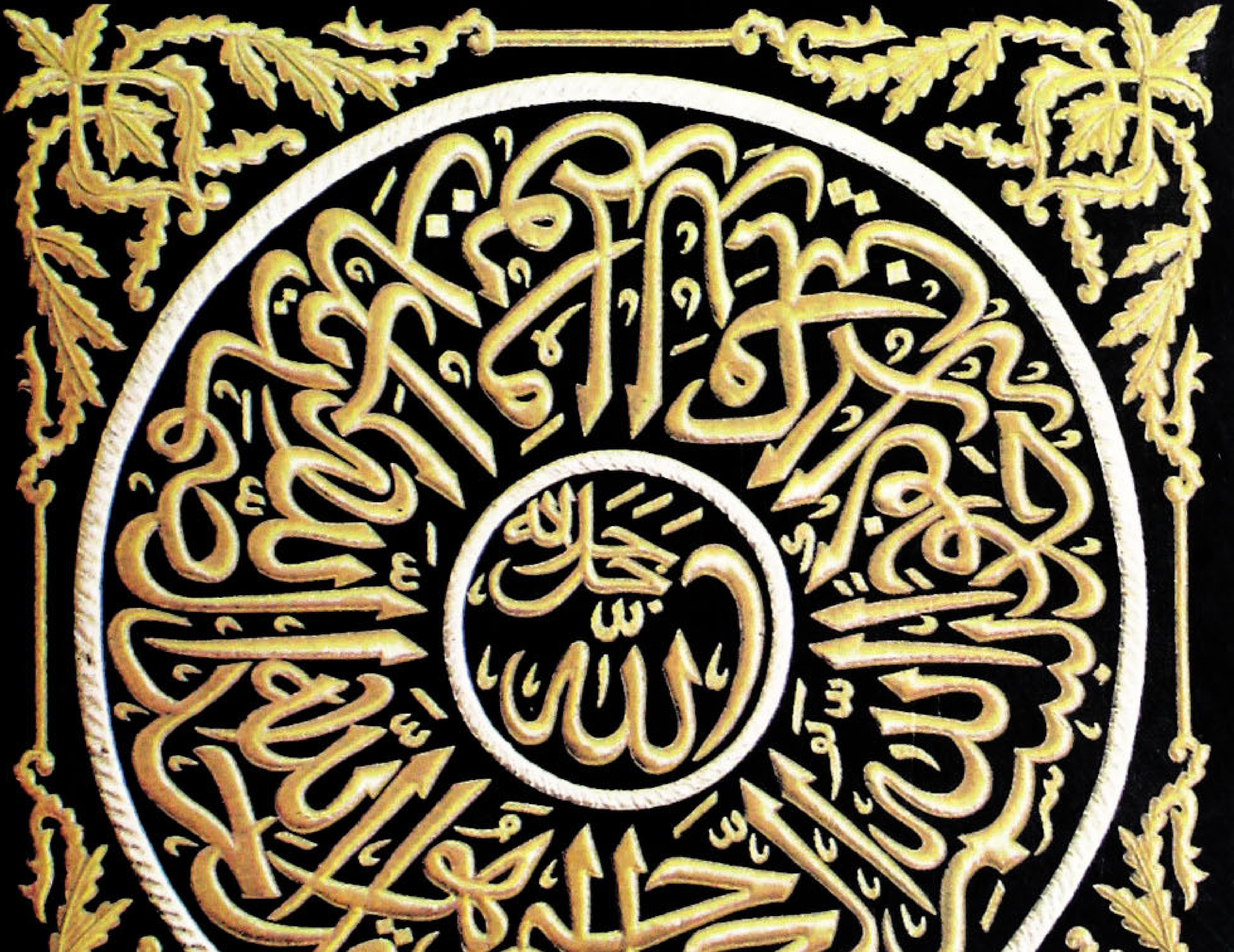

عکسی مفتی

Marfat.com

تلاش

اللہ: ماورا کا تعین

عکسی مفتی

ترجمہ
نجیبہ عارف

الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

Marfat.com

297.211 Uxi Mufti
Talaash: Allah Mawara ka Tayyan/
Uxi Mufti.- Lahore: Al-Faisal Nashran,
2012.
552p.

1. Allah Ta, ala I. Title.

ISBN 969-503-851-4

Copyright @ Uxi Mufti

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

110412

3 ک

مئی 2012ء

محمد فیصل نے

آر۔آر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت:-/1200 روپے

AI-FAISAL NASHRAN

Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore. Pakistan
Phone: 042-7230777 & 042-7231387
http: www.alfaisalpublishers.com
e.mail: alfaisalpublisher@yahoo.com

Marfat.com

DATA ENTERED

بسم اللہ

Begin

With

the name of Allah

Marfat.com

اعتراف وتشکر

ڈاکٹر فرتجوف کیپرا

پروفیسر ڈاکٹر فریڈ ایلن وولف

پروفیسر ڈاکٹر رالف ولبرہڈ

ڈاکٹر نجیبہ عارف

اور میری شریکِ حیات، حنا

Marfat.com

ع، غ دی ہکا صورت

ہک نقطے شور مچایا اے

سسی دا دل لیئن کارن

ہوت پنوں بن آیا اے

ہک نقطہ یار پڑھایا اے!

صوفی شاعر بلّھے شاہ

ایک طویل اور پر خطر راستے پر

میرے رہبر و رہنما،

قدرت اللہ شہاب کے نام!

Marfat.com

Marfat.com

ابّا کے نام!
ممتاز مفتی، جو باپ بھی تھے اور دوست بھی!

میں نے تمھیں پہچان لیا ہے!
تم ہی میری ماں ہو
تم ہی میرے باپ ہو
ایک بن آئے ہو
مجھے سمجھانے کے لیے
تمھارے پیار نے مجھے سب کچھ دیا ہے
سمجھایا ہے
جو کچھ بھی مجھے ملا ہے
تم ہی نے دیا ہے
جو کچھ بھی مجھے ملتا ہے
تم ہی دیتے ہو!
جو رنج میں نے تمھیں دیے ہیں
مجھے معاف کر دینا
جو تکلیف میرے ہاتھوں تمھیں پہنچی ہے
مجھے معاف کر دینا
بس میرا شکر قبول کر لینا،
یہی ہے میرے پاس دینے کے لیے!
تھینک یو ابا!
تھینک یو!

Marfat.com

Marfat.com

ترتیب

خدا کی تلاش	مصنف	7
عرضِ مترجم	ڈاکٹر نجیبہ عارف	11
تعارف	ماورا کا تعیّن	15
پہلا باب	اللہ کی سائنس: تشریح وتوضیح	21
دوسرا باب	خدا کا روایتی تصور بکھر چکا ہے	45
باب سوم	متوازی معکوس سچائی کی کہانی	55
باب چہارم	اصولیات	67
	حصہ دوم	
باب پنجم	اسمائے حسنیٰ	87
باب ششم	پہلا اصول	175
باب ہفتم	صفات درجہ وار ہوتی ہیں افعال مرحلہ وار	295
باب ہشتم	اسمائے حسنیٰ کی فلسفیانہ اور سائنسی معنویت	363
	حوالہ جات مصنفین وکتب	457

Marfat.com

Marfat.com

خدا کی تلاش

اللہ کا سائنسی اصول

خدا کی تلاش صدیوں سے سائنس اور فلسفے کی جستجو کا مرکز رہی ہے۔ یونانی فلاسفہ کی طرح بہت سے جدید فلسفی بھی ایک ایسے مرکزی نکتے کی تلاش میں زندگی بھر سرگرداں رہے ہیں جو انسانی زندگی اور حقیقتِ ازلی کا اسرار کھول دے۔ اس پارس کی کھوج میں رہنے والے فلسفیوں اور سائنس دانوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن جدید دور میں، خاص طور پر ولیم جیمز اور آئن سٹائن نے برسوں ایک ایسے جامع نظریے کی تلاش میں خلوت نشینی اختیار کیے رکھی جو زندگی کے بڑے اور اہم تضادات کا حل پیش کر سکے۔ اور بھی کئی ہم عصر سائنس دان اپنی تحقیق کے دوران اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حقیقت کو سمجھنے کا ایک کلی نظریہ (Theory of Everything) موجود ضرور ہے لیکن سائنس اور فلسفے پر بے حجاب نہیں ہوتا۔

سائنس کی اس مسلسل ناکامی کے ردعمل میں، آکسفورڈ یونی ورسٹی کے رچرڈ ڈاکن جیسے جدید اور قابل سائنس دان خدا کے وجود سے یکسر منکر ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر خدا موجود ہے تو اس مفروضے کو ایک سائنسی حقیقت کے طور پر ثابت کیا جانا چاہیے ورنہ خدا محض ایک ذہنی اختراع، ایک واہمے کے سوا کچھ اور نہیں۔ اسلامی فلسفی اور صوفیا ایک مدت سے اللہ کے وجود کو سائنسی نہیں تو فلسفیانہ سطح پر ہی سہی، مربوط طریقے سے بیان کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مثلاً جدید زمانے کے صوفی سلطان باہو نے ''الف'' کا ایسا نکتہ بیان کیا ہے جو انسانی فہم کی رسائی میں بھی ہے اور اس کی ادھوری بصیرت کی تکمیل بھی کر دیتا ہے۔ بلّھے شاہ بھی فرما گئے ہیں: اک نکتے وچ گل مکدی اے۔ مغربی فلسفی تو جدید عہد میں اس تلاش سے کم و بیش دستبردار ہو چکے ہیں؛ جدید سائنس نے اپنا رُخ پیسہ کمانے والی ٹیکنالوجی کی طرف پھیر لیا ہے اور فلسفہ، عملیت پسندانہ، تجرباتی اور منافع بخش

Marfat.com

علوم تک محدود ہو گیا ہے۔ خدا کی عالمانہ تلاش کی کوشش، صنعتی دور کی عجلت پسندی اور تیز رفتاری اور مابعد صنعتی دور کے شہری معاشروں کی گوناگوں مصروفیات میں پہلے تو نظر انداز ہوتی رہی اور پھر بالآخر جدید طرزِ زندگی کے روزمرہ معمولات کے دباؤ اور الجھنوں میں دفن ہو کر رہ گئی۔

لوک ورثہ، تہذیبی و ثقافتی مطالعات اور سماجی علوم کے ایک پاکستانی ماہر، عکسی مفتی نے ۱۹۶۹ میں چارلس یونی ورسٹی، پراگ میں طالب علمی کے زمانے میں، خدا کے سائنسی فرضیے (scientific hypothesis) کو پی ایچ ڈی کا موضوع بنایا تھا لیکن لگاتار اور وقفے وقفے سے کی گئی کوششوں کے باوجود اسے تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ چالیس سال کی مسلسل تلاش اور تحقیق کے بعد اب انھوں نے اللّٰہ کا ایک سائنسی فرضیہ تیار کر لیا ہے جو اس کتاب کی صورت میں زیرِ اشاعت ہے۔ اہلِ مشرق کا دیرینہ خیال ہے کہ اللّٰہ اتنی عظیم حقیقت ہے کہ سائنس اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ اللّٰہ سائنس سے کہیں بڑا ہے اور سائنس میں یہ دم خم نہیں کہ اللّٰہ تک رسائی حاصل کر سکے۔ عکسی مفتی نے اس کتاب میں اللّٰہ کو سائنس کی مدد سے ثابت کرنے کی جراَتِ بے باک کا مظاہرہ کیا ہے۔ عکسی مفتی کی یہ فکری دریافت، یعنی اللّٰہ کی سائنس اللّٰہ کے ننانوے ناموں (اسمائے حسنیٰ) پر مبنی ہے۔

یہ کتاب ممتاز مفتی کی آخری اور مقبول تصنیف ''تلاش'' کی اگلی کڑی ہے۔ کتاب اصلاً انگریزی میں تحریر کی گئی ہے تاہم پاکستانی قارئین کے لیے اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے کیا ہے جو انٹرنیشنل اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد کی استاد اور کئی علمی و تحقیقی کتابوں کی مصنف ہیں۔ یونیورسٹی آف ٹینیسی، امریکہ کے پروفیسر رالف ولبر ہوڈ (Ralph Wilbur Hood Jr.) نے، جو امریکہ میں مذہبیات پر سند سمجھے جاتے ہیں اور مذہب کے سائنسی مطالعات کی تنظیم کے رکن ہیں، اس مسودے کو حرف بحرف پڑھا ہے اور ان کی رائے ہے کہ یہ کتاب امریکہ اور برطانیہ میں قارئین کے ایک وسیع حلقہ کی توجہ اور پسندیدگی کا مرکز بن جائے گی۔

عکسی لکھتے ہیں:

> ''میں پروفیسر رچرڈ ڈاکن کا بہت بڑا مداح ہوں۔ پروفیسر ڈاکن آکسفورڈ یونی ورسٹی میں پبلک انڈرسٹینڈنگ آف سائنس کے پروفیسر اور *The God Delusion* جیسی معروف کتاب کے مصنف ہیں۔ خدا کے بارے میں ان کی یہ کتاب بے حد دلچسپ، پُر لطف اور قدرے ظریفانہ ہے۔ وہ کائنات کے بارے میں دو مختلف نظریات رکھنے والوں کے

Marfat.com

درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو موضوع بناتے ہیں۔ یعنی کیا یہ کائنات خدا کی تخلیق ہے یا ارتقا کا نتیجہ؟ ان کا خیال ہے کہ نظریہ ارتقا کو ماننے والے دراصل ایک قسم کے ملحد ہیں (اور یوں وہ خود بھی اس قسم میں شامل ہو جاتے ہیں) جب کہ دوسری طرف نظریہ تخلیق کے ماننے والے ایک طرح کے نظریاتی توہم کا شکار ہیں۔

لیکن کیا ہم انسانوں کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے کہ حقیقت کے ایک منتشر تصور میں مبتلا رہ کر زندگی بسر کرتے رہیں یا یہ ہماری سائنس کی ناکامی کا نتیجہ ہے جس نے انسانی بصیرت کے اس تضاد کو دور کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ آخر کار سائنس کا بنیادی مقصد تو یہی ہے کہ وہ حقیقت کا کوئی عقلی جواز پیش کرے اور کسی استثنا کے بغیر، اہم تضادات میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ سائنس کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ سائنس نے عظیم ترین کامیابیاں، بظاہر متضاد اور مختلف دکھائی دینے والے امکانات کے امتزاج ہی سے حاصل کی ہیں۔ میں پروفیسر رچرڈ ڈاکن کے اس ہٹ دھرمی کی حد تک غیر متزلزل عقیدے کا بے حد احسان مند ہوں کہ خدا اگر ہے تو اسے ایک سائنسی حقیقت کی صورت میں ثابت کیا جانا چاہیے، بصورت دیگر وہ صرف انسان کا وہم ہے۔

یہ کیا ظلم ہے کہ بنی نوع انسان، کسی تڑخے ہوئے آئینے کی مانند، مابعد الطبیعیات اور فلسفے، سائنس اور عقیدے، مذہب اور لا مذہبیت، شعور اور مادے، انسانی اور طبعی علوم کی ''متضاد'' انتہاؤں کے مسلسل کھنچاؤ کی زد میں ہے۔

زندگی خواب بھی ہے اور حقیقت بھی۔ اور چکی کے ان دو پاٹوں کے بیچ پستا ہوا انسان دو نیم زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

تصور کو ٹٹول کر دیکھیں تو حقیقت درہم برہم ہو جاتی ہے۔

اور حقیقت کے تعاقب میں نکلیں تو خواب سسک سسک کر دم توڑ جاتے ہیں۔

انسان کی اصل حقیقت ہے کیا؟

ایک شکستہ آئینہ؟

ایک نادر و کم یاب حقیقت جس نے انسان کی تب و تاب کو دھندلا دیا ہے اور اسے ایک سے دو

Marfat.com

میں بدل کر دوئی کے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے؟
حقیقت کیا ہے؟
کیا میں اسے درست انداز میں دیکھ اور سمجھ رہا ہوں؟
کیا میں نے اس کے بارے میں صحیح اندازے قائم کیے ہیں؟
کیا میرا ردِ عمل درست ہے اور میں خود کو اس سے درست طور پر ہم آہنگ کر پا رہا ہوں؟
کیا میری ترجیحات درست ہیں؟
ہماری سراسیمہ سائنس کے پاس انسان کے ان بنیادی سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔

میں نے ۱۹۶۹ میں چارلس یونی ورسٹی، پراگ میں طالب علمی کے زمانے میں، خدا کے سائنسی فرضیے (scientific hypothesis) کو پی ایچ ڈی کا موضوع بنایا تھا لیکن لگاتار اور وقفے وقفے سے کی گئی کوششوں کے باوجود اسے تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ چالیس سال کی مسلسل تلاش اور تحقیق کے بعد بالآخر اللّٰہ کا ایک سائنسی فرضیہ (scientific hypothesis) تیار ہو گیا ہے جو اس کتاب کی صورت میں زیرِ اشاعت ہے۔ میں پروفیسر ڈاکن کی خدمت میں نہایت ادب سے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ اللّٰہ کا سائنسی اصول (scientific law) بالآخر دریافت کر لیا گیا ہے۔

اہلِ مشرق کا دیرینہ خیال ہے کہ اللّٰہ اتنی عظیم حقیقت ہے کہ سائنس اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ اللّٰہ سائنس سے کہیں بڑا ہے اور سائنس میں یہ دم خم نہیں کہ اللّٰہ تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس کتاب میں اللّٰہ کو سائنس کی مدد سے ثابت کرنے کی جراٗتِ بے باک کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اللّٰہ کی یہ سائنس اللّٰہ کے ننانوے ناموں (اسمائے حسنیٰ) پر مبنی ہے۔ یہ کتاب ممتاز مفتی کی آخری اور مقبول تصنیف ''تلاش'' کی اگلی کڑی ہے۔ کتاب اصلاً انگریزی میں تحریر کی گئی ہے تاہم پاکستانی قارئین کے لیے اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے کیا ہے جو انٹرنیشنل اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد کی استاد اور کئی علمی و تحقیقی کتابوں کی مصنف ہیں۔

عکسی مفتی
پوسٹ بکس نمبر ۱۳۷۱، اسلام آباد
muftiuxi@yahoo.com

Marfat.com

عرضِ مترجم

عکسی مفتی کی کتاب کا ترجمہ ایک انوکھا تجربہ ثابت ہوا۔ میں نے جب اس ترجمے کی ہامی بھری تو میرے ذہن میں دور دور تک یہ تصور نہ تھا کہ کتاب اس طرح مجھ پر طاری ہو جائے گی۔ مجھے ترجمے کے عمل کا محدود سا تجربہ ضرور تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ ترجمہ، تخلیق سے بھی زیادہ مشکل کام ہے کیوں کہ تخلیق میں تو خود اپنے ہی مقابل ہونا پڑتا ہے لیکن ترجمے میں خود اپنے آپ کو رد کر کے، کسی اور ہستی کے تجربات و تصورات کو اپنی جان پر جھیلنا ہوتا ہے۔ یہ سراسر پرائی آگ میں جلنے کا عمل ہے۔ میں نے اس آگ میں کودنے کا ارادہ صرف عکسی مفتی کی مدد کے لیے کیا تھا۔ مجھے ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ یہ آگ میرے اندر کی کسی چنگاری سے مل کر مجھے خود اپنا ہی طور بنا دے گی جس پر ارنی اور لن ترانی کی صدائیں باری باری گونجا کریں گی۔

میں زندگی شک اور یقین کے بین بین، اندھیرے اجالے کے سنگم پر بتانے کی عادی رہی ہوں۔ بین بین رہنے میں بڑی سہولت نظر آتی ہے۔ جب اِدھر کوئی فائدے کی بات ہو تو اِدھر جھک جاؤ، اُدھر سے کوئی امید لگ جائے تو وہ بھی دور نہیں۔ اس طرح انسان ایک طرف ہو کر پوری طرح ناکام رہنے کے خطرہ سے بچ جاتا ہے۔ ہم میں سے اکثر یونہی جیتے ہیں۔ عکسی مفتی کے سپائرل کی طرح نہیں، ہائی اسکول کی سائنس لیبارٹری میں رکھے پنڈولم کی طرح۔ جب بھی یقین کا پلڑا جھکتا ہے کوئی بھاری پتھر شک کے پلڑے میں آ گرتا ہے اور جوں ہی شک کا اندھیرا مکمل ہوتا ہے تو کہیں کوئی مدھم سا دیا روشن ہو جاتا ہے۔

اللہ سے میں نے بار بار پوچھا ہے، تو کیا ہے؟ کہاں ہے؟ میری سمجھ میں کیوں نہیں آتا؟ مجھے یہ کتاب پڑھ کر صاف لگتا ہے کہ اللہ نے بالآخر مجھے اس نیم جانی سے رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس نے عکسی مفتی سے یہ کتاب لکھوا کر مجھے بھیجی ہے کہ جا، پڑھ کر دیکھ لے! تو صرف پڑھ کر سمجھ سکتی ہے، محسوس کرنے سے عاری

Marfat.com

ہے۔ تجھے تیری ماں نے سرسید احمد خان کے خیالات پر پروان چڑھایا ہے۔ تیرا اپنے باپ کے عشق کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں۔ تو زندگی بھر ایک انگلی کی مدد سے گزوں اونچے تار سے لٹکی رہے گی۔۔۔ چھوڑوں، کہ نہ چھوڑوں۔۔۔۔کہیں گر نہ جاؤں۔۔۔۔جست بھرنے کا حوصلہ تجھ میں نہیں۔

لے، اس کتاب کی رسی پکڑ کر دھیرے دھیرے اترتی آ!

اپنی طرف!

میری طرف!

ترجمے کے بارے میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ مصنف کی خواہش تھی، کہ ترجمہ مفہوم کا ہو، الفاظ کا نہیں مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس کتاب کا پورا متن سائنسی اور فلسفیانہ اصطلاحات سے بھرا پڑا ہے۔ ان میں سے کئی اصطلاحات کا تکنیکی ترجمہ بھی میسر ہے مگر وہ ترجمہ مصنف کی خواہش کے برعکس اسے نصابی کتابی رنگ دے دیتا ہے۔ عکسی مفتی کا مطالبہ تھا کہ کتاب میں پیش کردہ تصورات و نظریات اور مفاہیم کو زیادہ سے زیادہ عام فہم انداز میں پیش کیا جائے۔ لہٰذا اس کوشش میں کہیں کہیں ترجمے کے اس اصول سے روگردانی بھی کرنا پڑی کہ مخصوص الفاظ کا ہر جگہ ایک ہی متبادل استعمال کیا جائے۔ زبان کی تحریری اور تقریری صورتوں میں عام تجربہ بھی یہی ہے کہ ایک ہی لفظ مختلف سیاق وسباق میں مختلف معانی و مفاہیم اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا اس ترجمے کے دوران بھی، بعض اوقات ایک ہی لفظ کے لیے تناظر کی نسبت سے ایک سے زیادہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ تاہم تکنیکی اصطلاحات کی وضاحت کے لیے ان کے انگریزی متبادل قوسین میں درج کر دیے گئے ہیں۔

کئی مقامات ایسے بھی تھے جہاں بات ترجمے سے بڑھ کر ترجمانی تک جا پہنچی لیکن چوں کہ خود مصنف نے اس ترجمے کا حرف بہ حرف مطالعہ کیا ہے اور جہاں ضرورت محسوس کی ہے وہاں اصلاح و ترمیم سے بھی کام لیا ہے اس لیے مجھے اطمینان ہے کہ اس ترجمے میں کوئی ایسی بات شامل نہیں جو منشائے مصنف کے خلاف ہو۔ البتہ طرزِ بیان اور اسلوب کے بیش و کم کی ذمہ داری تنہا مجھ ہی پر عائد ہوتی ہے۔ کیوں کہ کئی الفاظ ایسے بھی تھے جنھیں مصنف نے ثقیل جان کر قلم زد کر دیا اور میں نے ناگزیر جان کر، حقِ مترجم استعمال کرتے ہوئے، انھیں پھر سے وہیں جڑ دیا۔

حرفِ آخر کے طور یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں نے اس کتاب کا مطالعہ بھی کیا ہے اور ترجمہ بھی۔ دونوں باتوں

Marfat.com

میں وہی فرق ہے جو پرندوں اور شہد کی مکھیوں کے پھولوں کا رس چوسنے میں ہوتا ہے۔ تصنیف مصنف کا آئینہ ہوتی ہے اور ترجمہ اس آئینے کا آئینہ۔ آئینے کا کمال یہ ہے کہ اس میں صرف عکس دکھائی دے، خود آئینہ نہیں۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گی کہ اس کتاب کے ترجمے کے دوران میں اکیلی نہیں تھی، عارف جزوذات کے طور پر میرے ساتھ تھے، دونوں بچے؛ مومنہ اور محمد، اپنی خوئے تسلیم، امی اپنی خاموش دعاؤں، ابو اپنی الوہی موجودگی، ساس اور سسر اپنی بے لوث محبت، نوشی اور حیدر نیم مسرت، نیم رضامندی اور اطیب، احسن، عادل اور اروی وقتاً فوقتاً ہمت افزائی سے میرے شریکِ کار رہے۔ پروفیسر معین الدین عقیل اور پروفیسر ظفر اسحٰق انصاری کی حوصلہ افزائی اور شفقت اور پروفیسر محمد عمر میمن کی رہنمائی اور مروّت میری علمی جستجو کی رہنما رہی ہے۔

عکسی مفتی! شکریہ!!!

اور ممتاز مفتی کے تو کیا کہنے جنھوں نے حیلوں بہانوں سے عکسی مفتی کو مجھ سے ترجمہ کروانے پر اکسایا۔

نجیبہ عارف

القادر، حسین روڈ، بنی گالا، اسلام آباد

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

ماورا کا تعین:
Measuring the Intangible

اللہ کا سائنسی قانون:
Scientific Law of Allah

فلسفے اور سائنس کی یہ کتاب جدید سائنس اور انسانیات (humanities) کا امتزاج پیش کرتی ہے۔ سائنسی نظریات کا آغاز سائنس دان کے کسی فرضیے (hypothesis) پر ایمان لانے سے ہوتا ہے جو اس کے تمام تر مشاہدات و نتائج میں مرکزی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ اللہ کے اس قانون کے فلسفیانہ قضیوں (premises) کی بنیاد بھی اسمائے حسنیٰ کی دو مستند ترین روایات پر قائم کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک امام ترمذیؒ کی روایت ہے اور دوسری گنج العرش کی۔ کتاب کے دوسرے حصے میں اس نظریے کے حق میں بہت سی تجرباتی شہادتیں بھی پیش کی جائیں گی۔

کتاب کے پہلے پانچ باب اسمائے الٰہی میں پوشیدہ حکمت و بصیرت سے متعلق ہیں۔ دیگر مباحث اور ان کے نتائج کی بنیاد فلسفیانہ استخراج کے ذریعے جدید سائنس کے تجرباتی مطالعات اور مسلمہ نظریات پر قائم کی گئی ہے۔ اللہ کے اسمائے حسنیٰ کے معانی مذہبی علما کی تفسیروں یا مابعد الطبیعیاتی مباحث سے نہیں بلکہ معیاری عربی لغات سے اخذ کیے گئے ہیں جو نہ صرف میرے خیال کے مطابق بلکہ سائنس دان کے لیے بھی مستند ترین اور غیر جانب دار ماخذ ہیں۔

ڈاکٹر لیزا رانڈال (Dr. Lisa Randall) نے، جو ہارورڈ یونی ورسٹی میں فزکس کی پروفیسر اور

Marfat.com

تکوینیات کی عالم (cosmologist) ہیں اور ٹائم میگزین نے انھیں دنیا کے سو مؤثر ترین لوگوں کی فہرست میں شامل کیا ہے، اپنی کتاب، *Knocking on Heaven's Doors* میں ہماری زندگی میں سائنس کے کردار کا بہت پر جوش طریقے سے دفاع کیا ہے۔ ان کے مطابق سائنس جنت کے دروازوں پر دستک دے رہی ہے۔ بلاشبہ فزکس کی جدید ترقی نے اس امکان کو قوی تر کر دیا ہے کہ دنیا کے بارے میں ہمارے فہم کو مکمل طور پر بدل ڈالے۔ کائنات کے ماڈل بہت تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔

رابرٹ اوپن ہائمر (Robert Oppenheimer) کا خیال ہے کہ فزکس اور شاعری ناقابلِ تفریق (indistinguishable) ہوتے جا رہے ہیں۔ فریجوف کیپرا نے *The Toa of Physics* میں اور کیمبرج کے پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ نے *The Grand Design* میں یہ بتایا ہے کہ کیسے فزکس اور مابعد الطبیعیات تیزی سے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے جا رہے ہیں۔ جوں جوں سائنس ترقی کرتی رہی، توں توں فلسفے کا، حقیقت کی تعبیر و تفسیر کرنے اور ٹھوس حقائق سے آگے بڑھ کر نظریات تشکیل دینے کا، روایتی کردار پس منظر میں چلا گیا تھا۔ آج ہمیں ایک مرتبہ پھر ان نئے سائنسی حقائق کی، جن کا ہمیں سامنا ہے، فلسفیانہ توضیح و تشریح کی ضرورت درپیش ہے جو حقیقت کے بارے میں ہمارے بدلتے ہوئے نقطۂ نظر کی رہنمائی کر سکے۔

سائنس کی ہزاروں سال کی پیش رفت کے باوجود، مابعد الطبیعیاتی حقائق تو کجا، طبعی حقیقت کو بھی سمجھنے میں اس کی مسلسل ناکامی کے باعث، بدقسمتی سے ہم یہ مابعد جدید (postmodern) نقطۂ نظر اختیار کر بیٹھے ہیں کہ حقیقت کا فہم حاصل کرنا ممکن ہی نہیں۔ مذہب کے معاملے میں عذر خواہی کرنے والے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک مافوق الفطرت خدا پر ایمان طبعی سائنس کی حدود سے باہر ہے۔ حتیٰ کہ معروف سائنس دان بھی یقین کر بیٹھے ہیں کہ خدا سائنس کی حدود سے باہر اور اسی لیے بے معنی تصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو سائنسی طریقے سے سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی گئی اور اسی لیے یہ معاملہ لوک ادب یا زیادہ سے زیادہ مذہبی فلسفوں کے ہاتھ میں رہا۔ دوسری طرف جدید سائنس کی شاندار ترقی کے باوجود اس کی الجھنیں اور مخمصے روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ جدید سائنس ایک بند گلی میں پہنچ گئی ہے۔ ایمان اور استدلال، مذہب اور سائنس کے درمیان صدیوں پرانی کشمکش سے قطع نظر کوانٹم مکینکس (quantum mechanics) اور عمومی اضافیت (general relativity) کے نظریوں میں ایسی حیرت انگیز دو رُخی (dichotomy) ہے کہ اس خلیج کو

Marfat.com

پانا دشوار ہے۔ایک کا دعویٰ ہے کہ طبعی قوانین متعین اور قابلِ پیشین گوئی ہیں اور دوسرے کا تجزیہ ہے کہ عدم تیقن (uncertainty) ناگزیر ہے اور محض گمان اور امکان (probabilities) ہی وجود رکھتے ہیں۔ایک حقیقت کے مادی ذرات پر مشتمل ہونے کا اعلان کرتا ہے اور دوسرا اسے غیر مادی موج قرار دیتا ہے۔اگر سائنس کا اعلاترین مقصد ربط وہم آہنگی پیدا کرنا ہے تو یہ سب کیوں ہے؟ سائنس کی بنیاد تو یکساں قوانین پر ہوتی ہے۔لیکن اس طرح تو سائنس کی بنیاد ہی مشکوک ہو جاتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو ہماری سائنس پوری طرح سمجھی نہیں یا ابھی ادھوری اور نامکمل ہے۔بہرحال یہ جدید فزکس کا سب سے بڑا اور لاینحل مسئلہ ہے۔اس میں اگر ارتقا اور تخلیق، تدبیر اور تقدیر اور طبعی سائنس اور انسانیت کے درمیان حائل خلیج کو بھی شامل کر لیں تو معاملہ اور گمبھیر ہو جاتا ہے۔ ہستی (Being) اور تکوین (Becoming) کے وجودیاتی معاملات، الہامی اور اکتسابی علم کے فلسفیانہ اور علمیاتی (epistemological) مسائل، قانونِ الٰہی اور قانونِ فطرت کے درمیان روز افزوں فاصلہ، علتِ مظہر (neumenon) اور مظہر (phenomenon)، عقلیت (rationalism) اور تجربیت (empiricism) کے درمیان بے نتیجہ مباحث، نفسیات میں ساختیات (structuralism) اور فعلیت (functionalism) کے درمیان مسلسل ناموافقت اور عدم تطابق اور مادی اور مابعد الطبیعیاتی دنیا کے بیچ گہری ہوتی خلیج اس پر مستزاد ہیں۔

یونانِ قدیم کے زمانے ہی سے فلسفیوں کو یقین تھا کہ اس ظاہری تنوع اور رنگارنگی کے پیچھے ایک پوشیدہ وحدت موجود ہے۔اس کے برعکس ہم عصر سائنس دانوں کو متنوع حقیقتوں کی مسلسل بڑھتی، پھیلتی اور حیران کن تکثیریت کا سامنا ہے۔بلا شبہ تکثیریت (pluralism) جدید زمانے کا خدا ہے۔تکثیریت کے اس عہد میں ہمیں خدا اور ملٹی ورس (multiverse) کے درمیان کشمکش کا بھی سامنا ہے۔سائنس دانوں کا دعویٰ ہے کہ نظریات سادہ سے سادہ تر ہوتے جا رہے ہیں اور اوکیم کے قانون (Occam's law) کے مطابق سادہ ترین حل ہی بہترین حل ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود ہماری سائنس کو آج کل حیرت انگیز پیچیدگی اور کثرت کا سامنا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری سراسیمہ سائنس کارگر ثابت نہیں ہو سکتی۔مذہب کی مدافعت کرنے والوں کے برعکس میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ ہمیں صرف سائنس کی بنیاد درست کرنے کی ضرورت ہے۔ایک حرکی،

Marfat.com

روز افزوں اور پھیلتی ہوئی حقیقت کا فہم حاصل کرنے کے لیے ہمیں اس کی بنیاد پر اپنی گرفت مضبوط کرنا ہو گی۔ پلٹ کر دیکھنا ہوگا اور نئے سرے سے جڑوں کی دریافت کرنا ہوگی۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس تمام یا بیشتر سوالوں کے جواب ہیں۔ ہمارے پاس ایسے آلات نہیں ہیں جن کی مدد سے پورے عالمِ فطرت کا تعین کیا جا سکے۔ اس لیے ہم کبھی بھی یقین سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے کوئی حتمی نظریہ تشکیل دے لیا ہے جو ہر بات کی وضاحت کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر مارسیلو گلیزر (Dr. Marcelo Gleiser) نے اسٹیفن ہاکنگ (Stephan Hawking) کی نئی کتاب *The Grand Design* پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مضمون "Hawking and God: An Intimate Relationship" میں لکھا ہے: ''اس بات پر یقین کرنا کہ ہم انسان اس منزل تک پہنچ سکتے ہیں، واقعی ایک خود فریبی ہوگی۔ نئی فزکس نے ثابت کر دیا ہے کہ نت نئی حیرتیں اور دریافتیں ہمیشہ ہماری منتظر رہیں گی۔'' میرے خیال میں کسی ایسے نظریے کا تصور خاصا ناپسندیدہ ہے جو انسان کی تمام تر تلاش اور جستجو کا انت ثابت ہو اور اس کی مزید نشوونما کا امکان منقطع کر دے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اللہ ایسی تکوینیات (cosmology) کا نام نہیں ہے۔

میں سائنس کی بھی تردید یا تحقیر نہیں کر رہا۔ بلکہ میں تو اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ آج ہماری سائنسی فہم اس حد تک ترقی یافتہ ہو چکی ہے کہ ہم اس کی مدد سے مجرد ترین، ماورائی اور ناقابلِ رسائی حقیقت یعنی خدا کا تعین بھی کر سکتے ہیں۔ ''ماورا کا تعین'' خدا پر ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ سائنس بنی نوع انسان کی عالمگیر زبان ہے۔ یہ علم کی متفقہ بنیاد ہے۔ آئن اسٹائن کے زمانے سے اب تک ایک ایسے آخری اور حتمی نظریے کی تلاش جاری رہی ہے جسے ٹی۔ او۔ ای۔ (theory of everything: TOE) کہتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر ایسے نظریات کا ازدحام ہے۔ ٹی۔ او۔ ای۔ کی تلاش کا بنیادی مقصد، صدیوں پرانی لاحاصل جستجو کی منزل پا لینے کی ذہنی و عقلی تسکین کے ساتھ ساتھ، یہ بھی ہے کہ اس نمایاں سائنسی تقسیم و تفریق میں وحدت پیدا کی جائے۔ متضاد حقائق میں وحدت پیدا کرنے کا یہ عمل بلاشبہ نہ صرف ہمارے فہم کی افزونی کا باعث ہے بلکہ نئے اور ابھی تک انجان رہنے والے مظاہر کی پیشین گوئی کا سبب بھی ہے۔ یہ تصنیف ربط و ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک اصول، ایک سائنسی قانون، ایک نیا نقطۂ نظر، فراہم کرتی ہے جو کائنات کو ایک تجدید شدہ اور نتیجہ خیز انداز میں دریافت کرنے کا ذریعہ

Marfat.com

بن سکے، سائنسی مواد کے ظاہری تضاد وتناقض کی معنویت اخذ کر کے، ان کے درمیان حائل خلیج کو پر کر سکے اور بنی نوع انسان کو حقیقت کا بہتر فہم، اس پر قابو پانے کی بہتر صلاحیت اور اس سے انسانی ربط وتعامل کو بہتر بنانے کی استعداد فراہم کرے۔

سائنسی نتائج عارضی اور غیر یقینی ہوتے ہیں کیوں کہ یہ ایسے مشاہدات پر بنیاد رکھتے ہیں جو ہمیشہ نت نئی تعبیر وترمیم کی زد میں رہتے ہیں۔ ماورا کا تعین بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

پہلا باب

اللہ کی سائنس: تشریح و توضیح

عربی میں اللہ کا مطلب ہے خدا

Marfat.com

Marfat.com

اللہ کی سائنس: تشریح و توضیح

تجربہ اور علم:
Experience and Knowledge

جب تک آپ کسی چیز کا بذات خود تجربہ نہ کرلیں، اس کی وضاحت نہیں کر سکتے۔ یعنی جو کچھ بھی آپ کے تجربے سے باہر ہے اس کا علم تو ہو سکتا ہے لیکن آپ اس کی حقیقت نہیں جان سکتے اس لیے وہ ایک طرح سے نامعلوم ہی رہتا ہے۔

تو پھر اس ''نامعلوم'' کی وضاحت کیسے کی جائے؟

کسی ایسی چیز کو کیوں کر بیان کیا جائے جس کا کبھی تجربہ ہی نہ ہوا ہو؟

فرض کیجیے آپ کسی ایسے شخص کو برف کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں جو اس کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا ہو تو آپ کیا کریں گے؟

ذرا کوشش کر کے دیکھیے!!

کیا وہ آپ کی بات واقعی سمجھ سکتا ہے؟

حسی اور تجریدی عناصر ایک دوسرے میں تانے بانے کی طرح پیوست ہیں:
The sensible and the abstract are webbed together

حسی، قابلِ ادراک اور ٹھوس 'تجربے' (Experience) اور مجرد، غیر طبعی اور نظریاتی 'علم'

Marfat.com

(Knowledge) کے درمیان ایک عجیب و غریب اور دوطرفہ رشتہ ہے۔ حسی اور تجریدی عناصر ایک دوسرے سے یوں منسلک ہوتے ہیں جیسے تانا اور بانا۔ مادی اور غیر مادی، تجربہ اور علم، ٹھوس حقائق اور مجرد نظریات ایک دوسرے سے یوں جڑے ہوئے ہیں کہ انسان حیران و سرگرداں رہ جاتا ہے اور حقیقت کے بارے میں اس کی سمجھ بوجھ خود اس کے اپنے عمل، تجربے اور مشاہدے تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ تمام تر سائنس حواس، مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر ہی قائم ہے۔ لہٰذا اگر کوئی اللہ کی سائنس مرتب کرنا چاہے تو لازم ہے کہ یہ بھی حواس پر منحصر ہو۔

ایک دفعہ میں نے ایک کہانی پڑھی تھی۔ ایک ایسے شخص کی کہانی جو افریقہ کے کسی دور دراز، وسطی میدانی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اس کے گاؤں کے لوگوں نے پانی صرف چھوٹے موٹے تالابوں کی صورت میں ہی دیکھا تھا، جو ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہوتے اور بارش کے دنوں میں بھر جاتے تھے۔ ان تالابوں کو اس علاقے کی مقامی زبان میں ''ایڈو'' کہتے تھے۔ جب کسی آبادی کے قریب موجود ایڈو خشک ہو جاتا تو وہاں کے لوگ نقل مکانی کر کے کسی اور ایڈو کے کنارے آباد ہو جاتے۔

ایک دن وہاں کا ایک باسی کسی ایڈو کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے بہت دور جا نکلا اور سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔ سمندر کو دیکھ کر وہ حیرت سے گنگ رہ گیا۔ اس نے اس سے پہلے کبھی ایسی کوئی جگہ نہ دیکھی تھی۔ وہ فوراً اپنے قبیلے کی طرف پلٹا اور چلا چلا کر کہنے لگا:

''ایڈووووووووووووووووووووووووووووووووو''

یہاں تک کہ اس پر غشی طاری ہو گئی۔ مگر کسی نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ کچھ لوگوں نے تو نہایت دکھ سے سوچا کہ شاید وہ پاگل ہو گیا ہے اور اگلے روز اسے زنجیروں سے باندھ دیا تا کہ پھر بھٹک کر کہیں اور نہ جا نکلے۔

کئی مہینے گزر گئے لیکن وہ شخص مصر رہا، ''ایڈووووووووووووووووووووو''

آہستہ آہستہ چند ایک لوگ اس پر یقین کرنے لگے۔ کچھ تو اسے جادوئی قوتوں کا مالک سمجھنے لگے اور اس کے معتقد ہو گئے۔ کچھ یہ سمجھنے لگے کہ شاید اس نے کوئی خواب دیکھا ہے؛ کسی بہت بڑے تالاب کا خواب، جو کہیں وجود نہیں رکھتا۔ شاید کسی بہت بڑے تالاب تک پہنچنے کی خواہش نے اس کے تخیل کو متحرک کر دیا ہے حالاں کہ ایسا کوئی تالاب وجود نہیں رکھتا۔

110612

Marfat.com

ہم سب بھی کسی نہ کسی نخلستان میں ایک ننھے سے کنویں کے کنارے بستے ہیں، اگر کبھی کوئی بھٹک کر کسی سمندر کے کنارے جا نکلے تو ہم اس کے تجربے سے سوائے تحیر اور اسرار کے اور کیا حاصل کر سکتے ہیں؟ اس کا کشف ہماری سمجھ سے بالاتر ہی رہتا ہے۔۔۔ ہمارے روزمرہ کے تجربات اور تخیل سے بعید تر۔

۱۹۶۱ کی بات ہے، ایک نوجوان انتھروپالوجسٹ کارلوس کستانیدا (Carlos Castaneda) کو امریکہ کے انڈین قبیلے یاقی (Yaqui) کی ایک غیر معمولی روایت سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔ یہ "جدا حقیقت" (Separate Reality) کی دنیا تھی اور صاحبِ علم بننے کے لیے انسان پر لازم تھا کہ اس مشکل راستے سے گزرے۔ یاقی قبیلے کے ایک ستر سالہ بوڑھے ڈون جوآن (Don Juan) نے، جو میکسیکن زبان میں "بروجو" (Brujo) کہلاتا تھا (یعنی معالج، روحانی رہنما اور جادوگر)، کارلوس کو "پیوتے" (peyote) کا استعمال سکھایا۔ پیوتے ایک نشہ آور جڑی بوٹی تھی، جو انسان کے فہم و ادراک کا دروازہ معمول کی حقیقت سے بہت مختلف دنیا میں کھول دیتی تھی۔ یہ ایک روحانی راز تھا جس کے ذریعے انسان میں کردار کی پختگی اور مافوق الفطرت نفسیاتی قوت پیدا کی جاتی تھی۔ کارلوس اور اس یاقی بوڑھے کے درمیان ہونے والی گفتگو کو کارلوس نے اپنی دو نہایت دلچسپ کتابوں میں بیان کیا ہے۔ ان کتابوں کے نام *Teachings of Don Juan* اور *A Seperate Reality* ہیں۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ میں ان کتابوں کے چند اقتباسات آپ کو سنائے بغیر یہاں سے آگے بڑھ جاؤں۔

کارلوس کے نزدیک علم کتابی ہے جو تجربے پر فضیلت رکھتا ہے جب کہ ڈون براہ راست علم کی بات کرتا ہے جو حقیقت کے تجربے سے پھوٹتا ہے۔

"کیا تم اپنے گردوپیش کی دنیا کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" اس نے پوچھا

"میں سب کچھ جانتا ہوں"، میں نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے کہ کیا کبھی تم نے اس دنیا کو محسوس بھی کیا ہے؟"

"جتنا محسوس کر سکتا ہوں اتنا تو کرتا ہوں"۔

"مگر اتنا تو کافی نہیں۔ تمھیں ہر چیز کو محسوس کرنا چاہیے، ورنہ یہ دنیا اپنا احساس کھو دے گی۔"

کارلوس نے یہاں وہی پرانی دلیل دی کہ سوپ بنانے کی ترکیب سمجھنے کے لیے اسے چکھنا ضروری نہیں اور

Marfat.com

بجلی کی ماہیت کا علم حاصل کرنے کے لیے بجلی کا جھٹکا کھانے کی شرط نہیں۔

''تم بالکل بے وقوفی کی بات کر رہے ہو، میں 'دیکھ' رہا ہوں کہ تم بس اپنی دلیلوں سے چمٹے رہنا چاہتے ہو، حالانکہ وہ تمھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ تم آخر تک ایسے ہی رہنا چاہتے ہو، جیسے ہو، چاہے اس میں تمھارا بھلا ہو یا نہ ہو!''

''تو پھر آپ مجھے بھی 'دیکھنا' سکھا دیجیے!''

چناں چہ ڈون نے اسے نظر ڈالنے (see) اور دیکھنے (look) کے درمیان امتیاز سے آگاہ کیا۔

''نظر ڈالنے کا مطلب ہے دنیا کو سرسری نظر سے دیکھنا جو ہمارا روزمرہ کا معمول ہے اور **دیکھنے** سے وہ خاص عمل مراد ہے جس کے ذریعے کوئی صاحبِ علم اس دنیا کی اشیا کے حقیقی جوہر کو پہچان لیتا ہے۔''

''اور لوگوں کو 'دیکھنے' کی یہ صلاحیت کیسے حاصل ہوتی ہے ڈون؟''

''جب تم 'دیکھنے' لگتے ہو، تو لوگ مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ ذرا سے دھوئیں میں تمھیں انسان روشنی کے ریشوں جیسے نظر آئیں گے۔''

''روشنی کے ریشے؟''

''ہاں، مکڑی کے سفید جالے کی طرح کے ریشے؛ سر سے لے کر ناف تک بہت باریک تاروں کے دائرے سے۔''

''کیا ہر انسان ایسا ہی دکھائی دیتا ہے؟''

''ہاں، ہر انسان۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہر انسان، دوسری تمام چیزوں کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔۔۔ اپنے ہاتھوں سے نہیں، لمبے لمبے تاروں کے اس گچھے کے ذریعے، جو اس کے پیٹ کے مرکز سے نکلتے ہیں۔ یہ تار انسان کو اس کے گرد و پیش سے جوڑے رکھتے ہیں؛ اس کا توازن قائم رکھتے ہیں، اس میں استحکام پیدا کرتے ہیں۔ اور کسی دن تم خود دیکھ سکو گے کہ انسان ایک چمکتے ہوئے انڈے کی مانند ہے۔''

''ڈون، مجھے کچھ اور بتاؤ، یہ 'دیکھنا' کیا ہے؟''

''یہ جاننے کے لیے تمھیں خود 'دیکھنا' سیکھنا پڑے گا۔ میں تمھیں کچھ نہیں بتا سکتا۔''

''کیوں؟ کیا یہ کوئی ایسا راز ہے، جو تم مجھے نہیں بتا سکتے؟''

Marfat.com

’’نہیں! لیکن بس میں اسے بیان نہیں کر سکتا‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’تم اسے سمجھ نہیں سکو گے۔‘‘

’’کوشش تو کر دو ڈون، شاید میں سمجھ جاؤں!‘‘

’’نہیں۔ بس یہ تمھیں خود ہی سیکھنا پڑے گا، کچھ باتیں کہنے کی‘‘

’’میں دونوں طرح سے دیکھ سکتا ہوں۔ جب میں اسے سرسری طور پر دیکھنا چاہتا ہوں جیسے مثلاً تم دیکھتے ہو، تو بس نظر ڈالتا ہوں، اور جب اس کو گہرائی میں جا کر سمجھنا چاہتا ہوں تو اسے ’’دیکھتا‘‘ ہوں۔‘‘

’’جب تم ’’دیکھتے‘‘ ہو تو کیا ہر بار اشیا ایک جیسی ہی نظر آتی ہیں؟‘‘

ہوتی ہیں اور کچھ کرنے کی۔‘‘

’’اچھا، تو یہ بتاؤ، کہ کیا اب تم دنیا کو سرسری طور پر نہیں دیکھ سکتے؟‘‘ ’’اشیا کبھی نہیں بدلتیں۔ تمھارا انھیں دیکھنے کا انداز بدل جاتا ہے۔‘‘

دنیا میں بہت سے لوگ گزرے ہیں؛ بزرگ، ولی، صوفی، یوگی، جوگی، مہارشی اور راہب، جنھوں نے خدا کا عکس دیکھنے کا تجربہ کیا اور اسے دوسروں کے سامنے بیان کرنے کی کوشش بھی کی لیکن انسان دوسروں کے تجربے کو کبھی نہیں سمجھ پایا۔ انسان کی عقل و فہم ابھی اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی کہ ایسے باطنی، مبہم، پراسرار اور خیالی تصور کو سمجھ سکے، حقیقت کو سمجھنے کی منزل تو بہت دور ہے۔ انسان اس تک کبھی نہیں پہنچ سکا۔

سائنس کا انتخابی رویہ:

Science by Selection

خدا کا وہ تصور جو عام لوگوں میں مقبول تھا، اس کے ٹوٹ کر بکھر جانے کا سبب سائنس کی ترقی نہیں، بلکہ اس کی نارسائی ہے۔ ہماری نومولود سائنس، جس حقیقت کو سمجھ نہیں پاتی، اسے نظر انداز کر دیتی ہے بلکہ سرے سے اس کا انکار ہی کر بیٹھتی ہے۔ سائنس نے جو ترقی کی ہے اس کی بنیاد میں اس کا یہی انتخابی رویہ کارفرما رہا ہے یعنی ہر اس شے کو ترک کرتی چلی گئی جو اس کی فہم سے باہر تھی اور صرف ان باتوں پر توجہ مرکوز کرتی رہی، جنھیں سمجھنا اس کے لیے آسان تھا۔ ہزاروں تصورات اس نے محض اس وجہ سے نظر انداز یا رد کر دیے کہ وہ اس کی سمجھ میں آنے

Marfat.com

والے تصورات کو الٹ پلٹ دیتے تھے۔ جو چیز بھی سائنس دان کے فرضیے (hypothesis) کو جھٹلا دے، سائنس دان اسے آسانی سے نظرانداز کر دیتا ہے۔ سائنس کے ایسے متروک یا نظرانداز کیے گئے تصورات ایک جگہ جمع کر لیے جائیں تو ایک جامع انسائیکلوپیڈیا تیار ہو سکتا ہے۔ سائنس ایک سازش ہے۔ یہ ہرگز کوئی معروضی علم نہیں ہے۔ مغربی فلسفے اور سائنس دونوں کی بنیاد شک پر ہے۔ یہ ڈیکارٹ (Decarte) ہی تھا، جس نے کہا تھا کہ جو بھی سچ کو تلاش کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو، ہر چیز پر شک کرے۔ لیکن اسی ''مسلمہ کلیے'' کی بنیاد پر ہمیں یہ آزادی بھی ملنی چاہیے کہ ہم سائنس پر بھی شک کر سکیں۔ سائنس محض انتخاب نہیں کرتی، الگ الگ بھی کرتی ہے۔ یہ کسی شے یا عمل کا مشاہدہ کرنے کے لیے اسے ٹکڑوں میں بانٹ کے دیکھتی ہے، کسی مظہر کا تجزیہ کرنے کے لیے اسے اس کی کلیت (wholeness) سے جدا کر دیتی ہے اور یوں اس کی جیتی جاگتی مکمل ہستی کو نہیں پا سکتی۔ ڈون جوآن کی ''جدا حقیقت'' کے نظریے میں کسی شے کو اس کی مکمل ہستی، اس کی کلیت سے الگ نہیں کیا جاتا۔ اپنی کلی حقیقت سے جدا ہونے والی شے معدوم ہو جاتی ہے۔ اس متبادل حقیقت میں ہر شے ایک دائمی بہاؤ کا حصہ ہے اور کسی چیز کو دوسری چیز سے کاٹنا، جدا کرنا اور اجزا میں تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے۔

اعلاتر ہمیشہ مجرد ہوتا ہے:
Higher is Abstract

ہر اعلاتر حقیقت اپنی فطرت کے اعتبار سے مجرد (Abstract) ہوتی ہے۔ ہر شے کا جوہر، اس کا عطر، ہمیشہ تجریدی ہوتا ہے۔ یہی فطرت کا اصل اصول ہے۔ جوں جوں ہم بلندی کی طرف جاتے ہیں، فضا لطیف ہوتی جاتی ہے، ریاضی کے آخری مراحل میں، جب جز کل کے برابر ہو جاتا ہے اور ہمیں لامحدود (infinity) سے واسطہ پڑتا ہے تو زیادہ سے زیادہ تجریدی تصورات سامنے آتے ہیں، آرٹ جوں جوں ترقی یافتہ ہوتا ہے اس میں تجریدیت بڑھتی جاتی ہے، جیسے جیسے ہم لسانی اور علمی میدان میں ترقی کرتے ہیں، زیادہ پیچیدہ اور مجرد نظریات کو سمجھنے کے قابل ہوتے جاتے ہیں۔ تجریدی کی جانب مسلسل سفر؛ یہی ترقی، ارتقا اور تہذیب کا راز ہے۔

اگر اپنے حواس کی مدد سے سمجھنا چاہیں تو ایکس ریز، برقی لہریں، کشش ثقل، دور خلاؤں میں موجود کہکشائیں، یہ سب کچھ ہماری عقل کی رسائی سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ ہم ان مظاہر کو نہ تو براہ راست دیکھ سکتے ہیں، نہ جان سکتے ہیں۔ کئی صدیوں پر محیط دریافتوں محتاط پیمائشوں اور پیچیدہ تجربوں سے گزرنے کے بعد انسان

Marfat.com

سائنس کے اس مقام تک پہنچ پایا ہے جہاں تمام مجرد حقائق انسانی سمجھ بوجھ اور مشاہدے کا حصہ بن گئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ جاننے کے لیے کہ دور خلا میں کیا ہے، انسان کو کتنی ایجادات اور دریافتوں کا انتظار کرنا پڑا ہے۔ دوربین، برقی علمِ فلکیات، اسپیکٹروگرام، خلائی تصویر کشی اور تمثیلی انعکاس کے آلات، رفتار، مقناطیسیت اور برقی لہروں کے نظریات اور اعلا ریاضی کے پیچیدہ فارمولے۔ پھر ہم یہ توقع کیسے رکھ سکتے ہیں کہ سائنس ابھی سے مجرد ترین حقیقت، یعنی خدا کو سمجھ پائے جب کہ ابھی اس کی رسائی محض عالمِ فطرت اور عالم مادی تک ہی ہو پائی ہے۔ حقیقت کی بالاتر، غیر مادی سطحوں کے معاملے میں ابھی یہ بالکل بے دست و پا دکھائی دیتی ہے۔

لیکن اگر سائنس ابھی اپنے ارتقائی مراحل میں ہے اور اعلاترین، ماورائی اور محیطِ کل ہستی (Being) کا علم حاصل کرنے میں ابھی تک ناکام رہی ہے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان اس مجرد حقیقتِ اعلا تک رسائی کی کوشش ہی ترک کردے۔ اگر ہم نے ہمیشہ سائنس کے اسی طریق کار پر عمل کیا ہوتا؛ جس کے مطابق سائنس دان ان سب امکانات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ان کے عہد تک ہونے والے سائنسی انکشافات سے مختلف ہوتے ہیں، تو سائنس کبھی اتنی ترقی نہ کرتی اور نہ کبھی موجودہ مقام تک پہنچ پاتی۔

سائنس کی اپنی ترقی کا راز بھی یہی ہے کہ اس نے ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مجرد نظریات و قوانین وضع کیے اور پھر ان سے عمومی کلیات (generalizations) تشکیل دیے۔ بعد میں انھی عمومی کلیات کی مدد سے قابلِ مشاہدہ حقائق اور مظاہر کی تعبیر و تشریح کی جا سکتی ہے، ان کے بارے میں پیشین گوئی کی جا سکتی ہے اور انھیں کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ شاید کوئی بھی قانون مطلق درست نہیں ہوتا۔ لیکن غور و فکر سے وضع کیا گیا کوئی عمومی نظریہ یا سائنسی فرضیہ (scientific hypothesis)، جو درست سمت کی طرف اشارہ کر سکے، بہت اہم ہوتا ہے، خواہ بعد میں وہ غلط ہی کیوں نہ ثابت ہو جائے۔ ہیلڈن (Haldane) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ چوں کہ کوئی بھی نقشہ، انگلستان کی بالکل درست جغرافیائی ہیئت کو ظاہر نہیں کر سکتا اس لیے انگلستان کی کوئی جغرافیائی ہیئت نہیں"۔

کسی نابغے کا وجدان:

Intuition of a Genius

انسان تو اتنا باکمال ہے کہ بعض اوقات، سائنسی آلات اور مادی ذرائع کے بغیر ہی، محض وجدان کی ایک

Marfat.com

اڑان میں حقیقت کا تعین کر لیتا ہے۔ معروف سائنس دان نیلز بور (Niels Bohr) یاد کرتا ہے کہ کیسے طالب علمی کے زمانے میں اس نے خواب میں ایٹم کا ماڈل دیکھا تھا جو بہت بعد میں کہیں جا کر دریافت ہوا۔ اسی طرح آگسٹ کیکولے (Auguste Kekule) بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ بس میں سفر کرتے ہوئے وہ سو گیا اور خواب ہی میں ایٹم کی ساخت کے بارے میں اپنا نظریہ وضع کر لیا۔ پھر وہ پوری رات اس خواب کی تفصیلات قلم بند کرتا رہا۔ جدید طبیعیات (New Physics) اور اس کے اطلاق کے بیشتر نظریات ایسے ہی خوابوں کا نتیجہ ہیں۔ سائنس کی تاریخ میں کئی بار ایسا ہوا ہے کہ کسی نابغۂ روزگار شخصیت کے وجدان (intuition of a genius) نے روشنی کے مینار کی طرح سائنس کی رہنمائی کی ہے۔ اس بات پر عام طور پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ بڑے پیمانے پر ہونے والی اجتماعی کوشش، بہت زیادہ ساز و سامان اور خطیر رقم کے بغیر اب سائنس ترقی کی سمت مزید پیش رفت نہیں کر سکتی۔ لیکن ہم بھول جاتے ہیں کہ بنیادی نوعیت کی سائنسی دریافتیں، جیسے کشش ثقل، مقناطیسی لہریں، موجی حرکت کا قانون، خلوت نشیں لوگوں کے کارنامے ہیں جو آلات کے بغیر یا بہت کم آلات کے ساتھ، سرانجام دیے گئے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انسان کا وجدان دوربین سے پیدا نہیں ہوتا، البتہ دوربین انسانی وجدان کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ جب ہم اصل حقیقت کی تہ تک پہنچیں تو اس معمہ کا حل نہایت سادہ اور آسان نکلے؛ بالکل اسی طرح جیسے سائنسی ایجادات جوں جوں زیادہ ترقی یافتہ ہوتی جاتی ہیں، ان کی تکنیک پیچیدہ سے سادہ تر ہوتی جاتی ہے۔ سیزان، گوگیں اور واں گو (Cezanne,Gauguin and Von Gogh) جیسے معروف تاثراتی مصوروں نے اپنے فن کے عروج پر پہنچ کر اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کاش وہ ایک بچے کی سی معصوم سادگی سے تصویریں بنا سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ تلاش کے آخری مرحلے پر اللہ، جو حقیقتِ ازلی ہے، اپنی ناقابلِ فہم پیچیدگی کے باوجود، ایسی ہی ناقابلِ یقین سادگی کا حامل نکلے۔

سائنس نے اپنے ارتقا کے ابتدائی مراحل میں زیادہ توجہ ایسی مادی ایجادات اور دریافتوں پر مرکوز کیے رکھی، جو ترقی میں اس کی مددگار ثابت ہو سکیں۔ اس دوران تکنیکی آلات کی تیاری، طریقِ کار کے اختراع، اور اوزاروں کی ایجاد جیسے مقاصد اس کے پیش نظر رہے جن سے سائنس کو خود اپنی پیش رفت میں بڑھاوا مل سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سائنس ہر اس چیز کی موجودگی کے امکان کو جوش و خروش سے جھٹلاتی رہی، جو اس کی حدِ فہم سے باہر تھی

Marfat.com

تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسانیت اس نومولود سائنس کے راستے سے بھٹک کر کسی اور جانب جا نکلے۔

یہ تو موجودہ زمانے ہی میں ممکن ہوا ہے کہ جدید سائنس ہمیں ان بنیادی سوالوں کے جواب فراہم کرنے کی کوشش کر سکے جن کا تعلق خود انسان سے ہے اور جو، اب تک تشنۂ جواب رہے ہیں۔ آج کا انسان اپنے پیمائشی آلات، مشاہدات اور تجربات سے لیس ہو کر بذات خود علم کا نمونہ بن گیا ہے۔ اس نے انسانی تجربات کو ایک نظام میں ڈھال کر اس کی سائنس بنا ڈالی ہے۔ اس کے باوجود سچ یہ ہے کہ کائنات کے بارے میں ہمارا سائنسی علم محض ہمارے مشاہدات و تجربات تک ہی محدود ہے۔ جدید انسان کو سمجھ بوجھ تو بہت ہے لیکن فوری اور حاضر حقیقت سے آگے بڑھ کر اسے کچھ معلوم نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جدید انسان حقیقت کو صرف سائنسی تجربات و مشاہدات کی حد تک ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس سے آگے جو کچھ بھی ہے وہ پوشیدہ، نامعلوم اور پراسرار ہے۔

اگر آپ ایک ان پڑھ کسان کو یہ سمجھانے کی کوشش کریں کہ ایروسول (aerosol) ڈبے استعمال کرنے سے کرۂ ارض کے گرد موجود اوزون کے غلاف میں شگاف پڑنے کا اندیشہ ہے تو وہ اسے سمجھ نہیں پائے گا، لیکن اگر آپ قدرتی زرعی چکر کی مدد سے اسے ماحولیاتی تبدیلیوں کی بات سمجھانے کی کوشش کریں گے تو وہ یقیناً سمجھ جائے گا کیوں کہ یہ بات کاشتکاری کے تجربے سے قریب تر ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ہم آسمانوں کے اوزون غلافوں کی بات زمین کی زراعتی اصطلاحوں میں کیسے واضح کریں۔ یہ وضاحت اور بھی مشکل ہو جاتی ہے جب ایک بالاتر حقیقت کو نچلے درجے کے نقطۂ نظر سے بیان کرنے کی کوشش کی جائے۔

مظاہر کی مدد سے بالاتر کی توضیح:

Explaining the Exalted from the Observable

مرئی کو غیر مرئی سے، ایمان کو بے اعتقادی سے اور مجرد کو ٹھوس کی مدد سے بیان کرنا کتنا مشکل ہے۔

اس کوشش میں آپ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں؟

باطن کو ظاہر سے کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟

کمرے کے فرش پر کھڑے ہو کر اس کی چھت پر کون نظر ڈال سکتا ہے؟

اور اگر آپ اس کی سائنس مرتب کرنا چاہیں تو کیسے کریں گے؟

Marfat.com

ظاہر ہے، جواب بالکل صاف ہے؛ وہی بالاتر حقیقت کو نچلے درجے کے نقطۂ نظر سے، نا قابلِ تجربہ کو تجربے کی زبان میں، مابعد الطبیعیاتی کو طبیعیاتی تناظر میں اور غائب کو حاضر کی مدد سے بیان کرنے کی کوشش۔ اس طرح کم از کم آپ کے پاس معلوم سے نا معلوم کی طرف بڑھنے کی ایک مضبوط بنیاد ضرور ہوتی ہے۔ اب تک ہماری سائنسی پیش رفت اسی طرح ہوتی رہی ہے اور فطرت کی یکساں روی پر پختہ یقین تمام جدید سائنسوں کے بنیادی اعتقادات میں سے ایک رہا ہے۔

معلوم کی مدد سے نا معلوم کا نظارہ:

Viewing the Unknown from the Known

سائنس دان ہمیشہ کمرے کے فرش پر بیٹھ کر اس کی چھت کے بارے میں اندازہ لگاتے ہیں۔ یقیناً چھت اور فرش میں کوئی غیر معمولی مشابہت یا ہم آہنگی ضرور پائی جاتی ہوگی جو سائنسی فرضیوں کی بنیاد بن سکے۔ معلوم سے نا معلوم کی طرف سے نا معلوم کی طرف بڑھنا ایک مسلمہ سائنسی طریق کار ہے اور ہم اسی کی پیروی کریں گے، حالاں کہ اس میں کئی خطرے بھی ہو سکتے ہیں؛ ہو سکتا ہے ہم غلط فہمی کا شکار ہو جائیں یا حقیقت کی غلط تعبیر کرنے لگیں۔ جیسے ابتدا میں مستشرقین (Orientalists) نے مشرقی تہذیب و ثقافت کے بارے میں بالکل غلط اندازے قائم کیے تھے؛ جاپان کے پبلک حمام کی روایت کو بد چلنی سمجھا جاتا تھا اور عمر خیام کی صوفیانہ رباعیات کو شراب اور عورت کے گرد گھومتی ہوئی لذت پرستانہ شاعری قرار دے دیا گیا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر بالاتر حقیقت کو جان بھی لیں تو اسے دوسروں کو سمجھانا ممکن نہیں کیوں کہ دوسروں کو سمجھانے کے لیے ایک مخصوص قسم کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔ آپ کا سچ اس وقت تک آپ کی ذات تک محدود اور دوسروں کے لیے نا قابل قبول رہتا ہے، جب تک آپ اسے مسلمہ، منظم اور مربوط طریقے سے بیان نہ کر دیں۔ آئن اسٹائن (Einstein) نے اپنی پوری عمر نوجوانی کے ایک وجدانی تجربے میں فاش ہونے والے سائنسی اسرار کی وضاحت میں صرف کر دی تھی۔

''ایڈو۔۔وو۔۔وو'' کی پکار:

Shrieking cries of "adow-wow-wow"

اگر اللہ سچ ہے؛ سب سچائیوں سے بڑا سچ۔ تو یقیناً کچھ معروف لوگوں کو اس سچ کا تجربہ حاصل ہوا ہوگا اور یہ

Marfat.com

لوگ صدیوں سے اللہ کو جانتے ہوں گے۔اسی لیے تو بنی نوع انسان کا زبانی اور تحریری ادب ''ایڈووووووووووووووووو'' کی پکار سے لبریز رہا ہے۔

ان میں سے کئی لوگوں نے اللہ کو بیان کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جوگیوں اور فقیروں، صوفیوں اور مہارشیوں کے باطنی فلسفے کسی عظیم ترین ہستی کو بیان کرنے کی کوشش نہیں تو اور کیا ہیں؟ ہر قوم اور ہر زبان میں ایسی تحریریں ملتی ہیں جو اس اسرار سے پردہ اٹھاتی ہیں۔مشرق اللہ کے تجربے سے مالا مال ہے لیکن اس اتنے بڑے علمی خزانے کو ''وجدانی اور غیر معروضی'' قرار دے کر اسے سائنس کے لیے ناقابلِ غور سمجھ لیا گیا ہے۔

سائنس۔اجتماعی جدوجہد کا گوشوارہ:

Science as the Balance Sheet of Cumulative Effort

سائنس دان ہر اس بات سے انکار کر دیتے ہیں جسے ثابت نہ کیا جا سکے اور جس کی تصدیق نہ ہو سکے۔ان کی اس بات میں بہت وزن ہے اور میں اس معاملے میں پوری طرح ان سے متفق ہوں۔کسی کو یہ اجازت نہیں دی جانی چاہیے کہ وہ مجھے بے وقوف بنا سکے۔کسی فرد کو یہ حق نہیں کہ وہ سائنس کے شاندار ایوانوں میں آویزاں اس عظیم علمی ذخیرے کا تمسخر اڑائے جو قابلِ تغیر لیکن غور و فکر سے متعین کردہ، احتیاط سے تصدیق شدہ اور باریک بینی سے مشاہدہ کیے جانے والے سائنسی قوانین کا مجموعہ ہے۔آخر ہم یہ حماقت کیسے کر سکتے ہیں کہ سائنس دانوں کی نسل در نسل کی مشقت اور ریاضت کو محض ایک آدمی کی ''بصیرت''، اس کے ''تخیل'' یا ''شاعرانہ پیغمبری'' کی خاطر جھٹلا دیں؟ ہرگز نہیں! ہم ایسا کبھی نہیں کر سکتے اور کسی کو بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ہمارا فرض ہے کہ اپنی سائنس کو ہر شے سے عزیز رکھیں اور اس کی قدر کریں۔سائنس تو بنی نوع انسان کی کئی نسلوں کی مشترکہ کاوشوں کا گوشوارہ ہے۔''حقیقت'' کو جاننے کے لیے اس کی صبر آزما جدوجہد کا ثمر۔ہم سائنس کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سائنس علم کی منزل کی طرف جانے والا معاشرتی راستہ ہے جب کہ وجدان ایک انفرادی مہم جوئی ہے۔سائنس آفاقی علم ہے اور یہی وجہ ہے کہ سائنس کو علم کے دیگر تمام ذرائع پر برتری حاصل رہی ہے۔سائنس دراصل ''اجماع'' کا نام ہے۔یہ ''سچائی'' کی تجربی میزان ہے۔تجربی (Empirical) طریق کار کے مطابق صرف تجربہ ہی وہ کلیدی پیمانہ ہے جس پر سچائی کو پرکھا جا سکتا ہے۔مابعد جدید اور مابعد صنعتی (Post-industria) (Post-modern and) دور میں مغربی تہذیب کی سب سے اہم

Marfat.com

اقدار، بنی نوع انسان کے مشترکہ تجربات(collective experience)، عملیت پسندی (pragmatism) اور تجربی طریق کار(empiricism) سے اخذ کی گئی ہیں۔ آزادی، مساوات، جمہوریت، خواتین کی خودمختاری، انسانی حقوق اور شہری سماج جیسی قدریں نہ تو کسی خداداد وجدان کا نتیجہ ہیں اور نہ خودفراموشی کی کیفیت میں دکھائی دینے والے مشکوک چھلاووں اور بے سروپا نظاروں کی دین۔ جی نہیں! یہ تو ہماری اپنی عزیز ترین متاع، ہمارے اپنے تجربات کا حاصل ہیں۔ یہ کئی عشروں پر محیط، ہماری عملی جدوجہد کی عظیم کامیابیاں ہیں۔ ہم نے اپنے معاشرے کی بنیادی ضروریات کو سمجھنے اور ان کا درست تعین کرنے کے لیے خون پسینہ ایک کردیا، تب کہیں جاکر ایک مہذب معاشرے میں زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہم نے بڑی محنت اور کوشش سے اپنے لیے تجرباتی طریق کار وضع کیا ہے، جو سراسر ہماری اپنی تخلیق ہے اور ہم نے اس کے لیے کتنی دشواریاں، کتنے مصائب سہے ہیں۔ علم کا راستہ آسان نہیں ہوتا۔ اسی لیے یہ طرزِ فکر ہماری پوری زندگی کا محور ہے۔ ہماری اخلاقیات، ہمارا آرٹ، ہماری ٹیکنالوجی، یہ سب اسی طرزِ فکر پر بنیاد رکھتی ہیں جس کی تصدیق ہم نے تجربی طریقے سے کرلی ہے۔ ہم کیسے کسی ناپختہ، فریب کار، طلسماتی تخیل، کسی غیر معتبر تکوینی نظریے اور وہم وگماں کے زائیدہ، خدا کے کسی پرفریب تصور کے ہاتھوں بے وقوف بن جائیں۔ ہماری طرف سے صاف انکار ہے؛ اب ہم کسی اور کے ہاتھوں، کسی اور طریقے سے دھوکہ کھانے کو تیار نہیں۔

لامرکز تکوینیات یا سائنسی قانون:

Acentric Cosmogony or Scientific Law

اللہ کا سائنسی اصول نہ تو کوئی روحانی، جادوئی منتر ہے، نہ کوئی انوکھا اور عجیب وغریب تکوینی نظریہ (Cosmogony)۔ یہ تو مجموعی تجربی سائنس کی بنیاد پر قائم کیا گیا کلیہ ہے جو ہماری جدید تہذیبی اقدار کا اثبات ہی نہیں، ان کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ میں یہاں *The Dawn of Magic* نامی کتاب کے مصنفین: لوئی غوویلز (Louis Rauwels:۱۹۲۰۔۱۹۹۷) اور ژاک بیرگیئے (Jacques Bergier:۱۹۱۲۔۱۹۷۸) کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۱۹۱۳ میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی، *The Glacial Cosmogony of Horbiger*۔ اس کتاب کا زیادہ حصہ ہاربگر نے خود ہی لکھا تھا۔ بہت جلد یہ کتاب ہٹلر کے عہدِ حکومت کے لیے آسمانی صحیفے کی

Marfat.com

طرح مقدس بن گئی۔ یہ کتاب کائنات کی تاریخ اور ارتقا کا جامع نقطۂ نظر پیش کرتی تھی۔ ہر سوال کا حتمی اور کامیاب جواب فراہم کرتی تھی۔ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟

یورپ اور ایشیا میں سواستکا (Swastika) ہمیشہ سے ایک جادوئی نشان سمجھا جاتا رہا ہے۔ ہٹلر اور اس کے مشیروں نے فیصلہ کیا کہ سواستکا کو اپنی نسلی پوترتا کی علامت کے طور پر ایک قومی نشان بنا لیں۔ اس نے اس نشان کو دائیں سے بائیں طرف الٹا دیا۔ ہٹلر نے جب اقتدار سنبھالا تو اس کا مقصد صرف حکومت کرنا ہی نہیں تھا، وہ انسانی زندگی میں تبدیلی لانا چاہتا تھا اور ایک برتر نسل کی تیز تر افزائش اور جینیاتی تبدیلی کا خواہش مند تھا۔ ایک ایسی نسل جو اعلا انسانی ضمیر کی حامل اور انسان نما دیوتاؤں (Demy-gods) پر مشتمل ہو۔ ہٹلر نے سائنس کے ہر اصول کو بھی الٹ دیا اور سائنس کو جادو اور جوتش کا غلام بنا دیا۔ تمام تر سائنسی شہادتوں کے برخلاف اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین محدب نہیں، مقعر ہے اور ہم گلوب کی بیرونی سطح پر نہیں، بل کہ اس کے اندرونی جانب رہتے ہیں۔ اس کا یہ نظریہ تاریخ اور تکوینی ارتقا کے متعلق ایک جامع نقطۂ نظر پر مبنی تھا۔ اس نظریے کی بنیاد برف اور آگ کے درمیان کبھی ختم نہ ہونے والے تصادم پر تھی۔ کشش اور گریز کی طاقتوں کے بیچ ایک مسلسل کشمکش۔ برف اور آگ کے درمیان یہ پیکار سیاروں کی پیدائش، موت اور دوبارہ پیدائش کا باعث بنتی ہے اور اسی کا عکس انسانوں کی روح میں بھی ہے۔ کائنات سے ہمارا ایک طلسماتی رشتہ ہے اور اگلی جینیاتی تبدیلی کے بعد انسان اس قابل ہو جائے گا کہ اس رشتے کو سمجھ سکے اور یوں وہ انسان نما دیوتاؤں (Demy-gods) میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس جینیاتی تبدیلی کی رفتار تیز کرنے کے لیے ہٹلر نے نسل کشی کا طریقہ استعمال کیا۔ اس کے نزدیک خانہ بدوش، حبشی اور یہودی صحیح معنوں میں انسان نہیں تھے بل کہ کائنات کی تخلیقی قوتوں کی بھول چوک کا نتیجہ تھے اور ہٹلر کے الفاظ میں، ''وہ ہم سے اتنے ہی دور ہیں جتنے جانور انسانوں سے۔''

یوں دنیا دو مختلف نقطہ ہائے نظر میں تقسیم ہو گئی۔ ایک انسانی نقطۂ نظر تھا اور دوسرا طلسماتی۔ ان دونوں کے درمیان مفاہمت ناممکن ہو گئی اور نتیجتاً دنیا ایک تباہ کن جنگ کا شکار ہوئی جو انسانی حافظے سے کبھی محو نہ ہو سکے گی۔ کوپرنیکس (Copernicus) اور ہٹلر (Hitler) کی کائناتیں ایک جیسی نہ تھیں۔ وہ ہر معاملے میں ایک دوسرے سے بالکل متضاد تھیں۔

''ان خوف ناک جنگوں کی بنیاد، جرمنی کے خلاف لڑنے کے لیے روایتی اور پرانے

Marfat.com

حریفوں کے محض عارضی اتحاد پر نہیں تھی۔ یہ پوری دنیا، واحد اور متحد دنیا کا، جو ترقی، انصاف، مساوات اور سائنس پر اعتقاد رکھتی ہے، ایک مشترکہ دشمن کے خلاف اتحاد تھا۔ اس متحد دنیا کا کائناتی نقطۂ نظر مشترک ہے، آفاقی قوانین کا فہم مشترک ہے اور کائنات میں انسان کے مقام کا تصور مشترک ہے۔ یہ مقام نہ تو بہت بلند و برتر اور ماورائی ہے اور نہ بہت حقیر اور پست۔ اس جنگ عظیم میں کامیابی دراصل ہماری انسان دوست تہذیب کی شیطانی اور طلسماتی تہذیب پر فتح کی علامت ہے۔ اس طلسماتی تہذیب پر فتح، جو انسان کے لیے نہیں بل کہ انسانوں سے برتر کسی مخلوق کے لیے تھی۔"

اس دوران متعدد معروف اور عظیم سائنس دانوں کو جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ آئن اسٹائن کے کارناموں پر خاک ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ جرمنوں نے عظیم یہودی سائنس دانوں، بل کہ پوری سائنس ہی کے خلاف ایک سرکاری مہم چلا دی۔

سرّی علوم کا احیا:
Resurgence of the Occult

یہ عجیب بدنصیبی ہے کہ جدید زمانے میں سرّی علوم، جادوئی عملیات، جعلی سائنس اور ضعیف الاعتقادی کا چلن ایک بار پھر مقبول ہوتے جا رہے ہیں اور دنیا بھر کی آبادی کا ایک کثیر حصہ ان توہمات کو اہمیت دینے لگا ہے۔ اس دور میں مخفی اور سرّی علوم کا احیا ہو رہا ہے جو یقیناً پریشان کن ہے۔ فغانسواز لے لوآنیز (Francoise le Loinnais) نے اپنی ایک مطالعاتی رپورٹ، *Une Maladie des Civilisations; les Fausses Sciences* (La Nef, No. 6 June 1954) میں جو اعداد و شمار دیے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں۔

صرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہی میں تیس ہزار نجومی موجود ہیں، علم نجوم پر مبنی بیس رسالے شائع ہوتے ہیں جن کی اشاعت کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ ہے اور دو ہزار سے زیادہ اخبارات میں علم نجوم سے متعلق کالم چھپتے ہیں۔ ۱۹۹۴ میں پینتیس (۳۵) ملین امریکیوں نے ان نجومیوں کی ہدایات پر عمل کیا اور اپنے مستقبل کے بارے میں جاننے کے لیے دو سو ملین ڈالر سالانہ کی رقم خرچ کی۔ فرانس میں چالیس ہزار سے زیادہ روحانی معالج

Marfat.com

اور پچاس ہزار سے زیادہ عامل اور غیب دان موجود ہیں اور صرف پیرس شہر میں ان معالجوں، عاملوں، غیب دانوں، نجومیوں اور جادوئی قوتوں کے حامل افراد کو ادا کی جانے والی رقم کا تخمینہ پچاس ملین فرانک سے زیادہ لگایا جاتا ہے۔ پورے فرانس کا مجموعی بجٹ، جو جادو ٹونے پر خرچ ہوتا ہے، سائنسی تحقیق کے بجٹ سے بھی زیادہ ہے۔ اب تک تو یہ اعداد و شمار اور زیادہ حیرت انگیز اور پریشان کن ہو چکے ہیں۔

سانپ ماریں مگر لاٹھی نہ توڑیں:

Dont throw the Baby with the Bath Tub

شاید اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس صورت حال پر سنجیدگی سے غور کریں۔ ''سائنس خود ہمیں دعوتِ فکر دے رہی ہے کہ ہم انسان کی پیچیدہ ذہنی ساخت پر ایک نئے زاویے سے نگاہ ڈالیں۔ اگر انسان ایسی طاقتوں کا مالک ہے جنھیں اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور اگر واقعی کوئی ایسی شے موجود ہے جسے ہم انسان کے برتر شعور سے تعبیر کرتے ہیں اور جس پر اعتقاد رکھنے کا رجحان بھی انسان میں بالعموم پایا جاتا ہے، تو ہمیں کسی ایسے فرضیے (Scientific Hypothesis) کو رد نہیں کرنا چاہیے جسے تجرباتی طور پر آزمایا جا سکے۔ ضعیف الاعتقادی، توہم پرستی اور جعلی سائنس کے خلاف مہم چلاتے ہوئے کسی غیر متنازعہ حقیقت یا بصیرت افروز تقابل کو بغیر سوچے سمجھے جھٹلانا مناسب نہ ہوگا۔ ایک انگریزی کہاوت ہے کہ باتھ ٹب خالی کرتے ہوئے دھیان رکھیے، کہیں آپ اس میں نہاتے ہوئے بچے کو نہ پھینک بیٹھیں۔''

اللہ بلاشبہ ایک حقیقت ہے۔ بلکہ تمام حقیقتوں کی حقیقت۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر اللہ کو ضرور ہماری اس مادی دنیا میں ظاہر ہونا چاہیے ورنہ پھر وہ غیر حقیقی سمجھا جائے گا۔ کسی کند ذہن کا واہمہ، اور بس۔ لیکن اگر اللہ ہر شے پر محیط، مقتدر اور اعلا و برتر ہستی ہے تو پھر اسے مادی و غیر مادی، حسی و تجریدی، اور وجود کی ہر سطح پر، ہر چیز میں تانے بانے کی طرح پیوست ہونا چاہیے۔ اللہ کی کوئی نہ کوئی تجربی شہادت (empirical evidence) ضرور ملنی چاہیے ورنہ وہ محض ایک تخیل، ایک کھوکھلا نظریہ تصور کیا جائے گا۔

Marfat.com

ہر سائنسی فرضیہ ابتدا میں محض اعتقاد ہوتا ہے:

Any Scientific Hypothesis is an Initial Act of Faith

سائنس بھی اعتقاد پر بنیاد رکھتی ہے۔ایک ایسے فرضیے پر اعتقاد جو کسی نظریے، کسی مجرد اصول، کسی سائنسی قضیے کو تشکیل دیتا ہے اور جو سائنس کے موروثی نظریات سے بھی ہم آہنگ ہوتا ہے۔ وہ موروثی سائنسی نظریات جنہیں اگلوں نے تشکیل دیا تھا اور جن پر سوال اٹھانا سائنس نے سیکھا ہی نہیں۔ جب سائنسی علم کی بنیاد بھی ایمان واعتقاد ہے، تو پھر خدا پر ایمان کیوں نہیں؟

سائنس دان بجا طور پر دلیل دیتے ہیں کہ سائنسی فرضیوں اور مسلمات پر ایمان لانا تو اس لیے ضروری ہے کیوں کہ یہ ہر ایک کے لیے با معنی ہوتے ہیں لیکن خدا کے سائنسی فرضیے پر ایمان لانا اس لیے غیر ضروری ہے کیوں کہ یہ سائنس دان کے لیے بے نتیجہ ہے۔ لہٰذا انھوں نے اسے ایک ناکام سائنسی تلاش قرار دے کر ترک کر رکھا ہے۔

کیا اللہ ایک سائنسی حقیقت ہے؟

Is Allah a Scientific Fact?

اگر اللہ حقیقی ہے تو دیگر تمام حقائق کی طرح اللہ بھی ایک سائنسی حقیقت ہے۔ بل کہ تمام حقیقتوں کی حقیقت ہے۔ وہ ہمارے گردوپیش کی دنیا میں ظاہر بھی ہے اور قابلِ مشاہدہ بھی۔ انسانی تجربے کا حصہ ہونے کے باعث وہ معلوم بھی ہے اور قابلِ تصدیق بھی۔ اعلاترین سائنسی قضیے کی حیثیت سے اللہ دراصل برتر سائنس ہے، جو بنی نوع انسان کے لیے گہرے معانی اور ہماری موجودہ سائنس کے لیے فیصلہ کن نتائج کی حامل ہے۔ اللہ اظہر من الشمس ہے؛ لیکن یوں کہ آشکار ہوتے ہوئے بھی پوشیدہ ہے۔

تو پھر ہم اللہ کی سائنس کا بیان کیسے کریں؟ یہ تو بالکل متضاد، بے محل، مبہم، مہمل اور ناممکن بات معلوم ہوتی ہے۔ یعنی دو متضاد انتہاؤں، اللہ اور سائنس کو یک جا کرنے کی کوشش۔ کیا یہ ممکن ہے؟ مرئی اور غیر مرئی، ٹھوس اور مجرد، ظاہر اور مخفی، طبعی سائنس اور غیر طبعی اللہ کیا کسی ایک سائنسی مساوات میں برابر ثابت کیے جا سکتے ہیں؟

اللہ تجربہ ہے۔ اللہ علم ہے۔ وہ ان گنت صدیوں سے انسان پر منکشف ہے۔ مشرق اللہ کے تجربے سے لبریز

Marfat.com

ہے۔تو پھر لازماً اللہ کو ہر زمانے کی مسلمہ سائنسی حقیقت بھی ہونا چاہیے۔لیکن ایسا ہے نہیں۔سائنس کی دنیا میں تو ابھی وہ پیدا بھی نہیں ہوا۔آخر کیوں؟

کیوں یہ دقیق عقدہ صرف ان پر کھلا ہے جو اسے مانتے ہیں؟ کیوں یہ معما عام انسانوں کی فہم سے بالاتر ہے؟ اور کیوں اللہ کا تصور راز داری اور اسرار کی دھند میں چھپا ہوا ہے؟ اگر اللہ سائنس ہے تو سائنسی علم میں راز داری کا کیا کام؟ لیکن صوفی، بزرگ، علمِ کیمیا کے ماہر، حکما، سب کے سب اپنے علوم کو مخفی رکھنے پر شدت سے اصرار کرتے ہیں، کیوں؟

سائنس اور راز داری:

Science and Secrecy

شاید ہم یہاں تاریخ اور طبعی سائنس کے ارتقا کے درمیان ایک ہم آہنگی تلاش کر سکتے ہیں۔جدید سائنس نے ہمیشہ علم کے پھیلاؤ سے نشو ونما پائی ہے اور اس سے فائدہ بھی اٹھایا ہے لیکن ایک خاص مرحلے پر آکر، جب اس کا سامنا بالاتر حقیقت سے ہوا تو اچانک اس نے راز دارانہ انداز اختیار کر لیا؛ جیسے نیوکلیر فزکس کے عمل انشقاق اور ادغام (fission and fusion) کے معاملے میں یا مادے میں پوشیدہ توانائی کے بارے میں۔ہمارے زمانے تک آتے آتے، سائنسی سرگرمی ایک خفیہ عمل بن چکی ہے اور اسے پوشیدہ رکھنے کی حکمت عملی روز بروز اور مضبوط ہوتی جارہی ہے۔سیاسی ایذا رسانی، سماجی حد بندیاں، تجارتی تقاضے، عسکری ضروریات، اخلاقی دباؤ اور یہ احساس کہ سائنس دان کی ذمہ داریاں بہت نازک اور حساس نوعیت کی ہیں، ان تمام باتوں کا نتیجہ یہی ہوگا کہ سائنس دان اپنی سرگرمیوں کو خفیہ رکھنے پر مجبور ہو جائے گا۔جیسے آخری طبعی عنصر ''یورینیم'' کے خواص پر کام کرتے ہوئے، سائنس دانوں نے اچانک پراسرار خاموشی اختیار کر لی اور راز دارانہ رویہ اپنالیا۔ہو سکتا ہے کہ مشرق کے صاحبِ بصیرت افراد جب اللہ کی بے پایاں قوتوں سے آشنا ہوئے تو انھوں نے بھی حقیقت کے اس پہلے اور آخری اصول کی بے پناہ طاقت اور اس کے غلط استعمال کے خوف سے، راز داری کا رویہ اختیار کر لیا ہو؟ آخر کیمیا گری کے ماہر بھی تو دھاتوں کو سونے میں بدلنے کے نام نہاد نادر و کم یاب نسخے کے معاملے میں گہری راز داری برتتے ہیں۔مشرق کا صوفی بھی حکایتوں، تمثیلوں، استعاروں اور قصے کہانیوں کی زبان میں بات کرتا ہے۔

Marfat.com

کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ اشوک اعظم نے جب ایک خونی جنگ کے دوران ہزاروں لوگوں کو تہ تیغ ہوتے دیکھا تو جنگ سے توبہ کر لی اور بدھ مذہب اختیار کر کے امن پسند بن گیا تھا۔ جنگ کی ہولناکیوں سے واقف ہونے کے بعد اس نے لوگوں کو اپنی ذہانت غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے روک دیا تھا۔ اس کے عہد میں طبعی سائنس کے معاملے میں انتہائی رازداری برتی جاتی رہی۔ یوں اس نے کرۂ ارض کے سب سے طاقتور خفیہ معاشرے کی بنیاد رکھی۔ اشوک کا عہد خاص طور پر وجد وانبساط اور روحانیت پر مبنی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ دو ہزار سال سے زیادہ عرصے تک، مادے سے لے کر ذہن اور روح کی ساخت تک، ہر قسم کی سائنسی تحقیق ممنوع قرار پائی اور اس نے صوفیانہ نقاب اوڑھ لیا۔ ذرا تصور کیجیے، جب مادے کا ایک ننھا سا ذرہ، طبعی دنیا کی سب سے چھوٹی اکائی، اپنے اندر ایسی ناقابلِ یقین توانائی کا ذخیرہ رکھتی ہے تو پھر انسان کے لیے کیا کچھ نہ ہوگا، اگر وہ اللہ کا راز پالے، جو آخری اور مطلق حقیقت ہے۔

تاہم اس کے علاوہ بھی کچھ اسباب ہو سکتے ہیں۔

شعور کی ذہن کو درہم برہم کر دینے والی تبدیلیاں:

Mind-Blowing alteration of Consciousness

اگر ہم ایل ایس ڈی یا ہیروئن لیں تو یہ ہمارے ذہن کا فیوز اڑا کر رکھ دے گی اور شعور کی حالت میں تبدیلی پیدا کر دے گی۔ مگر یہ کیفیت محض ایک التباس، ایک عارضی فریب ہوگی۔ اللہ کا تجربہ بھی ہے تو کچھ ایسا ہی، بس وہ التباس نہیں۔ نشہ آور اشیا کا اثر ایک عارضی فریب ہے مگر اللہ کا تجربہ ہماری ذہنی کیفیت کو دائمی طور پر متاثر کرتا ہے اور ہمیشہ کے لیے ہمارے شعور کو بدل دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنا بڑا تجربہ اگر اچانک درپیش آئے تو سنگین خطرات لاحق ہو سکتے ہیں، اور کوئی بھی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ انسان کو اس تجربے سے گزرنے کے لیے مضبوط سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ نئی آگاہی، حقیقت کی برتر سطح پر ایک نئے جنم کے مترادف ہے۔ یہ ایک خاص حد سے گزر جانے، ایک دہلیز کو پار کر جانے اور کایا کلپ ہو جانے کا تجربہ ہے۔

یہ ایک طرح کی قلب ماہیت ہے۔ اگر وہ اس ابتدائی تجربے کے پرخطر نتائج سے صحیح سلامت گزر جائے اور حقیقتِ عظمیٰ سے اپنا تعلق برقرار رکھے تو وہ سالک ہے اور اگر اس سے مغلوب ہو کر بے خود ہو جائے تو مجذوب۔ مجذوب اسے کہتے ہیں جو کسی خاص نفسی کیفیت میں جذب ہو کر اپنا شعور کھو بیٹھے اور اس کی سدھ بدھ

Marfat.com

جاتی رہے۔

سالک کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اسے حقیقتِ عظمیٰ کی جو آگہی ملتی ہے، اسے پوری طرح دوسروں کے سامنے بیان کر سکے۔ شاید کئی لوگوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی ہوگی مگر کوئی ان کی بات سمجھ میں ہی نہ سکا کیوں کہ دوسرے اس تجربے اور کیفیت سے آشنا نہیں تھے۔ اس عمل کی ایک مشابہت حیاتیاتی ارتقا کے سفر میں دیکھی جا سکتی ہے جس کے دوران کسی نوع میں ایسا تغیر (Transmutation) رونما ہوتا ہے کہ ایک بالکل نئی نوع (Species) وجود میں آ جاتی ہے۔ حیاتیاتی ارتقا کے اس اصول کو انسان کے ذہنی ارتقا پر لاگو کریں تو گویا انسانی آگاہی ایک نئی نوع کی کائناتی آگاہی سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ایک نیا جنم ہے۔ انسانی ذہن کی وجود کی ایک برتر سطح تک رسائی ہے۔ عظیم تر آگہی ہے۔

اس عمل کو سوشیالوجی اور انتھروپولوجی کے ماہرین کی کسی ایسی کیس سٹڈی کی مدد سے شاید زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکے، جس کے دوران ایک قدیم، روایتی، قبائلی شخص کو، جس نے کبھی ریل گاڑی، جہاز، ٹیلی فون یا ٹیلی ویژن نہ دیکھا ہو، اچانک نیویارک جیسے کسی بڑے شہر میں بھیج دیا جائے اور اس کے ردِعمل کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ سفر اس شخص کے لیے مکانی نہیں زمانی ہوگا۔ یعنی وہ اپنے وقت سے سینکڑوں برس آگے نکل آئے گا۔ حقیقت کی ایک اور سطح کے بے نقاب ہونے کے اس حیران کن تجربے پر وہ کیا ردِعمل ظاہر کرے گا، کیسے اس کے اثرات کو جذب کر پائے گا، اور کیا سمجھے گا؟ کوئی بھی ماہرِ نفسیات بتا سکتا ہے کہ اس سارے عمل میں کتنے خطرات مضمر ہیں۔ یہ حقیقت میں ذہن کا فیوز اڑ جانے کے مترادف ہے۔ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں اور بہت دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ اگر یہ شخص اس تجربے کے ابتدائی تحیر کے صدمات سہہ جائے اور واپس اپنے قبیلے میں جا پہنچے تو اپنے لوگوں کو کیسے ہماری ٹیکنالوجی کے معجزات: ریل گاڑی، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون کے بارے میں بتائے گا۔ کیا اس کے قبیلے کے لوگ اس پر یقین کر لیں گے؟ اس سے بھی پہلے یہ کہ کیا وہ انھیں سمجھا بھی پائے گا کہ اس نے کیا دیکھا تھا؟

ہو سکتا ہے کہ یہ سب دیومالائی قصے، ناقابلِ یقین معجزے اور ان ہونیاں، کشف و کرامات، حکایات اور تمثیلیں، مشرق کے صوفیوں اور اولیا کی کہانیاں بھی کسی برتر حقیقت کو بیان کرنے کی ایک کوشش ہی ہوں؛ کسی ایسی ماورائی دنیا کی حقیقت جہاں روح کی پرواز (Astral traveling)، ٹیلی پیتھی (Telepathy) اور غیر حسی تجربات و مشاہدات (Clairvoyance) بھی اتنے ہی حقیقی ہوں جتنے ہماری اس سائنسی دنیا میں

Marfat.com

ہوائی جہاز، ٹیلی فون اور ٹیلی ویژن حقیقی ہیں۔

کلیت؛ مقامِ ''الف'':

Wholeness, the Point Aleph

جب ہم دہلیز پار کر جاتے ہیں تو ہمارے شعور میں تغیر رونما ہوتا ہے اور وہ ایک اعلا تر حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہم خود کو ہلکا پھلکا اور لطیف تر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ 'لطافت' وہ اصطلاح ہے جسے ہم اپنی ثقافت کے نفیس ترین اور انتہائی ترقی یافتہ پہلو کے اظہار کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس نئے، لطیف تر، ملکوتی احساس کے ساتھ، جو زمین کی گرفت سے آزاد ہو جانے اور ہوا بھرے غبارے کی طرح آہستہ آہستہ بلندی کی طرف بڑھنے کی کیفیت سے مشابہ ہے، ہم حقیقت کا ایک نیا، کلی رُخ دیکھنے لگتے ہیں۔ پھر ہم اشیا کو باہم ترکیب دینے لگتے ہیں، انھیں زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور ان کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر بدلنے لگتا ہے۔ ہم انھیں کسی عظیم کلیت (Holism) کا، جو در حقیقت ہر شے کی اصل اور بنیاد ہے، جز و سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی مقام ہے جو بیک وقت ہر شے کی ابتدا بھی ہے۔ اس مقام کو مشرق کے عارفوں نے ''الف'' کی مدد سے بیان کیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سب تضادات اور کثرت کے تمام مظاہر **وحدت** کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ مشرق کے صوفیوں اور عارفوں نے اس تجربے کو وحدت الوجود کا نام دیا ہے۔ شعور کے اسی مقام پر ہم اللہ کا تجربہ کرتے ہیں؛ جو واحد ہے، یکتا ہے، کون و مکاں پر محیط ہے۔ تمام تر تنوع، ساری نیرنگیاں، اس تن تنہا حقیقت سے بہت دور نیچے کہیں رہ جاتی ہیں؛ جیسے زمین سے جتنا اوپر اٹھیں، ماحول کی کثافتیں اور آلودگیاں اتنی ہی کم ہوتی جاتی ہیں۔ اکسیر گری کے قدیم نسخوں میں بھی اس عمل کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ کیمیا گری کی یہ شدید محنت دراصل خود کیمیا گر کی تطہیر کا باعث بن جاتی ہے۔ عملِ کیمیا کے پردے میں وہ خود اپنے شعور کے ارتقا کے ذریعے اپنی کایا کلپ چاہتا ہے۔ وہ دھات کو نہیں، خود کو سونا بنانے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ یہیں آ کر کیمیا گر کو حقیقی علم حاصل ہوتا ہے اور وہ مادے، توانائی، ٹیکنالوجی اور سب سے بڑھ کر خود اپنی ذات کے کلیدی نکتے کو پا لیتا ہے۔ شاید یہی وہ نکتہ، وہ علم ہے جو ہماری تیز رفتار تہذیبی ترقی کی آخری منزل ہے۔

Marfat.com

سائنسی تعمیم، کئی کو ایک میں ڈھالنے کا نام ہے:

Scientific Generalization is a process of reducing many to one

کوئی بھی سائنسی تعمیم (Generalization) اصل میں ایک نقطۂ نظر ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے دنیا کی نیرنگیاں ہیں جن کی کثرت ہمیں الجھن میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ہمیں فکری، سائنسی اور نظریاتی، ہر اعتبار سے ایک ایسا نقطۂ نظر وضع کرنے، ایک ایسا نظریہ تشکیل دینے اور ایک ایسا عمومی کلیہ بنانے کی ضرورت ہے جس کی مدد سے ہم اس بکھیر دینے، ٹکڑوں میں تقسیم کر دینے والی، پریشان کن کثرت سے نجات حاصل کر سکیں۔ اس نیرنگی کے پیچھے چھپی ہوئی سادگی اور یک رنگی کو محسوس کر سکیں۔ سائنس بھی تو کسی ایسے ہی عمومی کلیے یا سائنسی قانون کی تلاش میں ہے اور یہ کلیہ کئی کو ایک میں بدل دینے سے ہی ہاتھ آ سکتا ہے۔ اس نو دریافت شدہ ''ایک'' میں ہر شے شامل ہوتی ہے اور اسی لیے اس کا اطلاق ہر شے پر ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ یہی تمام تر سائنس کی بنیاد ہے، ایک اعلاتر عمومی کلیے کی تلاش، ایک اعلاتر نقطۂ نظر کی جستجو، جس کی مدد سے زیادہ سے زیادہ حقائق کو اتنی ہی آسانی سے سمجھا جا سکے جیسے کسی سائنسی کلیے کی مدد سے پیچیدہ حقائق کو سمجھا جاتا ہے۔ گویا سائنسی کلیہ بھی اصل میں ایک اعلاتر نقطۂ نظر ہوتا ہے؛ بالکل ''الف'' کی طرح جو ایک صوفی، ایک عارف کی نظر میں کثرت اور نیرنگی کے پیدا کردہ تضادات کو وحدت کی مدد سے حل کر دیتا ہے۔ جدید دور کے ایک فلسفی ولیم جیمز نے بھی تو یہی کہا ہے:

> ''اس انکشاف سے حاصل ہونے والی مسرت؛ کہ حقائق کی یہ انتشار انگیز کثرت دراصل ایک ہی پوشیدہ حقیقت کا اظہار ہے، کسی موسیقار کی اس طمانیت اور آسودگی کے مترادف ہے جو بالآخر بے ہنگم آوازوں کے شور کو ایک مترنم نغمے میں بدلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔''

فلسفہ اور سائنس بھی شدت سے ایسے ہی کسی ایک نکتے کے متلاشی رہے ہیں جس کی بنیاد پر تمام تر تضادات کو حل کر دینے والا نظریہ تشکیل دیا جا سکے۔ تاہم دورِ آخر کے فلسفیوں نے اپنی یہ تلاش بے سود ذہنی کاوش سمجھ کر ترک کر دی اور ہماری سائنس بھی اس جستجو سے منہ موڑ کر ٹیکنالوجی کی نت نئی ایجادات میں مگن ہو گئی۔ البتہ دوسری طرف طبعی ریاضیاتی تحقیق (Physico-mathematical research) آئن سٹائن (Einstein) کے بعد سے کسی ایسے قانون کی تلاش میں رہی ہے جس کی مدد سے تمام کائناتی قوتوں مثلاً کشش ثقل، برقی مقناطیسی لہروں، روشنی اور جوہری توانائی کا سراغ لگایا جا سکے۔

Marfat.com

تشریح وتوضیح کیسے ہو؟

How to Explain?

تو پھر ہم اس اعلاتر حقیقت کی تشریح وتوضیح کیسے کر سکتے ہیں؟ وحدت کو کثرت کی مدد سے کیسے بیان کر سکتے ہیں؟ خطِ مستقیم سے دائرہ کیسے بنا کر دکھا سکتے ہیں؟

اللہ ایک ماورائی حقیقت ہے۔ نادیدہ اور ناقابلِ بیان۔ صرف ایک باطنی تجربہ۔ ہم وجدانی طور پر اسے سمجھتے ہیں مگر عقلی طریقے سے اس کی وضاحت نہیں کر سکتے۔ اسے بیان کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں کہ حسی اصطلاحات کا سہارا لیا جائے اور وہ بھی صرف اس قدر کہ جس حد تک وہ دنیاوی مظاہر اور موجودات کی کثرت میں رونما ہوتا ہے۔ اللہ کو ان مظاہر کے ذریعے بیان کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا ایکس ریز کا تجزیہ کرنا یا روشنی کی غیر مرئی لہروں کو مرئی رنگوں کی مدد سے بیان کرنے کی کوشش کرنا یا نہاں کو عیاں کی اصطلاحات میں سمجھنا۔ تو کیا ہم نے اسی کام کا بیڑا اٹھایا ہے؟

اس مہم جوئی کا بے ثمر ہونا کتنا ہی واضح کیوں نہ ہو، مگر ہماری سائنس میں اس عمل کی مسلمہ مثال ملتی ہے۔ طبعی اور حیاتیاتی سائنس نامعلوم حقیقت کو معلوم حقائق کی مدد سے بیان کرتی ہے۔ لہٰذا ہم بھی اللہ کا سائنسی اصول بیان کرتے ہوئے اسی مسلمہ قانون کی پیروی کریں گے۔

یہ مشق خواہ کتنی ہی بے وقعت کیوں نہ ہو، بالکل بے نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ آخر یہ بھی تو ہوا ہے کہ پودوں اور جانوروں کے برتاؤ اور طرزِ عمل کے مطالعے اور علم و تجربے نے انسانوں کے بارے میں بھی حیران کن علم فراہم کیا ہے۔ ہماری سائنس نے زندگی کی کم تر صورتوں کے مطالعے کی مدد سے کافی کچھ سیکھا ہے۔ اسی طریقے سے سائنس دان انسان کی حیات، جسمانی ساخت، ذہن اور برتاؤ کو سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی تو ممکن ہے کہ انسانی ذہن، شعور اور برتاؤ کا مطالعہ کر کے اللہ کی زیادہ بہتر آگہی حاصل کی جا سکے۔ شاید اسی سے اس بات کی وضاحت بھی ہو جائے کہ کیوں خود آگہی (Know Thyself) اور خود شناسی کو انسانی علم، فلسفے اور مذاہب کا عظیم ترین مقصد سمجھا جاتا رہا ہے۔

یہ مقالہ اللہ کے تصور کو سائنسی انداز میں پیش کرنے اور وحدت کا سائنسی اصول بیان کرنے کی پہلی کوشش ہے۔ اس مقصد کے لیے میں نے سائنسی طریق کار کی سختی سے پیروی کی ہے اور جدید سائنس کی تمام دریافتوں،

Marfat.com

مسلمہ نظریوں اور حقائق کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سائنسی اصطلاحات کو ہر ممکن حد تک ترک کرتے ہوئے، اپنے نتائج کو زیادہ سے زیادہ عام فہم زبان میں پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے تا کہ ہر شخص اسے سمجھ سکے۔ یہ اللہ کا ایسا سائنسی قانون مرتب کرنے کی کوشش ہے جو آسان زبان میں ہو، جسے مذہب، فلسفے، سائنس اور آرٹ، ہر شعبے میں لاگو کیا جا سکے اور جو ایک بین العلومی اندازِ نظر اور تمام علوم کے لیے ایک مشترکہ بنیاد فراہم کر سکے۔ کوئی مطلق صداقت نہیں بلکہ ایک سائنسی قانون۔ ایک مفید اور کارآمد فرضیہ (Hypothesis)۔

Marfat.com

Marfat.com

دوسرا باب

خدا کا روایتی تصور بکھر چکا ہے

اگر خدا حقیقت ہے
تو وہ زندگی کی سب سے اہم چیز ہے۔
ورنہ محض ایک سراب۔۔۔

Marfat.com

Marfat.com

خدا کا روایتی تصور بکھر چکا ہے:

Conventional Image of God is Shattered

انسان کی فکری دریافتوں کے ارتقا پر نظر ڈالتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ جوں جوں انسان ترقی کرتا جاتا ہے، حقیقت کے بارے میں اپنے علم پر نظر ثانی کرتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر آسمانی اجسام کے بارے میں اس کے خیالات و تصورات اس کے علم کی نوعیت کے مطابق وقتاً فوقتاً بدلتے رہے ہیں۔ قدیم مصری نہایت خلوص سے یقین رکھتے تھے کہ ستارے دراصل دیوتاؤں کی روشن کی ہوئی لالٹینیں ہیں جنھیں وہ ایک رسی سے باندھ کر رات کو باہر لٹکا دیتے ہیں اور صبح سویرے رسی کھینچ کر انھیں بجھا دیتے ہیں۔ یہ تو بالکل قریب ہی کی بات ہے جب انسان کو پہلی بار علم فلکیات کی روشنی میں آسمانوں کی وسعت اور نامعلوم سرحدوں تک پھیلے ہوئے خلاؤں کی بے کرانی کا کچھ اندازہ ہوا ہے۔ پھر بھی یہ بات یقینی ہے کہ آنے والے سالوں میں اس علم میں اور بھی اضافہ ہو گا۔ آج ستاروں کے بارے میں قدیم مصریوں، حتیٰ کہ سولھویں صدی تک کے لوگوں کے تصورات بھی ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔

عظیم تخلیقی منصوبہ:

The Grand Design

جدید فزکس کا بانی اسحاق نیوٹن (Isaac Newton) انتہائی مذہبی آدمی تھا۔ اس نے صرف چند دہائیاں پہلے ہی کائنات کے عظیم تخلیقی منصوبے کا مشاہدہ کیا اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ کائنات جو مستقل، قابلِ پیش گوئی (predictable) اور متعین قوانین کے تابع ہے، کسی انتشار اور بے ترتیبی سے خود بخود نہیں پھوٹی بلکہ اسے خدا نے تخلیق کیا ہے۔ اسی بنیاد پر عظیم سائنس دان البرٹ آئن اسٹائن (Albert Einstien) نے

Marfat.com

اپنا عہد ساز نظریہ اضافیت (Theory of Relativity) قائم کیا جو کشش ثقل اور وسیع تر کائناتی سرگرمیوں کے بیرونی منظر سے متعلق تھا۔ تاہم جلد ہی کوانٹم فزکس کی نئی دریافتوں نے، جو ایٹم کے اندرونی اور تحتِ ایٹم (sub-atomicl level) منظر سے متعلق تھیں، نئے حقائق آشکار کر دیے۔ ان نئے حقائق نے جو حقیقت کی خارجی اور وسیع ترین کائناتی سطح کے مقابلے میں اس کے اندرونی، خفیف ترین، خردبینی پہلو سے متعلق تھے، یہ انکشاف کیا کہ حقیقت اپنے باطن میں ناقابل پیش گوئی، غیر یقینی، غیر متعین اور منتشر ہے۔ اس دریافت نے بے چارے آئن اسٹائن کے تنظیم و ترتیب کے خوگر ذہن کو چکرا کر رکھ دیا۔ وہ یہ قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو سکا کہ حقیقت ایسی غیر مستقل بھی ہو سکتی ہے کہ بیک وقت قابلِ پیش گوئی (predictable) بھی ہو اور غیر یقینی (uncertain) بھی۔ چناں چہ آئن اسٹائن نے اپنی باقی ماندہ زندگی الگ تھلگ ہو کر، اس بات پر غور کرتے ہوئے گزار دی کہ کلاسیکی نظریہ اضافیت (Theory of Relativity) کو کوانٹم فزکس کے نئے قانونِ غیر یقینیت (Law of Uncertainty) سے ہم آہنگ کیسے کیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ فزکس کی چاروں مختلف قوتوں کو ہم آہنگ کر دینے والا کوئی نہ کوئی نظریۂ وحدت (Unification Theory) ضرور ہو گا۔ اسی مبہم نظریے کو تلاش کرتے کرتے وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اسی اثنا میں ماہرینِ طبیعیات ہائزن برگ (Heisenberg) اور نیلز بور (Neils Bohr) نے حقیقت کی خردبینی، خفیف ترین، تحتِ ایٹم (Sub-atomic) سطحوں کی چھان بین جاری رکھی اور اس کے نتیجے میں کائنات کی ایک ایسی حیران کن تصویر سامنے آئی جس نے کلاسیکی نیوٹنی تصورات کے پرخچے اڑا دیے۔ حقیقت غیر یقینی، غیر متعین اور غیر مرئی موج (Wave) بھی تھی اور مرئی اور قابلِ تعین ذرہ (Particle) بھی۔ یہ حقیقت لامحدود اور ان گنت امکانات کا ذخیرہ تھی جو بیک وقت وجود رکھتے تھے اور کسی واحد کائنات (Universie) کی بجائے کثیر کائنات (Multiverse) کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ کائنات کے سائنسی ماڈلوں میں تیز رفتار اور انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ اب ماہرینِ طبیعیات کو یقین ہونے لگا کہ حقیقت کے صرف تین ابعاد (Dimensions) نہیں ہیں جن کے ساتھ چوتھا بُعد زمان یا وقت (Time) سمجھا جاتا تھا۔ حقیقت کے ابعاد کی تعداد دس بارہ، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہو سکتی ہے۔ ایسے بہت سے نظریات وجود میں آ گئے جن کے کئی پہلو ایک دوسرے سے مشترک اور ہم آہنگ تھے اور جو اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے متعلق تھے کہ اب ہمیں اس کثیر کائنات (Multiverse) کو کیا نام دینا چاہیے۔ اسے ایم تھیوری (M-Theory) کہا جاتا

Marfat.com

ہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۸ میں سٹیفن ہاکنگ (Stephan Hawking) کو اپنی کتاب A Brief History of Time کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل ہوگئی۔ اس کتاب میں کائنات کی ابتدا، بلیک ہول (Black Hole) کوانٹم قوتِ ثقل اور تکوینیات (Cosmology) کا مفصل بیان ملتا ہے۔ سٹیفن ہاکنگ نے لکھا ہے: ''اگر ہم ایک مکمل نظریہ دریافت کر لیں تو یہ انسانی فکر کی عظیم ترین کامیابی ہوگی کیوں کہ پھر ہم خدا کے ذہن تک رسائی حاصل کر لیں گے''۔

بیس برس بعد اپنی نئی کتاب The Grand Design میں، جو انھوں نے ایک امریکی ماہرِ طبیعیات لیونارڈ موڈی نوف (Leonard Mlodinov) کے اشتراک سے تصنیف کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ یہ کائنات خدا کی تخلیق کردہ نہیں ہے اور 'بگ بینگ' (Big Bang) محض فزکس کے قوانین کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ چوں کہ قوتِ ثقل جیسا قانون موجود ہے لہٰذا کائنات خود بخود عدم سے وجود میں آتی رہے گی۔ یوں خالقِ کائنات کا وجود اور تصور بے معنی ہو جاتے ہیں۔ انھیں اعتراف ہے کہ یہ از خود یا بے ساختہ تخلیق (Spontaneous Creation) ہی ہے جس کی وجہ سے معدومیت کی بجائے کچھ موجود ہے، جس کے باعث ہم بھی وجود رکھتے ہیں اور یہ کائنات بھی۔

لاس اینجلس ٹائمز کے میخائل مورکوک (Michael Moorcock) اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ ہاکنگ نے اپنے نظریے پر تنقید کے جواب میں کہا، ''کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ خدا موجود نہیں ہے۔ لیکن سائنس خدا کو غیر ضروری بنا دیتی ہے''۔ نظریہ ارتقا (Evolution) پر یقین رکھنے والے کئی ماہرینِ حیاتیات اور منکرینِ خدا (Atheist) نے جن میں معروف سائنس دان رچرڈ ڈاکنز (Richard Dawkins) بھی شامل ہیں، ہاکنگ کے نقطۂ نظر کو سراہا ہے اور بہ بانگِ دہل اعلان کیا ہے کہ 'ڈارونیت نے خدا کو حیاتیات سے باہر نکال پھینکا تھا لیکن فزکس میں وہ باقی رہا۔ اب ہاکنگ نے اسے آخری دھکہ دے ڈالا ہے'۔ The Grand Design کے مصنفین کا کہنا ہے کہ آئن اسٹائن نے کائنات کے پہلے ماڈلوں کی بنیاد پر جس نظریہ وحدت (*Unified Field Theory*) کی موجودگی کا ذکر کیا تھا، وہ شاید وجود نہیں رکھتا۔ اس کتاب میں سائنسی علم کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور کثیر کائنات (Multiverse) کی بھی وضاحت کی گئی ہے جو ایک ابھرتی ہوئی ایم تھیوری (M-Theory) ہے اور حقیقت کے کثیر الابعاد ہونے کا اعلان کرتی ہے۔

Marfat.com

ڈاکٹر مارسیلو گلیزر (Dr. Marcelo Gleiser) اپنے مضمون Hawking and God: An Intimate Relationship میں لکھتے ہیں، ''کسی قطعی نظریے کے بارے میں سوچ بچار کرنا فزکس کے بنیادی جوہر سے میل نہیں کھاتا۔ فزکس ایک تجربی (Empirical) سائنس ہے جو بتدریج معلومات جمع کرنے پر بنیاد رکھتی ہے۔ چوں کہ ہمارے پاس ایسے آلات نہیں ہیں جو پورے عالمِ فطرت کی پیائش کر سکیں اس لیے ہمیں کبھی یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتا کہ ہم نے ایک قطعی نظریہ وضع کر لیا ہے یا نہیں۔ لہٰذا حیران کن اور غیر متوقع انکشافات کا امکان ہمیشہ موجود رہے گا اور فزکس کی تاریخ میں ایسے مواقع کئی بار آ چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کا یہ سمجھ بیٹھنا کہ انسان ایسا کوئی قطعی نظریہ وضع کر سکتے ہیں، محض لاف زنی معلوم ہوتا ہے۔ ہاکنگ کو چاہیے کہ خدا کا پیچھا چھوڑ دے''۔

آج کی صداقت کل غلطی ثابت ہو سکتی ہے:
Today's Truth is Tomorrow's Error

حقیقت تبدیل نہ ہو تو بھی حقیقت کے بارے میں انسان کا تصور ضرور تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اگر خدا ایک ناقابلِ تغیر حقیقت ہے تو انسان کا اس کے بارے میں فہم و ادراک، نت نئی دریافتوں کی روشنی میں بدلتے رہنا چاہیے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سائنسی نظریات کی بنیاد ابتدا میں جن اصولوں پر قائم ہوئی وہ غلط نکلے اور بعد میں انھیں درست کیا گیا۔ اسی بنا پر ہم یہ بھی فرض کر سکتے ہیں کہ جدید سائنس کی کچھ بنیادی سچائیاں اور مفروضے شاید مستقبل میں غلط ثابت ہو جائیں۔ اگر خدا کے بارے میں ہمارا روایتی تصور ٹوٹ چکا ہے تو شاید اس کا بھی یہی مطلب ہو کہ یہ تصور غلط بنیاد پر قائم کیا گیا تھا اور اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ انسان کی سچائی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ آج کی صداقت کل غلطی ثابت ہو سکتی ہے اور یہ سائنس کا اصول ہے۔ ہمیں سائنسی دریافتوں اور انسان کے جدید علم کی روشنی میں، خدا کے بارے میں اپنے تصور کی ترمیم و اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ خدا کا تصور محض ایک سراب ثابت ہوگا۔ جدید دنیا کا ایک بے سروپا جذباتی تصور۔۔۔ اور کچھ نہیں۔

Marfat.com

ماقبل سائنس کا تصورِ خدا آج مؤثر نہیں:

The image of God built by a pre-scientific man can no longer hold

تصورات میں رونما ہونے والی یہ مسلسل تبدیلی، حقیقت کی یافت اور بازیافت کا یہ مسلسل عمل ایک امرِ واقعہ ہے جو اوزاروں کی ایجاد سے لے کر سائنسی نظریات اور فلسفیانہ تصورات تک، ہر چیز سے متعلق رہا ہے۔ مثلاً پیغامات کی ترسیل کے لیے پہلے گھڑسواروں سے کام لیا جاتا تھا، پھر ڈاک کا نظام متعارف ہوا، وائرلیس کا رواج ہوا اور اب یہ برقی ذرائع سے تبدیل ہو گیا ہے۔ اسی طرح زمین نرم کرنے کی ضرورت تو اب بھی اسی طرح موجود ہے لیکن اس کام کے لیے اب لکڑی کا ہل استعمال نہیں کیا جاتا بل کہ زیادہ پیچیدہ اور بہتر ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔ تصورات ہوں یا آلات، انھیں مسلسل ترمیم واصلاح کی ضرورت رہتی ہے۔ خدا کے تصور کا بھی یہی معاملہ ہے۔ قبل از سائنس کے زمانے میں تشکیل پانے والا تصورِ خدا اب کارگر نہیں ہو سکتا۔

سیدھے سادے الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ جدید دور کی الجھن یہ ہے کہ ہماری اندرونی ضرورت تو ابھی موجود ہے مگر خدا کا تصور وہی ہے جو ہم نے جاگیردارانہ ورثے میں حاصل کیا تھا اور

جواب مزید ہمارا ساتھ دے نہیں سکتا۔

> ''ان سب باتوں کے پس پشت کسی عقیدے کا ہونا لازمی ہے، یعنی روزمرہ کی عام فہم زبان میں بیان کردہ ایک بنیادی تصور جو دنیا کے بارے میں ہمارے جدید علم سے متصادم نہ ہو۔ ہم سانپوں، انجیر کے پتوں اور قربانی کی بھیڑوں جیسے تصورات سے گزارہ نہیں کر سکتے۔
>
> جی نہیں جناب! ہم تو ایسا عقیدہ چاہتے ہیں جسے جدید زبان میں بیان کیا جا سکے۔''

یہ ہیں وہ جملے جو ایچ جی ویلز کے ناول *Babes in the Darkling Wood* کا ایک نوجوان اور مذبذب شاگرد اپنے شہر کے ایک پادری کے سامنے ادا کرتا ہے۔ یہ بیسویں صدی کے انسان کے روحانی بحران کا واشگاف اظہار ہے۔

Marfat.com

خدا کے بارے میں طفلانہ رویّے ابھی تک قائم ہیں:
Infantile attitudes towards God persist

اگر میں دن میں دو مرتبہ اپنے دانت صاف کرتا ہوں یا ٹریفک قوانین کی پابندی کرتے ہوئے ہمیشہ سڑک کے دائیں جانب گاڑی چلاتا ہوں تو اس سے خدا کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ لیکن مجھے یاد ہے جن دنوں میں چھوٹا سا بچہ تھا؛ جب بھی اپنے دانت صاف کرتا تھا، فوراً اپنی ماں کے پاس جا کر شاباش ضرور حاصل کرتا تھا جیسے میں نے ان کی کوئی خدمت سرانجام دی ہو۔ اسی طرح اگر ہم اجتماعی عبادت میں شریک ہوتے ہیں، اتوار کو گرجے یا جمعے کو مسجد جاتے ہیں تو خدا کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ خدا کے متعلق ہمارے بہت سے طفلانہ رویے بلوغت کے بعد بھی قائم رہتے ہیں۔ ابھی تک خدا کے بارے میں ہماری سوچ، طرزِ فکر و عمل، رویے اور کردار میں قبائلی رسوم، معاشرتی رواج، ثقافتی اقدار، سماجی روایات کے اثرات نظر آتے ہیں۔

ان اثرات سے سائنس دان بھی محفوظ نہیں کیوں کہ آخر کار وہ بھی انسان ہیں اور اپنے سماجی و معاشرتی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ سائنسی فکر ہمیشہ اپنے عصر کی ترجمانی کی طرف مائل رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تصورات اور تمثیلیں ہمارے معاشرتی اور فکری ماحول سے ہی پھوٹتے ہیں؛ ان کے ثبوت بعد میں تلاش کیے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ بات اور بھی ضروری ہے کہ ہمارے عہد میں خدا کا تصور ہمارے معاصر سائنسی نظریات سے ہم آہنگ ہو اور نظریۂ ارتقا (Evolution)، کثیر کائنات (Multiverse) اور جدید طبیعیات (New Physics) کی تازہ ترین تحقیقات پر محیط ہو۔ خدا کے بارے میں طفلانہ تصورات جدید دور میں ذہنوں کو متاثر نہیں کر سکتے۔

انسان کے بچگانہ جسمانی، ذہنی اور جذباتی اوصاف، بالخصوص خدا کے بارے میں اس کے تصورات بلوغت کے بعد بھی اس کی زندگی کا حصہ رہتے ہیں۔ ایسے ناپختہ اور ناتراشیدہ تصورات اور خدا کے متعلق انسان کے طفلانہ رویے ایک طرح کی ذہنی و جذباتی پس ماندگی اور شخصیت کے طفلانہ عہد میں اٹک کر رہ جانے کے غیر فطری رجحان کو ظاہر کرتے ہیں۔ بچہ یہ طفلانہ خیالات اور رویے، یہ ڈر اور خوف، دادی اماں کی سنائی ہوئی کہانیوں، لوک ریت، مذہبی تربیت اور معاشرتی و ثقافتی روایات سے اخذ کرتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اپنے قدیم، غیر تہذیب یافتہ آباؤ اجداد سے حاصل کردہ یہ طفلانہ فکر و عمل ہماری جدید اور تہذیب یافتہ دنیا کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔ اپنی انتہائی صورت میں یہی طفلانہ تصورات مذہبی انتہا پسندی کی بنیاد بھی بنتے ہیں۔

Marfat.com

معاصر امریکن ماہر نفسیات اور بچوں کی نفسیات پر کئی کتابوں کی مصنف ڈاکٹر اسٹیلا چیس (Dr. Stella Chess) لکھتی ہیں کہ عام طور پر بچہ اپنی نشو ونما کے دوران جن مشکلات سے دوچار ہوتا ہے وہ پریشانی، عام یا مخصوص خوف، بے اطمینانی، غیر ضروری شرمیلا پن، عمومی منفیت، چمٹنے کے رجحان، عدم تحفظ، پس ماندگی اور رجعت پسندی پر بنیاد رکھتی ہیں۔

خدا کے نام پر ثقافتی اضافیت:
In the Name of God, Cultural Relativism

ایک دن برسات کے موسم میں، جب کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی، مجھے بذریعہ جہاز کراچی جانا پڑا۔ ہوائی اڈے پر پہنچتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ ائر پورٹ کا پورا نظام معطل ہو چکا ہے۔ باہر سیکورٹی چیکنگ کے انتظار میں گاڑیوں کی قطاریں لگ گئیں، اندر ہجوم کے صبر وتحمل کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ بڑی مشکل سے آخر کار جب میں پرواز کے حفاظتی دروازے تک پہنچ گیا تو معلوم ہوا کہ تین میں سے دو دروازے کام نہیں کر رہے ہے۔ انتظار کرتے ہوئے لوگوں کا غصہ برداشت کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ میں اپنی مغربی تربیت کے زیر اثر نہایت غصے میں آگے بڑھا اور پوچھا کہ سیکورٹی کے انتظامات کا نگران کون ہے؟ ایک باریش اور باوردی ملازم نے آگے بڑھ کر خود کو سیکورٹی انچارج کے طور پر پیش کیا۔ جب میں نے اس سے وضاحت طلب کی کہ باقی کے دونوں دروازے خراب کیوں ہیں اور مسافروں کو پہنچنے والی اس تکلیف اور پریشانی کا ذمہ دار کون ہے؟ تو وہ خفیف سا مسکرایا اور آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہنے لگا، ''اللہ کی مرضی سر! اس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔''

ہم لوگ اکثر یہی کرتے ہیں کہ اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کی ذمہ داری فوراً اللہ کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ مشرق ہو یا مغرب، یہ رویہ عام دیکھنے کو ملتا ہے۔ انسانی تاریخ خدا کے نام پر ہونے والے قتل و غارت، جنگوں اور انسانیت سوز جرائم سے بھری پڑی ہے۔

انسان کس طرح اپنی ناکامیوں کا الزام خدا کو دیتا آیا ہے، یہ جاننے کے لیے لادین (agnostics) الحاد پرست (atheist)، تشکیک پسند (skeptics) لامذہب (secularists) عقلیت پرست (rationalists) اور انسان پرست (humanists) انسانوں کے عقائد کے متعلق چند دیب گاہیں

Marfat.com

دیکھ لیجیے! میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ ان ویب گاہوں پر ایک نظر ضرور ڈالیں (web sites) (ان کی فہرست اس کتاب کے آخر میں درج ہے) بلاشبہ یہ سب کچھ انسان کی نہایت اہم جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ یہ ہی مفید سماجی تحریکیں ہیں جو مذہبی تنگ نظری اور ہر قسم کے معاشرتی و مذہبی استحصال کے مقابلے میں عقلیت (rationalism) روشن خیالی (enlightenment)، انسانیت پرستی (humanism) اور آزادی (freedom) جیسے اعلاو ارفع انسانی آدرش (ideals) تشکیل دیتی ہیں۔ میرے خیال کے مطابق ان سب تحریکوں کو خدا دوست سمجھا جانا چاہیے کیوں کہ یہ معاشرتی بیداری کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔لیکن اس کے باوجود یہ بھی دیکھیے کہ ان سب تحریکوں کے ماننے والے کتنی مرتبہ خود کو درست ثابت کرنے کے لیے خدا پر الزام تراشی کرتے ہیں۔حتیٰ کہ ایک نام ور معاصر سائنس دان پروفیسر رچرڈ ڈاکن بھی الزام تراشی کے اس کھیل میں ملوث ہیں (دیکھیے ویب گاہ: RDF)۔اب وقت آ گیا ہے کہ اس سائنسی دور میں ہم یہ الزام تراشیاں ختم کر کے خدا کی عقلی و منطقی تفہیم کی کوشش کریں۔

طاقت کا ردعمل:
Reaction to Force

پچھلے مہینے کی بات ہے کہ میں نے اپنا سائبر شاٹ ڈجیٹل کیمرہ اپنے سولہ سالہ بیٹے کو ادھار دیا۔جب یہ کیمرہ واپس مجھے ملا تو اس کی بیٹری کا ڈھکن ٹوٹا ہوا تھا لیکن میرے بیٹے کو یہ اہم سبق مل چکا تھا کہ کبھی کسی مشین کو زبردستی کھولنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ ایسا اصول ہے جس کا دائرہ کار مشینوں سے آگے نکل کر انسانی معاملات پر بھی محیط ہو جاتا ہے، بلکہ اگر آپ ایک متوازی کائنات کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں تو روحانی حقیقتوں پر بھی اتنا ہی صادق آتا ہے۔مغرب میں آزادی کے حصول کے لیے چلنے والی بہت سی تحریکیں اصل میں ماضی میں کلیسا کی جانب سے ہونے والے جبر و استبداد اور سخت گیر معاشرتی اقدار کا ردعمل ہیں۔ روایتی، مگر غلط، طور پر خدا کو ہمیشہ کسی مطلق العنان حکمران جیسا سمجھا جاتا رہا ہے، باپ کی طرح رعب داب کا مالک اور خوف زدہ رکھنے والا، نظم و ضبط کا پابند، سزا دینے والا اور طاقت ور۔اسی تصور کے ردعمل میں مغرب کی حالیہ تحریکوں نے جنم لیا اور ان تحریکوں کی بے لگام آزادی کے ردعمل میں مشرق میں مذہبی انتہا پسندی اور راسخ العقیدگی پھلنے پھولنے لگی۔ یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں کہ خدا کے بارے میں ہمارا تصور بالکل ناقص ہے۔یہی روایتی حاکمانہ اور

Marfat.com

جابر ہستی کا تصور انسانی رشتوں کو پامال کرنے اور خالق کے بارے میں انسانی فہم کو مسخ کرنے کا ذمہ دار ہے۔

انسانی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال نہیں ہوتا:

Human faculties are not fully employed

جب میرا پرانا کیمرہ طاقت کے غلط استعمال کے باعث خراب ہو گیا تو مجھے ایک نیا کیمرہ خریدنا پڑا۔ چناں چہ میں نے جدید ترین EOS کینن (Canon) کیمرہ خرید لیا۔ اس کیمرے نے مجھ پر ناقابلِ تصور امکانات کی ایک نئی دنیا کھول دی۔ انسان اس کیمرے کی مدد سے مشکل اور پیچیدہ ترین عکس حاصل کر سکتا ہے لیکن کوئی بھی اس کیمرے کی تمام تر قوت، تمام تر امکانات کو استعمال میں نہیں لاتا۔ بہت سے لوگ تو میری طرح اسے آسان سے خودکار (Auto) نظام کے ذریعے استعمال کر لیتے ہیں۔ انسان بھی بے شمار اعلا و ارفع اوصاف سے متصف ہے لیکن انھیں استعمال کیا جاتا ہے نہ ان کی پرورش اور نشو و نما ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ، جو ایک اعلا و ارفع تر حقیقت ہے، آج تک انسانی فہم و ادراک اور تجربے کی حد سے باہر رہی ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

باب سوم

متوازی معکوس سچائی کی کہانی

Story of Parallel Invertible Truth

ریاضی کے جو اصول حقیقت کو بیان کرتے ہیں
وہ یقینی نہیں ہوتے
اور جو یقینی ہوتے ہیں
وہ حقیقت کو بیان نہیں کرتے

البرٹ آئن سٹائن

حقیقت کو تلاش کریں تو خیال فریب دیتا ہے
خیال کا تعاقب کریں تو حقیقت درہم برہم ہو جاتی ہے
کیا اصلیت ایک تڑخا ہوا آئینہ ہے؟
کیا یہی ہے انسان کی بکھری ہوئی منتشر حقیقت؟

Marfat.com

Marfat.com

متوازی معکوس سچائی کی کہانی:

Story of Parallel Invertible Truth

ظاہر(Outer) باطن(Inner)

مغربی فلسفے کے ارتقا پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہی ہمارے سامنے ایک دوسرے سے مختلف، متضاد اور معکوس مکاتبِ فکر کی فہرست نمایاں ہو جاتی ہے:

:Rationalism عقلیت پسندی، یعنی ذہن، عقل اور باطنی بصیرت ہی سچ ہیں۔

:Empiricism تجربیت، یعنی خارجی وجود، تجربہ اور مشاہدہ اصل حقیقت ہیں۔

:Idealism مثالیت پسندی، یعنی یہ نظریہ کہ دنیا ایک ذہنی عمل یا خیال ہے۔

:Positivism اثباتیت، یعنی دنیا ایک معروضی حقیقت ہے۔

:Absolutism مطلقیت، یعنی سچائی ناقابلِ تغیر اور مستقل بالذات ہے۔

:Relativism اضافیت/نسبتیت، یعنی ہر چیز غیر مستقل، تغیر پذیر اور اضافی ہے

:Mechanism میکانکیت، یعنی ہر شے محض متحرک مادہ ہے۔

:Organicism نامیاتی نظریہ، یعنی ہر چیز ایک زندہ اور فعال نامیاتی کل ہے۔

:Altruism ایثاریت، یعنی بے غرضی اور خیرِ کل ہی مقصدِ حیات ہیں۔

:Egotism انانیت، یعنی خود غرضی ہی باعثِ نفع ہوتی ہے۔

:Monism واحدیّت، یعنی حقیقت ایک ہے اور صفات اسی اکائی کا جزو ہیں۔

:Pluralism تکثیریت، یعنی حقیقت کثیر اور حسی ہے۔

Marfat.com

Determinism: جبریّت ،یعنی حقیقت متعین، مطلق اور یقینی ہے۔

Indeterminism: لاتعینیّت/لاقدریّت ،یعنی حقیقت ایک گمان ہے جو غیر متعین اور غیر مستقل ہے۔

Certainty: تیقن/ایقانیت ،یعنی اثباتی ،یقینی اور مطلق۔

Uncertainty: لاتیقن/بے یقینی ،یعنی نامعلوم ،غیر معین اور مبہم۔

جسم اور ذہن کی دوئی اور ان کا باہمی ربط فلسفے کے لیے ہمیشہ ایک معمہ رہا ہے۔

باطنی خیال (Idea) حقیقت ہے یا یا خارجی شے کا حسی تجربہ (Sensation)؟ آخر باطن اور ظاہر میں باہمی رشتہ کیا ہے؟ حسی علم خارجی دنیا میں آزادانہ وجود رکھنے والی اشیا کی نمائندگی کرتا ہے لیکن ہم ان اشیا کو خود اپنے خیال، اپنے ذہن کی مدد سے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ تو پھر حقیقی کیا ہے اور حقیقت کیا ہے؟ ذہن (Mind) یا شے (Object)؟ حقیقت داخلی (باطن) ہے یا خارجی (ظاہر)؟

تمام تر فلسفہ حقیقت کے اسی باطنی (Inner) اور ظاہری (Outer) محور کے گرد گھومتا رہا ہے۔ یہ فلسفے کی ایک بہت بڑی مشکل رہی ہے جس نے بعض فلسفیوں کو میکانکیت اور مادیت کی نفی کرنے پر مجبور کر دیا اور بعض کو مثالیت پسندی، واحدیّت اور تکثیریت، عقلیت پسندی اور تجربیت جیسے نظریات کو جھٹلانے پر اکسایا۔

یہ سارا جھگڑا کارتیسی ثنویت (Cartesian Dualism) جیسے نظریات نے کھڑا کیا تھا جن کے مطابق ذہن اور مادہ دو مختلف تخلیقات ہیں۔ اس سوال نے کئی دہائیوں تک فلسفیوں کو مصروف فکر رکھا ہے کہ ذہن اور جسم، شعور اور مادے کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ کیا یہ دو مختلف وجود ہیں (تکثیریت) یا ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں (واحدیّت)؟

اس فلسفیانہ بحث کی جڑ یہی خیال (Idea) اور حسی تجربے (Sensation) کی دوئی تھی۔ عقلیت پسند اور مثالیت پسند، علم کا ماخذ خیال (باطن) کو قرار دیتے تھے، جب کہ تجربیت پسند اور اثباتیت پسند تجربے (ظاہر) اور خارجی اشیا کے مشاہدے کو۔ فلسفیانہ تاریخ کے آغاز میں افلاطون نے کہا تھا کہ خیال (Idea) اور احساس (sensation) ایک دوسرے کے الٹ ہوتے ہیں۔ خیال غیر مادی ہوتا ہے اور احساس مادی۔ ذہن سے سمجھی جانے والی شے حواس کی مدد سے محسوس کی جانے والی شے سے بالکل متضاد ہوتی ہے۔ افلاطون

Marfat.com

(Plato) کے نزدیک ذہن احساس سے مقدم ہوتا ہے جب کہ لاک (lock) اور ہیوم (hume) پہلے آتا ہے۔ مفہوم کا یہ الٹ پھیر وضاحت طلب ہے۔

ایک طرف سوچ (Thought) ہے اور دوسری طرف احساس (Sensation)۔ خیال یا سوچ اندر (باطن) ہوتی ہے اور حسی شے باہر (ظاہر)۔ فلسفیانہ مکاتبِ فکر ایک دوسرے سے بالکل متضاد راستے پر چل رہے تھے اور حیرت انگیز طور پر الٹتے پلٹتے بھی رہتے تھے لیکن یہ ماننے کو کوئی بھی کسی صورت تیار نہ تھا کہ سچائی دوسری طرف بھی موجود ہوسکتی ہے۔ کوئی ایک مکتبِ فکر بھی اس بات کی تشریح نہیں کر سکتا تھا کہ کسی بھی نقطۂ نظر کا یوں بالکل الٹ جانا کیسے ہوتا ہے، اس بات کا تو ذکر ہی چھوڑ یے کہ وہ اصول دریافت کیے جاتے جن کی رو سے حقیقت کے ان دونوں ادلتے بدلتے پہلوؤں کے باہمی تعلق اور تعامل کی وضاحت ہو سکے۔

ایک طرف کسی چیز کی بناوٹ یا اس کا ڈھانچا (Structure) ہے اور دوسری طرف اس چیز کا فعل یا عمل (Function)۔ سوچ، دماغ کا فعل ہے اور دماغ سوچ کا ڈھانچا ہے۔ یوں فلسفہ ''مرغی پہلے یا انڈہ'' والی مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا جس کا حل نکلنا ناممکن تھا۔

دوطرفہ نظریہ:
Double Aspect Theory

اسپائی نوزا (Spinoza) جیسے وحدانیت پر یقین رکھنے والے فلسفیوں کی جانب سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کچھ کوششیں ضرور ہوئیں۔ اسپائی نوزا نے ایک درمیانی نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ دونوں ایک ہی جوہر کی دو مختلف صفات ہیں۔ اسپائی نوزا وحدانی (Monist) تھا۔ اس نے مابعد الطبیعیاتی (Metaphysical) نظریے سے کچھ جزوی خیالات مستعار ضرور لیے تھے لیکن وہ مابعد الطبیعیات کا حوالہ دینے سے گریزاں تھا؛ اس لیے اس نے اپنے نظریے کو Double Aspect Theory یا دوطرفہ نظریے کا نام دے دیا۔ بعد میں آنے والے شیلنگ (Schelling) جیسے کئی اور فلسفی، جنھوں نے اسپائی نوزا کے واحدیت کے نظریے کو اپنایا، یہ کہتے رہے کہ ذہن اور دماغ کے افعال بنیادی طور پر ایک ہی حقیقت کے بالترتیب اندرونی (باطن) اور بیرونی (ظاہر) پہلو ہیں۔ لیکن اس بات نے بھی حقیقت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اگر ذہنی پہلو کو حقیقت سمجھا جائے تو یہ نفسی وحدانیت اور روحانیت (Spiritualism) کی طرف لے جاتا ہے اور اگر

Marfat.com

جسمانی یا دماغی پہلو کو حقیقت سمجھا جائے تو یہ طبعی وحدانیت یا مادیت (Materialism) کی طرف لے جاتا ہے۔ لٰہذا یہ نظریہ بھی اس سوال کا کوئی جواب فراہم کرنے سے قاصر رہا۔ ذہن شے ہے اور دماغ اس کا ایک پہلو (روحانیت) یا اس کے برعکس دماغ شے ہے اور ذہن اس کا ایک پہلو (مادیت)۔ لیکن وہ شے کیا ہے جس کے دو پہلو ہیں؛ ایک باطنی اور ایک خارجی؛ اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

اوپر۔ نیچے کے مقامات:
UP-DOWN Positions

یونان کا ایک قدیم نظریہ تھا کہ انسان کائنات کو عقل کی مدد سے یقینی طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اسی یقین یا ایقانیت (Certainty) کی فلسفیانہ تلاش کے دوران عقلیت پسند (Rationalist) اور تجربیت پسند (Empiricist) دو مختلف مقامات سے آغاز کرتے ہیں اور اوپر یا نیچے کی طرف عمل کرتے ہیں۔ عقلیت پسند استخراجی طریقے (Deductive Method) سے شروع کرتے ہوئے عام سے خاص یعنی مجرد سے ٹھوس کی جانب بڑھتے ہیں جب کہ تجربیت پسند استقرائی طریقے (Inductive Method) سے کام لیتے ہوئے خاص یا ٹھوس سے شروع کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ عمومیت یا تجرید کی جانب سفر کرتے ہیں۔ گویا ایک طریقہ باطن سے ظاہر کا سفر ہے اور دوسرا ظاہر سے باطن کا۔

یہ دونوں طریقے ایک دوسرے سے بالکل الٹ تھے۔ ایک بنیاد یا ماخذ پر توجہ مرکوز کرتا ہے یعنی آغاز کیا ہے، تو دوسرا انجام پر غور کرتا ہے، یعنی منزلِ مقصود کیا ہے؟ دونوں اپنی تلاش کے اختتام پر ایک دوسرے سے بُعدِ قطبین کے فاصلے پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نقطۂ نظر نہ تو مکمل طور پر درست ہوسکتا ہے اور نہ بالکل غلط۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر سچائی کا درست تعین کرتے ہوں۔ ایک مکتبہ فکر کے فلسفی سچائی کو اوپر سے نیچے کی طرف دیکھتے اور بیان کرتے تھے اور دوسرے مکتبہِ فکر کے لوگ نیچے سے اوپر کی جانب۔ یوں دونوں قطعاً مختلف نتائج تک پہنچتے تھے۔ اس بات کا کوئی جواب نہ تھا کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ یہاں تک کہ فلسفہ ایک تفرقہ انگیز تضاد کی بازی گاہ بن گیا جہاں دونوں فریق درست تھے اور دونوں غلط۔ کیا عجب کہ پھر فلسفہ اپنے اعلیٰ مقام سے گر گیا اور عملی متبادلات کے لیے جگہ خالی کرتا گیا۔

اس تضاد کو حل کرنے، ان الجھے ہوئے سوالوں کا درست جواب تلاش کرنے میں ناکامی کے بعد فلسفے نے

Marfat.com

عملیت پسندی (Pragmatism)، افادیت پسندی (Utilitaruanism) اور وجودیت (Existentialism) جیسے نظریات کے حق میں پسپائی اختیار کر لی اور عملی انسانی مسائل پر اپنی توجہ مرکوز کرلی۔ اب فلسفے کا ناگزیر اور اہم ترین موضوع خدا تھا نہ یقین تک پہنچنے کا ذریعہ۔ بل کہ یہ خیالات ونظریات کی عملی افادیت اور انسانیت کی بہتری اور خیر کے سامان مہیا کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہو گیا جو اپنے جیسے مگر پھر بھی مختلف دوسرے انسانوں سے ربط وضبط قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوسکیں۔ یوں فلسفے کا مرکز خدا یا سچائی کی تلاش سے ہٹ کر انسان کے لیے عملی فائدوں کی تلاش کی طرف منتقل ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے مکمل انکار یا الحاد کی راہ اپنائی اور Atheism کی طرف رجوع کر لیا جب کہ کچھ نے Agnosticism، یعنی لاادریت کا راستہ اختیار کرلیا۔ کچھ نے سیکولرازم اور کچھ نے انسانیت پرستی کو اپنا لیا۔

اس کے ساتھ ساتھ نفسیات میں بھی کچھ ہلچل پیدا ہو رہی تھی جس کے نتیجے میں ذہن کی سائنس کا آغاز ہوا۔ ادراک (Perception) اور وقوف (Cognition) بیک وقت داخلی بھی تھے اور خارجی بھی۔ بیسویں صدی میں کرداریت (Behaviorism) نے اعلان کیا کہ مشاہدے کا درست طریقہ موضوعی یا اندرونی (باطن) نہیں، معروضی یا بیرونی (ظاہر) ہوتا ہے یعنی یہ داخلی مشاہدہ نہیں بلکہ بیرونی کردار کا مشاہدہ ہے۔

گیسٹالٹ (Gestalt) نفسیات دانوں نے، جن میں وردائمر (Wertheimer)، کولر (Kohler) اور کافکا (Kafka) شامل ہیں، ادراک کی حسی نوعیت کی تکذیب کی اور ''کل'' (Whole) کی منفرد خصوصیات پر زور دیا (Holism)۔ یعنی ان کے مطابق ''کل'' محض اجزا کا مجموعہ نہیں ہوتا بل کہ اپنے اجزا کے مجموعے سے بڑھ کر کچھ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ یہ نہ سمجھ پائے کہ ''کل'' اور جز کا باہمی رابطہ کیا ہے۔

خدا کے باطنی علم اور معرفت کو ایسی ہی ایک اور زبردست دوئی یا ثنویت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ یہ مادے اور روح کی دوئی تھی۔ اس طرزِ فکر کا سراغ ہمیں مثالیت پسند فلسفیوں کے ہاں ملتا ہے۔ ۴۰۰ عیسوی میں سینٹ آگسٹائن (Saint Augustine) نے یزداں اور اہرمن کی ایرانی ثنویت سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ دو قوتوں کے درمیان کشمکش اور پیکار انسان کی ذات میں بھی موجود ہے۔ اس کشمکش میں روح کو خیر کا درجہ حاصل ہے اور جسم کو شر کا۔

ابتدائی اسلامی فلسفے نے اس مسئلے کا حل دونوں صورتوں کی ہم آہنگی میں تلاش کرنے کی کوشش کی اور قدیم

Marfat.com

یونانی فلسفے کو قرآنی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی۔نویں اور دسویں صدی عیسوی کے الکندی(Al-kindi)، الفارابی(Al-Farabi)، الغزالی(Al-Ghazali) اور ابن سینا(Avicenna) اور تیرھویں صدی میں قرطبہ کے ابن رشد (Averroes) کو مغرب میں بہت پذیرائی ملی۔ یہ ابن رشد کے مغربی مقلدین ہی تھے جن کے ہاں استدلال(Reason) اور ایمان (Faith) کو ہم آہنگ کرنے کی کوششوں نے ''دوہری سچائی'' (Dualism) کا نظریہ تشکیل دیا۔تاہم فلسفے کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کہ اگر استدلال سے ہم کسی ایسے نتیجے پر پہنچ جائیں جو الہامی مذہبی عقائد کے مخالف ہو، تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟اس سوال کا کبھی بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔

انیسویں صدی کے جدید تر مفکر تو وجدان و معرفت، مابعد الطبیعیاتی (Metaphysical) قیاس آرائی اور مجرد فلسفیانہ نظریوں سے اور زیادہ گریزاں رہے، یہاں تک کہ انھوں نے اس طریق کار کو مکمل طور پر رد کر دیا اور طبعی سائنس کی طرف رُخ موڑ لیا جو غیر معمولی دریافتوں میں مصروف تھی اور مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر توانا ہو رہی تھی۔ چناں چہ اثباتی سائنس اور تجرباتی طریق کار کی بدولت اثباتیت(Positivism) اور تجربیت (Empiricism) ہی وقت کی آواز بن گئے۔اس کے بعد فلسفے کا مرکز نہ صرف خدا بل کہ خود انسان سے بھی ہٹ کر مادی حقائق کی طرف منتقل ہو گیا۔

اب کلیدی سوال یہ نہیں تھا کہ خدا کیا ہے؟ اور نہ یہ کہ انسان کے لیے خیر یا فلاح کس چیز میں ہے، بل کہ اب سوال صرف یہ تھا کہ مادی حقیقت (Reality) کیا ہے؟

یہ خیال کہ حقیقت عناصر اور مرکبات سے مل کر بنی ہے، ایٹم کی دریافت کے ساتھ ہی رفت گزشت ہو گیا۔ نیوٹن(Newton) کی طبیعیات نے اس کی خوب وضاحت کر دی تھی۔ حقیقت ننھے ننھے، ناقابلِ شکست، اور ایک دوسرے سے جدا ذرات سے مل کر بنی ہے جنھیں ایٹم کہا جاتا ہے اور جو ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے بھی ہیں اور دور بھی پھینکتے ہیں۔ یہ ایٹم ٹھوس اور الگ الگ ہیں۔یہی مادے کے بنیادی اجزا ہیں۔ نیوٹن کے قانونِ حرکت (Newton's Laws of Motion) نے ہر شے کی تعبیر ایک حرکی مادے (Matter in Motion) کے طور پر کر دی جس میں ہر حرکت پہلے سے متعین ہوتی ہے اور اس کی بالکل درست پیش بینی کی جا سکتی ہے۔ نظام شمسی کا میکانکی انداز ایک بے روح مگر یقینی حقیقت کا نمونہ بن گیا (Law of

Marfat.com

(Determinism۔ انسانی شعور کا اس بے روح میکانکی نظام میں کوئی کردار نہیں تھا۔ یوں انسان کا فطرت اور خدا سے رشتہ دشوار تر ہوتا گیا۔ انسان آگے بڑھ کر خلاؤں کی تسخیر کرنے لگا، پیچیدہ سائنسی آلات بنانے لگا اور نتائج کی پروا کیے بغیر فطرت پر غلبہ پانے میں مصروف ہو گیا۔

تاہم جلد ہی انسان نے کوانٹم فزکس کی تحتِ ایٹم دنیا (Sub-Atomic world) دریافت کر لی۔ جب سائنس دانوں نے باطن میں جھانکا تو ایٹم کی خردبینی دنیا (Micro-world) میں حقیقت کی ایک بالکل نئی جھلک نظر آئی جو نیوٹن کے قوانینِ حرکت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے طبیعیاتی تصورات سے سراسر الٹ تھی۔ چناں چہ ہائزن برگ (Heisenberg) کا اصولِ عدم یقین، (Law of Uncertainty) نئی فزکس کا بنیادی اصول بن گیا۔ کوانٹم حقیقت (Quantum Reality) ایک غیر مادی موج (Immaterial Wave) کی سی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک مادی ذرہ (Material Particle) بھی ہے۔ حقیقت کی تصویر کو مکمل کرنے کے لیے یہ دونوں بہت ضروری تھے لیکن ایک وقت میں ایک ہی ہاتھ آتا تھا۔ کچھ بھی مستقل اور متعین نہیں تھا ہر شے لامحدود امکانات کے ایک بے کراں ذخار میں بکھری ہوئی تھی اور ہاتھ نہیں آتی تھی۔ کوئی چیز بھی دوسری چیز سے جدا نہ تھی۔ یہ نیوٹن کی دنیا سے بالکل متضاد دنیا تھی اور اس میں کسی چیز کو دوسری سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں ''غیر'' (Other) کا کوئی تصور ہی موجود نہ تھا۔ حقیقت بیک وقت مادی بھی تھی اور غیر مادی بھی۔

کوانٹم فزکس میں انسان نے ایٹم کے اندر ایک اور زیادہ پیچیدہ حقیقت دریافت کر لی جو نہ صرف بالکل مختلف تھی بلکہ نیوٹن کی کلاسیکی فزکس سے قطعی الٹ بھی تھی۔ اب سچائی کے ایسے متوازی (Parallel) مگر الٹ (Inversion) تصورات میں ہم آہنگی کیوں کر پیدا کی جا سکتی تھی؟ نیوٹن کی مادیت اور کوانٹم فزکس کی غیر مادیت ایک دوسرے کے متوازی مگر بالکل متضاد دنیائیں تھیں۔ آخر کیوں؟ سائنس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ آج سائنس کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان تضادات میں وحدت (Unification) کیسے پیدا کی جائے؟ اس کے ساتھ ساتھ کوانٹم فزکس اور آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت (Theory of Relativity) میں ہم آہنگی پیدا کرنا بھی ابھی ہمارے ذمّے ہے۔ لگتا ہے کہ جدید سائنس رفتہ رفتہ اپنی یک رنگی (consistency) سے بھی محروم ہوتی جا رہی ہے، یقین کی منزل پا لینے کا تو سوال ہی کیا ہے۔ آج کی فزکس کا

Marfat.com

ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کوانٹم فزکس کے تصورات کو اضافیت کے عمومی نظریات سے کیسے ہم آہنگ کیا جائے تاکہ کائنات کے بارے میں ایک محکم اور واضح تصور قائم کیا جاسکے۔

کوانٹم فزکس میں ایک نئے نظریے نے جنم لیا ہے جس کے مطابق ننھے ننھے تحت ایٹم ذرّات خارجی طور پر، اور مشاہدہ کرنے والے سے الگ تھلگ رہ کر آزادانہ وجود نہیں رکھتے۔ ان ذرّات یا ذرّات کی اس موج کی حقیقت کے تعین کے لیے انسانی مشاہدہ (Human Reference Point) بہت اہمیت رکھتا ہے۔ نئی فزکس کے مطابق اگر واقعی ذرے اور موج، غیر مرئی اور مرئی، غیر مادی اور مادی کی ثنویت انسان کو یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ حقیقت کو مختلف زاویوں میں سے کسی ایک کی مدد سے دیکھ سکے تو حقیقت کے تعین کے لیے انسان کا نقطۂ نظر بہت اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر حقیقت بیک وقت مادی بھی ہے اور غیر مادی بھی، مرئی بھی اور غیر مرئی بھی، تو سوال یہ ہے کہ اسے کیسے دیکھا جائے، کہاں تلاش کیا جائے، کس زاویے سے اس کا مشاہدہ کیا جائے اور خود مشاہدہ کرنے والا کون ہے؟

نئی فزکس ایسے کئی وسیع تر مابعدالطبیعیاتی (Metaphysical) اشارے اور دلالتیں فراہم کرتی ہے جنھیں سائنس دان زیر بحث لانا بھی گوارا نہیں کرتے۔ کوانٹم فزکس کے یہ وسیع تر اشارے کیا ہیں؟

جدید سائنس کوپن ہیگن کی اس تشریح وتعبیر میں پناہ ڈھونڈ رہی ہے جو کوپن ہیگن انسٹی ٹیوٹ، ڈنمارک کے نیلز بور (Neils Bohr: ۱۹۲۷) نے پیش کی ہے: ''اگر یہ قابلِ مشاہدہ ہے تو پھر کوئی تضاد موجود نہیں اور اگر قابلِ مشاہدہ ہی نہیں تو اس کے بارے میں بات ہی کیوں کی جائے؟'' یہاں ہمیں ایک سائنس دان کا کٹر پن صاف نظر آتا ہے: ''جس چیز کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا، اس چیز پر بات بھی نہیں کی جا سکتی''۔ لہٰذا غیر مرئی اشیا پر بحث بےکار ہے۔

یوں انسانی ذہن ایسے مختلف اور متضاد نظریات کے درمیان مسلسل کشمکش کا شکار رہتا ہے؛ جنھیں جوڑنا اور ہم آہنگ کرنا یا ان میں توازن پیدا کرنا سائنس کے بس کی بات ہے نہ فلسفے کے۔ فلسفے اور سائنس میں سچائی کے ان بالکل الٹ اور متضاد مظاہر اور انھیں ہم آہنگ کرنے کی انسانی کوششوں نے مل کر انسان کی اپنی حقیقت، اس کی زندگی اور اس کی بصیرت کو دونیم کر رکھا ہے اور اسے بے ربطی، انتشار، دوغلے پن اور عدم توازن کا شکار اور غیر یقینیت، تذبذب اور بےچینی میں مبتلا کر رکھا ہے۔

Marfat.com

انسان خود بھی یونہی دو انتہاؤں (Extremism) کے درمیان تقسیم ہو چکا ہے۔ مابعد الطبیعیات اور فلسفے کے درمیان ، ایمان اور سائنس کے درمیان، مذہب اور لادینیت کے درمیان، شعور اور مادے کے درمیان، انسانیات اور طبعی سائنسوں کے درمیان۔ بالکل ایسے جیسے کوئی تڑخا ہوا آئینہ ہو۔ انسان ایک ٹوٹی ہوئی منقسم زندگی جی رہا ہے۔

خیال کا تعاقب کریں تو حقیقت درہم برہم ہو جاتی ہے۔
حقیقت تلاش کریں تو خیال فریب دیتا ہے۔

انسان کی حقیقت ہے کیا؟ ایک تڑخا ہوا آئینہ؟ ایک ٹوٹی پھوٹی حقیقت جو انسان کی تب و تاب کو دھندلا دیتی ہے اور اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے، دوئی کے عذاب میں مبتلا رکھتی ہے؟

حقیقت آخر ہے کیا؟
کیا میں اسے ٹھیک سمجھ پایا ہوں؟
کیا میں نے حقیقت کا درست اندازہ قائم کیا ہے؟
کیا میرا ردعمل ٹھیک اور حقیقت سے ہم آہنگ ہے؟
کیا میری ترجیحات درست ہیں؟

ہماری سراسیمہ سائنس کے پاس انسان کے ان بنیادی اور اہم ترین سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔

میں پروفیسر رچرڈ ڈاکن کا بہت بڑا مداح ہوں۔ پروفیسر ڈاکن آکسفورڈ یونی ورسٹی میں پبلک انڈرسٹینڈنگ آف سائنس کے پروفیسر اور *The God Delusion* جیسی معروف کتاب کے مصنف ہیں۔ خدا کے بارے میں ان کی یہ کتاب بے حد دلچسپ، پُر لطف اور قدرے ظریفانہ ہے۔ وہ ارتقا (Evolution) اور تخلیق (Creation) جیسے دو مختلف نظریات کو ماننے والوں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو موضوع بناتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نظریۂ ارتقا کو ماننے والے دراصل چھپے ہوئے ملحد (Atheist) ہیں (اور یوں وہ خود بھی اس قسم میں شامل ہو جاتے ہیں) جب کہ دوسری طرف نظریہ تخلیق کے ماننے والے ایک طرح کے نظریاتی توہم کا شکار ہیں۔

لیکن کیا ہم انسانوں کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے کہ حقیقت کے ایک منتشر تصور میں مبتلا رہ کر زندگی بسر کرتے

Marfat.com

رہیں یا یہ ہماری سائنس کی ناکامی کا نتیجہ ہے جس نے انسانی بصیرت کے اس تضاد کو دور کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ آخر کار سائنس کا بنیادی مقصد تو یہی ہے کہ وہ حقیقت کا کوئی عقلی جواز پیش کرے اور کسی استثنا کے بغیر، اہم تضادات میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ سائنس کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ سائنس نے عظیم ترین کامیابیاں، بظاہر متضاد اور مختلف دکھائی دینے والے امکانات کے امتزاج ہی سے حاصل کی ہیں۔ میں پروفیسر رچرڈ ڈاکن کے اس ہٹ دھرمی کی حد تک غیر متزلزل عقیدے کا بے حد احسان مند ہوں کہ خدا اگر ہے تو اسے ایک سائنسی حقیقت کی صورت میں ثابت کیا جانا چاہیے، بصورت دیگر وہ صرف انسان کا وہم ہے۔ بلاشبہ! شکریہ، پروفیسر رچرڈ ڈاکن!

جب آئن اسٹائن (Einstein) نے تحقیق کے دوران دو مختلف قوتیں، یعنی کششِ ثقل (Gravity) اور برقی مقناطیسیت (Electromagnetism)، دریافت کیں مگران دونوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں ناکام رہا تو اسے خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ آئن اسٹائن اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا کہ عالمِ فطرت کی بنیاد ایسی متضاد اور ثنویت کی حامل قوتوں پر ہو سکتی ہے۔ تیس سال تک وہ ایک ایسے نظریے کی تلاش کرتا رہا جو ثابت کر سکے کہ یہ دونوں بظاہر متضاد نظر آنے والی قوتیں دراصل کسی ایک ہی عظیم قانون کے دو مختلف مظاہر ہیں (Unifying Theory)۔ اسی ناکام تلاش نے آئن اسٹائن کو فزکس کے مرکزی دھارے سے جدا کر دیا اور ۱۹۴۰ کے ابتدائی دنوں میں اس نے ایک دوست کو لکھا کہ ''میں اب ایک تنہا بوڑھا ہوں جسے لوگ صرف اس حوالے سے پہچانتے ہیں کہ وہ جرابیں نہیں پہنتا اور محض لوگوں کے تجسس کی تسکین کے لیے خاص خاص مواقع پر جس کی نمائش کی جاتی ہے۔''

کیا یہی ٹوٹا پھوٹا منقسم وجود انسان کا مقدر ہے؟

کیا ہم کسی اعلیٰ تر حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں؟

حقیقت کیا ہے؟

کیا ہم اللہ کی حقیقت کو عقل و استدلال کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں؟

اللہ جو سب حقیقتوں سے بڑی حقیقت ہے! اور سائنس کی بہت سی پریشانیوں کا حل بھی۔

انسان نے خدا کا ایک خیالی تصور باندھ رکھا ہے۔ بدقسمتی سے، علم دشمن نجومیوں اور متعصب لوگوں کی وجہ سے اللہ کو ابھی تک ایک خیالی شے ہی سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے ہم آج کے روشن خیال دور میں بھی اللہ کے بارے

Marfat.com

میں تخیلاتی قصوں اور نظریوں میں الجھے ہوئے ہیں، یہ جانے بغیر کہ درحقیقت اللہ کیا ہے؟ تو پھر اس بات پر تعجب کیسا کہ ہماری سائنس اور فلسفے کو ابھی تک یہ علم نہیں ہو سکا کہ اشیا کی اصل حقیقت کیا ہے؟

دوسری طرف اگر خدا کوئی مقدس تصور (Sacrosanct Idea) ہے تو ہمیں ایسے تصور کی کوئی ضرورت نہیں۔ہم جانتے ہیں کہ جو چیز بھی مقدس بن جائے وہ فطرت کے ہاتھوں مات کھا جاتی ہے کیوں کہ وہ انسان کی زندگی اور علم کے ارتقا میں رکاوٹ بنتی ہے۔ارسطو (Aristotle) کے نظریات، جنھیں ایک ہزار سال تک کوئی جھٹلانے کی جرأت نہ کر سکا تھا، جب مقدس بن گئے تو وقت نے انھیں مٹا ڈالا۔اسی طرح اٹھارھویں صدی میں عیسائیت کا کٹر پن (Dogma) روشن خیالی (Renaissance) کے ہاتھوں ڈھیر ہو گیا اور روشن خیالی کا قلعہ استدلال اور سائنسی تحقیق کی روایت کے ہاتھوں مسمار ہو گیا۔ہم صرف امید ہی کر سکتے ہیں کہ ہمارا طبعی سائنس پر قائم ہونے والا یہ نو دریافت شدہ اعتقاد کوئی مقدس عقیدہ نہ بن جائے جو آگے بڑھنے سے منکر ہو جاتا ہے۔

جدید انسان کو ایک شفا بخش مرہم کی ضرورت ہے؛ ایک ایسے ہمہ جہت ترکیبی عنصر کی تلاش ہے جو انسان کی کٹھن سائنسی جوکھم کو نتیجہ خیز بنا دے اور اس کی تجزیاتی کوششوں کا اثبات کر سکے۔ ایک ایسی کلیت (Wholeness) جو کٹر (Dogmatic) نہ ہو اور استدلال اور سائنسی پیش رفت کو قبول کر سکے۔ایک ایسے کُل کا تصور جو انسان کو عظیم تر معنویت اور شناخت فراہم کر سکے۔

Marfat.com

Marfat.com

باب چہارم

اصولیات

Methodolgy

استخراجی/استقرائی (Deductive/Inductive)

استقرائی کا مطلب ہے کسی منزل کی سمت بڑھنا
استخراجی کا مطلب ہے کسی منزل کی سمت سے آنا
تو کیا سائنس کا مسلمہ طریق کار یہی ہے؟
آغاز اور انجام کے درمیان تضاد میں، کشمکش اور ٹکراؤ؟
قضیے سے نتیجے کی طرف یا اس کے برعکس؟
ایک طریقے کے مطابق عام سے خاص کی طرف بڑھتے ہیں
اور دوسرے کے مطابق خاص سے عام کی طرف۔

Marfat.com

Marfat.com

''عالمِ غیب اور عالمِ شہادت''

Alam'i-Ghaib and Alam'i Shahadah

استخراجی اور استقرائی طریق کار

عقلیت پسندی اور تجربیت پسندی

فلسفہ اور سائنس

اگر ہمیں اللہ کی فطرت کی کھوج لگانا ہو اور ایک سائنسی اصول وضع کرنا ہو تو ہم ام العلوم یعنی فلسفے کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتے کیوں کہ فلسفہ ہی ہے جو علم (knowledge) اور وجود (existence) کی حتمی نوعیت کے بارے میں کھوج لگاتا ہے۔

فلسفہ کائنات کی توجیہہ و تعبیر علم کی مدد سے کرتا ہے۔ یہ فطرت کے بارے میں ایک جامع نقطۂ نظر کی تلاش کا نام ہے جو کائنات کی کوئی آفاقی تعبیر پیش کر سکے۔ اس حوالے سے فلسفہ سائنس کی آخری تسکین ثابت ہوتا ہے کیوں کہ سائنس میں فطری طور پر یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ ہر چیز کو قابلِ مشاہدہ سائنسی حقائق کی بنا پر ایک وحدت میں سمو دے۔ تاہم سائنس فلسفے کی ناگزیر اور ٹھوس بنیاد ہے۔

متوازی دنیائیں:

Parallel Worlds

فلسفہ غیر مادی نظریات کا مجموعہ ہے جب کہ سائنس قابلِ مشاہدہ مادی حقائق پر مشتمل ہے۔ علم کی صحت مندانہ نشوونما تبھی ممکن ہے جب غیر مادی (فلسفہ) اور مادی (قابلِ مشاہدہ سائنس) دونوں پہلو ایک دوسرے

Marfat.com

سے ہم آہنگ ہو کر آگے بڑھیں۔ جب بھی تصور اور حقیقت، خیال اور ہیئت، نظریے اور عمل، انسانی فکر اور تجربے، فلسفے اور سماجی اداروں جیسی متوازی دنیاؤں کے درمیان توازن بگڑتا ہے تو بنی نوع انسان کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ کیوں کہ حقیقت کے بغیر تصور محض دیوانگی ہے اور کسی ربط باہم کے بغیر حقائق بے معنی و منتشر اجزا کے مجموعے کے سوا کچھ نہیں۔ جس تجربے کا کوئی معنی نہ ہو، وہ ایک بے مایہ سنسنی خیزی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور اگر تجربہ نہ ہو تو تشریح و تعبیر فقط ذہنی صورت گری ہے، اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ تصورات ہمیں اس قابل بناتے ہیں کہ حقائق کی تشریح و تعبیر کر کے ان پر قابو پاسکیں جب کہ حقائق ایک جاری و ساری متحرک باہمی عمل کے ذریعے ہمارے تصورات کی تشکیل کرتے ہیں۔ غیر مادی اور مادی اشیا کا یہ باہمی تعامل، مشرقی مابعد الطبیعیات (metaphysics) میں عالمِ غیب اور عالمِ شہادت کی دو متوازی دنیاؤں کا اشتراکِ عمل کہلاتا ہے۔ عالمِ غیب سے مراد ہے ایک ان دیکھی دنیا کے تمام تر مراتبِ تصور، وجدان، ذہن، خیال، جوہر اور روح۔ اور عالمِ شہادت سے مراد ہے مادی مظاہر کی حسی دنیا۔ یہ دونوں دنیائیں شعور سے لے کر فوق الشعور تک حقیقت کی ہر سطح پر ایک دوسرے سے تعامل کرتی ہیں۔ یہی کلیہ اعلیٰ تر حقائق پر بھی صادق آتا ہے۔ اللہ غیر مرئی یا ناقابلِ مشاہدہ ہے لیکن قابلِ مشاہدہ حقائق مرئی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان بھی ایسا ہی کوئی تعامل ہونا چاہیے۔ خدا کا ایسا کوئی بھی تصور جو عالمِ فطرت اور انسان کے برتاؤ، طرزِ عمل اور کردار سے ہم آہنگ نہ ہو، محض ایک مذہبی خبط ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ دوسری طرف عدم مطابقت کی حامل حسی اور عملی دنیا کا بکھرا بکھرا، بے ترتیب سا تجربہ بھی، جو باہمی ربط اور معنویت سے محروم ہو، محض الجھاؤ اور انتشار ہی کا باعث بنتا ہے۔ یہ دونوں دنیائیں ایک دوسرے کے متوازی اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ جب بھی یہ ربط ٹوٹ جاتا ہے تو نتیجہ یاس، اضمحلال اور رنج و الم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

عقلیت اور تجربیت:

Rationalism and Empiricism

مغربی فلسفے کی مثال ہی لیجیے! صدیوں سے یہ، عقلیت اور تجربیت، مثالیت پسندوں (Idealists) اور اثباتیت پسندوں (Positivists) کے درمیان تقسیم ہے اور مسلسل بحث مباحثے میں الجھا ہوا ہے۔ انھی مباحث کے نتیجے میں فلسفے کو ترقی اور پختگی نصیب ہوئی ہے۔

Marfat.com

عقلیت حسی تجربے سے منکر ہے اور اس کا ایمان ہے کہ اعلیٰ عقلی روش ہی مطلق ہے۔ابتدائی دور کے فلسفی نہایت سنجیدگی سے یہ سمجھتے تھے کہ خیالات خدا کی طرف سے آتے ہیں لہٰذا صرف خیال ہی مستقل ہیں۔ارسطو کے بقول خیال ہی حقیقت ہیں۔حتیٰ کہ سترھویں صدی تک برکلے اور لائبنز (Berkeley and Leibniz) جیسے فلسفی بھی یہ سمجھتے تھے کہ خیال کی علت، خارجی یا مادی اشیا نہیں بلکہ خدا ہے۔دنیا کا اصل منبع و مصدر ذہن ہے۔ان فلسفیوں نے خارجی اشیا کے وجود سے ہی انکار کر دیا۔یہ وہ انتہا پسندانہ نظریہ تھا جس کے تحت ذہن کو مادے پر فوقیت حاصل تھی اور علم حواس کی مدد سے نہیں، بلکہ فکر و استدلال کے ذریعے حاصل ہوسکتا تھا۔مشرقی اصطلاح میں بات کی جائے تو یہ مکتب فکر غیر مادی کو مادی یعنی عالم غیب کو عالم شہادت پر ترجیح دیتا تھا۔روزمرہ گفتگو میں آج بھی اس شخص کو بہت توقیر ملتی ہے جو نت نئے خیالات پیش کرتا ہے۔خیالات کو آج بھی بہت قدر و قیمت حاصل ہے اور انھیں زندگی کی اعلیٰ تر، غیر مرئی اقلیم (domain) کا حاصل سمجھا جاتا ہے۔

دوسری طرف تجربیت (Empiricism) ذہنی مفروضوں کی مخالف ہے۔یہ ایسے علم کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے جو بغیر تجربے کے حاصل کیا گیا ہو۔تجربیت کا موقف یہ ہے کہ تمام تر علم خالصتاً حسی تجربے سے پیدا ہوتا ہے اور عقل اس میں کوئی کردار ادا نہیں کرتی۔یہ ایک بالکل متضاد صورت حال ہے جو عالم شہادت کو عالمِ غیب پر ترجیح دیتی ہے۔

مثالیت اور اثباتیت:

Idealism and Positivism

اسی طرح مثالیت (Idealism) کو لیجیے۔اس نقطۂ نظر کے مطابق حقیقت کو صرف مادے کے حوالے سے نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ اس کا کلی علم صرف خیالات (ideas) کی مدد سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔اس لیے ایک مثالیت پسند ایسی مادی دنیا کے وجود سے انکار کر دیتا ہے جو انسان یا خدا کے خیال سے عاری ہو۔اثباتیت (positivism) اس سے الٹ راستہ اختیار کرتی ہے اور صرف ان اشیا کے وجود کا اثبات کرتی ہے جن کا علم حواس کی مدد سے ہوتا ہے۔یہ مکتب فکر تمام تر مابعد الطبیعیات اور تصوف کا مخالف ہے۔یعنی اثباتیت دراصل مظہریت (phenomenalism) ہے۔اس نظریے کے مطابق مظاہر ہی تمام تر علم کی بنیاد ہیں۔مغربی فلسفے کی تاریخ، دنیا کے بارے میں ان دونوں متضاد نظریات کے درمیان مسلسل کشمکش کی داستان ہے۔

Marfat.com

ان میں سے ہر مکتبِ فکر نے اپنے اپنے تحقیقی طریق کار وضع کیے ہیں جو ان کے نقطۂ نظر سے مطابقت رکھتے ہیں۔ان میں سے ایک عالمِ غیب یعنی خیال کا پرچم بلند کرتا ہے تو دوسرا عالمِ شہادت یعنی مادی مظاہر کی حمایت کرتا ہے۔ان دونوں نقطہ ہائے نظر نے ہمیں استخراجی اور استقرائی طریق کار سے روشناس کیا ہے۔

نتیجتاً ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فلسفے کے یہ مکاتبِ فکر دو مختلف اور زبردست اندازِ نظر وضع کرتے ہیں۔ایک مجرد خیالات اور ان کے عقلی ربط کو اہمیت دیتا ہے تو دوسرا حقائق اور مظاہر کے تنقیدی مطالعے کو فوقیت دیتا ہے۔مشرق کی لطیف تر اصطلاحات میں بات کریں تو پہلا طریقہ عالمِ غیب کا طرزِ فکر ہے اور دوسرا عالم شہادت کا نقطۂ نظر۔ایک طریقہ وجدانی ہے دوسرا معروضی۔ایک فکری ہے دوسرا عملی،ایک خیالی ہے دوسرا حقیقی۔ایک مطلق ہے دوسرا تغیر پذیر۔اگر ایک وحدت سے کثرت کی طرف بڑھتا ہے تو دوسرا کثرت سے وحدت کی طرف۔یہ دو متوازی مگر مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل الٹ ہیں۔بالکل ایسے جیسے محدب شیشے کو دوسری طرف سے دیکھیں تو وہ مقعر نظر آتا ہے۔آخری تجزیے سے شاید یہی نتیجہ نکلے کہ یہ دو نقطہ ہائے نظر ایک ہی حقیقت کے بارے میں دو مختلف انسانی رویوں اور طرزِ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کے باہمی اختلافات ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

مشرق میں اللہ کے بارے میں بھی ایسے ہی اور اس کے متوازی صوفیانہ اور باطنی مباحث پھیلے ہوئے ہیں مگر مختلف زبان،مختلف اصطلاحات اور مختلف میدانِ عمل میں۔یہاں میرا اشارہ وحدت الوجود کے حامیوں کے دائمی دلائل کی طرف ہے۔وحدت الوجود ایک مشرقی فلسفہ ہے جو وحدت اور کثرت،باطن (اندر) اور ظاہر (باہر)،مشاہدہ (خیال) اور مجاہدہ (ریاضت)،ایمان (یقین) اور عمل سے بحث کرتا ہے۔

ثبات اور تغیر:

Permanence and Change

ابتدائی یونانی فلسفے کا غالب وظیفہ ایک مثالی اصول کی تلاش تھا؛ایک ایسا واحد مقصد جو تمام تر سرگرمی کا جواز بن سکے۔اپنے ارتقائی ادوار میں فلسفے کو اس تذبذب کا سامنا کرنا پڑا کہ ایک طرف تو اسے ثبات کی تلاش تھی اور دوسری طرف ناقابلِ تردید تغیرات کا سامنا تھا۔دوام کی باطنی تلاش اور فنا کے ظاہری آثار کے درمیان کشمکش جاری تھی۔اللہ کے مشرقی مباحث میں یہ بقا اور فنا کی کشمکش کہلاتی ہے۔

Marfat.com

مشرقی ادیان کے ساتھ ساتھ فلسفے اور سائنس کی تمام تر کاوشوں کی تعبیر اسی طرح باطن اور ظاہر، عالمِ غیب اور عالمِ شہادت کی باہمی کشمکش سے کی جاسکتی ہے۔

اصل مسئلہ ہستی (Being) اور تغیر (Change) کا تھا۔ یہ واضح تضاد فلسفے اور سائنس کی بنیاد میں موجود ہے۔ اندر (باطن) اور باہر (ظاہر) کی اس دوئی نے دو متضاد نقطہ ہائے نظر کو جنم دیا جو ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے اور اس مسلسل ٹکراؤ اور تصادم کے نتیجے میں فلسفہ ترقی کرتے کرتے اپنی موجودہ سطح تک پہنچ گیا۔ یہ سب باطن اور ظاہر کے باہمی تعامل (interaction) ہی کا نتیجہ ہے۔

یونان کے ایلیائی نظامِ فکر (Eleatic system) نے دوام اور عدم تغیر کا نظریہ پیش کیا جب کہ ہرقلیطس مکتبِ فکر (Heraclitean school) نے اس کے برعکس بہاؤ اور مسلسل تبدیلی کے نظریے کی حمایت کی۔ فیثاغورثیوں نے (Pythogoreans) ریاضی کا ایک مثالی کلیہ دریافت کرنے پر زور دیا جو انسان کے کلی علم کو محیط ہو اور دیموکریتسیوں (Democritus) نے مادیت اور جوہریت پر اصرار کیا۔ رواقیت (Stoicism) نے کائنات کو ایک بامقصد ذہانت سے مملو قرار دیا اور ہر قسم کی مادیت، لذتیت اور انانیت کی مخالفت کی۔ دوسری طرف اپی قوریت (Epicureanism) نے حقیقت کو محض ایک مشین، ایک حقیر میکانکی نظام کے طور پر پیش کر دیا۔

عملیت:
Pragmatism

عقلیت نے شاعرانہ رومانویت (Romanticism) کو جنم دیا اور مثالیت (idealism) وقت کے ساتھ ساتھ اثباتیت (Positivism) کو راہ دیتی گئی جو صرف حسی تجربے پر یقین رکھتی تھی۔ بحث وتکرار کا یہ دور انیسویں صدی تک جاری و ساری رہا۔ یہاں تک کہ ان عقلیت/تجربیت اور مثالیت/اثباتیت کے سرد مباحث کے ردعمل میں ایک نئی اثباتیت نے جنم لیا جسے عملیت (Pragmatism) کا نام دیا گیا۔ عملیت نے ان تمام مباحث کو بے معنی قرار دیتے ہوئے دعویٰ کیا کہ سچائی صرف اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب تصورات کے عملی نتائج کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ ولیم جیمز (William James) اور جان ڈیوی (John Dewey) جدید عملیت کے معروف ترین فلسفی تھے۔ یہ مکتبۂ فکر اس مشاہدے کی بنا پر قائم ہوا تھا کہ تمام روایتی

Marfat.com

فلسفیانہ افکار و نظریات ایک دوسرے سے متصادم اور متضاد ہونے کے باوجود اپنے اندر کچھ نہ کچھ صداقت ضرور رکھتے تھے۔ یوں فلسفے میں جاری یہ تصادم اور کشمکش جس نے کئی دہائیوں تک فلسفیوں کو الجھائے رکھا، کسی واضح نتیجے تک پہنچے بغیر ہی ختم ہو گیا اور یہ تمام فلسفیانہ ریاضت محض ایک بے نتیجہ ذہنی ورزش بن کر رہ گئی۔ عملیت نے اس بات پر زور دیا کہ سچا فلسفہ صرف وہی ہے جو ازلی اور ابدی صداقتوں کی تلاش ترک کر دے اور زندگی کی عملی، اخلاقی اور سماجی قدر و قیمت کا سراغ لگائے۔ گویا فلسفے کا مرکز "عمل" یعنی خیال کے عملی نتیجے کی طرف منتقل ہو گیا۔

کیا خوب سودا نقد ہے:
Cash Value

عملیت پسندی کا یہ نظریہ ایک طرح سے تو مفید ثابت ہوا کیوں کہ اس نے مثالیت اور اثباتیت کے درمیان جاری کشمکش کا خاتمہ کر دیا لیکن دوسری طرف اس نے فلسفے کی اس اعلیٰ تر تلاش کو بھی ترک کر دیا جو صداقت، خدا اور ابدیت جیسے سوالات کے حتمی جواب ڈھونڈنے سے متعلق تھی۔ یہ ایک طرح سے مغربی فلسفیوں کا ازل اور ابد کی تلاش سے انکار بھی تھا اور اقرار بھی۔ چناں چہ اس کے بعد فلسفہ فوری طور پر فائدہ بخش اور عملی طور پر کام آنے والے علم کا محض ایک آلۂ کار بن کر رہ گیا۔ ہیگل (Hegel) کی طرح کے نظریات، تصورات اور کائناتی مسائل سب فرسودہ ہو گئے۔ ایک اعلیٰ و برتر خدا کی عظیم اور جرأت مندانہ فلسفیانہ، تلاش ہمیشہ کے لیے سرد ہو گئی۔

دوئی کا فروغ:
Rise of Dualism

فلسفے کے اس قدیم و عظیم مقابلے کا آخری میچ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ہی ختم ہو گیا۔ اس صورت حال نے ایک قسم کی دوئی کو جنم دیا جس میں جسم اور ذہن، مرئی اور غیر مرئی جیسے مساوی مگر متضاد اصولوں کو ایک جیسی اہمیت حاصل ہو گئی۔ کئی فلسفی تو یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو گئے کہ اشیا کی حقیقت کو عقلی طور پر جاننے کے لیے دو متضاد پہلوؤں کا ہونا ضروری ہے جیسے ذہن اور جسم، روحیت اور میکانکیت، مادہ اور شعور، سائنس اور انسانیات، الحاد اور مذہب وغیرہ۔ ان کا خیال تھا کہ تمام تر انسانی تجربات لازمی طور پر دو متضاد اصولوں میں کشمکش اور تصادم کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

Marfat.com

یوں انسان کی زندگی اوراس کا نقطۂ نظر جسم اور ذہن کی دو برابر مگر متضاد قوتوں کے درمیان تقسیم ہو کر رہ گئے۔ عالم غیب اور عالم شہادت کا صحت مندانہ اشتراکِ عمل ختم ہو گیا۔

ان سب باتوں کے باوجود، فلسفے کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک صدی پر محیط انسانی ثقافت کی یہ جنگ دراصل مثالیت اور حقیقت پسندی کے پر جوش باہمی تعامل کا نتیجہ ہے اور اس جنگ کے دوران ہی فلسفے کو ترقی کرنے کا موقع ملا ہے۔

عقلیت (Rationalism) کا ایک بڑا نقص یہ رہا ہے کہ اس نے صرف ذہن (باطن) اور قضیے کو ضروری خیال کیا اور باہر (ظاہر) کی طرف دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ استخراجی طریقے میں کسی ایک قضیے سے ایک پورا فلسفیانہ نظام قائم کیا جا سکتا ہے جو بالکل غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے استخراجی طریقہ جدید سائنس دانوں کو پسند نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفے میں عقلیت کی تحریک کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ فلسفیوں کے بارے میں عوامی نقطۂ نظر ابھی تک یہی ہے کہ وہ روزمرہ کی عام حقیقتوں سے دور، خیالات کی دنیا میں الجھے ہوئے رہتے ہیں۔ ایک معروف فرانسیسی کہاوت ہے کہ فلسفی وہ ہوتا ہے جو آسمانوں میں جھانکتا ہے اور کنویں میں گر پڑتا ہے۔

یوں تجربیت (Empiricism) نے، جو عقلیت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتی ہے، استقرائی طریق کار کا ڈول ڈالا۔ Empiricism (تجربیت) کی اصطلاح دو یونانی الفاظ experience اور trial سے مل کر بنی ہے۔ استقرائی فکر دراصل قابلِ مشاہدہ مواد پر بنیاد رکھتی ہے اس لیے اس کے حاصل کردہ نتائج صرف قضیے میں پوشیدہ علم کا انکشاف نہیں کرتے بلکہ بالکل نیا علم فراہم کرتے ہیں۔ عظیم اور نابغۂ روزگار تجربیت پسند گلیلیو (Galileo) نے جو شہدائے سائنس میں سب سے زیادہ معروف ہوا، اس طریق کار کی بنیاد رکھی تھی۔

ذہن اور مادہ ایک چکر میں جڑے ہوئے ہیں:

Mind and Matter are webbed together in a cycle

بہرحال سائنس دان کے لیے لازم ہے کہ عملی حقائق کا مشاہدہ کر کے ان کی کوئی عمومی توجیہہ و تعبیر پیش کرنے کی کوشش کرے۔ یعنی کوئی ایسا فرضیہ (Unifying Hypothesis) ترتیب دے جو الگ،

Marfat.com

منتشر حقائق میں ایک ربط پیدا کر دے۔ اور اگر سائنس دان ایسا فرضیہ مرتب نہ کرے تو وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ وہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے اور بے معنی اور بے نتیجہ ٹکڑوں میں بٹ کر رہ جاتا ہے (atomism)۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ سائنس دان محض اتفاقی نتائج پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنے فرضیے کی روشنی میں آگے بڑھے اور اگلے مشاہدات تک پہنچے۔ یہ فرضیہ ایک غیر مرئی شے ہے۔ گویا ایک غیر مرئی شے سائنس دان کی رہنمائی کرتی ہے جس کے نتیجے میں وہ مرئی اشیا کا مشاہدہ کرتا اور ان کی توضیح و تشریح کرتا ہے۔ پھر مرئی اشیا کا مزید تجربہ کر کے وہ اس غیر مرئی تصور کو نئے سرے سے ترتیب دیتا اور اسے سنوارتا اور نکھارتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک چکر رواں دواں ہو جاتا ہے۔ درحقیقت ذہن اور مادہ تانے بانے کی طرح ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ یہ دونوں متضاد انتہائیں باہمی عمل کے ذریعے آگے بڑھتی ہیں اور ارتقا کا پہیہ چلتا رہتا ہے۔ یوں سائنس بھی فلسفے کی طرح اپنی گزشتہ دریافتوں، تجربات اور ان کے نتائج کی بنیاد پر ترقی کرتی ہے۔

تخلیقی عمل:

The Creative Process

ایک عملی سائنس دان نئے تصورات، سائنسی اصول اور دریافتیں تخلیق کرتا ہے۔ یوں تمام سائنس دان تخلیق کار ہوتے ہیں۔ تو چلیں ایک لمحے کے لیے رک کر غور کریں کہ تخلیقی عمل کیا ہوتا ہے؟ ایک تخلیقی ادیب ہی کی مثال لے لیں، وہ اپنے تخلیقی عمل کا آغاز ایک خیال، پلاٹ یا کہانی سے کرتا ہے۔ لیکن ادیب کا یہ باطنی تصور صرف اس وقت حقیقت کا روپ دھارتا ہے جب وہ اپنے فن کے حسبِ ضرورت، مناسب تکنیک اور آلات کا استعمال کرتا ہے۔ اس کے خیالی تصور کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے ایک پورا ہنرمندانہ نظام درکار ہے۔ اسی طرح کسی بھی دست کار کو اپنی جدتِ فکر، اپنے نمونۂ خیال کو مجسم کرنے کے لیے تکنیکی مہارت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ ہر تخلیقی عمل خیال اور ہنرمندی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایک مثالی صورت کو تشکیل دینے، ایک تخلیقی خیال کو فن پارے میں بدلنے کے لیے اسی عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ سائنس دان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ تخلیق کا عمل فرضیے اور تکنیک، مجرد اور ٹھوس، جوہر اور ہیئت، یعنی عالمِ غیب اور عالمِ شہادت کو ہم آہنگ کرنے کا نام ہے۔ جب تک یہ دو بظاہر متضاد دکھائی دینے والی انتہائیں ایک دوسرے سے مل کر کارفرما نہیں ہوتیں، تب تک تخلیقی عمل مکمل نہیں ہوتا۔ یہ عمل دیکھنے میں تضاد پر مبنی لگتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ تضاد ہر تخلیق کا فطری جوہر ہے۔ مصور، موجد، دست کار اور

Marfat.com

سائنس دان، اس کلیے سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔

اس خیال کو وسعت دیں تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خدا کا تخلیقی عمل بھی اس سے مختلف نہیں ہوسکتا۔ یہ بیک وقت الہامی خیال بھی ہے اور اس کا مادی ڈھانچا بھی۔ وجدان اور طریق کار، بصیرت اور تکنیک کا امتزاج۔ اس لیے کہ سائنس کا اصول ہے کہ فطرت میں یکسانی پائی جاتی ہے۔ اسی اصول کی بنیاد پر سائنس وجود میں آئی ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ تخلیق کا عمل ہوتا کیا ہے؟ اس عمل کی توضیح ممکنہ طور پر کن کن طریقوں سے کی جا سکتی ہے؟ اگر ایک شخص اسے دیکھ کر کہہ اٹھتا ہے، 'واہ! کیا کمال ہنر ہے؟' تو ہوسکتا ہے کہ دوسرا کہے، ''کیا حسنِ خیال ہے''۔ تخلیق کا عمل ہمیشہ دو مختلف زاویہ ہائے نظر کا محرک بن سکتا ہے۔ ایک وہ جو ذہنی پہلو پر توجہ مرکوز کرے اور دوسرا وہ جو مادی یا ظاہری پہلو کو اہمیت دے۔ یہ اندرونی اور بیرونی نقطہ ہائے نظر ہیں۔ ایک ہی حقیقت کے باطنی اور ظاہری پہلو۔ دونوں مساوی طور پر اہم اور لازمی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی مکمل حقیقت نہیں ہے۔ ''اندر'' اور ''باہر'' کے پھاٹک ایک ہی احاطے میں کھلتے ہیں اور یہ ہماری روزمرہ زندگی کا نہایت معمولی تجربہ ہے۔ سائنس بھی ایسی ہی سادہ حقیقت پر بنیاد رکھتی ہے۔

ہر تخلیق ان دونوں اصولوں کے امتزاج سے تشکیل پاتی ہے۔ اپنی ملازمت کے دوران، جب میں ایک ایسے ادارے کے چیف ایگزیکٹو کے عہدے پر فائز ہوا جو اسلامی فنِ دست کاری کی روایت جاری رکھنے اور اس کے معیار کو برقرار رکھنے کا ذمہ دار تھا، مجھے یہ تجربہ ہوا کہ جب بھی خیال (idea) اور اس کی ظاہری صورت (form)، وجدان (inspiration) اور اس کے پیکر (structure) جیسی دو انتہاؤں کے درمیان صحت مند اشتراکِ عمل کی فضا متاثر ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ لازمی طور پر فنِ دست کاری کے انحطاط، عدم تناسب اور ادھورے پن کی صورت میں سامنے آتا ہے اور کاری گری کا معیار گر جاتا ہے۔ تاریخ میں اسلامی دستکاری کی تخلیقیت اور ہنرمندی نے دنیائے فن پر ناقابلِ تردید اثرات چھوڑے ہیں۔ بعد میں ہنر تو باقی رہا مگر وہ تخلیقی خیال، وہ نظر باقی نہیں رہی جس نے یہ فن ایجاد کیا تھا۔ بس اصل نمونوں اور تکنیک کی اندھی تقلید، قدیم ہو جانے والی جدتوں کی نقلیں اور بناوٹی جعل سازیاں باقی رہ گئیں۔ یہاں تک کہ یہ بناوٹی نقلیں بھی زیادہ دیر تک باقی نہ رہیں اور جلد ہی ان کا معیار گرنے لگا، ساخت متاثر ہوگئی اور تخلیقیت تو بالکل ہی غائب ہوگئی۔ اپنی باطنی قوت سے محروم ہو کر یہ روایت بالکل گل سڑ کر رہ گئی۔

Marfat.com

''اندر'' (باطن) اور ''باہر'' (ظاہر) کے یہ دو اصول ایک دوسرے سے مل کر کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو متاثر بھی کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں اور عمل اور ردِ عمل کے کبھی ختم نہ ہونے والے رشتے میں پروئے ہوتے ہیں۔ ہر تخلیق کی ابتدا ایک خیال سے ہوتی ہے سو اس کا منبع و ماخذ عالمِ غیب میں ہے جو خیال کی، ذہن کی، جوہر کی دنیا ہے اور اگر اس سلسلے کو آگے بڑھائیں تو روح کی اور ان دیکھی حقیقتوں کی دنیا۔ لیکن دوسری طرف ہر تخلیق کی انتہا مادی حقیقت کی صورت میں ہوتی ہے۔ کوئی دریافت، کوئی ایجاد، کوئی تکنیک یا کوئی اور مادی مظہر۔۔۔ تخلیقی عمل کی منزل بہر حال عالمِ شہادت ہی ہے جو دراصل مظاہر کی دنیا ہے۔ انسان کی ترقی اور تخلیقیت کے لیے ان باہم مربوط حقیقتوں کا مل جل کر چلنا لازمی ہے۔

مذہبی یا مابعد الطبیعیاتی حقیقت بھی اس سے مختلف نہیں۔ مذہبی رسومات کے حقیقی مفہوم اور اہمیت کو سمجھے بغیر ان کی اندھی پیروی، محض ہیئت پرستی ہے جو روح سے محروم ہوتی ہے۔ روح اور بدن کی یہ جدائی، ایمان اور رسم پرستی کا یہ فرق مذہب کو ایک ڈھونگ میں تبدیل کر دیتا ہے جس میں بس مروجہ رسموں کی بلا سوچے سمجھے پیروی کی جاتی ہے۔ سماجی اداروں کی طرح ایسے مذاہب بھی زوال کا شکار ہو جاتے ہیں اور انسان کی زندگی پر اثر انداز ہونے کے قابل نہیں رہتے۔

ایک تخلیقی مظہر کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اس کی شکل وصورت، اس کا پیکر، اس کے اوصاف، اس کی خوبیاں سب 'خیال' کا اظہار کرتی ہیں۔ یہ مظہر اس خیال اور خیال کو جنم دینے والے ذہن کی موجودگی کی گواہی دیتا ہے۔ یہی عالمِ شہادت کا لغوی معنی ہے۔ یعنی گواہی کی دنیا۔

عالمِ غیب یعنی غیر مرئی اور غیر مادی حقیقت اور عالمِ شہادت، یعنی مظاہر اور ٹھوس گواہی کی دنیا؛ یہی دو متضاد حقیقتیں ہیں جنھیں اللہ نے اپنے عملِ تخلیق کے دوران باہم ملا دیا تھا۔۔۔ اس وقت جب اس نے مادے کو ترقی دی، مٹی کا پتلا بنایا اور اس میں اپنی روح پھونک کر زندگی عطا کی۔ لیکن فی الحال اس الوہی پہلو کو ایک طرف رکھ کر پہلے ہم استقرائی و استخراجی، سائنس اور فلسفے کے عام فہم پہلو کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سائنس ایک تخلیقی کام ہے:

Science is a Creative Enterprise

یہ سچ ہے کہ پوری کی پوری سائنس ایک تخلیقی کام ہے۔ اگر چہ اس کے طریق کار کو منطقی قرار دیا جا سکتا ہے

Marfat.com

لیکن اس طریق کار کا کامیابی سے استعمال بلاشبہ ایک تخلیقی ذہن کی وجدانی قوت کا مرہون منت ہے۔ آئن اسٹائن (Einstein) نے ایک مرتبہ کہا تھا: ''تخیل علم سے زیادہ اہم ہے''۔ یوں آئن اسٹائن نے سائنس میں جدتِ فکر کی راہ کھول دی۔ پہلے کوئی اپنے تخیل کو کام میں لاکر مفروضہ تیار کرتا ہے پھر کہیں جا کر مشاہدے کی باری آتی ہے۔ سائنس کا عمل اس کے برعکس نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا سائنس بھی ایک فن ہے۔ ایک فن کار کا طریقِ کار بھی یہی ہے۔ اس کے پاس بھی ایک طرف تکنیک ہے اور دوسری طرف وجدان۔

تضاد کا حل:
The Paradox Explained

یورپ کا ایک ماہرِ حیاتیات ولیم ایس بیک (William S.Beck) اپنی کتاب *Modern Science and the Nature of Life* میں لکھتا ہے:

''کائنات اپنی فطرت میں متناقض ہے۔ یہی تضاد سائنس کا جوہر ہے جو کائنات کو کسی شاطر محبوبہ کی طرح اس قدر خوش گوار اور اتنا مایوس کن بنا دیتا ہے۔ سائنس کم وبیش مضحکہ خیزی کی حد تک دورُخی ہے۔ ایک ہی وقت میں یہ حقیقی دنیا کے بارے میں بے حد منظم نقطۂ نظر بھی رکھتی ہے اور اس کے باوجود کبھی تکمیل یا کسی نتیجے تک نہیں پہنچتی۔ یہ اپنی منطق اور طریق کار کے حوالے سے ''یقین'' کا نمونہ ہے لیکن اسے متحرک رکھنے والی قوت ''شک'' ہے اور اس کے نتائج کبھی یقینی نہیں ہوتے؛ ہمیشہ امکانی ہوتے ہیں۔ یہ اپنے کارکنوں سے مطلق نظم وضبط کا مطالبہ کرتی ہے لیکن خود نئے افکار وخیالات کا منبع ہے۔ یہ ابتدا میں مقامی ہوسکتی ہے لیکن اس کے نتائج آفاقی ہوتے ہیں۔۔۔ یہ تضاد اور دورنگی کائنات کی اصل فطرت ہے۔ اس لیے یہ تضاد علم سمیت، ہر چیز میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ کائنات کے بارے میں علم بظاہر متناقض ہوگا۔''

دانش کی آرزو:
Love of Wisdom

فلسفی بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ فلسفے کا لغوی مطلب ہے دانش کی آرزو۔ آرزو کے بغیر یہ بھی محض ذہنی

Marfat.com

ورزش رہ جاتا ہے۔ اصل فلسفی وہی ہے جو دانش کی آرزو کرتا ہے۔ عشق کو ضرور خرد کا رہنما رہنا چاہیے۔ سچا فلسفی ایسی فراخ دلی اور وسعتِ قلب کا مالک ہوتا ہے جو ایک بے تعصب ذہن کو جنم دیتی ہے۔ دانش کو جنم دینے کے لیے عشق اور عقل کا وصال ضروری ہے۔ اسی طرح شعور کی بنیاد حسی تجربہ ہے۔ جب تک ہمارے حواس متاثر نہیں ہوتے، ہمارا ذہن خیال مرتب نہیں کر سکتا اور ذہنی آگہی کے بغیر حسی تجربہ بے معنی ہے بلکہ ایک طرح سے وجود ہی نہیں رکھتا۔ اسی طرح حقیقت کا تجربہ کیے بغیر خیال پیدا نہیں ہوتا اور خیال نہ ہو تو تجربہ بے معنی رہتا ہے۔ اسی لیے حقیقت نہ صرف باطنی ہے اور نہ محض خارجی۔ یہ باطن و خارج کا ایک مسلسل ربطِ باہم، ایک اشتراکِ عمل ہے۔ انسانی آگاہی ذہن اور خارجی شے کے باہمی تعامل سے پیدا ہوتی ہے۔ تجربہ کسی زندہ وجود اور اس کے ماحول کے درمیان مسلسل تعامل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تمام جاندار اشیا اس باطنی / خارجی رشتے سے پیوست ہیں۔ یوں انسانی ترقی بھی عالمِ غیب اور عالمِ شہادت کے درمیان ایک متحرک اور رواں دواں تعامل کا نتیجہ ہے۔

آیئے دیکھیں کہ سائنس دان کیسے کام کرتا ہے؟

Let us see how a scientist works

سائنس دان کئی بکھرے ہوئے، بے جوڑ حقائق اور مظاہر کا بغور مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر کوئی کانٹا سا اس کے ذہن میں اٹک جاتا ہے، ایک مدھم سا خیال، ایک شبہ سا کہ شاید ان منتشر حقائق میں کوئی مشترک پہلو بھی موجود ہے اور انھیں اس اشتراک کی بنا پر کسی ایک مشترک اصول کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی کو سائنس دان فرضیہ کہتے ہیں۔ لیکن یہ فرضیہ ایک سائنسی اندازے ایک وجدانی مفروضے کے سوا اور کیا ہے؟ یہ خیال ایک مفروضہ ہی تو ہے کہ ان بظاہر بے جوڑ حقائق کو شاید کسی ایک اصول کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے۔

کسی فرضیہ کو سچ ثابت کرنے کے لیے اسے قابلِ مشاہدہ حقیقت ہونے کے امتحان سے گزارنا پڑے گا۔ اب اگر پہلے مفروضے اور اندازے درست ثابت ہو جائیں تو پھر یہ ایک مسلمہ اصول بن جائے گا اور اگر یہ آزمائش میں پورا نہ اترے تو پھر اسے نئے سرے سے ترتیب دینا اور بدلنا پڑے گا یا پھر اسے ترک کر دینا ہوگا۔ تمام تر سائنسی علوم کا یہی مسلمہ طریق کار ہے اور ہم بھی یہی طریقہ اللہ کے سائنسی اصول کی تشکیل کے لیے استعمال کریں گے۔

یہاں ہمیں حیرت انگیز باہمی تعامل نظر آتا ہے، ٹھوس انفرادی مشاہدے اور مجرد مفروضے کے درمیان باہمی

Marfat.com

تعامل۔۔۔ بہت سے حقائق اور ایک عمومی اصول ہیں، مظاہر کی دنیا اور خیال کی دنیا میں باہمی تعامل۔۔۔ منتشر، بے ربط حسی تجربے اور ایک وحدت انگیز مثالی اصول میں یعنی تجربیت اور عقلیت میں باہمی تعامل۔۔۔ مرئی اور غیر مرئی میں باہمی تعامل۔۔۔

وحدت کے ناگزیر پہلو:
Integral Aspects of Unity

مشرق کا صوفی اس باہمی تعامل کو ایک بلند تر سطح پر مظاہر کی دنیا یعنی عالمِ شہادت اور غیر مرئی حقیقت کی دنیا یعنی عالمِ غیب کے درمیان رشتے کا نام دیتا ہے۔ ٹھوس اور مجرد، کثرت اور وحدت، مظہر اور خیال، حقیقی اور مثالی، یک رنگی اور نیرنگی، تجربی اور عقلی، اتفاقی اور متعین اور مرئی اور غیر مرئی کے بیچ یہی تعامل ہے جو جدید سائنس کا سنگِ بنیاد ہے۔

جیسے مظاہر کی ٹھوس دنیا، مجرد خیال کی آزمائش گاہ ہوتی ہے اسی طرح عالمِ شہادت، عالمِ غیب کی آزمائش گاہ ہے۔ دوسری طرف یہ مجرد قوت وہ ہے جو تمام بکھرے ہوئے بے جوڑ حقائق میں وحدت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا عالمِ غیب وہ دنیا ہے جہاں ہر شے وحدت میں گم ہے۔ یوں عالمِ غیب اور عالمِ شہادت وحدت کے دو جزو ہیں۔ کوئی بھی سائنسی قانون دو اصولوں کے تعامل کے بغیر نہیں بن سکتا۔

تمام تر سائنس خود آگہی کا نام ہے:
All Science is Self Discovery

سائنس دراصل خود آگہی کا نام ہے یا یوں کہیے کہ سائنس دراصل ''خدا'' آگاہی کا نام ہے۔ ان دونوں جملوں میں کوئی تضاد نہیں کیوں کہ خودی خدا کا جزو ہے۔ یہ الگ بات کہ بہت چھوٹا سا جزو، جیسے ایک ایٹم ایک شمسی نظام کا جزو ہوتا ہے، انھی عناصر سے بنا ہوتا ہے اور وہی خواص رکھتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیوں کہ حقیقت میں دوسرا کوئی نہیں ہوتا۔ جدائی کا وجود تو کیا تصور بھی نہیں ہوتا۔ یہودیت میں خدا کو Kaddosh کہتے ہیں جس کا مطلب ہے، ''دوسرا یا غیر''۔ یہ دوسرا بھی خود اللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا۔ قرآن میں اللہ کی ایک صفت بیان کی گئی ہے الرقیب جس کے معنی ہیں ''حریف، مقابل''۔ یہ خیالی ''دوسرا''

Marfat.com

دراصل اسی حقیقت کے دوسرے سرے کا نام ہے۔اور یہ بات مظاہر کی ہر سطح پر صادق آتی ہے۔ ہم آج اس حقیقت کو ایک سائنسی صداقت، ایک قابلِ آزمائش تجربے کے طور پر جانتے ہیں۔ جدید سائنس اور اس کی تازہ ترین تحقیقات نے داخلی اور خارجی، باطنی اور ظاہری کا فرق مٹا ڈالا ہے۔اب ہم اندر اور باہر، داخل اور خارج میں فرق نہیں کر سکتے۔اب تو ہمیں یہی کہا جاتا ہے کہ جو کچھ موجود ہے وہ داخل اور خارج، باطن اور ظاہر دونوں کا امتزاج ہے۔

اگر یہ سائنسی صداقت ہے تو اس کا اطلاق ہماری روزمرہ زندگی اور عام سوجھ بوجھ پر بھی ہونا چاہیے۔اب یا تو ہم حقیقت کو درست طور پر سمجھنے سے قاصر ہیں یا پھر حقیقت کے بارے میں ہمارا تصور ہی غلط ہے۔ ورنہ ان دونوں معاملوں میں کوئی تضاد نہیں ہوسکتا۔دراصل یہ ہماری اپنی مرضی پر منحصر نہیں کہ جب چاہیں اپنی سوجھ بوجھ سے کام چلالیں اور جب جی چاہے تو کوانٹم فزکس کے آدھے ادھورے اصولوں کو قبول کرلیں۔شادی کا بندھن باندھنے کے لیے تو گرجے میں جاکر قسمیں کھائیں ''جب تک موت ہمیں جدا نہ کردے'' اور طلاق میں آسانی ڈھونڈنی ہو تو سیکولر اداروں سے رجوع کرلیں۔دورخی سائنس کی طرح دورخے انسان کی سہولت پسند خودغرضی۔ کیا یہی ہے حقیقت؟ کیا ہم اسے ایسا ہی دیکھنا چاہتے ہیں؟ جی نہیں۔ یہ انسانی اشتہا کی کج روی ہے۔صرف موقع پرستی اور خودغرضی۔

سائنس کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی سوالات پر قائم ہے:

At the base of Science are highly Moral Questions

آپ نے دیکھا کہ سائنس کی بنیاد کس طرح اخلاقی سوالات پر قائم ہے۔ جب بھی اور جہاں بھی آپ اپنے اختیار کا استعمال کریں گے تو لازماً آپ کو اخلاقی سوالات کا سامنا بھی کرنا پڑے گا کیوں کہ اختیار اور اخلاقیات دونوں لازم وملزوم ہیں۔سائنس کے اخلاق سے عاری ہونے کی باتیں تو سب اٹھارھویں صدی کی شعبدہ بازی ہے۔آج جب ہم جمہوریت کے دور میں آپہنچے ہیں جو انسان کی سب سے عظیم الشان ایجاد ہے، بعض دانش ور اس دور کو ''تاریخ کے خاتمے'' کا دور بھی کہہ رہے ہیں، ہم پر لازم ہوگیا ہے کہ ہم سچائی کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ کریں جو اخلاقیات سے متعلق ہے۔اس دوسرے پہلو کی دریافت کے بغیر کوئی بھی جمہوریت کارگر ثابت نہیں ہوگی اور ہماری تہذیب ریت کی دیوار کی طرح ڈھے جائے گی۔اگر ہر چیز توازن چاہتی ہے، اور یہ سائنسی حقیقت ہے تو

Marfat.com

جدید آزاد انسان کا توازن کہاں ہے اور اس لولی لنگڑی سائنس کا توازن کہاں ہے؟

تو آیئے دیکھتے ہیں کہ جدید سائنسی دریافتیں ہماری عام سوجھ بوجھ کے مطابق ہیں یا نہیں؟ کوانٹم فزکس کا سب سے چھوٹا قابلِ مشاہدہ ذرہ بیک وقت ذرہ (مادی) بھی ہوتا ہے اور موج (غیر مادی) بھی۔ کیا یہی نتیجہ ہے جدید سائنس کی تمام تر کاوشوں کا؟ کیا یہی حقیقت کی سائنسی تصویر ہے؟

آپ وہی دیکھتے ہیں جو دیکھنا چاہتے ہیں:
What you See is What you are Looking For

اب ہم یہ دیکھتے ہیں نئی سائنسی دریافت کس طرح انسان کی عقل سلیم سے مطابقت رکھتی ہے۔ کوانٹم فزکس کے مطابق چھوٹے سے چھوٹا قابلِ مشاہدہ ذرہ بیک وقت ذرہ (مادی) بھی ہوتا ہے اور موج (غیر مادی) بھی۔ کیا یہی ہے سائنس کی تمام تر سعی کا حاصل؟ کیا یہ حقیقت کی سائنسی تصویر ہے؟

جو ہم دیکھتے ہیں، وہ دراصل وہاں ہے ہی نہیں۔

اور جو نادیدہ ہے وہ اصل میں موجود ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کو وہی ملتا ہے جو آپ ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔

اگر آپ کے سامنے مسئلہ یہ ہو کہ بھارت میں سیاحت کو کیسے فروغ دیا جائے تو لازماً آپ کا پہلا سوال یہی ہوگا کہ سیاح کیا چاہتے ہیں؟ جب تک آپ اس دوسرے سوال کا جواب نہ ڈھونڈ لیں، پہلے مسئلے کا حل تلاش نہیں کر سکتے۔ اب یہ دیکھیے کہ بیرونی اور اندرونی (خارجی اور داخلی) کس طرح ایک باہمی رشتے میں منسلک ہیں۔ اس سوال کا جواب کہ سیاحت کے مختلف خارجی پہلوؤں، مثلاً تفریحی مقامات، یادگاروں اور خوب صورت مناظر کو کیسے ترقی دی جائے، دراصل اس بات میں پوشیدہ ہے کہ سیاح چاہتا کیا ہے اور یہ سیاح کے باطن کا جائزہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کیسے خارج اور داخل، ظاہر اور باطن ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ یہ ہے عام سمجھ بوجھ کی بات جس سے ہماری سائنس جوں جوں ترقی کرتی جاتی ہے، محروم ہوتی جاتی ہے۔ اس دوُرخے پن کی وجہ سے ہماری سائنس حقیقت کی اعلیٰ سطح پر مزید ترقی کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔ مجھے مغربی سائنسی اصطلاحات، اعلیٰ تر صداقت کے بیان کے لیے ناکافی محسوس ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے بار بار مشرقی زبانوں کی اصطلاحات استعمال کرنی پڑ رہی ہیں۔

Marfat.com

جدید انسان کا مسئلہ یہ ہے کہ اس نے ایسے بنیادی سوال اٹھانا ہی چھوڑ دیا ہے کہ ''سیاحت کیا ہے؟''، جدید تہذیب کا یہ شاندار ایوان تعمیر کر کے اب وہ اپنے اسکائی اسکر یپر کی ایک سو چھتیسویں منزل کی تزئین و آرائش میں مگن ہے، لیکن اس عمل میں یہ بھول بیٹھا ہے کہ اس عمارت کی بنیاد میں دراڑیں ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ زندگی میں جب بھی کبھی اسے اپنا اختیار، اپنی مرضی استعمال کرنے کا موقع ملتا ہے تو وہ بڑی آسانی سے دونوں امکانات کو چن لیتا ہے۔ جب ایک طرف مفید لگے تو اسے اور جب دوسری طرف کی ضرورت پڑے تو اسے بھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ کسی چیز کو بیک وقت رد اور قبول کرنے میں پنہاں حقیقت تک پہنچنے میں ناکام رہتا ہے۔

سو بھارت کا سیاحتی نقشہ کیا ہے؟ بس وہی جو سیاح چاہتا ہے۔ یہ ہے حقیقت کا تضاد۔ کائنات کی خارجی حقیقت اصل میں وہ ہے جو سائنس دان تلاش کرتا ہے۔ بھارت میں کتنی ہی خوبصورت جگہیں، جھیلیں، گلیشیر، لوگ اور مقام ہوں گے، اور یقیناً ہیں، جو بھارت کے سیاحتی نقشے میں نظر نہیں آتے کیوں کہ ابھی کسی سیاح نے انھیں دیکھنے کی طلب ہی نہیں کی۔ یقیناً ابھی ایسے کتنے ہی حقائق ہیں جو جدید سائنس کے نقشے میں نہیں ہیں، کیوں کہ کسی سائنس دان نے انھیں تلاش ہی نہیں کیا۔ آخر سائنس بھی تو دوسری تمام چیزوں کی طرح سائنس دان کے باطن اور اس کے حقیقت کے بارے میں خارجی تجربے کے درمیان ایک باہمی ربط کار ہی کا نام ہے۔

موضوع اور معروض کا امتزاج:
Fusion of Subject-Object

موضوع اور معروض کا موجود سائنس کا ایک خاص وصف ہے۔ تو پھر سوشیالوجی کو بھی ہم معاشرے میں موجود انسان کی سائنس اور انسان میں معاشرے کی سائنس کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح نفسیات بھی جسم میں ذہن اور ذہن میں جسم کی سائنس کہلا سکتی ہے۔ مجھے کالج کی زندگی کے ان گنت ایسے مباحثے یاد آرہے ہیں جن کے ایسے موضوع ہوتے تھے: حالات عظیم انسانوں کو جنم دیتے ہیں یا عظیم انسان حالات کو بدل ڈالتے ہیں۔ یہ اور بھی برمحل ہو جاتا ہے جب ہمیں ایسے سائنسی سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ کیا ہمارا رویہ ہمارے آزاد ارادے کا نتیجہ ہوتا ہے یا ہمارے ورثے کا، جس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں؟ اس سوال کے جواب میں پیدا ہونے والی بحث ہمیشہ جاری رہ سکتی ہے اور اکثر معروف سائنس دان اپنی اپنی مرضی کا جواب منتخب کر لیں گے۔ اس بحث کا کبھی کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا کیوں کہ اس سوال کا جواب عمرانیات (Sociology) اور حیاتیات (Biology) کے

Marfat.com

ملاپ یعنی عمرانی حیاتیات (Socio-Biology) میں پنہاں ہے۔

ہم اکثر یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سائنس کی مختلف شاخیں دراصل ہماری اپنی بنائی ہوئی تقسیم ہیں اور حقیقت میں اس حد بندی کا کوئی وجود نہیں۔ حقیقت کسی تقسیم کو نہیں مانتی۔ یہ حرکی تعامل کا تسلسل ہے (Continuum of dynamic interactions)۔ حقیقت تو تقسیم کو رد کرتی ہے۔ یہ بے انتہا امکانات اوران کی باہمی ترکیب کا بحرِ بے کراں ہے۔

کیا آج ہم کوانٹم فزکس کے عجیب وغریب حقائق کو اپنی روزمرہ زندگی سے مربوط کرسکتے ہیں، جب تک ہم یہ نہ سمجھ جائیں کہ یہ وحدت کے تعامل کا ایک حرکی چکر (dynamic cycle) ہے۔ عالمِ غیب اور عالمِ شہادت کا چکروار تعامل (Cylic Interaction)۔

پاکستان میں ہم عام طور پر اپنی گفتگو میں بے ساختہ ایک لفظ دہراتے ہیں ''ان شاء اللہ''، اگر خدا نے چاہا تو۔۔۔'' ایک اچھا عیسائی بھی God Willing کے الفاظ دہراتا ہے۔ دراصل یہ مرضی کے تصادم یعنی دوئی سے بچنے کی کوشش ہے۔ ان الفاظ میں ایک ایسی بصیرت پوشیدہ ہے جو ہماری زبان میں ہی نہیں بلکہ ہماری روزمرہ زندگی میں بھی گہری اتری ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات ہمارے شعور میں بھی نہ آتی ہو کہ مرضی صرف اس وقت پوری ہوسکتی ہے جب دونوں طرف کی مرضی ایک ہو جائے۔ یعنی خدا اوراس کے بندے کی مرضی۔ میرے کئی مغربی دوست ہمیشہ اس لفظ کا بہت مذاق اڑاتے ہیں کیوں کہ یہ انھیں بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایک سائنس دان بھی تو کہتا ہے، ''اگر دیگر تمام متغیرات قائم رہیں تو۔۔۔'' وہ بھی تو یہی حقیقت بیان کرتا ہے لیکن سائنسی زبان میں کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اگر کسی ایک متغیرے میں بھی تبدیلی آگئی تو اس کا پورا سائنسی عمل غارت ہو جائے گا۔ یہ ہے عام سمجھ بوجھ۔ اختیار اور مقدر مل کر کام کرتے ہیں اوراسی طرح آزادی اور اخلاقیات بھی۔

Marfat.com

Marfat.com

حصہ دوم

باب پنجم

اسمائے حسنیٰ

Appellation of "Allah"

خشت اوّل

The Foundation

Marfat.com

Appellation of "Allah"

The Foundation

Marfat.com

اِقرَا بِرَبّی اِسمُکَ

اللہ کے نام سے پڑھ

مغرب بائیں سے دائیں پڑھتا ہے
مشرق دائیں سے بائیں پڑھتا ہے۔
ایک شک سے یقین کی طرف
دوسرا یقین سے شک کی طرف

Marfat.com

Marfat.com

اللہ کے نام
Appellations of Allah

خشتِ اوّل:
The Foundation

عربی: اللہ، ترکی: اللہ۔ اللہ معیاری عربی میں خدا کے لیے استعمال ہونے والا لفظ ہے۔ مغرب میں یہ اصطلاح اس حوالے سے زیادہ پہچانی جاتی ہے کہ یہ مسلمانوں کے خدا کا نام ہے لیکن یہ تمام ابراہیمی ادیان کے عربی بولنے والے پیروکاروں کے ہاں خدا کے معنی میں مستعمل ہے جن میں عیسائی اور یہوذی بھی شامل ہیں۔ مکہ کے کفار میں بھی قبل از اسلام کے سب سے عظیم اور خالق خدا کے لیے یہی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔

عربی بولنے والے، ابراہیمی ادیان کے تمام پیروکار، جن میں عیسائی اور یہوذی بھی شامل ہیں، اللہ کا لفظ خدا کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ آج کے عرب عیسائیوں کے پاس خدا کے لیے اللہ کے سوا کوئی لفظ نہیں۔ حتیٰ کہ مالٹا میں جہاں کی تقریباً کل آبادی رومن کیتھولک عیسائیوں پر مشتمل ہے، عربی الاصل مالٹائی زبان میں بھی خدا کے لیے 'الہٰ' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ٹامس کارلائل (۱۸۴۰) نے بھی اپنی تحریروں میں کہیں کہیں اللہ کی اصطلاح استعمال کی ہے مگر یہ سمجھے بغیر کہ اللہ کا لفظ خدا سے مختلف ہے۔ اللہ عبرانی زبان کے لفظ Elohim کا مترادف ہے جس کا ترجمہ انگریزی کی انجیلوں میں God کیا گیا ہے۔ انڈونیشیا اور ملائشیا کے عیسائی بھی اللہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ (وکی پیڈیا)

اللہ کا لفظ قبل از تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ عیسائی، یہودی اور مسلم صحائف کے مطابق اس لفظ کا آغاز

Marfat.com

حضرت ابراہیم کے دور سے ہوتا ہے۔ قبل از اسلام کے عرب میں عربوں، یہودیوں اور عیسائیوں، سب کے ہاں اللہ کا لفظ خدا کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے اللہ کے مترادف یا ہم معنی لفظ تمام سامی زبانوں میں ملتا ہے جن میں عبرانی اور آرامی زبانیں بھی شامل ہیں۔ آرامی انجیل میں یہ Elaha ہے اور شامی میں Alaha۔

مغرب میں اللہ کے لفظ کا مسلمانوں کے خدا کے لیے مخصوص ہونا تو محض دور جدید کی بات ہے۔ اس اصطلاح کے پہلے جزو ''ایل'' کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت سی قدیم زبانوں جیسے سمیری، سامی، اکادیائی، فنیشین، عبرانی، ہیٹیائی، فنش، حتیٰ کہ یونانی زبان میں بھی کثرت سے استعمال ہوتا رہا ہے۔

عربی میں الہٰ کا مطلب ہے، 'جس کی عبادت یا پرستش کی جائے'، مثلاً خدا یا دیوتا۔ الہٰ کے ساتھ حرفِ تنکیر ''ال'' لگا دیں تو یہ خدائے واحد کو ظاہر کرتا ہے۔ عبرانی زبان میں Elohim کا لفظ یہودیت کے خدا کے لیے استعمال ہوتا ہے جو الوہیت کا تصور دیتا ہے۔ Elohim کا لفظ دراصل Elahi کی جمع ہے، جس کا مطلب ہے کئی خدا یا سب سے بڑے خدا ''ایل'' کے بیٹے۔ یوں یہ لفظ پرانے زمانے کی سامی کثرت پرستی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بعد میں وحدت پرست یہودیوں نے سامی کثرت پرستی کی بجائے عبرانی انداز میں یہواہ (YHWH) کی عبادت کے اظہار کے لیے اسے جمع سے واحد میں بدل دیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ Elohim کا لفظ مختلف صفات کے مالک ایک خدا کے لیے مخصوص ہو گیا۔ انجیل کے انگریزی تراجم میں کافروں کے حوالے سے Elohim کا لفظ ایک سے زیادہ خداؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور جب بنی اسرائیل کے خدا کا ذکر آتا ہے تو یہ خدائے واحد کو ظاہر کرتا ہے۔ تاہم اس کے لیے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ لفظ Elohim ایک خدا کے لیے استعمال ہوتا ہے جو مختلف صفات کا مالک ہے۔

See google images for divine names in judaism .

Marfat.com

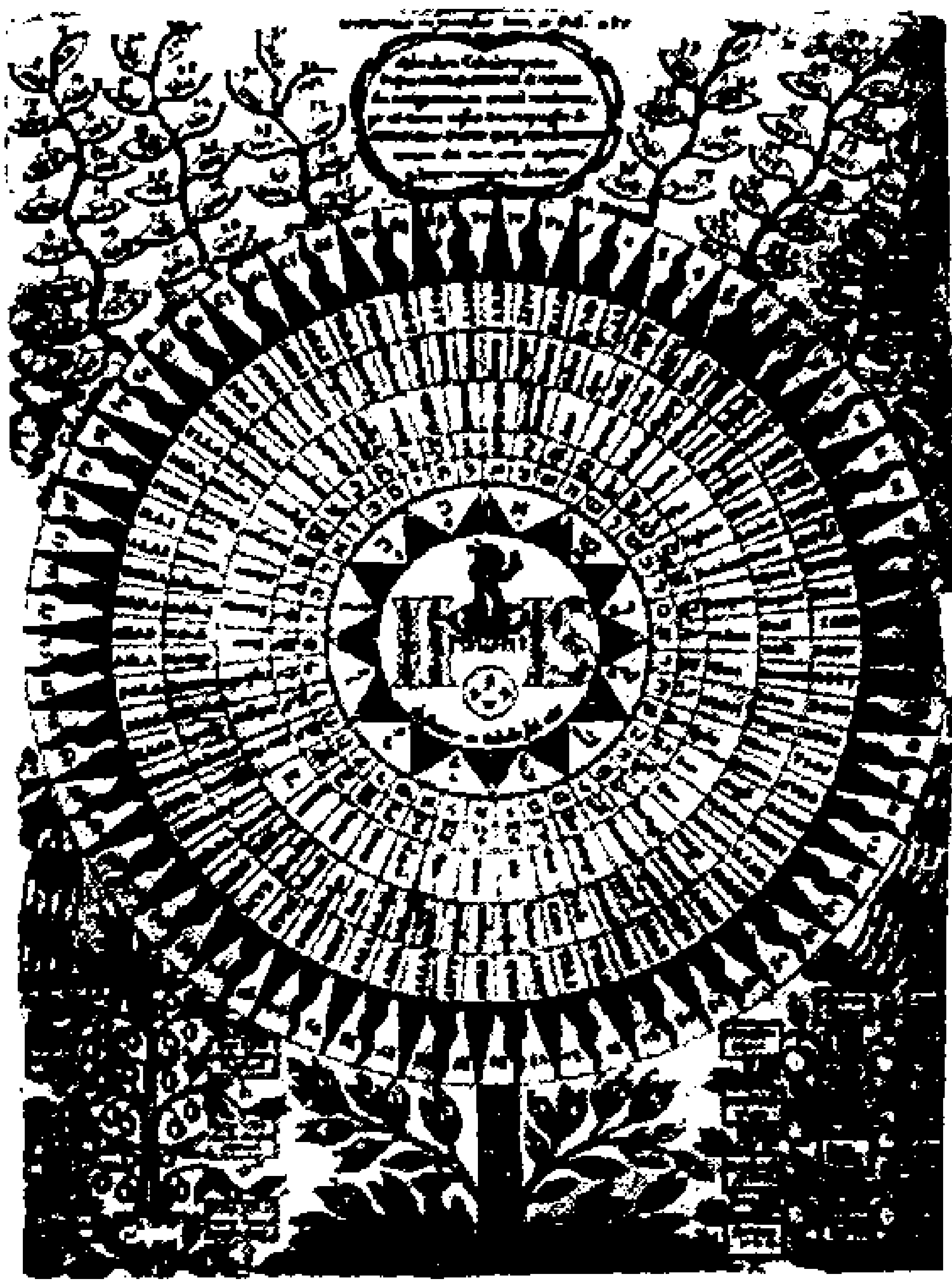

یہودی تصوف کے مخصوص روایتی انداز میں پیش کیے گئے بہتر اسماے الٰہی: ۱۶۵۲۔۱۶۵۴

اللہ کے نام:
Names of Allah

مختلف توحیدی مذاہب میں خدا کے مختلف نام ہیں۔ ہر زمانے اور ہر زبان میں اللہ کے علاوہ بھی ان گنت الفاظ استعمال ہوتے رہے ہیں۔ ہندو صحائف رگ وید اور سہار سنامہ میں خدا کے ایک ہزار نام ہیں۔ محققین کا کہنا ہے کہ اللہ کے تین سو نام ہیں۔ ایک ہزار سے زیادہ نام فرشتوں (ملائکہ) کے ہیں اور اتنے ہی پیغمبروں کے؛ جن میں سے ہر ایک کو خدا کو پکارنے کے لیے ایک مخفی نام عطا کیا گیا تھا۔ تین سو نام توریت یا عہد نامۂ عتیق میں ملتے ہیں اور تین سو ہی داؤدؑ کی زبور میں بھی ہیں۔ تین سو نام انجیل یا عہد نامۂ جدید میں ہیں اور ننانوے نام قرآن یعنی آخری عہد نامے میں ہیں۔ عام عقیدہ ہے کہ اللہ کا ایک خاص اور مخفی نام ہے جسے اسمِ اعظم یا سب ناموں سے عظیم نام کہا جاتا ہے۔

اولیا، بزرگ، عالم، عارف اور سالک اللہ کا فضل و کرم حاصل کرنے کے لیے ان ناموں کا ورد کرتے ہیں۔

Marfat.com

انھی میں سے چند ایک منتخب لوگوں کی یہ مشق اللہ کے ناموں کے بارے میں اس قلیل تصنیفی سرمائے کی بنیاد ہے جو زیادہ تر عربی زبان میں ہے۔ یوں اللہ کے یہ نام اسرار کی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ان ناموں کے معانی، ان کی اہمیت، ان کی تعداد اور ان کی نوعیت کے بارے میں محققین اور علما کے درمیان اختلافِ رائے ملتا ہے۔ اگر ان میں سے چند ایک، تسبیح کے دانوں پر ان ناموں کا ورد کرنے کی اہمیت سے واقف بھی ہیں تو ان کے درمیان اس عمل کی برکات کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔

ان سب مختلف ناموں میں سے "اللہ" ایک ایسا نام ہے جو خدا کے جوہر اور ان کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس لیے اسے "اسمِ ذات" کہتے ہیں۔

امام ترمذی نے ابو ہریرہؓ کے حوالے سے ایک مستند حدیث نقل کی ہے جس میں اللہ کے ننانوے نام ایک خاص ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں۔ ابو ہریرہ رسول خدا حضرت محمد ﷺ کے مستقل ہم نشینوں میں سے تھے اور انھوں نے دوسرے صحابہ سے کہیں زیادہ تعداد میں احادیث بیان کی ہیں۔ اس حدیث میں آنے والے نام، اپنی مخصوص ترتیب کے ساتھ نیچے درج کیے گئے ہیں۔ عربی اسما تو قرآن سے لیے گئے ہیں لیکن ان کے انگریزی مطالب مذہبی تفاسیر یا اسلامی علما کے مابعد الطبیعیاتی مباحث کی بجائے معیاری لغت سے نقل کیے گئے ہیں تاکہ ان اصطلاحات کی غیر جانب دارانہ اور بالکل درست تعبیر کی جا سکے۔

Dictionary meanings of Divine Names in Islam

وہ اللہ ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔	He is Allah, besides are no gods except Allah.	هو الله الذی لا اله الا الله	۱
اچھا، عطا کرنے والا، محسن، فیاض، داتا، سخی، کریم، مخیر، نیک صفت، مشفق، دیالو	Good, Giver, Beneficent	الرحمان	۲
مالک، قابض، دخیل، مقتدر اعلا، حکمران، بالاترین، صاحبِ اقتدارِ عظیم، حاکم اعلا، فرماں روا، بیرونی مداخلت یا اثر اندازی سے آزاد، سب سے زیادہ با اختیار۔	Owner, Possessor, Sovereign, Supreme Ruler, Supreme Spirit	الملک	۳

Marfat.com

پارسا، صالح، متقی، دیانت دار، منصف مزاج، عادل، راست باز، خالص، نرمل، منزہ، پاک، صاف۔ کامل، بے عیب، تمام، پختہ، تکمیل کی حد تک پہنچا ہوا، متبرک، پاک، مقدس، پرہیبت۔	Righteous, Purified Perfect, Holy	اَلْقُدُّوْسُ	۴
امن، چین، آرام، آسودگی، صلح، آشتی، سلامتی، خیریت، سکھ، راحت، امن و سکون، اطمینانِ قلب، ہم آہنگی، متانت، سرپرست، حامی، ولی، مربی، منتظم، دفاع کرنے والا، نگران، محافظ، نگہبان، رکھوالا، محفوظ کار، تحفظ کنندہ	Peace, Protector, Preserver	اَلسَّلَامُ	۵
قابلِ اعتماد، باوثوق، معتمد، بھروسے کے لائق، اعتباری، معتبر، اصل کے مطابق، وفادار، فرض شناس، فرض برآری میں اٹل، بے جھجک، وفا کیش، وعدوں کا پابند۔	To render secure and safe, Trustworthy, Faithful	اَلْمُومِنُ	۶
سرپرست، حامی، ولی، مربی، منتظم، نگران، دفاع کرنے والا، تحفظ فراہم کرنے والا۔	Protector	اَلْمُهَيْمِنُ	۷
طاقت ور، مضبوط، جسہ زور، قوی، جلیل القدر، وسعت، حجم یا اہمیت میں بڑا۔	Mighty	اَلْعَزِيْزُ	۸
جابر، مجبور کرنے والا، دباؤ ڈالنے والا، جبراً باز رکھنے والا، سختی کرنے والا، اخلاقی دباؤ سے روکنے والا، حکم ماننے پر مجبور کرنے والا، زبردستی کرنے والا، مزاحمت پر مجبور کرنے والا، طاقت کا استعمال کرنے والا، قادرِ مطلق۔	Force, Compeller, to employ power, to coerce, Omnipotent	اَلْجَبَّارُ	۹
مغرور، مفتخر، فاخر، خود پسند، خوددار، متکبر، دبدبے والا، بارعب، صاحبِ جبروت، پرجلال، باوقار، عظیم المرتبت، پرشکوہ، عالی شان، بلند، رفیع، عالی، اونچا، آراستہ و پیراستہ، گراں قدر، بیش بہا، عمدہ، عظیم، مشہور، نامی گرامی، اعلا اخلاق و کردار اور فضیلت والا، ممتاز، معروف، محترم، بلند حیثیت کا مالک، عزت مآب۔	Proud, Majestic, Noble, Eminent, Illustrious, Magnificent	اَلْمُتَكَبِّرُ	۱۰
بانی، موجد، مخترع، تخلیق کار، پیدا کرنے والا، خالق، آفرینندہ، مسبب، مشکل۔	Originator, Creator.	اَلْخَالِقُ	۱۱
عاملِ ارتقاء، خدا، الوہیت، خدائی، دیوتا، الٰہ، جسے معبود ٹھہرایا گیا ہو، سب سے بڑا خدا۔	Evolver, Deity, Highest God.	اَلْبَارِئُ	۱۲

Marfat.com

نمونہ ساز، صورت ساز، کٹائی، گھڑائی اور ارتقا سے تخلیق میں لانے والا، ذریعے ابعادی فن پارہ تخلیق کرنے والا۔	Designer, Sculptor, Fashioner, to give form, to fashion, to model, to sculpture.	اَلْمُصَوِّر	۱۳
معاف کرنے والا، غفّار، غافر، اغماض یا صرفِ نظر کرنے والا، چشم پوشی کرنے والا، تلافی کرنے والا، درگزر کرنے والا، بخشندہ، عفو دینے والا۔	Forgiver, Condoner, Absolver, Indulgence, remission of sin.	اَلْغَفَّار	۱۴
تباہ کنندہ، مسمار کنندہ، تباہ کن، فاتح، غالب، ہرانے والا، شکست دینے والا، اطاعت پر مجبور کرنے والا، مغلوب کن، غالب، ظالم، جابر، متشدد۔	Destroyer, Vanquisher, One who forces, Compels, Subduer, Oppressor.	اَلْقَهَّار	۱۵
سرفراز کرنے والا، عنایت کرنے والا، عطا کرنے والا، دہندہ، معطی، واہب، ہبہ کنندہ، ہدیہ کنندہ، سخی، فیاض، عالی ہمت، بے لوث، شریف النفس، کریم، کشادہ دل، خوش خلق، خوش نما، شفیق، متواضع، پسندیدہ، خوش گوار، دل فریب، مہربان، پرفیض، بے تعصب۔	Bestower, Giver, Donor, Generous, Gracious, One who gifts, concedes, surpassed in giving.	اَلْوَهَّاب	۱۶
پرورش کرنے والا، کفیل، قوت بخشنے والا، برقرار رکھنے والا، بحال رکھنے والا، حمایتی، سہارا دینے والا، کسی کی مدافعت کرنے والا، کسی بوجھ کو اٹھائے رکھنے والا، ساتھ دینے والا۔	Sustainer, Nourisher, Maintainer, Supporter, Provider, One who provides resources for subsistence.	اَلرَّزَّاق	۱۷
کشادہ کار، افتتاح کرنے والا، کھولنے یا شروع کرنے والا، قفل کھولنے والا، ظاہر کرنے والا، افشا کردینے والا، وضاحت کردینے والا، شرح کرنے والا، ابہام کو دور کرنے والا، تعبیر کرنے والا، صفائی میں دلائل پیش کرنے والا، ابتدا، شروع، آغاز، علتِ اولیٰ، منبع، عالمِ وجود میں آمد، مطلع، حصہ اول، پہلا سبب، فاتح، ظفریاب، فیروزمند، غالب، مظفر، منصور، فتح مند، فتح نصیب۔	Opener, Initiator, One who unlocks ,reveals, who explains, expounds, The Key, The Beginning, Victorious, Conqueror.	اَلْفَتَّاح	۱۹

Marfat.com

دانش مند، عالم، تیز فہم، ذکی، آگاہ، باخبر، خبردار، ہوشیار، سیانا، چوکس، علام الغیوب، عالمِ کل، ہمہ دان، ہمہ بین، سب کچھ جاننے والا۔ عاقل، عقل مند، فہیم، ذہین، ذی شعور، زیرک، باخبر، خردمند، سمجھ دار، صاحب بصیرت، معاملہ فہم، فرزانہ، عالم، فاضل، مطلع، واقف، کامل، دانا، قانون، مذہب، سائنس یا ادب کا عالم۔	All Knowing, Omniscient, Intelligent, Wise, Learned, Sagacious, Doctor in Law or Religion, Science or Literature.	اَلْعَلِيم	۱۹
قابض، ٹھیکے دار، معاہدہ کرنے والا، اجارہ دار، مروڑنے والا، بل ڈالنے والا، سخت گیر، درشت، تند یا ترش مزاج، باز رکھنے والا، اینٹھنے، بھینچنے یا سکیڑنے والا۔	Constrictor, Contractor, Restrictor, Curtailer, Astringent, One who refrains, who grasps, takes away.	اَلْقَابِض	۲۰
پھیلانے والا، افزوں کرنے والا، وسیع تر، درازتر، زیادہ فراواں، اضافہ کرنے والا، مسرت بخش، پر انبساط، خرم، محظوظ، بشاش، مسرور، کیف آور۔	Expander, Dilating, amplifying, stretching out, making capacious, joyful, merry.	اَلْبَاسِط	۲۱
فروتن، خاکسار، ناچیز، مسکین، حلیم اور عاجز کر دینے والا، تکبر اور رعونت ختم کر دینے والا۔	Abaser, One who humiliates, humbles, makes lower.	اَلْخَافِض	۲۲
عظمت بخشنے والا، عزت بڑھانے والا، بلند کرنے والا، نشیب سے اٹھا کر بلندی تک لے جانے والا، شائستہ بنانے والا، اعزاز عطا کرنے والا، مشرف کرنے والا، پھیلانے یا ابھارنے والا، سربرآوردہ، بلند مرتبہ دینے والا، کسی کو قابلِ احترام بنانے والا۔	The Exalter, One who elevates, makes eminent.	اَلرَّافِع	۲۳
عزت، وقار، توقیر، قدر، شرف، منزلت، ساکھ، اعزاز، آبرو، ضمیر، اخلاق، ایمان، مرتبہ، شہرت، شکوہ، عظمت دینے والا، ادب، پاس، لحاظ، تواضع، مدارات، مان، آن، لاج، قدر، بڑائی، اوج، دبدبہ، جلال، اخلاقی معیار اور کردار کی بلندی والا۔	One who Honors.	اَلْمُعِزّ	۲۴
بے حرمتی، بے عزتی، بے وقعتی، بدنامی، رسوائی، ذلت، شرم، بے اعتباری، ذلت، ننگ اور رسوائی کا باعث۔	One who Dishonors.	اَلْمُذِلّ	۲۵
سب کچھ سننے والا۔	All Hearing.	اَلسَّمِيع	۲۶

Marfat.com

سب کچھ دیکھنے والا۔	All Seeing	اَلْبَصِیْرُ	۲۷
قاضی، عادل، حَکَم، منصف، حاکمِ عدالت، صدرِ عدالت۔	The Judge.	اَلْحَکَمُ	۲۸
عدل پسند، صحیح، راست، سچا، قانونی، حق پر، درست، منصفانہ، معقول مبنی بر انصاف، بلا رو رعایت، ٹھیک ٹھیک، مناسب۔	The Just.	اَلْعَدْلُ	۲۹
نازک، دقیق، کومل، لطیف، سہانا، مرغوب، صاف، مہذب، باریک، نفیس، شریف، بزرگ، دھیما، فصیح، خوش ادا، خوب صورت، حسین، شائستہ، پسندیدہ، وضع دار، اعتدال پسند، تھوڑا، نرم، ملائم، ہلکا، مدھم۔	Subtle, Fine, Delicate, Refined, Gentle, Elegant, Graceful, Moderate.	اَللَّطِیْفُ	۳۰
آگاہ، واقف، چوکس، ہشیار، کبردار، مطلع، ماہر، جاننے والا، خبردار، دانا، آزمودہ کار، جہاں دیدہ، تجربہ کار۔	Aware, Knowing, Well Informed, Experienced.	اَلْخَبِیْرُ	۳۱
مہربان، نرم دل، رحیم، سلیم الطبع، شریف، بزرگ، سیدھا، دھیما، صابر، متحمل، بردبار، حلیم۔	Forbearing, Mild, Gentle, Patient, Long Suffering.	اَلْحَلِیْمُ	۳۲
اونچا، بلند، اعلا، رفیع الشان، بہت بڑا، بے اندازہ، بے انتہا، کبیر، عمدہ، عظیم۔	High, Lofty, Enormous, Very Big, Great.	اَلْعَظِیْمُ	۳۳
مغفرت کرنے والا۔ بخش دینے والا۔	All Forgiving.	اَلْغَفُوْرُ	۳۴
شکرگزار، احسان مند، مشکور، ممنون۔	Grateful.	اَلشَّکُوْرُ	۳۵
اعلا، بزرگ، شریف النفس، خاندانی، عالی ظرف، عظیم، بلند، رفیع، اونچا، ممتاز۔	Exalted, Noble, Sublime, High Elevated, top most summit, Upper Part.	اَلْعَلِیُّ	۳۶
بڑا، کبیر، عظیم، عمدہ، وسیع، تفصیلی، لا انتہا، بے حد، بے پایاں، بہ کثرت، مغرور، متکبر، خودبین، اونچا، جاہ و جلال والا۔	Great, Large, Immense, Proud, Haughty, Arrogant, Grievous, High Majesty.	اَلْکَبِیْرُ	۳۷
محافظ، نگہبان، دستگیر، ولی، سرپرست، حافظ، ظرف دار، حامی، حمایتی، ولی، مربی، امین۔	Protector, Defender, Guardian, Caretaker, known by heart.	اَلْحَفِیْظُ	۳۸

Marfat.com

پالن ہار، رزاق، پرورش کنندہ، برداشت کرنے والا، قائم رکھنے والا، حامی، محافظ، رکھوالا، بچانے والا۔	Nourisher, Sustainer, Preserver, Maintainer.	اَلْمُقِيت	۳۹
گننے والا، محاسب، حساب داں، پیمائش، اندازہ، انتہا، میعاد، درجہ، مالیت، دام، قدر، وصف۔ عوض، بدلہ، اجر، ثمر، پھل، یا انعام دینے والا۔ مکافات، پاداش۔	Reckoner, Measure, Value, One who calls to account, One who evaluates, recompense or rewards.	اَلْحَسِيب	۴۰
تاب دار، منور، درخشاں، شریف، ذوالجلال، جلیل القدر، معزز، عظیم۔	Dignified, Illustrious, Highly esteemed in rank or dignity, Glorious.	اَلْجَلِيل	۴۱
چمک دار، خاندانی، شریف النفس، عالی ظرف، عظیم، عالی نسب، قابلِ تکریم، حلیم، خلیق، سلیم، مہربان، سخی، فیاض۔	Noble, Generous, Liberal, Benign.	اَلْكَرِيم	۴۲
بیدار، چوکس، خبردار، ہوشیار، چوکنا، مستعد، متوجہ، مقابل، روبرو، مخالف، ہم سر، ہم چشم، رقیب، دشمن، حریف، مخالف، عدو۔	Watchful, Expector, Opponent, Competitor, Enemy.	اَلرَّقِيب	۴۳
جواب دہ، لائق، موافق، قابل، عطا کرنے والا، دینے والا، توقع کے مطابق۔	Responsive, Expecting, Granting.	اَلْمُجِيب	۴۴
بڑا، وسیع، فراخ، کشادہ، لمبا چوڑا، لق ودق، جامع، بے شمار، مکمل شامل، تمام ملا کے،	Ample, Capacious, All Embracing, Vast, Broad, Comprehensive, All Inclusive.	اَلْوَاسِع	۴۵
عقل مند، منصف، حکمت والا، صاحبِ بصیرت، دانا، دانش مند، طبیب، ذی علم، باخبر، صاحبِ نظر، صاحبِ علم	All Wise Judge, Physician, Learned Authority, Knowledgeable.	اَلْحَكِيم	۴۶
مشتاق، محبت آمیز، مشفق، شیدائی، مشتاق، رحم دل، پریمی، محبانہ طرزِ عمل والا، محبوب، معشوق، دوست جیسا، مہربان، دوست دار۔	Loving, Affectionate, Beloved, Friendly.	اَلْوَدُود	۴۷

Marfat.com

بزرگ ترین، عظمت والا، واجب التعظیم، عزت مآب، جلیل القدر، لائق تکریم، اعلا نسب، اعزاز یافتہ، راست باز، مستحسن، مکرم، تعظیم و تکریم کے نشانات اور اسناد سے مزین، والا شان، صاحبِ آبرو، موَقر، عالی دماغ، ذی حوصلہ، شایان۔ آفرین، ستائش، توصیف، حمد و ثنا، تحسین، مدح، قصیدہ خوانی، تعریف کے لائق۔	Excelling, Surpassing in Glory, Lauded, Praised, Honorable.	اَلْمَجِید	۴۸
باعثِ احیا، بیدار کر دینے والا، سبب، علّت، باعث، وجہ، غرض، نصب العین، مقصد، محرک، تحریک، ترغیب،	Resurrector, Awakener, Cause, Motive Incentive, Impulse.	اَلْبَاعِث	۴۹
گواہ، شاہد، شہادت، تصدیق، ثبوت، اعلان، اقرار۔	Witness, Evidence, Affirmer, Testimony.	اَلشَّھِیدُ	۵۰
صداقت، سچائی، راستی، حقیقت، اصلیت، نفس الامر، تیقن، یقینی، مصدقہ، مستقل، ثابت، قائم، محکم، مستقل، مضبوط، برقرار، مبنی بر انصاف، منصفانہ۔	Truth, Reality, Certainty, Proven, Confirmed, Just.	اَلْحَقُّ	۵۱
امین، متولی، وکیل، معتمد، مشیر۔	Trustee, Pleader, Attorney to whom one entrusts one's affairs, Counsel who represents.	اَلْوَکِیل	۵۲
مضبوط، توانا، مستحکم، طاقت ور، قادر، زور آور، قوی، جلیل القدر، شہ زور۔	Strong, Powerful, Mighty.	اَلْقَوِیّ	۵۳
پختہ، مستحکم، پکّا، غیر متبدل، غیر متغیر، بے لچک، ٹھوس، ثابت قدم، مجسم، زوردار، موَثر، متشدد	Firm, Solid, Forcible.	اَلْمَتِین	۵۴
مالک، آقا، حاکم، ناظم، ماہرِ فن، استاد، ولی نعمت، قابض، مختار، پشت پناہ، متولی، سرپرست، ولی۔	Master, Patron, Guardian Friend.	اَلْوَلِیّ	۵۵
مستحسن، توصیف و تعریف کے لائق، سزاوارِ حمد و ثنا، قابلِ تحسین و ستائش، تعظیم و تکریم کا مستحق۔	Praised, Praiseworthy, Commendable.	اَلْحَمِید	۵۶
حساب گیر، شمار کنندہ، تخمینہ کار۔	Reckoner, Counter, Calculator.	اَلْمُحْصِی	۵۷

Marfat.com

بانی، موجد، مخترع۔	Originator, One who initiates.	اَلْمُبدِی	۵۸
بحال کنندہ، تجدید کنندہ، جدت کار، اجرا کنندہ، احیا کنندہ۔	Restorer, Renewer, Renovator, One who brings back.	اَلْمُعِید	۵۹
حیات بخش، جلا بخشنے والا، موت سے زندگی پیدا کرنے والا۔	Giver of Life, Raiser from Death.	اَلْمُحی	۶۰
مہلک، قاتل، تباہ کن، مرگ آسا، خطرناک، جان لیوا، موت کا خالق۔	Deadly, Killer, Creator of Death.	اَلْمُمِیت	۶۱
زندہ، جیتا جاگتا، بقیدِ حیات، عمل پیرا، پھرتیلا، پر جوش، متحرک، زندگی نما، جان آفریدہ۔	Alive, Living, Animated.	اَلْحَیّ	۶۲
پختہ، مستحکم، جماجمایا، مستقل، پائیدار، نصب شدہ، ساکن، تذبذب سے خالی، دیرپا، دائمی، استمراری، قطعی۔	Stable, Fixed, Lasting, Permanent.	اَلْقَیُّوم	۶۳
دریافت کنندہ، یابندہ، انکشاف کنندہ، افشا کنندہ، ظاہر کنندہ، کھوجی، ایجاد و اختراع، دریافت، وجود، ہستی، تکوین، شخصیت، فردیت، مدرک۔	Finder, Discoverer, Perceived, Existing, Inventor, Invention, Discovery, Existence, Personality, Perception.	اَلْوَاجِد	۶۴
ارفع، پر شکوہ، پر جلال، ہیبت و تقدیس کا حامل، تقدس مآب، لا ثانی، لا جواب، کبریا، صاحبِ جلال و عظمت، عالی مقام، سرمست و بے خود، لائقِ تحسین و ستائش، ممتاز، منور، ذی عزت، جلیل القدر، اعزاز یافتہ۔	Sublime, Exalted, High, Praised, Noble, Glorified, Honorable.	اَلْمَاجِد	۶۵
یکتا، نرالا، انوکھا، بے مثل، عدیم النظیر، غیر معمولی، بے مثیل، منتخب، اولین، قدیم ترین، اصل، طبع زاد، بے بدل، ناقابلِ موازنہ، الگ، جدا، منفرد۔	Unique, Singular, Original, Incomparable, Isolated.	اَلْوَاحِد	۶۶
ایک، واحد، متحد، اکائی، اصلی، بنیادی، یگانگی، اتحاد، میل، ہم آہنگی، یک جہتی، غیر منقسم، منفرد، ذاتی۔	One, Oneness, Unity, Individual.	اَلاَحَد	۶۷

Marfat.com

ازلی، ابدی، لازوال، دائمی، مسلسل، استمراری، جاودانی، لگاتار، بحال کنندہ، تلافی کنندہ، ترمیم واصلاح اور مرمت ودرستی کرنے والا، اونچا، ارفع، صعودی، مصفّی۔	Eternal, Perpetual, to repair, to have recourse, succor and salvation, High, Sublime.	اَلصَّمَد	۶۸
قابل، اہل، بااستعداد، مستعد، ہوشیار، توانا، چست، فطین، قوی، ماہر، دبنگ، محکم، بلوان، زبردست، ذی اختیار، زوداثر، لامحدود قوت کا مالک۔	Able, Capable, Potent, Almighty, Prevailing over.	اَلقَادِر	۶۹
قابل، اہل، سکت، غالب، شدید، بے پناہ، ناقابلِ مزاحمت، مستبد، حاکمانہ، آمرانہ، ہمہ مقتدر۔	Able, Overpowering, Strong, Authoritative, Possessing Power.	اَلمُقتَدِر	۷۰
پہلا، سابقہ، پچھلا، پہلے آنے والا، قابلِ ترجیح، افضل، فائق، شرطِ مقدم، سابقہ، قبل، زمانی یا مکانی طور پر پہلے۔	Preceding, Prior, to Advance, First Part, Antecedent, Anterior, having priority.	اَلمُقَدِّم	۷۱
مؤخر، تاخیر سے آنے والا، متاخر، پچھلا، آخریں، عقبی، مابعد، مقلد زمانی یا ترتیبی لحاظ سے بعد میں آنے والا۔	Procrastinated, To Delay, Last Part, Latter Part, Posterior, Subsequent, Following.	اَلمُوخِّر	۷۲
پہلا، اولین، سب سے آگے، سب سے پہلے۔	First, Foremost.	اَلاوّل	۷۳
آخری، تازہ ترین، حتمی، انجامی، اختتامی۔	Last, Final.	اَلآخِر	۷۴
آشکار، ہویدا، عیاں، واضح، مرئی، قابلِ مشاہدہ، نمودار، دیدنی، ظاہر، علانیہ، بیّن، اظہر من الشمس، پیش پا افتادہ، بیرونی، خارجی، باہری، مرکز سے دور جاتا ہوا۔	Manifest, Visible, Evident, Obvious, External, Outward.	اَلظَّاهِر	۷۵
مخفی، نہاں، پوشیدہ، چھپا ہوا، خفیہ، روپوش، غیر مرئی، اندرونی، داخلی، باطنی، خلقی، پیدائشی، نفسی، فطری، جبلی، درونی۔	Hidden, Covert, Invisible, Internal, Intrinsic, recesses of mind and heart.	اَلبَاطِن	۷۶
حاکم، فرماں روا، سرکار، پیمانہ، مسطر، مربی، پشت پناہ، سرپرست۔	Governor, Ruler, Patron.	اَلوَالِی	۷۷

Marfat.com

عالی مقام، بلند مرتبت، رفیع، سربلند، ارفع ترین۔	Most Exalted Highest.	اَلْمُتَعَال	۷۸
اچھا، عمدہ، نفیس، صادق، راست گو، دین دار، پاک، صالح، پارسا، صاحبِ ایمان۔	Good, Truthful, Pious, Justified, Innocence, having good faith.	اَلْبَرُّ	۷۹
عفو پرور، رحمدل، شفیق، خطاپوش، غفور، معاف کردینے والا۔	Forgiving, Acceptor of Penitence.	اَلتَّوَّاب	۸۰
منتقم، بدلہ جو، سرزنش کرنے والا، تعزیر دینے والا۔	Avenger, Punisher.	اَلْمُنْتَقِم	۸۱
معاف کرنے والا، نرم دل، معتدل، حلیم، ہلکا، مدھم، کم، نیک، ملائم، شفیق، مہربان۔	Forgiver, Pardoner, Mild, Clement, Indulgent.	اَلْعَفُوُّ	۸۲
عفو پرور، رحم دل، خطاپوش، غفار، خیراندیش، کریم فطرت، خلیق، شریف، سلیم النفس، غم خوار، ہمدرد، مشفق۔	Forgiving, Benign, Pitiful, Compassionate.	اَلرَّءُوف	۸۳
مقتدرِ اعلا، صاحبِ اقتدار و اہمیت، بیرونی مداخلت سے آزاد، منتظم، منصرم، مختار کار، بااختیار،	Sovereign, Administrator, Superpower.	مَالِکُ الْمُلْک	۸۴
قوت، شان اور جلال کا مالک۔	Lord of Awful Mighty and Bounty.	ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام	۸۵
قاسم، تقسیم کنندہ، بانٹنے والا، عطا کرنے والا، منتشر کرنے والا، پراگندہ کرنے والا، بکھیرنے والا، حصوں میں بانٹنے والا، تجزیہ کار، الگ الگ کرنے والا، منصف، عادل، غیر جانبدار، راست، برحق۔	Divider, Distributer, Disperser, Apportioner, Analyzer, break into Equitable, parts, Just Measure.	اَلْمُقْسِط	۸۶
جامع، جمع کرنے والا، مؤلف، مدون، ملانے والا، مکمل کرنے والا، تکمیل دینے والا، جوڑنے ولا، ترکیب دینے والا، کل میں جمع کرنے والا، مجموعہ، سراسر، سب کچھ، کل، محیط، میزان، جملہ، تمام۔	Collector, Compiler, Combining, Completing, Synthesis, Make Whole, Collective, All.	اَلْجَامِعُ	۸۷
مستقل، آزاد، خود مکتفی، فارغ البال، مستغنی، تونگر، متمول، زرخیز، قیمتی، زردار۔	Independent, Self-Sufficient, Rich, Wealthy.	اَلْغَنِیُّ	۸۸

Marfat.com

آزاد کر دینے والا، مستغنی بنا دینے والا، متمول اور دولت مند کر دینے والا۔	to make Independent, to enrich, make wealthy.	اَلْمُغْنِیُ	۸۹
منع کر دینے والا، روک دینے والا، انکار کر دینے والا، بھگا دینے والا، دور ہٹا دینے والا، مزاحمت کرنے والا۔	Forbidding, Inhibiting, Refusing, Preventing, Dissuading, Hindering.	اَلْمَانِعُ	۹۰
ضرر رساں، ناحق، نقصان دہ، مضر، پر زیاں، ایذا دینے والا۔	Injurious, Hurtful, Distresses.	اَلضَّارُ	۹۱
سودمند، نافع، نفع بخش، مددگار، فائدہ بخش، آرام دہ، مفید، موافق، اچھا، عمدہ۔	Profitable, Beneficial, Advantageous, Wholesome, Good.	اَلنَّافِعُ	۹۲
روشنی، نور۔	The Light.	اَلنُّورُ	۹۳
ہدایت کنندہ، راہ نما، راہ بر، سالار، مرشد، روحانی استاد، گرو، قائد۔	to direct, to guide, Leader, Spiritual Guide.	اَلْهَادِیُ	۹۴
انوکھا، نادر، نرالا، کمیاب، لطیف، لاثانی، بے مثل، حیرت انگیز۔	Novel, Rare, Incomparable, Wonderful.	اَلْبَدِیعُ	۹۵
لازوال، لافانی، پائیدار، جاودانی، مستقل، ابدی، دائمی۔	Everlasting, Permanent, Eternal.	اَلْبَاقِیُ	۹۶
مالک، آقا، حاکم، مختار، متصرف، وارث۔	Owner, Master, Inheritor.	اَلْوَارِثُ	۹۷
رشد و ہدایت دینے والا، درست راستہ دکھانے والا، صحیح الاعتقاد، ہدایت یافتہ۔	Guiding in the right way, Right Path, Holding a right belief, one guided or directed aright.	اَلرَّشِیدُ	۹۸
بے انتہا صابر، متحمل، قوتِ برداشت کا مالک، خود پر قابو رکھنے والا، دکھ سہ جانے والا، انتظار کرنے والا، قناعت کر لینے والا، خود مطمئن۔	having great patience, Enduring, Suffering, Mild, Self Restraining, to Wait, to content oneself.	اَلصَّبُورُ	۹۹

Marfat.com

قرآن میں اصرار کیا گیا ہے اور تاریخ دان بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ محمدؐ اور ان کے پیروکار اسی خدا کی عبادت کرتے ہیں جسے یہودی بھی مانتے ہیں۔(۲۹:۴۶) قرآن کا ''اللہ'' وہی خالق خدا ہے جس نے ابراہیم سے معاہدہ کیا تھا۔

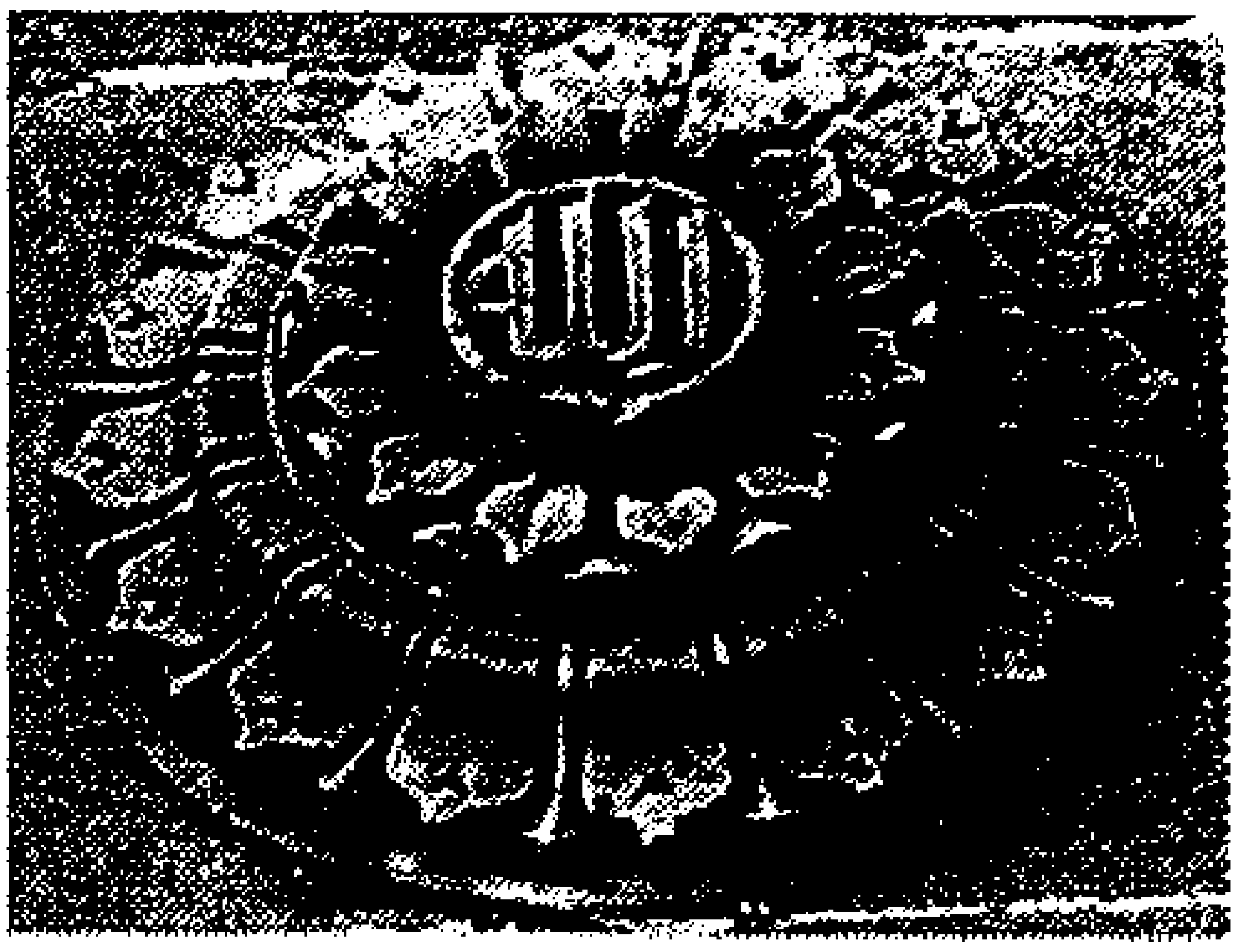

جہلم، پاکستان کے قریب قلعہ رہتاس کے مقام پر اللہ کا ایک حجری نقش

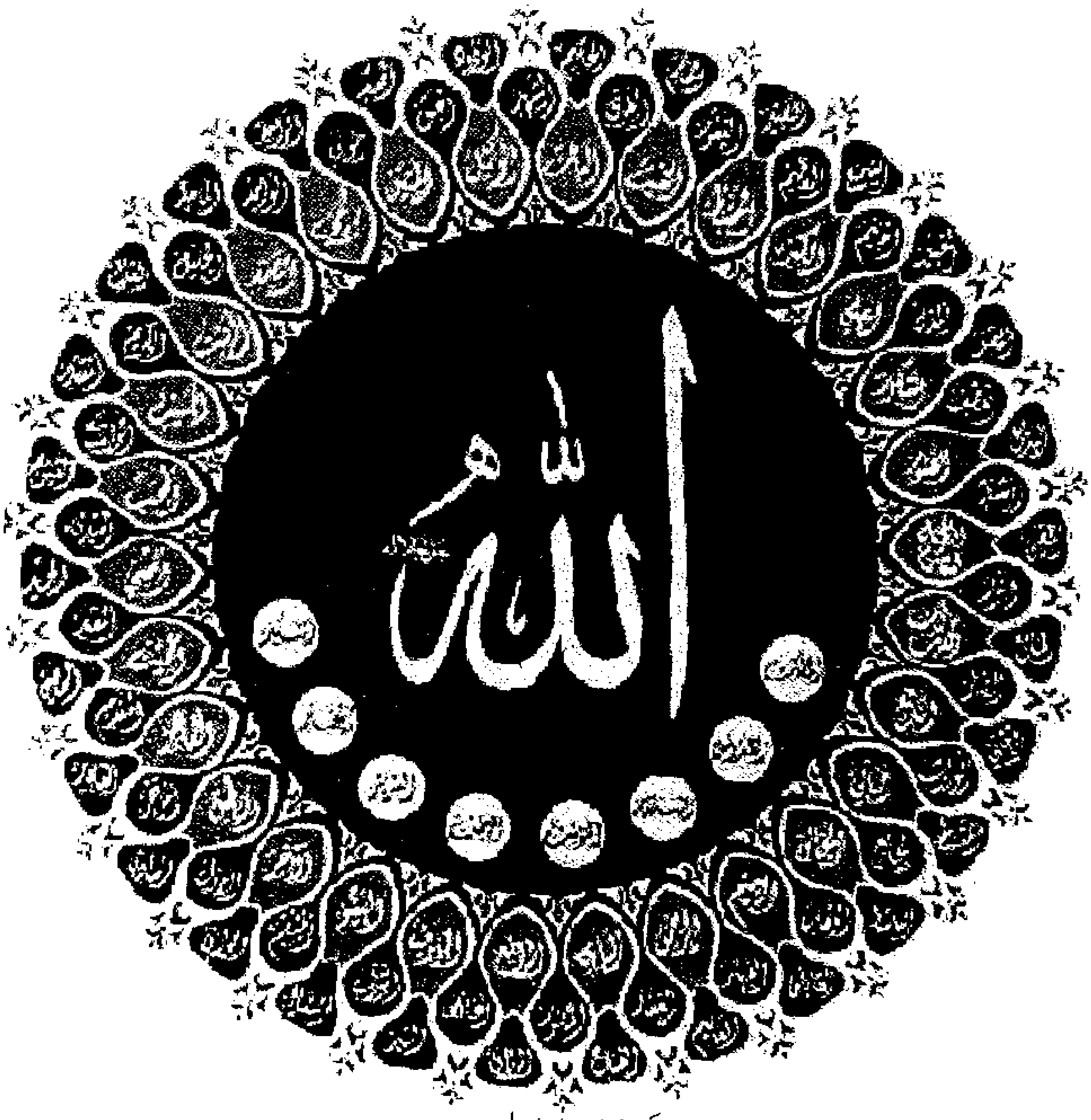

اللہ کے 99 نام کا پھول

Marfat.com

اللہ کے ننانوے نام:
The 99 Names of Allah

محققین اس فہرست میں درج اسمائے الٰہی کے مفاہیم کے بارے میں متفق نہیں ہیں۔ یہ عربی اسما مختلف اور دقیق معانی کے حامل ہیں۔ ہم نے ان الفاظ کے وہی مطلب درج کیے ہیں جو معیاری اور حوالہ جاتی لغت میں درج ہیں تاکہ کسی تعصب کا شائبہ تک نہ رہے اور آزادانہ تحقیق کی سائنسی روح برقرار رہ سکے۔ جب بھی اور جہاں بھی کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ملے ہیں، انھیں بھی اس فہرست میں شامل کرلیا گیا ہے خواہ وہ کتنے ہی غیر سنجیدہ، دنیاوی، انسانی، ایک دوسرے سے متصادم یا متضاد کیوں نہ لگتے ہوں۔

ان اسمائے الٰہی کی روزمرہ کے استعمال میں، طبعی خواص کے حوالے سے، انسانی یا نفسیاتی کوائف کے متعلق، انسانی اوصاف اور کرداری صفات کے بارے میں یا روحانیت کے تعلق سے اہمیت اور فضیلت بھی بیان کردی گئی ہے تاکہ ہر اصطلاح کے معانی کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے واضح ہو جائے۔ اگر آپ غور کریں تو دیکھیں گے کہ اکثر اسما کا تعلق انسان کی زندگی، اس کے اوصاف اور اس کی خصوصیات سے ہے۔

ان ناموں کا پہلا حصہ جو "ال، ار یا از" پر مشتمل ہے، حرف تنکیر کو ظاہر کرتا ہے اور انگریزی کے Definite Article یعنی The کے مترادف ہے۔ ان ننانوے ناموں کا ماخذ قرآن ہے۔ مسلم عقیدہ ہے کہ یہ نام اللہ نے خود اپنے پیغمبر کو الہام یا وحی کے ذریعے بتائے ہیں۔ اس لیے زمینی، تجربی یا سائنسی علم کے برعکس یہ نام ملکوتی تجلی، باطنی روشنی یا وجدانی علم کے حامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان الہامی ناموں کے ذریعے اللہ اپنی تجلیات کا اظہار کرتا ہے اور اپنی ذات کی مختلف صفات کا علم عطا کرتا ہے۔

اسمائے الٰہی کا غلط استعمال:
Misuse of Divine Names

روحانی حلقوں میں یہ زبانی روایت اور ضعیف الاعتقادی عام ہے کہ کسی استاد یا رہنما کی اجازت کے بغیر ان اسما کا تسبیح پر ورد نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ کے ان ناموں کا فرداً فرداً یا دو تین ناموں کو ملا کر، یا سب ناموں کا اکٹھے ورد کرنے کے لیے مخصوص طریقے رائج ہیں جنھیں روحانی رہنماؤں، بزرگوں، ولیوں اور نیک لوگوں نے تجویز کر

Marfat.com

رکھا ہے۔ان کے ورد کے لیے جسمانی پاکیزگی، وضو، گوشت اور جنس سے پرہیز، صاف ستھری مخصوص جائے عبادت، خلوت اور خاص اوقات بھی تجویز کیے جاتے ہیں۔ یہ تجاویز عارفوں اور مرشدوں کے طویل تجربات کا حاصل ہوتی ہیں۔ان خفیہ جماعتوں کے بزرگ، جنھیں روحانی اکسیر گر کہا جاسکتا ہے، یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کے یہ نام انسان کی زندگی سے گہرا ربط رکھتے ہیں۔انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی جھلک ان اسمائے الٰہی میں دیکھی جاسکتی ہے اور انھیں دہرانے سے زندگی کے وہ مخصوص پہلو متاثر ہوتے ہیں۔ان ناموں میں سے کسی کو بھی ایک چکر کی صورت بار بار دہرانے سے روحانی توانائی پیدا ہوتی ہے جو فیصلہ کن روحانی اور مادی اثرات مرتب کرتی ہے۔

اس سلسلے میں لوگوں کو کڑی تنبیہ کی جاتی ہے کہ ان ناموں کا علم سیکھے بغیر انھیں دہرانا اللہ کی صفات کی کیمسٹری کے غلط استعمال اور شدید نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔انھیں دہرانے کے لیے ادب، توجہ، صحیح رہنمائی اور سب سے بڑھ کر نیک نیتی کا ہونا ضروری ہے ورنہ یہ عمل خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔اس بات کے ثبوت میں عظیم بزرگوں کی سرگزشتوں میں سے کئی کہانیاں، حکایتیں اور قصے بھی بیان کیے جاتے ہیں جو ان ناموں کے غلط استعمال کے نتائج سے آگاہ کرتے ہیں۔ان کہانیوں میں ایسے واقعات بھی شامل ہیں جب کچھ ناموں کا بار بار ورد کرنے سے یہ مشق کرنے والے بزرگوں کو روحانی طاقتیں حاصل ہوگئیں۔مخصوص ناموں کو آپس میں ملا کر مرکب صورت میں دہرانے سے ایسے ہی نتائج نکلتے ہیں جیسے مثلاً آکسیجن اور ہائڈروجن کو ملانے سے پانی بن جاتا ہے۔مشرق کے صوفی ادب سے ایسے ثبوت ملتے ہیں کہ یہ نام ایسی طاقتیں پیدا کردیتے ہیں جو آگ لگاسکتی ہیں، تباہ کرسکتی ہیں یا پھر شفا بخش دیتی ہیں۔ یہ تحریریں مختلف زبانوں کے ادب میں شامل ہیں۔لیکن بدقسمتی سے ان بے شمار تحریروں کی تصدیق کے لیے کسی منظم مطالعے کی کوشش کم ہی ہوئی ہے اور اس موضوع پر مشرق کا یہ ادبی سرمایہ محققین کی عدم توجہ کا شکار رہا ہے۔

زمانۂ قدیم کے خفیہ علوم:
Secret Knowledge of Earliest Times

اس موضوع پر ملنے والے ادب کی بھاری مقدار اور تعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اسمائے الوہیت کے بارے میں خفیہ علوم تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور غالباً یہ قدیم ترین علم ہے جو ازل سے چلا آرہا ہے۔

Marfat.com

تمام پیغمبروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں علم عطا کیا گیا۔ لہٰذا ایسا ماورائی علم توریت، زبور، انجیل اور قرآن کے نزول سے پہلے بھی موجود تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک مطلق العنان، محیطِ کل ہستی، یعنی اللہ موجود ہے تو اس کی اپنی ذات ہی پہلا اور اہم ترین اصول ہوگی جو ہر چیز پر اولیت رکھتی ہے۔ اللہ کی ذات ہر شے سے پہلے ہے اور باقی سب کچھ اس کے بعد آتا ہے۔ یعنی اللہ **مقدم** ہے اور باقی ہر چیز **موٴخر**۔ گویا اللہ کے ناموں کا یہ مخفی علم قبل از تاریخ کے زمانے کا ہے۔ چاروں الہامی کتابوں کے کرۂ ارض پر نزول سے بہت پہلے کا۔

قرآن کی سورۃ البقرہ میں اس قدیم واقعے کا بیان ملتا ہے جو مٹی سے آدم کا پتلا بنانے سے پہلے آسمانوں پر وقوع پذیر ہوا تھا۔ اللہ نے اپنی آسمانی مخلوق یعنی فرشتوں سے کہا کہ وہ آدم کو زمین پر اپنا نائب بنا کر بھیجنے والا ہے۔ فرشتوں نے ایسی غیر محدود قوتیں مٹی کے ایک حقیر اور کمزور پتلے کو بخش دینے پر احتجاج کیا جس پر اللہ نے کہا: ''جو میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے''۔

اللہ نے آدم کو مخفی نام سکھائے اور اسے آسمان اور زمین میں موجود اشیا کا مخفی علم عطا کیا۔ جب آدم نے ان ناموں کو دہرایا تو فرشتے ششدر رہ گئے۔ ''سبحان اللہ! بے شک ہم علم نہیں رکھتے'' اور اللہ کے فرمان پر آدم کے سامنے سجدے میں گر گئے۔

یہی علم ۔۔۔ مخفی اسما کا علم ہی دراصل وہ طاقت تھی جو اللہ نے آدم کو اپنے نائب، اپنے معاون تخلیق کار کی حیثیت سے عطا کی تھی اور اپنی سلطنت کی تمام مخلوق کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کی اجازت دی تھی۔

یہ فراموش شدہ علم ابھی تک اسرار کی دھند میں لپٹا ہوا ہے:
Mystery Shrouds the Forgotten Knowledge.

اسما کا یہ فراموش شدہ علم ابھی تک پراسرار سمجھا جاتا ہے۔ محققین اور علما کے درمیان ان کی تعداد، نوعیت اور نتائج پر گہرے اختلافات ہیں۔ ابھی تک تربیت یافتہ افراد کی جانب سے اس معاملے پر کوئی سنجیدہ اور منظم علمی تحقیق نہیں کی گئی اور یہ علم ابھی تک باطنی، مخفی، مبہم اور مغالطہ انگیز سمجھا جاتا ہے۔ ان حالات میں اس موضوع پر تحقیق و تفتیش کا کام صرف جاہل نجومیوں اور خفیہ جماعتوں تک محدود رہ گیا۔ دوسری طرف مذہبی انتہا پسندوں اور قسمت کا حال بتانے والوں نے دنیاوی نفع کے لیے عبادت خداوندی کے عجیب و غریب طریقے اور چلّے تجویز

Marfat.com

کرنے شروع کردیے۔

اس موضوع پر حال ہی میں چھپنے والی بیشتر تحریریں بزرگانِ قدیم کی زبانی روایات سے اخذ کی گئی معلومات کی بنا پر مخصوص ناموں کا بغیر سوچے سمجھے ورد کرنے کے عملی فوائد سے متعلق ہوتی ہیں اور ان میں سے کوئی کتاب بھی ان ناموں کی اصل اہمیت، ان کے معانی اور ان کے اثرات کا احاطہ نہیں کرتی۔ ایسے اوراد کے کئی فارمولے وضع ہو چکے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی بے اولاد شخص چار ہفتے لگاتار جمعے کے دن ایک ہزار دفعہ ''الاوّل'' کا ورد کرے تو اس کے ہاں بچے کی ولادت ہوگی۔ ایک اور فارمولا یہ ہے کہ وہ عورت جو اولاد کی خواہش مند ہو، مگر اس مقصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکے، سات دن روزے رکھے اور ہر روز، روزہ افطار کرتے ہوئے، اکیس مرتبہ ''الخالق، البارى، المصور'' کا ورد کر کے پانی کے گلاس پر پھونک مارے اور پھر وہ پانی پی لے تو اللہ اس کی گود ہری کر دے گا۔

میرا مقصد اللہ کے ناموں کی اس عملی نفع بخشی کو جھٹلانا ہرگز نہیں۔ ان ناموں کا اس طریقے سے ورد کرنا بھی یقیناً مفید ہوگا۔ اور نہ میں ان زبانی روایات اور رسومات کی افادیت کے بارے میں مشکوک ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ان اسمائے حسنہ کی برکات کے حصول کے لیے ان کی معنویت اور افادیت سے عقلی طور پر واقف ہونا ضروری نہیں۔ جیسے گاڑی چلانے کے لیے کار کی مشینری اور اس کی کارکردگی سے آگاہ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ اسی طرح جو ورد کرتا ہے وہ اس کے اثرات سے بھی فیض یاب ہوتا ہے۔ ایک صارف کی طرح جو صرف اپنی اشیائے صرف کے استعمال اور ان سے فائدہ اٹھانے میں دلچسپی رکھتا ہے۔

میرا مقصد صرف یہ کہنا ہے کہ اسمائے الٰہی کے اس شاندار ورثے اور دانش کے اس مخفی خزانے کی، وسیع القلبی، روشن دماغی اور عقیدے کی پختگی کے ساتھ جیسی تحقیق و تلاش ہونی چاہیے تھی، ویسی ابھی تک نہ ہو سکی۔ توریت اور قرآن کی طرح جنھیں مارے ادب کے عقیدت مند، ریشمی، خوب صورت، معطر غلافوں میں لپیٹ کر گھر کی سب سے اونچی کارنس یا الماری کے بلند ترین خانے میں سجا چھوڑتے ہیں، ان اسما کا بھی بے حد احترام کیا جاتا ہے۔ ان پر عقیدہ رکھنے والے انھیں بھی طغروں کی صورت سجاتے اور لٹکاتے ہیں لیکن ان عقیدت مندوں کے روزمرہ معمولاتِ زندگی ان کی عملی افادیت، ان کی باطنی تجلی سے محروم ہی رہتے ہیں۔

عربی زبان میں اسمائے حسنیٰ پر چند ایک علمی نوعیت کے کام، جو ابتدائی دور میں ہوئے تھے، اب یا تو طبع نہیں

Marfat.com

ہوتے یا پھر ہمیشہ کے لیے نابود ہو چکے ہیں۔عہدِ حاضر کی تازہ ترین تصانیف میں سے ایک، ڈینیئل گیمارے (Daniel Gimaret) کی *Les Noms Divin eu Islam* ہے جو ۱۹۸۸ میں پیرس سے شائع ہوئی۔ بدقسمتی سے میں فرانسیسی نہیں جانتا اور اس کتاب کے مندرجات سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ تاہم یہ اس موضوع پر چند جامع تصانیف میں سے ایک ہے۔ یہ اسمائے حسنٰی کے لغوی مادے، معانی، مابعدالطبیعیات، لوک ریت اور الٰہیات کے مباحث پر مبنی ہے۔

ان اسمائے حسنہ کے عمومی معنی بیان کرنے کے بعد اب ہم ان ناموں کی نوعیت و ماہیت کی طرف چلتے ہیں۔

اللہ ایک پہیلی:
Allah The Riddle

ان میں سے کئی اسما اور ان کی ترتیب انسان کے لیے ایک پہیلی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ نام اللہ نے انسان کے سامنے اس لیے پیش کیے ہیں تاکہ اس میں اللہ کو جاننے کی ترغیب پیدا کریں۔ وہ خود اپنے بارے میں اشارے کر رہا ہے اور آگے بڑھنے کو اکسا بھی رہا ہے۔ ایک مثال دیکھیے:

المبدی (بانی، موجد، مخترع)،

المعید (بحال کنندہ، تجدید کنندہ، جدت کار)،

المحی (حیات بخش، جلا بخشنے والا، موت سے زندگی پیدا کرنے والا)،

الممیت (مہلک، قاتل، تباہ کن، مرگ آسا، خطرناک، جان لیوا، موت کا خالق)،

الحی (زندہ، جیتا جاگتا، بقیدِ حیات، عمل پیرا، پھرتیلا، پرجوش، متحرک، زندگی نما، جان آفریدہ)،

القیوم (پختہ، مستحکم، جما جمایا، مستقل، پائیدار، نصب شدہ، ساکن، تذبذب سے خالی، دیرپا، دائمی، استمراری، قطعی)،

الواحد (یکتا، نرالا، انوکھا، بے مثل، عدیم النظیر، غیر معمولی، اولین، قدیم ترین، اصل، طبع زاد، بے بدل، جدا، منفرد)،

الاحد (ایک، واحد، متحد، اکائی، اصلی، بنیادی، غیر منقسم، منفرد، ذاتی)

Marfat.com

بتاؤ تو کون؟

بوجھو تو جانیں!

کوشش تو کرو، آگے بڑھو۔۔

اب ایک اور ترتیب دیکھیے:

المقدم (پہلا، سابقہ، پچھلا، پہلے آنے والا، قابلِ ترجیح، افضل، فائق، قبل، زمانی یا مکانی طور پر پہلے)،

الموخر (مؤخر، تاخیر سے آنے والا، متاخر، پچھلا، آخریں، عقبی، مابعد، مقلدز مانی یا ترتیبی لحاظ سے بعد میں آنے والا)،

الاوّل (پہلا، اولین، سب سے آگے، سب سے پہلے)،

الآخر (آخری، تازہ ترین، حتمی، انجامی، اختتامی)،

الظاہر (آشکار، ہویدا، عیاں، واضح، مرئی، قابلِ مشاہدہ، نمودار، دیدنی، ظاہر، بیّن، اظہر من الشمس، پیش پا افتادہ، بیرونی، خارجی، باہری، مرکز سے دور جاتا ہوا)،

الباطن (مخفی، نہاں، پوشیدہ، چھپا ہوا، خفیہ، روپوش، غیر مرئی، اندرونی، داخلی، باطنی، خلقی، پیدائشی، نفسی، فطری، جبلی، درونی)،

بتاؤ کون ہے؟

ادھر ادھر دیکھو، کون ہوسکتا ہے؟ کوشش تو کرو!

ایک روایت کے مطابق ان ناموں کو زبانی یاد کر لینا فائدہ بخش ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ ان ناموں کا اصل مقصد نہیں ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ اس ذات کو تلاش کیا جائے جس کے یہ نام ہیں۔

تلاش تو اسے کرنا ہے جس کے یہ نام ہیں:
Find the One Who is Named

مشرق میں تصوف اس بات کی مشق بہم پہنچاتا ہے کہ ان اسما پر اس طرح غور و فکر کیا جائے کہ پہلے اپنے اندر (باطن) اور پھر خارجی دنیا (ظاہر) میں اس ذات کو پہچان لیا جائے۔ اسی طرح وحدت الوجود، جس کا لغوی مطلب ہے، خدا کی ذات کا واحد ہونا، مابعد الطبیعیاتی سطح پر کثرت میں وحدت کو تلاش کرنے کا علم ہے۔ لفظ

Marfat.com

'وجود' کا مادہ 'وَجَدَ' ہے، جس کا مطلب ہے، ''وہ جسے ڈھونڈا جا سکے''۔ صوفی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے خدا کے وجود کا تجربہ کیا ہے اور مابعد الطبیعیاتی نظریات کی بجائے براہ راست تجربے سے اسے پہچانا ہے۔ اس حوالے سے تصوف تجربیت کے مترادف ہے۔ 'وجد' کے معنی ہیں خدا کا اہتزاز انگیز تجربہ جو صوفی کے لیے تخیل نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اس بات سے بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ خدا تک صرف مذہبی تجربے کے ذریعے ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ بہت سے صوفیا نے اپنے اس وجودی تجربے کو اپنی تصانیف میں بیان کیا ہے اور ''الف'' کا نکتہ بیان کیا ہے؛ (الف عربی حروفِ تہجی کا پہلا حرف ہے اور اللہ کو ظاہر کرتا ہے) جو نیرنگی اور تنوع میں وحدت پیدا کرنے کا اصول ہے اور یہی اصول صدیوں سے فلسفے کی اعلیٰ تر تلاش کا حاصل ہے۔

''عبادت'' کا تصور، جس کے لغوی معنی پرستش، بندگی اور اظہارِ عبودیت کے ہیں، اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اللہ کے ناموں کا ورد کر کے اس کی تعریف کی جائے۔ مثال کے طور پر اسلام کی فرض عبادت یعنی نماز (صلوٰۃ) بھی منظم طریقے سے اسمائے الٰہی کے ورد ہی کا نام ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: ''اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔'' اس جملے میں اللہ کے تین نام ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں۔ اب آگے دیکھیے، ''تعریف ہو اللہ کی جو رب ہے تمام جہانوں کا''۔ سجدے میں جب انسان انتہائی عاجزی سے زمین پر ماتھا ٹیکتا ہے تو دہراتا ہے، ''تعریف ہو اللہ کی جو سب سے بڑا اور بلند و برتر ہے''۔

عظیم صوفی شیخ طالب کو ذکر اور ورد کے طریقے اور آداب سکھاتے ہیں۔ ذکر کا لفظی مطلب ہے، یاد کرنا، دہرانا، نام لینا، بلند کرنا اور ورد کا مطلب ہے بار بار دہرانا، ایک تسبیح کے دانوں پر کسی لفظ کو بار بار پڑھنا۔

اللہ کی کیمسٹری اور فزکس:
Chemistry and Physics of Allah

اللہ کے اسرار کو جاننے کے لیے ایک اور حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ یہ محض نام نہیں ہیں۔ یہ عام معمول کے انداز میں صرف ایک ذات کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ اس ذات کی مخصوص خصوصیات اور خواص (properties) بیان کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ لطیف ہے، آگاہ ہے، صابر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نام اس کے وظائف، عمل اور ردعمل اور اس کے افعال (action-reaction) کے بارے میں بھی بتاتے ہیں مثلاً یہ کہ وہ فراخی پیدا کرنے والا ہے، تنگی پیدا کرنے والا ہے، حساب لینے والا ہے۔ اگر ہم یہاں کیمسٹری اور فزکس سے مماثلت تلاش

Marfat.com

کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اگر ہمیں کسی عنصر کے خواص معلوم ہو جائیں اور ہم اس کا بغور مشاہدہ کر کے اس کے طرزِ عمل اور فعل کا بھی اندازہ لگالیں تو ہم فوراً بغیر کسی مشکل کے اس عنصر کی شناخت کے قابل ہو جائیں گے خواہ وہ کتنی ہی خام صورت میں موجود ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ عناصر خالص حالت میں شاید ہی کبھی مل سکیں، ہمیں ہمیشہ سائنسی مشاہدے کے ذریعے انھیں پہچاننا اور مختلف مرکبات میں سے الگ کرنا پڑتا ہے۔ سائنس دانوں نے ۹۲ عناصر دریافت کیے ہیں جو پوری کی پوری طبعی دنیا کا خام مواد ہیں۔ یہ ۹۲ عناصر مادے کے تمام تر تغیرات، تقلیب اور ظہور میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ سائنس کی عظیم ترین کامیابیوں میں سے ایک عناصر کا دوری جدول (periodic table of elements) تیار کرنا ہے جو تمام مادی علوم، فزکس اور کیمسٹری کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

مرئی حقیقت کے اجزائے ترکیبی:
Building Blocks of Tangible Reality

عنصر کے لیے انگریزی لفظ element ہے جو لاطینی کے لفظ elementum سے ماخوذ ہے اور جس کا مطلب ہے وہ سادہ شے جس سے پیچیدہ اشیا بنائی جائیں۔ سائنس دانوں کو یہ جاننے میں ۲۶۰۰ سال لگ گئے کہ وہ کون سے بنیادی اور لازمی عناصر ہیں جن سے یہ کائنات بنی ہے۔ انھیں یقین تھا کہ عناصر ہی وہ اساسی مادہ ہے جس سے تمام تر کائنات بنی ہے۔ ہر شخص انسان کے اردگرد موجود روزمرہ کی اشیا سے واقف تھا لیکن ان سب اشیا کا مادہ مختلف تھا اور متنوع خواص کا مالک تھا۔ کچھ اشیا گرم تھیں، کچھ ٹھنڈی، کچھ گیلی تھیں، کچھ خشک۔ سائنس داں حیران تھے کہ اس بے پناہ تنوع میں کیسے کوئی مشترک بات تلاش کریں؟ ان ایک دوسرے سے متضاد خواص کو آپس میں جوڑنے والی چیز کیا ہے؟ یہ کھوج لگانے والے اولین سائنس دان عرب کیمیادان تھے جنھیں Al-Chemist کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ عربی کے لفظ الکیمیا سے لیا گیا ہے۔ کئی صدیوں تک وہ الاکسیر کی تلاش میں بنیادی عناصر کے خواص، انفعال اور عمل کا کھوج لگاتے رہے۔ (انگریزی لفظ elixir، اسی عربی لفظ الاکسیر کی تبدیل شدہ صورت ہے)۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ سیسے جیسی عام دھاتوں کو سونے میں بدل دیں۔ یہ ابتدائی مشرقی اکسیر گر صوفی تھے۔ ان کا علم اور طریق کار پراسرار تھا۔ انھوں نے دھاتوں کے طبعی خواص کو سماوی اجسام سے منسلک کر دیا۔ مثلاً وہ سونے کو سورج اور چاندی کو چاند کہتے تھے۔ جس تیزاب سے سونا گلایا جاتا تھا اسے انھوں

Marfat.com

نے aqua regia کا نام دے رکھا تھا۔ کیمیا گروں کو نجانے کیوں یقین تھا کہ وہ سستی دھاتوں کو سونے میں بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ اس عمل کا راز عناصر کے ناموں، ان کے خواص اور طرزِ عمل میں پوشیدہ ہے۔ یہ بات کسی کو ٹھیک سے معلوم نہیں ہو سکی کہ کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئے یا نہیں؟ مشرق میں اگر کسی کو کوئی کامیابی مل بھی گئی تو اس میدان کے پیشہ ور ماہرین نے اسے فوراً خاموش کر دیا۔

مغرب نے کیمیا گری کا یہ علم، کیمیا گری کے بانی الجابر، الرازی اور ابن سینا جیسے عرب سائنس دانوں کے ذریعے سیکھا۔ پھر یہ پر اسرار علم جعل ساز اور ڈھونگی اتائیوں کے ہاتھ لگ گیا جنھوں نے اسے مال کمانے کا ذریعہ بنا لیا۔ ان فریب کاروں نے سونا بنانے کا لالچ دے کر حریص یورپی بادشاہوں سے خطیر رقم، اقتدار اور سرپرستی حاصل کر لی۔

یوں جس علم کا آغاز ایک مخفی سائنس کے طور پر ہوا تھا، آخر کار وہ بدنام ہو کر رہ گیا۔ مشرق میں کیمیا گری ہمیشہ سے ایک مخفی فن ہی رہی ہے اور اس میدان میں صرف ان چند صوفیوں نے ہی قدم رکھا جن میں یہ جرأت تھی کہ مادے کو تبدیل کرنے کے راز کو پا سکیں۔

دنیا کے مغربی خطے میں، اسرار کی دنیا سے ہٹ کر ایک تحریک نمودار ہوئی جس کا مقصد کرۂ ارض کے اجزائے ترکیبی کا زمینی اور شفاف سائنسی انداز میں کھوج لگانا تھا۔ تاہم اس سارے عمل میں مشرق و مغرب کے کیمیا گروں نے اہم سائنسی دریافتیں کیں جن میں سے کچھ سونے سے بھی زیادہ قیمتی ثابت ہوئیں مثلاً آرسینک، زنک، پارہ، ٹین، تانبہ، سلفیورک اور نائٹرک ایسڈ وغیرہ جو کئی جدید صنعتوں کی بنیاد ہیں۔ اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ جدید کیمسٹری اپنی بہت سے ابتدائی دریافتوں کے لیے کیمیا گری کی ممنونِ احسان ہے۔ متقدمین کیمیا دانوں کے پیش کردہ خیالات و نظریات اس قدر معقول اور ناقابلِ مزاحمت تھے کہ آئزک نیوٹن جیسا عظیم ترین سائنسی ذہن رکھنے والا سائنس دان بھی برسوں سونا بنانے کے تجربات کرتا رہا۔ نیوٹن نے کیمیا گری یعنی سونا بنانے کے نسخے کی تلاش میں بہت وقت صرف کیا۔ ان ابتدائی عرب کیمیا گروں کے خیالات میں کچھ تو ایسی پر اسرار اور ناقابلِ تردید بات ضرور تھی۔

Marfat.com

غیر مرئی حقیقت کے اجزاے ترکیبی:
Building Blocks of Intangible Reality

شاید اللہ کی یہ صفات غیر مرئی حقیقت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ جس طرح دنیا کی تمام زبانیں، جن میں ان گنت الفاظ ہیں، دراصل چند ایک حروف تہجی سے ہی مل کر بنتی ہیں، اسی طرح قدیم یونانی بھی یہ یقین کرنے میں حق بجانب تھے کہ مادی اشیا کی یہ بے اندازہ تعداد دراصل چند ایک بنیادی عناصر کی باہمی ترکیب کا نتیجہ ہے۔ آج دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ بات درست ہے تاہم ان بنیادی عناصر کی شناخت کا عمل ابھی جاری ہے اور تحقیق ونظر ثانی کے مرحلوں سے گزر رہا ہے۔ اللہ کے ننانوے نام بھی شاید حقیقت کے غیر مرئی پہلو کے بنیادی عناصر ہیں جو بلاشبہ حقیقت کا پورا نقشہ ہیں۔ یہ ننانوے نام انسان کی ذہنی قوت کے ظہور، تقلیب اور ترکیب وتغیر، گویا اعلیٰ تر غیر مرئی حقیقت کی کلید ہیں۔ یہ انسان کے مزید ارتقا کی ضمانت ہیں۔ ایک متوازی حقیقت کی کائنات میں بانوے (۹۲) معلوم عناصر اس غیر مرئی حقیقت کا مرئی پہلو ہیں جو اس کے متوازی اور مساوی ہے۔ ان کے بعد ایک برتر حقیقت کی غیر مرئی اقلیم شروع ہوتی ہے جس میں ہم پہلے ہی ذہنی ارتقا کے ذریعے داخل ہو چکے ہیں۔ یہی ذہنی ارتقا ہماری بقا کا ذمہ دار ہے۔ ہماری طبعی اقلیم سائنسی تلاش وتفتیش کے نتیجے میں اب خوب اچھی طرح کھنگالی جا چکی ہے، یہ دنیا اب ختم ہو رہی ہے، اس کے قدرتی وسائل بھی انسانی جسم کی طرح گھٹتے اور آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف غیر طبعی دنیا، انسانی شعور کی دنیا، سوچ کی دنیا، علم کی دنیا ایک نئی طلوع ہونے والی حقیقت ہے۔ انسانی ذہن، جو غیر مرئی حقیقت کا پیمانہ ہے، ترقی کر رہا ہے اور برتر حقائق تک رسائی کے لیے، وجود کی اعلا تر سطح تک پہنچنے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ اب ہم غیر مرئی دنیا میں داخل ہو رہے ہیں۔

غیر مرئی دور کا آغاز:
The Dawn of Intangible

اللہ کے یہ ننانوے نام مجرد اور غیر مرئی حقیقت تک رسائی کا وسیلہ ہیں۔ یہ انسانی خودی کی بقا اور اس کی کایا پلٹ کا راز ہیں۔ یہ ممکنہ طور پر انسانی اوصاف، خصائل اور عناصر میں پوشیدہ سونے کی دریافت کا راستہ ہیں۔ آج ہم اللہ کی دہلیز پر کھڑے ہیں جو ایک مجرد حقیقت ہے۔ ہم ایک نئی صبح کے طلوع کے تماشائی ہیں جو غیر مرئی دنیا کا

Marfat.com

دروازہ کھول رہی ہے۔صرف ان اسمائے حسنٰی کی درست تفہیم، ذہن کی کچھ اور وسعت اور سائنسی تحقیق و تفتیش کے ذریعے ہم اس کرۂ ارض پر اپنی بقا کو قائم رکھنے کے قابل ہو سکتے ہیں ۔ یہ اسما ہمیں ابھرتی ہوئی سچائیوں اور تیز رفتار ماحولیاتی تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہونا سکھا کر حقیقتِ عظمٰی کی اصل فطرت سے آگاہ ہونے میں مدد دے سکتے ہیں۔ہمیں ''غیر مرئی عہد'' کا نقیب بننا ہے اور انسان کی مزید نشوونما اور ارتقا کے ناقابلِ تصور امکانات کا دروازہ کھولنا ہے۔

بنی نوع انسان کو نہایت جائز طور پر اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔انسان کا ارتقا ہمیشہ سے نئے چیلنجوں کا محتاج رہا ہے۔ابھی تک ہم نے اپنی ذہنی قوت کا نہایت معمولی سا حصہ استعمال کرنا سیکھا ہے۔ ہمارا ذہن ابھی نشوونما پا رہا ہے اور مستقبل میں ترقی کے ان گنت امکانات روشن ہیں۔ ساز وسامان (hardware) تو موجود ہے لیکن یہ کام کرنا تب شروع کرے گا جب انسان اس کے لیے کوشش کرے گا۔ شاید اپنی استعداد کی بھرپور تکمیل کے لیے اسے کئی زندگیوں کا وقت درکار ہو، شاید میرے اس خواب کی تعبیر سامنے آنے میں ایک ہزار سال اور لگ جائیں۔شاید اللہ سب پہیلیوں سے بڑی پہیلی ہے اور اس کائنات اور اصل حقیقت کی تفہیم کا راز اسی پہیلی کے جواب میں پوشیدہ ہے۔۔۔اللہ کے ننانوے نام۔

اللہ کی درجہ بندی:
ALLAH CLASSIFIED

درجہ بندیاں اور اس کے مختلف طریقے سائنسی مطالعات کو آسان اور منظم بنانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور ہمیں یہ جاننے کا موقع دیتے ہیں کہ کیا زیر مطالعہ مواد میں کوئی خاص ترتیب، تنظیم اور نقش یا نمونہ موجود ہے یا نہیں؟ یہ نمونے کسی عمومی اصول اور سائنسی قانون کی موجودگی کا پتا دیتے ہیں۔سویڈن کے سائنس دان کارل لینائیس (Karl Linnaeus) نے پودوں اور حیوانات کی درجہ بندی کا نظام وضع کیا تھا۔چارلس ڈارون (Charles Darwin) نے اس نظام کی بنیاد پر ہزاروں پودوں اور جانوروں کی درجہ بندی کی اور یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ ان میں سے ہر ایک نوع کس طرح لاکھوں سال کے ارتقا کے دوران مختلف تبدیلیوں سے گزرتی رہی ہے۔سائنس نے بار بار یہ ثابت کیا ہے کہ کس طرح زندگی کی ادنیٰ سطح کے مظاہر کے مطالعے،ان کا اندراج اور درجہ بندی کرنے سے ہمیں زندگی کے اعلیٰ مظاہر کو سمجھنے میں مدد ملی ہے اور اس کے برعکس اعلیٰ مظاہر کے ایسے ہی

Marfat.com

مطالعے سے گزشتہ ادنیٰ مراحل کو سمجھنے میں آسانی ہوئی ہے۔

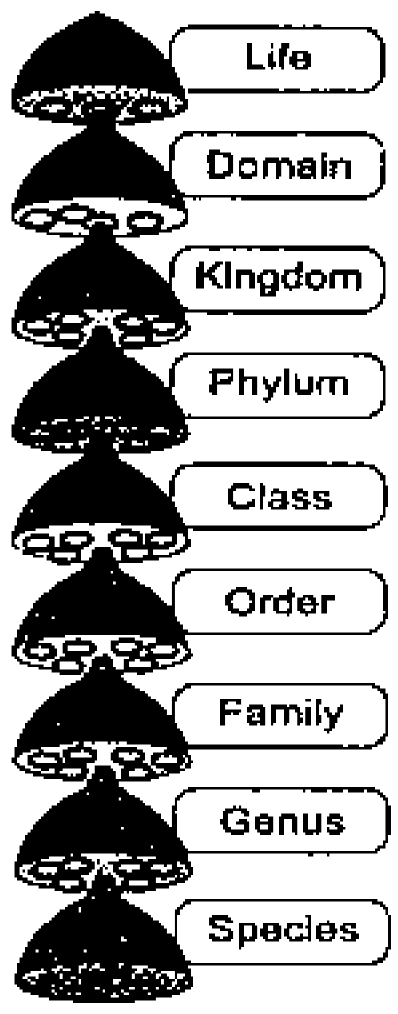

ڈارون تھیوری کے نتیجے میں یہ خیال عام ہو گیا کہ درجہ بندی ڈارون کے اشتراکِ نسل کے تصور کا اظہار کرتی ہے اور شجرِ حیات جیسی تصویریں سائنسی تصانیف میں مقبول ہونے لگیں۔ حیاتیاتی درجہ بندی کے آٹھ اہم درجے یا زینے۔ درمیانی یا کم اہم مدارج ظاہر نہیں کیے گئے۔

کسی ہستی کی ماہیت کی درجہ بندی، تدریج، زمرہ بندی اور ترتیب و تقسیم ایک قسم کی مابعد الطبیعیات ہے جسے وجودیات (Ontology) کہا جاتا ہے جو ہستی اور وجود کا علم ہے۔ مختلف فلسفیوں نے اس مشکل سوال کے مختلف مابعد الطبیعیاتی جواب تلاش کیے ہیں۔ وجود (Existence) کیا ہے؟ اس کی بنیادی اکائیاں کیا ہیں؟ وجود (existence) کے خصائص کیا ہیں؟ ان خصائص کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ وجود کی کتنی سطحیں (levels of existence) ہیں؟ اور اس سطح سے مراد کیا ہے؟ یہ تصنیف اس اعتبار سے ان گزشتہ مابعد الطبیعیاتی تصورات سے مختلف ہے کہ یہ ہستی (Being) کی سادہ ترین تصویر پیش کرتی ہے اور اس کی ہر سطح کو جدید سائنسی تحقیق کی روشنی میں بیان کرتی ہے۔

اللہ کے ناموں کو عمومی طور پر تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جنھیں ''اسماے ذات''، ''اسماے صفات'' اور ''اسماے فعل'' کہتے ہیں۔

اسم ذات خاص اور ذاتی نام کو کہتے ہیں جیسے ''اللہ'' اسم ذات ہے۔ یہ خاص طور پر اس کی ذات کو ظاہر کرتا ہے اور اس کے سوا کسی کے لیے استعمال نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا پہلا درجہ تو اللہ کی ذات کا ہے۔

اسماے صفات اللہ کی صفات اور خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں جیسے سب کچھ جاننے والا (العالم)،

Marfat.com

حفاظت کرنے والا (المھیمن)، جبر کرنے والا (الجبّار)۔ گویا دوسرا درجہ اللہ کی صفات، اوصاف، رویے اور طرزِ عمل کا ہے۔

اسمائے فعل اللہ کے کاموں کو ظاہر کرتے ہیں یعنی وہ افعال جو وہ سرانجام دیتا ہے، مثلاً ابتدا کرنے والا (المبدی)، بحال کرنے والا (المعید)، تخلیق کرنے والا (الخالق)۔ یوں تیسرے درجے پر اللہ کے افعال آتے ہیں۔ وہ کام جو وہ انجام دیتا ہے، وہ نظام جس پر وہ عمل کرتا ہے، وہ طریق کار جو وہ اپناتا ہے اور وہ طرزِ عمل جو وہ اختیار کرتا ہے۔

اللہ جو نہاں ہے:
ALLAH THE HIDDEN

اللہ کی ذات، اس کا جوہر، اس کا اصل نہاں ہے۔ اللہ کا یہ نہاں پہلو انسانی فہم و فراست سے بالاتر ہے۔ وہ غیر مرئی ہے، مجرد ہے، نامعلوم ہے۔ وہ کسی ان دیکھی دنیا (عالمِ غیب) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے ہم اسمائے ذات کے ذریعے اس کی ہستی کو نہیں پہچان سکتے۔ یہ اللہ کی غیر مرئی حقیقت ہے جو انسانی تجربے اور علم سے ماورا ہے۔ وہ مخفی ہے۔ اس مخفی ہستی پر یقین رکھنا ہی ایمان ہے۔ اس کے الفاظ ایک حکم ہیں، اس کا پیغام ایک عقیدہ ہے، وہ ایک مختارِ کل ہستی ہے۔ وہ اکملیت ہے، غیر متبدّل اور مطلق ہے، وہ زمان و مکاں اور تغیر و تبدل کے تمام تر انسانی تصورات سے بالاتر ہے اور اس کے افعال ناقابلِ پیش گوئی گمان اور اتفاقات ہیں۔ کیا جدید فزکس کے پاس اس کے مساوی کوئی مثال موجود ہے؟ یہ ابھی دریافت ہونا باقی ہے۔ حقیقت کی سب سے آخری، نچلی اور خفیف ترین سطح پر اس کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی انھی اوصاف کو ظاہر کرتا ہے؛ یعنی یہ بیک وقت غیر مرئی موج بھی ہے اور مرئی ذرّہ بھی۔ نہاں بھی اور عیاں بھی۔ پوشیدہ بھی اور ظاہر بھی۔

اللہ جو عیاں ہے:
ALLAH THE OBVIOUS

اللہ کی صفات اور اس کے افعال مادی دنیا میں اسی طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں جیسے انسانوں کے خیالات، اعمال و خصوصیات۔ اس کے اوصاف اس خارجی دنیا (عالم شہادت: لغوی معنی گواہی کی دنیا) میں صرف انسانی

Marfat.com

اوصاف کی صورت ہی ظاہر نہیں ہوتے بلکہ طبعی قوانین اور مادی اصولوں کی صورت میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ یوں اللہ کے اسما اور اس کی صفات ظاہر ہوتے ہیں اور جس حد تک ظاہر ہوتے ہیں، اس حد تک ان کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔اس حد تک اللہ کے بارے میں سوال بھی اٹھائے جاسکتے ہیں اور تحقیق و تفتیش بھی کی جاسکتی ہے۔

اس کی صفات و افعال اس کے کاموں میں ظاہر ہوتے ہیں۔اگر اللہ تخلیق کار ہے تو اس کا تخیل، اس کا تصور، اس کا نقشِ خیال اس کی تخلیق کے ذریعے ہی ظاہر ہوں گے۔ یوں اسے ہماری اس جانی پہچانی، جاندار اور بے جان اشیا کی دنیا میں آسانی سے ڈھونڈا جا سکتا ہے۔اسے خود ہماری اپنی خلقی (inherent) خصوصیات، کردار، اوصاف اور صلاحیتوں میں پہچانا جا سکتا ہے۔اللہ جو عیاں ہے، اسے دیکھا جا سکتا ہے، ناپا تولا جا سکتا ہے، اس کا تعین کیا جا سکتا ہے، اس کی بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس کا پیغام عقلی اور قابلِ فہم ہے۔اس کے مظاہر بے شمار ہیں جو ہمیشہ متحرک و متغیر رہتے ہیں۔اس کی صفات اور افعال ہمیشہ ترقی کرتے رہتے ہیں۔اس کی ہستی حرکی (dynamic) جو مسلسل حرکت میں رہتی ہے۔اس کے اعمال قابلِ پیش گوئی ہیں، اور وہ انسانی فہم و فراست سے بالاتر نہیں ہے۔اس کی نمود کے مظہر کئی ہیں، متنوع ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔وہ متلوّن اور ہمہ گیر ہے، اس کے امکانات لامحدود ہیں جو مستقل بروئے کار آتے رہتے ہیں، باہمی تعامل (interact) کرتے ہیں، اسباب و علل (cause and effect) سے بندھے ہوئے ہیں، محرک اور ردِ عمل (stimulus and response) کے رشتے میں پروئے ہوئے ہیں اور مسلسل خود کو نت نئے رنگوں اور صورتوں میں منکشف کرتے رہتے ہیں۔اس کی تخلیقات اس کی گواہ (شہادت) ہیں لیکن خود ''وہ'' نہیں ہیں۔ان گنت اور متنوع صورتیں اللہ کی جھلک دکھاتی ہیں لیکن وہ اللہ نہیں ہیں۔اللہ کے انھی مظاہر نے کئی مذاہب کو صنم پرستی کی راہ پر لگا دیا۔

اللہ جو خود مختار ہے:
ALLAH THE SELF-DEPENDENT

اب ایک مرتبہ پھر اسما اور ان کی صفات کو دیکھیے۔مثلاً اسما کی یہ ترتیب دیکھیے: وہ انصاف ہے (العدل)، وہ نافذ کرنے والا ہے (الحکم)، وہ گواہ ہے (الشاھد)، وہ سچائی ہے (الحق)، وہ دلیل دینے اور دفاع کرنے والا ہے (الوکیل)۔

Marfat.com

اوپر دیے گئے ان ناموں کی ترتیب ظاہر کرتی ہے کہ یہ صفات ایک دوسرے سے اتنی مربوط ہیں کہ انھیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ گواہ کے بغیر حق قائم نہیں ہو سکتا اور نافذ کرنے والی قوت کے بغیر عدل قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ صفات ایک دوسرے سے اسی طرح مربوط ہیں جس طرح طبعی دنیا کے عناصر اور مرکبات، جن کے کسی ایک حصے کو علیحدہ کر کے نہیں دکھایا جا سکتا۔ اللہ بھی خود مختار ہے۔ اس لیے اللہ کے کئی نام ایسے ہیں جنھیں ایک یا دو اور ناموں کے ساتھ ملا کر ہی دہرایا جاتا ہے، اکیلے نہیں۔ مثلاً ''اللہ کے نام کے ساتھ جو مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے''۔ ہم جانتے ہیں کہ طبعی دنیا کے کچھ عناصر ایسے تعاملی (reactive) ہوتے ہیں کہ انھیں دوسرے عناصر سے جدا کرنا نہایت دشوار ہوتا ہے اور سائنس دان برسوں کے تجربات اور کڑی محنت کے بعد ہی اس قابل ہو پاتے ہیں کہ ان عناصر کو دوسرے عناصر سے الگ کر سکیں۔ مثال کے طور پر فلورین ایک ایسا ضدی عنصر تھا جسے دوسرے عناصر سے جدا کرنا نہایت مشکل تھا۔ ۱۸۸۶ میں آخر کار سائنس دان لیبارٹری میں تو فلورین کو الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے مگر عالمِ فطرت میں ایسا نہیں کر سکے۔ اللہ کی کچھ صفات بھی ایسی ہی ہیں، کچھ فعال اور کچھ مفعول۔ تاہم اللہ کی صفات کا یہ ربطِ باہم صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی صفات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ یہ اس کی خود انحصاری اور دوسرے لفظوں میں اس کے خود مکتفی ہونے کی نشانی ہے۔

اللہ کی یہ صفت جزا اور کل کے مشرقی فلسفے کی وضاحت کرتی ہے۔ اللہ ایک کلیّت ہے۔ اس کی خصوصیات کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا، یہ تو ایک ناقابلِ تقسیم کل کا، ایک سالم وجود کا لازمی حصہ ہیں۔ یہ تمام صفات ایک دوسرے سے جڑی ہوئی، پوری طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور باہم مل کر اللہ کے وجود کی کلیت کو تشکیل دیتی ہیں۔ یہ صفات ایک دوسرے سے اس لیے مربوط ہیں کیونکہ یہ ایک ہی نظام کا لازمی حصہ ہیں۔ ایسے نظام کا انفرادی خصوصیات کے ذریعے تجزیہ کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ محض اجزا پر غور کرنے سے تو اس مکمل نظام کو پوری طرح سمجھا بھی نہیں جا سکتا۔ ان کا باہمی ربط ہی ہوتا ہے جو انھیں ایک حرکی توازن (dynamic equilibrium) میں قائم رکھتا ہے۔ اس کی مثال اکنامکس، ماحولیاتی نظام اور معاشروں میں ملتی ہے۔ یہ صفات اور خصوصیات الگ الگ وجود نہیں رکھتیں؛ اس لیے اسمائے حسنیٰ اپنے مکمل معانی اسی وقت آشکار کرتے ہیں جب اکٹھے ملا کر سمجھے جائیں۔ جو شخص بھی ان اسما کی عربی قرأت سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ کس طرح یہ نام ایک روانی ایک تسلسل سے آتے ہیں اور ایک دوسرے میں پیوست معلوم ہوتے ہیں۔ اللہ الجامع ہے یعنی ایک مجموعہ، جس میں سب کچھ شامل ہے اور جو اپنی جگہ پر مکمل ہے۔ ہر حقیقت میں انھی خصوصیات کا عکس ہوتا

Marfat.com

ہے۔ جدید فزکس ہر شے کے انحصار باہمی کی شہادت پیش کرتی ہے۔ جدید سائنس دان گواہ ہیں کہ کسی شے کو دوسری شے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جس حصے (جزو) کو الگ کر دیا جائے وہ اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔ وہ خود کو قائم نہیں رکھ پاتا۔ کٹ جانے والا عضو مردہ ہو جاتا ہے اور ہر طرف سے بند تالاب کا پانی بالآخر گل سڑ کر خشک ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے ماحولیاتی شعور پھیل رہا ہے، ہم فطرت میں جاری اصول وضوابط سے زیادہ سے زیادہ آگاہ ہوتے جا رہے ہیں۔ فطرت کی اس واضح ہوتی ہوئی تصویر میں ہم دیکھتے ہیں کہ تمام اشیا ایک دوسرے سے کتنے گہرے رشتوں کے جال میں بندھی ہوئی ہیں۔ ہر شے اپنی بقا کے لیے باہمی رشتوں کے اسی جال پر انحصار کرتی ہے۔

یہ سب اشیا مل کر حقیقت کی تصویر مکمل کرتی ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

www.ecoliteracy.org/ecological-principles

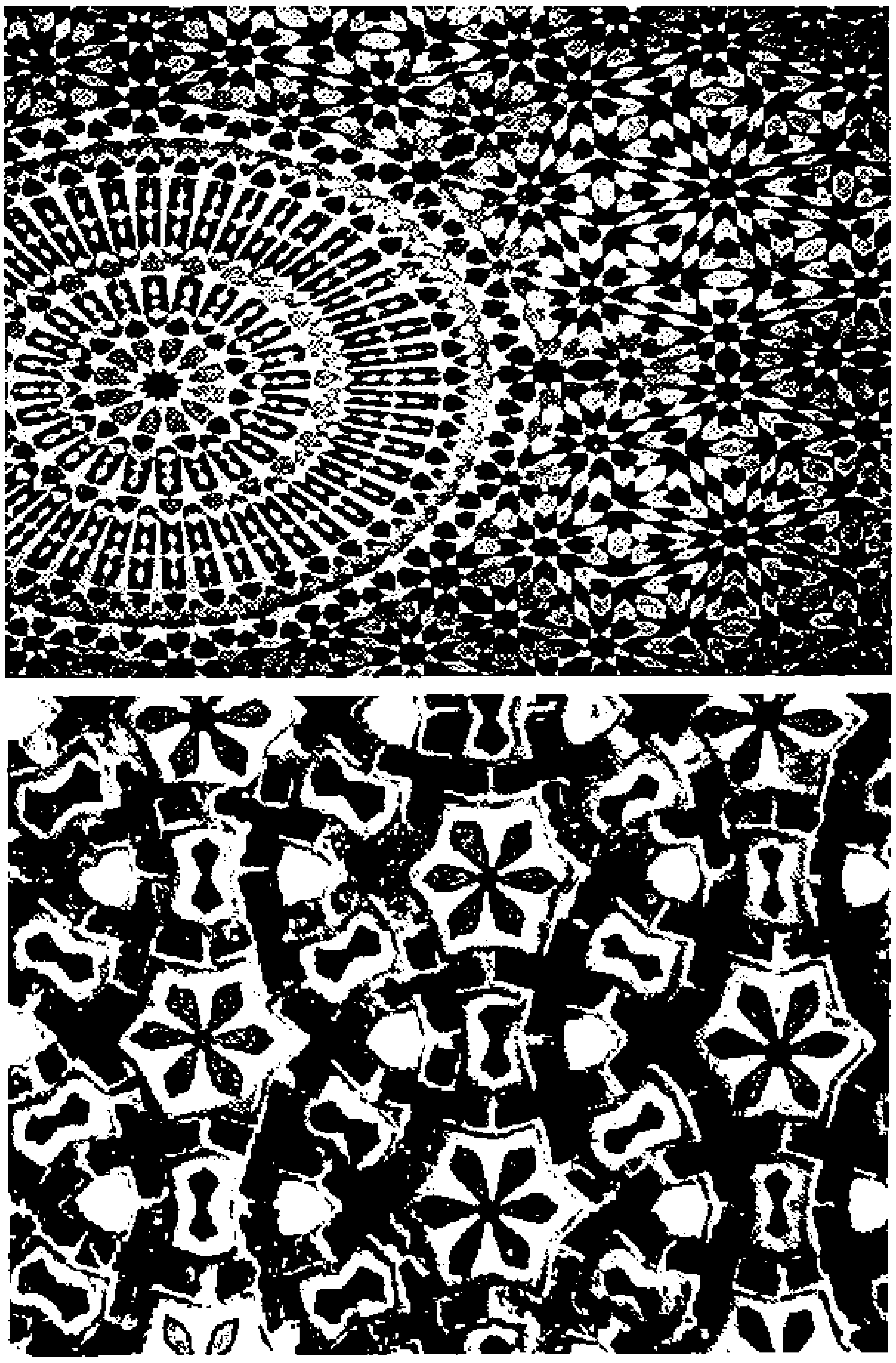

صوفیا کے مزارات پر نیلی ٹائلوں کے نقش ونگار پچھلی کئی نسلوں کا ورثہ ہیں اور انسانیت کو ربط باہم کا، ایک دوسرے سے جڑ کے جینے کا اور اللہ کی فطرت سے آشنا ہونے کا پیغام دیتے ہیں۔

Marfat.com

سائنس پودوں، جانوروں اور انسانوں کے لیے انحصارِ باہمی کی اہمیت سے خوب واقف ہے۔ اسے معلوم ہے کہ بقا کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کتنا ضروری ہے۔ زندگی کے اس جال سے توانائی کا سیل ایک چکر کی صورت گزرتا ہے جو ترقی اور تحرک کا توازن پیدا کرتا اور اسے قائم رکھتا ہے۔ انحصار باہمی کا راز جاننا ہو تو عالمی اقتصادیات کو دیکھ لیجیے؛ جس میں مواد، حتیٰ کہ مزدوری بھی دیگر ذرائع سے حاصل ہوتی ہے۔ رابرٹ کوہن (Robert Keohane) اور جوزف نائے (Joseph Nye) تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ بین الاقوامی سیاست بھی انحصارِ باہمی کی ترجمان وعکاس ہو چکی ہے اور یہی حریت پسندی کے حالیہ نظریات کی بنیاد ہے؛ یعنی عسکری قوت میں کمی اور اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی سطح پر انحصارِ باہمی کے ذریعے خود مختار ریاستوں کے درمیان تعاون میں اضافہ۔ دوسری طرف الگ تھلگ کر دینا ایک طرح کی سزا ہے جو عادی مجرموں اور معاشرے کے باغیانہ عناصر کے لیے روا رکھی جاتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی عقوبت ہے۔ قیدِ تنہائی پانے والے مجرموں کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ اس سے ان کے دل و دماغ پر شدید نوعیت کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں جن کا نتیجہ ذہنی خلل، افسردگی، دماغی افعال کی تبدیلی، حتیٰ کہ موت کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

عالمِ فطرت میں انحصارِ باہمی کے عمل کو پوری طرح سمجھنے کے لیے گریگری کجیٹ (Gregory Cajete) کی تصنیف *Natural Laws of Interdependence* کا مطالعہ کیجیے۔ ماحولیات کی ترقی پذیر سائنس بھی تمام جان دار اشیا کے ایک دوسرے، بلکہ ہوا، پانی اور مٹی جیسے دیگر غیر جان دار وسائل پر منحصر ہونے کی اہمیت کو بھرپور طریقے سے اجاگر کرتی ہے۔ ماہرِ حیاتیات چارلس ڈارون کا مشاہدہ بھی یہی تھا کہ کسی ذی روح اور اس کے ماحول کے درمیان پیچیدہ رشتوں میں، جو اس کے فطری چناؤ (natural selection) کے معروف نظریے کے بنیادی عوامل میں شامل ہیں، یہی انحصارِ باہمی کا اصول کارفرما ہے۔ انحصارِ باہمی اور مطابقت پیدا کرنا (adaptation)، سائنس کے وہ اساسی نظریات ہیں جنھیں بچے اسکول ہی میں سیکھ لیتے ہیں۔ طالب علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری زمین، بلکہ پوری کائنات، الگ تھلگ اجزا کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک مسلسل اور مربوط ماحول کا نام ہے جو زمان و مکاں میں قائم ہے۔ اسی ربطِ باہم اور انحصارِ باہمی کی وجہ سے توانائی ایک شکل سے دوسری شکل میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور اشیا کو بقا حاصل ہوتی ہے۔ یہی تصورِ اللہ کی پہچان ہے چوں کہ سب کچھ کل میں شامل ہے۔

Marfat.com

اللہ جو تسلسل ہے:
ALLAH THE CONTINUUM

ایک سے لے کر ننانوے تک اسمائے حسنہ ایک تسلسل میں ہیں۔ جس طرح عناصر کے چارٹ پر ہائیڈروجن پہلا عنصر ہے اور تابکار عنصر یورینیم آخری۔ اسی طرح اسمائے حسنیٰ ''الرحمان'' یعنی ''مہربان'' سے شروع ہوتے ہیں اور آخری نام ''الصبور'' یعنی ''خود کو روک رکھنے والا'' تک ایک تسلسل (continuum) قائم کرتے ہیں۔ یہ نام رفتہ رفتہ، درجہ وار ایک سطح سے دوسری سطح تک پہنچتے ہیں، کسی یک لخت تبدیلی کے بغیر۔

سٹینفر ڈ انسائکلوپیڈیا آف فلاسفی میں لفظ مسلسل (continuous) کے معنی ہیں، بے جوڑ، غیر منقطع، متواتر۔ گویا ایک مسلسل وجود، ایک تسلسل (continuum) وہ ہوتا ہے جس میں کوئی رخنہ، کوئی وقفہ نہ ہو۔ میری ایم ویبسٹر (Merium Webster) میں تسلسل کو ایک مربوط کل کے طور پر بیان کیا گیا ہے جو ایسی اقدار یا عناصر کے مجموعے، ترتیب یا ارتقا پر مشتمل ہو، جن میں درجے کا نہایت معمولی سا فرق ہو، مثلاً اچھا (good) اور برا (bad) ایک ہی تسلسل کے دو کنارے ہیں۔ اللہ بھی دیگر تمام مسلسل اشیا کی طرح ملحق کڑیوں پر مشتمل ایک زنجیر، ایک ربطِ باہم، ایک استقلال، ایک نسبت، ایک تسلسل، ایک تعلق، ایک بہاؤ، ایک باہمی رشتے، ایک تواتر، ایک جاری و ساری عمل، ایک ابدیت، ایک دوام، ایک ثبات، ایک استمرار، ایک وحدت، ایک ترتیب، ایک سلسلۂ حیات، ایک کل کا نام ہے۔ اس سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ہر دو بالکل متضاد صفات مثلاً التّوّاب (معاف کرنے والا) اور المنتقم (انتقام لینے والا)، النافع (فائدہ پہنچانے والا) اور الضّار (نقصان پہنچانے والا)، الاوّل (پہلا) اور الآخر (آخری) المحی (زندگی) اور الممیت (موت) کے درمیان بھی درجہ بندی موجود ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال آپ کی کار کے انجن کا درجۂ حرارت بتانے والا آلہ ہے جس کی دو انتہائیں ہیں ایک ''گرم'' اور دوسری ''سرد''۔ یہ آلہ بتاتا ہے کہ یہ دونوں سرے ایک ہی فعل کے انتہائی مقامات ہیں۔

Marfat.com

CONTINUM

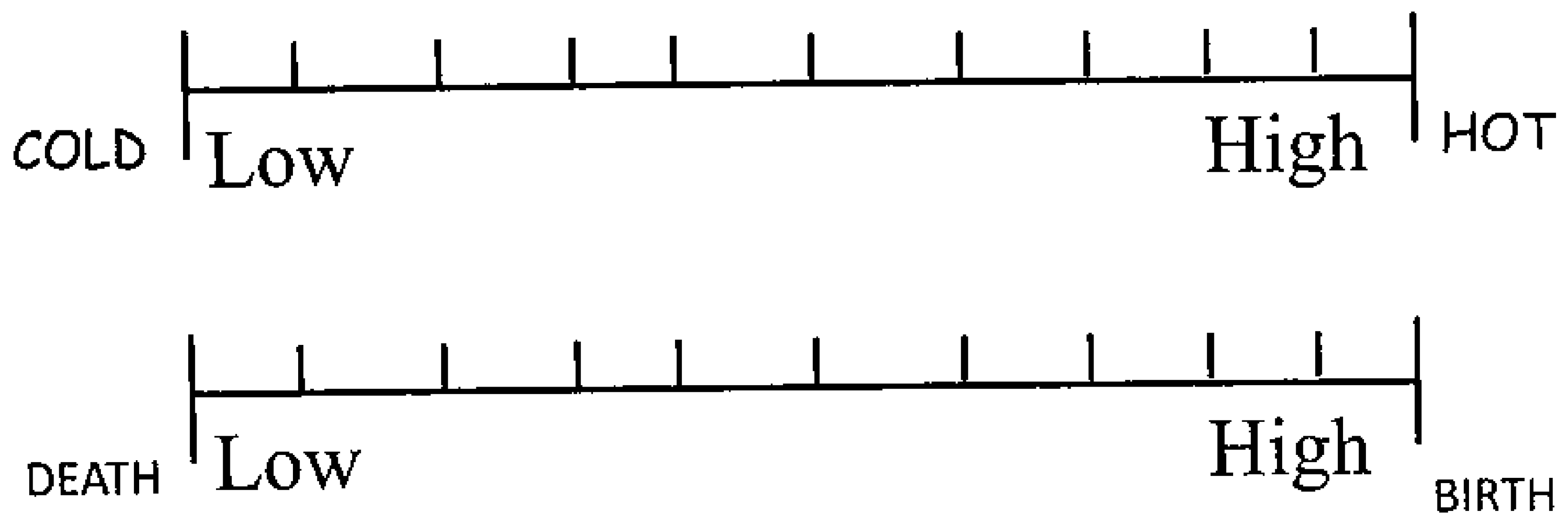

جب ان دونوں انتہاؤں کو ایک دوسرے سے مختلف یا متضاد سمجھ لیا جاتا ہے تو کئی سائنسی غلط فہمیاں جنم لے سکتی ہیں۔ اصل میں یہ دونوں سرے ایک ہی حقیقت کے دو مظہر ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ جیسے انسانی نفسیات کا سائنسی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ محبت اور نفرت ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ اسی طرح مذہب اور سائنس بھی ایک ہی تسلسل کی دو انتہائیں ثابت ہو سکتی ہیں، لیکن اس بارے میں تفصیل آگے آئے گی۔

اللہ جو درجہ وار ہے:
ALLAH THE GRADED

موسم اور درجۂ حرارت میں رونما ہونے والے تغیرات جو بہت سرد سے بہت گرم تک جاتے ہیں ایک ایسا تسلسل قائم کرتے ہیں جو درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت تک پہنچتا ہے۔ یہ دوسری حالت عموماً پہلی حالت کے بالکل متضاد ہوتی ہے۔

اللہ کی ذات بھی اسی طرح درجہ وار ہے۔ اللہ کی صفات جو بتدریج ظاہر ہوتی ہیں، ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ طبعی دنیا میں اس کی ایک اچھی مثال روشنی کی صورت میں ملتی ہے۔ فزکس میں اسے ایک مسلسل طیف (spectrum) کہا جاتا ہے جس میں توانائی (روشنی) طولِ موج (wavelengths) کی مختلف شرحوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ روشنی تباہ کن گاما شعاعوں (gammarays) اور بالائے بنفشی شعاعوں (ultra-violetrays) سے تبدیل ہوتی ہوئی معتدل، مفید اور مرئی شعاعوں میں بدل جاتی ہے تاکہ زندگی کی بقا میں مددگار ثابت ہو سکے۔ اسی طرح اللہ اپنے طولِ موج کی مختلف شرحوں کے

Marfat.com

ذریعے اپنی ساری مخلوقات تک پہنچ جاتا ہے۔''مہربان'' سے لے کر''رحیم'' تک مدارج کا ایک تسلسل ہے جو بنی نوع انسان کے لیے مخصوص ہے۔وہ خلقی طور پر خیر ہے، فائدہ مند ہے، جزا دینے والا ہے، مسرت بخش ہے، باعثِ طمانیت ہے اور جب انتہائی مدارج کی طرف بڑھتا ہے تو معاف کر دینے والا ہے، رحم کرنے والا ہے، چھوٹ دینے والا ہے، برداشت کرنے والا ہے، عفوودرگزر سے کام لینے والا ہے، تحمل کرنے والا ہے اور صبر کرنے والا ہے۔ابتدائی فزکس میں روشنی کا مرئی طیف، جسے VIBGYOR کہا جاتا ہے، اسی طرح طول موج کے اختلاف کی وجہ سے قرمزی، بنفشی اور نیلے جیسے سرد اور معتدل رنگوں سے ہوتا ہوا آتشیں نارنجی اور سرخ رنگ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اسی طرح الاوّل (پہلا) اور الآخر (آخری)، الظاہر (مرئی) اور الباطن (غیر مرئی)، المنعم (انعام دینے والا) اور المنتقم (انتقام لینے والا)، الغفار (بخش دینے والا) اور القہار (قہر نازل کرنے والا) بھی ایک ہی بنیادی ماہیت کے دو رخ، دو انتہائی مقامات ہیں۔اور یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں انتہائی مقامات کے درمیان بے شمار مدارج، سطحیں اور زینے ہیں جو مراجعت (regression) اور پیش رفت (progression) دونوں کو ظاہر کرتے ہیں۔یہ بھی مختلف طولِ موج کے مظاہر ہیں جو صفات کے طیف (spectrum) پر ایک کیفیت سے دوسری کیفیت تک لے جاتے ہیں۔درجہ بندی سے مراد ہے ایک منظم اور مرتب طریقے سے یکے بعد دیگرے آگے بڑھنا، کسی شے کا دھیرے دھیرے، انتہائی غیر محسوس طریقے سے، ایک درجے سے دوسرے درجے تک، ایک رنگ سے دوسرے رنگ تک، ایک صفت سے دوسری صفت تک، ایسے ہی جیسے روشنی کے طیف میں، وقت کی روانی میں، دن کے اجالے سے شام کے اندھیرے تک، بچپن سے بڑھاپے اور زندگی سے موت تک پیش رفت کرنا۔

اب جیسے بنیادی عناصر کے چارٹ پر ہائیڈروجن اور یورینیم ایک ہی قوس کے دوسرے ہیں، اسی طرح بنیادی خدائی صفت مہربانی سے آخری صفت صبر تک ایک درجہ وار تسلسل موجود ہے۔مہربانی اساسی صفت ہے اور صبر کرنا بلند ترین الوہی صفت ہے۔عیسیٰ علیہ السلام کی دکھ، تکلیف، صبر اور برداشت بھری زندگی میں اس کی بہت اچھی مثال ملتی ہے جس نے بالآخر ناقابلِ شکست رومن سلطنت کو ریت کے محل کی طرح منہدم کر دیا اور عیسیٰ کا صبر و تحمل ہیروشیما پر پھینکے گئے بم کی تباہی سے کہیں زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوا۔حقیقت بلکہ تمام تر مخلوق اسی خصوصیت سے متصف ہے۔کوپرنیکس (Copernicus) پہلا سائنس دان تھا جس نے اس کائنات کو ایک تسلسل کی صورت میں دیکھا اور سمجھا تھا جس میں رات کو دمکنے والے ستارے اور دن کو چمکتا ہوا سورج ماہیت

Marfat.com

کے اعتبار سے یکساں نظر آتے ہیں۔دوسری طرف چارلس ڈارون پہلا شخص تھا جو اپنی عمر بھر کی سائنسی تحقیق و تفتیش کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام تر حیات ایک تسلسل کا نام ہے جو آہستہ آہستہ اور بتدریج مختلف شکلوں میں ڈھلتی جاتی ہے۔فزکس نے تو اس حقیقت کو شک وشبے سے بالاتر قرار دیا ہے کہ سب سے بنیادی عنصر ہائیڈروجن کا ایٹم بھی بنیادی عناصر کا وہی تسلسل ہے، جو ہزاروں سال تک لاتعداد کائناتی کہکشاؤں میں گھومتا اور تغیر و تبدل کی منزلوں سے گزرتا رہا ہے۔

تسلسل کا یہ تصور سائنس کے سبھی شعبوں میں خوب راسخ ہے۔نظریہ تسلسل کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو کسی انقلابی یا غیر معمولی الٹ پھیر سے گزرے بغیر ایک حالت سے دوسری حالت تک بتدریج سفر کرتی ہے ۔فزکس میں زمان ومکان کا تسلسل یہ واضح کرتا ہے کہ زمان ومکاں الگ الگ حقیقتیں نہیں بلکہ ایک ہی تسلسل کے اجزا ہیں۔حرکیاتِ تسلسل (Continuum Mechanics) فزکس کی ایک شاخ ہے جو مسلسل مادے (continuous matter) کا مطالعہ کرتی ہے۔سائنس دان ایک ہزار سال سے زمان، مکان، حرکت اور نظریہ تسلسل کو سمجھنے کی کوشش کرتے آئے ہیں۔اس جستجو کے نتیجے میں کتنی ہی غیر معمولی کامیابیاں انسان کا مقدر بنیں، مثلاً فیثا غورثیوں کی حقیقی اعداد (irrational numbers) کی دریافت، زینو کے تضادات، علم الاحصا (nfinitesimal calculus)، اضافیت (relativity) اور معدومیت (nothingness) کے نظریات، کوانٹم فزکس اور دیگر کئی اہم نظریات وتصورات۔آج کل تسلسل پر مبنی تصورات کی روشنی میں اسکولوں اور کالجوں میں طلبہ کو تاریخی واقعات سے روشناس کیا جاتا ہے یا کسی شے کے مختلف مدارج، مثلاً وزن، درجۂ حرارت، رنگ، معنویت، مقبولیت کی شرح وغیرہ سے آگاہ کیا جاتا ہے۔لیکن اسے سمجھنے کے لیے بنیادی سوال ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ، کس شے کا تعین کیا جارہا ہے اور پیمانے کی آخری حدیں یا دونوں انتہائیں کیا ہیں؟

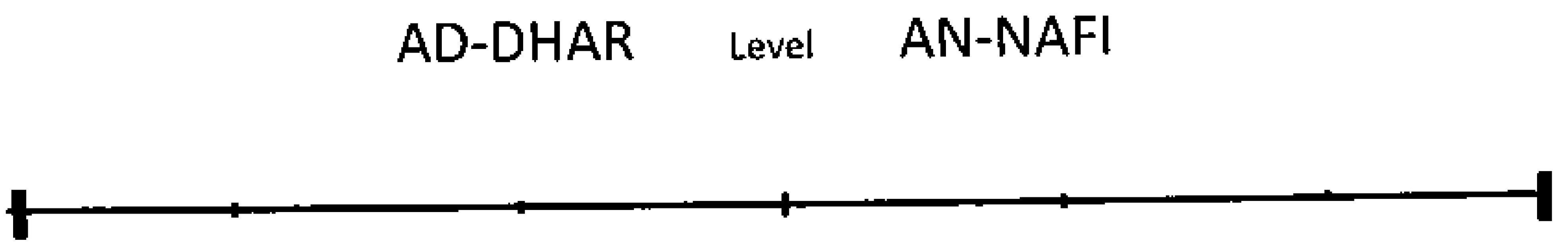

نفسیات میں انسانی شعور، کرداری اوصاف، شخصیتوں کے اختلافات اور ذہنی خلل وغیرہ کی ایک تسلسل پر پیمائش کی جاتی ہے۔ہر ایک، کسی خاص شخصیتی جہت (ersonality dimension) کے تسلسل کے کسی

Marfat.com

نہ کسی مقام پر ضرور پورا اترتا ہے۔ یوں ہم سب نام نہاد ذہنی صحت مند لوگ ہیں جن کے اپنے اپنے ذہنی خلل ہیں۔ اسی طرح یہ تصور قانون، اخلاقیات اور عمرانیات پر بھی یکساں طور پر لاگو آتا ہے جس سے انسانی رویے کے تنوع کو دیکھا، جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح خدا پر ایمان کے مدارج کو بھی ایک تسلسل کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے جو الحاد یا کفر سے لے کر خدا پرستی تک پھیلا ہوا ہے۔ مثلاً؛ خدا وجود ہی نہیں رکھتا (شدید الحاد)، خدا کم و بیش غیر موجود ہے، یہ ایک سطحی تصور ہے (الحاد)، کوئی نہیں جانتا کہ خدا موجود ہے یا نہیں (لاادریت)، خدا موجود ہے مگر اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا (کمزور الحاد)، خدا موجود ہے: اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا (خدا پرستی)، خدا موجود ہے اور اسے ثابت کیا جا سکتا ہے (شدید خدا پرستی)۔

اللہ جو ایک گردشی چکر ہے:
ALLAH THE CYCLE

تسبیح پر اللہ کے ناموں کا ورد کرنے کے جو طریقے تجویز کیے جاتے ہیں انھیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اسمائے حسنیٰ اصل میں ایک گردشی چکر (cycle) ہیں۔ ہر ننانوے کے بعد دوبارہ ایک آتا ہے مگر ہر بار اس ''ایک'' کی طاقت ایک سو کے برابر ہو جاتی ہے اور یوں یہ پرانا ایک نہیں رہتا بلکہ ہر چکر پر اس کی تجدید ہوتی ہے، احیا ہوتا ہے اور یہ دائمی ارتقا کا سفر جاری رہتا ہے۔ یہ تجدید و احیا گردشی چکر (cycle) کی ماہیت کا بنیادی حصہ ہے۔ چکر یا گردش بار بار اپنے ماخذ، اپنی بنیاد کی طرف پلٹنے اور خود کو اسی طرح دہراتے رہنے کا عمل ہے۔ ایک چکر کسی عمل کے ایک بار مکمل ہونے کا نام ہے اور یہ عمل بار بار ہوتا رہتا ہے۔ اگر ہم ماحولیاتی چکر پر ایک سرسری سی نظر بھی ڈالیں تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہ چکر ہر بار کس طرح فطرت کے صَرف ہو جانے والے ذخیروں کو بھر دیتا ہے اور اسے پاک و منزہ کر کے ایک نئی زندگی بخش دیتا ہے۔ یہ چکر ہمیشہ متحرک رہتا ہے اور دائمی طور پر تجدید و احیا کا ذمہ دار ہے۔ اس کا ہر بار پلٹ کر آنا نئی بلندیوں سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ ابدیت کے اس چکر میں پہلا اور آخری مل کر ایک نیا گردشی دائرہ تشکیل دیتے ہیں۔ متضاد صفات اشتراکِ عمل سے اس تحرک، ترقی اور نشوونما کو ہمیشہ جاری رکھتی ہیں۔ ہر شے ہمیشہ اپنی جڑوں کی طرف پلٹتی ہے۔ یہی ہیں اللہ کی وہ خصوصیات جو کل کائنات، کل زندگی پر محیط ہیں۔ جو کچھ بھی ہے انھی خدائی خصوصیات کا عکس ہے۔

Marfat.com

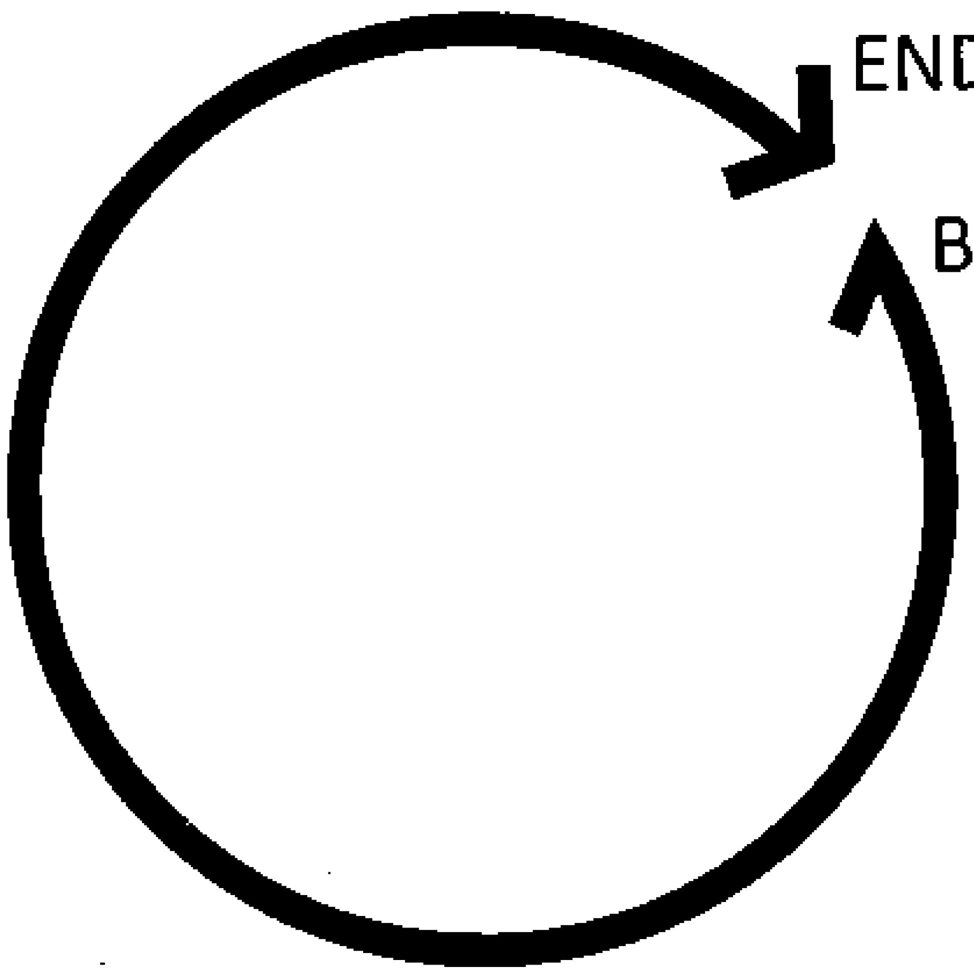

ہر انجام ایک نیا جنم، نیا آغاز ہے۔ روزمرہ کی اس سادہ سی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اعلیٰ فزکس کے دقیق کلیوں کی ضرورت نہیں۔ درخت ہی کو دیکھ لیجیے، کیسے وہ ایک بیج سے پھوٹتا ہے، پھلتا پھولتا ہے، بڑا ہوتا ہے، پھول اور پھل دیتا ہے، زیرہ بکھیرتا ہے، باہمی متضاد صفات کے درمیان اشتراکِ عمل ہوتا ہے اور آخرکار یہ چکر ایک نئے بیج پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ کس طرح یہ درخت خزاں کے دنوں میں تقریباً موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور بہار آتے ہی پھر سے جی اٹھتا ہے۔ پھر کیا عجب کہ شاعر فطرت کی شان میں گیت گنگناتے ہیں۔ ہر حقیقت اسی طرح، غیر خطی (non-linear) ہے اور چکر کی صورت میں نمودار ہوتی ہے لیکن ریاضیاتی سائنس نے محض دس سال قبل اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ دنیا بیش تر غیر خطی (non-linear) ہے جو پیچیدہ باہمی رشتوں اور خود بخود فعال رہنے والے چکروں پر مبنی ہے۔ جہاں تک انسانی دماغ کا تعلق ہے، سچائی ہمیشہ گردشی چکر جیسی ہوتی ہے۔ کوئی ایک امکان، کوئی ایک سائنسی فرضیہ لے لیجیے اور اس کے بارے میں اپنے مفروضے کی خارجی دنیا میں تصدیق کرنے کی کوشش کیجیے۔

بالکل ارضی اجسام کی طرح پوری کائنات کے حیاتی کرّے (global biosphere) کو بار بار توانائی، پانی، غذا اور کیمیائی مادوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ ضرورت توانائی کی گردش (circulation of energy) کے عالمگیر نظام اور کیمیائی مادوں کے چکر (chemical cycles) کے ذریعے پوری ہوتی ہے۔ یہ مادے زمین کے چاروں کرّوں (biosphere, hydrosphere atmosphere, lithosphere) میں متواتر حرکت کرتے، مختلف صورتوں میں ڈھلتے اور مختلف اوقات میں مختلف اجسام کے استعمال میں آتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کا چکر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ایسے سائنسی چکروں اور ایسے گردشی عمل کی مثالیں فزکس، ریاضی، سمعی علوم، اقتصادیات، آبی چکر، نائٹروجن، ہائیڈروجن اور آکسیجن کے چکر، حیاتیاتی

Marfat.com

گھڑی، انسانی جسم کے توازن وتناسب، خون کی گردش، نظام تنفس کے چکر، حیض اور تولیدی نظام کے چکر، ماحولیاتی چکر، روپے کی گردش، کاروباری چکر، موسیقی، الجبرا، شمسی اور کائناتی چکر، فلکیاتی چکر، نیند کے چکر، چاند کے چکر اور سمندر کی موجوں کے چکر میں، غرض ہر جگہ ملتی ہیں۔ تقریباً سبھی ایسے عناصر جو زندگی کے لیے اہم ترین ہوتے ہیں، چکر کی صورت میں ملتے ہیں۔ انسانی جسم ہو، ماحول ہو، یا کرۂ حیاتی ہو، کل کائنات انھی چکروں کے حرکی توازن (dynamic equilibrium) کے سبب سے قائم ہے۔ تمام اشیا مسلسل حرکت کرتی اور تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ مختلف مادے ماحول میں داخل اور خارج ہوتے رہتے ہیں اور مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر مختلف مرکبات بناتے ہیں۔ یہ چکر نہ ہوں تو دنیا مردہ اور بے جان ہو جائے۔ یہی چکر ہمارے اس کرۂ ارض کو زندگی عطا کرتے ہیں۔

بہت سے مذاہب بھی چکر پر یقین رکھتے ہیں۔ جو مذاہب جنم کے چکر کو مانتے ہیں وہ دراصل اسی سائنسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس سائنسی دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مذہب کو عقل کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ چکر کی اہمیت کے گہرے اور بین العلومی مطالعے کے لیے دیکھیے: cyclesresearchinstitute.org۔ ان کا نعرہ چکر در چکر (cycles within cycles) ہے۔

رے ٹومز (Ray Tomes) اپنی کتاب *Cycles in the Universe* میں لکھتا ہے:

> میں نے کئی سال اس کائنات کے طرزِ عمل کا مطالعہ کرنے میں گزارے ہیں۔ میری دلچسپی کا مرکز چکروں کا مطالعہ تھا اور یہ چکر فلکیات، اقتصادیات، ارضیات، تاریخ اور فزکس، غرض ہر شعبے سے متعلق تھے۔ اس دلچسپی کا آغاز یوں ہوا کہ میں کمپیوٹر کی مدد سے اقتصادی چکر کی پیش بینی کی کوشش میں مصروف تھا اور اس کے نتیجے میں Harmonics Theory مرتب کر ڈالی جو ایک ایسے نظریے کی صورت میں ابھری جس نے کائنات کی ساخت کی وضاحت کر دی۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مگر یہ سچ ہے کہ کائنات ایک بہت بڑے ساز کے سوا کچھ نہیں جو ایک دوسرے سے بالکل ہم آہنگ ارتعاشات پر مبنی خاص الخاص اور قابلِ پیش گوئی نمونے پر مشتمل ہے اور جو کہکشاؤں سے لے کر تحت ایٹم ذرات تک کائنات کی ہر چیز کی ساخت اور ماہیت تشکیل دیتے ہیں۔ ہر چیز ایک گردشی چکر پر مبنی ہے۔ موسم، اقتصادیات،

Marfat.com

سورج، جنگیں، جغرافیائی ساختیں، ایٹمی ارتعاشات، آب و ہوا، انسانی مزاج، سیاروں کی حرکت، حیوانات کی آبادی، بیماریوں کا پھیلنا، اشیا کی قیمت، حصص اور وسیع تر پیمانے پر کائنات کی ساخت۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ایک دوسرے سے جدا اور بالکل آزادانہ وجود نہیں رکھتی۔ تحقیق بتاتی ہے کہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف شعبوں کے مواد بالکل یکساں چکروں کے حامل ہوتے ہیں۔ ہر شے ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے اور اب وقت آ گیا ہے جب یہ نظریہ عام ہو جانا چاہیے۔ اس نظریے کو سمجھنے کے لیے چکروں کا مطالعہ ضروری ہے۔ کیوں کہ چکروں کے ادوار اسی طرح قابلِ شناخت ہیں جس طرح انسان کی انگلیوں کے نشانات یا اس کے ڈی این اے کی ساخت۔"

رے ٹومز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے دیکھیے: ray@tomes.biz

جب چکر کی گردش مکمل نہ ہو تو کیا ہوتا ہے۔ یہ ایک اہم سائنسی سوال ہے؟ اس کا اطلاق انسانی جسم کے چکروں پر کر کے دیکھیے؛ مثلاً فضلے کے اخراج کا نظام، حیض کا چکر، نیند کا چکر۔ یا پھر اس کا اطلاق ماحول، آب و ہوا، موسموں، موسیقی یا کسی بھی چیز پر کر لیجیے۔ حالیہ گرین ہاؤس کے اثرات، عالمی سطح پر درجہ حرارت میں اضافہ، اوزون غلاف میں شگاف، آسمانوں کے سوراخ اور ان تمام باتوں کے تباہ کن اثرات انسانی بقا کے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکے ہیں اور یہ سب چکر کے نامکمل رہ جانے کا نتیجہ ہیں۔ انسان کی ایک اہم ترین ریاضیاتی دریافت صفر کا تصور ہے جس نے اعداد کو ایک نئی قوت عطا کر دی۔ صفر ایک مکمل چکر کو ظاہر کرتا ہے۔ جب اسے کسی عدد کے ساتھ جوڑا جاتا ہے تو ایک بالاتر سطح پر اس کی تکمیل کر دیتا ہے۔ اس کلیے کا اطلاق انسانوں کی جسمانی، ذہنی، نفسیاتی اور روحانی حقیقت پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً صحت کا چکر، مرض کا چکر، موت اور زندگی کا چکر وغیرہ۔ فطرت کے قوانین یکساں ہوتے ہیں اور ہر ایک پر یکساں طور پر منطبق ہوتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ اگر یہ چکر الٹا چلنے لگے تو کیا ہوگا؟ یہ ایک ایسا اختیار ہے جو انسان کو عطا کیا گیا ہے۔ کالا جادو، شیطانی اعمال اور شرانگیز قوتیں فطرت کے چکر کو الٹا چلانے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن فی الحال ہم اپنے موضوع کی طرف واپس آتے ہیں۔

Marfat.com

کوپرنیکس کی چکر در چکر کائنات کا تصور

اللہ جو مرکز ہے:
ALLAH THE CENTER

تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ مرکز کے بغیر کوئی چکر کوئی دائرہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ مرکز اور دائرے کے تعلق کو سمجھنے کے لیے چلیں ایک دائرہ کھینچتے ہیں۔

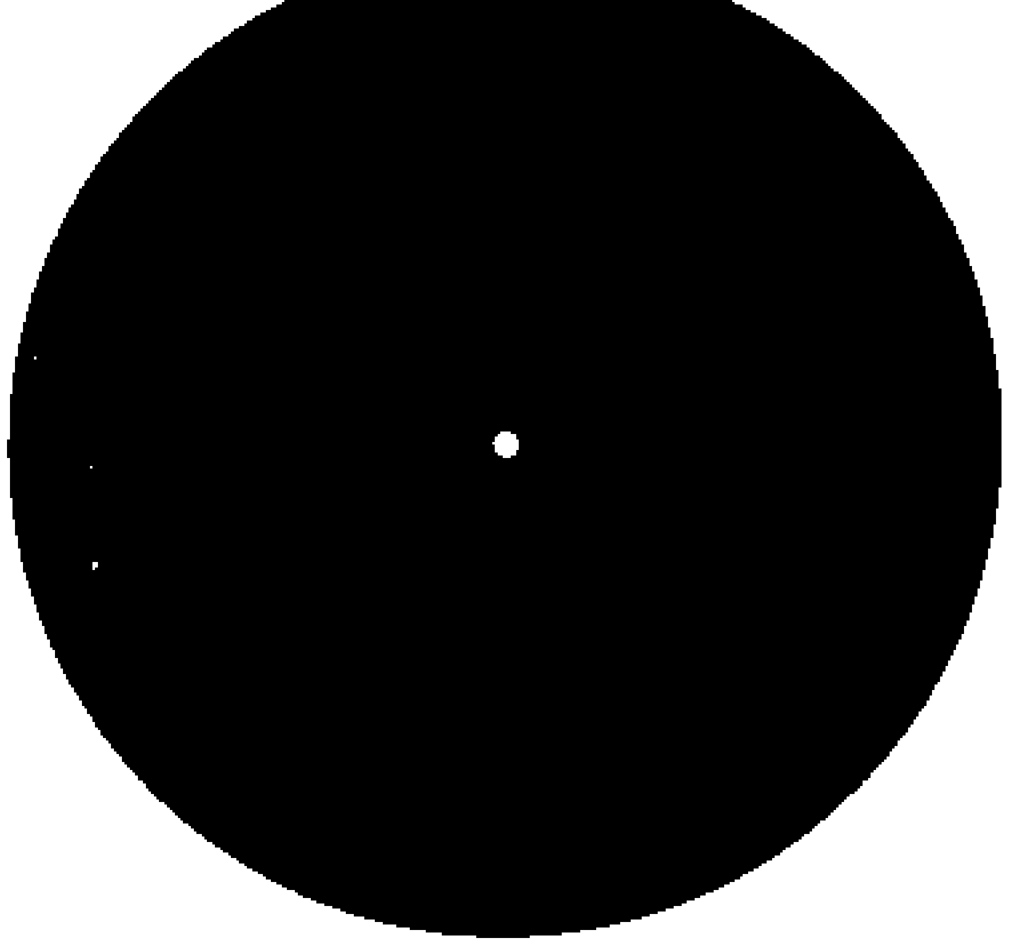

غیر مرئی مرکز اور مرئی دائرہ۔ باطن اور ظاہر کا تعامل۔

دائرہ بیرونی کناروں سے بنتا ہے گویا یہ محیط کا نام ہے۔ یہ بیرونی ہے، خارجی ہے۔ مرکز اندرونی ہے، باطنی ہے، قلب نہاں ہے اور ایک ناقابلِ ادراک نقطہ ہے۔ دائرہ عیاں ہے مگر مرکز نہاں ہے۔ دائرہ مرئی (ظاہر)

Marfat.com

ہے، جب کہ مرکز غیر مرئی (باطن) ہے۔ دائرہ متحرک ہے، ارتقا پذیر ہے، پھیلاؤ پر مائل ہے جب کہ مرکز نقطہ ہے، مستقل ہے، استوار ہے اور ساکن ہے۔ اندرونی نقطہ تنہا ہے، واحد ہے لیکن بیرونی دائرے میں کثرت ہے، یہ بہت سے نقطوں سے مل کر بنا ہے۔ مرکز کسی شے کا درمیانہ نقطہ ہے جو کنارے کے ہر مقام سے برابر فاصلے پر ہے۔ مرکز ہی ہے جو محیط کی حرکت میں توازن قائم کرتا ہے۔ توازن مرکزِ ثقل سے جڑے رہنے کی استعداد کا نام ہے۔ یہی غیر مرئی درمیانی نقطہ ہے جو کسی شے کا مرکز ہوتا ہے اور یہی مرکزِ ثقل بھی ہوتا ہے۔ دائرہ کھنچاؤ یا کشش (pull) اور دباؤ یا گریز (push) کی قوت کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ یہ وہ قوتیں ہیں جو مرکز اور محیط کے درمیان بروئے کار آتی ہیں اور توازن پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ گھومتا ہوا دائرہ باہر کی طرف کھینچتا ہے اور ساکن واستوار مرکز اندر کی طرف۔ یوں ایک مسلسل چکر وجود میں آتا ہے۔ مرکز اور دائرہ ایک دوسرے سے بالکل برعکس عمل کرتے ہیں اور ہر طرح سے ایک دوسرے کا متضاد ہیں لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے سے ناقابلِ شکست رشتے سے جڑے ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان مکمل توازن کی حالت تبھی پیدا ہوسکتی ہے جب کھنچاؤ (+) اور دباؤ (-) کی قوتوں میں مکمل مساوات قائم ہو جائے۔

اللہ کو سمجھنے کے لیے، اس کی فطرت، اس کی حرکت، اس کے افعال کو جاننے اور سمجھنے کے لیے مرکز، دائرہ اور چکر اہم ترین مثالیں ہیں۔ ان پر غور کریں اور اللہ کو سمجھیں تو کل کائنات کو سمجھ جائیں گے۔ یہ بالکل سادہ اور سامنے کی بات ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے کسی پیچیدہ علم کی ضرورت نہیں، ہر چند کہ وہ مفید ضرور ہوتا ہے۔ علم ضرور حاصل کرنا چاہیے لیکن اللہ نے اپنی پہچان کے لیے علم کی شرط نہیں رکھی۔ انسان کی غلطی اور بھول یہ ہے کہ وہ ہر شے کو الٹ دیکھتا ہے۔ سائنس کو دیکھ کر اللہ سمجھ میں نہیں آتا لیکن اللہ کو سمجھ لیں تو تمام تر سائنس سمجھ میں آجاتی ہے۔

مرکز کے بغیر حرکت نہیں ہوسکتی:
No Motion without Center

ہر دائرے کے لیے ایک غیر مرئی، ناقابلِ ادراک مرکز کا ہونا لازمی ہے جس کے گرد دائرے کی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ یہ غیر مرئی مرکز ہی اس متحرک دائرے کا اصل سبب ہوتا ہے اور اس کی مسلسل وسعت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ مرکز متعین ہوتا ہے، ایک ہوتا ہے، اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے لیکن اس کے محیط کا چکر رواں اور متحرک رہتا

Marfat.com

ہے، کثرت کا حامل ہوتا ہے اور اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ غیر مرئی مرکز اور مرئی چکر ایک دوسرے کے مساوی مگر معکوس ہوتے ہیں۔ محیط دائرے کو باہر کی طرف دھکیلتا ہے اور مرکز اندر کی طرف کھینچتا ہے۔ ان کشش اور گریز کی مساوی قوتوں کے اشتراکِ عمل سے چکر متحرک رہتا ہے۔ یہ حرکی چکر ابدی ہے۔ اس کی ہر انتہا ایک نئی ابتدا ہے۔ یہ بیک وقت مرئی بھی ہے اور غیر مرئی بھی۔ اب یہ دیکھنے والے کے نقطۂ نگاہ پر منحصر ہے کہ وہ اسے کیسے دیکھتا ہے۔ تاہم یہ طے ہے کہ چکر کی وسعت اور ترقی دو متضاد اصولوں کے باہمی ربط پر منحصر ہے یعنی غیر مرئی مرکز اور مرئی محیط کا باہمی رشتہ۔ پہلے مرکز ایک دور لے جانے والی حرکت کا آغاز کرتا ہے پھر اسے واپس اپنی طرف کھینچتا اور دوبارہ بحال کرتا ہے۔ یوں دو اصول مل کر کام کرتے ہیں۔ ان تضادات کا باہمی ربط ایک متحرک توازن قائم کرتا ہے۔ پھیلاؤ اور سکڑاؤ، فراخی اور تنگی، پیش قدمی اور پسپائی کی متضاد حرکات کے باہمی عمل سے چکر مکمل ہو جاتا ہے۔ پہلے آگے کی سمت بڑھتی ہوئی حرکت، پھر پیچھے کی طرف لوٹتی ہوئی حرکت۔ پہلی حرکت پھیلاؤ (divergence) کی ہے، آخری سکڑاؤ (convergence) کی۔ یوں چکر ساری بات سمجھا دیتا ہے۔ یہ چکر کسی واقعہ کے تمام پہلوؤں کے بیک وقت رونما ہونے کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے۔ یہ سادہ ترین ضابطہ بندی اور وضاحت، جدید طبیعیات سے مابعد الطبیعیات اور ارضیات سے حیاتیات تک، ہر حقیقت پر منطبق ہوتی ہے۔ یہ تخلیق کے سب سے بنیادی اصول کو بیان کر دیتی ہے اور خدا اور انسان کے ناگزیر رشتے کو بھی واضح کر دیتی ہے۔

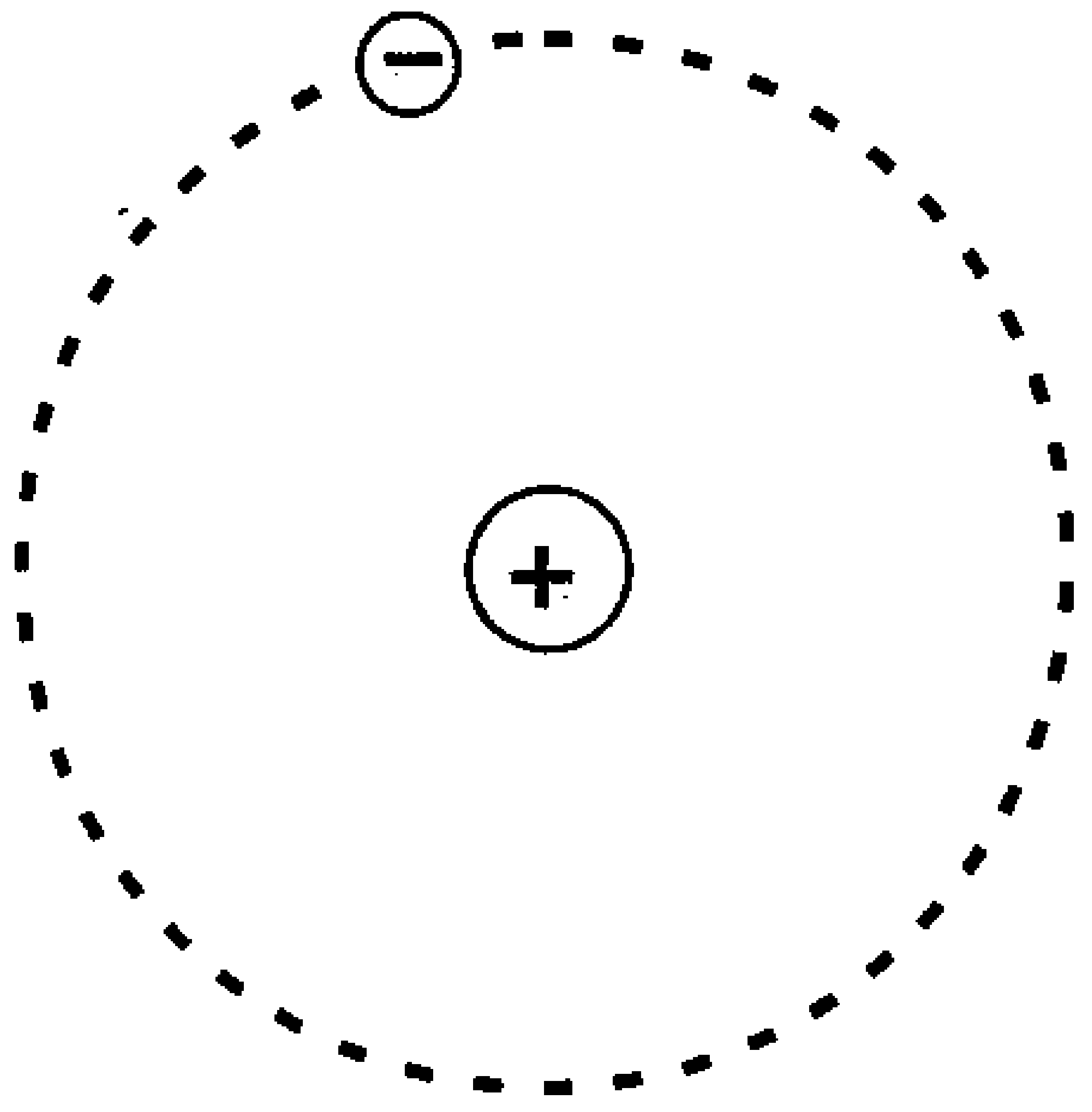

ہائیڈروجن ایٹم: ہماری کائنات کا سادہ ترین، بنیادی ذرہ

معروف برطانوی مفکر سٹیفن ہاکنگ اپنی نئی کتاب *The Grand Design* میں استدلال کرتا ہے

Marfat.com

کہ بیگ بینگ فزکس کے قوانین کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ مادے میں خلقی طور پر کشش اور گریز کی قوتیں پائی جاتی ہیں۔ سٹیفن کا کہنا ہے کہ اب کائنات کے لیے کسی خالق خدا کا تصور فرسودہ اور بے کار ہو چکا ہے کیوں کہ جب تک قوتِ ثقل قائم ہے، کائنات عدم سے وجود میں آتی رہے گی۔ تاہم سٹیفن یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ خود بخود (spontaneous) تخلیق کا عمل یہ ظاہر کرتا ہے کہ کچھ نہ ہونے (nothing) کے مقابلے میں کچھ (something) ہے ضرور جو اس بات کا جواز فراہم کرتا ہے کہ یہ کائنات اور ہم خود موجود ہیں۔

کارل ساگاں اپنی شاندار کتاب *The Cosmic Connection* (۱۹۷۳) میں عالمِ کون و مکاں کو اس طرح بیان کرتا ہے:

> ہم کرۂ ارض پر زندگی کے وجود کی تاریخ کے ایک عہد ساز اور عبوری دور میں زندہ ہیں۔ کرۂ ارض پر زندگی کے مستقبل کے لیے اس سے زیادہ خطرناک اور اس سے زیادہ امید افزا دور کبھی نہیں آیا۔ ہمارا سورج جو ہماری کائنات کا مرکز ہے، چھوٹا سا، ٹھنڈا اور غیر متاثر کن ستارہ ہے اور ان دو بلین سورجوں میں سے ایک ہے جو ہماری کہکشاں میں موجود ہیں۔ ہم اس کہکشاں کے مرکز سے اتنی دور ہیں کہ روشنی اگر ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتو اسے ہمارے سیارے تک پہنچنے میں تقریباً تیس ہزار سال لگ جائیں گے۔ ہم کہکشاں کے کسی پس ماندہ مضافات میں بستے ہیں جہاں کوئی سرگرمی نہیں ہے۔ اور ہماری کہکشاں بھی خلا کی وسعتوں میں بکھری ہوئی اربوں کہکشاؤں کا ایک بے حد معمولی سا جزو ہے۔ زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ ہم اس پوری کائنات کو اپنی دنیا کہنے لگیں گے۔ ہم ایسی لاتعداد دنیاؤں کے درمیان گھری ہوئی صرف ایک دنیا کے باشندے ہیں۔

الجبرا میں مرکز ان تمام عناصر کے مجموعے (set) کو کہتے ہیں جو دیگر عناصر کے ساتھ تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اسے عموماً Z کی علامت سے ظاہر کیا جاتا ہے جو جرمن لفظ (Zentrum) بمعنی مرکز سے لیا گیا ہے۔ عظیم یونانی ماہرِ طبیعیات، ریاضی دان اور انجینئر ارشمیدس نے پہلی بار کسی کمیت کے مرکز (center of mass) کا تصور پیش کیا تھا۔ کمیت اور قوتِ ثقل کے مرکز کا تصور عملی زندگی میں حرکت کی سادہ مساواتوں کے اطلاق سے

Marfat.com

روزمرہ زندگی کی مختلف اشیا میں استعمال ہوتا ہے مثلاً دروازوں کے قبضوں میں، محور میں، ایکسل میں اور مدار کی تکنیک وغیرہ میں۔ آج کل یہ فزکس کی دنیا میں میں بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے؛ جیسے اینگولر مومینٹم (angular momentum) یا سکونی حرکت (momentum of inertia) کے مطالعے میں یا پھر مرکزِ قوتِ ثقل (center of gravitational forces) کے مطالعے میں۔ بلاشبہ حقیقت مراکز کا ایک تسلسل (continuum of centers) ہے جو مرئی دنیا کے طول و عرض میں اور اس کے متوازی غیر مرئی دنیا کی لامتناہیت میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ اللہ ان سب **مراکز کا مرکز** (Center of all centers) ہے۔

عملِ تخلیق میں مصروف خداوند، ولیم بلیک، ۱۷۹۴ء، صاحبِ بصیرت شاعر اور مصور

بے شک سٹیفن ہاکنگ نے مرئی حقیقت کا مرکز قوتِ ثقل کو قرار دے کر ایک جرأت مندانہ کوشش کی ہے لیکن یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ تو بنیادی نوعیت کی سائنس ہے۔ شاید سٹیفن ہاکنگ کو اعلاتر مراکز کی دریافت میں ایک ہزار سال اور لگ جائیں۔ یہ اعلاتر مراکز خود انسان کے مطالعے سے ہی آشکار ہو سکتے ہیں جسے آپ چاہیں تو ارتقا کا عروج کہ دیں یا تخلیق کا تاج سمجھ لیں۔ مستقبل انسانی علوم کا ہے، طبعی علوم کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ شعور (consciousness) ہمارے عہد میں کثرتِ استعمال سے پامال ہو جانے والی اصطلاح بن کر رہ گیا ہے۔

Marfat.com

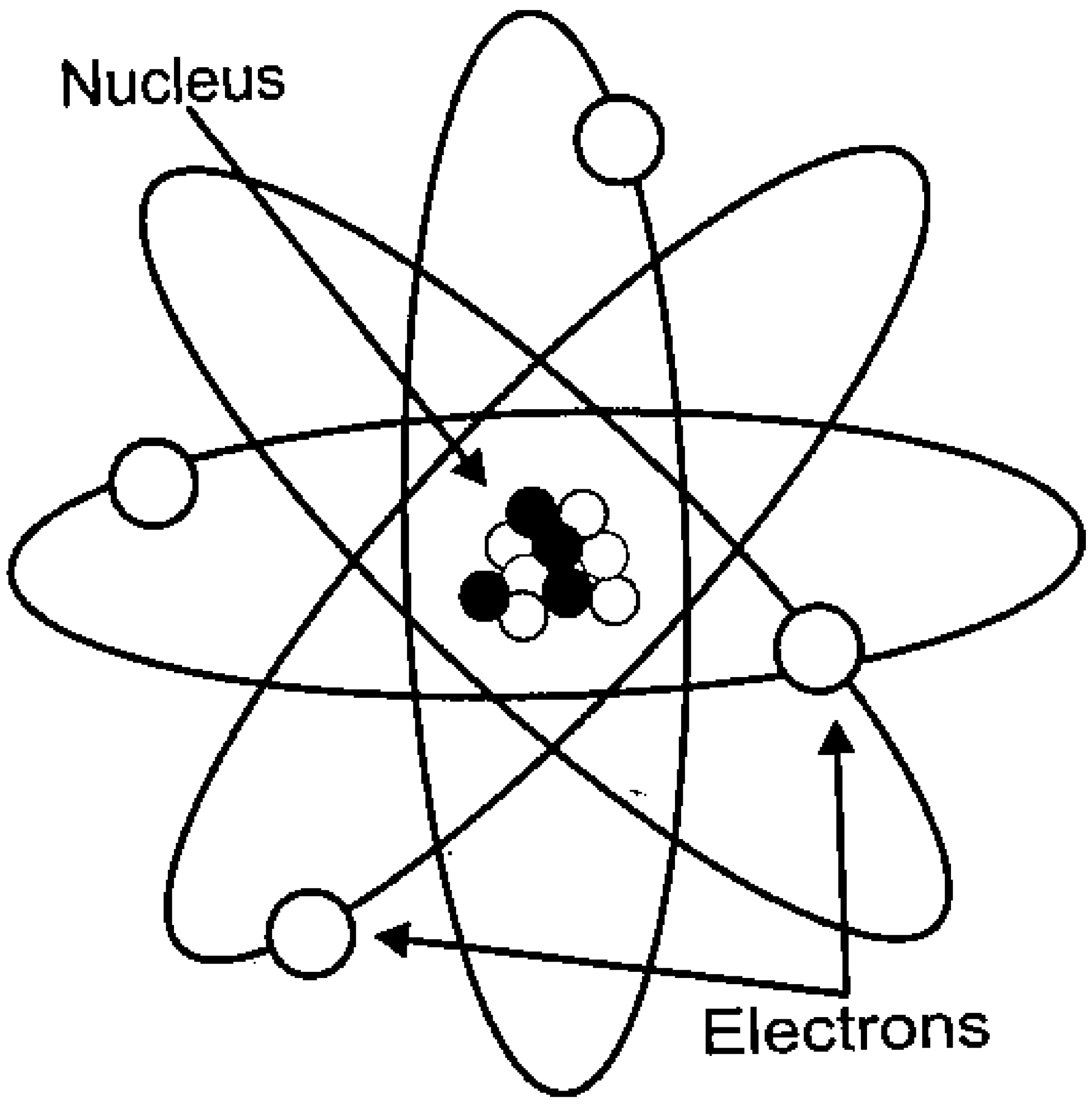

اوسط درجے کا انسانی جسم ایسے سات پدم (quadrillion) ایٹموں سے مل کر بنتا ہے

بہت سے قدیم مذاہب مثلاً بدھ مت اور ویدی عقائد میں حقیقتِ مطلق کو ''چکرا'' (the wheel) کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ آج کے بہت سے جدید علوم میں بھی چکر (cycle) کا ایک متواتر اور بار بار دہرائے جانے والے عمل کے طور پر سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے مثلاً ایٹمی چکر، وقت کا چکر، کیلنڈر، ستاروں کی گردش، نظامِ شمسی کا چکر، موسموں کا چکر، نامیاتی چکر، حیاتیاتی چکر، طبی چکر، دماغی لہروں کا چکر، موسیقی اور آہنگ کا چکر، روحانی چکر، یہ سب کے سب اس ایک ہی اصولِ تخلیق کے مظاہر ہیں۔ دائرہ اور مرکز، صدیوں تک اہم سائنسی مباحث کا موضوع رہے ہیں اور انسان کو حقیقی ترقی صرف اس وقت نصیب ہوئی ہے جب انسان نے یہ جان لیا کہ زمین گول ہے اور خود کو اس کا مرکز ماننے کے نظریے سے دست بردار ہو گیا۔ برونو اور کوپرنیکس نے پہلی بار یہ دریافت کیا تھا کہ زمین گول ہے، ایک مکمل دائرہ، جس میں کہیں جوڑ نہیں ہے۔ ایک کشادہ اور مناسب ترین مکان جو سب کچھ اپنے اندر سمیٹ لینے، سمو لینے کی وسعت رکھتا ہے اور اس لیے بھی کہ کائنات کے تمام اہم اجزا، سورج، چاند، ستارے، سیارے گول ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اور مزید اس لیے کہ ہر شے ایک دائرے کی صورت اختیار کرنے کا رجحان رکھتی ہے اور یہ حقیقت پانی یا کسی بھی سیال مادے کے ایک قطرے سے بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ زمین بھی ایک کرے کی شکل کی ہے کیوں کہ یہ ہر طرف سے اپنے مرکز پر دباؤ ڈالتی ہے اور سورج کے گرد گھومتی ہے جو ایک بلند تر مرکز ہے۔ سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا۔ گلیلیو کے زمانے میں دوربین ایجاد ہوئی تو مشتری کے گرد چار سیارے گھومتے نظر آئے۔ یہ ایک ثبوت ہے کہ زمین کی سورج کے گرد حرکت محوردر محور

Marfat.com

اور دوسرے لفظوں میں دائرہ در دائرہ ہے۔

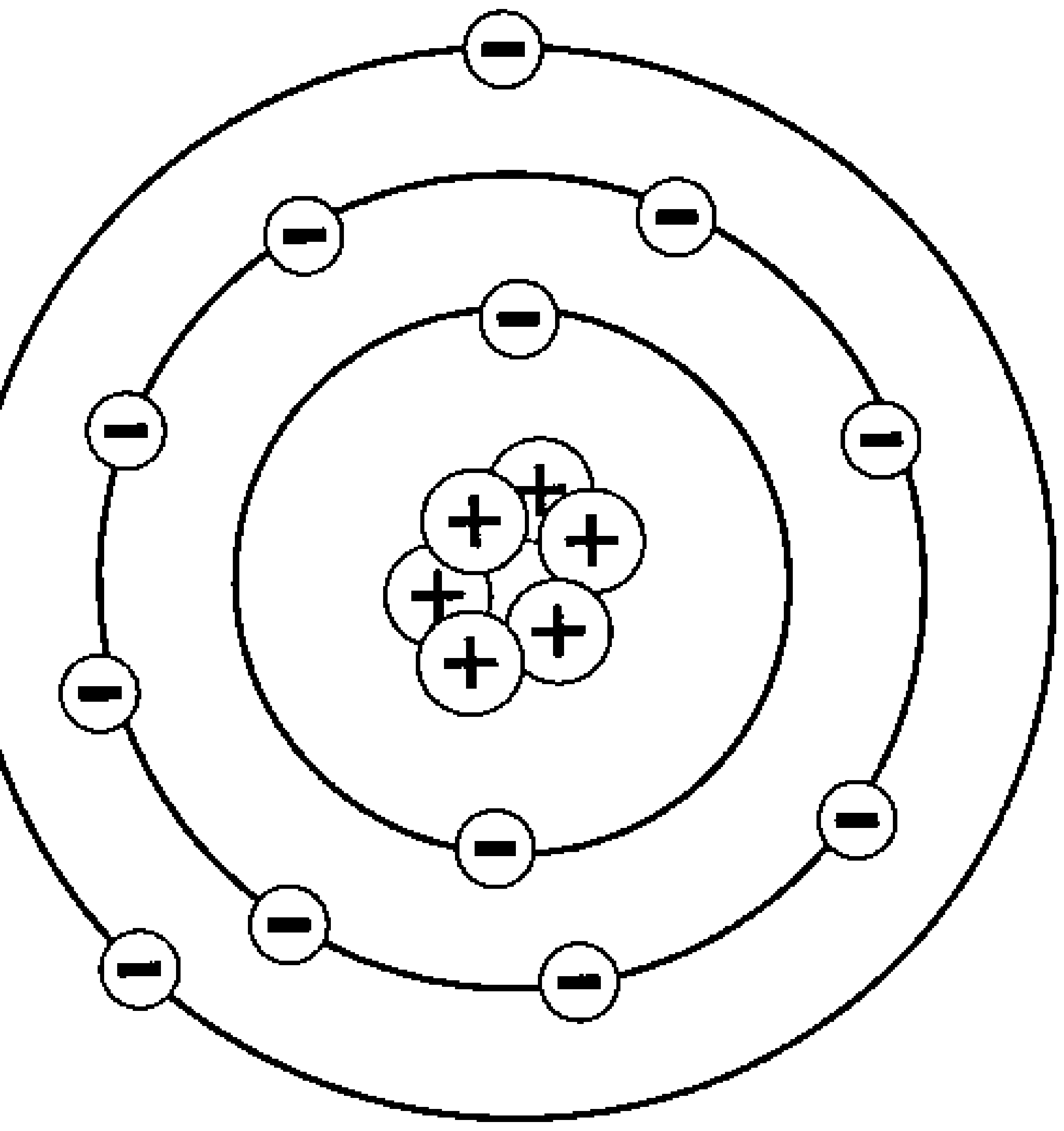

اور ہر شے ایٹموں سے مل کر بنی ہے جو ایسے دکھائی دیتے ہیں!

مرکز کے بغیر کوئی گردش ممکن نہیں:
No Circulation without Center

چکر ایک گردش کا نام ہے۔ ایک مسلسل گردش۔ جیسے تمام عناصر اور مادے زمین کی مختلف سطحوں؛ حیاتی کرّے، آبی کرّے، ہوائی کرّے اور حجری کرّے کے اردگرد مسلسل حرکت کرتے رہتے ہیں، مختلف صورتوں اور حالتوں میں، مختلف اجسام کی ضرورتیں پوری کرنے کا وسیلہ بنتے ہوئے اور اس طرح زندگی کے احیا اور بحالی کے عمل میں مسلسل شریکِ کار رہتے ہوئے ہمیشہ مصروفِ سفر، ہمیشہ ایک گردشی حرکت میں محو۔ حتیٰ کہ گل سڑ کے تحلیل ہو جانے کا چکر بھی زمین کو زرخیز کرنے کے عمل میں شریک ہوتا ہے اور پودوں، جانوروں اور انسانوں کے لیے خورد و نوش کے ذرائع کی زنجیر بناتا ہے۔ چکر ہمیں زندہ رکھتا ہے، ہمیں تحرک بخشتا ہے، توانائی عطا کرتا ہے اور ترقی کا زینہ بنتا ہے۔ چکر ہمیں تازہ دم کرتا ہے، از سرِ نو جینے کی امنگ دیتا ہے اور ہماری سرد ہو جانے والی آگ کو، ہماری توانائی اور قوتوں کو پھر سے روشن اور تیز تر کر دیتا ہے۔ چکر زوال اور ارتقا، موت اور حیات کی متضاد قوتوں کے درمیان توازن قائم رکھتا ہے۔ تمام غذائی اجزا غیر نامیاتی سے نامیاتی کی طرف اور نامیاتی سے دوبارہ غیر نامیاتی کی طرف گردش کرتے ہیں۔ یوں ایک دوسرے کی مخالف قوتوں کے اشتراک سے ایک ابدی چکر قائم ہوتا ہے جسے سائنس کی زبان میں حیاتی ارضی کیمیائی چکر (Bio-geo-chemical Cycle) کہتے

Marfat.com

ہیں۔ یہ چکر فطرت کا آفاقی قانون ہے جس کا ہر شے پر اطلاق ہوتا ہے۔

ٹرپی گف بیٹری وائر کا تجربہ (trippy-gifs-battery-wire experiment) ظاہر کرتا ہے کہ جب آپ بیٹری کے مثبت (O+) اور منفی (O-) سروں کو تانبے کے تار کے ذریعے ایک دوسرے سے جوڑتے ہیں تو تانبے کے تار میں ایک گردشی حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ ہر قسم کی حرکت دباؤ (push) اور کھنچاؤ (pull) کی قوتوں کے درمیان ایک متوازن تعامل (balanced interaction) سے وجود میں آتی ہے۔ ہر حرکت نفی اور اثبات کا تعامل ہے۔ عیسائیت میں چکر کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گرد ایک نورانی ہالے کی صورت بیان کیا جاتا ہے۔ ویسے بھی روحانیت کو ظاہر کرنے کے لیے ایسا ہی روشن چکر اولیا اور پیغمبروں کے سر کے گرد بھی دکھایا جاتا ہے۔ عیسائیت میں چکر کی اہمیت کے لیے دیکھیے: www.bible.com

یہی قانون روحانیت پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ وجود سے لے کر عدم تک اور مرئی سے غیر مرئی تک تمام تر حرکت متضاد قوتوں کی باہمی کشش کا نتیجہ ہے۔ کشش اور گریز کی مساوی مگر متضاد قوتیں اشتراکِ عمل سے ایک ابدی چکر تشکیل دیتی ہیں۔ یہ قوتیں بظاہر متضاد دکھائی دیتی ہیں مگر درحقیقت ایک ہی ہیں جو سدا ایک حرکی توازن قائم رکھنے میں کوشاں رہتی ہیں۔ کائنات کی ہر حرکت، ہر رفتار گردشی ہے، زمین، سورج، اجرامِ فلکی اور ارتقا کی رفتار جسے ہم ایک بے ترتیب پیچیدگی سے شروع ہو کر ایک منظم پیچیدگی کی جانب بڑھنے والا سفر قرار دے سکتے ہیں۔

کائنات

Marfat.com

تسبیح:
The Rosary

یہاں تک کہ نہ صرف زندگی جس کا آغاز واحد خلیے سے ہوتا ہے بلکہ پوری کائنات بھی جو ایک اتنے چھوٹے غیر مرئی نقطے سے پھوٹی ہے جس کی جسامت کے سامنے ریت کا ذرہ بھی پہاڑ معلوم ہوتا ہے، اسی گردش کے مظاہر ہیں۔ مادی دنیا پوری کی پوری ایک ہی عنصر 'ہائیڈروجن' سے نکلی ہے۔ تسبیح بھی، جو زمانہ قدیم سے موجود ہے، ایک چکر کی طرح ہوتی ہے۔ یہ الوہیت کی اصل فطرت کا انکشاف کرتی ہے۔ یہ ایک غیر مرئی، ماورائی اللہ کے گرد گھومتی ہے اور اس کے ننانوے موتی اللہ کی ننانوے صفات کے مظہر ہیں۔ تسبیح کو انگریزی میں Rosary کہتے ہیں جس کا لغوی مطلب ہے گلابوں کا ہار۔ عیسائیت میں یہ عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے اسرار کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ ایک ذریعہ ہے جس کی مدد سے مریم کی زندگی میں شریک ہو کر عیسیٰ کو پایا جا سکتا ہے۔ پوپ جان پال ثانی نے اسے عیسائیت میں گیان دھیان کا لطیف ترین اور سب سے مستحسن طریقہ قرار دیا ہے۔ عیسائی ولیوں اور خدا رسیدہ بزرگوں نے صدیوں سے تسبیح پر ورد کرنے کے لیے توجہ، ادب اور نیک نیتی کو لازمی شرائط قرار دے رکھا ہے۔ پیدرو پیو (Pedro Pio، اٹلی: مئی ۱۸۸۷۔ ستمبر ۱۹۶۸) نے اسے مقدس مطالعہ (Lectio Divina) قرار دیا ہے۔ ''کتابوں کے مطالعے سے انسان خدا کو تلاش کرتا ہے لیکن تسبیح پر گیان دھیان کر کے اسے پا لیتا ہے۔'' گویا چکر پوری کائنات کی دائمی اور ابدی حقیقتوں کا اظہار کرتا ہے۔ اس ابدی چکر کی اہمیت کے لیے دیکھیے: www.bible.com

اسلامی اور یہودی روایات میں تسبیح کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی حمد و ثنا کی جائے، اس کا ذکر کیا جائے اور اس کی ذات پر غور و فکر کیا جائے۔ یہ اسمائے حسنہ کو چکر یا دور کی صورت میں دہرانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس کا مرکزی خیال غیر مرئی، واحد اور الوہی ہستی کا ہے جس کے گرد ننانوے موتی، اس کی ننانوے صفات کے اظہار کے لیے گھومتے ہیں۔ مشرق میں تسبیح اللہ کے ذکر کا ایک آلہ ہے۔ بدھ تیاگی اور درویش مدتوں سے عبادتِ الٰہی کے لیے اپنے منتروں اور مراقبوں میں تسبیح کا استعمال کرتے آئے ہیں۔ مسلمانوں میں تسبیح کی روایت غالباً یہودیوں سے آئی ہے۔ عام طور پر یہ سو موتیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ننانوے موتیوں پر اللہ کے ننانوے نام پڑھے جاتے ہیں اور سوواں موتی امام یعنی سردار کہلاتا ہے جو پہلے چکر کا خاتمہ اور اس کے ساتھ ہی دوسرے چکر کا آغاز کرتا ہے۔ لہٰذا تسبیح کے اس چکر میں آغاز و انجام بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔(END and the

Marfat.com

(BEGINNING concur on the CYCLE)۔

پہلے پہلے تسبیح صرف تینتیس (۳۳) موتیوں پر مشتمل ہوتی تھی (کیا اس امر کی کوئی مماثلت ابتدا میں صرف ۳۳ عناصر کی دریافت سے ہوسکتی ہے؟) اور امام ہر تینتیس دانوں کے بعد، اسمائے حسنہ کے ایک نئے ارفع تر چکر کا آغاز کرتا تھا، جیسے موسیقی کے سر ایک قوس بناتے ہوئے رفتہ رفتہ بلند تر ہوتے جاتے ہیں۔ ایک مکمل تسبیح میں بھی ہر تینتیس دانوں کے بعد ایک چھوٹا امام آتا ہے جو اسما کے چکر کے بلند تر ہونے کا اعلان کرتا ہے، یہاں تک کہ تیسرے ضمنی چکر کے بعد ننانوے نام مکمل ہو جاتے ہیں اور ہم دوبارہ ایک پر پہنچ جاتے ہیں۔ یوں یہ چکر اوپر جاتا اور پھر نیچے آتا ہے۔ اوج سے پستیوں کی طرف اور پستیوں سے پھر بلندیوں کی جانب مائلِ پرواز۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس کا کوئی ربط تاریخ، عمرانیات اور انسانی زندگی کے اوپر نیچے آتے جاتے چکروں سے بھی ہے؟

پہیے کی ایجاد:
Invention of the Wheel

بنی نوع انسان نے اس گردشی حرکت کو پہیے کی ایجاد سے دریافت کیا تھا۔ پہیہ بھی ایک چکر ہی ہوتا ہے جو ایک مرکز کے گرد گھومتا ہے۔ پہیے کی اس گردشی حرکت کی قدر و قیمت کو پہچان کر اسے بنی نوع انسان کے عملی فائدے کے لیے استعمال کیا۔ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہم ترین دریافتوں میں سے ایک تھی۔ ذرائع آمد و رفت، چرخے کا پہیہ، پانی کھینچنے کا پہیہ، اور جدید طرزِ زندگی میں جیٹ انجن، ٹربائن، جنریٹر، اڑن پہیہ یہ سب اسی کے مختلف روپ ہیں۔ اس دریافت کے بعد انسان اس قابل ہو گیا کہ سٹیرنگ ویل کی مدد سے جہاز رانی کر سکے، سفر میں سمت کا تعین کر سکے، مڑنے کے صحیح زاویے تلاش کر سکے اور منزل کا بالکل درست اندازہ لگا سکے۔ پہیے کا اصل مطلب بھی یہی ہے؛ مڑ جانا، گھوم جانا۔ یہ گردش، رفتار اور ارتقا کی علامت ہے۔ قدیم سنسکرت میں اسے ''چکرا'' کہتے تھے جس کا مطلب ہے دائرہ۔ بدھ مت میں ''دھرما چکرا'' کا مطلب ہے دھرم کا پہیہ، جس کے آٹھ ارے یا ڈنڈے ہوتے ہیں اور جو بدھ مت کے ہشت پہلو مقدس قانون کی علامت ہیں۔ قدیم یوگا میں چکرا دائرے کی علامت ہے جو باقاعدہ تکرار، آواگون، نئی زندگی، ین اور یونگ کو ظاہر کرتا ہے۔ چکرا کے ذریعے یوگا کے الوہی مراکز کو فعال کیا جاتا ہے۔ بہت سے مذہبی عقائد میں روحانی ترقی کے لیے اس مشق پر زور دیا جاتا

Marfat.com

ہے۔دیکھیے: Chakra Meditation, اور www.chakraenergy.com

Dharma wheel

بدھ مت میں چکرا مرکز، دائرے اور تسلسل کو ظاہر کرتا ہے۔چکرا ایک تسلسل کا نام ہے۔حقیقت خطی (linear) نہیں ہے بلکہ ہر حقیقت غیر خطی (non-linear) ہے۔یہ تصویر ظاہر کرتی ہے کہ رنگوں کا طیف (color spectrum) دراصل ایک چکر ہے اسمائے حسنیٰ بھی اسی طرح ایک چکر کی صورت میں ہیں۔جس طرح رنگوں کا چکر مسلسل ہے اسی طرح صفاتِ الٰہی میں بھی تسلسل پایا جاتا ہے۔

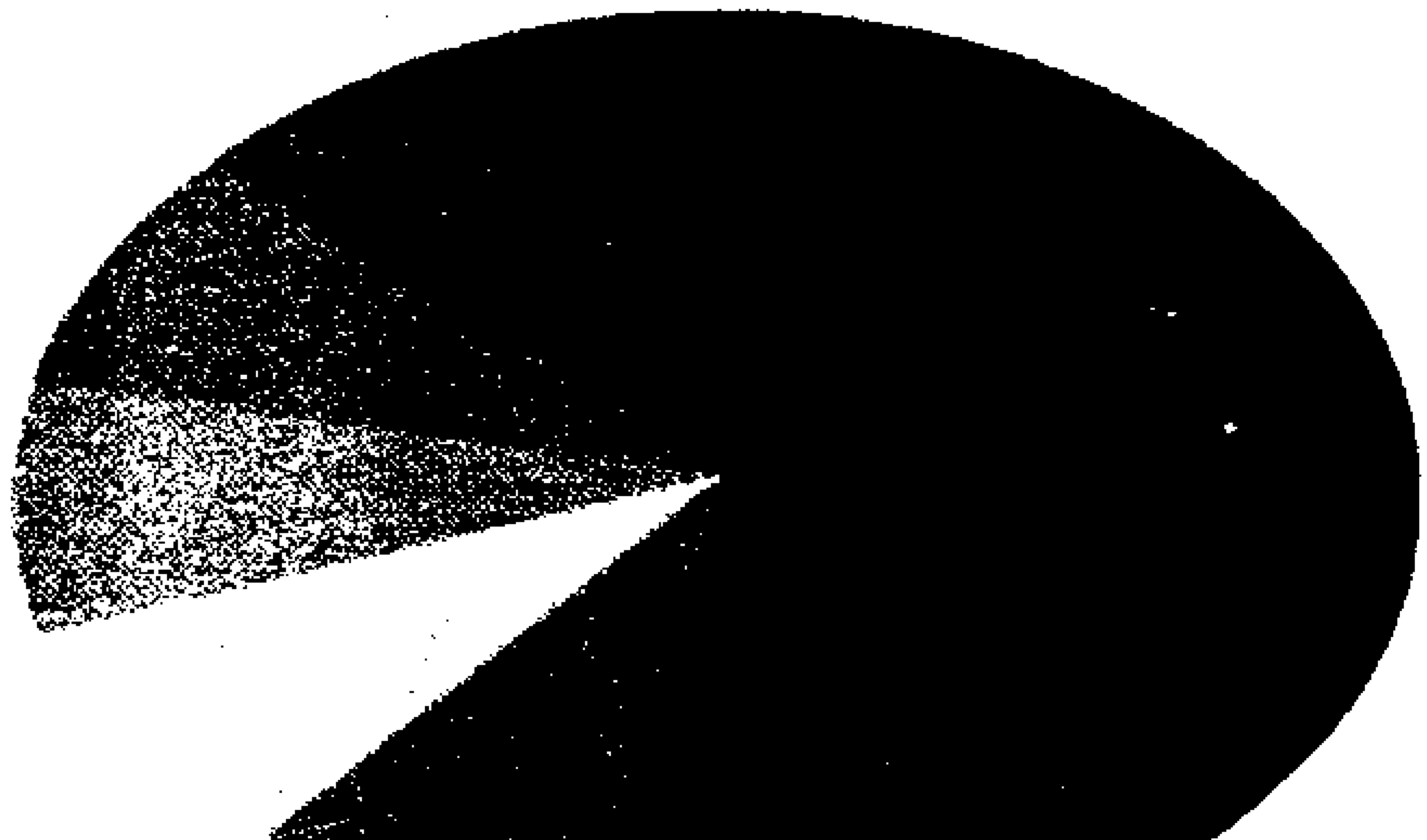

Color spectrum

اب ذرا اس پچھلے بیان کے اہم ترین الفاظ پر غور کیجیے: اشتراک باہمی، چکر، غیر مرئی مرکز، تسلسل، مساوی معکوس، تضادات کی ہم آہنگی اور اشتراکِ عمل، پہلے اور آخری کا اتصال، درجہ بندی، صعودی اور نزولی حرکات، کشش اور گریز کی قوتیں، پھیلاؤ اور سکڑاؤ، فراخی اور تنگی (بسط و قبض)، متحرک توازن، ابدی چکر، ہر انتہا ایک نئی ابتدا۔

یہ وہ بنیادی تصورات ہیں جن کی مدد سے پیچیدہ ترین حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے اور جسے ہم آئندہ صفحات میں

Marfat.com

اس سائنسی تصور کی تفصیل بیان کرنے کے بعد زیادہ گہرائی میں جا کر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ مختصر ترین الفاظ میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ گردشی چکر کا مکمل وقوعہ وحدت پیدا کرنے والی قوتوں کا اصول (principle of unified forces) بیان کرتا ہے۔

''تمام تر حرکت اور سرگرمی وجود کی عدم کی جانب کشش کا نتیجہ ہے۔ یہ بات عمومی نظریۂ معدومیت (General Nothingness Theory) میں منطقی طور پر ثابت ہو چکی ہے۔ کائنات کا آغاز ایک ایسی حالت سے ہوا تھا جس میں نہ مکان تھا نہ زمان، نہ مادہ اور نہ توانائی۔ یہ ایسی ہی معدومیت کی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ لامحدود وقت کے اندر، یہ ہمیشہ سے ایسے ہی پھیلاؤ اور سکڑاؤ کے چکر میں محوِ سفر ہے اور ہمیشہ یونھی رہے گی۔ فطرت کے تمام نظام اسی چکر کی پیروی کرتے ہیں۔'' تفصیل کے لیے دیکھیے:
Google.com, Nothingness Theory, 1989-2007 Corey Kaup Communications.

اللہ جو تنوع ہے:
ALLAH THE DIVERSITY

اللہ کے نام جن متنوع اور گوناگوں صفات کا اظہار کرتے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی وحدت بیک وقت اجتماعی اور گوناگوں بھی ہے۔ جہاں اس کا ذاتی نام صرف ایک ہے وہاں اس کے صفاتی نام ننانوے ہیں جو اس ایک ذات کے مظاہر کی کثرت اور تنوع کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ نام اللہ کی ایک مرئی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ چوں کہ یہ صفات، روشنی کے مرئی طیف کی طرح، جو ان گنت رنگوں کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے، خود کو ظاہری دنیا میں بے نقاب کرتی ہیں اور ہم انھیں خود انسانوں کے اندر بھی دیکھ سکتے ہیں، اس لیے آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اللہ کی وحدت خود کو کثرت میں بے حجاب کرتی ہے۔ وہ واحد ہے مگر جمع میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ الواسع یعنی سب پر محیط ہے۔ اللہ ان صفات کا حامل تبھی ہو سکتا ہے جب وہ خود کو گوناگوں مظاہر میں عیاں کرتا ہے اور یوں الجامع اور الواسع یعنی ہر چیز کا مجموعہ، ہر چیز کا حامل، ہر چیز پر مشتمل، ہر چیز پر محیط، ہر چیز سے ہم آغوش، اور خود ہر چیز بن جاتا ہے۔

اس کی دیگر خصوصیات بھی اللہ کے تنوع کو ثابت کرتی ہیں۔ مثلاً وہ الظاہر (عیاں) ہے،

Marfat.com

الواسع (محیطِ کل) ہے، الحق (سچ) اور العدل (انصاف) ہے۔ یہ نام اللہ کی وحدت اور کثرت کی نوعیت کے بارے میں اہم اشارے فراہم کرتے ہیں۔ الظاہر اشارہ کرتا ہے کہ وہ خارجی ہے، مرئی ہے، بیرونی ہے اور عیاں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خارجی اور ظاہری دنیا گو اللہ نہیں ہے لیکن اللہ کے سوا کچھ اور بھی نہیں ہے۔ لہٰذا ظاہری کثرت اور تنوع بھی دراصل وحدت ہی ہے۔ بے شک یہی وہ سائنسی حقیقت ہے جو جدید ماحولیاتی سائنس نے دریافت کی ہے۔ انسان فطرت میں موجود جس شدید تنوع اور نیرنگی کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ اپنی اصل میں واحد حقیقت ہے۔ فطرت ایک نامیاتی وحدت ہے۔ اس میں سبھی کچھ شامل ہے اور یہ متضاد صفات کی حامل ہے جن کا باہمی ربط فطرت میں ایک مستقل توازن قائم رکھتا ہے۔ اسی طرح ہر حقیقت متناقض ہوتی ہے۔ جہاں تک اللہ خود کو ظاہر کرتا ہے وہاں تک کائنات میں موجود ہر چیز اللہ کا مظہر ہوتی ہے لیکن جہاں وہ منکشف نہیں ہوتا وہاں کوئی مظہر بھی اللہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تضاد حقیقت کی بنیادی فطرت میں موجود ہے۔ ہر سچائی اسی طرح متناقض ہوتی ہے، سائنس بھی متناقض ہے اور فلسفہ بھی متناقض ہے۔

اسی طرح الواسع (محیطِ کل)، الجامع (سب کو جمع کرنے والا) الحق (سچ) اور العدل (انصاف) باہمی مربوط اور ایک دوسرے پر منحصر صفات ہیں جو ایک جامع، محیطِ کل حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ سچائی تک پہنچنا تب تک محال ہوتا ہے جب تک اس کے ہر پہلو کا مطالعہ اور مشاہدہ نہ کر لیا جائے اور تمام متعلقہ حقائق جمع نہ کر لیے جائیں۔ اسی طرح انصاف تب تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک تمام اختلافی شہادتوں پر غور نہ کر لیا جائے۔ اللہ اس وقت تک انصاف کرنے والا نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ ہر حقیقت کو جمع کرنے والا (الجامع) نہ ہو اور اسے تب تک حق کا لقب نہیں مل سکتا جب تک وہ ہر پہلو کو محیط (الواسع) نہ ہو۔ یہاں پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی متنوع صفات کس طرح ایک دوسرے پر منحصر اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

تنوع کو مختلف لغات میں نیرنگی، عدم مشابہت، مختلف ہونے کی حالت، بوقلمونی، کثیر صورتی اور غیر متجانست قرار دیا گیا ہے یعنی کسی شے کا جداگانہ، منحرف یا مرکب ہونا۔ ہم اس تصور کا اطلاق اللہ پر بھی کر سکتے ہیں کیوں کہ وہ بھی متنوع درجات، متفرق سطحوں اور مختلف النوع صفات و عناصر کا مجموعہ ہے۔

سائنس میں تنوع کی تعریف یوں کی جاتی ہے، ''حیاتیاتی تنظیم کی ہر سطح پر موجود زندگی کی متنوع صورتیں''۔ حیاتیاتی تنوع کا مطلب ہے، پورے کرہ ارض پر زندگی کی مختلف صورتوں کے درمیان اختلاف کے مدارج۔ یہ

Marfat.com

کسی بھی نظام کی صحت کا پیمانہ ہے۔ انسانیت کے لیے تنوع کی اہمیت کا بڑھتا ہوا شعور اس امر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اقوامِ متحدہ نے ۲۰۱۱۔۲۰۲۰ تک کے عشرے کو حیاتیاتی تنوع کا عشرہ قرار دیا ہے۔

۱۹۹۲ میں اقوامِ متحدہ ارتھ سمٹ
United Nations Earth Summit

میں حیاتیاتی تنوع کو تمام ذرائع سے حاصل ہونے والی، زندہ اجسام کی نیرنگی قرار دیا ہے۔ نظریہ خود تولیدی (ABIOGENESIS) ایک طرح کی قدرتی سائنس ہے جس میں اس بات کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ حیات کیسے قدرتی عمل کے ذریعے غیر حیاتی عناصر سے وجود میں آئی۔ حیاتیاتی ارتقا میں اس بات کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ زندگی اعلاتر صورتوں کی طرف کیسے ترقی کرتی ہے۔ چھ سو ملین سال پہلے، زندگی ایک واحد خلیے سے وجود میں آئی تھی۔ اس عرصے کے دوران تمام تر زندگی یک خلوی (single cell organisms) جانداروں پر مشتمل تھی۔ آج ان جانداروں میں جو تنوع اور نیرنگی دکھائی دیتی ہے وہ ساڑھے تین بلین سالوں کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک بتدریج عمل تھا جس میں ایک جیسے عناصر کی مختلف تراکیب سے نوعی تغیرات رونما ہوتے رہے۔ برازیل کے اطلانتک جنگل میں جو حیاتیاتی تنوع کی ایک نادر مثال ہے، پودوں کی کم از کم بیس ہزار، ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے جانوروں کی ۱۳۵۰ اور کیڑوں مکوڑوں کی کروڑوں اقسام موجود ہیں جن میں تقریباً نصف ایسی ہیں جو اور کہیں نہیں پائی جاتیں۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے:

www.geoearthorg/article/biodiversity۔ انسان اور اس کے شعور کا نمودار ہونا اس ارتقائی عمل کا عروج ہے۔

اللہ کی صفات بھی اسی طرح بتدریج اس طبعی دنیا میں منکشف ہوتی ہیں اور انسانی خصوصیات، اوصاف، کردار، فطرت، مزاج، شخصیت، انفرادیت اور تشخص کی نیرنگی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ صفات پیدائشی اور خلقی ''اچھائی'' (الرحمٰن) سے لے کر توازن اور انصاف کے بے لچک اصولوں (العدل) تک اور دوسری طرف عیسیٰ کے صبر و تحمل (الصّبور) تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ سب اللہ کے درجہ وار تسلسل کے مختلف مقامات ہیں۔

Marfat.com

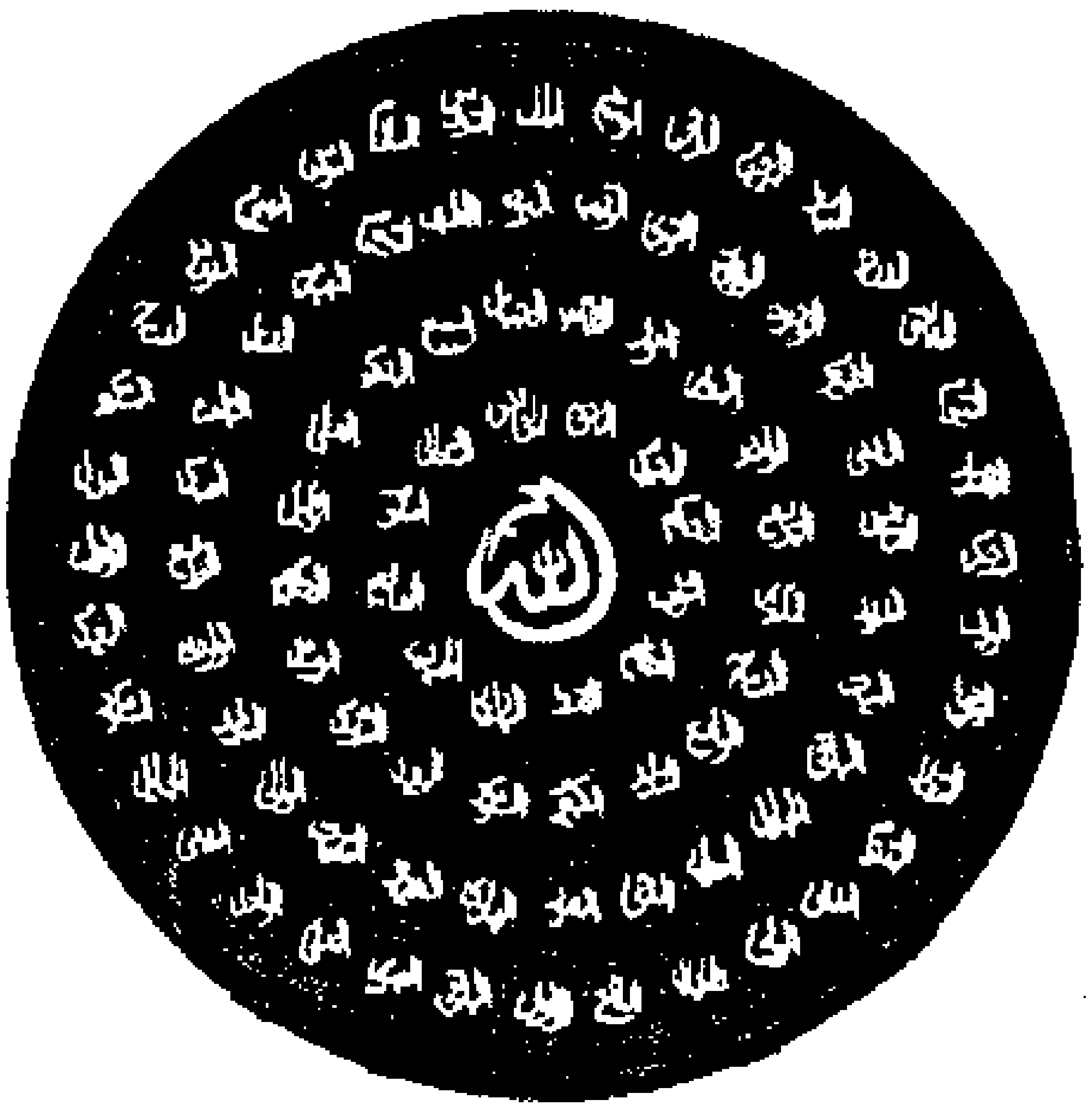

لکڑی پر کھدے ہوئے اسمائے حسنیٰ

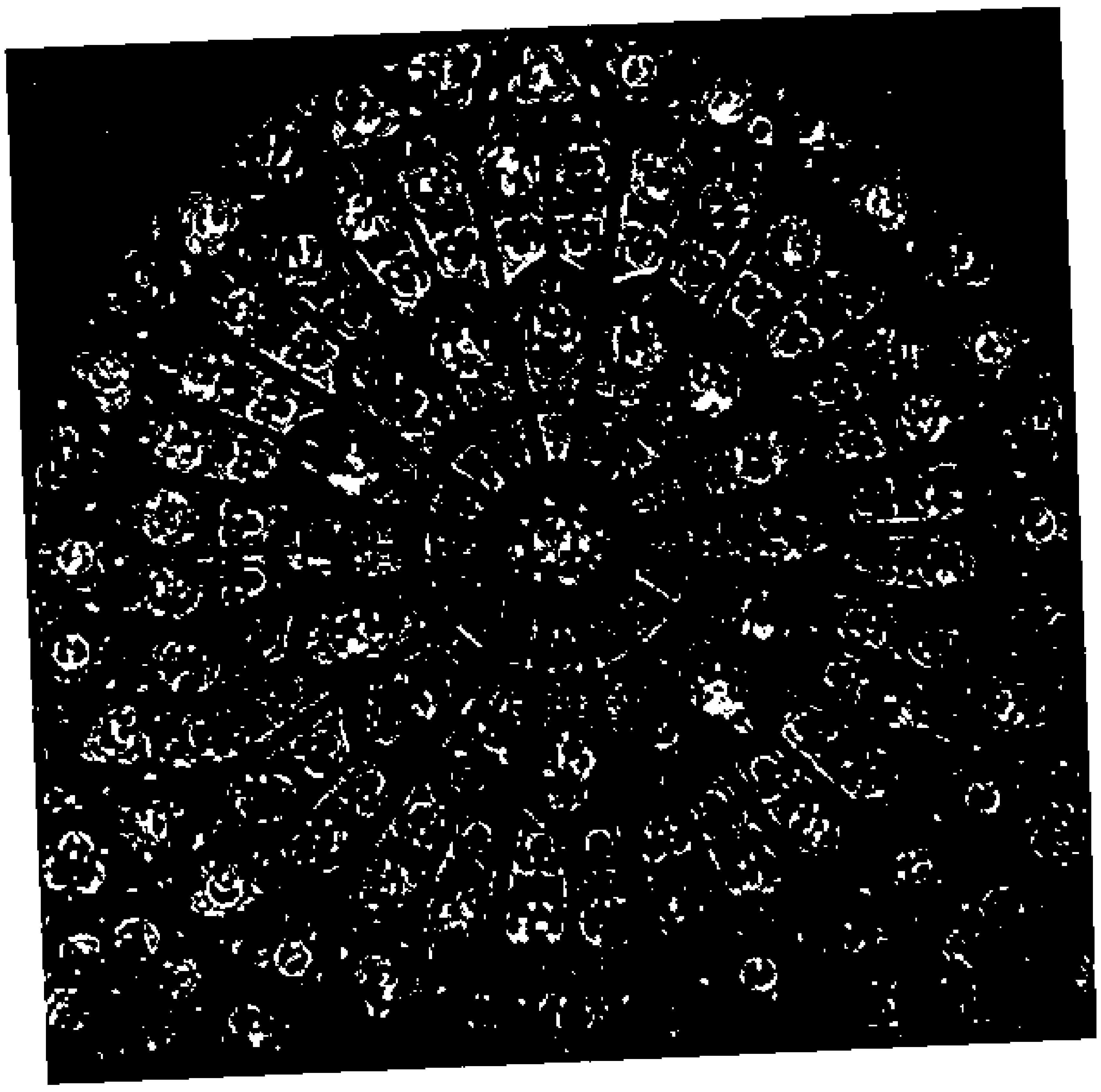

نوٹرے ڈیم، پیرس کے ایک کلیسا کی گوتھک طرز کی کھڑکی

اللہ کی یہ نیرنگی انسانوں کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ افراد یا انواع کو منفرد خصوصیات، تجربات اور اوصاف عطا کرتی ہے۔ یہی انسان کو جدت طرازی کی استعداد بخشتی ہے، نئے نئے خیالات، نت نئی تخلیقی اپچ،

Marfat.com

کاروبار اور معاشرتی اور سیاسی تنظیم کی بہتر صلاحیتوں سے نوازتی ہے۔ثقافتی تنوع ترقی کا محرک بنتا ہے۔یہ فکری و ذہنی، جذباتی ، اخلاقی اور روحانی طور پر زیادہ تکمیل یافتہ زندگی گزارنے کا ایک وسیلہ ہے۔یہی تنوع ہے جو ماحولیاتی نظام کی صحت مندی کا سبب ہے۔ہوا اور پانی صاف رکھنے کا ذریعہ ہے اور کٹاؤ اور بردگی (erosion) کی روک تھام کا ذمہ دار ہے۔ہمیں تقریباً ۸۰ فی صد خوراک پودوں سے حاصل ہوتی ہے۔انسان کم از کم پودوں کی چالیس ہزار اقسام استعمال کرتے ہیں۔فطرت کا یہی تنوع ہے جس پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے اور جو انسان کو خوراک، لباس اور رہائش مہیا کرنے کا ذمہ دار ہے۔تنوع انسانی صحت کے لیے بھی مفید ہے۔یہ سائنسی شہادت ہے جس کی بنیاد صحت کی عالمی صورت حال اور امراض کے خاتمے کے لیے والے مطالعے پر مبنی ہے۔حیاتیاتی تنوع ادویات اور دیگر طبی وسائل کی دریافت میں بھی بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔دواؤں کی ایک بڑی تعداد فطرت میں موجود متنوع ذرائع سے حاصل ہوتی ہے اور دنیا کی کل آبادی کا تقریباً اسّی فی صد فطرت سے حاصل شدہ ادویات پر انحصار کرتا ہے۔صنعتی اور تجارتی استعمال کا مواد بھی حیاتیاتی ذرائع سے حاصل ہوتا ہے، مثلاً تعمیراتی مٹیریل، نباتاتی ریشے، رنگ، ربڑ، تیل، لکڑی، کاغذ اور خوراک وغیرہ۔تنوع زرعی ترقی کا بھی وسیلہ ہے۔فصلوں میں جتنا تنوع پیدا ہوتا جاتا ہے اتنا ہی بیماریوں اور حملہ آور کیڑوں مکوڑوں سے تحفظ حاصل ہوتا ہے۔زراعت میں یکسانیت تباہ کن ثابت ہوتی ہے اور اس کا ایک ثبوت انیسویں صدی کے اواخر میں یورپ کی وائن کی صنعت کی تباہی ہے۔یہی معاملہ انسانی صحت کا بھی ہے۔ایک ہی خاندان کے افراد کی باہمی شادیاں امراض اور صلاحیتوں کے زوال کا سبب بنتی ہیں۔اللہ کی نیرنگی اور تنوع ساکت و جامد نہیں، حرکی ہے۔اللہ کے ناموں، مثلاً الغفار (معاف کرنے والا) اور القہار (قہر ڈھانے والا) کے ساتھ مستقل اور متعین اقدار وابستہ نہیں کی جاسکتیں۔ہم ایسا نہیں کرسکتے کہ کسی ایک صفت پر توجہ مرکوز کرلیں اور اس باہمی حرکی اور زندہ تعامل کو نظر انداز کردیں جو اللہ کی صفات کے پورے نظام کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ان صفات کو انفرادی طور پر قدر و قیمت کا حامل اور مقصود بالذات سمجھنا درست نہیں ہے کیوں کہ اس طرح پورا چکر ٹوٹ جاتا ہے۔ایسا کرنا تو بت پرستی کے زمرے میں آتا ہے۔اس لیے ہمیں اس پورے نامیاتی اور حرکی عمل کو سمجھنا ہوگا جو ان صفات کے درمیان ربط پیدا کرتا ہے۔ہمارا نقطۂ نظر انفرادی اجزا کی بجائے پورے نظام کی کلیت پر نظر رکھنے پر مائل ہونا چاہیے۔یہی کلیہ طبعی یا جسمانی حیاتیاتی تنوع پر لاگو ہوتا ہے۔محض انواع، جینز اور ماحولیاتی نظام کے تنوع کو سائنسی طریقے سے شمار کرنے ہی کو کافی سمجھنا اور اس کے پس پشت کارفرما ارتقا کے اس حرکی عمل کو نظر انداز کردینا

Marfat.com

جو فطرت کی حقیقی اقدار کو نہ صرف قائم رکھتا ہے بلکہ اسے پیدا بھی کر دیتا ہے، مغرب کے ناقص اور متعصبانہ رویے کا اظہار ہے۔ ابھرتی ہوئی جینیاتی سائنس تنوع کو جینز اور جانداروں کی نیرنگی قرار دیتی ہے۔ اس سائنس میں ارتقا کا باعث بننے والے نوعی تغیر و تبدل (mutations)، جینز کی منتقلی اور لونیاتی حرکیات (genome dynamics) کے عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ عمل کسی عملی صوفی، کسی سچے طالب کے، صفاتِ خداوندی کے مطالعے سے مشابہ ہے۔ اللہ کی صفات کی نیرنگی ایک باہمی مربوط اور ایک دوسرے سے تعامل کرتے چکر کا نام ہے۔ اگر ان صفات کے نظام میں سے کوئی ایک ترتیب بھی خارج کر دی جائے تو یہ چکر ٹوٹ جاتا ہے اور تنوع کی یہ حرکی گردش کسی ایک غالب صفت پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اس بات کا اطلاق انسانی نفسیات اور ذہنی ترقی پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام تر حقیقت باہم مربوط ہے۔ نیشنل سائنس فاؤنڈیشن کی ایک تحقیق (۲۰۰۷) کے مطابق حیاتیاتی تنوع اور جینز کا تنوع ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ ان میں سے کوئی ایک انحطاط کا شکار ہوتا ہے تو دوسرا بھی منفی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پودے اور حشرات۔ حال ہی میں تعمیر ہونے والے دارالحکومت اسلام آباد میں، شہر کی تعمیر شروع کرنے سے پہلے یہاں اگی ہوئی جنگلی جھاڑیاں کاٹ دی گئی تھیں اور نئے درخت لگائے گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خوبصورت پرندے جو ان جھاڑیوں میں رہتے تھے، یہاں سے ہجرت کر گئے اور یہاں کوؤں کی کثرت ہو گئی جو درختوں پر رہتے ہیں۔ اسی طرح ہو سکتا ہے انسان بھی، جو فطرت کا مرہونِ منت ہے، گزرے ہوئے برسوں کے دوران صنعتی پھیلاؤ، بڑھتے ہوئے تجارتی رجحان، گنجان معاشرے، عالمگیریت، ذہنی دباؤ، تناؤ، بے چینی، عدم تحفظ، راحت کے فقدان، ایک دوسرے سے کٹ کر جینے کے اسلوب، انا پرستی، انتشار، جنگ اور تصادم کے باعث، اپنی کئی خلقی خصوصیات گنوا چکا ہو۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے کہ زندگی کی مادی اور غیر مادی اقدار، اس دنیا اور اس کے متوازی، بنی نوع انسان کی روحانی حقیقت کے درمیان توازن پیدا کیا جائے۔ خطرے کے آثار اور اشارے تو پہلے ہی سے دکھائی دے رہے ہیں۔ تیزی سے ختم ہوتا ہوا حیاتیاتی تنوع، جانوروں اور پودوں کی معدوم ہوتی ہوئی اقسام، ان کے جینز اور اس ماحول کی تباہی جس پر انسان کی زندگی کا بیشتر حصہ انحصار کرتا ہے، ایک انتہائی پریشان کن بحران کا پیش خیمہ ہے جس کا سامنا بنی نوع انسان کو اس سے پہلے کبھی نہیں کرنا پڑا۔ انسان کا یہ احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے کہ شہری ترقی، صنعتی آلودگی، قدرتی وسائل کے ضیاع اور ضرورت سے زیادہ تجارتی سرگرمیوں کے باعث انسان جن وسائل سے محروم ہو رہا ہے وہ ان وقتی معاشی فوائد

Marfat.com

سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں جو انسان کو ان سرگرمیوں کے نتیجے میں حاصل ہو رہے ہیں۔ ماحولیاتی سطح پر اب یہ لازم ہو چکا ہے کہ انسان اور فطرت کے درمیان، یعنی بنی نوع انسان اور خدا کے درمیان توازن قائم کیا جائے۔ اللہ کے ناموں کا تنوع درجہ بندی (Classification) کے عمل سے بہت ملتا جلتا ہے۔ مئیر (Mayr) نے سائنسی درجہ بندی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ اشیا کو اس طرح درجہ وار ترتیب دینے اور ان کے الگ الگ گروہ بنانے کا نام ہے کہ ایک جیسی یا ملتی جلتی خصوصیات والی اشیا ایک درجے میں ہوں اور یہ گروہ دیگر گروہوں کے ساتھ مل کر بلند تر مدارج کی طرف بڑھتے جائیں۔ ہر گروہ یا نوع مشترک اوصاف یا خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ تقسیم اور تفریق کے اصول کی رو سے حیاتیاتی درجہ بندی (biological classifications) کے نظام مراتب (hierarchy) میں آٹھ نمایاں درجے یا زینے ہیں۔ ان کے درمیانی اور غیر نمایاں گروہ بھی ہوں گے مگر وہ شمار میں نہیں آتے۔ تاہم سائنس دان عام طور پر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ درجہ بندی ڈارون کے مشترک نسلی توارث کے اصول کا اظہار کرتی ہے۔ لہٰذا سائنسی تصانیف میں شجرِ حیات (tree of life) کا تصور بہت عام ہے۔ مشرق کا صوفی بھی اسی طرح اللہ کی صفات کو سات سے آٹھ، بلند تر ہوتے ہوئے مدارج میں تقسیم کرتا ہے۔ شاید مزید سائنسی تحقیقات ہمیں اس مقام پر لے آئیں کہ ہم حیاتیاتی ارتقا کی درجہ بندی کے اصول پر انسانی شعور کی درجہ بندی کے لیے بھی ایسے ہی شجرِ حیات کا نقشہ کھینچ سکیں۔

اس تنوع سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نام صرف اس فہرست میں درج ناموں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ اسمائے حسنیٰ اللہ کی کل صفات کو محیط نہیں ہیں۔ جس طرح اس کی ذات کی نیرنگی بے حساب ہے اسی طرح اس کے نام بھی بے شمار اور لامحدود ہیں۔ جیسے روشنی کے طیف پر موجود ان گنت رنگوں کے بے حساب ہلکے اور گہرے، مخلوط اور اکہرے، مرئی اور غیر مرئی شیڈ، دراصل ایک ہی حقیقت، ایک ہی بے رنگ روشنی کے مظہر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ اسمائے حسنیٰ اللہ کے ناموں میں سے بہترین نام ہیں۔ یہ اللہ کی ممتاز ترین صفات اور لازمی، ناگزیر خصوصیات کے عکاس ہیں۔ اللہ کی یہ نیرنگی اس کی مخلوق میں بھی نظر آتی ہے۔ اللہ کی اسی نیرنگی کے باعث افراد اور انواع میں انفرادیت پائی جاتی ہے، ان کی صفات میں تنوع ہوتا ہے اور ان کے تجربات ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتے ہیں۔ اسی سے ان کی ذہنی، اخلاقی، تہذیبی اور روحانی تسکین وتکمیل کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کی یہ نیرنگی بنی نوع انسان کا عظیم ترین سرمایہ ہے اور اس کا اظہار ہر تخلیق میں ہوتا

Marfat.com

ہے۔ یہی کائنات کی جاوداں ترقی اور دائمی جدت کاری کا محرک ثابت ہوتی ہے۔ یونیسکو کے ثقافتی تنوع کے عالمی کنونشن ۲۰۰۱ کے مطابق یہ تنظیموں کے منشور کا سب سے اہم اور کلیدی عصری مسئلہ ہے۔ وزرائے ثقافت کی گول میز کانفرنس منعقدہ ۱۶۔۱۷ ستمبر ۲۰۰۲ ، استنبول، ترکی کی روداد بھی دیکھیے جس کا عنوان تھا: غیر مرئی ثقافتی ورثہ: ثقافتی تنوع کا آئینہ۔

اللہ کی اس نیرنگی کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مظاہرِ فطرت ہی کی عبادت کی جانے لگی اور ہمہ اوست یا کائنات پرستی جیسے عقائد عام ہو گئے۔ کائنات پرستی (Pantheism) وہ نظریہ ہے جس کے مطابق خدا اس حقیقت کا نام ہے جو ظاہر ہے، آشکار ہے۔

اس عقیدے کا ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ فطرت یا دنیا کو خدا سمجھ لیا جائے اور دوسرا یہ کہ حواس سے حاصل شدہ علم اور تجربے کو فریبِ تخیل سمجھ کر دنیا کی حقیقت کا ہی انکار کر دیا جائے۔ پہلا نظریہ کائنات پرستی کے اس تصور سے مشابہ ہے کہ خدا نہ صرف مظاہر پر مشتمل ہے اور ان سے جھانکتا ہے بلکہ اس سے زیادہ بھی کچھ ہے۔

کثرت پرستی بہت سے خداؤں پر یقین رکھنے کا نام ہے۔ جدید عہد میں مذہب کے منظم مطالعے نے مذہب کی مظہریات (Phenomenology) یا مظاہر کے علم کو متعارف کرایا ہے۔ مظہریات مذہب کا تجرباتی پہلو ہے۔ اس کا مقصد ان مختلف طریقوں کی تشریح و تعبیر کرنا ہے جن کی مدد سے انسان دنیا میں خدا کو سمجھتے اور اس کے بارے میں اندازہ لگاتے ہیں۔ کثرت پرستی کو ہمیشہ ایک برائی یا غلطی خیال کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ وہ اعمال و افعال جنھیں بظاہر بت پرستی کہا یا سمجھا جاتا ہے، اکثر ذرا سی وضاحت کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ دنیا کی پیچیدگی اور مافوق الانسان قوتوں کی کارفرمائی پر انسان کے عملی یا علامتی ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ مظہریات مذہب اس ردعمل پر خیر و شر کا کوئی حکم لگائے بغیر انھیں سمجھنے کی کوشش کا نام ہے۔ اس کے لیے ایسے طریق کار وضع کیے گئے ہیں جن سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ رسمیاتِ مذہب پر عمل پیرا ہونے والے لوگوں کے لیے یہ مذہبی خیالات و افعال کیا معانی رکھتے ہیں۔ یہ مذہبی لوگوں کے باطنی نقطۂ نظر کو، جو ان کے اپنے وجدان پر بھی مبنی ہو سکتا ہے، محسوس کرنے کی کوشش ہے۔ ایسا کرنا اس لیے ضروری ہو گیا تھا کیوں کہ مذہبی رسوم کو، اس مذہب کی روایات سے باہر رہ کر دیکھنے والے ان کے بارے میں اکثر غلط یا جھوٹے نتائج نکال لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی مسلمان کو حجر اسود کو بوسہ دیتے اور کعبہ کے سامنے سجدہ کرتے دیکھ کر اسلامی تاریخ اور عقائد سے

Marfat.com

انجان شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ مسلمان ایک کالے پتھر اور ایک سیاہ مکعب عمارت کی عبادت کرتے ہیں جو خدا کا گھر کہی جاتی ہے۔

ایسے مذہبی عقائد مثلاً آواگون یا مجسمہ گری کے مآخذ کا بغور جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عموماً مجرد تصورات، علامتی صورت گری اور مقدس خیالات کا اظہار ہوتے ہیں جو سراسر روحانی معنویت کے حامل ہوتے ہیں۔ اور زیادہ تر تو یہ خدا کی مختلف صورتوں کا ہی اظہار کرتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی ارفع و اعلیٰ روح مسخ ہو جاتی ہے اور محض کھوکھلی رسوم باقی رہ جاتی ہیں جن میں جہالت اور نادانی کے باعث ظاہری صورت ہی کو اصل حقیقت سمجھ لیا جاتا ہے۔

ہندو مذہب میں اوتار زمین پر خدا کے اترنے کے عقیدے کا اظہار کرتے ہیں۔ وشنو دیوتا کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دنیا کو تباہی سے بچانے کے لیے وقتاً فوقتاً انسان یا جانور کی صورت میں زمین پر اترتا ہے۔ تاہم ویدوں کے ابتدائی زمانے میں، جو ہندومت کا ماخذ و منبع ہے، آریاؤں نے نہ تو مندر بنائے تھے اور نہ بتوں کی پوجا ہوتی تھی۔ ہندو صحیفے شاسترا میں کہا گیا ہے کہ کسی انسانی شبیہ کا مندر میں ہونا بدشگونی کی بات ہے۔ جنوبی ہندوستان میں چندم برم کے مندر میں ہر شے کی حقیقت کو ایک خلا سے ظاہر کیا گیا ہے: ایک خالی کوٹھڑی ۔۔۔ جو آرٹ کی حدود کا ایک اعلیٰ تصور پیش کرتی ہے۔

ہندو آرٹسٹ ای۔ بی۔ ہیول اپنی یادگار تصنیف، The Art Heritage of India میں لکھتا ہے:

> "ہندوستانی آرٹسٹ کئی صدیوں سے، عام لوگوں کے لیے یوگی کے تصورِ خدا کا نقش بنانے کے خیال سے بچتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ اپنشد کے فلسفے میں برہمنوں کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی یوگی کے تصورِ خدا کو الوہیت کا ناقص اظہار سمجھتے تھے جو ہر صورت پر محیط ہے اور ہر شے سے ماورا ہے۔ انسانی حدود و قیود کو ظاہر کرتی ہوئی تجسیم کی نسبت، ویدوں کی رسومات میں استعمال ہونے والی اقلیدسی شکلیں، انھیں آفاقی قوتوں کی زیادہ مناسب علامت محسوس ہوتی تھیں اور آج بھی برہمنوں کی ارفع تر مذہبی رسوم کے دوران ہندو بتوں کی بجائے یانترا یا اقلیدسی علامتیں استعمال کی جاتی ہیں۔"

بدھا نے بھی مندروں کو انسانی شبیہوں سے سجانے سے منع کیا تھا۔ بدھ مت کی رسوم ابتدا میں خالصتاً علامتی

Marfat.com

مفاہیم کی حامل ہوا کرتی تھیں۔ یہ تو بدھا کے پیروکار تھے جنھوں نے اپنے پیشوا کی تصویروں اور مجسموں کی پوجا شروع کر دی تھی۔

ای بی ہیول نے اپنی تصنیف Ideals of Indian Art میں لکھا ہے:

''ابتدائی دور میں آریا اس امر کی خاص احتیاط کیا کرتے تھے کہ کہیں ان کے عقائد عوامی اوہام کا شکار ہو کر مسخ نہ ہو جائیں۔ اسی لیے ویدوں کے دور تک بھارت آرٹ کے میدان میں بہت پیچھے رہا کیوں کہ ویدوں اور اپنشد میں پوشیدہ حکمت اور دانائی اس قدر مقدس سمجھی جاتی تھی کہ اسے الفاظ یا آرٹ کے ذریعے بیان کرنا اس کی روحانیت کو مادیت میں بدلنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے بھارت میں تارکینِ وطن آریاؤں کا اعلیٰ دانش ور طبقہ خدا اور مذہب کے بارے میں اپنے افکار کو تحریر کرنے سے گریز کرتا رہا اور موسوی شریعت کے اس قانون پر سختی سے عمل پیرا رہا کہ 'تم اپنے لیے زمین اور آسمان میں موجود کسی چیز کا عکس یا تمثیل نہیں بناؤ گے۔

اشوک عہد میں بھی، بھارت کے آرٹ پر ویدوں کے عہد کے گہرے اثرات موجود رہے ؛ یہاں تک کہ اس دور میں بدھا کی بھی۔ جو ان کے نزدیک مقدس ترین خیال ہو سکتا تھا، کوئی تصویر یا مجسمہ نہیں ملتا۔ اگر چہ اس دور میں بدھا کے تعلق سے بے شمار علامتی تصاویر ملتی ہیں جن میں اسے ایک درخت، پرندے، جانور یا انسان کے روپ میں دکھایا گیا ہے، اس کے کشکولِ گدائی اور بڑ کے اس درخت کی تصاویر بھی ہیں جس کے نیچے اسے نروان حاصل ہوا تھا، حتیٰ کہ شہزادے سدھارتھ کے روپ میں اس کی زندگی کے ابتدائی دور کے واقعات کی تصاویر بھی اشوک عہد کے مصوروں کا موضوع بنی ہیں، لیکن انھوں نے کبھی اپنے مو قلم یا سنگ تراشی کے آلات کو خود بدھا کی شخصیت کی عکاسی کے لیے استعمال کرنے کی جرأت نہیں کی۔ جب عبوری دور کے آخر میں، گندھارا میں کشان بادشاہوں کے مقرر کردہ یونانی۔ بکتریان (Greco-Bactrian) نقاشوں اور مجسمہ سازوں نے یونانی دیوتا اپالو جیسے ایک دبلے پتلے خوش وضع تاتھاگاتا کا کسی بھارتی یوگی کے انداز کا نقش بنانا شروع کیا تو یقیناً ان کے لیے یہ گستاخی سخت صدمے کا باعث بنی ہوگی۔''

انجیل میں تصویر کشی کو بت پرستی سے متعلق قرار دیا گیا ہے اور یہی تصور قرونِ وسطیٰ میں اور ربانی یہودیت

Marfat.com

میں بھی عام رہا۔ ابتدائی یہودی اقوام آرٹ کی مخالف نہیں تھیں بشرطیکہ خدا کا نقش نہ بنایا جائے۔ عیسائیت میں، **ٹامس اکیناس** (Thomas Aquinas: ۱۲۲۵۔۷۴) نے تصویر بنانے کی حرمت کا اعلان کیا اور اس کے حق میں یہ دلیل دی کہ عبادت تو اصل میں اس حقیقت کی ہی ہوتی ہے جس کی علامت کے طور پر تصویر بنائی جاتی ہے۔ پروٹسنٹ فرقے نے بھی تصویر سازی کی شدید مخالفت کی اگرچہ مارٹن لوتھر (Martin Luther) نے مصلوب عیسیٰ کی تصویر بنانے کی اجازت دے رکھی تھی۔

اللہ کی متنوع صفات مختلف صورتوں میں نظر آتی ہیں لیکن اللہ ان تمام صورتوں اور مظاہر سے ماورا ہے۔ خارجی دنیا میں اللہ کا جلوہ ضرور نظر آسکتا ہے لیکن خارجی دنیا اللہ کے مساوی ہے نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ فطرت ہو یا جانور، علامتیں ہوں یا انسان، اسی اصول کے تحت اللہ کا مظہر تو ہو سکتے ہیں لیکن اللہ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ بالکل اسی طرح جیسے خارجی اور قابلِ مشاہدہ دنیا میں مظاہر کی کثرت اللہ کی لازمی وحدت کا اظہار ہوتی ہے۔ انسان اس کثرتِ مظاہر سے دھوکہ کھا کر کبھی کبھی فطرت، علامات، برگزیدہ انسانوں اور پیغمبروں کو تقدس عطا کر دیتا ہے۔

تمام ارفع مذاہب کی طرح اسلام میں بھی خدا کی علامت کے طور پر جانداروں کے نقش بنانے کی سخت ممانعت ہے۔ قرآن ایسی نقش گری کی سخت مخالفت کرتا ہے جو بت پرستی کا سبب بن جائے۔ تاہم تاریخی اعتبار سے اسلام نے عرب میں بت پرستی کے خلاف شدید مزاحمت کی تھی اور اسی لیے ہر طرح کی نقش گری، خاص طور پر مجسمہ سازی کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اس ممانعت نے مسلمان مصوروں کی تخلیقی توانائی کو پھولوں، اقلیدسی شکلوں، عربی گل کاری، خطاطی اور دیگر مناظر کی عکاسی پر مرکوز کر دیا جو اب اسلامی آرٹ کی پہچان سمجھے جاتے ہیں۔ اس بارے میں مزید اللہ کی تجرباتی شہادت کے باب میں لکھا جائے گا۔

اللہ جو آہنگ ہے:
ALLAH THE HARMONY

جب بھی ہم اللہ کے ننانوے نام دہرائیں تو ان ناموں کے آہنگ اور موسیقی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کیسے ہر نام کی آواز ایک تسلسل کے ساتھ دوسرے نام کی آواز میں ضم ہوتی ہے اور ایک مکمل ہم آہنگی اور توازن پیدا کرتی ہے۔ ذرا اس پہلے نام کی موسیقیت اور آہنگ دیکھیے:

هو الله الذی لا اله الا هو

Marfat.com

یا یہ دیکھیے:

المقسط، الجامع

الغنی، المغنی، المانع

الضّار، النّافع

النّور، الھادی، البدیع

الباقی، الوارث، الرّشید، الصّبور

ان صفات کا ایک خوشگوار توازن انھیں ایک کل میں جوڑ دیتا ہے۔ صفاتِ الٰہی کی ایک دوسرے سے اور اپنے "کل" سے مطابقت، یعنی ایک باہم مربوط کلی مجموعے میں خود کو موزوں انداز میں جوڑ لینے کی قوت اور مختلف صفات کے درمیان اشتراک اور ہم آہنگی پیدا کر لینے کی صلاحیت وحدتِ تاثر پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ اس کی مثال موسیقی کے ہم آہنگ سروں سے دی جا سکتی ہے۔ اللہ کی فطرت کی یہ ہم آہنگی دیگر ناموں سے بھی جھلکتی ہے مثلاً اللطیف جس کا مطلب ہے نفیس، فنکارانہ، باوقار، مہذب، خوب صورت، اعلیٰ، عمدہ ذوق کا حامل اور المصور، یعنی مصور، تخلیق کار، نقاش اور السلام یعنی امن و ہم آہنگی۔

ہم آہنگی (harmony) کا مطلب ہے اجزا کا ایک دوسرے کے موافق اور مطابق ہونا۔ یہ ایک ایسے نظام کا نام ہے جس کا مقصد ایک ایسے باہم مربوط کُل (whole) کی تشکیل کرنا ہے جو وحدت تاثر قائم کر سکے۔ معیاری لغات میں ہم آہنگی کا مطلب ہے ایک کل کے اجزا کا خوشگوار اثر پیدا کرنے والا مجموعہ، جیسے رنگوں کی ہم آہنگی، فطرت کی ترتیب و تنظیم، کائنات کی ہم آہنگی۔ یہ اجزا کی کل سے اور ایک دوسرے سے مکمل مطابقت، مناسب اور سازگار ترکیب، موزونی، ترتیب و تنظیم، باہم موافقت و مطابقت، نفاست، باہمی احترام اور رواداری کا نام ہے۔ شاید ایک فن کار ہم آہنگی کو کسی عام آدمی سے زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ جب کوئی رنگوں کی حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے تو پھر وہ رنگوں کی آمیزش کا ہنر بھی سیکھنے لگتا ہے۔ ان کے مختلف ہلکے اور گہرے شیڈ، ان کی شدت اور تعدد کو اس طرح ہم آہنگ کرنا کہ وہ ایک ہم آہنگ کُل میں تبدیل ہو جائیں۔ رنگوں کا ایک پورا نظام ہے، ایک نظریہ ہے جس کی بنیاد رنگوں کے چکر (color wheel) پر ہے اور جس میں رنگ ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔

Marfat.com

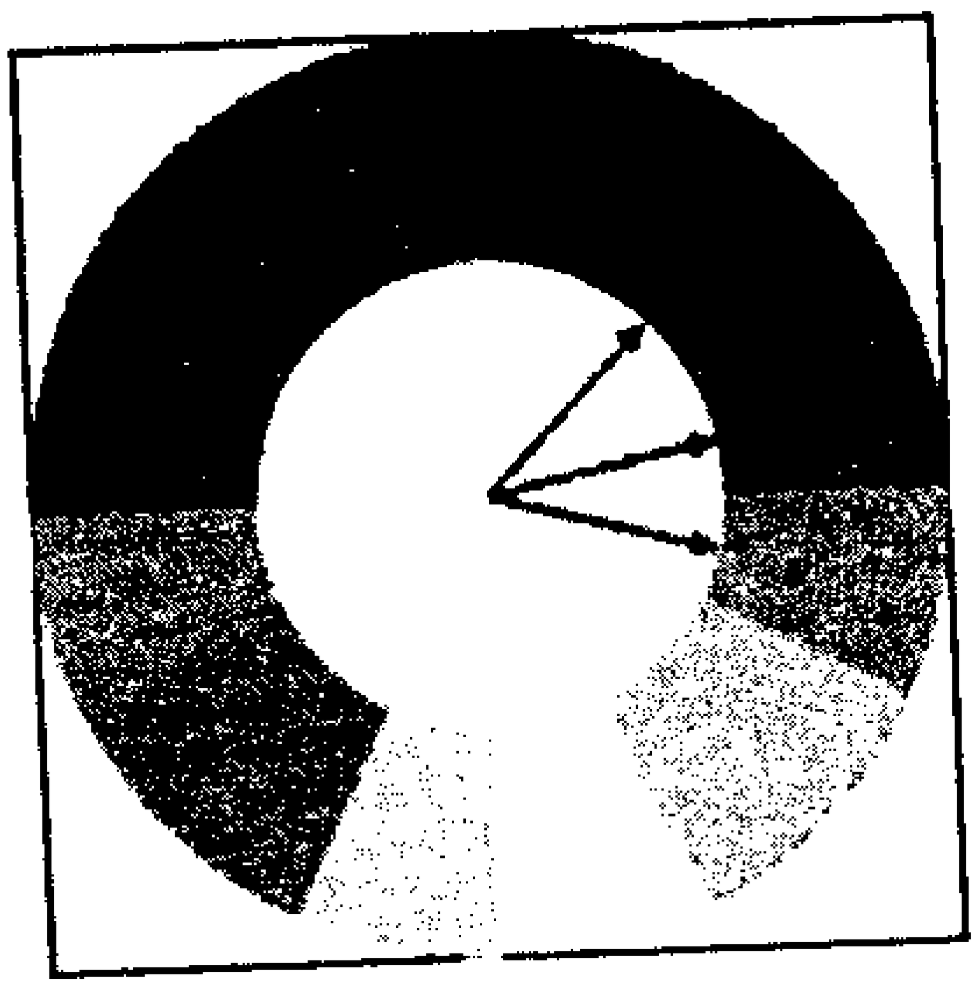

رنگوں کا طیف ایک تسلسل ہے

رنگوں کا یہ چکر سات قدرتی رنگوں پر بنیاد رکھتا ہے۔ یہ رنگ بنفشی، کاسنی، نیلا، سبز، پیلا، نارنجی اور سرخ ہیں۔ رنگوں کے اس فرق کی بنیاد طبعی خواص اور روشنی کی لہروں کے تعدد (frequencies) پر ہوتی ہے۔ اگر پانچ درمیانی رنگوں کو بھی شمار کریں تو اس طیف کے رنگ بارہ ہو جاتے ہیں لیکن رنگوں کی اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہر مصور جانتا ہے کہ ان رنگوں کے لاتعداد شیڈ ہیں۔ مصور اپنی پوری زندگی صرف کر کے بھی اس چکر کے رنگوں کے تمام تر امکانات دریافت نہیں کر سکتا۔

حقیقت اپنے خالق کا آئینہ ہوتی ہے؛ اگر یہ بات درست ہے تو صفاتِ الٰہی کا بھی ایسا ہی طیف بننا چاہیے۔ اعلا مذاہب اور روحانی سائنس میں سات کا عدد بہت اہمیت کا حامل ہے۔ توریت اور انجیل میں سات کے ہندسے کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

خدا نے کائنات کو چھے دنوں میں تخلیق کیا اور ساتویں دن آرام کیا کیوں کہ یہ تکمیل کا دن تھا۔ ہمارا روزمرہ کی زندگی بھی اسی معمول پر چلتی ہے۔ سات دنوں کا ہفتہ جس میں اتوار کا دن آرام کا ہوتا ہے اور بارہ مہینوں کا سال جو ایک چکر مکمل ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن کا آغاز سورۃ فاتحہ (کھولنے والی، شروع کرنے والی) سے ہوتا ہے جس کی سات آیات ہیں۔ یہی خدا کی سلطنت کی کلید ہے۔ سورۃ الحشر میں اللہ خود اس طیفِ الٰہی (Divine spectrum) کو بیان کرتا ہے۔ یہ بنیادی قضیہ بیان کرنے کے بعد کہ خدا بس ایک ہے اس کے سوا کوئی نہیں اور وہ ہر شے کا جوہر ہے، خیر ہے اور منفعت بخش ہے، اللہ اس طیفِ الٰہی کے درجے بیان کرتا ہے۔
الـمٰلک، القدوس، السبّوح، السّلام، العزیز، الجبّار، المتکبّر کو م ق س۔س۔ا ج

Marfat.com

م" کی علامتوں سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ان میں سے 'س' کو اللہ کی صفات کا نقطۂ توازن یا اوسط قرار دیا جا سکتا ہے۔بالکل ایسے ہی جیسے ٹریفک کا اشارہ یک دم سرخ سے سبز نہیں ہوتا بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک اور مرحلہ آتا ہے جس میں پیلی روشنی جلتی ہے، جو اشارے کی تبدیلی کے درمیان ایک عبوری دور (interim stage) کو ظاہر کرتی ہے۔اسی طرح طیفِ الٰہی میں بھی وسطی مراحل آتے ہیں جو بارہ کے چکر کی تکمیل کا اعلان کرتے ہیں۔تاہم یہ چکر پورا چکر نہیں ہوتا۔یہ اوپر کی طرف اور آگے بڑھتا ہے اور ننانوے صفاتِ الٰہی اور ان کی لاتعداد درمیانی صفات کی نیرنگی، ترکیب، امتزاج، طولِ موج، تعدد اور حرکت کی شرح کا "چکرا" مکمل کرتا ہے۔نیچے دیے گئے خاکے میں دیکھیے۔اس کا مرکز، اس کا قلب (نور) غیر مرئی، مجرد اور پوشیدہ ہے۔پھر سات بنیادی صفات، المُلک، القدوس، السبّوح، السّلام، العزیز، الجبّار، المتکبّر کا اندرونی طیف ہے جب کہ سب سے بیرونی طیف مرئی رنگوں کا ہے یعنی VIBGYOR۔

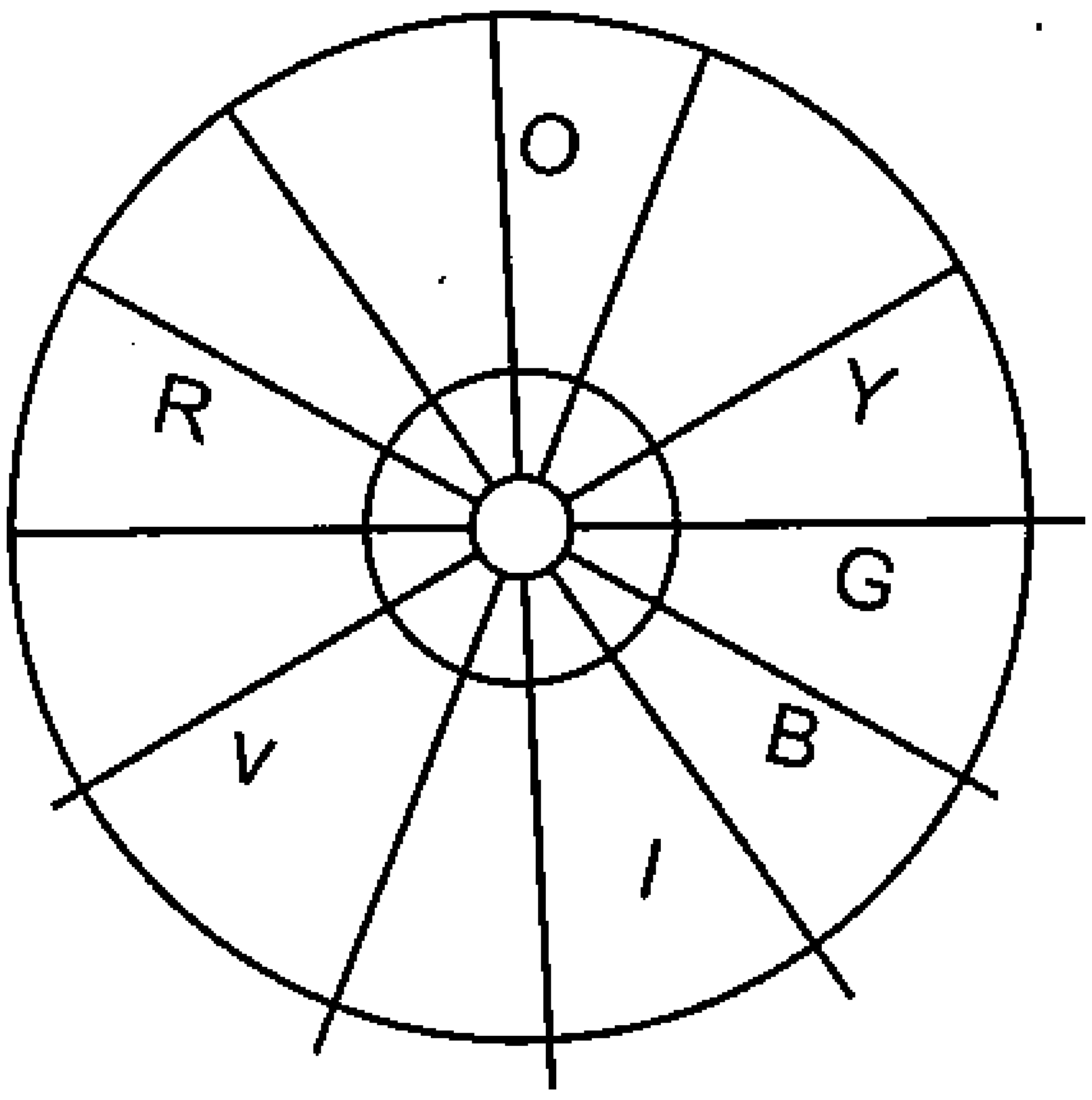

سات رنگوں کا چکر

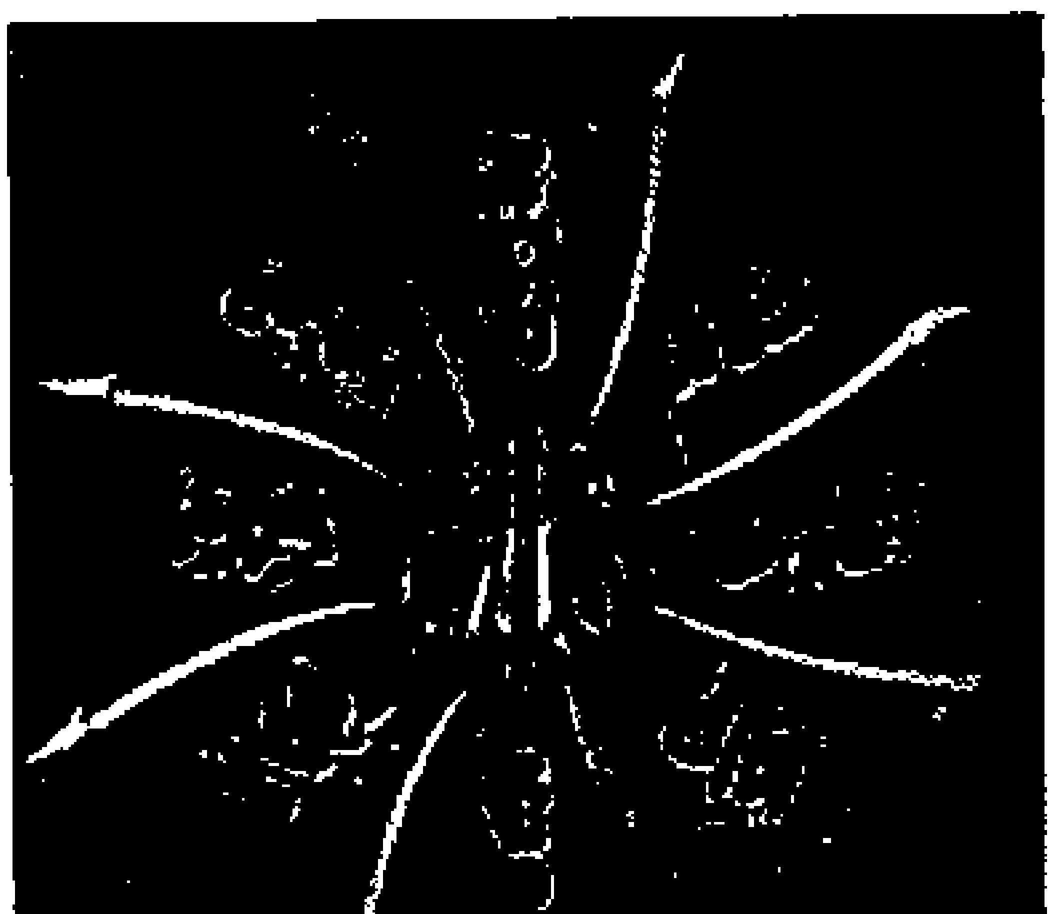

اللہ کے سات اہم ترین نام

Marfat.com

اب رنگوں کے چکر کی طرف واپس چلتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ رنگوں کے اس چکر کو یکساں یا مشابہ رنگوں کے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ گروہ ان رنگوں کے ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں، رنگوں کے چکر پر ایک دوسرے کے برعکس ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے الٹ ہوتے ہیں جیسے سرخ اور سبز، نیلا اور نارنجی وغیرہ، رنگوں کی تکون بناتے ہیں، جیسے تین بنیادی رنگ، سرخ، نیلا اور پیلا یا سبز، کاسنی اور نارنجی۔ اللہ کا طیفِ الٰہی بھی اسی طرح گروہوں میں تقسیم ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ روشنی کے رنگوں کا یہ مرئی طیف حقیقتِ الٰہی کا ایک عکس ہے تاکہ انسان اللہ کی فطرت کو سمجھ سکیں۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ رنگوں کے طیف میں تضاد وجود نہیں رکھتا۔ متضاد کی اصطلاح ہی ایک غلط تصور ہے کیوں کہ اشیا کی ہستی میں متضاد کہیں وجود نہیں رکھتا۔ جس رنگ کو ہم متضاد کہتے ہیں وہ دراصل تکملہ (complementary) ہوتا ہے۔ ایسے رنگ زیادہ واضح اور شوخ نظارہ پیدا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ حقیقی متضاد رنگ کالا ہوتا ہے جو اصل میں رنگ کی غیر موجودگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح صفاتِ الٰہی بھی ایک دوسرے کو زیادہ واضح کرتی ہیں مثلاً السّلام (امن، ہم آہنگی) اور الجبّار (جبر، قوت)۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور ان کی مکمل ہم آہنگی ہی توازن کی ضامن ہے۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ قوموں نے قیامِ امن کے لیے جنگ کی ہے۔

اسی طرح قومی ریاستوں کو دفاع کے تقاضے پورے کرنے کے لیے قوت کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ طیفِ الٰہی میں تکون یا تثلیث کا تصور بھی کئی مذاہب میں استعمال ہوتا آیا ہے۔ جیسے ترشول جو ہندومت میں قوتِ الٰہیہ کی علامت ہے، ترمورتی یعنی خدا کا ویدک تصور جس کے جسم پر تین سر ہوتے ہیں اور عیسائیت کا معروف تصورِ تثلیث۔ آج اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ان تصورات کو تعصب کی بجائے عقل کی مدد سے پرکھا اور سمجھا جائے۔

اللہ کی جانب سے آنے والے کشف و الہام اور وحی ہمیشہ شعریت سے مملو ہوتے ہیں۔ انسان پر نازل ہونے والے تمام الہامی صحیفے اللہ کی شاعرانہ فطرت کی چغلی کھاتے ہیں۔ قدیم ترین دور کے تبتی لاماؤں کے طوماروں، ویدوں کے مقدس منتروں، بھجنوں، مناجاتوں اور گیتا کے بولوں سے لے کر جدید ترین قرآن کی سورتوں تک، ہر الہامی کلام میں جس مشترک خصوصیت کی تکرار ملتی ہے وہ اس کی شاعرانہ لطافت ہے۔ اس سے نچلے درجے پر آئیں تو صوفیانہ شاعری کے عشقیہ بول، مذہبی گیت، رزم نامے اور معرفت کی نظمیں سب اپنے

Marfat.com

قاری کو ابلاغ کے انتہائی غنائی اور مترنم لہجوں سے آشنا کرتی ہیں۔ یہ سب باتیں اللہ کے تجربے کی ہم آہنگی اور غنائیت سے بھرپور فطرت کا استعارہ ہیں اور شاید اس بات کا اشارہ بھی کہ ایسے تجربات سائنسی زبان اور اندازِ بیان میں کیوں نہیں سما سکتے؟۔ جدید سائنس ایسے کسی ابلاغ کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتی جس کی نوعیت سائنسی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طرح کے شاعرانہ اسالیب اور اللہ جو خود سب سے بڑا شاعر ہے، طبعی سائنسی علوم سے خارج سمجھے جاتے ہیں۔

تاہم یہ بھی سچ ہے کہ بعض بہت بڑے بڑے سائنس دانوں نے اس عالمِ کون و مکاں کو موسیقی اور ہم آہنگی کی اصطلاحات میں بیان کیا ہے۔ ''آسمانی موسیقی (Music of the spheres) یا کائناتی موسیقی'' (Musica Universalis) ایک قدیم فلسفیانہ تصور ہے جو اجرامِ فلکی یعنی سورج، چاند اور سیاروں کی گردش کو موسیقی کی ایک قسم (musica) قرار دیتا ہے۔ یونانی فلسفی فیثاغورث (Pythagoras) نے اس تصور کی بنیاد رکھی جو بعد میں افلاطون اور دیگر متاخرین تک منتقل ہوتا گیا۔ ۱۶۱۹ میں جوہانس کیپلر (Johannes Kepler) نے کائناتی موسیقی کے اس تصور کو اپنی کتاب *Harmonica Mondi* (Harmony of the World) میں پیش کیا۔ کیپلر کو یقین تھا کہ خالقِ کائنات نے یہ پوری کائنات جیومیٹری کی اشکال کے نمونے پر تخلیق کی ہے۔ جدید دور میں اسحٰق نیوٹن نے کائنات کو ایک خاموش نغمے (silent symphony) سے تشبیہ دی ہے اور فزکس کی حالیہ سٹرنگ تھیوری (String Theory) بھی کائناتی ہم آہنگی کے اسی تصور پر بنیاد رکھتی ہے۔

کیپلر اپنے قطب نما کے ساتھ

Marfat.com

یہ بات اس حد تک درست ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور، مولانا رومی اور سر محمد اقبال جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی اپنے ماورائی تجربات کو سائنسی زبان میں بیان کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔ ان کی اس معذوری یا شاید نارضامندی کے سینکڑوں اسباب ہو سکتے ہیں لیکن اس کی بنیادی اور عقلی وجہ ایک ہی ہے کہ یہ تجربہ اپنی اصل کے اعتبار سے شاعرانہ ہے جو سائنسی طرز فکر کی رسائی سے باہر ہے۔

قرآن حضرت محمدؐ پر نازل ہوا جو صحرائے عرب کے ایک ناخواندہ چرواہے تھے، مگر یہ ایک ماہر فن موسیقی کار کا شہکار معلوم ہوتا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب عرب میں اعلیٰ درجے کی شاعری کا بول بالا تھا، قرآن حضرت محمدؐ کا ایک معجزہ ہے۔ یہ عظیم شعری شہکار محمدؐ کی اللہ سے گفتگو کے دوران ان پر شاعروں کے شاعر اللہ کی جانب سے نازل ہوا، حالاں کہ وہ خود بالکل ناخواندہ تھے۔ کئی روایات میں آتا ہے کہ رسولؐ جب جذب کی کیفیت میں ہوتے تو فرماتے کہ ''میں عرب میں سب سے زیادہ فصیح البیان ہوں'' لیکن جب ہوش کی حالت میں آتے تو فرماتے، ''اے اللہ! میں نہیں جانتا کہ کیسے تیری حمد و ثنا کروں؟'' صوفیانہ زبان میں جذب سے مراد ہے اللہ کے تجربے کے دوران مستی اور خود فراموشی کی کیفیت کا طاری ہو جانا جب کہ ہوش یا سالکیت کی کیفیت سے خود آگاہی کے وقار و ضبط کی حالت مراد ہے۔ پہلی حالت خدا شعوری کی ہے اور دوسری خود شعوری کی اور یہ تجربہ صرف پیغمبروں تک محدود نہیں ہے۔

موسیقی بہت سے مذاہب کا ایک اہم عنصر رہی ہے جو خدا کو متوجہ اور راضی کرنے اور اس کی حمد و ثنا اور عبادت کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے کیوں کہ خدا خود بھی توازن اور ہم آہنگی کا نمونہ ہے۔ ہندومت، یہودیت اور سکھ مت جیسے کئی مذاہب میں موسیقی عبادت کے مرکزی طریقے کے طور پر، نقش پرستی پر سبقت لے جاتی ہے۔ موسیقی قدیم و جدید مذاہب میں وجد و حال کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے بھی استعمال کی جاتی رہی ہے۔ انجیل کی کئی مناجاتوں سے پہلے ان کی دھنوں کے بارے میں ہدایات درج ہوتی ہیں۔ یہ روایت صوفیانہ رسوم اور مشرق کی عارفانہ شاعری میں بھی جاری رہی ہے جو آج بھی مزاروں پر مخصوص دھن اور سر تال میں گائی جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ برعظیم کے کلاسیکی رقص اور موسیقی کی پوری روایت، جو یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث رہی ہے، خدا ہی پر توجہ مرکوز کرنے کا ایک ذریعہ رہی ہے۔ یہ برسوں کی ریاضت کے بعد ''راگ'' اور ''راگنی'' کے ایک منظّم نظام میں ڈھل گئی۔ یہ شاید اپنی نوعیت کا واحد اور اپنے بطون میں انتہائی پیچیدہ موسیقی کا

Marfat.com

نظام ہے جس میں رقصِ ذاتِ واحد کی حرکت اور راگ اور راگنیاں اس کی صفات کی کثرت کو ظاہر کرتی ہیں۔ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی یوگیوں، جوگیوں، پنڈتوں اور گیان دھیان میں ڈوبے صوفیوں کی ایجاد ہے جنھوں نے اپنے اپنے تصورِ خدا کو فنِ موسیقی کی لطیف ترین زبان میں پیش کیا ہے، جو خود خدا کی زبان بھی ہے۔ اگر کچھ مذاہب میں انسان بھٹک گیا اور اس نے خود موسیقی ہی کو عبادت کا مرکز بنالیا تو یہ کوئی ایسی محیرالعقل بات نہیں۔

انجیل کی کتابوں کو روایتی دھنوں میں گایا جاتا تھا۔ صومعوں میں عشائے ربانی کی نماز میں گائے جانے والے نغمے، کلیسائی گیت اور حمد، نعت، دھمال، کافی اور قوالی کی مسلم روایات سب خدا کی شان کے بیان اور رقص و موسیقی کے ذریعے اس تک پہنچنے کی خواہش کا اظہار ہیں۔ قرآن کی سب سے عمدہ قرأت اور اذان کی آواز دونوں شروع ہی سے موسیقی سے لبریز رہی ہیں۔

تاہم یہ بھی ہے کہ بعض دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی موسیقی کو ناپسند کیا جاتا ہے اور اسلامی علما سماع یا موسیقی کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ کچھ تو اس معاملے میں زیادہ سخت ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ مذہبی قوانین اور صوفیانہ مسلک میں رقص و موسیقی کے استعمال کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ اسلامی علما اس بات کے قائل ہیں کہ اعلیٰ وارفع مذہبی مقاصد کے حصول کے لیے موسیقی ایک رکاوٹ اور بہکاوا ہے؛ اس لیے لغو ہے۔ ان کے خیال میں یہ طالب کو خدا کی راہ پر ڈالنے کی بجائے اس سے بھٹکا دیتی ہے۔ وہ موسیقی کی بھی اتنی ہی شدت سے مذمت کرتے ہیں جتنی شدت سے مظاہر پرستی اور صنم پرستی کو رد کرتے ہیں۔ اسلام اللہ کے مادی اور حسی مظاہر کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس ناپسندیدگی کی ایک وجہ اسلام کے تاریخی پہلو میں تلاش کی جاسکتی ہے کیوں کہ بنیادی طور پر اسلام یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ اللہ کی ذات غیر مرئی، ماورائی اور تجریدی ہے اور تمام تر حسی تجربات اور مظاہر سے بالاتر ہے۔ جید علما مثلاً علی بن عثمان جلبی الہجویری، جنھیں لوگ عقیدت کے اظہار کے طور پر داتا گنج بخش کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جو تصوف کے موضوع پر قدیم دور کی ایک اہم تصنیف ''کشف المحجوب'' کے مصنف بھی ہیں، اس نقطۂ نظر کے شدت سے قائل ہیں کہ اسلامی تصورات میں کسی ترمیم و تبدیلی پر سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے خیال میں اللہ کی صفات چوں کہ اللہ سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں اس لیے انھیں اللہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہی نقطۂ نظر اسلام کی جانب سے ہر قسم کی تصویر کشی، صورت تراشی اور حسی نوعیت کی مظہریت کی مذمت کی بنیاد ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے، یہ بات ہمارے اس خیال کو منطقی طور پر ثابت کرتی ہے کہ موسیقی اور شاعری بھی؛ جو

Marfat.com

انسان کے ارفع ترین مشاغل ہیں، اللہ کے مظاہر میں سے ہیں۔ سگمنڈ فرائیڈ نے کہا تھا کہ ہر ممنوعہ شے کی خواہش کی جاتی ہے اور ہر چیز، جس کی خواہش ہو، ممنوعہ ہوتی ہے۔ یہ بھی اسی لیے ممنوع ہے کہ کہیں انسان کو ادنیٰ سطح پر قانع نہ کر دے اور اس کی راہِ طلب کھوٹی نہ ہو جائے، اس کا ارتقا رک نہ جائے۔

اسلامی روایات میں اس معاملے میں ایک واضح ابہام پایا جاتا ہے اور تاریخ میں دونوں روایات معاملے کے دونوں پہلوؤں کا اثبات کرتی ہوئی ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ بہت سی اسلامی رسوم میں موسیقی کا استعمال ہوتا ہے؛ یہ صوفیوں اور بزرگوں کے شعائر و مشاغل کا حصہ رہی ہے۔ چشتیہ سلسلے میں موسیقی یا سماع کو مادی دنیا کے چنگل سے آزاد ہونے اور ماورا کی دنیا میں داخل ہونے کے وسیلے کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود کئی متقی اور زاہد طبائع اسے ماورا کی تجسیم کی کوشش قرار دیتی اور اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہیں۔

یہاں دو رویے واضح ہوتے ہیں؛ اللہ جو نہاں ہے اور اللہ جو عیاں ہے۔ وہ لوگ جو اللہ کو نہاں اور ماورا سمجھتے ہیں وہ موسیقی کی مذمت کرتے ہیں اور وہ جو سمجھتے ہیں کہ حسی دنیا اور اس کے مظاہر کے ذریعے ماورا تک پہنچا جا سکتا ہے وہ موسیقی کو حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام میں ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں سے کوئی بھی موسیقی کو اپنا آخری مقصد نہیں قرار دیتا، جیسا کہ بعض دوسرے مذاہب میں ہوتا ہے۔

اللہ جو وحدت ہے:
ALLAH THE UNITY
الاحد (ایک)، الواحد (یکتا)

ہم اللہ کے جز اور کل کی بات نہیں کر سکتے کیوں کہ اللہ ایک زندہ ہستی ہے۔ وہ ایک مستقل اور مکمل کل ہے، جامع اور وسیع ترین (الجامع)۔ اللہ تمام اشیا کو اپنے اندر سمیٹے اور سموئے ہوئے ہے اور ہر شے اس کا عکس اور مظہر ہے۔ وہ کامل ہے۔ وہ واحد ہے (الاحد)، زندہ ہے (الحی)، باخبر (الخبیر) ہے اور یکتا (الواحد) ہے۔ لیکن جیسے ہم کسی شخص کی صفات کو اس کی ہستی کے کسی ایک پہلو کی مدد سے بیان کر دیتے ہیں، یا کسی عنصر کے تمام خواص میں سے اس کی کسی ایک خاصیت کو اس کا حوالہ بنا لیتے ہیں، اس طرح ہم اللہ کی ان صفات کو اس کی ذاتِ واحد کا بنیادی پہلو قرار دے سکتے ہیں۔ اللہ کے ناموں کی یہ ظاہری پیچیدگی اور کثرت اس کی ذات کی صفتِ حقیقی نہیں ہے۔ یہ نام ایک ہی حقیقت کی بدلی ہوئی صورتیں اور ایک ہم آہنگ ہستی کے مختلف

Marfat.com

طرزِ اظہار ہیں۔ اللہ کی وحدت (توحید) اور اس کی کلیت وہ بنیادی خصوصیت ہے جو ہر حقیقت میں منعکس ہوتی ہے۔ہم جانتے ہیں کہ مادہ کبھی فنا نہیں ہوتا۔ یہ صرف ایک شکل سے دوسری شکل میں منتقل ہو جاتا ہے یا توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ زندگی اور مادہ مختلف صورتیں اختیار کر لیتے ہیں۔مثال کے طور پر کیلشیم کاربونیٹ ہی کو لیجیے، چاک، چونا، سنگِ مرمر اور موتی سب اسی ایک معدنیاتی عنصر کی مختلف صورتیں ہیں جو اس کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتی ہیں۔اللہ اور اس کی بوقلموں صفات بھی ایسی ہی ہیں۔یعنی مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک ہی ہستی کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتی ہیں۔

مثال کے طور پر ہم اپنی معمول کی روزمرہ زندگی میں دیکھتے ہیں کہ درخت ایک وحدت ہے لیکن یہ سادہ سی وحدت بیک وقت وحدت بھی ہے اور کثرت بھی۔درخت میں جڑیں بھی ہیں، تنا بھی، چھال بھی، شاخیں اور پتے بھی، پھل اور بیج بھی۔لیکن اس کے باوجود یہ طے ہے کہ درخت ایک وحدت ہے۔اسی طرح میں کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک ہوں، میں منفرد ہوں، میں عکسی مفتی ہوں۔لیکن دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ میں ایک مجموعہ ہوں جلد، ہڈیوں، بالوں، ناخنوں، ٹانگوں اور بازوؤں کا، پھر میری خصلتیں ہیں، میرے میلانات ہیں، میری جسمانی ضروریات ہیں، طرزِ عمل اور رویے ہیں، ذہنی رجحانات اور افکار ہیں۔ یہ سب چیزیں ایک زندہ شخصیت کا لازمی جزو ہیں۔

اگرچہ ہم اللہ کے بارے میں اسی مفہوم میں بات نہیں کر سکتے لیکن یہ سب مثالیں اللہ کی وحدانیت اور یکتائی کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتی ہیں۔اللہ واحد ہے لیکن اس وحدت میں کس قدر کثرت ہے۔اللہ کی وحدانیت، وجود کے چاروں ابعاد؛ طبعی، عضویاتی، انسانی اور نفسی دائروں پر محیط ہے۔وحدانیت اللہ کی صفات میں سے سب سے زیادہ اہم، ناگزیر اور لازمی صفت ہے جو بیک وقت کثرت کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور جس کا اظہار اس کے ننانوے ناموں سے ہوتا ہے۔پھر یہ بھی ہے کہ جب تک وہ اس کثرت، اس تنوع کا حامل نہ ہو، کیسے اسے الواسع (ہر شے کو محیط) اور الجامع (ہر شے کا مجموعہ، تمام اشیا کی ترکیبِ باہمی) کہا جا سکتا ہے۔

اللہ کی وحدانیت کی اس پیچیدگی اور تنوع کے پیشِ نظر کئی مابعد الطبیعیاتی مکاتب اللہ کی ذات کی وحدانیت کا مطالعہ کرنے کے لیے وجود میں آ گئے۔ یہاں ہمارا اشارہ وحدت الوجود (ہر شے کی حقیقت ایک ہے) اور تصورِ توحید (اللہ کی وحدانیت) کے لامتناہی مباحث کی طرف ہے۔انسانی جسم ان گنت خلیات سے مل کر بنتا ہے لیکن

Marfat.com

اس کثرت کے پس پشت ایک حیرت انگیز سادگی اور یکسانیت بھی ہے کیوں کہ ہر خلیے کی بنیادی ساخت ایک جیسی ہے، یعنی ایک مرکزہ ہر خلیے کا مغز ہوتا ہے جس میں ہر چیز شامل ہے۔ اب تک کل ۱۰۶ عناصر دریافت ہوئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ان میں اختلاف صرف الیکٹران اور پروٹان کی تعداد میں ہوتا ہے۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کائنات انھی عناصر پر مبنی ہے اور کائنات کی ہر چیز انھی کی ترکیب و ترمیم سے وجود میں آئی ہے۔ اسی طرح صوفی اور عارف بھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہر شے کا جوہر ایک ہی ہے اور تمام صفات اسی ذاتِ واحد کے مختلف پہلو ہیں۔ صوفی کے لیے زمینی حقیقت محض اس آسمانی حقیقت کا عکس ہے۔

اللہ الواسع (ہر شے کو محیط) ہے۔ اس کی ذات جاندار اور بے جان، جسمانی اور طبعی، مادی اور نفسی، مرئی اور غیر مرئی، ظاہر اور پوشیدہ، ہر شے کو محیط ہے۔ بنیادی ماہیت صرف ایک ہے، کثرت محض وجود کی قوس پر صفات کی درجہ بندی کا نام ہے۔ حاصل یہ کہ اللہ محیطِ کل ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا مختارِ کل اور مطلق العنان خدا کیسے ہو سکتا ہے جب تک وہ ہر جگہ اور ہر شے پر محیط نہ ہو۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا کہ ہر شے خدا ہے یا خدا کی تخلیق شدہ حواس کی دنیا خدا ہے۔ یہ بعض مذہبی عقائد کی غلط فہمی اور وحدت الوجود کی غلط تشریح ہے۔ وحدت الوجود ایک سائنسی نظریہ ہے جو یہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اصل میں ایک ہی ذات کے بدلتے ہوئے رنگوں کا اظہار ہے۔ یہ تمام مخلوقات کے ارتقا کا اثبات کرتا ہے اور خدا کو ایک ایسی حقیقت قرار دیتا ہے جس کے مختلف مدارج ہیں۔ بے جان اشیا ہوں یا جان دار، جسمانی اوصاف ہوں یا نفسی، ہر شے ایک دوسرے سے جڑی ہوئی اور اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے۔

اللہ کی وحدانیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ننانوے صفات باہم مربوط، غیر منقسم اور ایک وحدت میں جڑی ہوئی ہیں۔ متعدد معیاری لغات میں وحدانیت (Unity) کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے:

''کلیت، مجموعہ، اتحاد، اکائی، ہم آہنگی، یکسانی، تشخص، انفرادیت، غیر منقسم ہونا، تمامیت، ربطِ باہم، یکتائی، امن، یگانگت، تنہائی، ترکیب، اکملیت، تفرید، توحید، موافقت وغیرہ۔

اس لفظ کے مترادفات ہیں یکتائی، فردیت، تنہائی، اتفاق، ایک، اکائی، اولین، فرد، بے مثال، لاشریک، زنجیر، ربط، تعلق، استقلال، تسلسل، موزوں، بہاؤ، باہمی مربوط، جڑا ہوا، استمرار، سلسلہ، استواری، توارث، بقا، اصولِ حیات، کل، پیوستگی، وابستگی، جوڑ، چمٹاؤ، جامعیت، مناسبت، موافقت، الحاق، استقلال، استمرار،

Marfat.com

انسلاک، اتحاد، معقولیت۔ اور اس کے متضاد الفاظ میں عدم موافقت، عدم مطابقت، نامعقولیت، بعید الفہم اور عدم تسلسل شامل ہیں۔

اس کے متعلقہ فعل ہیں؛ ایکائی پیدا کرنا، جوڑنا، ملانا وغیرہ اور اس سے متعلق اسمائے صفات ہیں، ایک، پورا، واحد، تنہا، متحد، فرد، الگ، اکیلا، لاشریک، بے سنگت، یکتا، طاق، منفرد، پہلا اور آخری، لاجنس، یک صورت، مجرد، مفرد، ناقابلِ تجزیہ، مربوط۔

اصولِ وحدت:
Principle of Unity

وحدت اللہ کی تخلیقات اور ان کے نمونوں کا امتیازی نشان ہے۔ یہ اس تکمیل کا نام ہے جو کسی نمونے کے تمام عوامل اور عناصر ایک دوسرے سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہونے، ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، باہم پیوست و منسلک نظر آنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کی صفات ایک دوسرے کے مقابل صف آرا نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ ہر صفت اس اندرونی رشتے کو تقویت فراہم کرتی ہے جو تمام عوامل کے درمیان ہے اور جو ان عوامل کو ان کے مجموعے سے مربوط و منسلک کرتا ہے۔ ان کی یہی خصوصیت اللہ کی کلیدی صفت، یعنی وحدت کا اظہار کرتی ہے۔ کسی فن پارے میں فنکارانہ وحدت تب نظر آتی ہے جب اس کے تمام فنی عناصر (توازن، شدت، سادگی، تضاد، تناسب، حرکت، اور خالی جگہیں وغیرہ) راست طور پر بروئے کار لائے جائیں۔ فن پارے کے لیے منتخب کی گئی ہر صفت اس کے مرکزی خیال سے مربوط ہونی چاہیے۔ اللہ کی وحدت بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔

وحدت ترتیب و تنظیم کا احساس پیدا کرتی ہے۔ جسامت اور شباہت کی موزونیت پیدا کرنا، بنیادی عناصر کی تکرار سے نمونے کی ہم آہنگی قائم رکھنا، شروع سے آخر تک ان کے درمیان توازن رکھنا اور ایسا تنوع پیدا کرنا جو نمونے کو کبھی ختم نہ ہونے والی بوقلمونی اور نیرنگی بخش دے۔ اللہ کی وحدت، تخلیق اور صورت کشی کا راز یہی ہے کہ تمام صفات اور عوامل، نت نئے، بالکل درست اور مناسب امتزاج (combination) پیدا کرتے رہیں۔ ان عوامل کی وحدت ہی انھیں ایک دوسرے سے جوڑ کر مکمل کرتی ہے۔ اللہ کی وحدت کو ہمیشہ ایک کلیت، ایک اکائی کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے، اجزا یا ٹکڑوں کی صورت میں نہیں۔ اس وحدت کا آخری پیمانہ یہ ہے

Marfat.com

کہ اس میں نہ تو کچھ شامل کیا جا سکتا ہے اور نہ اس میں سے کچھ منہا کیا جا سکتا ہے۔ تمام عوامل کا باہمی رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ کسی ایک کو نکالنا یا شامل کرنا اس رشتے کو مجروح کرتا ہے۔ جب کل (whole) میں سے کسی جز کو خارج نہ کیا جا سکے تو سمجھ لیجیے کہ وحدت حاصل ہو گئی۔ فزکس، حیاتیات اور ماحولیات کی جدید ترین تحقیقات نے بھی یہ بات ثابت کر دی ہے۔

آیئے دیکھیں کہ کوئی فن کار وحدت کے تصور کو کس طرح سمجھتا اور اسے اپنے فن میں کس طرح منعکس کرتا ہے۔ یہاں نمونہ سازی کے کچھ اصول (design principles) پیش کیے جاتے ہیں جنھیں دنیا بھر کے نقاش، مجسمہ ساز اور ویب ساز اختیار کرتے ہیں۔

تکرار کا اصول:
Principle of Repetition

یہ اصول کسی نمونے کے تمام حصوں کو آپس میں جوڑنے کے کام آتا ہے کیوں کہ یہ تسلسل اور تکمیل کا احساس پیدا کرتا ہے۔

تسلسل کا اصول:
Principle of Continuity

اس اصول کے تحت مختلف عناصر کو ایک ہی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مختلف نقوش میں ''خاندانی مشابہت'' (Family resemblance) پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ ان عناصر کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھنے اور ان میں مسلسل ربط قائم رکھنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

ترتیب کا اصول:
Principle of Alignment

نقوش کو اس طرح ترتیب دینا کہ ایک نقش دوسرے نقش تک پہنچا دے، وحدت پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔

Marfat.com

پیوستگی کا اصول:
Principle of Proximity

یکساں عناصر کو ایک گروہ میں جمع کر دینا تا کہ ایک گروہ کے اجزا مل کر ایک باہم مربوط مجموعہ تشکیل دیں اور بکھرے بکھرے منتشر اجزا معلوم نہ ہوں۔

توازن کا اصول:
The Principle of Balance

اگر اجزا کے درمیان توازن پیدا نہ کیا جائے تو وہ ایک دوسرے سے کٹ جائیں گے۔ وہ نقش جو کسی ہموار سطح مثلاً کینوس پر بنائے جاتے ہیں، ان پر بھی یہی اصول لاگو ہوتا ہے۔

حرکت کا اصول:
The Principle of Movement

تکرار، آہنگ اور عمل کے ذریعے حرکت کا تصور پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ حرکت فن پارے کے مختلف اجزا میں ربط پیدا کر کے اسے موزوں اور متناسب بناتی ہے۔ تکرار سے اشیا میں ربط کا تصور پیدا ہوتا ہے خواہ وہ ایک دوسرے میں پیوست ہوں یا نہ۔ اس تکرار کے نتیجے میں آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ یہ آہنگ مسلسل تکرار سے بھی پیدا ہو سکتا ہے اور وقفے وقفے سے ہونے ہونے والی تکرار کے ذریعے بھی۔ حرکت کا تصور عمل یا متحرک تصویر کشی (animation) سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

سادگی کا اصول:
The Principle of Simplicity

فن کی سادگی کا، جسے بصری کفایت (visual economy) یا مختصر ترین نمونہ (minimal design) بھی کہتے ہیں، مطلب ہے ان تمام غیر ضروری یا غیر اہم عناصر اور تفاصیل کو منہا کر دینا جو فن پارے کی مجموعی وحدت قائم رکھنے میں کوئی کردار ادا نہیں کرتیں، تا کہ ان اجزا کو اجاگر کیا جا سکے جو فنی اعتبار سے واقعی اہم ہیں۔ اچھا نمونہ وہ ہوتا ہے جس میں نمونہ کم سے کم ہو۔ یہ کسی فن کار کے لیے اوکیم ریزر (Occam's

Marfat.com

(razor) کے مترادف ہے۔اس اصول کے تحت کسی فن پارے کا مطلوبہ تاثر قائم کرنے کے لیے صرف انتہائی اہم اور لازمی عناصر ہی کو پیش کیا جاتا ہے۔اچھا نمونہ تخلیق کرنے کے لیے ایسی سادگی اور روک تھام انتہائی اہم ہوتی ہے۔سادگی کا اصول یہ ظاہر کرتا ہے کہ اچھا فن پارہ وہ ہوتا ہے جو سادہ ترین نمونے کے ذریعے پیش کیا جا سکے۔

تضاد کا اصول:
The Principle of Contrast

فن میں تضاد کا اصول اس وقت کارفرما ہوتا ہے جب دو مختلف عناصر ایک دوسرے سے مربوط ہوں۔ جتنا اختلاف زیادہ ہوگا اتنا ہی تضاد بھی زیادہ ہوگا۔تضاد مجموعی نمونے میں تنوع اور وحدت پیدا کرتا ہے۔ یہ تضاد ہی ہے جو دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور ناظرین کو تصویر پر نظر دوڑانے پر مجبور کرتا ہے۔اگر تضاد نہ ہو تو تصویر بالکل یک رنگ (monotonous) ہو جائے۔

تناسب کا اصول:
The Principle of Proportion

فن میں تناسب کا مطلب ہے کسی تصویر کے مختلف اجزا میں، جسامت، رنگ، تعداد، شدت، منظر اور تناسب کے اعتبار سے ہم آہنگی پیدا کرنا۔فن پارہ تب ہم آہنگ سمجھا جائے گا جب اس کے اجزا درست اور مطلوبہ طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہوں۔اس کا تعلق کسی عنصر کی مناسب جسامت، پھیلاؤ اور تناسب سے ہے۔تناسب جتنا عمدہ ہوا تنا ہی فن پارے میں مجموعی طور پر ہم آہنگی، یکسانی اور توازن پیدا ہوتا ہے۔ یہ تناسب عموماً ظاہری طور پر نظر نہیں آتا تاوقتیکہ کوئی جز اس سے ہٹ کر عدم تناسب پیدا نہ کر دے۔

یہ فن میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔دوسرے الفاظ میں ایک جز کی شکل وصورت اس سے منسلک دوسرے اجزا کی شکل وصورت کی مناسبت سے ہونی چاہیے۔یہ شکلیں اپنی اپنی جگہ پر خوب اچھی طرح سمائی ہوئی ہونی چاہییں۔

Marfat.com

اچھے نمونے کے اصول:
The principles of good design

یہ اصول فن کار یا نقاش کے لیے مؤثر تصویر یا نمونہ تخلیق کرنے کا آلہ کار ثابت ہوتے ہیں۔فن کاروں نے برسوں کے تجربے اور فطرت کے مطالعے کے ذریعے یہ اصول تشکیل دیے ہیں۔ یہ اصول ہیں؛ توازن، حرکت، تکرار، شدت، سادگی، تضاد، تناسب اور خالی جگہ یا خلا۔ یہ تمام عناصر مل کر وحدت پیدا کرتے ہیں۔

ہر قسم کا فن، خواہ یہ ویب سازی ہو یا صنعتی نمونہ سازی، فنونِ لطیفہ ہوں یا مجسمہ سازی، تجارتی فن ہو یا گرافک آرٹ، انھی اصولوں کا تابع ہے جو نمونے کی وحدت پر زور دیتے ہیں۔ یہ اصول عالمگیر ہیں اور اسی طرح ارتقا، تخلیق، ماحولیات، سائنس، فلسفے، عالم انسانیت اور بالآخر اللہ کی صفات مثلاً الخالق (تخلیق کرنے والا، ابتدا کرنے والا)، الباری (نکالنے والا)، المصور (مصور، صورت عطا کرنے والا) پر بھی منطبق ہوتے ہیں۔ ہر فن ایک تصور، ایک خیال سے شروع ہوتا ہے اور پھر ایک مجموعی اور واحد شکل صورت اختیار کرتا ہے۔ توازن، حرکت، تکرار اور ہم آہنگی، شدت، سادگی، تضاد، تناسب اور خلا اس کے لازمی عناصر ہوتے ہیں۔

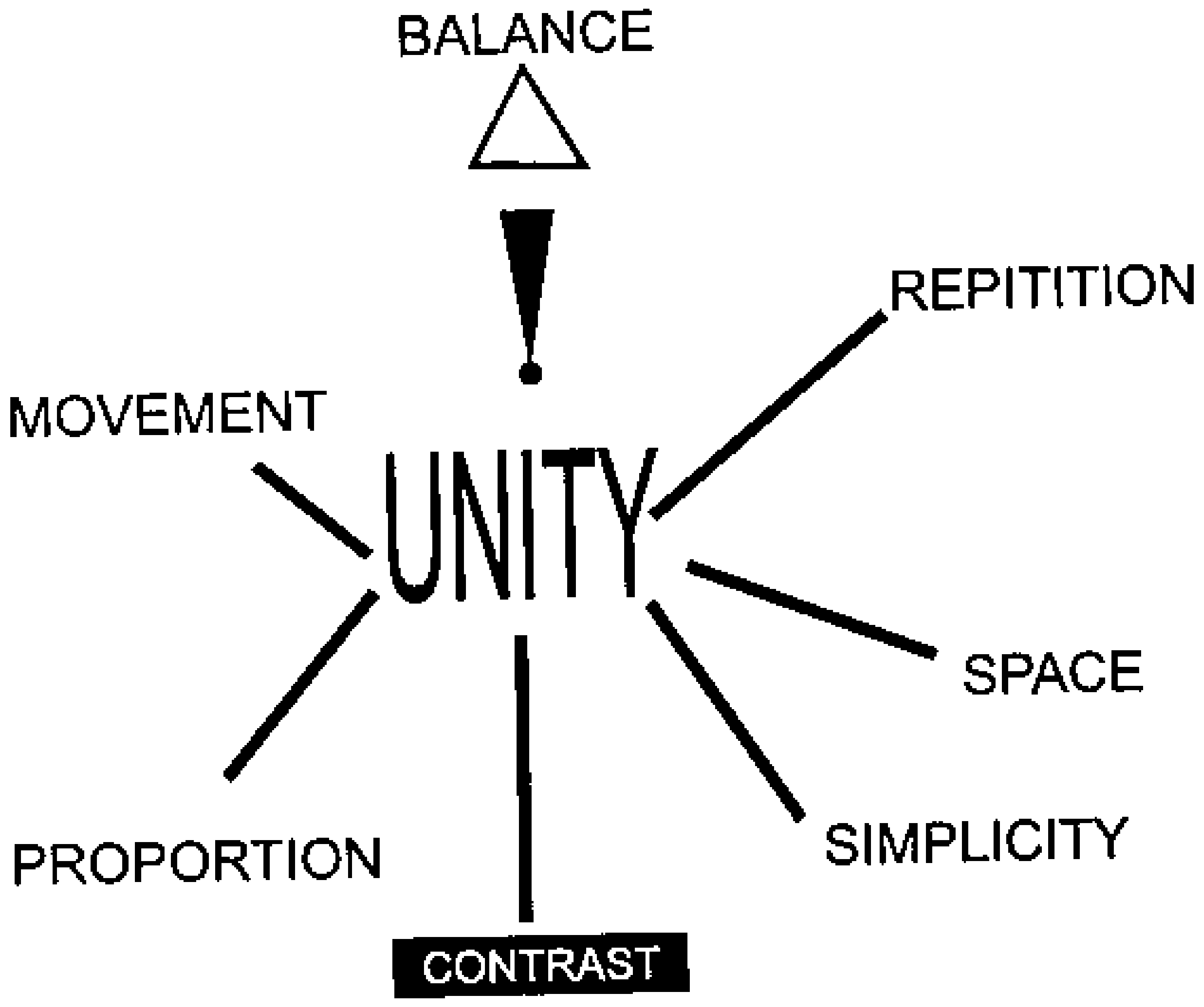

یکساں روی کی تگ ودو:
Strain for Consistency:

ہر چیز توازن اور یکساں روی (Consistency) کی طلب گار ہے۔ ہر چیز وحدت کی متلاشی ہے۔ سائنس ہو، فلسفہ ہو، انسانی جسم ہو، معاشرہ ہو، شعور یا فکرِ انسانی ہو، ہر چیز میں وحدت کا واضح طور پر اظہار ملتا ہے۔ اگر کوئی شخص شور سن رہا ہو اور ساتھ ساتھ درد بھی محسوس کر رہا ہو تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ درد کو الگ

Marfat.com

محسوس کرے اور شور کو الگ۔ اسے درد اور شور بیک وقت، ایک ہی شعوری تجربے کے دو پہلوؤں کے طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن ان جدا جدا احساسات کو کیسے ایک پیچیدہ مرکب احساس میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس عمل کو وحدتِ شعور (unity of consciousness) کہتے ہیں۔ وحدتِ شعور کے اس تصور نے فلسفیوں کو برسوں تک الجھائے رکھا۔ یہ وحدتِ شعور ہی ہے جو کسی شخص یا معاشرے کو تشخص، تسلسل، ہم آہنگی اور انفرادیت بخشتی ہے۔ یہ توازن کو بحال کرتی ہے اور چکر پورا کر دیتی ہے۔ یکساں روی کی یہ تگ و دو اس وقت تک نمایاں نہیں ہوتی جب تک کوئی بدنظمی یا بے ترتیبی رونما نہیں ہوتی۔ نفسیاتی یا طبعی کیفیات کا مطالعہ کرنے کا ایک بہت دلچسپ طریق کار یہ ہے کہ ان کیفیات کی شکست و ریخت یا معمول سے انحراف کرنے والی صورت حال کا مطالعہ کیا جائے۔ وہ عمل یا کیفیت جو معمول کی کارگزاری کے دوران بالکل ہم آہنگ اور سادہ معلوم ہوتی ہے، جب شکست و ریخت سے دوچار ہوتی ہے تو اس میں ہر طرح کا نقص اور ساخت کی خرابی نظر آنے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی ملک یا فرد کے گردشی قرض ہی کو لیجیے، جب کوئی ایک شخص یا ملک وقت پر اپنا کردار ادا کرنے میں ناکام رہتا ہے تو یہ چکر الٹا چلنے لگتا ہے اور فرد یا قوم کی معیشت کی تباہی اور تنزل کا باعث بنتا ہے۔ اگر یہ معاملہ انسانی ذہن کے ساتھ پیش آئے تو نتیجہ شدید کشمکش، اعصابی توڑ پھوڑ اور نفسیاتی انتشار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

اللہ الاحد یعنی ایک ہے لیکن الجامع یعنی سب کا مجموعہ بھی ہے۔ گویا اللہ وحدت بھی ہے اور کثرت بھی۔ یہی بات توحید پرستی کے عقیدے کی طرف لے جاتی ہے جس کا مطلب ہے: ایک ایسے خدائے واحد پر ایمان جو انسان سمیت اپنی تمام مخلوقات سے گہرا جڑا ہوا بھی ہے اور اس کے باوجود ان سب سے جدا اور بالاتر بھی ہے۔ بہت سے الہامی صحیفوں میں اللہ کو "نور" یا الوہی روشنی کے طور پر بیان کیا گیا ہے لیکن ارضی یا زمینی روشنی میں بھی اللہ کی کچھ نہ کچھ صفات سے مماثلت یقیناً موجود ہوگی۔ ہماری دنیا کی روشنی قوسِ قزح کے رنگوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جو بنفشی سے لے کر نارنجی سرخ تک رنگوں کے ہزار ہا بلکہ بے شمار امکانات اور درجات پر مشتمل ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی روشنی کا حقیقی رنگ نہیں ہے۔ روشنی خود بے رنگ ہوتی ہے لیکن روشنی کے درجہ بدرجہ ان گنت مظاہر کا روپ انھی رنگوں کے آئینے میں منعکس ہوتا ہے۔ روشنی کے ہر درجے یعنی ہر رنگ کا طول موج ایک جدا حقیقت کا تعین کرتا ہے جس کی اپنی مخصوص صفات ہیں لیکن اصل میں یہ روشنی ہی کا انعکاس ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ روشنی کے بغیر کوئی رنگ دکھائی نہیں دے سکتا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ روشنی کا مرئی طیف درحقیقت غیر مرئی طیف ہی کا ایک انتہائی قلیل سا حصّہ ہے۔ یہ غیر مرئی طیف لامحدود اور ماورائی ہے۔

Marfat.com

روشنی ایک دوسرے سے بالکل متضاد اور الٹ صفات کا مرکب ہے۔ یہ مرئی بھی ہے اور غیر مرئی بھی۔ یہ غیر مادی موج بھی ہے اور مادی ذرہ بھی۔ توحید پرستی خدا کی ماورائیت اور کائنات میں اس کی نفوذیت دونوں کی قائل ہے۔ اللہ کائنات میں جاری وساری اور یہاں کی ہر چیز کا جز ولاینفک ہے لیکن تمام مظاہر اور فعالیت سے ماورا بھی ہے۔ وہ مجرد بھی ہے اور مخفی بھی۔ وہ تمام تضادات کو باہم ملا دینے والا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو کائنات کے ظاہر و باطن میں موجود ہے لیکن اس سے ماورا، جدا اور آزاد بھی ہے۔ اللہ کی ماورائیت اور اس کی نفوذیت مشرق ومغرب کے طویل اور بار بار اٹھائے جانے والے فلسفیانہ مباحث کا موضوع رہے ہیں۔ کئی مغربی مکاتبِ فکر اس سلسلے میں کانٹ، شیلنگ اور ایمرسن کا حوالہ دیتے ہیں۔

ایک خدا پر یقین، جس نے زمینوں اور آسمانوں کو پیدا کیا، عبرانی، عیسائی اور اسلامی صحیفوں کے عقائد کا مرکزی نکتہ ہے اور یہی انسانیت کے ارفع مذاہب کی جان ہے۔ مثال کے طور پر یہودیوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک یکتا، کامل، غیر مرئی اور ہر شے کے خالق و مالک خدا پر یقین رکھیں جو ازل سے موجود ہے، جو مخلوقات میں سے کسی شے کے مشابہ نہیں، اور جس پر تمام مخلوقات کا انحصار ہے۔ اسی طرح عرب میں اسلام کے طلوع سے پہلے اللہ سب سے بڑے خدا کے طور پر پہچانا جاتا تھا مگر تب اسے واحد خدا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی بعثت کا مقصد یہی تھا کہ اللہ کی وحدانیت کا اعلان کریں۔ قرآن اللہ کی وحدانیت یا توحید پر شدت سے اصرار کرتا ہے اور کسی اور کو خدا کا شریک بنانے کو سب سے بڑا اور ناقابلِ معافی گناہ قرار دیتا ہے۔ یہ کوئی نیا پیغام نہیں تھا بلکہ اسی صدیوں پرانے پیغام کی تجدید تھی۔

قدیم مصر کے ایک فرعون اُمنتحب (۱۳۶۰ ق م) کے مقبرے کی پتھریلی چٹان پر سورج دیوتا ایٹن (Aton) کی شان میں دو حمدیہ گیت کھدے ہوئے ملے ہیں جن میں سورج کو مصر کے اندر اور باہر تمام جان دار اشیا کا خالق ومحافظ اور ایک آفاقی خدا قرار دیا گیا ہے۔ ان گیتوں میں وہی شدتِ احساس اور گرم جوشی ہے جو کئی صدیوں بعد خداے موسیٰ کی مناجاتوں میں نظر آتی ہے۔ اُمنتحب کا نیا مذہب محض سورج کی پرستش تک محدود نہیں تھا؛ بلکہ اس میں سورج کی اس مجرد قوت کو الوہیت کا حامل قرار دیا گیا تھا جو زمین پر سورج کی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ سورج زمین کا مرکز ہے اور زندگی کا منبع وماخذ ہے۔ یہ حقیقتِ مطلق کی اصل فطرت یعنی مرکز اور محیط کا حامل اور اس کا طبعی مماثل ہے۔ سورج دیوتا ایٹن کو ایک مجرد ہستی کا مظہر قرار دیا گیا تھا اور حقیقت میں

Marfat.com

پرستش اسی ہستی کی ہوتی تھی، سورج کی نہیں۔ ان میں سے ایک حمد میں ان جذبات کا اظہار بے شمار الفاظ میں کیا گیا ہے: ''اے خدا! صرف تو ہی خدا ہے اور تیرے سوا کوئی اور خدا نہیں۔'' یہ اسلام کے پہلے کلمے کی بازگشت ہے۔ ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں''۔ اس اصرار نے توحید کی اہمیت کو دو چند کر دیا اور وحدت پرستی کو ایک آفاقی خدا کے تصور سے بدل دیا۔ توحید کا یہی تصور ہے جو نوحؑ سے لے کر ابراہیمؑ اور موسیٰؑ سے لے کر محمد ﷺ تک، تمام الہامی مذاہب میں برقرار رہا۔ اس الوہی تصورِ توحید کے مسخ ہوتے ہی کثرت پرستی کا رواج ہو جاتا ہے۔ ''ایک'' اور ''کئی'' خداؤں کے تصور میں یہ نزاع مذاہب کی تاریخ کا کلیدی عنصر رہا ہے۔ توحید پرستی نے ہی آفاقیت اور انسانیت کی وحدت کا راستہ صاف کیا ہے۔

ازتک کائناتی چکر

علم فلکیات اور علمِ نجوم کے درمیان صدیوں پرانا تعلق ہے۔ ازتک کائناتی چکر کائنات کی قدیم فہم کا اظہار ہے۔ مرکز میں سورج ہے۔

Aztec Cosmic Circle

The connection between astronomical investigation and astrological quest is age old. The Aztec Cosmic Circle represents an ancient understanding of the Universe. In the center is the Sun.

Marfat.com

اللہ کی وحدت کا تصور علم، فلسفے، سائنس، اخلاقیات، مذہبیات، انسانی برتاؤ، ارتقا اور انسانی تقدیر کے نظریات کے حوالے سے گہری معنویت اور اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ تمام صفات کا نچوڑ اور عطر یہی تصور وحدت ہے۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ تمام مخلوقات، جاندار ہوں یا بے جان، ایک ہی سرچشمے سے پھوٹی ہیں اور ان سب کی اصل حقیقت ایک ہے۔ یہ تنوع جو وقت کے ساتھ ساتھ رونما ہوتا رہا ہے، ارتقا کے چکر کا نتیجہ ہے۔ یعنی ماحول سے توافق اور سماجی تہذیب و تمدن سے مطابقت کا ثمر۔ یہ تصور اس بات کی بھی تصدیق کرتا ہے کہ تمام مذاہب، تمام پیغمبر، تمام الہامی پیغامات کا منبع و ماخذ بھی ایک ہی ہے لہٰذا یہ سب بھی ایک ہی حقیقت کے روپ ہیں۔ ان الہامی مذاہب میں جو اختلافات رونما ہوئے وہ یا تو پیغمبر یا رسول کی ذاتی شخصیت، یا ان کے مبلغین کے درمیان فرق اور یا پھر ان کی بعثت کے وقت انسان کے سماجی و تہذیبی حالات اور ارتقا کے مدارج کا نتیجہ تھے۔ اللہ ایک آفاقی وحدت ہے۔ اس لیے یہ طے ہے کہ تمام مذاہب کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور ان کی منزل بھی ایک ہے۔ بعد میں ان مذاہب اور فرقوں میں پیدا ہونے والی دوریاں اور فرقہ بندیاں انسانی انا یا لاعلمی کا نتیجہ ہیں۔ حقیقت کا مغز فراموش کر دیا گیا ہے اور مذہب کی ظاہری صورت اور رسومات کا خول باقی رہ گیا ہے۔ مغز تو ایک ہی ہے۔ اس سارے فسانے کی اصل حقیقت بس اتنی ہے کہ اللہ ایک ہے۔ باقی تمام باتیں ضمنی ہیں اور انھیں جذباتی انداز میں قبول کرنے کی بجائے منطقی اور عقلی طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہماری سائنس فطرت کی یکسانیت کے اصول کو مانتی ہے یعنی ہر چیز اصل میں ایک ہے کیوں کہ اللہ ایک ہے۔ ہر حقیقت اللہ کی یکسانیت اور وحدت کی گواہ ہے۔ اس کرۂ ارض پر جنم لینے والا ایک ایک انسان اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ جیسے وہ واحد اور منفرد ہے، اسی طرح اللہ بھی ایک ہے (الاحد) اور بے مثال ہے (الواحد)۔

پہلا نام:
First Name

اسمائے الٰہی کی فہرست میں سب سے پہلا اور بنیادی نام ھو اللّٰہ الذی لا الہ الّا ھو (وہی اللہ ہے، کوئی اور خدا نہیں سوائے اللہ کے) ہے۔ یہ بیان اللہ کی غالب اور اہم ترین صفت یعنی وحدت کا برملا اعلان ہے۔

Marfat.com

آخری نام:
Last Name

جب کہ اس فہرست میں اللہ کا آخری نام الصبّور ہے جو اس کی انتہائی دل جمعی، تحمل، قوت برداشت اور خود انضباطی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسے اس قادر مطلق، اس غالب و مقتدر اللہ کی اعلا ترین صفت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ اللہ کی ایسی صفت ہے جو بیک وقت انسان کے لیے بھی قابلِ حصول اور قابلِ قدر اور اللہ کو جاننے اور سمجھنے کے لیے بھی بہت ضروری اور اہم ہے۔

اللہ کی صفات جوڑوں کی صورت میں ہیں:
ALLAH'S SIFAT ARE PAIRED

اللہ کی صفات کی ایک ممتاز اور بیحد نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جوڑوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں اور ان میں سے کچھ جوڑے تو ایسے ہیں جو ہمیشہ اکٹھے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً:

الرحمان	مہربان	الرحیم	رحم کرنے والا
القابض	تنگی پیدا کرنے والا	الباسط	کشادگی پیدا کرنے والا
السمیع	سب کچھ سننے والا	البصیر	سب کچھ دیکھنے والا
الظاہر	عیاں	الباطن	نہاں
الواحد	منفرد	الاحد	ایک
الاول	پہلا	الآخر	آخری
الوھاب	عطا کرنے والا	الرزاق	رزق دینے والا
المقسط	تقسیم کرنے والا	الجامع	جمع کرنے والا

یہ صفات کسی دوطرفہ نظام (binary system) کی طرح ایک دوسرے سے باطنی اور فطری طور پر وابستہ ہیں اور ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ ان صفات کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین قسم کی ہیں:

درجہ وار (Graded) جوڑے: مثلاً الرزاق یعنی روزمرہ کی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے والا اور الوھاب یعنی عنایات سے سرفراز کرنے والا، خزانے بخش دینے والا۔ اسی طرح الرحیم مہربانی کرنے والا

Marfat.com

اور الـرحـمـان یعنی رحم کرنے والا۔ یہ دونوں نام ایک ہی صفت کے مختلف درجات کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک صفت دوسری صفت میں اضافے کو ظاہر کرتی ہے۔ جیسے گہرا نیلا ہلکے نیلے سے مختلف ہوتا ہے یا سرخ، نارنجی سے مختلف ہوتا ہے لیکن اصل میں اسی کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ نام بھی کسی صفت کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔

متضاد (Polar) جوڑے: جیسے الـظـاهـر یعنی عیاں اور الـبـاطـن یعنی نہاں۔ الـمـقسط یعنی تقسیم کرنے والا اور الـجـامع یعنی جمع کرنے والا۔ الاوّل یعنی پہلا اور الآخر یعنی آخری۔ یہ صفات دیکھنے میں ایک دوسرے سے متضاد معلوم ہوتی ہیں جیسے آگ اور پانی، زمین اور آسمان، سرخ اور سبز یا جیسے کسی مقناطیس کے مثبت اور منفی سرے۔

پہلو بہ پہلو (Aspects) جوڑے: جیسے الـسـمیع اور الـبـصـیر یعنی ایسی صفات جو ایک دوسرے کے ساتھ آتی ہیں۔ انھیں ایک ہی حقیقت کے مختلف رُخ کہا جا سکتا ہے جیسے لمبائی اور چوڑائی، رنگ اور ساخت، یہ ایک ہی حقیقت کے الگ الگ پہلو ہیں۔

اللہ کے ناموں کی ایک اور مصدقہ اور مسلمہ روایت گنج العرش ہے جس کا مطلب ہے آسمانوں کا خزانہ اور جو حضرت محمدؐ پر فرشتے جبریل کے ذریعے نازل کی گئی تھی اور بعد ازاں ایک زبانی روایت کی حیثیت رکھتی ہے۔ گنج العرش کا جامع اور بار بار دہرایا جانے والا تسلسل بھی صفات کے جوڑوں پر مشتمل ہے جو روایت کے مطابق یہ ہیں:

گنج العرش

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

اللہ کے نام سے جو مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ سُبحانَ

اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ پاک ہے۔

یہ پہلا جملہ اللہ کے اسما کے ہر جوڑے کے ساتھ دہرایا جاتا ہے۔ اللہ کی صفات کے جوڑے دار ہونے کے ثبوت کے طور پر یہاں کچھ ناموں کے جوڑے درج کیے جا رہے ہیں:

Marfat.com

اَلْمَلِکُ	حکمران	اَلْقُدّوسُ	پاک، ارفع
اَلْعَزِیزُ	قوت رکھنے والا	اَلْجَبَّار	جبر کرنے والا
اَلْقَوِیُّ	طاقت ور	اَلْوَفِیُّ	وفادار
الوکیل	قابلِ اعتبار	الکفیل	ذمہ دار
الدائم	دائمی	القائم	مستحکم
الحی	زندہ	القیوم	قائم بالذات
الواحد	اکیلا	الاحد	ایک
الاول	پہلا	القدیم	قدیم
الکبیر	عظیم	المتعال	ماورائی
الواحد	اکیلا	القہار	قہر ڈھانے والا
العلیم	باخبر	الحکیم	دانش مند
الصمد	خود مکتفی	الاحد	ایک
ذی الھیبت	تباہ کن	والقدرت	خالق
العزیز	قوت رکھنے والا	الوھاب	عطا کرنے والا
الباری	آغاز کرنے والا	المصور	صورت دینے والا
الجبار	جبر کرنے والا	المتکبر	تکبر کرنے والا

ناموں کے جوڑے بنانے کی یہ خاصیت انسان کو بار بار دعوتِ غور وفکر دیتی ہے اور یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اس ماورائی، غیر مرئی، تجریدی اور غیر مادی ہستی کے بارے میں اپنے تصور اور فہم کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنا سکے۔ اس خصوصیت میں ان لوگوں کے لیے واضح پیغام موجود ہے جو اس کی تلاش میں ہیں۔ یہ جوڑے اللہ کی پہیلی بوجھنے کے لیے اشارے فراہم کرتے ہیں۔ چوں کہ اس پیغام کا مخاطب انسان ہے اس لیے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان ہی ہے جو اللہ کا متلاشی ہے اور جو یہ پہیلی بوجھنے کا خواہش مند ہے۔

Marfat.com

مثال کے طور پر گنج العرش سے یہ چند مثالیں دیکھیے جن میں صفات کے جوڑے پیش کیے گئے ہیں:

الملک سے مراد ہے کہ اللہ مطلق العنان ہے لیکن یہ خصوصیت تو زمین کے بادشاہوں کی بھی ہوتی ہے، کئی مطلق العنان حکمران گزرے ہیں جنھوں نے دنیا پر حکومت کی ہے۔ انسانی تاریخ ایسے آمروں اور مطلق العنان بادشاہوں کے احوال سے بھری پڑی ہے۔ ان میں سے بہت سے فرعون کی طرح خدائی کے دعوے دار بھی ہوئے۔ لیکن جب ہم اللہ کی اس مطلق العنانی کی صفت کو اس کے متوازی دوسری صفت القدوس یعنی انتہائی پاک اور اعلیٰ وارفع سے ملا کر پڑھتے ہیں تو فوراً خدائی کے ایسے دعوے داروں کو رد کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ارسطو کے فلسفۂ سیاست کے مطالعے سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک خیر اندیش اور شریف النفس مطلق العنان آمر کی حکومت سب سے زیادہ قابل اور مؤثر ثابت ہو سکتی ہے۔

لیکن یہ ایک مثالی صورت حال اور خیالی امکان ہے جس کی تعبیر و ترویج ہماری اس ناقص اور نامکمل دنیا میں نظر نہیں آتی۔ طاقت ہمیشہ خودسر بنا دیتی ہے دو صفات یعنی مطلق طاقت اور مطلق پاکیزگی اللہ کے سوا کسی اور ذات میں مجتمع نہیں ہوتیں۔

الاوّل سے مراد ہے پہلا یا ابتدائی لیکن اور بھی کئی ایسے عمل ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلے یا ابتدائی ہیں۔ مثال کے طور پر عدد ایک تمام اعداد میں سے پہلا ہے اور اعداد کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ صفت ہمیں نہایت آسانی سے اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکتی ہے کہ عدد ایک ہی اللہ ہے اور ہم اسی کو معبود سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن جب ہم اس صفت کو القدیم (یعنی بہت پرانا اور ازلی) کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں تو عدد ایک اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔ اکائی سے پہلے اس کے کسری اعداد مثلاً ۳/۴، ۱/۲، ۱/۴ وغیرہ آتے ہیں اور یوں اکائی لامحدود حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ایسا کوئی عدد نہیں جو پہلا بھی ہو اور ازلی اور قدیم بھی۔ یہ صفات صرف اور صرف اللہ کی ہیں۔

الصمد کا مطلب ہے خود مکتفی، مکمل طور پر صرف خود پر انحصار کرنے والا۔ یہ صفت ہمیں گروہی اور اجتماعی ڈھانچوں میں دکھائی دیتی ہے جیسے قومیں، کارپوریشنیں، معاشرے وغیرہ۔ افراد کبھی بھی خود مکتفی نہیں ہو سکتے۔ ہر فرد ناگزیر طور پر معاشرے، خاندان اور حالات وغیرہ پر انحصار کرنے پر مجبور ہے۔ یہ صرف اللہ ہی ہے جو الصمد بھی ہے اور الاحد بھی۔

Marfat.com

اسی طرح اسما کے ہر جوڑے میں ایک منطقی اور عقلی توجیہہ بھی ہے اور گہری فلسفیانہ قدر و قیمت بھی جو تہ دار معنویت کی حامل ہے اور جس کی تفسیر و توضیح کئی طرح کی جا سکتی ہے۔ اس سے اخذ ہونے والے کچھ نتائج کی مفصل وضاحت کے لیے تو ایک علیحدہ مقالہ لکھنے کی ضرورت ہوگی جو اس تصنیف کی حدود میں نہیں ہے۔ فی الحال تو یہی جاننا کافی ہے کہ اللہ کی صفات جوڑوں کی شکل میں ہیں اور اس طرح جوڑے بنانے کا عمل اللہ کی فطرت کو سمجھنے اور اس کی آگہی حاصل کرنے کا ایک اہم اشارہ ثابت ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ بھی ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ جوڑوں کی صورت میں ظاہر ہونے والی اللہ کی صفات کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کچھ علیحدہ ہے بھی تو وہ بھی یقیناً اسی کلیت کا حامل اور اس کلیت میں شامل ہوگا۔ ان جوڑوں کو الگ الگ کرنا یا ان کی ترتیب کو بدلنا گمراہ کن ہو سکتا ہے کیوں کہ یہ صفات اللہ کا محض جزو ہے اور اس سے الگ اور قائم بالذات نہیں ہیں۔

اللہ کی صفات کے جوڑوں کو دیکھتے ہوئے فوری طور پر جو بات ذہن میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کی صفات انسانی اور طبعی دنیا میں بھی اسی طرح زوجی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ کئی مقدس کتابیں، جو الہامی ہونے کی دعوے دار بھی ہیں، اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ اللہ نے ہر چیز کو جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے۔ دوسری طرف ہمارے روزمرہ کے تجربات و مشاہدات مثلاً چاند سورج کی جوڑی، مرد عورت کی جوڑی اور مرکز اور محیط کا جوڑ، اس تصور پر مزید مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ حقیقت کے اس زوجی تصور نے کئی کائنات پرست اور کثرت پرست مذاہب کو دو اصولوں پر ایمان لانے پر مائل کر دیا مثلاً نر مادہ اور دیوی دیوتا، جیسے رادھا کرشن، رام سیتا اور یانگ ین۔

یہی نفسی بصیرت راگ اور راگنی کے تصور میں نظر آتی ہے۔ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی میں مذکر سمجھے جانے والے ہر راگ کے ساتھ ایک مؤنث راگنی بھی وابستہ ہوتی ہے اور یہ بات بھی فطرتِ الٰہی پر غور و فکر کرنے کا ایک محرک ثابت ہو سکتی ہے۔ آفاقی طور پر مقبول رومانی اور عشقیہ کہانیاں بھی اسی ناگزیر زوجی تصور کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ کہانیاں انسان کے لیے ایک روحانی پیغام ہیں جو اس کی توجہ اس واحد حقیقت کی طرف مبذول کراتی ہیں جو ایک ہوتے ہوئے بھی دو یعنی جوڑے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی لیے میں اس گہرے روحانی پیغام کو ایک مشرقی زبان یعنی فارسی کی ایک مقبولِ عام کہاوت میں ادا ہوتے دیکھ کر حیران نہیں ہوتا۔ کہاوت ہے: یک جان، دو قالب۔ یعنی ایک ہی روح کا دو اجسام میں ظاہر ہونا۔ یہ کہاوت شیریں فرہاد، ہیر رانجھا اور رومیو جیولیٹ کے

Marfat.com

درمیان کبھی نہ ٹوٹنے والے رشتے کو بہت جامعیت سے بیان کرتی ہے۔عرب کے ایک مقبول رومانی قصے قیس لیلیٰ میں جب مکتب میں استاد قیس کو تھپڑ رسید کرتا ہے تو اس کا نشان لیلیٰ کے رخسار پر ابھر آتا ہے۔

ایسی رومانی کہانیاں قدیم دور سے لے کر جدید عہد تک ہر زمانے اور ہر ثقافت میں کثرت سے ملتی ہیں اور ایک ہی مرکزی خیال پر مبنی ہوتی ہیں، یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں کہ انسان کا یہ وجدانی علم پوری انسانیت کی مشترکہ میراث ہے اور ایک ایسی آفاقیت کا حامل ہے جو انسان کے دیگر معاملات میں نہیں ملتی۔

دوسرے صحیفوں کی طرح قرآن بھی اسی بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ نے ہر چیز کو جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا ہے۔یہ بیان اللہ کی تخلیقات کے بارے میں ہے، خود اس کی اپنی ذات کے بارے میں نہیں لہٰذا اس کا اطلاق اس مادی دنیا میں اس کے مظاہر پر ہوتا ہے۔گویا اس کے مظاہر یعنی اس کی صفات اور افعال جوڑوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ جوڑے کبھی تو ایک ہی حقیقت کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتے ہیں اور کبھی اس کے دو متضاد پہلوؤں کو۔ یہی بات کئی فلسفیوں اور جدید سائنس دانوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہے کہ حقیقت میں ثنویت یا دوئی پائی جاتی ہے۔تاہم کئی فلسفیوں نے جن میں اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل کے فلسفی مثلاً کانٹ، فشے، شلنگ وغیرہ شامل ہیں، اس ظاہری تضاد کا مسئلہ حل کرنے کے لیے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ دونوں متضاد صفات ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔فریڈرک ولیم جوزف شیلنگ نے خاص طور پر اس وحدت پرستانہ تصور کی وضاحت کی ہے۔خاص طور پر شیلنگ علمی وحدت کا نظام قائم کرنے میں پیش آنے والی دشواریاں دور کرنے میں منہمک رہا۔دنیا ایک ہے اور فکر (یعنی دنیا کا علم) بھی ایک ہی تھی جو خود اپنی منظم ترکیب کی خواہش مند تھی۔لیکن انسان کے ادراک اور شعور کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ واحد دنیا جو اس شعور سے گزر کر ظاہر ہوتی ہے، دوئی میں تقسیم ہو جاتی ہے۔اس تقسیم کے نتیجے میں ظاہر ہونے والا ہر نصف اس بات کا دعوے دار ہوتا ہے کہ وہی کل حقیقت کا اظہار کرنے والی، بالکل برحق اور منطقی طور پر مطلق سچائی ہے۔یہ فلسفے اور سائنس کا ایک بڑا اور بار بار نمودار ہونے والا مسئلہ رہا ہے۔قرآن اللہ کی تخلیقات کا حوالہ دیتے ہوئے بار بار اس کی جوڑے دار اور زوجی نوعیت کی شہادت دیتا ہے۔مثلاً سورۃ المزمل (۷۳:۸) میں:

رَبّ المَشرِق وَ المَغرِب

مشرق اور مغرب کے آقا

Marfat.com

اسی طرح سورۃ الصفات (۳۷:۱) میں:

ربّ السمٰوٰتِ وَالاَرض

آسمانوں اور زمینوں کے خدا

سورۃ الانعام (٦) میں:

عَالِمُ الغَیبِ وَ الشَّهَادَة

غیر مرئی اور مرئی دنیا

Marfat.com

باب ششم

پہلا اصول

اللہ حقیقت ہے

اللہ کو جاننا؛

ہر حقیقت کو جان لینا ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

پہلا اصول:
THE FIRST PRINCIPLE

اللہ کا پہلا نام:
The First Name of Allah

اللہ کا سب سے پہلا نام ہے: لا الٰــہ الّا اللّٰہ ۔ یہ اوّلین اصول اللہ کی تمام صفات کی بنیاد ہے۔ اسلام سے پہلے اللہ کو عظیم ترین تو مانا جاتا تھا لیکن واحد نہیں سمجھا جاتا تھا۔ عرب میں بے شمار خدا تھے جن میں سے ۳۶۰ کے بت، خانۂ خدا یعنی کعبہ میں نصب تھے، جسے حضرت ابراہیم نے از سرِ نو تعمیر کیا تھا۔ ان بتوں کو ''الٰہ'' کہا جاتا تھا جو عرب میں خدا کے لیے استعمال ہونے والی ایک عمومی اصطلاح تھی۔ ''الٰہہ'' کا لفظ ''الٰہ'' کی جمع کے طور پر ان خداؤں کے لیے استعمال ہوتا تھا جنھیں حضرت محمدؐ کی آمد سے پہلے عرب میں پوجا جاتا تھا۔

اللہ کا لفظ عربی کے حرفِ تخصیص (definite article) ''ال'' اور ''الٰہ'' یعنی خدا کو مختصر کر کے ملانے سے بنتا ہے۔ یعنی ''ال لہٰ'' جس کا مطلب ہے خدائے واحد۔

حضرت محمدؐ کا مشن یہ تھا کہ اللہ کے واحد، عظیم ترین، یکتا و بے مثل اور صرف ایک ہونے کا اعلان کیا جائے۔ اسی لیے پہلا بیان یہی ہے کہ لا الٰــہ یعنی نہیں کوئی خدا؛ الّا اللّٰہ سوائے اللہ کے۔ حضرت محمدؐ نے اللہ کی وحدت یعنی توحید پر بہت زور دیا ہے اور کثرت پرستی کو نا قابلِ معافی گناہ اور شرک قرار دیا ہے۔ عربی میں شرک کا مطلب ہے ایک سے زیادہ خداؤں پر یقین رکھنا یا خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرانا۔ ایک واحد اور لاشریک ذات کو ''اللہ'' قرار دیا گیا جو اس مقتدر ترین، ماورائی، مجرد، بلند و بالا اور بے مثل ہستی کا اسم ذات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی میں ''الٰہ'' کی اصطلاح کی جمع تو موجود ہے لیکن لفظ ''اللہ'' کے لیے جمع کا کوئی صیغہ

Marfat.com

موجود نہیں۔

الٰہ اور اللہ:
Illah and Allah

یوں عربی کے ان دو الفاظ میں سے ''الٰہ'' کا لفظ کئی خداؤں اور ''اللہ'' کا لفظ صرف ایک خدا کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کا الٹ تھے اور یہ تضاد کثرت پرستی اور وحدت پرستی کی باہم متصادم قوتوں کو ظاہر کرتا تھا۔ ان دونوں متضاد اصطلاحات کو اسلام کے پہلے اصول میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ لا الٰہ: نہیں کوئی خدا اور الّا اللّٰہ: مگر اللہ۔

''الٰہ'' تو نظر آتے تھے، ٹھوس تھے اور کئی تھے، جب کہ ''اللہ'' نادیدہ تھا، ماورائی تھا اور صرف ایک تھا۔ یوں حضرت محمدؐ کا مشن ہی یہ تھا کہ کثرت اور وحدت، عیاں اور نہاں، مرئی اور غیر مرئی، ارضی اور ماورائی کا آپس میں ٹکراؤ پیدا ہو۔ لا الٰہ الّا اللّٰہ کے الفاظ یعنی نہیں کوئی خدا، مگر اللہ، پہلا اور اہم ترین اعلان یا کلمہ ہیں۔ اللہ کے ناموں کی قرأت اسی بنیادی اعلان یا کلمے سے شروع ہوتی ہے۔ ھُوَاللّٰہُ الَّذِی لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ ۔(خدا وہ ہے جس کے ساتھ کوئی شریک خدا نہیں) گنج العرش میں اللہ کے ناموں کا ہر جوڑا اسی کلمے کی تکرار سے شروع ہوتا ہے۔ اللہ کے کئی نام ہو سکتے ہیں جو اس کی بے شمار صفات کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس کی ذات کا کلیدی نکتہ اور دیگر تمام صفات پر محیط خصوصیت اسی کلمے اور تصوّر میں پوشیدہ ہے۔ اس کلیدی اور بنیادی تصور کو ہم اللہ کا پہلا اصول قرار دے سکتے ہیں۔

مشرق کے متصوفانہ ادب میں کئی عظیم بزرگوں کی روایات ملتی ہیں جو اس بنیادی کلمے کی تکرار سے ذکرِ اللہ میں مصروف رہے۔ ''ذکر اللہ'' (لغوی مطلب ہے اللہ کو یاد کرنا) تصوف کی ایک خاص مشق ہے جس میں صوفی اپنے سانس کے ذریعے ''اللہ'' یا دوسرے اسمائے الٰہی کی تکرار کرتا اور ان پر غور و فکر کرتا ہے۔ ایسی ہی ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ کیسے ایک پختہ کار اور کامل بزرگ کا امتحان لینے کی غرض سے ان سے لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کے معنی بیان کرنے کو کہا گیا۔ اس بزرگ نے پوچھا کہ وہ اس کلمے کے علمی اور عارفانہ نکات بیان کریں یا اس کے حقیقی مفہوم کا عملی مظاہرہ پیش کر کے دکھائیں؟ امتحان لینے والے نے انھیں حقیقی مفہوم کا مظاہرہ کرنے کو کہا، جس پر اس بزرگ نے لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کا ورد شروع کیا۔ ہر مرتبہ جب وہ لَا اِلٰہ کا لفظ ادا کرتے تو

Marfat.com

غائب ہو جاتے اور جب اِلَّا اللّٰہ کا کلمہ ادا کرتے تو ظاہر ہو جاتے۔ یوں اس عظیم صوفی نے پہلے کلمے کے ذریعے لَا اِلٰہ (نفی) اور اِلَّا اللّٰہ (اثبات) کا حقیقی مفہوم بیان کیا۔

نفی اور اثبات:
Negation and Affirmation

اس کلمے کی ایک تعبیر یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی شے حقیقی وجود نہیں رکھتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمام حقیقتوں کی حقیقتِ اولیٰ ہے۔ اس کے سوا ہر چیز موجود تو ہے لیکن اس کی موجودگی مستقل نہیں؛ اس کی اپنی کوئی حقیقی قدر و قیمت نہیں اس لیے وہ عبادت یا پرستش کے لائق نہیں ہے۔ لہٰذا لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ اس بات کا اعلان ہے کہ اس عارضی اور ناپائیدار کائنات میں صرف اللہ ہی مستقل اور ناقابلِ تغیر ہے اور اس لیے صرف وہی عبادت، پرستش، احترام اور خدائی کا مستحق ہے۔ یہ انسانوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ ان کا مقصدِ اولیٰ موت نہیں جو اس ناپائیدار دنیا کا ناگزیر انجام ہے بل کہ ان کی منزل تو اللہ کی غیر مرئی دنیا میں ابدی زندگی ہے۔

یہاں ایک قرآنی تمثیل یاد آتی ہے۔ حقیقت کے متلاشی ابراہیم نے جب رات کو چمکتا ہوا چاند دیکھا تو اسی کو اپنا خدا سمجھا، لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو مایوس ہو گئے۔ پھر ایک تاریک اور ڈراؤنی رات میں انھوں نے روشن ترین قطبی ستارے کو دمکتے ہوئے دیکھا تو اسے اپنا خدا سمجھا لیکن صبح کا اجالا پھیلتے ہی ستارے غائب ہو گئے اور ابراہیم ایک مرتبہ پھر ناامید ہو گئے۔ پھر سورج طلوع ہوا، سب سے بڑا، سب سے روشن، ابراہیم نے خود سے کہا، ضرور یہی میرا خدا ہو گا لیکن وہ بھی بالآخر ڈھل گیا اور مایوسی کے عالم میں ابراہیم نے خود سے کہا کہ فنا ہو جانے والی کوئی شے بھی خدا نہیں ہو سکتی۔

کئی اور ایک:
Many and One

ذرا اور فلسفیانہ زبان میں کہا جائے تو پہلا کلمہ یہ ہے کہ ''کثرت پرستی نہیں، وحدت پرستی ہی اصل حقیقت ہے''۔ کثرت نظر آتی ہے، ظاہر و عیاں ہوتی ہے لیکن وحدت اسے مسترد کر کے اس پر غالب آ جاتی ہے۔ ''الٰہ'' کئی خداؤں کو ظاہر کرتا ہے اور ''اللہ'' صرف ایک خدا کو۔ یقیناً پہلے کلمے کا اصل عقدہ یہی ہو سکتا ہے کیوں کہ

Marfat.com

حضرت محمدؐ کا عظیم ترین مشن یہی تھا کہ مروجہ کثرت پرستی کے خلاف وحدت پرستی کا علم بلند کریں۔ یہاں ہمیں ایک اور کئی (وحدت اور کثرت) کے فلسفیانہ سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مغربی فلسفہ، اپنے ابتدائی یونانی دور سے ''ایک اور کئی'' کے مسئلے پر الجھا ہوا ہے۔ یہ سوال آج بھی مغرب کے تصوّرِ کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ کائنات کی تمام تر متنوع اشیا کی تہ میں جو وحدت پوشیدہ ہے، اس کی تلاش کا عمل ''ایک اور کئی'' یا وحدت اور کثرت کا مسئلہ کہلاتا ہے۔ اس مسئلے کے پس پشت یہ مفروضہ کارفرما ہے کہ کائنات اصل میں ایک ہی شے ہے۔ چوں کہ کائنات اصل میں ایک شے ہے اس لیے ہر شے کی تہ میں ضرور کوئی ایسا اصول موجود ہوگا جو ان تمام اشیا کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھے۔

یہ کلمہ بتاتا ہے کہ کثرت کی کوئی حقیقت نہیں اور حقیقت صرف ایک ہی ہستی کی ہے جو واحد ہے۔ اب اگر ہم اس کلمے کو اللہ کی ان متنوع صفات پر لاگو کریں، جو مظاہر کی کثرت میں نمودار ہوتی ہیں، تو اس سے کثرت میں وحدت تلاش کرنے کا عمل سامنے آتا ہے۔ گویا نادیدہ، غیر مرئی اور واحد قوت کو ہر لحظہ بدلتے ہوئے مظاہر کی کثرت میں ڈھونڈنا۔ شاید پوشیدہ حقیقت کا راز کھولنے کی کلید اسی عمل میں پوشیدہ ہے۔ یہ انسان کے لیے ایک طرح کی ہدایت بھی ہے کہ دم بدم بدلتی ہوئی، ناپائیدار دنیا میں مظاہر کی کثرت کے نتیجے میں رونما ہونے والی اقدار کی نیرنگی، افراتفری اور شورش میں رہتے ہوئے بھی وحدت کے مستقل اور پائیدار اصول پر قائم رہیں۔ یہ ظاہری کثرت جو ایک مستقل بہاؤ کی صورت رواں دواں ہے، واحد اور دائمی حقیقت کے مقابلے میں بالکل بے معنی ہے۔ یہ ان گنت اشیا زوال پذیر ہیں اور بدلتے بدلتے بالآخر ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ حقیقت انسان سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ مظاہر کی تہ میں پوشیدہ، مجرد، ارفع اور غیر مرئی مگر مستقل اور لافانی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ کثرت انسان کے لیے پرکشش ضرور ہے مگر عارضی، تغیر پذیر، گریزاں اور مایوس کن بھی ہے اور اسی لیے یہ انسان کی تقدیر نہیں بن سکتی۔ یہ اللہ کے پہلے اصول اور اس کلمے کے آخری حصے کی فلسفیانہ معنویت کا اظہار ہے۔ متنوع مظاہر کی کثرت اور تجربی حقائق کو باہم منسلک کرنے والے اور ان میں کوئی اندرونی ربط پیدا کرنے والے مجرد ترکیبی اصول یا نظریے کی تلاش ہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کے سائنس دان اور فلسفی دونوں متلاشی ہیں۔

خدا دراصل ہماری زندگی کو سمت اور رُخ عطا کرنے والی ہستی کا نام ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی خلائے مطلق میں نہیں رہ سکتا جہاں نہ کوئی سمت ہوتی ہے، نہ رُخ، نہ مقصد، نہ معنویت۔ تو گویا خدا ایک طرح سے مقصدِ حیات

Marfat.com

ہے۔بل کہ سب مقاصد کا مقصدِ اولیٰ (المقصود) ہے۔لوگ اپنی زندگی میں جن مقاصد کے حصول کی تگ و دو کرتے ہیں، وہ ان کی زندگی کو معنویت بخشتے اور اس کے سیاق و سباق کو ظاہر کرتے ہیں، اور ان کی توانائیوں کے صرف سے ان کی اندرونی خواہشات کی تسکین کا باعث بنتے ہیں۔ انسانی زندگی اس کثرت زدہ ماحول میں مقاصد کے تسلسل اور خواہشات و ترجیحات کی کثرت سے عبارت ہے۔ یہ پہلا اصول انسان کو ترغیب دیتا ہے کہ خود کو پست مقاصد کے افسوس انگیز اثرات سے نجات دلا کر ارتقا پائے اور زندگی کے اعلا و ارفع پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے انسانی عظمت کی جانب سفر جاری رکھے۔اس انتشار زدہ کثرت، ان لاتعداد مظاہر، اس حیرت انگیز تنوع سے سراسیمہ ہوئے بغیر حقیقتِ واحدہ کی طلب، تلاش اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کیے جائے کیوں کہ یہی وہ مقصد اولیٰ ہے جو انسان کی طمانیت، جمعیت خاطر، آسودگیِ قلب و نظر اور ہم آہنگی کا ضامن ہے۔

تکثیریت کا دور:
The Age of Pluralism

آج کل ہم تکثیریت کے دور میں جی رہے ہیں۔اس جدید دور کی مثال حضرت محمدؐ کے عہد کی سی ہے جب آپؐ پتھر کے بتوں کی پوجا کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے۔لیکن جدیدیت کے بت پتھر کے نہیں، خیال کے ہیں اور یہ مجرد بت زیادہ اثر انگیز اور ذہنوں پر چھا جانے والے ہیں۔اسی لیے جدید دور کا آدمی زندگی کے واحد مرکز، واحد مقصد اور واحد منزلِ مقصود سے محروم ہے۔

پروفیسر ولیم چِٹک اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''مغربی فکر کا طرۂ امتیاز ایک متضاد روش ہے۔چوں کہ لوگ یک سمتی پیدا کرنے والے اصول و ضوابط سے نا آشنا ہیں اس لیے نتیجہ یہ ہے کہ ہر طرف ایک شورش ہے؛ نت نئے مقاصد اور خداؤں کی کثرت، شدید تر ہوتا ہوا انتشار۔''

دوسری طرف مشرقی فکر، مثلاً قدیم چینی، بدھ اور ویدک صوفیانہ مسالک کا نمایاں ترین پہلو ہمیشہ سے ان کا وحدت، ہم آہنگی، اتحاد اور یک جہتی کی جانب میلان رہا ہے۔

Marfat.com

''عظیم مسلم مفکرین ہمیشہ کئی شعبوں میں مہارت رکھتے تھے، لیکن وہ ان سب شعبوں کو ایک ہی شجرِ توحید کی شاخوں کے طور پر دیکھتے تھے۔ وہ علم نجوم اور علمِ حیوانات، طبیعیات اور اخلاقیات، ریاضی اور قانون، تصوف اور منطق میں کبھی کوئی تضاد نہیں دیکھتے تھے۔ ہر چیز ایک ہی اصول کے تابع تھی کیوں کہ خدا کی حقیقت کو ہر شے پر محیط سمجھا جاتا تھا۔

جدید زمانے میں ''ترقی، سائنس اور ارتقا'' کے خداؤں کی حکومت ہے۔ جدید انسان سمجھتا ہے کہ ہم دنیا کے بارے میں اگلے لوگوں سے کہیں زیادہ جانتے ہیں کیوں کہ ''ہمارے پاس سائنس ہے''۔

لیکن اس کے باوجود معاصر مغربی مفکرین، جنھیں جدیدیت اور روز افزوں تکثیریت (Pluralism) کا سامنا ہے، اس صورت حال سے نمٹنے کی ایسی اہلیت سے محروم ہیں جس کی مدد سے وہ اس انتشار اور کثرت میں ہم آہنگی، یک جہتی اور اتصال پیدا کرسکیں۔ حالانکہ سائنسی اور فکری علوم میں ایک دوسرے کے قریب آنے کا رجحان روز بروز نمایاں طور پر بڑھتا جارہا ہے۔ یہاں میرا اشارہ اس مصنوعی اور زبردستی کی ہم آہنگی کی طرف نہیں ہے جو نظریۂ تخلیقِ کائنات، تکوینی علوم اور آفرینش کے بارے میں مختلف نظریات کی پیدا کردہ ہے یا مذہبی تعصبات اور سیاسی جبریت کی زائیدہ ہے۔ نہ اسے عقائد کی کورانہ تقلید اور رسم پرستی پر محمول کیا جائے۔ اس کے برعکس یہ فکری علوم اور سائنسی تحقیق کی بنا پر قائم کلیّت (Scientific Holism) کا ایک تصور ہے جو ایک ہی مرکز، ایک ہی نصب العین کی جانب مائل ہے۔

پہلے انکار، پھر اقرار:
Negate to Affirm

سب سے پہلے لا الٰہ یعنی نہیں کوئی خدا (انکار) آتا ہے اور پھر الا اللہ یعنی مگر اللہ (اقرار)۔ پہلے رد ہے (-) پھر قبول (+)۔ یہ کلمہ تکثیریت سے انکار اور وحدت کا اقرار کرتا ہے۔ یہ ''ایک'' کے مقابلے میں ''کئی'' کو جھٹلاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ''حقائق'' کو جھٹلاتا اور ایک عظیم ترین حقیقت ''اللہ'' کا اثبات کرتا ہے۔ اللہ کی ذات نادیدہ، غیر مرئی اور پوشیدہ ہے، لہٰذا یہ پہلا کلمہ مادی حقائق کو ناپائیدار اور زوال پذیر ہونے کی بنا پر رد کرتا ہے اور اس غیر مادی، مجرد اور ماورائی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے جو غیر فانی ہے۔ یہ مادی دنیا کی ناگزیر زوال پذیری اور

Marfat.com

موت آشنائی کے مقابلے میں دائمی زندگی کو انسان کا مقدر قرار دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کلمہ حواس کی ظاہری دنیا (عالم شہادت) کی نفی کرتا ہے اور ایک نادیدہ دنیا (عالمِ غیب) کا اثبات کرتا ہے۔ گویا یہ ظاہری اور خارجی دنیا (الظاھر) کی نفی ہے اور ایک پوشیدہ داخلی دنیا (الباطن) کا اثبات ہے۔ یہ ذہن کی جسم پر فوقیت کا اعلان ہے۔ اس طرح یہ کلمہ انسانی زندگی کا ایک واضح مقصد متعین کر دیتا ہے اور انسان کے لیے اس امید کا پیغام بن جاتا ہے کہ اس کا انجام موت نہیں، زندگی ہے۔ یہ کلمہ انسان کی نفی اور خدا کا اثبات ہے۔

مادے پر ذہن کی فوقیت:
Mind over Matter

فلسفیانہ اصطلاح میں بات کی جائے تو یہ کلمہ مادے کے مقابلے میں ذہن کے اثبات کا اعلان کرتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی علم ہے کہ الظاھر اور الباطن اللہ کی صفات کے جوڑوں میں سے ایک جوڑا ہیں۔ یہاں ہمیں اس تضاد کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اللہ کی نفی بھی ہورہی ہے اور اثبات بھی۔ ان دونوں صفات میں سے پہلی یعنی الظاھر کی نفی کی جارہی ہے اور دوسری یعنی الباطن کا اثبات کیا جارہا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ان دونوں میں سے ایک صفت ناپائیدار اور تغیر پذیر ہو، اس لیے اس کی تردید کی جائے، جب کہ دوسری مستقل اور دائمی ہو اس لیے اس کی تاکید کی جائے۔ الظاھر (مادی یا ٹھوس حقیقت) اگرچہ اللہ ہی کی ایک صفت ہے لیکن یہ اس کی ذات کے مساوی قرار نہیں دی جاسکتی۔ یہ تغیر پذیر، زوال آشنا، عارضی اور محدود ہے اس لیے انسان کی عقیدت اور پرستش کا محور نہیں ہوسکتی اور نہ اس کی منزل مقصود بن سکتی ہے۔ یعنی یہ پہلا کلمہ تمام مظاہر کی نفی کرتا ہے اور اور اللہ کا اثبات کرتا ہے جو نہاں ہے، لازماں ہے اور ابدی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان دونوں میں سے ایک صفت تو ابدی ہے (ذہن) جب کہ دوسری عارضی ہے (مادہ)۔ ایک زندگی ہے اور دوسری موت۔ یہیں سے انسان کے اعلاترین مقصدِ حیات کا تعین ہوتا ہے۔ یہ پہلا کلمہ انسان کو ذہن کی دائمی صفت تک رسائی کی ترغیب دیتا ہے تا کہ وہ مادی اور ظاہری دنیا سے بالاتر ہو کر اللہ کی غیر مرئی صفت کی اعلاتر سطح تک پہنچیں جو ذہن کی جسم یا مادے پر فوقیت کا اعلان ہے۔ یہ انسان کو حقیقتِ عظمیٰ کی مجرد اور ماورائی نوعیت کو سمجھنے بوجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ انسان سے اعلاتر شعور تک رسائی کے ارفع مقصد کو حاصل کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔

اللہ کی صفات مظاہر کی دنیا (عالم شہادت) میں رونما ہوتی ہیں۔ یہ مادی مظاہر بھی یقیناً اللہ کی نشانی اور اس

Marfat.com

کی شہادت ہیں لیکن یہ حقیقت عظمیٰ کے عارضی، غیر مستقل اور کم تر مظاہر ہیں۔ان کی تصدیق نہیں ہونی چاہیے، تا کہ کہیں انسان کم تر سطح کے مظاہر سے وابستہ نہ ہو جائے۔ حقیقت درجہ وار ہوتی ہے۔ یہ ایک تسلسل کا نام ہے۔اسی لیے دو مختلف اور متضاد صفات میں سے ایک یعنی الظاھر (ٹھوس حقیقت) کی نفی کی جاتی ہے اور الباطن (ماورائی حقیقت) کا اثبات کیا جاتا ہے۔ الظاھر حقیقت کے اس تسلسل کا نچلا درجہ ہے جسے حقیقت کے ارفع اور مطلوب درجے یعنی الباطن کے حق میں ترک کیا جاتا ہے۔ یہ کلمہ حقیقت کے عارضی اور ناپائیدار پہلو کی نفی اور اس کے دائمی اور غیر مرئی پہلو کا اثبات ہے۔ یہ انسان کے لیے ایک دعوت ہے کہ وہ مادی صورت اور فریب حواس کی کثافت سے بلند تر ہو کر ذہن اور روح کی ارفع اور ابدی دنیا کی لطافت کی طرف متوجہ ہو۔ یہ انسان کی کم تر سطح کے مظاہر سے غیر منطقی وابستگی (fixation) کو جھٹلاتا ہے اور اسے ترغیب دیتا ہے کہ وہ ان سے بالاتر ہو کر ذہن اور روح کی اکمل سطح تک پہنچیں۔ یہ انسان کے لیے ایک پیغام ہے کہ وہ مادیت پرستی سے نکل کر ذہن و روح کے اعلا اور لطیف منطقوں میں قدم رکھے۔ یہ انسان کو کسی وہم سے چمٹ کر رہ جانے کی عادت (fixation) سے روکتا اور خبر دار کرتا ہے۔

غیر منطقی وابستگی سے ہوشیار!:
Warning against Fixations

کسی ایک خیال سے چمٹ کر رہ جانے (fixation) کی اس عادت کے خطرناک نتائج و عواقب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے قارئین کو میرا مشورہ ہے کہ وہ انسانیات کے عظیم سائنس دان سگمنڈ فرائیڈ سے رجوع کریں اور اس عادت کے اثرات اور نتیجتاً ظاہر ہونے والے نیوروسس (neurosis) جیسے ذہنی عوارض کے گہرے مطالعات پر غور کریں۔ یہ تو ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جو مرد اپنی ماں سے غیر معمولی طور پر وابستہ ہو وہ شادی کے لیے بھی موزوں نہیں ہوتا۔ بقا کی تو بات ہی چھوڑ یے۔

زمانہ قدیم ہی سے بہت سے مذاہب نے کم تر سطح کی ایسی غیر منطقی وابستگیوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور کسی عقلی توجیہہ کے بغیر ایسی مشقیں اور تکنیکیں وضع کی ہیں جو انسان کو اس غیر فطری وابستگی سے نجات دلا سکیں۔ مثال کے طور پر ہندو پر بھت میں، وجود کے شیطانی چکر سے نکلنے، حیوانی سطح سے بلند تر ہو کر مہا کنڈلی تک پہنچنے اور امر ہونے کے لیے پانچ چیزوں کی وابستگی سے آزاد ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ ہستی اور تکوین (Being

Marfat.com

and Becoming) کی ہندو مابعد الطبیعیات ہے۔ یہ پانچ چیزیں، کام (جنس)، کرودھ (غصہ)، لوبھ (لالچ)، موہ (اپنے نفس، ماں باپ، بچوں، رشتے داروں، قبیلے اور عقیدے کی محبت) اور اہنکار (تکبر) ہیں۔ کیا ہم ان پانچوں کو انسانی خواہشات اور مقاصد کے سلسلے میں وابستگی کی درجہ بندی کے طور پر دیکھ سکتے ہیں؟ اسی طرح عیسائیت میں بھی سات گناہ گنائے گئے ہیں۔ اسلام خاص طور پر کم تر سطح کی وابستگیوں کے معاملے میں شدید تر رویے کا اظہار کرتا ہے اور حسی لذات مثلاً نشہ، جنس، بت پرستی، ملکیت، تکبر اور مجسمہ گری، یہاں تک کہ شدید صورت میں موسیقی اور رقص کی بھی ممانعت کرتا ہے۔

متضاد قوتوں کی یک جائی کا راز:
The Secret of Combining Opposites

مشرق کے صوفی اور روحانی مرشد ایک زمانے سے متضاد قوتوں یعنی نفی (-) اور اثبات (+) کی یک جائی کا راز جانتے ہیں اور اس کی مشق کرتے چلے آرہے ہیں۔ دو متضاد قوتیں یعنی نفی اور اثبات جب یک جا ہوتی ہیں تو ایسی توانائی پیدا کرتی ہیں جو یہ مشق کرنے والے کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ عام بجلی کے جنریٹر بھی اسی اصول پر کام کرتے ہیں۔ جب مقناطیس کے منفی اور مثبت سرے ایک گول دائرے میں گھومتے ہیں تو بجلی پیدا ہوتی ہے۔

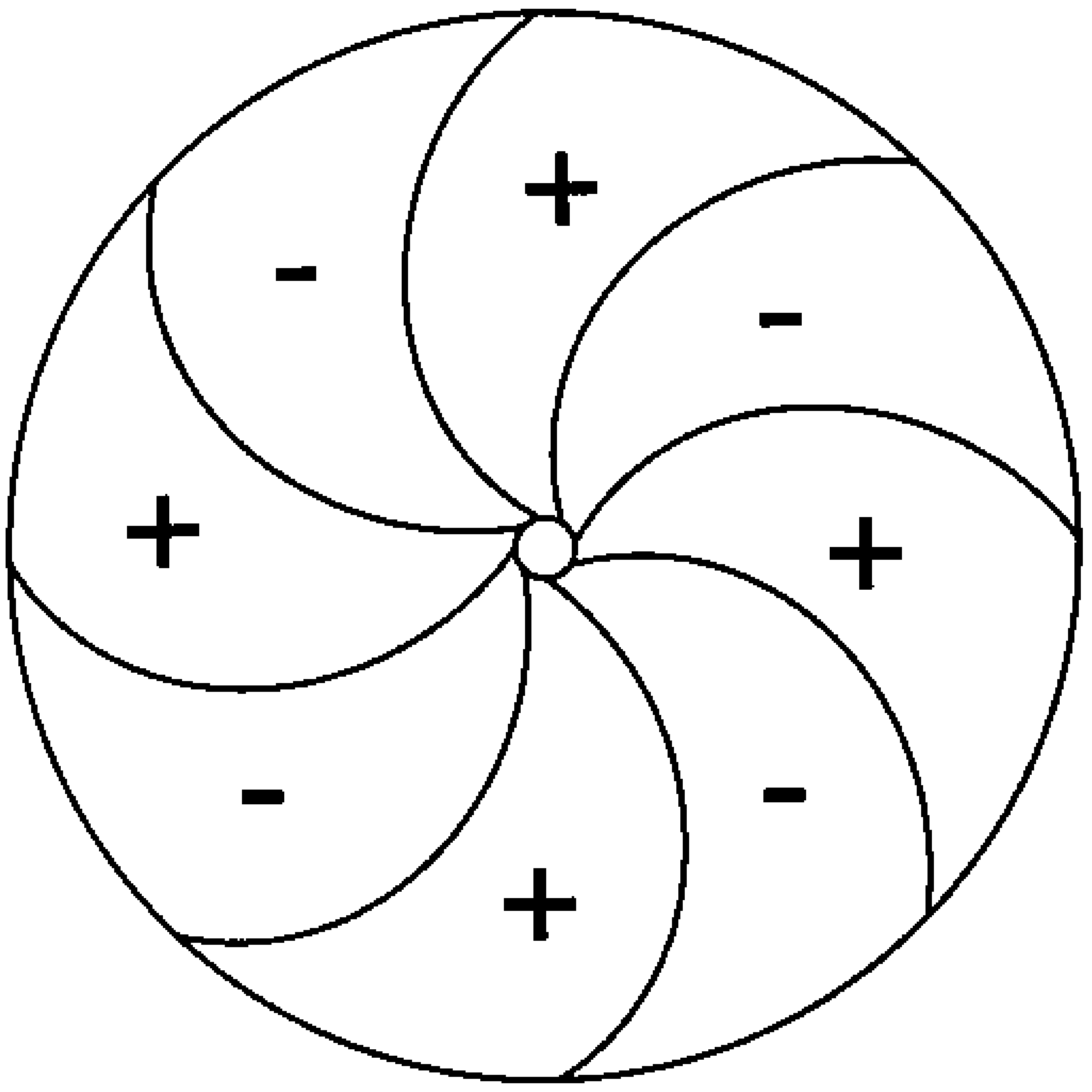

عام جنریٹر بھی اسی اصول پر نفی اور اثبات کی حرکت سے بجلی پیدا کرتے ہیں

روحانی جنریٹر بھی اسی اصول پر چلتا ہے۔ جب اللہ کے دونوں پہلوؤں کے ذکر کی تکرار ہوتی ہے تو روحانی

Marfat.com

توانائی پیدا ہوتی ہے جو ذکر کرنے والی کی کایا پلٹ کر دیتی ہے۔ صوفیانہ روایت میں اس مشق کو ''نفی اثبات'' کا نام دیا جاتا ہے۔ انسان اللہ کے ان پہلوؤں یعنی لا الٰہ (ظاہر) اور الاّ اللّٰہ (باطن) کے درمیان ہوتا ہے۔ پہلے اصول کی اعلاترین اطلاقی صورت یہ ہے کہ انسان حقیقتِ عظمیٰ کے اثبات میں خود اپنی ذات کی نفی کر دے۔ نفی ذات کی یہ مشق تمام مذاہب کے صوفیوں اور بزرگوں کے ہاں ملتی ہے۔

قدیم ہندو مہذب میں متضاد قوتیں آگ اور پانی کے میلاپ کی ایک تصویر

متضاد کے ملاپ کا راز

ہندوستانی تنترا کا نقش جو متضاد اصولوں کی یکجائی کا اظہار ہے اور یہی کیمیا گروں اور پر اسرار علوم کے ماہرین کا آدرش رہا ہے۔ اسی طرح خدا اور انسان کا وصال بھی ہر مذہب کا بنیادی نصب العین ہے

Secret of Combining the Opposites

Engraving from the Indian Tantric works showing the marriage of the opposites which has been the ideal of Alchemists and Occultists. The union of God and man is likewise the ideal of all religions.

متضاد کا ملاپ

متضاد اشیا کے ملاپ کا معروف طریقہ صرف چاند اور سورج، یا نر اور مادہ کے وصال کی علامت ہی سے ظاہر نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اسے ''اندروجین'' (androgyne) کی تصویر کے ذریعے بھی بیان کیا جاتا تھا۔ یہ وہ منفرد ہستی ہے جس میں متضاد اصول یکجا ہو گئے ہیں۔ یہی خیال اس تصویر میں پیش کیا گیا ہے۔ متضاد کردار مل کر اژدہا پر قابو پا رہے ہیں۔

Conjunction of Opposites

The famous conjunction of opposites was not symbolized only by the union of the sun and moon, or by the male and female principles, it was also illustrated by the figure of "androgyne" , the unique being which united the opposite principles within itself. Same theme is expressed in the

Marfat.com

illustration in which the opposites combine to triumph over the dragon.

وحدت کے پہلو:
Aspects of Unity

یہ اصول دوسرے لفظوں میں اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نفی (-) اور اثبات (+) وحدت کے دو پہلو ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جمع اور تفریق سے، ضرب اور تقسیم سے اکائی وجود میں آتی ہے۔ یہ وحدت کے جزو لاینفک ہیں۔ یہی وحدت کے پہلے اصول کی اصل معنویت ہے۔ نفی اور اثبات کا امتزاج اور انتشار وحدت کی اصل فطرت کو بے نقاب کرتا ہے۔ اسی لیے یہ اللہ کا پہلا اصول (توحید) ہے۔ منفی اور مثبت ایک دوسرے میں گتھے ہوئے اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ ذات واحد کا ایک لازمی پہلو یہ ہے کہ یہ منفی اور مثبت، تفریق اور جمع، رد اور قبول، انتشار اور امتزاج، گریز اور کشش کا مجموعہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو طاقتیں بظاہر ایک دوسرے کا الٹ دکھائی دیتی ہیں، اصل میں ایک ہی ہیں۔ خارجی، مرئی اور ظاہری (الظاھر) ہوں یا داخلی، غیر مرئی اور پوشیدہ (الباطن)، دیکھنے میں ایک دوسرے کا الٹ، متضاد اور برعکس دکھائی دیتی ہیں مگر حقیقت میں اسی وحدت کے مختلف پہلو ہیں۔ یہ حقیقت کے ایک ہی تسلسل کے دو انتہائی سرے ہیں (continuum) جو بظاہر ایک دوسرے کا الٹ ہیں مگر اصل میں ایک ہی ہیں۔

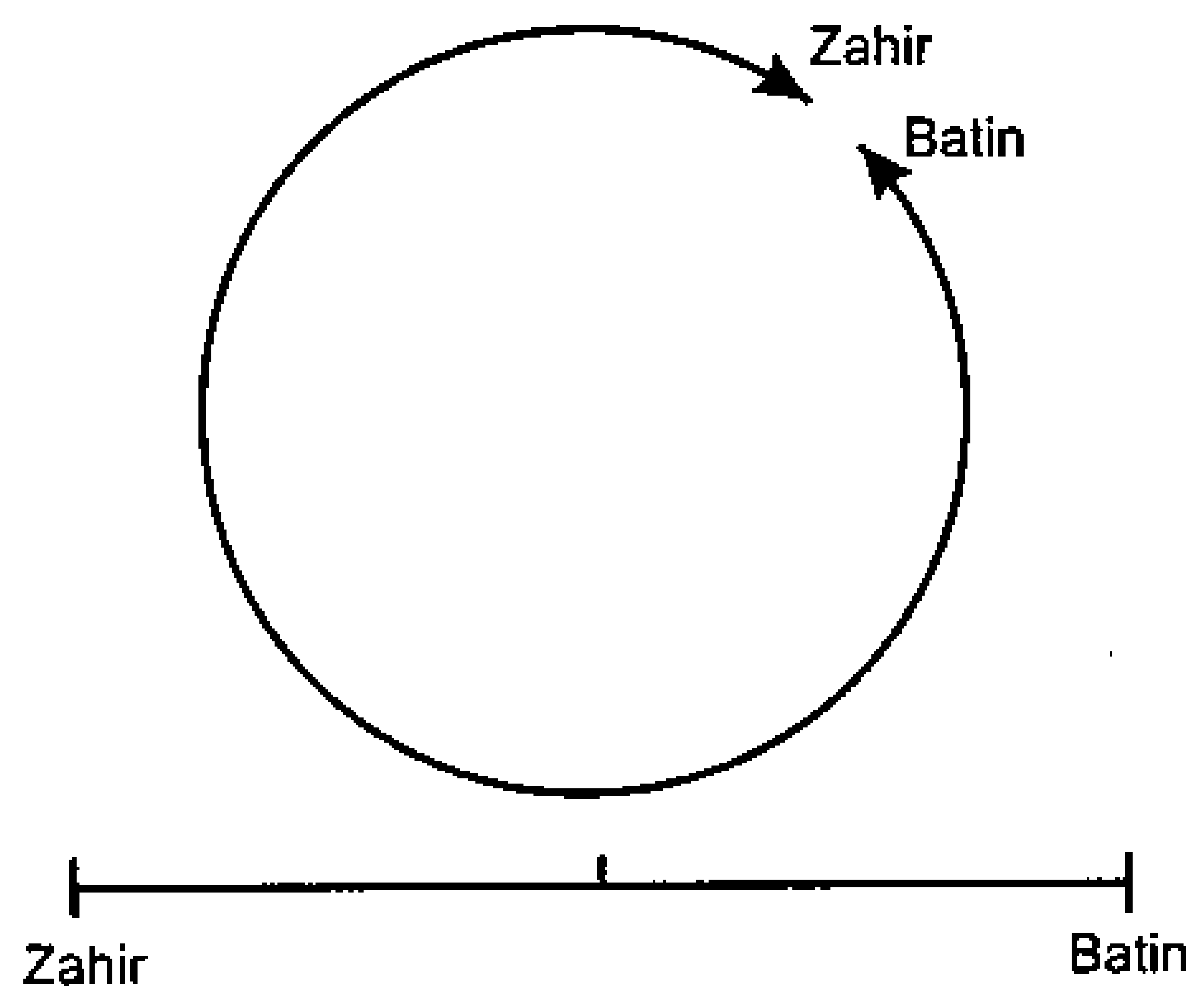

Continuum illustration Az Zahir and Al Batin
similar continuums of object and subject, submission and command, man and God, in cyclic order. Submission and command make unity. Experiment two magnetic bars plus and plus repulse while minus and plus combine to make a unity.

Marfat.com

یہ قوتیں ایک دوسرے سے مل کر روبہ عمل آتی اور یوں حقیقتِ واحدہ کا اطلاق کرتی ہیں۔ اس کی مثال برقی توانائی کے مثبت اور منفی بار کی سی ہے یا پھر ایٹم میں پروٹان اور الیکٹران کی موجودگی یا مقناطیس کے مثبت اور منفی سرے جو ایک دوسرے کو کھینچتے اور دھکیلتے ہیں۔ اسی طرح حکم اور اطاعت، خدا اور خودی، فاعل اور مفعول اور معبود اور عبد مل کر ایک وحدت کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ اللہ کی فطرت کی لازمی صفت ہے اور اس لیے حقیقت ہے۔ یہ ایک ایسا بنیادی اصول ہے جسے بار بار دہرایا جاتا ہے، از سرِ نو تشکیل دیا جاتا ہے، بار بار روبہ عمل لایا جاتا ہے، جس کی تقلید دنیا کی ہر شے کرتی ہے اور کل کائنات میں جس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کشش اور گریز برقی توانائی کا سب سے بنیادی اصول ہے۔ کائنات کا چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ بھی اسی خصوصیت کا حامل ہے۔ ظاہری طور پر متضاد قوتیں جو بادی النظر میں ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں، اندرونی طور پر ایک دوسرے سے جڑی ہوئی اور باہم پیوست و منسلک ہیں۔ اور یہ فطرت کا سب سے بڑا اور اساسی اصول ہے۔ یہی تضاد ہر حقیقت کی روح ہے۔ ہماری سائنس اور ہمارا فلسفہ بھی اسی مبنی بر تضاد حقیقت کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ بنیادی اصول ہر شے میں موجود ایک ناگزیر وحدت کا اعلامیہ ہے۔ مثال کے طور پر آج کل ماحولیات کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ ترقی اور بقائے فطرت کے درمیان توازن کیسے پیدا کیا جائے؟ آگے بڑھنے کی ایک ہی صورت ہے کہ یہ دونوں پہلو یعنی ترقی اور بقائے فطرت مل کر ایک ہو جائیں۔ اسی طرح داخل اور خارج یوں جڑے ہوئے اور باہم مربوط ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت نہ تو محض داخلی ہے اور نہ صرف خارجی؛ یہ داخل و خارج کے ربط باہم کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح خدا اور انسان بھی ایک ایسے ہی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔

فطرت کا بنیادی قانون:
Primary Law of Nature

یہ اصول اسلامی نہیں ہے اگرچہ اسلام نے اس اصول کو جدید دور میں الہامی علم کے ذریعے پیش ضرور کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی بھی مذہب اس اصول کا ماخذ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ اصول زمانہ قبل از تاریخ سے موجود ہے۔

۱۳۶۰ قبل مسیح میں اُمنحتپ (Amenhotep) کی سورج دیوتا، ایتن (Aton) کی شان میں کہی گئی

Marfat.com

مناجاتیں، جو قدیم مصری کتبات پر کندہ ہیں، لاتعداد الفاظ میں ایک ہی بات کا بیان ہیں، ''اے خدائے واحد، تیرے سوا اور کوئی خدا نہیں''۔ یہی بیان کئی صدیوں بعد موسیٰ کی مناجاتوں میں دہرایا گیا اور بعد میں اسلام کے پہلے اصول میں اسی کی گونج سنائی دیتی ہے، ''نہیں کوئی خدا، مگر اللہ''۔

متضاد قوتوں کو باہم یکجا کرنے کا راز قدیم چین پر بھی آشکار تھا۔ ین اور یانگ متضاد قوتوں کی یک جائی کی قدیم ترین اور معروف ترین علامتوں میں سے ایک ہیں لیکن کم ہی لوگ اس کے مکمل معانی سے آگاہ ہیں۔ ین اور یانگ قدیم تاؤ فلسفے کے بنیادی اور اہم ترین نظریات میں سے ایک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس نظریے کی روح یہ ہے کہ وجود کی دو انتہائیں؛ مثبت اور منفی، جو متضاد لیکن باہم مربوط اور دوسرے کی تکمیل کرنے والی قوتیں ہیں، ایک گردشی حرکت میں یکجا کی جائیں تاکہ ایک ابدی توازن پیدا کیا جا سکے۔ لطیف اور سفید یانگ جو اوپر اڑنے کا رجحان ہے، کثیف اور سیاہ ین سے جڑ جاتا ہے جو نیچے کی طرف کھینچنے والی قوت ہے۔ ین اور یانگ ایک دوسرے پر منحصر متضاد قوتیں ہیں جو ایک فطری گردش میں حرکت کرتی ہیں اور ہمیشہ ایک نقطۂ توازن کی تلاش میں رہتی ہیں۔ یہ قوتیں اگرچہ متضاد ہیں مگر مخالف نہیں ہیں۔ یہ دونوں تاؤ کے دو پہلو ہیں، ایک ہی حقیقت کے دو رُخ جو مل کر ایک وحدت کی تشکیل کرتے ہیں۔

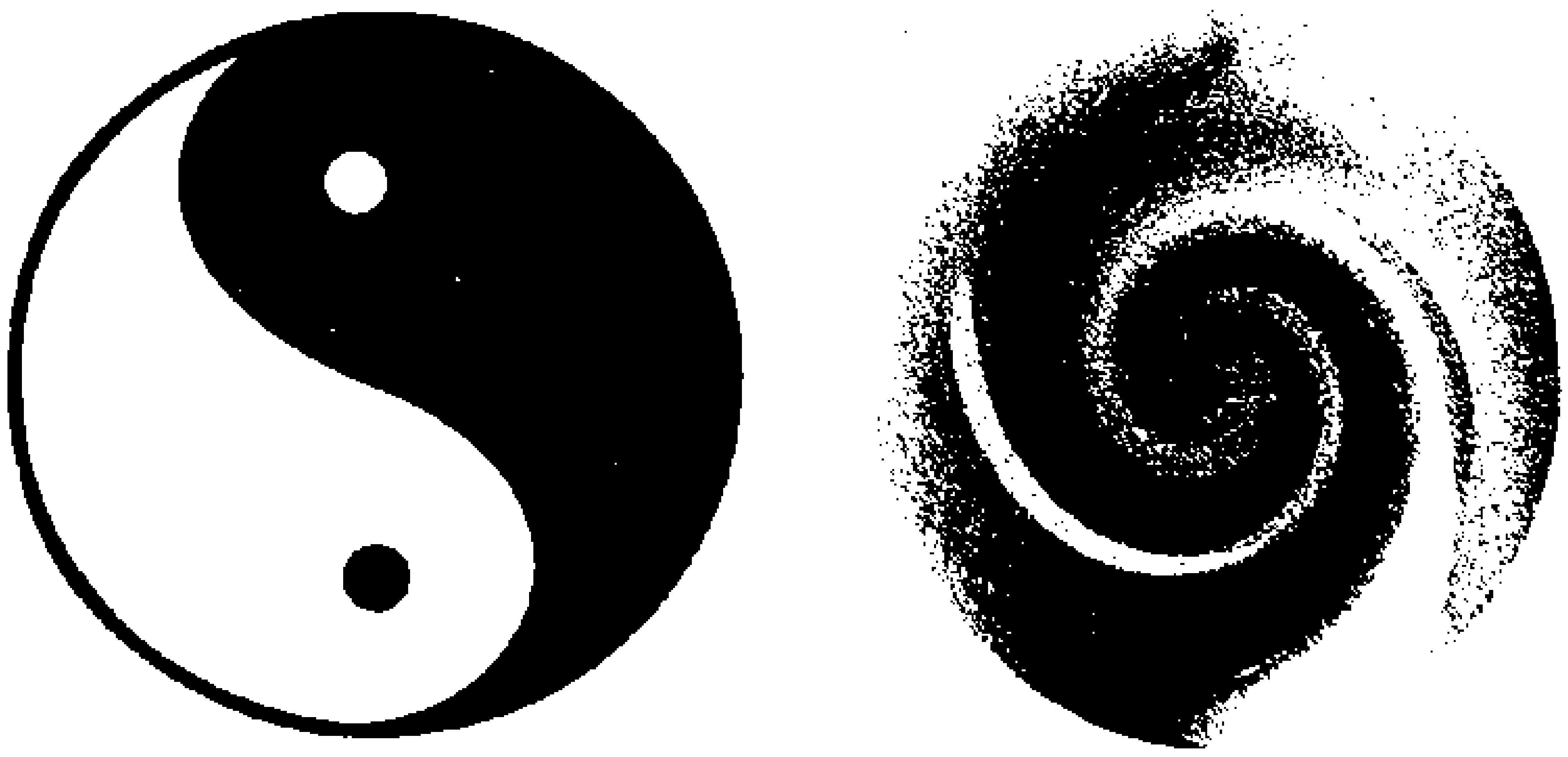

ین اور یانگ کی دو بنیادی مگر متضاد قوتیں
یہ چین کی تاریخی، قدیم ترین اور مسلمہ مقدس روایات ہیں جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہی ہیں۔ چینی، کائنات کو ین اور یانگ کی انھی بنیادی قوتوں کی مدد سے سمجھتے ہیں

Two Fundamental but Opposite Forces of YIN and YANG
This is the oldest and most authentic evidence of historical divination that has bneen handed down over generations from China. Chinese represent two fundamental forces of YIN and YANG which are at the base of understanding the Universe.

Marfat.com

ین یانگ اس یقین کا اثبات ہیں کہ کائنات میں ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی دو قوتیں کارفرما ہیں۔ ہر مثبت اور مردانہ اوصاف رکھنے والی شے یانگ ہے اور نسائی اور منفی اوصاف رکھنے والی ہر شے ین ہے۔کوئی شے بھی بذاتہ دوسری شے سے بہتر نہیں بلکہ توازن قائم رکھنے کے لیے دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ین نرم خو ہے اور یانگ سخت جان۔ ین سکون ہے تو یانگ تحرک۔ چاند ین ہے اور سورج یانگ۔ مادہ ین ہے تو نر یانگ۔ پہاڑ ین ہیں اور دریا یانگ۔ ین وجدانی ہے اور یانگ منطقی۔ موسمِ سرما ین ہے اور موسمِ گرما یانگ۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: www.Britannica.com yinyang)

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جو اشیا ایک دوسرے کی ضد ہوں وہ ایک دوسرے کی جانب کھنچتی ہیں۔ اسی طرح ایک جیسی (similar) اشیا ایک دوسرے سے دور بھاگتی ہیں؛ جیسے مقناطیس کے دونوں سرے یا قطبین جو ایک دوسرے کا الٹ ہوں، ایک دوسرے کو اپنی جانب کھینچتے ہیں، جب کہ مماثل سرے ایک دوسرے کو دور دھکیلتے ہیں۔ منفی مثبت کی جانب کھنچتا ہے اور مثبت مثبت سے دور بھاگتا ہے۔ یہ کشش اور گریز بلاشبہ زندگی کے دو کنارے ہیں۔ یہ دونوں مل کر زندگی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی وحدت میں پروئے ہوئے ہیں۔ ہستی کے ان دونوں کناروں کے درمیان مسلسل اور مستقل تعامل ہوتا رہتا ہے۔ اس تعامل میں ان دونوں کا کردار مساوی ہے، ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والا ہے اور مکمل طور پر متوازن ہے اور اس تعامل کا نتیجہ زندگی کی صحت مندانہ نشوونما، بڑھوتری اور ارتقا کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ انسان کی سماجی و ثقافتی ترقی اس کی ایک عمدہ مثال ہے جو زیادہ تر عورت اور مرد کے مسلسل اور مستقل تعامل کے احوال پر مشتمل ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں انسانی معاشرے تبدیل ہوتے رہے اور ترقی پاتے گئے۔ ادب، ڈراما اور آرٹ کی ہر صنف اسی کی تصویر ہے۔ جب بھی کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دی گئی تو کئی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے اور صحت مندانہ نشوونما رک گئی۔ انسان کے یہ روزمرہ کے سادہ تجربات و مشاہدات اللہ کی صفات کی دورنگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مذہب اور سائنس بھی اسی طرح ایک دوسرے سے متضاد ہیں جن میں باہمی کشش بھی پائی جاتی ہے اور گریز بھی۔ انسان کی نشوونما کے لیے ان کا مسلسل باہمی تعامل بھی لازمی ہے۔

Marfat.com

وحدت کا اصول:

THE LAW OF UNIFICATION

اللہ کے دو رُخ:

Allah the Bi-Polar

اللہ کی صفاتِ عالیہ کی طرف پلٹتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ الظاہر اور الباطن، یعنی عالمِ شہادت اور عالمِ غیب اللہ کی جوڑے دار صفات میں سے ایک جوڑا ہیں۔ ان قطبین میں سے ایک طرف نفی ہے اور دوسری طرف اثبات۔ ایک منفی دوسرا مثبت۔ یہی وہ قطبین ہیں جہاں کشش اور گریز کی قوتیں پوری طرح متوازن ہوتی ہیں۔ الظاھر یا عالمِ شہادت اللہ کی تخلیقی قوت کا اظہار ہے جو عیاں اور نمودار ہے۔ یہ وہ سرا ہے جو دور بھاگتا ہے۔ جب کہ الباطن یا عالمِ غیب اللہ کا اندرونی، غیر مرئی حصہ ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یوں دو مساوی قوتیں، ایک وہ جو دائرے کے محیط کی طرف دھکیلتی ہے اور دوسری وہ جو مرکز کی جانب کھینچتی ہے، ایک متحرک نقطۂ توازن پر مکمل طور پر متوازن ہو جاتی ہیں۔ اس لیے پہلا کلمہ، یعنی ''نہیں کوئی خدا'' (منفی) ''مگر اللہ'' (مثبت) سب سے اساسی اصول قرار پاتا ہے جس کے مطابق اللہ اپنی تمام تر مخلوقات کو اپنے قلبِ ذات، اپنے مرکز میں تھامے ہوئے ہے اور ہر شے ایک متحرک توازن میں ہے۔ مخلوقات اس دائرے کے محیط میں گرتی رہتی ہیں اور مرکز انھیں اپنے اندر کی طرف کھینچتا رہتا ہے۔ یوں اللہ کی دو صفات اس توازن کو قائم رکھتی ہیں اور مخلوقات نہ تو دائرے سے باہر نکلتی ہیں اور نہ اس کے مرکز میں مدغم ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک صفت ہے **المبدی** یعنی ابتدا کرنے والا، متحرک کرنے والا اور دوسری صفت ہے **المعید** یعنی وہ جو واپس لاتا ہے، لوٹاتا ہے اور حرکت میں توازن قائم رکھتا ہے۔ کائنات میں یہ دونوں قوتیں بالکل متوازن ہیں اور یہی کل کائنات کا سائنسی نظریہ ہے۔

قونیہ میں عظیم صوفی رومیؔ کے مزار کے صدر دروازے پر لکھا ہے:

باز آ ، باز آ، ہر کہ ہستی، باز آ
کافر و گر بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

Marfat.com

لوٹ آ، لوٹ آ، تو جو کوئی بھی ہے لوٹ آ
چاہے کافر ہے یا بت پرست، لوٹ آ
ہماری یہ درگاہ، مایوسی کا مقام نہیں
اگر تو سو بار بھی توبہ توڑ چکا ہے تو بھی لوٹ آ

خالق ومخلوق اللہ کے دو روپ ہیں جو ایک دوسرے میں گندھے ہوئے ہیں۔ایک ارتقا پذیر ہے، دوسرا ساکن وقائم ہے۔ایک المبدی یعنی ابتدا کرنے والی قوت کے زور سے چھلکتا اور باہر کی طرف دھکیلتا ہے، دوسرا المعید یعنی روک لینے، تھام رکھنے کی اتنی ہی قوت کے باعث حرکت سے روکتا اور قیام پر آمادہ کرتا ہے۔ کشش اور گریز کی قوتیں ایک دوسرے کے مساوی ہیں اور یوں ہی ہمیشہ برسرکار رہتی ہیں۔المبدی اور المعید کی ان دونوں مساوی قوتوں کا باہمی تعامل ایک ابدی اور جاری وساری گردشی حرکت پیدا کرتا ہے جو ایک غیر مرئی، مستقل مرکز کے اردگرد تخلیق کے لامحدود امکانات، راستے اور ذریعے روشن کرتی رہتی ہے اور یہ غیر مرئی مستقل اور قائم ودائم مرکز اس گردشی حرکت کو ایک متحرک توازن عطا کرتا رہتا ہے۔اسی لیے ہر چیز حرکت، ترقی اور توازن کی متلاشی رہتی ہے۔

انسان کے عروج کے لیے ارتقا کا زینہ:
Evolutionary Ladder for the Ascent of Man.

الظاہر (ظاہری حقیقت) اور الباطن (مجرد حقیقت) وحدت کے دو پہلو ہیں اور چوں کہ یہ دونوں پہلو ہمیشہ ایک دوسرے سے مل کر ایک درجہ وار تسلسل کے ذریعے مساوی طور پر بروے کار آتے ہیں، اس لیے یہ بنیادی اصول انسان کو عروج کی طرف جانے کا ایک راستہ، ایک تدریجی زینہ فراہم کرتا ہے۔

یوں زندگی کے ارتقا کی چال دھیمی رہتی ہے؛ آہستہ آہستہ تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے، کایا پلٹ ہوتی رہتی ہے۔اسی طرح ایک باعمل صوفی نفی اور اثبات کے ورد سے ناقابلِ ادراک ترقی اور تبدیلی سے گزرتا ہے۔دو پہلوؤں کا یہ باہمی تعامل ہی اصولِ ترقی (principle of development) ہے جو آفاقی طور پر لاگو ہوتا ہے۔یہی حال ہمارے فلسفے کا ہے جس کی ترقی کا راز تجربیت اور منطقیت، مادیت اور مثالیت کے ماننے والوں کے درمیان نامختتم مباحث میں پنہاں ہے۔سائنس نے بھی اسی طرح ہنر مندی اور مجرد نظریے کے

Marfat.com

درمیان کشمکش کی مدد سے ترقی کا سفر طے کیا ہے۔ مذہب، عقیدے اور عمل کے باہمی کھنچاؤ سے اور انسانی ذہن فرد اور معاشرے کے ٹکراؤ سے ارتقائی مراحل طے کرتا رہا ہے۔ یہی حال صوفی کا ہے جس کا روحانی ارتقا ہجر اور وصال، فنا اور بقا، قبض اور بسط کی کشمکش پر منحصر ہے۔ صوفی اپنی ذات کی نفی کرتا ہے تاکہ ذاتِ خداوندی میں اس کا اثبات کر سکے۔ نفی (فرد کی ذات) اور اثبات (ذاتِ خداوندی) کی یہ کشمکش صوفی کو ایک ایسا زینہ فراہم کرتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے شعور کے ارتقا کا سامان کرتا ہے؛ یہاں تک کہ آخر کار وہ خدائی شعور تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

انسان کے سیکھنے اور ترقی کرنے کے عمل میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ہر طرح کی ترقی ضدین کے درمیان جاری وساری کشمکش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور سگمنڈ فرائیڈ کے پیش کردہ مشہور و معروف ایڈی پس کمپلیکس ہی کو لیجیے۔ نوخیز بچہ ماں کی محبت اور احساسِ ملکیت اور باپ سے رقابت اور حریفانہ کشمکش کے باہمی تعامل سے نشوونما حاصل کرتا ہے۔ بچے کی صحت مندانہ نشوونما کا دارومدار ہی ضدین، یعنی ماں اور باپ، احساسِ آزادی اور حاکمانہ تسلط، محبت اور نفرت، چشم پوشی اور پابندی کے باہمی تعامل پر ہے۔ Pavlov کے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ یہ ہے کہ سیکھنے کا عمل جزا (النافع) اور سزا (الضار) کے باہمی تعامل کا نتیجہ ہے جو اللہ کی دو متضاد صفات ہیں۔ انسان کی تمام تر آموزش اور معاشرت، سماج میں قبولیت اور ممانعت، عزت افزائی اور سرزنش کا نتیجہ ہے۔ سب سے خاص بات یہ ہے کہ سگمنڈ فرائیڈ جیسا شخص، جسے عام طور پر غلط فہمی کی بنا پر جنس اور لذت کا داعی سمجھا جاتا ہے، بطور ماہرِ تحلیلِ نفسی اپنی نامور پیشہ ورانہ زندگی کے اختتام پر اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ اصولِ لذت یا مسرت سے بالاتر اصولِ کرب واذیت بھی ہے جو انسانی ذہن کی نشوونما میں مساوی اہمیت کا حامل کردار ادا کرتا ہے۔ انسانی زندگی مسرت، حیات اور تعمیر (Eros) کے درد و کرب، موت اور تخریب (Thanatos) سے ربطِ باہم کا نام ہے۔ گویا زندگی، اللہ کی دو صفات المحی (حیات) اور الممیت (موت) کے باہمی تعامل سے تشکیل پاتی ہے۔ فرائیڈ کے مشاہدات نے اسے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کر دیا تھا کہ انسان کے اکثر تعمیری اقدامات بیک وقت تخریبی بھی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر گھر بنانے کے لیے زمین کھودنی پڑتی ہے، درخت کاٹنے پڑتے ہیں اور یوں تعمیر و تخریب کی قوتیں بیک وقت روبہ عمل ہوتی ہیں۔

Marfat.com

حرکی وحدت کے انتہائی سرے:
Poles of Dynamic Unity

الظّاھر (ظاہری حقیقت) اور الباطن (ماورائی حقیقت)، جو بظاہر ایک دوسرے سے متضاد صفات دکھائی دیتی ہیں، دراصل حقیقتِ واحدہ کے دو لازمی پہلو ہیں۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو انتہائی سرے ہیں (continuum) جو ایک دوسرے سے تعامل کرتے ہیں۔ یہ دونوں جدا جدا انتہائیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ڈور کے سرے ہیں۔ ایک زندہ وحدت کے دو کنارے جو ایک دوسرے سے مل کر کام کرتے ہیں۔ بے شک ان دونوں کناروں کے درمیان لاتعداد وسطی مقام ہیں، بے شمار درجے ہیں، منزلیں ہیں، مراحل ہیں، سطحیں ہیں، پڑاؤ ہیں۔ ان مقامات و منازل، درجات و مراحل کے درمیان مسلسل حرکت اور تعامل جاری رہتا ہے جس کے نتیجے میں ایک حیران کن تنوع (diversity) اور پیچیدگی (complexity) جنم لیتی ہے۔ یہ سادہ سا اصول چیزوں کی قلب ماہیت کا، تخلیق اور جدت کا، خیالات اور ضمیر کی حالتوں کا صعود کرتا ہوا، بلند تر ہوتا ہوا حیرت انگیز اور چکرا دینے والا تنوع پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔

اللہ کا پہلا اصول، کائنات کا بنیادی قانون بھی ہے۔ یہ صرف قانونِ الٰہی ہی نہیں، قانونِ فطرت بھی ہے۔ یہ اصولِ وحدت ہے جس کا اطلاق آفاقی ہے؛ ایٹم سے لے کر نظامِ شمسی تک اور واحد زندہ خلیے سے لے کر انسانی ضمیر تک ہر ایک شے پر۔ کائنات کا ارتقا (ظاہر)، پھر واحد زندہ خلیے کی پیدائش، زندگی کا حیران کن تنوع اور رنگا رنگی اور آخر کار انسان کا ظہور (حالتِ وسط)، پھر انسانی شعور کی مسلسل جاری رہنے والی ترقی (باطن)، غرض حقیقت ایک ارتقائی گردش کا نام ہے جس کے کئی مدارج ہیں اور ہر درجے میں وہی بنیادی اصول کارفرما ہے جسے ایک صاحبِ نظر شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

زندگی کیا ہے، اک طواف ہے بس!

Marfat.com

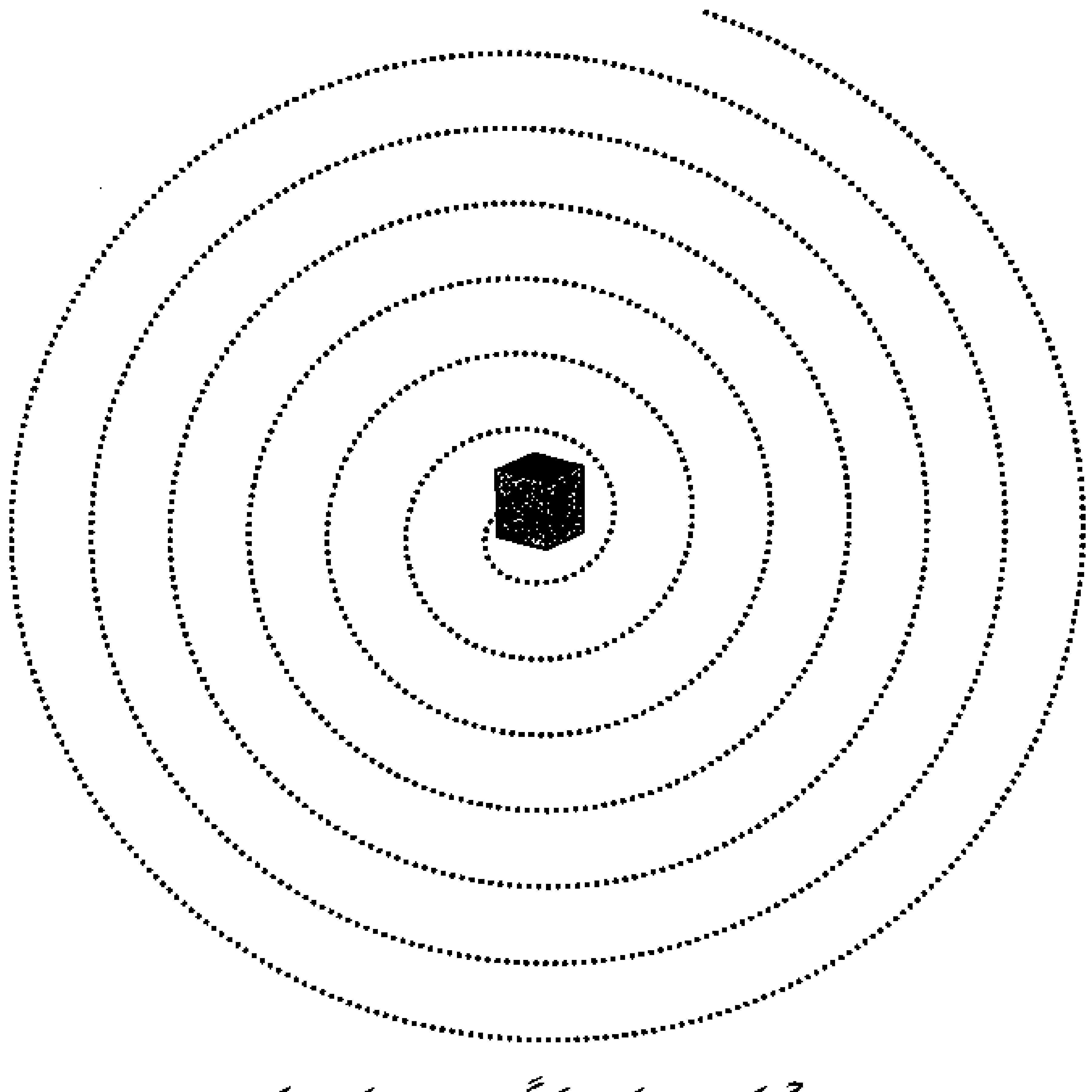

اسلامی حج کے دوران کعبہ کے گرد طواف کا ایک خاکہ
see google images for spiral and kundli

ہستی اور تکوین:
Being and Becomming

یوں ''ہستی Being'' اور ''تکوین Becomming'' وحدت میں کھو کر مکمل توازن کی حالت میں آ جاتے ہیں اور ان کا مساوی عمل ''پورے سچ'' کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی سے واضح ہوتا ہے کہ فلسفے اور سائنس کے مباحث میں عقلیت پسندی اور عقیدہ پرستی دونوں مساوی لیکن ایک دوسرے کے برعکس قوتیں ہیں اور اسی لیے ان کے درمیان یہ مباحث نا تمام اور بے نتیجہ رہتے ہیں اور ان کا انجام یا تو ایک تضاد کی صورت میں سامنے آتا ہے اور یا ان دونوں قوتوں کی مساوی حیثیت کو تسلیم کرنے کی صورت میں۔ (اس کتاب کا چوتھا باب ملاحظہ کیجیے)۔ اس کی مثال آپ کو فلسفے اور سائنس میں داخلی اور خارجی پہلوؤں کے تعامل سے مل جائے گی۔ کیا حقیقت خارجی ہے ؟ یا پھر داخلی ہے؟ خارجی شے دیکھنے والی آنکھ سے الگ اور آزاد ہوتی ہے لیکن اس شے کا فہم وادراک تو سراسر داخلی عمل ہے۔ یہی حقیقت کا تضاد ہے جو ہر شے پر محیط ہے۔ یہی تضاد ہمارے فلسفے، نفسیات، آرٹ اور سائنس پر بھی چھایا ہوا ہے۔ واضح جواب کہیں نہیں ملتا۔ داخل اور خارج ایک دوسرے میں یوں گتھے ہوئے ہیں کہ انھیں

Marfat.com

جدا جدا نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت نہ تو داخلی ہے اور نہ خارجی۔ یہ تو داخل و خارج کے باہمی ربط و تعامل کا نام ہے۔ نفسیات میں روشاک ٹسٹ (Rorschach Test) اس بات کا بیّن ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ انسان کیسے خارجی حقیقت کے حوالے سے خود اپنا اظہار کرتا ہے۔ ہر خارجی حقیقت، داخل ہی میں سمجھی اور جانی بوجھی جاتی ہے اور سائنسی تحقیق و تفتیش بھی اس اصول سے بالاتر نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی کے باوجود سائنس انسان کے داخلی حوالے سے بے نیاز اور لاتعلق نہیں قرار دی جاسکتی کیوں کہ آخر کار سائنس بھی تو انسانی تلاش ہی کا نام ہے۔ حسی تجربے (Sensory Experience) کو لیجیے، اس تجربے کے دوران خارج میں موجود شے مستقل اور غیر جانب دار ہوتی ہے جسے پیچیدگی کے ایک درجہ وار تسلسل پر ناپا یا پرکھا جاتا ہے؛ لیکن حسّی تجربے کے متعلق جو نظریات وضع کیے جاتے ہیں یا جو مشاہدات کیے جاتے ہیں، وہ بھی انسانی تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں اور اسی لیے تغیر پذیر بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ خارج اور داخل دونوں مل کر حقیقت کی تعبیر کرتے ہیں لیکن اس تعبیر کا بنیادی حوالہ ہمیشہ انسان ہی بنتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو ''حقیقت'' خود ایک مستقل بالذات خارجی شے کے طور پر موجود ہے۔۔۔ صرف ایک شے کے طور پر نہیں؛ حقیقت ہر شے ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ دوسری طرف حقیقت کا انسانی فہم ہے جو انسان کے ارتقائی شعور کے زینے پر کسی ایک مخصوص مقام سے متعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف نظریات رکھنے والے سائنس دان مختلف ٹھوس تجرباتی تعبیروں اور مفاہیم پر یقین رکھتے ہیں اور ان کے باہمی نظریاتی اختلافات اور مباحث کبھی ختم نہیں ہوتے۔ لیکن اس سارے قضیے کی سادہ ترین توجیہہ یہی ہے کہ یہ اختلافات، ان کی تعبیر و تفہیم کی نیرنگی اور ان کا باہمی تعامل دراصل توازن قائم رکھنے کے لیے ہے۔ ان میں سے کوئی بھی غلط نہیں لیکن مکمل سچ بھی کوئی نہیں۔ مکمل سچ تو ضدین کو ایک وحدت میں سمو دینے سے ہی حاصل ہوسکتا ہے، جب متضاد نظر آنے والے نکات کا کامل امتزاج پیدا ہو جاتا ہے اور ہر شے میں یک رنگی دکھائی دینے لگتی ہے۔ گویا ہستی اور تکوین، حقیقت اور اس کے بارے میں انسان کا ارتقا پذیر فہم و ادراک، ایک ہی سلکِ وحدت میں پروئے ہوئے ہیں۔

چت یا پٹ، اوپر یا نیچے!
Head or Tail, UP or DOWN.

صرف اللہ ہی ہے جو واحد اور کامل حقیقت ہے۔ اللہ کی نوع بہ نوع مخلوقات ایک ہی حقیقت کے مختلف

Marfat.com

مدارج ہیں۔ حقیقت خود مخفی ہے (باطن، اسم ذات) اور اس کے مظاہر عیاں ہیں (ظاہر، اسمائے صفات)۔ پس حواس کی یہ ظاہری دنیا دراصل اللہ کی متنوع صفات کی شہادت ہے، اس کی ماہیت اور خصوصیات کی مظہر ہے۔ یہ نیرنگی، یہ تنوع، صرف اللہ ہی کے ہونے سے ہے اور اس کے بغیر کسی شے کا کوئی وجود نہیں۔ لیکن ان میں سے کسی بھی شے کو اللہ نہیں کہا جا سکتا، نہ اللہ کے مساوی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ عالم شہادت ایک تجربہ گاہ ہے اور اللہ وہ خیال، وہ نظریہ ہے جس کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ یہی بات تمام مذاہب سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسانوں کو شعور کے وسطی ارتقائی درجے میں رکھا گیا ہے۔ اس لیے حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے انسان ہمیشہ دو نقطۂ نظر قائم کرنے پر مجبور ہے۔ بلندی کی سمت کا نقطۂ نظر (باطنی، ماورائی) اور پستی کی سمت کا نقطۂ نظر (ظاہری، ٹھوس)۔ تو پھر اس بات پر کیا تعجب، کہ سکّے کی طرح حقیقت کے بھی دو رُخ ہیں، ایک چِت (head) اور دوسرا پٹ (tail)۔

یہ خیال کہ ہر چیز مادے (matter) کی ارتقائی شکل ہے، اس کائنات اور مخلوقات پر بالکل صادق آتا ہے۔ مادے کا ارتقا، زندگی کی مختلف صورتیں، ذہن کی نمود اور بالآخر انسانی شعور کی بیداری، حقیقت کا پٹ ہے، پستی کی سمت کا نقطۂ نظر۔ یہ نقطۂ نظر درست تو ہے مگر ہے اصل کی الٹ؛ اس کے برعکس۔ اب اس کے متوازی دوسرا، بلندی کی سمت کا نقطۂ نظر کیا ہوگا جو سچائی کی تصویر مکمل کر دے؟ انسانی بصیرت کے ادھورے پن کو دور کرنے کے لیے دوسری سمت میں یعنی بلندی کی طرف، سکّے کی چِت دیکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ بتاتا ہے کہ تمام تر حقیقت ایک عظیم ترین شعور کے درجہ وار اظہار پر مشتمل ہے۔ یہ ایک عظیم ترین ذہن کی تخلیق ہے۔ یوں تخلیق اور ارتقا دونوں ایک وحدت کے اجزا ہیں۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ اب آپ جیسے چاہیں، حقیقت کو دیکھیں؛ آپ کی مرضی! اصل سمت میں یا اصل کی الٹ سمت میں۔ محدب شیشہ دوسری طرف سے مقعر ہوتا ہے۔ سائنس کی بیشتر غلطیوں کا سبب یہی ہے کہ دو حقیقتوں کو ایک دوسرے سے متضاد سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

معلول ہی علت ہے:
Effect is Cause

یہ استخراجی دعویٰ کوئی دور کی کوڑی نہیں ہے۔ اسے سمجھنا بہت ہی آسان ہے۔ خود ارتقا کے عمل کو بھی دو طرح

Marfat.com

سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم کہیں کہ مادہ ارتقا کے ذریعے شعور میں تبدیل ہو گیا اور اس کے برعکس دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ شعور نے زندگی کے نچلے مدارج میں ظہور کیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ارتقا کو انسان کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کو ارتقا کی مدد سے جاننے کی سعی کی جائے۔ جیسا کہ سر آرتھر جے تھامسن (Sir Arthur J. Thomson) نے اپنی کتاب Outlines of Biology (۱۹۳۱) میں لکھا ہے کہ اگرچہ ہم سب کو چاہیے کہ انسان کو نظریہ ارتقا کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں لیکن اس سے بھی مشکل کام یہ ہے کہ ہم ارتقا کو انسان کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ سائنس اسباب و علل یعنی سبب اور نتیجے پر یقین رکھتی ہے اور یہ حقیقت کا ادراک کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ نتیجہ ہی سبب ہے اور یہ حقیقت کو دیکھنے کا ایک اور زاویہ ہے جو اتنا ہی کار آمد ہے۔ بیج میں درخت کا پورا نقشہ چھپا ہوتا ہے۔ یہ بلندی کی سمت کا نقطۂ نظر ہے۔ معلول ہی علت ہے؛ یہ انتہائی سادہ سا مشاہدہ ہے جو انسان کی بیشتر چکرا دینے والی الجھنوں کو حل کر دیتا ہے اور پہلے مرغی یا انڈہ کی پہیلی کا جواب بھی فراہم کرتا ہے جو سائنس اور فلسفے کے بنیادی اور لاینحل مسائل کی بند گلی کے مترادف ہے۔ ڈارون کے نظریے کو اس زاویے سے دیکھیں تو یہ نظر آتا ہے کہ انسان زندگی اور مادے کی ادنیٰ صورتوں میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ یعنی ارتقا کے مختلف مدارج اور ادوار میں، ہر چیز، ہر حقیقت انسان ہی کی ادنیٰ، نچلی سطحوں کا مظہر رہی ہے۔ حقیقت انھی ادوار کے تسلسل کا نام ہے۔ ایک انسان کی حیثیت سے پہلے میں بن مانس تھا، بندر تھا، مچھلی بھی رہا، امیبا بھی، اور ان سب عناصر کا ایٹم بھی جو بعد میں مادے کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوئے۔ گویا میں ہی پوری کائنات تھا۔ کئی مذاہب مثلاً بدھ مت اور ہندو مت اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن ان صحیفوں کو ابھی پوری طرح سمجھا نہیں جا سکا۔ ہندو ابھی بھی یقین رکھتے ہیں کہ وہ اگلے جنم میں بندر، کتے یا بلی کے روپ میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہندو دیوتا وشنو کی تصویر میں اسے چار ہاتھوں والے دیوتا کی صورت دی گئی ہے؛ اوپر والا دایاں ہاتھ ایک چکر اتھامے ہوئے ہے جو رفتار اور توازن کو ظاہر کرتا ہے اور ذہن کی علامت ہے، جب کہ اوپر والے بائیں ہاتھ میں ایک سنکھ ہے جو تخلیق اور تمام عناصر کے ارتقا کی علامت ہے۔ یہ خدا کے بارے میں قدیم انسان کا وجدانی تصور ہے جو کچھ پہلوؤں سے: خاص طور پر روحانی اعتبار سے ہم جدید انسانوں کے تصور سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ مادی حیات اور اس کے مظاہر کے بارے میں قدیم انسان کا علم اور آگاہی چارلس ڈارون کے برابر نہیں تھی، اس لیے وہ حقیقت کو صرف شاندار کہانیوں، دیو مالائی علامتوں اور رسموں کے ذریعے ہی سمجھ سکتا تھا۔ یہ وقت تو اب آیا ہے کہ انسان مذہبی سچائی

Marfat.com

پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لے آنے کی بجائے اسے عقل کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرے۔ چارلس ڈارون نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان ایک ایسی حقیقت ہے جو ہزاروں سالوں سے درجہ وار ظاہر ہو رہی ہے۔ انسان کی تخلیق ایک تسلسل کا نام ہے۔ اللہ کا عمل تخلیق بھی ایک تسلسل ہے جو مسلسل جاری ہے (reality is graded)۔ یہ بلندی کی سمت بڑھتے ہوئے ادوار کا تسلسل ہے۔ یہ ڈارون ہی تھا جس نے دریافت کیا کہ تمام جان دار اشیا ایک ہی وحدت کے اجزا ہیں، ایک ہی نغمے کے مختلف سر ہیں۔ اس نغمے کو نیوٹن نے اجسامِ فلکی کی حرکت میں دریافت کیا اور ڈارون نے ارتقا کے مختلف ادوار میں۔ یعنی یہ کہ حیات کے تمام تر مظاہر، اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف، منفرد اور غیر مماثل ہیں لیکن یہ انسان ہی کے وجود کی نچلی سطحوں کے مظاہر ہیں اور انسان ہی ہے جو ارتقا کا نقطۂ عروج یا اگر دوسری طرف سے دیکھیں تو تخلیق کی معراج ہے۔ اب آپ جو نقطۂ نظر چاہیں، اپنا لیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ زندگی ایک وحدت ہے، ایک جاری و ساری ہم آہنگی ہے، جس میں ہر چیز ایک درجہ وار پیمانے کے کسی نہ کسی مقام پر موجود ہے اور ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ پھر یہ بھی کہ بنی نوع انسان ایک وسیع تر کینوس کا حصہ ہے۔ اگرچہ ہیئت سے لے کر اوصاف تک ارتقا کا ہر درجہ اپنی ایک منفرد شناخت کا حامل ہے، لیکن اس کے باوجود، ایٹم، بن مانس اور انسان میں کچھ ایسی حیرت انگیز یکسانیت بھی پائی جاتی ہے جو کلیدی نوعیت کی ہے۔ کل حیات انسان ہی کے جاری و ساری وجود کا درجہ بہ درجہ اظہار کرتی ہے۔ یہ درجہ بندی، یہ صورتوں کی آہستہ رو مگر مسلسل، درجہ وار کایا پلٹ (gradual transformation)، یہ مختلف مراحل کا یکے بعد دیگرے نمودار ہونا تمام مخلوقات کی مشترک صفت ہے۔

جب بھی کوئی کسی خیال کو ایک شکل دینا چاہتا ہے؛ خواہ دست کاری ہو، مصوری ہو، فنِ تعمیر ہو، ٹیکنالوجی کی ایجادات ہوں، کوئی کتاب ہو یا پراجیکٹ ہو، کام ہمیشہ مرحلہ وار ہی آگے بڑھتا ہے۔ خدا کا تخلیقی عمل بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ نہ زبردستی کوئی تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے، نہ اچانک اور فوراً کسی کام کو مکمل کیا جا سکتا ہے اور نہ ایک دم کوئی مکمل نقش تراشا جا سکتا ہے۔ تخلیق کا یہ تجربہ ہماری روزمرہ زندگی میں رچا بسا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی فنون کو انسانی معاشروں میں بہت عزت و وقار حاصل ہے کیوں کہ تخلیقی فن کار ایک الوہی عمل کی عکاسی کرتا ہے۔ تخلیقی فن کار خدا کی تخلیق کی شہادت دیتا ہے۔ اللہ جو سب سے زیادہ طاقت ور اور صاحبِ اختیار ہے، اپنی تخلیق یعنی انسان پر زبردستی کوئی تبدیلی یا حکم لاگو نہیں کرتا کیوں کہ وہ مہربان، بامروّت اور محبتی ہے۔ تاہم جن تبدیلیوں کی خواہش کی جاتی ہے اللہ انھیں آہستہ آہستہ، جہاں تک ممکن ہو، بغیر کسی زور اور زبردستی کے، پورا کر دیتا

Marfat.com

ہے۔ڈاکٹر یا طبی ماہر مرحلہ وار دوا دینے کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ صحت کا دارومدار دوا کی مخصوص درجہ بندی پر ہے۔زیادہ طاقت کی خام دوائیں جلد شفایابی کا باعث نہیں بنتیں بلکہ اس کے برعکس ناقابلِ تلافی نقصان کا سبب بن جاتی ہیں۔آمرانہ طرزِ حکومت بھی اسی لیے ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے کیوں کہ وہ اپنے عوام پر زبردستی اصلاحات ونظریات نافذ کرتا ہے۔

اب کیا یہ اندازہ لگانا بہت دشوار ہے کہ حیات کی تمام تر صورتیں، تمام مخلوقات اور معراجِ ارتقا یعنی انسان، اللہ کی ذات کے درجہ بہ درجہ مظاہر ہیں۔فرق محض مدارج کا ہے ورنہ کم یا زیادہ، سادہ یا پیچیدہ، ادنیٰ ترین سے لے کر اعلاترین تک، سب ایک ہی حقیقت کے مختلف درجے ہیں جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بھی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی علیحدہ انفرادی شناخت بھی قائم رکھے ہوئے ہیں۔اس عظیم وحدت سے باہر کوئی شے موجود ہے، نہ موجود رہ سکتی ہے۔

سورج جو ہماری کائنات کا مرکز ہے، اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے۔جس طرح سورج کے بغیر زندگی قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح اللہ کی عظیم ذات سے باہر نہ کوئی شے وجود رکھتی ہے، نہ رکھ سکتی ہے۔پوری زندگی ایک ایسی مکمل اور ہم آہنگ تصویر کی مانند ہے جس کا ہر جزو اپنی ایک منفرد صورت، شناخت اور صفات رکھتا ہے اور یوں اپنے خالق کی صفات کا اظہار کرتا ہے جو الاحد بھی ہے اور الواحد بھی۔ہر انسان اللہ کی احدیت اور انفرادیت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔جس طرح میرا ایک منفرد چہرہ ہے، میری انگلیوں کی پوروں میں میری شناخت کے مخصوص نشان ہیں، میرا جسم، میرا ڈی۔این۔اے۔، میرا طرزِ عمل، میری شخصیت، ہر چیز منفرد اور سب سے الگ ہے۔اسی طرح اللہ بھی سب سے جدا، سب سے منفرد (الواحد) ہے اور اکیلا یعنی ایک (الاحد) ہے۔اگرچہ ہر چیز اللہ ہی کی ذات کا جزو ہے لیکن کوئی بھی اللہ جیسی نہیں ہے۔ہر شے اس کی اعلاترین ذات کا اظہار ہے۔بالکل اسی طرح جس طرح ارتقا کے سفر میں مختلف صورتوں، ہیئتوں، ساختوں اور مظاہر کا جمِ غفیر دراصل بنی نوع انسان ہی کی نچلی سطحوں کا اظہار ہوتا ہے۔

الٹا عکس:
Inverted Image

یہ حقیقت کو دیکھنے کا درست طریقہ ہے یعنی اوپر سے دیکھنے کا زاویہ نظر (upside view)۔ڈارون کا

Marfat.com

ارتقا دراصل اسی طریقے کا الٹ ہے۔ انسان میں پیدائشی طور پر اس امر کی حیرت انگیز صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ چیزوں کو نیچے سے دیکھے (downside view) کیوں کہ وہ خود خدا کا الٹا عکس ہے۔ اگر آپ کلچرل انتھروپالوجی کی کسی نصابی کتاب پر ایک سرسری سی نظر بھی ڈالیں تو دیکھیں گے کہ اس میں کلچر کے ایک پہلو کے طور پر معاشرتی تنظیموں کے درجہ بندی کی گئی ہے اور اس درجہ بندی کی صورت یہ ہے کہ پہلے نمبر پر سماجی تنظیم، پھر اقتصادی پہلو، پھر سیاسی تنظیم اور آخر میں خیالات ونظریات اور عقائد ورسومات کی سمت بندی۔ یہ حقیقت کے الٹے عکس کی بہترین مثال ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سماجی ڈھانچے کی تشکیل دراصل انسان کے خیالات ونظریات اور عقائد ورسومات کی بنیاد پر ہی ہوتی ہے۔ جب ۱۹۶۷ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے میں پراگ جیسے خوب صورت شہر میں پہنچا جو ایک کمیونسٹ مطلق العنان حکومت کے زیر انتظام تھا، تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہاں دکانوں کے نام نہیں، صرف نمبر ہوتے تھے۔ یہ اس بات کی عکاسی ہے کہ خیالات ونظریات کس حد تک سماجی ڈھانچے کو متاثر کرتے ہیں۔ ہماری تمام تر سائنسی کتابیں اگرچہ سچ ہیں مگر یہ سچ بھی اسی طرح الٹے عکس کی مانند ہے۔

حضرت سلیمان کی عظیم الشان علامت

درج بالا تصویر کبالہ یہودیوں کی قدیم تعلیمات کا حصہ ہے

The Grand Symbol of Solomon. Revesible figure portraying Reality
The above figure is part of the ancient teachings of the Cabbala of Jews.

خدا کا شعور:
God Consciousness

انسان کا بڑھتا ہوا شعور، مسلسل اوپر کی سمت حرکت کرتا ہوا ایک تسلسل ہے جس کا رُخ خدا شعوری کی جانب

Marfat.com

ہے اور یہ اس ذاتِ مطلق (Supreme Self) کا اظہار ہے۔ یہ ہے انسان کے روز افزوں عرفانِ ذات اور خود آگہی کی کہانی۔ ہر چیز خود اپنی ہی ذات کی دریافت اور اس کی عمل پذیری میں محو ہے مگر یہ عمل مرحلہ وار ہے۔ شعورِ ذات (self) سے شعورِ ذات مطلق (SELF) تک ایک ہی تسلسل قائم ہے۔

یہ مرحلہ بندی اس گری پڑی انسانیت کو دوبارہ عروج تک جانے کا ایک آسان رستہ اور زینہ فراہم کرتی ہے۔ ارتقائی مظاہر میں یہ فرق صرف درجے کا ہے۔ ارتقا کی یہ گردشی حرکت مسلسل ذہن، شعور اور روح کی مجرد اقلیم کی طرف محوِ پرواز رہتی ہے۔ اس جہد البقا میں صرف بہترین صورتیں ہی برقرار رہ سکتی ہیں اور ابھی تک انسان ہی ہے جو بہترین صورت کا حامل ہے۔ یہی انسان کا مقصدِ حیات ہے جس سے روگردانی کرنا ناممکن ہے۔ اس ناگزیر ارتقائی گردشی اڑان میں انسان کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ خود اپنی ذات کو عملی اور حقیقی جامہ پہنائے؛ اس کے لیے سب سے زیادہ فائدہ بخش شے وہی ہے جو اس کی ''ذات'' کو فائدہ پہنچائے، اور اس کی بنیادی جبلت جو اس کے طرزِ عمل کا محرک بنتی ہے، یہی ہے کہ وہ بقائے ذات کا آرزو مند رہتا ہے۔ ارتقا زندگی (المحی) اور موت (الممیت) کے درمیان ایک جدو جہد کا نام ہے جس میں صرف بہترین صورت ہی باقی رہ سکتی ہے اور اس کے سوا ہر شے فنا ہو جاتی ہے (survival of the fittest)۔ گویا باقی صرف وہ رہ جاتا ہے جو خود کو حقیقتِ مطلق کے رُخ پر موڑ لیتا ہے، ڈھال لیتا ہے، اور اس سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ یہی فطرت کا عظیم قانون ہے جو لافانی ہے؛ اس کے سوا ہر شے زوال اور فنا کے بحرِ بے کنار میں غرق ہو جائے گی۔ زندگی اور موت کا یہ چکر چلتا رہتا ہے اور قانونِ فطرت سے مطابقت (ADAPTATION) اور موافقت (adjustment) پیدا کرنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ اس قانون کے مطابق صرف بہترین صورت ہی باقی رہتی ہے (only the fittest survives)۔ یہ چکر انسان کو بار بار خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے اور مطابقت پیدا کرنے ورنہ فنا کے لیے تیار ہو جانے پر آمادہ کرتا ہے مگر اس معاملے میں اللہ کی طرف سے کوئی جبر نہیں ہوتا۔ اگر انسان خود اپنی مرضی اور اختیار سے ایسا نہیں کرتا تو حالات کبھی اسے ایسا کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتے۔ زندگی کے اس چکر میں ہمیں صرف اتنا ہی اختیار حاصل ہے۔

ہم ساڑھے چار ارب سال کے حادثاتی اور سست رفتار حیاتیاتی ارتقا کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا یہ سوچنے کا تو کوئی جواز ہی نہیں کہ ارتقا کا عمل رک گیا ہے۔ یہ انسان ایک عبوری (transitional) عہد کا جانور ہے۔ وہ تخلیق کی

Marfat.com

معراج نہیں ہے۔

کئی صاحبِ نظر قائدین نے ایک ایسے عہد کا تخیل قائم کیا ہے جب کوئی بھی فرد، کوئی بھی انسان اپنی مخصوص قومی سلطنت، مذہب، نسل یا معاشی گروہ سے وابستہ نہیں ہوگا بلکہ اس کی وابستگی مجموعی طور پر بنی نوع انسان سے ہوگی۔ جب کسی دور دراز بسنے والے، کسی اور نسل، جنس، مذہب یا سیاسی نظریے سے وابستہ رہنے والے فرد کا مفاد بھی ہمیں اتنا ہی عزیز ہوگا جتنا اپنے ساتھ رہنے والے، اپنے ہمسائے اور اپنے بھائی کا۔ زمانے کا رجحان اگرچہ اسی سمت میں ہے مگر اس کی رفتار اذیت ناک حد تک سست ہے۔ ہمارے سامنے ایک گمبھیر مسئلہ یہ ہے کہ کیا مکمل تباہی سے پہلے پہلے انسان کے لیے اپنی ایسی عالمگیر شناخت قائم کرنا ممکن ہے؟ حالاں کہ ہم نے خود اپنی ذہانت کے ہاتھوں ٹیکنالوجی کی قوت کو بے لگام چھوڑ رکھا ہے۔

''حیات کے ارتقائی سفر میں ایسی لاتعداد مثالیں ملتی ہیں جب کوئی ایک ذی روح دوسروں کے مقابلے میں واضح طور پر غالب، خاص اور ماحولیاتی تقاضوں کے عین مطابق نظر آتا ہے لیکن ماحول بدل جاتا ہے اور وہ ذی روح موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت تبدیلی کی خواہاں ہے۔ ان تبدیلیوں کی اکثریت تباہ کن اور ہلاکت آفرین ہوتی ہے۔ یہ تبدیل شدہ انواع، معمول کی انواع کے مقابلے میں کم مطابقت پیدا کرنے والی ہوتی ہیں۔ لیکن ہزار میں سے ایک یا بعض اوقات دس ہزار میں سے ایک تغیر یافتہ نوع ایسی بھی ہوتی ہے جو اپنے ماں باپ پر کچھ فوقیت رکھتی ہے۔ یہ تغیرات نسل در نسل آگے بڑھتے ہیں اور تغیر یافتہ ذی روح قدرے زیادہ مطابقت اختیار کرتی رہتی ہے۔ مجھے لگتا ہے ہمیں بھی ایسے ہی سماجی تغیرات کی ازحد ضرورت ہے۔

اسی سے متعلق ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ غیر مغربی اور ٹیکنالوجی کے اثرات سے پاک معاشرے بھی مغرب کی قوت اور مادی دولت کو دیکھ کر، اس کی ہم سری اور برابری حاصل کرنے کی دوڑ میں جت گئے ہیں اور اس کوشش میں کئی قدیم روایات، نظریات اور نظامِ زندگی فنا ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم تو صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ جو عناصر فنا ہو رہے ہیں، ان کے کچھ اجزا ایسے بھی ہیں جن کی ہمیں تلاش ہے۔ ہمارے معاشروں کے ان مطابقت پیدا کرنے

Marfat.com

والے عوامل کو محفوظ رکھنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور ہونا چاہیے جو ہزاروں سال کے معاشرتی ارتقا کا نتیجہ بھی ہیں اور جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

ہم، کرۂ ارض پر موجود زندگی کی تاریخ کے عہد ساز لمحے اور ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے اس کرّے پر زندگی اور اس کے مستقبل کے بارے میں اس سے زیادہ مشکل اور اس سے زیادہ امید افزا وقت کبھی نہیں آیا"۔

کارل ساگان، باب ۱

Transitional Animal: The Cosmic Connection

نفسیات، اگرچہ ایک نوزائیدہ سائنس ہے لیکن انسانی شعور کے بند دروازے پر دستک دینے کے لیے تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ اس ارتقا پذیر انسانی شعور کو ترقی کرتے کرتے بالآخر اس منزل تک پہنچنا ہے جب انسان کا شعور خدائی شعور تک رسائی حاصل کر لے گا۔ خونی رشتے، خاندان، قبیلے اور قومیت سے لے کر کثیر ثقافتی قوموں، انسان پرستی اور عالمگیریت کے نظریوں تک کے مرحلے دراصل انسانی شعور کے ارتقا کے مختلف درجے ہیں۔ یہ انسانی ذہن کی ترقی اور نشوونما کی مختصر سی کہانی ہے۔ اس کہانی کو لازماً جاری رہنا چاہیے اور انسانی شعور کو خدا کے شعور تک پہنچنا چاہیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان اپنے خالق کو پہچانتے چلے جائیں گے اور کائنات کی ہر حقیقت میں اللہ کو دیکھ سکیں گے۔ یہ نوشتہ سائنس کی دیوار پر کھدا ہوا ہے۔ کیا اب بھی یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہر شے، ہر مخلوق ایک عظیم شعور (Supreme Consciousness) کی مظہر ہے اور ایک عظیم ارادے (Supreme Will) کی تخلیق ہے۔

متوازی معکوس:

Parallel Inversions

عملِ تخلیق:

The Process of Creation

مثال کے طور پر انسان کے تخلیقی عمل کے مراحل ہی کو دیکھ لیجیے؛ ہر شے جو انسان تخلیق کرتا ہے یا آج تک اس

Marfat.com

نے تخلیق کی ہے، اس کے ذہن کا کرشمہ ہے۔ یہی اصول اللہ کے تخلیقی عمل پر بھی لاگو آتا ہے۔ ہر شے اللہ کے ذہن، اس کے ارادے سے تخلیق ہوتی ہے۔ اور یہ کتنی سادہ سی بات ہے۔

تخلیق کا ہر عمل خیال (ذہن) اور ہنر (مادہ) کے، تخلیقی تصور (غیر مرئی، مجرد) اور تکنیک (مرئی، مادی) کے، مثال اور حقیقت کے امتزاج سے مکمل ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے متوازی مگر الٹ حقیقتیں ہیں۔ اللہ کا ارادہ اور اللہ کی مخلوق بھی اسی طرح ایک دوسرے کے مساوی مگر الٹ ہیں۔ مخلوقات دراصل کائنات کا متوازی اور معکوس مظہر ہیں۔ عالمِ غیب (غیر مرئی، نادیدہ دنیا) اور عالمِ شہادت (مادی دنیا) دو آئینوں کی مانند ہیں جنھیں ایک دوسرے کے مقابل رکھ دیا گیا ہو اور وہ دونوں مل کر لامتناہیت کو جنم دیتے ہیں۔ کسی چیز کو مادی وجود دینے کا عمل دراصل خالق کے خیال کا، اس کے حکم کا معکوس مظہر ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک پرنٹ شدہ ورق کمپیوٹر کے حکم (command) کا معکوس مظہر ہوتا ہے اور جیسے تصویر کا نیگیٹو (negative) اس کے پوزیٹو (positive) کا الٹ عکس ہوتا ہے یعنی یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ تخلیق کا عمل خیال اور تکنیک کو، تجرید اور مادیت کو، جوہر (عالمِ غیب) اور عرض (عالمِ شہادت) کو یکجا کر دیتا ہے۔ جب تک دو بظاہر ایک دوسرے کے الٹ نظر آنے والی حقیقتیں باہم مربوط و یک جا نہ ہوں، کسی چیز کی تخلیق ممکن نہیں۔ گویا مادی دنیا (عالمِ شہادت) میں جسے ارتقا کہتے ہیں وہ دراصل ذہن کی مجرد دنیا (عالمِ غیب) میں تخلیق کا عمل ہے (parallel inverse Universes)۔ شاید آپ کو اس بات میں تضاد نظر آئے لیکن تضاد تو ہر تخلیق کی سرشت میں شامل ہے۔ مصور ہو، یا موجد، دست کار ہو سائنس دان، کوئی بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔

سائنس بھی معکوس نقطۂ نظر ہے:
Science is the Inverted View

اس بات کو ذرا اور پھیلائیں تو ہم جان سکتے ہیں کہ خدا کا تخلیقی عمل بھی اس سے مختلف نہیں۔ یہ بیک وقت ایک الوہی تحریک بھی ہے اور ایک مادی ڈھانچا بھی، وجدان بھی ہے اور طریق کار بھی، بصیرت بھی ہے اور تکنیک بھی، مادہ بھی ہے اور ذہن بھی، حکم بھی ہے اور اس کی تعمیل بھی۔ ہم پورے تیقین سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کیوں کہ فطرت میں اصولِ یکسانیت کارفرما ہے اور یہی اصول سائنس کی بنیاد ہے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ یہی اصول اللہ کی الہامی صفات سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کیوں کہ اللہ تخلیق کار (الخـالـق) بھی ہے اور ارتقا دینے والا

Marfat.com

(الباری) بھی اوراس کے ساتھ ساتھ صورت گر (المصوّر) بھی وہی ہے۔

اب ارتقا کے عمل کو کیسے دیکھا جائے؟ اس کی توضیح وتشریح کیسے کی جاسکتی ہے؟ کوئی اسے کمال کو پہنچا ہوا ہنر قرار دے سکتا ہے، اور کوئی اسے ایک حسین تصور کہہ کر داد دے سکتا ہے۔ گویا تخلیق کا عمل ہمیشہ ادراک وتفہیم کے دو مختلف زاویے تشکیل دیتا ہے؛ ایک ذہن کو دیکھتا ہے اور دوسرا مادے کو۔ ایک فعلی پہلو کو دوسرا ساختیاتی پہلو کو۔ یہ داخلی اور خارجی زاویے ہیں۔ ایک ہی حقیقت کے باطنی اور ظاہری پہلو۔ دونوں ہی درست اور کارگر ہیں مگر دونوں میں سے کوئی ایک بھی کل حقیقت نہیں ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کا معکوس یا الٹ رُخ ہیں۔ سائنس بھی اسی طرح مبنی بر حقیقت تو ہے مگر ہے حقیقت کا معکوس رُخ۔ سائنس نے بنی نوعِ انسان کے لیے قابلِ ستائش ترقی کی ہے اور یہ صریحاً ایک روحانی عمل ہے۔ یہ انسانی ذہن کی نہایت اعلا کارکردگی ہے لیکن پھر بھی ہماری رفیع الشان سائنس نے حقیقت کو صرف ایک زاویے سے دیکھا ہے جو الٹ ہے یعنی نیچے سے اوپر کی جانب (UPSIDE DOWN)۔

ذہن (باطن) اور مادہ (ظاہر) ایک ہی حقیقت کے دو سرے ہیں۔ ایک ہی شے کی دو انتہائیں جو ایک دوسرے میں مکمل طور پر تبدیل ہوسکتی ہیں۔ جس طرح مادہ توانائی میں تبدیل ہوسکتا ہے اسی طرح توانائی بھی مادے میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ حقیقت کو دیکھنے کا ایک زاویہ تو یہ ہے کہ مادہ ذہن ہی کی تبدیل شدہ صورت ہے (intelligent design) اور دوسرا معکوس رُخ یہ ہے کہ مادہ، ذہن (شعور) میں تبدیل ہو جاتا ہے (evolution)۔ تمام مظاہر ایک اعلا ترین ذہن کے مادی اظہار کا نام ہیں۔ یہ ذہن ہی ہے جو مادی صورت اختیار کرتا ہے۔ تمام انسانی تعمیرات، تخلیقات، جدت اور تکنیک پر نظر ڈالیے، یہ انسانی ذہن ہی کی مادی صورتیں ہیں۔ تو پھر کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ تمام مخلوقات اسی طرح خدا کے ذہن کی مادی صورتیں ہیں۔ ان میں موجود اختلاف صرف درجے اور تنظیمی پیچیدگی کا ہے۔ ڈارون کی مہربانی سے ہم جانتے ہیں کہ مادہ ذہن (شعور) میں تبدیل ہو جاتا ہے اور انسان کے تخلیقی عمل کے ذریعے یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کس طرح ذہن مادے کو صورت عطا کرتا ہے۔ ایک انتہا کا دوسری انتہا میں تبدیل ہو جانا، سائنس، فلسفے اور نفسیات کے لیے ایک جانا پہچانا تصور ہے۔ مقناطیس کا مثبت سرا دوسرے کنارے پر منفی ہو جاتا ہے اور اس کی کھینچنے (pull) کی قوت، دوسری جانب دھکیلنے (pull) کی قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ عمل جتنا واضح ہے، اتنا ہی سادہ بھی ہے لیکن

Marfat.com

واضح ہونے کے باوجود مبہم رہتا ہے اور ہم اس ڈرامائی تبدیلی کی معنویت سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

مادے اور توانائی کا ایک دوسرے میں تبدیل ہونا آئن اسٹائن کی ایک عظیم دریافت تھی۔ اور بھی ایسے کئی سائنسی مطالعات کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کیسے محبت نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے، ایثار پسندی خود غرضی میں بدل جاتی ہے، اطاعت اور سپردگی جارحیت کا روپ دھار لیتی ہیں اور بقائے ذات کی خواہش تشدد کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں جو ایک ہی وحدت میں پروئے ہوئے ہیں اور یہ وحدت حقیقت کی سرشت ہے۔ کیا اب یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ ذہن مادے میں تبدیل ہو گیا ہے (MIND transformed to MATTER) اور یہ کہ انسانی فطرت کی متضاد خصوصیات اللہ کی فطرت کا مظہر ہیں جو ہر مخلوق میں اپنا اظہار کرتی ہے۔

مادیت (نیچے سے اوپر دیکھنے کا زاویہ) اور ذہن یا شعور (اوپر سے نیچے دیکھنے کا زاویہ) ایک ہی حقیقت کے دو سرے ہیں۔ ہر انسانی عمل انھی دونوں زاویوں کو جنم دے گا۔ تخلیق اور ارتقا، مذہب اور سائنس، عقلیت پسندی اور تجربیت پسندی، مثالیت پرستی اور حقیقت پرستی، سب ایک ہی حقیقت کو اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر دیکھنے کا زاویہ ہیں۔ یہ دونوں متوازی مگر معکوس ہیں۔ اثبات اور نفی (+/-) جو ایک ہی دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں، ذہن (عالم غیب) اور مادے (عالم شہادت) کی ایک دوسرے کے متوازی مگر معکوس کائنات کے مظہر ہیں۔ یہ متضاد کنارے ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں اور ایک متحرک توازن میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں تاکہ انسان کی مزید ترقی کے لیے لامتناہی امکانات پیدا ہوتے رہیں مگر پھر بھی یہ ایک دوسرے کے مساوی نہیں ہو سکتے کیوں کہ ان میں سے ایک نفی (-) ہے۔

جب تک یہ دونوں زاویے ایک دوسرے سے مل نہ جائیں، پورا سچ ظاہر نہیں ہوتا۔ مثبت اور منفی بار کا ملنا ضروری ہے۔ تمام تر حقیقت، عالمِ کون و مکاں، یہ کائنات، زندگی، نوعِ انسانی، ذہن کا ظہور، یہ سب کچھ ایک عظیم شعور (Supreme Consciousness) کے ارادے کا نتیجہ ہے۔ تاہم ارتقا کے اس موجودہ مرحلے پر، ابھی تک ہم انسان اس حقیقت سے واقف نہیں ہو سکے اور جب تک ہمارا شعور ارتقا کے بلند ہوتے تسلسل پر مزید آگے نہیں بڑھتا، ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ لیکن کچھ استثنائی صورتیں بھی ہیں۔ مذہبی اور صوفیانہ ادب میں ایسے کتنے ہی افراد اور پیغمبروں کی مثالیں موجود ہیں جنھوں نے اس دورِ حیات ہی میں خدا کے شعور تک

Marfat.com

رسائی پالی۔

ایک ہی تسلسل کے اوپر۔ نیچے کے مقامات:
UP DOWN Positions along a Continuum

انسان قانونِ الٰہی (مذہب) اور قانونِ فطرت (سائنس) کے وسط میں موجود ہے۔ حقیقت کے اس تسلسل میں یہی قانونِ فطرت اپنے الٹ یعنی مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ کی کار کے تھرمل میٹر پر ''سرد'' (cold) کی قوس دوسرے کنارے پر پہنچ کر ''گرم'' (hot) میں بدل جاتی ہے۔ یہ محض حقیقت کے درجہ وار تسلسل میں اسے دیکھنے کے دو نقطۂ نظر ہیں؛ نیچے سے اوپر یا اوپر سے نیچے۔ پہلے زاویے سے دیکھیں تو ارتقا جب اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو تخلیق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ حقیقت کا سائنسی نقطۂ نظر بھی درست ہے بلکہ امر واقع یہی ہے لیکن سائنس حقیقت کو نیچے سے دیکھتی ہے اور اس لیے یہ نقطۂ نظر کلی سچائی کا اظہار نہیں کرتا۔ سائنسی سچائی محض جزوی سچائی ہے۔ ارتقا کے عملِ جاری کے دوران انسان کی نظر ادھوری نظر ہے، اسی لیے یہ ناپائیدار اور تغیر پذیر ہے لیکن پھر بھی مسلسل ترقی کر رہی ہے۔

ہر محدب حقیقت دوسری جانب سے مقعر ہوتی ہے۔ اسی طرح مادہ (ظاہر) ذہن (باطن) میں تبدیل ہو جاتا ہے اور مادی دنیا (عالمِ شہادت) روحانی دنیا (عالمِ غیب) میں بدل جاتی ہے جو حقیقت کا متوازی مگر بالکل الٹ رُخ ہے۔ یہ دونوں رُخ مکمل طور پر ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں اور دونوں مل کر وحدت کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے یوں مربوط ہیں جیسے سچ بٹن، یا جیسے دیوار پر لگی ساکٹ کے مذکر اور مؤنث حصے۔ جیسے استنبول کا عظیم الشان شہر ہے جو مغرب کا دروازہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مشرق کا دروازہ بھی ہے۔ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ آپ اسے کس سمت سے دیکھ رہے ہیں اور خود آپ کی سمت کیا ہے؟

قانونِ فطرت اور قانونِ الٰہی:
Natural Law and Divine Law

لٰہذا ایک تو انسانی سچائی ہے اور دوسری خدائی سچائی۔ قانونِ فطرت بھی ہے اور قانونِ الٰہی بھی۔ اور خوش قسمتی سے انسانوں کی مسلسل بلند پروازی کے لیے ایک کھلا میدان موجود ہے کیوں کہ یہ دونوں سچائیاں ایک ہی قوس کے مختلف مدارج میں موجود ہیں۔ قانونِ فطرت کے تحت ماحولیات، حیاتیات اور طبعیات کے میدان میں

Marfat.com

ہونے والی سائنسی دریافتیں، آہستہ آہستہ قانونِ الٰہی کو منکشف کرتی رہیں گی۔ انسان اس بلندی تک پہنچنے کے پوری طرح اہل ہیں۔ ایک خلیے سے لے کر بن مانس تک اور بن مانس سے لے کر سوچنے والے انسان تک شعور کا مسلسل ارتقا ہی انسانی عروج کی کہانی بیان کرتا ہے۔ چارلس ڈارون نے ہمارے شعور کو ترقی دے کر ارتقا کے چکر اور جہد اللبقا تک پہنچا دیا ہے۔ ڈارون بھی؛ برونو اور کوپرنیکس کی طرح جو کلیسا کی جہل پسندی کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے، ایک عظیم آدمی تھا۔ ڈارون ایک روحانی شخص تھا۔ سائنس اس کے لیے ایک روحانی کام کا درجہ رکھتی تھی اور اسے اس بات سے پوری آگاہی حاصل تھی۔ جب مسیحی کلیسا کٹر عقائد، پیچیدہ رسومات اور ظاہر دارانہ حق پرستی کی رعونت سے اندھا ہو چکا تھا، تو یہ عظیم المرتبت چارلس ڈارون ہی تھا جس نے اس تاریک دنیا میں ہمارے شعور کے ارتقا کے لیے روشنی کا ایک مینار تعمیر کیا اور بنی نوع انسان کو متکبرانہ جہالت سے نجات دلائی۔ تب اللہ چپکے سے کلیسا سے نکلا اور ڈارون کے کام میں اس کی رہنمائی، مدد اور حوصلہ افزائی کرنے لگا۔ اصل میں اللہ کلیسا سے تو بہت پہلے نکل چکا تھا۔ اللہ ہمیشہ ''دوسرا'' (the other)، الٹ اور نرالا ہوتا ہے۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ عظیم جدید فلسفی ولیم جیمز (William James) کی تحریریں دیکھیں جن میں اس نے انسانی ذہن کی ترقی میں نرالے پن کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ ہے اللہ کی سائنس جس کی مدد سے انسانی شعور کو خدائی شعور کے درجے تک ترقی دی جا سکتی ہے۔ یہی تمام انسانوں کا آخری اور ناگزیر مقصد ہے اور یہی تکمیلِ ذات کے لیے ان کی طبعی اور سب سے گہری تلاش۔ جسم سے لے کر دماغ تک اور دماغ سے لے کر اعلاتر شعور تک انسانی عروج کی کہانی دراصل بے جان سے جان دار، مادی سے جسمانی اور جسمانی سے ذہنی یا تجریدی حقیقت تک ایک درجہ وار تسلسل کی کہانی ہے۔ اس تسلسل کا اگلا درجہ لازمی طور پر خدا کا شعور ہے جہاں صرف بہترین ہی باقی رہ سکتا ہے۔ یہ صداقت انسان کے سائنسی نقشے پر تحریر ہے۔ اب یہ انسان کی مرضی ہے کہ وہ اپنی سائنس اور علم کے لیے ایک نئی سمت کا تعین کرتا ہے یا اس نئے پن کی مزاحمت کر کے فنا کے گھاٹ اترنے کو ترجیح دیتا ہے تاکہ وہ بھی ارتقا کے سفر کے دوران معدوم ہو جانے والی ایک فکری نوع (extinct thought species) کی یاد بن کر رہ جائے۔

Marfat.com

وحدت کا چکر:
The Cycle of Unity

اللہ کے جوڑے دار نام (اسمائے حسنیٰ) جیسے الغفار، القہار، القابض، الباسط، المقدم، المؤخر ایک دوسرے کے الٹ بلکہ کبھی کبھی تو بالکل ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں لیکن اصل میں ایک ہی حقیقت کی دو انتہاؤں کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ انتہائیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ان دونوں انتہائی مقامات کے درمیان کئی مرحلے ہیں جنھیں صوفیہ اپنے روحانی تجربے میں ''درجات'' یا ''مقامات'' کا نام دیتے ہیں۔ وحدت کا یہ چکر لا تعداد درجات، اختلافات اور تغیرات پیدا کرتا ہے جو اس چکر کی مسلسل حرکت کے دوران خود کو منکشف اور عیاں کرتے رہتے ہیں۔ یوں یہ وحدت حیرت انگیز جدت اور تنوع کو جنم دیتی ہے۔ لیکن وحدت کا یہ چکر صرف اوپر کی جانب چلتا ہے اور کبھی نیچے کی طرف نہیں چل سکتا۔ ارتقا کا چکر بھی کبھی الٹا نہیں چلتا۔ بن مانس، انسان بن سکتا ہے لیکن انسان کبھی دوبارہ بن مانس نہیں بن سکتا۔ یہ چکر اوپر سے نیچے آتا ضرور ہے لیکن صرف دوبارہ اوپر جانے کے لیے؛ تاکہ اس کی پیش قدمی، ترقی اور بلند پروازی جاری رہے اور الوہی قوت کی شدت میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہے۔ یہ سادہ الفاظ میں اصولِ وحدانیت (Law of Unification) ہے؛ جو سب سے بنیادی اور اللہ کا پہلا اصول (first law of Allah) ہے۔ یہ ایک سائنسی اصول بھی ہے جو تمام سائنس اور اللہ کی تمام مخلوقات پر یکساں طور پر لاگو ہوتا ہے اور فطرت کے تمام بنیادی روابط کو ایک وحدت میں منسلک کر دیتا ہے۔ اسی لیے یہ اصولِ وحدانیت ہے۔ حقیقت وسطی ہوتی ہے (Reality is intermediate)؛ بیک وقت مادی بھی اور غیر مادی بھی، متعین بھی اور غیر متعین بھی۔ جدید فزکس کی تحقیق ہے کہ دو نقطوں کے درمیان ہمیشہ ایک وسطی مقام (intermediate point) ہوتا ہے۔ آیئے ایک مرتبہ پھر کچھ انتہائی صفاتِ الٰہی پر نظر ڈالیں:

الغفّار (معاف کرنے والا)	القہّار (سزا دینے والا)
القابض (سکیڑنے والا)	الباسط (پھیلانے والا)
الخافض (قدرومنزلت گھٹانے والا)	الرّافع (قدرومنزلت بڑھانے ولا)
المحصی (واپس لانے والا)	المبدی (ابتدا کرنے والا)

Marfat.com

النّافع (فائدہ پہنچانے والا)	الضّار (نقصان پہنچانے والا)
الحیّ (زندگی دینے والا)	الممیت (موت دینے والا)
الاوّل (پہلا)	الآخر (آخری)
المقسط (تقسیم کرنے والا)	الجامع (جوڑنے والا)
الظّاھر (عیاں)	الباطن (نہاں)
الخالق (تصور میں لانے والا)	الباری (نشو ونما کرنے والا)
المؤخّر (بعد میں آنے والا)	المقدم (پہلے آنے والا)
الکریم (فراخ دل، سخی)	الرّقیب (کڑا نگہبان)
النور (روشنی)	الھادی (ہدایت دینے والا)
لا الٰہ (نفی)	الّا اللّٰه (اثبات)

متوازی حقیقت:
Parallel Reality

اب سوال یہ ہے کہ کون سی زمینی حقیقت اس الوہی اور سماوی حقیقت کے متوازی ہے، جس کا نام اللہ ہے؟ وہ کون سے مادی یا جسمانی مظاہر ہیں جو اللہ کی صفات، حرکات اور کارکردگی کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں؟ یہ متوازی جسمانی مظاہر بہت اہم ہوتے ہیں کیوں کہ یہ اعلاتر حقیقتوں کو سمجھنے میں انسانی فہم کی رہنمائی کرتے ہیں۔ انھی متوازی جسمانی مظاہر کے ذریعے انسان اس قابل ہو سکتے ہیں کہ تجربے کی وسعت اور اس سے بالاتر نامعلوم کی سرحد کے پار جھانکنے کی صلاحیت حاصل کر سکیں۔ جیسے خلابازوں کو خلا میں بھیجنے سے پہلے زمین پر ہی خلا کے متوازی صورتِ حال پیدا کر کے تربیت دی جاتی ہے۔ ہماری کائنات کا مرکز (center) سورج ہے: ایک خود مکتفی، مکمل گول دائرہ ہے جو گردش میں ہے (a self-contained complete sphere that circles)۔ سائنس نے کوپرنیکس کی اس دریافت کے بعد ہی ترقی کی ہے کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا بلکہ زمین اپنے مرکز کے گرد گھومتی ہے۔ اسی طرح ڈارون کی یہ دریافت بھی سائنسی ترقی کی بنیاد

Marfat.com

بنی ہے کہ ہم زندگی کے تمام؛ سادہ ترین سے لے کر پیچیدہ ترین مظاہر بلکہ پورے عالمِ کون ومکاں سے جڑے ہوئے ہیں اور ہماری زندگی ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہے کیوں کہ ہر شے انھی بنیادی عناصر یا اجزا سے مل کر بنی ہے جن سے انسان بنا ہے۔ ان میں واحد فرق یہ ہے کہ ہر شے پیچیدگی کی مختلف سطح اور مختلف درجے پر ہے۔ جیسے ہم دودھ کو بلو کر مکھن نکالتے ہیں، اسی طرح عالم کون ومکاں بھی ایک بہت بڑی مدھانی ہے جو توانائی پیدا کرتی ہے، زندگی بخشتی ہے، درجہ بندی کرتی ہے اور مسلسل گردش سے چیزوں کو پھٹک پھٹک کر علیحدہ کرتی ہے۔ ہم اس عالم کون ومکاں سے اپنے ربط وتعلق سے واقف تو ہیں لیکن اس ربط کی اثر انگیزی اور قوت ہمارے خیال کی حد سے بھی پرے ہے۔ یہ عالم کون ومکاں انتہائی استعجاب انگیز ہے اور یہ ہماری مرضی اور پسند کا عالم کون ومکاں نہیں ہے جیسا کہ معروف ماہرِ فلکیات کارل ساگان نے بیان کیا ہے۔

سورج کی تمام اہم خصوصیات اور افعال دو متضاد قوتوں پر منحصر ہیں؛ قبض کی قوت جو کششِ ثقل کی وجہ سے اندر کی طرف کھینچتی ہے اور بسط کی قوت جو اندرونی دباؤ کے باعث اسے باہر کی جانب دھکیلتی اور پھیلنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان دونوں قوتوں کا توازن ہی سورج کو مکمل متوازن حالت میں قائم رکھے ہوئے ہے۔ ہر حرکت سورج کی کششِ ثقل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ تمام اجسام کی حرکت سورج کے عظیم الشان حجم کی کشش کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف برقائے ہوئے ذرّوں کی موجیں مسلسل سورج سے خارج ہوتی رہتی ہیں جنھیں شمسی کائناتی شعاعیں (Solar cosmic rays) کہا جاتا ہے۔ یوں سورج کھینچتا بھی ہے اور دھکیلتا بھی؛ سکڑتا بھی ہے اور پھیلتا بھی۔ کائنات میں موجود تمام تر مادہ اور تمام سیارے اسی کشش اور گریز کی قوت کی وجہ سے سورج سے بندھے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے مدار سے باہر نہیں گر سکتے۔

سورج ہماری کائنات میں توانائی کا منبع ہے۔ تمام تر روشنی اور گرمی کا ماخذ ہے۔ یہ انھی عناصر سے مل کر بنا ہے جن سے چاند اور زمین بنے ہیں لیکن کھربوں سال کے ارتقا نے انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ اور منفرد بنا دیا ہے۔ سورج ایک عظیم الجثہ جنریٹر ہے جہاں ایٹمی تحلیل وادغام (fission and fusion) کا عمل ہوتا رہتا ہے۔ اس مستقل مرکزی حرارت کے عمل سے مادہ اپنے الٹ یعنی توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور حرارت روشنی میں بدل جاتی ہے اور یہ آئن اسٹائن کی اہم ترین دریافت ہے۔ یہ توانائی برقی مقناطیسی لہروں کی صورت میں ہوتی ہے اور یہ لہریں زمین کی طرف سفر کرتی ہیں۔ ان لہروں کا طول موج، ان کا درجہ، ان کی شدت اور ان

Marfat.com

کی کیفیت ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہوتی ہے کہ ان میں کچھ تو حد درجہ ضرر رساں اور خوف ناک ہوتی ہیں اور کچھ انتہائی مفید اور زندگی بخش۔ سورج جن شعاعوں کا اخراج کرتا ہے ان میں گاما شعاعیں (Gamma rays)، لاشعاعیں (X rays)، بالائے بنفشی روشنی (Ultraviolet light) اور اس کے بعد مرئی روشنی (Visible light)، زیریں سرخ روشنی (Infrared light) اور ان سب کے بعد ریڈیائی لہروں (Radio waves) کا ایک وسیع سلسلہ شامل ہیں۔ توانائی کی غیر معمولی مقدار کا مسلسل اخراج سورج کو کھولتی ہوئی، گھومتی ہوئی حالت میں رکھتا ہے۔ سورج کبھی ساکن نہیں رہ سکتا۔ روشنی کا یہ مرئی طیف (spectrum)، جسے ہم سورج کی روشنی کہتے ہیں، دراصل سورج کی پیدا کردہ برقناطیسی توانائی کے طیف کا وسطی درجہ (Intermediategradient) ہے۔ لیکن یہ سورج کی متضاد خصوصیات کا اظہار کرتا ہے؛ یہ جلد کو دلکش بھی بناتا ہے اور اسے جھلسا بھی دیتا ہے، پر لطف اور رنگین زندگی کا باعث بھی ہے اور زندگی کے لیے خطرہ بننے والی لُو لگنے کا سبب بھی ہے۔

انسان کو سورج کی فطرت سمجھنے میں صدیاں لگ گئیں۔ ۱۶۰۰ میں جب دوربین پہلی بار استعمال میں آئی تب کہیں جا کر پتا چلا کہ سورج نظام شمسی کے مرکز میں واقع ہے۔ ۱۸۰۰ کے وسط میں جب علم فلکیات کے اہم آلات اور تکنیکیں جیسے فوٹو گرافی اور سپیکٹروسکوپی وغیرہ ایجاد ہوئے، تب سورج کی حقیقی فطرت بے نقاب ہو سکی۔ آخر ۱۹۳۰ میں جب نوایجاد نیوکلیر فزکس کے اصول دریافت ہوئے تب کھلا کہ سورج اور دوسرے ستاروں میں توانائی کہاں سے اور کیسے آتی ہے۔ سورج سے ایسی شعاعوں کا اخراج ہوتا ہے کہ آپ اس کی طرف نظر بھر کر دیکھ تک نہیں سکتے۔ اسی لیے سائنس دانوں کو بڑے بڑے آئینوں کی ایک کثیر تعداد استعمال کر کے اس کا عکس حاصل کرنا پڑتا ہے تا کہ وہ اس کا مشاہدہ کر سکیں۔

سورج کئی طرح سے الوہی صفات کا اظہار کرتا ہے۔ اسی لیے یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ ابتدا ہی سے ماضی کے قدیم معاشروں اور تہذیبوں میں سورج کو دیوتا یا خدا کی علامت کے طور پر پوجا جاتا تھا۔ بت پرستی کی سب سے عام قسم سورج کی پرستش پر ہی مبنی تھی۔ سورج کی پرستش کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے دیکھیے: گوگل: sun worship لیکن اس کے باوجود آج ہمیں علم ہو چکا ہے کہ ہمارا سورج کائنات میں پھیلی ہوئی لاکھوں کہکشاؤں میں موجود شمسی نظاموں میں سے صرف ایک نظام کا صرف ایک سورج ہے اور اسے کسی طرح

Marfat.com

بھی خدا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اللہ غیر مرئی ہے، سورج مرئی ہے۔ اللہ ابدی اور لافانی ہے، سورج فنا ہو رہا ہے۔ اللہ روحانی ہے، سورج مادی ہے۔ سورج بنیادی طور پر مختلف خصوصیات کا مالک ہے۔ ہماری نوخیز سائنس ابھی تک صرف طبعی یا جسمانی آفاق ہی میں الجھی ہوئی ہے اور اللہ جیسی عظیم ماورائی حقیقت ابھی انسانی رسائی سے بہت دور ہے۔ لیکن ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔ اللہ کی فطرت کا فہم حاصل کرنے کی سعی تو کر سکتے ہیں۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم خالق کی فطرت کا راز جاننے کے لیے اس کی تخلیق کی ہوئی دنیا میں اس کا عکس تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ قرآن ہمیں بار بار فطرت کے مظاہر کی طرف متوجہ کرتا ہے اور انسان کو ان کے بارے میں سوچنے، غور و فکر کرنے اور انھیں سمجھنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اللہ کی حرکیات:
Dynamics of Allah

اللہ بھی، جو ارفع ترین ذات ہے، اس عالمِ کون و مکاں کا مرکز ہے۔ وہ ہر شے کا منبع و ماخذ ہے۔ کائنات میں تمام تر حرکت، تغیر اور فعالیت اللہ ہی کی متضاد صفات کے روبہ عمل ہونے کا نتیجہ ہے۔ اللہ کبھی غیر فعال نہیں رہا حالاں کہ خود اپنی ذات میں وہ قائم اور ساکن رہ سکتا ہے۔ روحانی دنیا میں لاتعداد عمل اور نظام ہر وقت متحرک رہتے ہیں جو کائنات کی ہر شے کو منظم کرتے ہیں۔ کائنات کی ہر حرکت اور ہر عمل اللہ کی متضاد صفات کی کارفرمائی ہے جو ایک روحانی ڈائنمو (Dynamo)، ایک کائناتی جنریٹر کی طرح مسلسل گردش کے ذریعے نور (روحانی روشنی) خارج کرتی ہیں اور ہر طولِ موج میں ظاہر ہوتی ہیں۔ حقیقت محض قانونِ الٰہی کی تکرار کرتی ہے، اس کی تقلید کرتی ہے اور اسے منکشف کرتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ انسانی تہذیب کی صبح نو کے وقت سے ہی جدید مغربی فلسفے کے بانی سقراط، افلاطون اور فیثا غورث (۴۰۰ قبل مسیح) ایک ایسی الوہی حقیقت کے وجود پر یقین رکھتے تھے جو ناقابلِ تغیر اور ماورائے حواس ہے۔ ان کے خیال میں اس دنیا کی اشیا ابدی دنیا میں موجود اشیا کا محض ایک عکس، سایہ اور نقل ہیں۔

اللہ کی ذات میں، اس کے وجود کی تمام سطحوں پر متنوع اور متحرک عمل جاری و ساری رہتے ہیں۔ یہ سطحیں یا درجے ناکارہ مادے کے میکانکی عمل سے لے کر، ذہن اور روح کے مجرد اور پیچیدہ ترین مظاہر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کشش اور گریز، قبض و بسط، ارتکاز و انتشار، جمع اور تقسیم، محبت اور نفرت، جزا اور سزا، فرش اور عرش، عیاں

Marfat.com

اور نہاں، یہ سب متضاد صفات ہی اللہ کے مظاہر ہیں۔ اللہ کا کائناتی نور("cosmic "nur) ہے اور یہ متضاد صفات دو رویہ سڑک کی مانند ہیں جو خالق اور مخلوق کے درمیان دو طرف ٹریفک کا وسیلہ ہیں۔ یہ خالق و مخلوق کے درمیان ایک لامتناہی سفر کا راستہ ہیں۔ خالق و مخلوق ایک دوسرے سے مربوط ہیں لیکن ہم جنس نہیں ہیں۔ لہٰذا حکم اور سپردگی مل کر ایک وحدت بناتے ہیں، علم اطاعت ہی سے ملتا ہے اور دینا اصل میں لینا ہے۔ یہ دو ایک دوسرے کے الٹ کنارے اللہ کا مقناطیسی میدان ہیں جس میں کائناتی توانائی کو نفی (-) اور اثبات (+) کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ یہ قانونِ فطرت ہے جو ہر شے پر لاگو ہوتا ہے اور بلاشبہ یہی قانونِ الٰہی بھی ہے۔

مکان اور زمان یقیناً ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ مریخ کا ایک دن زمین کے ۶۷ دنوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم وقت کے اس زمینی (عالمِ شہادت) پیمانے کو آسمانی (عالمِ غیب) واقعات و حوادث پر بھی لاگو کر دیں۔ ہمارے زمان و مکاں ہمارے اس زمینی ٹھکانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں اس وقت کو ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بھلا سوچیے تو اس کے متوازی دوسری حقیقت کی دنیا میں وقت کا پیمانہ کیا ہوگا؟ شاید کوئی کوانٹم سائنس دان یہ اندازہ لگا سکے کہ اس متوازی دنیا کا وقت کیسا ہوگا؟

زمین اور انسان پر اللہ کے متنوع اور گہرے اثرات ہیں۔ اللہ سے نکلنے والی روحانی توانائی (نور) مختلف طول موج، مختلف درجے اور مختلف شدت سے جذب بھی ہوتی ہے اور منعکس بھی ہوتی ہے۔ یوں انسان۔ خدا (man-God systems) نظام قائم ہوتا ہے۔ یہ اس ربط باہمی اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے عملی حوادث کا ایک انتہائی پیچیدہ اور حیران کن نظام ہے۔ اس میدان میں ابھی مزید سائنسی پیش رفت کی ضرورت ہے تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ اللہ کس کس طرح زمین پر، ماضی، حال اور مستقبل پر اپنا حکم نافذ کرتا ہے۔

اللہ ایک حیات آفریں قوت ہے، تاب و تواں ہے۔ وہ اپنا نور (روشنی) ڈالتا ہے اور زندگی اخذ کرتا ہے۔ اللہ ذاتِ مطلق (SELF) ہے جو ہماری شخصیت، ہماری انا، ہماری روح اور ہمیں منفرد بنانے والی ہر صفت سے تعلق رکھتا ہے۔ اللہ ہی وجود ہے اور ہمارے وجود کی نشو و نما کا باعث ہے۔ اللہ ہماری حقیقی شناخت ہے۔ قدیم آریاؤں کے قدیم ترین صحیفوں، رگ وید اور اپنشد (۲۵۰۰ ق م) میں دیوتا وشنو کو جس طرح بیان کیا گیا ہے وہ غالباً خدا کے اولین وجدانی تصور کا عکاس ہے:

Marfat.com

''وشنو سب سے زیادہ قوت اور سب سے زیادہ علم کا مالک ہے اور ہر جگہ موجود ہے۔ وہ ہر سمت میں پھیلا ہوا ہے اور ہر شے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ وہ سب سے اندرونی مرکز، ہر چیز کا مغز، اس کا جوہر، اس کا نقطۂ اتصال ہے جس کے ذریعے ہر شے وجود میں آتی ہے۔ وشنو کو بے شمار ناموں سے جانا جاتا ہے۔ ناقوس (The Conch) اسی کی ملکیت ہے جو ظاہر کرتا اور پیدا کرتا ہے۔ وہ سورج کی طرح چمکتے ہوئے چکرا (wheel) کا بھی مالک ہے جو ذہن کی علامت ہے۔ اس کے کنول کا نام پدما ہے۔ یہ پاکیزگی اور سچائی (Sathva?) کی علامت ہے اور اس سے دھرما (The Laws of Conduct) جنم لیتا ہے اور اسی سے جنانا (Jnana) یعنی علمِ کل پیدا ہوتا ہے۔ وشنو کا عصا جس کا نام کامودا کی (Kaumodaki) ہے، وہ عنصری قوت ہے جو تمام جسمانی اور ذہنی قوتوں کا منبع ہے۔ وشنو کے پجاری اسے ایک ایسی عظیم ہستی کے طور پر پہچانتے ہیں جس میں سے برہما (خالق، توازن قائم رکھنے والا)، شوا (فنا کرنے والا) اور خود وشنو (بقا دینے والا) نکلتے ہیں''۔

مشرق کا ایک شاعر مصطفیٰ زیدی ایک وجدانی لمحے میں یہ ساری کتھا یوں بیان کرتا ہے:

آہستہ آہستہ

ابھی تاروں سے کھیلو، چاند کی کرنوں سے اٹھلاؤ
ملے گی اس کے چہرے کی سحر آہستہ آہستہ
دریچوں کو تو دیکھو، چلمنوں کے راز تو سمجھو
کھلیں گے پردہ ہائے بام و در آہستہ آہستہ

متوازی معکوس کا اصول:
The Law of Parallel Inversions

اللہ کا پہلا نام ''نہیں کوئی خدا، مگر اللہ'' متوازی معکوس کی مثال ہے جو نفی اور اثبات، مخلوق اور خالق کے

Marfat.com

تضادات کو یکجا کر دیتا ہے۔ ''الآ للہ'' جمع یعنی ایک سے زیادہ خداؤں کا اظہار ہے اور ''اللہ'' ایک ہے۔ یوں کثرت اور وحدت متوازی معکوس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کثرت پرستوں اور وحدت پرستوں میں ہمیشہ باہمی مناقشت اور تکرار جاری رہے گی۔ اس بحث و تکرار کے نتیجے میں انسان کا فکر و فلسفہ ترقی کرتا رہے گا اور کبھی کسی ایک نقطۂ نظر کو ہمیشہ کے لیے فتح نصیب نہیں ہو گی۔

مظاہر کی یہ مادی دنیا (عالمِ شہادت) اور دنیائے شعور (عالمِ غیب) بھی اسی طرح ایک دوسرے کے متوازی دنیائیں ہیں جو زندگی کی ہر سطح اور ہر درجے پر باہمی ربط میں بندھی ہوئی ہیں۔ فرد اور معاشرہ بھی ایک دوسرے سے یونہی جڑے ہوئے ہیں۔ اسی لیے معاشرہ انسانی ذہن کی تشکیل میں فعال کردار ادا کرتا ہے۔ جیسے جیسے معاشرے ترقی کرتے ہیں، انسانی شعور بھی ترقی کرتا ہے۔ یہ مادی اور مرئی دنیا اس تسلسل کا نچلا سرا ہے جو اپنے بالائی متضاد سرے یعنی غیر مرئی دنیا تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو کنارے ہیں اور نچلے کنارے سے بالائی کنارے کے درمیان کئی مدارج ہیں۔ یہ حقیقت کے ایک تسلسل کے متوازی معکوس ہیں۔ اللہ کی دو متضاد صفات مادہ اور ذہن برابر تعامل (interact) کرتی ہیں۔ حقیقت کے اس بلند ہوتے ہوئے تسلسل میں یہ دونوں صفات ایک متحرک توازن قائم رکھتی ہیں۔ مادہ بلند ہو کر ذہن کی طرف بڑھتا ہے اور ذہن اعلاتر شعور کی جانب سفر کرتا ہے۔ ان متضاد کناروں کے درمیان سفرِ مسلسل جاری رہتا ہے جس کے نتیجے میں بے پناہ تنوع، نیرنگی، پیچیدگی اور لاتعداد وسطی مدارج پیدا ہوتے ہیں۔ خود انسان بھی ایک وسطی درجہ ہے جو ان دو انتہاؤں کے درمیان موجود ہے۔ اس بلند ہوتے ہوئے زینے پر انسان کا مقام دنیاوی حقیقت (مادی دنیا) اور اعلاترین غیر مرئی حقیقت (خدا) کے، قانونِ فطرت اور قانونِ الٰہی کے، سائنس اور مذہب کے اور عالمِ شہادت اور عالمِ غیب کے درمیان رکھا گیا ہے۔ یوں لامتناہی امکانات اور ممکنات پیدا کر دیے گئے ہیں۔ جیسے دو شیشے مقابل رکھ دیں تو لامتناہیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا انسان کو ہر لحہ روز افزوں ارتباط، ترقی کے مواقع اور لا محدود امکانات حاصل ہو گئے ہیں۔ جدید فزکس کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ جب کسی شخص کو دو آئینوں کے درمیان کھڑا کر دیا جائے تو اس کے لامتناہی عکس جنم لیتے ہیں۔ لیکن دونوں آئینوں میں ایک ہی شے کا عکس ہوتا ہے۔ یوں لامتناہیت دراصل اپنے آپ ہی پر مشتمل ہوتی ہے۔ انسان کو دو آئینوں: حقیقت اور خدا کے درمیان رکھ دیا گیا ہے۔ اگر انسان حقیقت اور خدا کے درمیان موجود ایک نقطہ ہے تو مساوات کیا بنے گی؟ یہاں انسان بیک وقت ایک حقیقت (یعنی جانور) سے بڑھ کر ہو گا اور دوسری حقیقت (یعنی خدا) سے کم تر۔ انسان بیک وقت

Marfat.com

مثبت بھی ہے اور منفی بھی لہٰذا وہ ہمیشہ دو متوازی زاویوں سے دیکھنے کا اہل رہے گا، اوپر کی طرف یا نیچے کی طرف۔ان دونوں زاویوں کی مسلسل آویزش اور ربط باہم ہی انسانی آگہی کی سمت وصورت کا تعین کریں گے۔

متوازی معکوس کے اصول کی مکمل معنویت، مجھ جیسے سماجی سائنس دان کی بجائے کوئی کوانٹم سائنس دان زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔آخر انسان اور ایک کوانٹم ذرّے میں کیا فرق ہے؟ میرے نزدیک تو کوئی نہیں۔کوانٹم ذرّہ بیک وقت غیر مرئی موج بھی ہے اور مادی ذرّہ بھی۔انسان بھی اسی طرح ذہن بھی ہے اور جسم بھی۔کسی الیکٹران کی طرح انسان بھی حرکت کے مرکز کی طرف کھنچتا ہے۔اس کے امکانات لامحدود ہیں۔اس کا سیکھنے کا عمل کوانٹم کی چھلانگ جیسا ہے۔ابھی یہاں تو ابھی وہاں۔اس کا ذہن بیک وقت مرئی بھی ہے اور غیر مرئی بھی۔اس لیے طبعی علوم کی کوئی ایسی دریافت نہیں جس کا تعلق انسان سے نہ ہو اور نہ انسان کے بارے میں کوئی ایسی بات دریافت کی جاسکتی ہے جو طبعی علوم سے متعلق نہ ہو۔پھر یہ بھی ہے کہ انسان کو کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہوسکتی جسے وہ اپنی خارجی حقیقت میں دریافت نہ کر سکے۔گویا طبعی علوم (Physical Sciences) اور انسانیات (Humanities) میں یعنی خارجی اور داخلی دنیا میں، کوئی خلیج حائل نہیں ہے۔یوں اس بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان ایک دن اللہ کو بھی اپنی خارجی دنیا میں دریافت کر لے گا۔ وادی سندھ کے ایک صوفی شاعر شاہ لطیف کے اشعار دیکھیے:

بستی بستی، قریہ قریہ، تجھے ڈھونڈ ہی لوں گا میں ایک دن

آیئے فلسفہ، سائنس، نفسیات اور الٰہیات کے میدان میں متوازی معکوس کی کچھ مثالیں تلاش کرتے ہیں۔ یہ بظاہر ایک دوسرے کو رد کرنے والے خیال، درحقیقت ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک ہی حقیقت کے باہمی مربوط کنارے ہیں۔یہ وحدت کی قلب ماہیت ہیں:

متوازی معکوس

PARALLEL INVERSIONS

فکر (Thought)	احساس (Feeling)
استدلالیت (Reason)	حسیّت (Sensibility)
مغرب (West)	مشرق (East)

Marfat.com

عالمِ شہادت (Alam-'sh-shahada)	عالمِ غیب (Alam al-Ghaib)
مادہ (Matter)	ذہن (Mind)
اثباتیت (Positivism)	مثالیت (Idealism)
سائنس (Science)	مذہب (Religion)
ارتقا (Evolution)	تخلیق (Creation)
چاند (Moon)	سورج (Sun)
نفرت (Hate)	محبت (Love)
موت (Death)	زندگی (Life)
کثرت (Pluralism)	وحدت (Monism)
ظاہر (Zahir)	باطن (Batin)
عمومی اضافیت (GeneralRelativity)	کوانٹم فزکس (QuantumPhysics)
عورت (Woman)	مرد (Man)
انسان (Man)	خدا (God)

یہ فہرست بہت طویل ہوسکتی ہے لیکن ہم اسی پر اکتفا کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ ان معکوس مظاہر کی حقیقت کیا ہے؟

متوازی معکوس کی ماہیت:
Nature of Parallel Inversions

مشرق کا خدا اور مغرب کا خدا (رب المشرقین اور رب المغربین) یہ اللہ کی دو صفات ہیں۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو مظاہر ہیں۔ یہ اللہ کے دو متوازی کنارے ہیں اور ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ کیسے یہ دونوں ایک دوسرے سے مکمل طور پر متضاد ہیں اور پھر کیسے یہ دونوں ربطِ باہمی سے تنوع اور نیرنگی پیدا کرنے کا باعث ہیں۔

Marfat.com

مشرق میں لوگ احترام کے اظہار کے طور پر ٹوپی پہن لیتے ہیں جب کہ مغرب میں احتراماً ہیٹ اتار دیتے ہیں۔ مشرق میں مٹی کے ایک چبوترے پر بھی بیٹھنا ہو تو جوتے اتار دیتے ہیں، مغرب میں اتوار کو گرجے میں بھی جوتے پہنے رکھتے ہیں۔ مشرقی موسیقی اہلِ مغرب کو بے سری معلوم ہوتی ہے جیسے ٹِونگ ٹونگ، ٹوانگ ٹوانگ۔ مغربی موسیقی اہل مشرق کو پھسپھسی لگتی ہے، جیسے پوم پوم، پُوم پُوم۔ مشرق میں موسیقی کے علامتی حروف نہایت لطیف ہوتے ہیں؛ خم دار، دائروں اور نیم دائروں کی شکل کے۔ مغرب میں یہ پورے یا آدھے ہوتے ہیں: نقطے، خط یا سیدھی لکیر کی شکل کے۔ مشرق میں موسیقی مراقبے کا ایک ذریعہ ہے، یوگا ہے۔ مغرب میں یہ رقص و مسرت کا آلہ ہے۔ مشرق میں ڈرامے اور آرٹ کا اخلاقی پہلو نمایاں ہے۔ یہاں آرٹ برائے زندگی کا رواج ہے۔ مغرب میں آرٹ سیکولر ہے اور فن برائے فن کا نظریہ غالب ہے۔ مشرق کے پاس مذہب ہے، مغرب کے پاس سائنس ہے۔ مشرق جذباتی، گرم جوش اور مثالیت پسند ہے؛ مغرب عقلی، عملی اور اثباتیت پسند ہے۔ مغرب تدبیر پر یقین رکھتا ہے، مشرق تقدیر پر۔ مشرق شخصیتوں کا قائل ہے جب کہ مغرب سماجی ڈھانچوں (systems) اور قانون کو اہمیت دیتا ہے۔ مشرق رشتوں ناتوں اور خاندانی روابط کو ترجیح دیتا ہے، مغرب انسانی آزادی اور انفرادیت کا پرچم تھامے ہوئے ہے۔ مشرق افزائشِ آبادی سے معمور ہے جب کہ مغرب میں شرح پیدائش ایک ہی جگہ رکی ہوئی ہے یا منفی میں جا چکی ہے۔ مشرق مابعد الطبیعیات اور صوفیانہ تجربے سے مالا مال ہے تو مغرب سائنس اور فلسفے سے۔ مشرق کی شعری روایت عظیم تر ہے تو مغرب کی نثری روایت شاندار ہے۔ اہلِ مشرق زمین پر بیٹھ کر ہاتھوں سے کھانا کھاتے ہیں، مغرب میں کھڑے ہو کر یا اونچی کرسیوں پر بیٹھ کر، کانٹوں اور چھریوں کی مدد سے کھائے جانے والے بینکویٹ اور بوفے مقبول ہیں۔ مشرق انسان کا مستقبل ہے، اس کی تقدیر ہے۔ مغرب انسان کا حال ہے، اس تقدیر کی طرف لے جانے والا راستہ اور اس کی تدبیر ہے۔ مغرب کا باشندہ جب مشرقی باشندے کا سامنا کرتا ہے تو یا تو ہراساں، خوفزدہ، حیران، دہشت زدہ اور بدحواس ہو جاتا ہے، یا پھر مسحور و مسرور ہو کر اس کی طرف کھنچتا چلا آتا ہے تاکہ کسی نئے اور منفرد تجربے سے فیض یاب ہو سکے۔

موسیقی کے بارے میں اہلِ مشرق کا رویہ نہایت خوبصورتی سے دونوں دنیاؤں کے فرق کو واضح کر دیتا ہے۔ مشرق میں موسیقی کم و بیش عبادت کا ایک انداز ہے۔ یہ کچھ جاننے، سمجھنے، لکھنے یا پڑھنے کی چیز نہیں ہے؛ فقط گائے جانے، محسوس ہونے اور دل کو چھو لینے والی چیز ہے۔ مشرق کا موسیقار موسیقی جیتا ہے، خواہ اس نے کبھی

Marfat.com

کوئی رسمی تعلیم وتربیت حاصل نہ کی ہو۔ اکثر تو وہ اپنے ساز کی تاریخ، اس کی ظاہری ہیئت کے اوصاف اور اس کی ساخت کی علامتوں سے بھی واقف نہیں ہوتا۔ وہ موسیقی کا فلسفہ بیان کرنے یا سننے میں چنداں دلچسپی نہیں لیتا۔ وہ صرف موسیقی میں زندہ رہتا ہے اور خود اپنے آپ کو اس میں غرق کر لیتا ہے۔ یہ اس کے لیے ایک صوفیانہ مسلک ہے جس کے مطابق وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ مغرب میں موسیقی پڑھنے، سیکھنے، جاننے اور کرنے کا کام ہے جس کے بارے میں گفتگو کی جا سکتی ہے، بحث مباحثہ ہو سکتا ہے، علمی تصانیف ہو سکتی ہیں۔

مجھے اندازہ ہے کہ مشرق ومغرب کی یہ تخصیص بہت عمومی نوعیت کی ہے۔ مشرق میں کچھ نہ کچھ مغربی بھی ہوتا ہے اور مغرب میں کسی نہ کسی حد تک مشرق بھی موجود ہے اور ان دونوں انتہاؤں کے درمیان لاتعداد وسطی امکانات اور مدارج ہیں لیکن پھر بھی مشرق ومغرب کی مجموعی تصویر کچھ ایسی ہی بنتی ہے۔ یہاں سوال دونوں کی کوالٹی یا عمدگی کے فرق کا نہیں کیوں کہ موسیقی سیکھنے کی چیز بھی ہے اور محسوس کرنے کی بھی۔ مذہب کے بارے میں رویے کی بھی یہی صورت ہے۔ مشرق میں مذہب جذبے اور رسم پرستی، تقدیر اور یقین سے منسلک ہے جب کہ مغرب میں سائنس نے مذہب کی جگہ لے لی ہے جس کی بنیاد گہری تحقیق اور استدلال، ذاتی کوشش اور الوہیت کے بارے میں بے یقینی پر ہے۔

میں اس بارے میں ایک پورا مقالہ لکھ سکتا ہوں کہ یہ دونوں دنیائیں یعنی مشرق (رب المشرقین) اور مغرب (رب المغربین) کیسے ایک دوسرے کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ کیسے یہ دونوں انسان کے فائدے کے لیے ایک دوسرے سے تعامل (interact) کرتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے متوازی حصے کے لیے ''نئی'' ہے۔ ایسی ادل ابدل ہمیں یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ ہم ایک ''دوسری'' (other) اور ''نئی'' (novel) حقیقت کا فہم حاصل کر کے خود کو ترقی دے سکیں۔ ہر راستہ دوسرے راستے والوں کو باہمی ربط اور تعامل کے ذریعے سیکھنے اور نشوونما حاصل کرنے کے لامحدود مواقع پیش کرتا ہے۔ یہ اللہ کے ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے کنارے ہیں کیوں کہ وہ مشرق اور مغرب، دونوں کا رب ہے۔ مگر افسوس کہ انسان کی جہالت اور لاعلمی کے باعث ایک سمت دوسری سمت سے دست وگریباں رہتی ہے: ایک دوسرے کے خلاف صف آرا، ایک دوسرے کی تحدید کرتی ہوئی، ایک دوسرے کا استحصال کرتی ہوئی، ایک دوسرے کو دباتی ہوئی، برطرف کرتی ہوئی، رد کرتی ہوئی۔ اس طرزِ عمل سے توازن خراب ہو جاتا ہے اور کشتی ڈگمگانے لگتی ہے۔ دونوں کے مساوی ربط باہم

Marfat.com

سے پیدا ہونے والا صحت مندانہ توازن بگڑ جاتا ہے اور انسانیت کی بقا، تحفظ اور وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سامراجی سیاسی نظام کبھی دیرپا کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔

متضاد کناروں کے درمیان تعامل:
Interaction of Opposite Poles.

یقیناً دونوں کنارے مساوی تعامل کرتے ہیں اور ہر ایک دوسرے کی طرف کھنچتا ہے۔ اوپر جو فرق بیان کیا گیا ہے یہ دراصل بہت عمومی نوعیت کا ہے تاکہ اصل بات پر توجہ دی جاسکے۔ اس کی ایک اچھی مثال نر اور مادہ کی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم سب دوجنسی (bi-sexual) ہوتے ہیں۔ ہر مرد میں کچھ نہ کچھ نسائیت ہوتی ہے اور ہر عورت میں کچھ نہ کچھ مردانہ اوصاف ہوتے ہیں۔ گویا ہماری نسائیت یا مردانگی محض درجے کا فرق ہے۔ ہم سب اس دوجنسی کیفیت میں مرد یا عورت ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے اور کیس ہسٹریوں میں اس کے دستاویزی ثبوت بھی ملتے ہیں کہ کبھی فطری طریقے سے اور کبھی آپریشن کے ذریعے جنس تبدیل ہو جاتی ہے۔ یقیناً جنس کی ان دونوں انتہاؤں کے درمیان بھی کئی وسطی، انحرافی یا امتزاجی مدارج اور مراحل موجود ہیں اور ان کے مسلسل تعامل ہی سے بنی نوع انسان کی تمام ترنسلیں قائم و دائم ہیں اور پروان چڑھتی اور ترقی پاتی ہیں۔ ادب، ڈراما، موسیقی اور آرٹ ہی پر نظر ڈال کر دیکھ لیجیے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مخالف جنسوں کا باہمی ربط و تعامل کس طرح انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اور مرد اور عورت کے آپس کے رشتے کی نزاکتیں کیسے اس تمدنی ترقی کا باعث ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب بھی ان دونوں میں سے کسی ایک صنف نے دوسری صنف کے خلاف جبر، رکاوٹ اور پابندی کا وتیرہ اختیار کیا یا دوسری صنف کو جھٹلانے، بزور پیچھے چھوڑنے اور اسے اس کے مقام سے معزول کرنے کا رویہ اپنایا تو ان دونوں کے درمیان موجود صحت مندانہ رشتہ مسخ ہو گیا اور نتیجتاً فرد اور معاشرے کی نشوونما کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اللہ کی متضاد صفات کی فطرت و نوعیت بھی ایسی ہی ہے۔

اللہ دوطرفہ ہے:
Allah the Bi-Polar

اللہ نہ تو مذکر ہے نہ مؤنث۔ حالاں کہ وہ دونوں میں موجود ہے۔ چشم پوشی کرنے، پرورش کرنے، پروان چڑھانے اور حفاظت کرنے کی صفات کی بنا پر اللہ ایک ماں ہے اور مقتدر، نظم وضبط سکھانے، پیٹ پالنے،

Marfat.com

اورخاندان کے سربراہ جیسی صفات رکھنے کی بنیاد پر وہ باپ ہے۔اللہ کی اس دورُخی فطرت کا تجربہ ایک روایتی خاندان کے ڈھانچے کے اندر موجود ہے جو ہر بچے کی نشوونما کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ایک روایتی خاندان اسی فطرتِ خداوندی کی تشریح وتوضیح کرتا ہے، اس کی تقلید کرتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔اسی لیے روایتی طور پر مشرق میں ماں باپ کو انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور انھیں دنیا میں خدا کا روپ قرار دیا جاتا ہے۔اللہ کو اگرچہ کئی مذاہب میں مذکر اور مؤنث، دونوں جنسوں کے دیوی دیوتاؤں کے ذریعے پیش کیا جاتا رہا ہے لیکن اللہ کی کوئی جنس نہیں ہے۔وہ نہ تو مذکر ہے نہ مؤنث۔وہ دوجنسی (bi-polar) ہے۔ہم اللہ کو صرف صفاتِ خداوندی یا اسمائے حسنیٰ کے ذریعے بیان کرسکتے ہیں۔

گزشتہ دوصدیوں کے دوران دنیا نے دومختلف نظریات کے درمیان خوفناک بحث وتکرار کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہ دونظریات اشتراکیت (Communism) یعنی مطلق العنانی اور اقتصادی اشتراک کا نظریہ اور سرمایہ داری (Capitalism) یعنی انفرادیت اور مسابقت پر مبنی نظام ہیں۔ان کے باہمی تعامل نے دنیا کو تباہ کن جنگوں کے دہانے پر لا کھڑا کیا اور نا مختتم مباحث میں الجھا دیا لیکن کوئی بھی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ یہی تعامل پوری دنیا کی اقتصادیات، ٹیکنالوجی اور امورِ سلطنت کی ترقی کا محرک بن گیا۔وقت کے ساتھ ساتھ اقتصادی شتراک پر بنیادرکھنے والے معاشرے صحت مندانہ مسابقت کے ذرائع اختیار کرنے لگے اور مسابقت پر یقین رکھنے والے آہستہ آہستہ سماجی بہبود اور اجتماعی بھلائی کے ادارے قائم کرنے پر مجبور ہوگئے۔آخر کار دونوں اقسام کے معاشروں کے درمیان قائم کڑی لکیر مٹنے لگی اور دونوں طرح کے اصول ایک دوسرے میں مدغم ہوتے گئے۔ہر ایک نے اپنے کلاسیکی طرزِ فکر وعمل سے انحراف کرتے ہوئے دوسرے نظریے کی آمیزش سے متوازن نشوونما کا راستہ اپنا لیا۔اشتراکیت اور مسابقت دونوں کے ملاپ میں وحدت ہے۔ہر ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہے۔شاید ایک مثالی معاشرہ وہ ہے جہاں اجتماعی بھلائی ہی میں فرد کو نشوونما حاصل ہوسکے۔لیکن چلیں اب ہم اپنے موضوع پر واپس چلتے ہیں۔

کثیر کائنات:
Multiverse

عالمِ شہادت (حواس اور مظاہر کی دنیا) اور عالمِ غیب (ذہن، نفس اور روح کی دنیا) بھی اسی طرح دو

Marfat.com

متوازی دنیائیں ہیں۔ایک عیاں ہے، دوسری نہاں ہے۔ایک مرئی ہے، دوسری غیر مرئی ہے۔ایک جسمانی ہے، دوسری روحانی ہے، ایک ظاہر ہے، دوسری مخفی ہے۔ایک ترقی پذیر ہے، دوسری قائم بالذات ہے۔ایک عارضی ہے، دوسری مستقل ہے۔یہ ایک دوسرے کے متوازی کائناتیں ہیں جو وجود کی ہر سطح پر مساوی عمل اور باہمی ربط کے ذریعے ظاہر ہوتی ہیں۔اسی لیے اللہ کے صفات کا ایک جوڑا یہ بھی ہے کہ وہ زمین و آسمان کا رب (ربّ الأرض وَ السّمٰوٰت) ہے۔یہ دونوں دنیائیں ایک دوسرے کی مکمل کایا پلٹ ہیں۔یہ کسی دوطرفہ شبیہ (inversible figure) کی مانند ہیں جس کی بیک وقت صرف ایک طرف دیکھی جاسکتی ہے مگر دونوں ایک ہی وحدت میں بنی ہوئی ہیں۔یہ کوانٹم حقیقت کی طرح ہیں جو بیک وقت غیر مادی موج بھی ہے اور مادی ذرّہ بھی۔موج اور ذرّہ دونوں باہمی مربوط ہیں لیکن ایک وقت میں انسان ان میں سے صرف ایک کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔جن قوانین کا ایک پر اطلاق ہوتا ہے، ان کا دوسرے پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ان دونوں کے قوانین ایک دوسرے سے بالکل الٹ ہیں۔بے شک ہر ایک کے اندر کئی نیرنگیاں، درجے، سطحیں اور کئی کائناتیں (multiple universes) موجود ہیں۔خود انسان بھی حقیقت کے اس نقشے میں درمیان کے درجے پر فائز ہے: بے جان مادے سے لے کر ایک جاندار مشین تک اور جان دار مشین سے لے کر مشینی ذہن تک جو بعد میں ذہنی مشین اور آخرکار خالصتاً ذہنی روح میں تبدیل ہوتا ہے اور پھر ماورا۔ئے زمین سفر پر نکل کھڑا ہوتا ہے۔مشرقی زبانوں میں وجدانی طور پر موت کے لیے ''انتقال'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کا مطلب ہے تبدیلی، کایا پلٹ۔ارضی دنیا میں انسانی زندگی ایک تبدیلی ہے۔یہ ایک عبوری دور ہے جس کی منزل بلندتر آفاق ہیں۔یہ زندگی اعلاتر مقامات تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔

مرئی۔غیر مرئی:
Tangible - Intangible

عالمِ شہادت مادی ہے، حسّی ہے، ظاہر ہے، مرئی ہے۔عالمِ غیب غیر مادی ہے، بالائے حواس ہے، مخفی ہے، غیر مرئی ہے۔عالمِ شہادت مادے اور جسم سے متعلق ہے، عالمِ غیب ذہن اور روح سے متعلق ہے۔عالمِ شہادت یہ دنیا ہے، عالمِ غیب وہ دنیا ہے جو اس دنیا سے مختلف اور نئی ہے مگر اس کے متوازی ہے۔اس دنیا میں کچھ حاصل کرنے لیے ''لینا'' پڑتا ہے، اُس دنیا میں کچھ حاصل کرنے کے لیے ''دینا'' پڑتا ہے۔اس دنیا میں دعویٰ کرنے کا

Marfat.com

چلن ہے، اُس دنیا میں تسلیم واطاعت کا۔ اس دنیا میں اپنے حواس کی تسکین کے لیے کھاتے، پیتے، باتیں کرتے، سوتے اور جنسی مسرت حاصل کرتے ہیں۔ اُس دنیا میں اعلاتر روحانی انبساط کے لیے روزہ رکھتے ہیں، خاموش رہتے ہیں، تجرد اختیار کرتے ہیں، جاگتے اور مراقبہ کرتے ہیں، غور وفکر کرتے ہیں اور اپنی ذات کے ارفع پہلوؤں کی نشوونما کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس دنیا کے سب مسرت انگیز تجربے عارضی ہوتے ہیں جو جلد ہی افسردگی، زوال اور موت کی صورت میں انجام پذیر ہو جاتے ہیں جب کہ دوسری دنیا اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ دنیا ناپائیداری، تغیر وتبدل اور ارتقا وانحطاط کی دنیا ہے۔ دوسری دنیا قیام، بقا اور تخلیق کی دنیا ہے۔ یہ قانونِ فطرت کی دنیا ہے، اور وہ قانونِ الٰہی کی دنیا۔ یہ تشکیک، موت، زوال، بدہیئتی، بگاڑ، دشمنی اور عداوت کی دنیا ہے جب کہ وہ یقین، خیر، ایمان، زندگی، دیانت اور فرض شناسی کی دنیا ہے۔ اس دنیا کی سچائی سائنس ہے، اُس دنیا کی سچائی مذہب ہے۔ ایک قابلِ تغیر ہے دوسری ابدی۔ سائنس طبعی حقیقت کا جوہر ہے، مذہب روحانی حقیقت کا جوہر ہے۔ اس دنیا کی کلید ایک سو ایک عناصر کا چارٹ (table of elements of the tangible world) ہے جو طبعی حقیقت کی تشکیل کرتے ہیں اور اس زمینی دنیا کا گنج گراں مایہ ہیں۔ دوسری دنیا کی کلید اللہ کی ان ننانوے صفات کی فہرست ہے جو ''گنج العرش'' ہیں (table of elements of the Intangible world) اور غیر مرئی دنیا کی تشکیل کرتی ہیں۔

اعلا و بالا حقیقت کو ایٹموں اور عناصر و مرکبات کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ اس اعلا و بالا حقیقت کو سمجھے بغیر سائنس ہمیشہ صرف طبعی اور جسمانی دنیا کی پست سطح تک محدود رہے گی۔ ایک متوازی دنیا کی حقیقت (reality of the Parallel World) کو پہچانے بغیر ہماری سائنس متناقض اور خیالی ہی رہے گی۔ انسان کی اعلاتر صلاحیتیں مثلاً احساس، فکر، شعور، امنگ، وجدان، تخلیقیت، طباعی، شاعری، عشق، مہر و مروت، یادگیری، خدا، غرض ہر وہ چیز جو انسان کو انسان بناتی ہے، اس کی رسائی سے باہر ہی رہ جائے گی۔ عشق، ذہن اور روح کی دنیا تو ہمیشہ عقل واستدلال اور سائنس کی حد سے ماورا ہی رہے گی۔ انسان کے یہ حیات بخش پہلو؛ انسانی احساسات، اس کا وجود، اس کی قسمت اور اس کا مستقبل ایٹم، عنصر اور مرکب کے طبعی نظریات کی مدد سے بیان نہیں کیے جا سکتے۔ طبعی کائنات کی خصوصیات بیان کرنے والے ایک سو ایک عناصر کو پہچاننے میں انسان کو دو ہزار سال لگ گئے ہیں۔ لیکن یہ عناصر بھی کائنات کا صرف جزوی علم ہی عطا کرتے ہیں یعنی صرف عالمِ شہادت کی توضیح وتشریح کرتے ہیں اور اعلاتر ماورائی حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے۔ اس

Marfat.com

اعلاتر حقیقت کو اللہ کی ننانوے صفات بیان کرتی ہیں۔ یہ اس متوازی دنیا کی کلید ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک سو ایک عناصر مادی دنیا کی وضاحت کرتے ہیں، ویسے ہی ننانوے اسمائے الٰہی (اسماء الحسنٰی: لغوی مطلب، بہترین نام) میں سے ہر ایک اللہ کی ایک مخصوص صفت کا اظہار کرتا ہے جو روحانی دنیا کی وضاحت کرتی ہے۔ اللہ کی یہ ننانوے صفات عالمِ غیب (نادیدہ حقیقت) کی کلید ہیں۔ اگلے غالباً ایک ہزار سال کی درست سائنسی تحقیق شاید انسان کو اس قابل بنا سکے کہ وہ خود آگہی کے اس مسلسل سفر میں اصل بھید تک پہنچ جائے اور نہ صرف Know Thyself کا راز اس پر منکشف ہو جائے بلکہ وہ اپنی خارجی حقیقت کو بھی پہچان لے۔

نئی فزکس:
New Physics

نئی فزکس متوازی دنیاؤں کی موجودگی کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے۔ یہ ایک نئی اور زیادہ مجرد سمت ہے۔ ایک ایسی سمت جو حقیقت کی موجودہ دورخی اور منتشر تعبیروں سے بالاتر ہے اور جو ہمیں اپنی دنیا کی تصویر کو ایک وحدت میں بدل دینے کی شدید ضرورت سے آشنا کرتی ہے۔ اس متوازی کائنات کا ادراک پہلی بار ۱۹۵۷ میں پرنسٹن یونی ورسٹی کے ماہرِ طبیعات (Physicist: Hugh Everett III) ہیوج ایورٹ III نے کیا تھا۔ ماہرینِ طبیعیات تب سے متوازی کائنات کے نظریے اور اس کی ساخت کو سمجھنے کے لیے تجربات کر رہے ہیں۔ دیکھیے یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، لاس اینجلس کے فریڈ ایلن وولف (Fred Allan Wolf) جو نظریاتی طبیعیات میں ڈاکٹریٹ ہیں اور *Parallel Universes* نامی کتاب سمیت دیگر کئی کتب کے مصنف بھی ہیں، اس بارے میں کیا لکھتے ہیں:

> ''متوازی کائنات کیا ہے؟ یہ ہماری روزمرہ کی کائنات کی طرح زمان و مکاں پر مشتمل ایک علاقہ ہے جس میں مادہ ہے، کہکشائیں ہیں، ستارے، سیارے اور جاندار مخلوقات ہیں۔ متوازی کائنات بالکل ہماری اپنی کائنات جیسی ہے بل کہ شاید اس کی ہو بہو نقل ہے۔ صرف یہی نہیں بل کہ متوازی کائنات میں ہم جیسے انسان بھی ہیں جو ہو بہو ہمارا ہی عکس ہیں اور ایک مکینکی تار کے ذریعے ہم سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس رشتے کو صرف کوانٹم فزکس کے نظریات کی مدد سے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔''

Marfat.com

عام فزکس اور کوانٹم فزکس:
General Physics and Quantum Physics

ارسطو کی طبعیات کی رو سے جب کسی چیز پر مسلسل قوت لگائی جاتی ہے تو وہ لگاتار حرکت کرتی رہتی ہے۔ جب کیپلر اور گلیلیو نے اس حرکت کا جائزہ لیا تو انھیں معلوم ہوا کہ یہ حرکت دراصل دو آزادانہ عمل کرنے والی قوتوں کا نتیجہ ہے۔ ان میں سے ایک تو عمودی سمت میں دھکیلنے والی قوت ہوتی ہے اور دوسری ایک سکونی یا جمودی طاقت ہوتی ہے جو ایک افقی توازن پیدا کرتی ہے۔ گویا یہ دو قوتیں ہیں جن میں سے ایک حرکت پیدا کرتی اور دھکیلتی ہے اور دوسری روکتی اور واپس کھینچتی ہے۔ یہ ایک بہت اہم مشاہدہ تھا جس نے ارسطو کے، حرکت کی قوتوں کے بارے میں تجزیے کی اصلاح کی۔ اس دریافت کے ساتھ ہی نیوٹن کی دریافت کی بنیاد قائم ہو گئی تھی۔ نیوٹن نے ایک تفریقی مساوات $F= ma$ کے ذریعے ان دونوں قوتوں کے باہمی تعامل کی مقدار کا تعین کر دیا۔ یوں اس نے ریاضیاتی طور پر دو قوتوں کے درمیان متوازی و معکوس رشتے کا تعین کیا۔ پہلے میکس ویل (Maxwell) نے بھی برقی اور مقناطیسی توانائی کی مساواتیں دریافت کی تھیں۔ فرانسیسی ماہر طبیعیات آندرے ماری ایمپیر (Andre Marie Ampere) نے یہ دریافت کیا کہ اشیا میں برقی توانائی چکر (cycle) کی صورت میں گردش کرے تو ان میں مقناطیسی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں دراصل آندرے نے جو نکتہ دریافت کیا تھا وہ نفی (-) اور اثبات (+) کی قوتوں کی گردش کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ اب ہم اسے منفی اور مثبت (positive and negative) کناروں کے درمیان گردش (circulation) کرنے والی بنیادی برقی توانائی کے طور پر جانتے ہیں۔ جن تاروں سے برقی رو گزرتی ہے وہ بالکل مقناطیس کی طرح عمل کرتے ہیں۔ جس طرح لوہے کے ایک عام مقناطیسی ٹکڑے کے دونوں کنارے ایک دوسرے کو کھینچنے اور دھکیلنے کی قوت پیدا کر لیتے ہیں اسی طرح برقی توانائی رکھنے والے تار بھی ایسی ہی قوت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اس نے مقناطیس کے شمالی اور جنوبی کناروں کے مقناطیسی میدان (Magnetic field) اور برقی توانائی کے منفی اور مثبت سروں کے مطالعے کے ذریعے ان دونوں کناروں کے درمیان ہونے والی حرکت اور کشش (pull) اور گریز (push) کی قوتوں کے باہمی تعامل کا مشاہدہ کیا۔ سائنس نے ان تجربات کے نتیجے میں جو چیز دریافت کی وہ دراصل یہی متوازی معکوس کا باہمی تعامل (Interactions of Parallel Inversions) ہے۔ خدا (+) اور انسان (-) بھی اسی طرح کی ایک مساوات میں جکڑے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

انگریز ماہرِ طبیعیات مائیکل فیراڈے (Michael Faraday) جو ۱۷۹۱ میں پیدا ہوا، تجرباتی فزکس میں ایک نابغہ تھا۔ اس نے برقی مقناطیسی امالہ (electromagnetic induction) اور برقی مقناطیسی میدان (electromagnetic field) کا نظریہ متعارف کرایا۔ فیراڈے کا تجربہ بہت سادہ تھا۔ اس نے بس ایک عام مقناطیس کا ٹکڑا لیا اور اس کے شمالی اور جنوبی کناروں کو ایک تار کے ذریعے ایک چکر کی صورت میں گھمایا۔ اس نے دیکھا کہ چکر کھاتے ہوئے مقناطیس نے تار میں برقی توانائی پیدا کر دی ہے۔ اس چھوٹے سے تجربے نے مقناطیسی اور برقی توانائی کے درمیان موجود ہم آہنگی ظاہر کر دی۔ اصل میں اس نے ڈائنمو (Dynamo) کا بنیادی اصول دریافت کیا تھا جس کی مدد سے کسی تار کے چھلوں کو مقناطیسی میدان سے گزار کے اس میں برقی رو پیدا کی جاتی ہے۔ فیراڈے نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ کسی کاغذ کے اوپر لوہچون کے ذرات رکھ کر جب کاغذ کے نیچے مقناطیس پھیرا جاتا ہے تو لوہچون کے ذرے کس طرح مقناطیس کے شمالی اور جنوبی کناروں کے درمیان قطاروں کی صورت میں نئی ترتیب بنا لیتے ہیں۔ اس سے فیراڈے نے یہ نتیجہ نکالا کہ مقناطیسی قوت کا اثر پورے مکان (Space) پر ہوتا ہے۔ پھر سکاٹ لینڈ کے ماہر طبیعیات کلرک میکس ویل (Clerk Maxwell) نے اس قوت کی مقدار کا تعین کیا۔ اس نے دریافت کیا کہ ریڈیائی لہریں اور روشنی کی لہریں، جو خلا میں پھیلی ہوئی ہیں، برقی مقناطیسی عمل کا حصہ ہیں۔ کیا یہاں ہمیں کوئی متوازی حقیقت یاد آتی ہے؟

آئن سٹائن نے اپنی تحقیق کے دوران یہ دریافت کیا کہ زمان اور مکان (time and space) ایک ہی حقیقت کے ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکنے والے دو پہلو ہیں۔ اس کی معروف مساوات E= MC2 جس کا نتیجہ ایٹم بم کی دریافت کی صورت میں سامنے آیا، مادے اور توانائی کے درمیان موجود متوازی معکوس رشتے کی شماریاتی صورت ہے۔ مادہ اور توانائی ایک دوسرے میں کیسے تبدیل ہوتے ہیں؟ نیوٹن کا قانونِ حرکت دیکھیے:

''ہر عمل کا ایک مساوی اور متضاد ردِ عمل ہوتا ہے۔'' (For every action there is an equal and opposite reaction)

یہ اتنا بنیادی اصول ہے کہ ہر حقیقت پر صادق آتا ہے۔ یہ دو متوازی قوتوں کی نشان دہی کرتا ہے جو ایک دوسرے سے مساوی مگر معکوس تعامل (parallel inverse interactions) میں جکڑی ہوئی

Marfat.com

ہیں۔ نیوٹن نے ایسی مشین دریافت کی تھی جس میں اصول مستقل، مطلق، ریاضیاتی طور پر تعین شدہ، قابلِ پیش گوئی اور یقینی تھے۔ نیوٹن نے ہمیں جو قوانین حرکت دیے وہ ارضی دنیا پر لاگو ہوتے تھے اور آئن اسٹائن نے ان قوانین کا اطلاق آسمانی دنیا اور سماوی اجسام پر کیا۔ اسی سے ہمیں کائنات کی وسعت اور اس کی نمود کے بارے یقینی نظریاتی فہم حاصل ہوا۔ یہ حقیقت کا بیرونی نقطۂ نظر (Outer view) یعنی ظاہر تھا۔

تاہم جب کوانٹم حقیقت یعنی حقیقت کے خوردبینی روپ کے مطالعے کی نوبت آئی، جو حقیقت کا اندرونی نقطۂ نظر (Inner view) یعنی باطن ہے تو ہم نے دیکھا کہ حقیقت فزکس کے عمومی اصولوں سے بالکل مختلف بل کہ الٹ تھی۔ کائنات بھی انتہائی صورتوں کا اظہار ہے؛ یا تو ایٹم اور اس کے اندرونی اجزا کی طرح بالکل ننھی سی، اور یا خلا میں پھیلے ہوئے ستاروں اور کہکشاؤں کی طرح بہت وسیع وعریض اور عظیم الجثہ۔ ہمارے معاصر ماہرینِ طبیعیات اس بات پر حیران ہیں کہ آئن سٹائن نے ہمیں جو عمومی اضافیت کے قوانین دیے ہیں وہ کائنات کے ستاروں اور کہکشاؤں جیسے وسیع وعریض پہلو پر تو صادق آتے ہیں لیکن ایٹم اور تحتِ ایٹم ذرات پر مبنی خوردبینی کائنات پر لاگو نہیں ہوتے۔ نہ صرف یہ بلکہ کائنات کے ان دونوں پہلوؤں پر لاگو ہونے والے قوانین ایک دوسرے سے بالکل متضاد اور الٹ ہیں اور ان فلسفیانہ نظریات کے جوڑوں کے مماثل ہیں جن کا ذکر ہم نے چوتھے باب میں کیا تھا۔ عمومی اضافیت (General relativity) اور کوانٹم مکینکس (Quantum Mechanics) دونوں نظریے بیک وقت غلط نہیں ہو سکتے۔ یہ وہ مشکل ترین معما ہے جس کا آج کے سائنس دان کو سامنا ہے۔

تحت ایٹم حقیقت کے اندرونی نقطۂ نظر (باطن) پر کام کرتے ہوئے ہائزن برگ (Heisenberg) نے اصولِ عدم تیقن (Principle of Uncertainty) دریافت کیا۔ نیوٹن کے بیرونی نقطۂ نظر (ظاہر) کے برخلاف ایٹم کے اندر کی دنیا میں کچھ بھی متعین اور طے شدہ نہیں۔ یہاں لامحدود امکانات کے سوا کسی شے کا تعین نہیں ہو سکتا۔ یہاں، ایٹم کے اندر، حقیقت بیک وقت ایک غیر متعین موج (Intangible wave) بھی ہے اور متعین ذرہ (tangible particle) بھی۔ ڈنمارک کے ایک ماہر طبیعیات نیلز بور (Niels Bohr) نے آخر کار اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ موج اور ذرے کی یہ ثنویت درحقیقت ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے اس کا معروف نظریۂ تکملیت (Law of Complimentarity) یہ ثابت کرتا ہے

Marfat.com

کہ کوانٹم حقیقت کی وضاحت کے لیے موج (غیر مادی) اور ذرہ (مادی) دونوں ہی برابر ناگزیر ہیں۔ جب بھی کسی چیز کی حقیقی فطرت کو سمجھنے کا موقع آئے تو اس کے ان دونوں پہلوؤں؛ یعنی موج کے سے غیر مادی پہلو اور ذرے کے سے مادی پہلو، پر غور کرنا لازمی ہے۔ کوانٹم حقیقت بیک وقت ان دونوں پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ لیکن ایک وقت میں ان میں سے ایک پہلو ہی دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ (ذرے پر غور کریں تو موج نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے اور موج کو دیکھیں تو ذرہ غائب ہو جاتا ہے۔) آئن سٹائن نے حقیقت کا بیرونی رُخ دیکھنے کے لیے جو نقطۂ نظر ترتیب دیا تھا وہ اس کے اندرونی رُخ پر لاگو نہیں آتا۔

برائن گرین (Brian Greene) اپنی کتاب *The Elegant Universe* میں لکھتا ہے:

''ماہرین طبیعیات اپنی عظیم ترین سائنسی فتوحات حاصل کرنے کے باوجود، دور افق پر موجود ایک سیاہ بادل کی موجودگی سے باخبر رہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ جدید فزکس کی عمارت کی بنیاد جن دو ستونوں پر قائم ہے ان میں سے ایک تو البرٹ آئن سٹائن کا نظریہ عمومی اضافیت (General Relativity) ہے جو کائنات کی وسعتوں؛ ستاروں، کہکشاؤں اور ان کے نظاموں سے پرے تک دیکھنے اور اس کو سمجھنے کے لیے ایک نظریاتی ڈھانچا فراہم کرتا ہے۔ دوسرا بنیادی ستون کوانٹم مکینکس (Quantum Mechanics) ہے جو کائنات کو اس کی سب سے چھوٹی سطح؛ مالیکیول، ایٹم اور تحتِ ایٹم اجزا مثلاً الیکٹران اور کوارک (quark) کی سطح پر دیکھنے اور سمجھنے کے لیے نظریاتی ڈھانچا پیش کرتی ہے۔ تحقیق میں برس ہا برس صرف کرنے کے بعد ماہرینِ طبیعیات نے تجربات کے ذریعے ان دونوں نظریاتی ڈھانچوں کی بنیاد پر کی جانے والی کم و بیش تمام پیش گوئیوں کے حیرت انگیز حد تک درست ہونے کی تصدیق کر دی ہے۔ لیکن یہی نظریاتی نظام ایک اور پریشان کن نتیجے کی طرف بھی لے جاتا ہے؛ یعنی عمومی اضافیت اور کوانٹم مکینکس دونوں نظریاتی نظام اپنی موجودہ وضع میں بیک وقت درست نہیں ہو سکتے۔ یہ دونوں نظریات جو گذشتہ سو برس کے دوران فزکس کی شاندار ترقی کی بنیاد رہے ہیں، اور جن کی بنا پر فزکس آسمانوں کی وسعت اور مادے کی بنیادی اکائی کو سمجھنے کے قابل ہو سکی ہے، ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے۔

Marfat.com

لیکن یہ عین ممکن ہے کہ کائنات اپنی نوعیت میں انتہائی ہو۔ایک بلیک ہول کی مرکزی گہرائی میں بے حد و حساب مادہ پس پس کر انتہائی چھوٹے، خوردبینی جسامت کے ذروں میں تبدیل ہو رہا ہے۔ابتدائی دھماکے یا بگ بینگ کی گھڑی میں یہ پوری کائنات، ریت کے ذرے سے بھی کئی گنا چھوٹے، ایک ننھے سے خوردبینی ڈھیلے سے پھوٹ نکلی ہے۔یہ وہ آفاق ہیں جو بیک وقت منحنی بھی ہیں اور عظیم الجثہ بھی اور ان پر کوانٹم مکینکس اور عمومی اضافیت دونوں کے اصول بیک وقت لاگو آتے ہیں ۔جب عمومی اضافیت اور کوانٹم مکینکس کی مساواتوں کو اکٹھا کرنے یا جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ کانپنے، کھڑکھڑانے اور لگتی ہیں اور کسی گاڑی کی طرح جس کا انجن گرم ہو جائے، بھاپ سے ابلنے لگتی ہیں۔ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جب ہم آگے بڑھیں گے تو اس کی وجوہات بھی واضح ہو جائیں گی۔کچھ کم تمثیلی انداز اختیار کیا جائے تو ایسے طبعی سوالات ان دونوں نظریات کے امتزاج سے متعلق غیر عقلی جوابات فراہم کرتے ہیں۔حتیٰ کہ اگر آپ بلیک ہول کی اندرونی دنیا اور کائنات کی ابتدا کے لمحے کو اسرار کی دھند میں ملفوف ہی رہنے دیں تو بھی آپ اس احساس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے کہ کوانٹم مکینکس اور عمومی اضافیت کے نظریات کا باہمی تضاد ایک گہری سطح کی تفہیم کی دعوت دے رہا ہے۔کیا یہ ممکن ہے کہ کائنات اپنی بنیاد اور سرشت کے اعتبار سے قوانین کے دو قسم کے مجموعوں کی متقاضی ہو؟ ایک مجموعۂ قوانین بڑی، عظیم الجثہ اشیا پر لاگو ہوتا ہو اور دوسرا، اس کے بالکل الٹ مجموعۂ قوانین ہو جو چھوٹی، خوردبینی جسامت کی اشیا پر لاگو ہوتا ہو؟''

متوازی معکوس، دورُخی حقیقت:

Parallel Inversions, Invertible Reality

نیوٹن کی عمومی فزکس نے دنیا کے ظاہری اور بیرونی رُخ کو سمجھنے کے لیے یہ فرض کیا کہ حقیقت اپنی بنیادی سرشت میں ایٹموں سے مل کر بنی ہے جو اچھلتے، ایک دوسرے کو اپنی جانب کھینچتے اور دھکیلتے ہیں۔یہ ایٹم ٹھوس اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں اور زمان و مکاں میں اپنی اپنی الگ جگہ گھیرتے ہیں۔تمام تر مادہ ایسے ہی ذرات سے مل کر بنا ہے۔نیوٹن کے تصورِ حقیقت میں ہر شے مستحکم، متعین اور قابلِ پیمائش تھی اور بلیرڈ کی گیند سے لے کر

Marfat.com

اجسامِ سماوی تک ہر شے مطلق، ریاضیاتی اصولوں کے تابع تھی۔ نیوٹن کی فزکس کے تحت ہر قسم کی حرکت یکساں اور قطعی قوانین کے تحت تھی، جس کا تعین کیا جا سکتا تھا، ناپا جا سکتا تھا اور جو کسی خودکار مشین کی طرح یقینی تھی۔

کوانٹم فزکس نے تحتِ ایٹم (Sub-atomic) سطح پر دنیا کے اندرونی رُخ کے بارے میں جو تصور قائم کیا وہ یہ تھا کہ حقیقت کبھی تو موج کی طرح ایک غیر مادی شے ہوتی ہے اور کبھی ذرے کی طرح مادی۔ چوں کہ دونوں میں سے کوئی حالت بھی اپنی جگہ مکمل نہیں ہوتی اس لیے حقیقت کی پوری تصویر دونوں سے مل کر ہی بن سکتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم بیک وقت دونوں سطحوں پر توجہ نہیں دے سکتے۔ حقیقی مکان غیر متعین ہے اور اس لیے ہر شے غیر متعین ہے۔ غیر متعین ہونے کی بنا پر کوئی چیز بھی قابلِ پیش گوئی نہیں ہے۔ کچھ بھی متعین اور مستقل نہیں ہے۔ ہر چیز عدم تیقن (uncertainty) کے ماتحت ہے۔ دنیا میں امکانات اور قیاسات کا ایک انبوہِ کثیر ہے۔ اس نظریے کے مطابق علیحدگی کا کوئی تصور نہیں ہے؛ نہ ہی یکساں اور ہموار حرکت کا کوئی امکان ہے۔ اس کے برعکس حرکت کے دوران ابھار ہیں، چھلانگیں ہیں، اچھل کود ہے۔ اشیا اور واقعات وحوادث، زمانی اور مکانی دونوں اعتبار سے الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور حیرت انگیز حد تک مربوط زمان ومکان سے منسلک ہیں۔ یہ ایک عظیم تر کل (whole) کے مختلف پہلوؤں کے طور پر عمل کرتے ہیں اور اسی ''کل'' سے اپنی انفرادی اہمیت اور معنویت اخذ کرتے ہیں۔ تمام چیزیں اور تمام لمحے ہر مقام پر ایک دوسرے کو چھو کر گزرتے ہیں۔ اس مجموعی نظام کی عظیم الشان وحدت، ہستی کی وحدت (oneness of Being) کے قدیم یونانی نظریے کو تقویت دیتی ہے۔

عمومی فزکس یا حقیقت کا بیرونی رُخ (ظاہر) اور کوانٹم فزکس یا حقیقت کا اندرونی رُخ (باطن) متوازیِ معکوس ہیں اور متوازی معکوس کے سادہ اصول کے تحت کام کرتے ہیں۔ یہ معکوس سچائی اور الٹ جانے والی حقیقت کی مثالیں ہیں۔ یہ معکوس قوانین عالمِ شہادت اور عالمِ غیب یعنی یہ دنیا اور اس کے متوازی دنیا کے درمیان موجود الٹ جانے والے رشتے کی گواہی دیتے ہیں۔ اس مساوات کے بارے میں مزید بات آگے چل کر کریں گے جب ہم اس نظریے کو مزید آگے بڑھائیں گے۔

عالمِ فطرت میں صرف چار بنیادی قوتیں (four fundamental forces) ہیں۔ ان میں سے دو تو جانی پہچانی اور متعین ہیں یعنی برقی مقناطیسی قوت اور کششِ ثقل کی قوت جن کی پیمائش کی اکائیاں بالترتیب

Marfat.com

فوٹون اور گریویٹون (photon and the graviton) ہیں۔ یہ حقیقت کا بیرونی رُخ ہے۔ دوسری دونوں قوتیں اس وقت تک نادیدہ رہتی ہیں جب تک ہم ایٹم کے مرکزے (nucleus) میں گہرا اتر کر نہ دیکھیں۔ یہ حقیقت کا اندرونی رُخ ہے۔ یہ قوتیں نیوکلیائی کہلاتی ہیں اور ان کی بھی دو قسمیں ہیں: کمزور قوت (weak) اور شدید قوت (strong)۔ کمزور نیوکلیائی قوت، دھکیلنے والی (repulsive) اور کم مدت (short-range) کی قوت ہے جو زوال اور فنا کا باعث بنتی ہے جب کہ شدید قوت ذروں کو مرکزے سے جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ پہلی قوت دھکیلتی ہے اور ریڈیائی انحطاط (radioactive decay) کا باعث بنتی ہے جب کہ دوسری مرکزے سے جوڑتی ہے۔ آئن اسٹائن کو امید تھی کہ کوئی ایسا وحدت انگیز نظریہ (unified theory) ضرور ہوگا جس کے تحت کسی نہ کسی طرح تمام معلوم قوتوں کا ایک ہی قوت سے نکلنا ثابت ہو جائے گا۔ ایسا کوئی مسلمہ وحدانی نظریہ نہیں ہے۔ یہ میدان تحقیق کے لیے کھلا ہے۔ عمومی فزکس اور کوانٹم فزکس کے درمیان موجود تضادات اور اختلافات کو دور کرنے اور فزکس کے نظریات میں وحدت پیدا کرنے کے لیے ایسا کوئی نظریہ وضع کرنا وحدت پیدا کرنے کے صرف ایک امکان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پہلے برقی اور مقناطیسی قوتوں کو الگ الگ قوتیں سمجھا جاتا تھا لیکن اب ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی قوت یعنی برقی مقناطیسی (electro-magnetic) قوت کے دو مختلف پہلو ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ان چاروں قوتوں کے درمیان بھی ایسی ہی کوئی وحدت دریافت ہو جائے جو آج الگ الگ دکھائی دے رہی ہیں؟

اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ یہ چاروں قوتیں دراصل متوازی معکوس (law of parallel inversion) کے سادہ سے اصول کے تحت کام کرتی ہیں۔ اسحاق نیوٹن کے قوانینِ حرکت (laws of motion)، آئن اسٹائن کا نظریۂ اضافیت (Law of Relativity)، ہائزن برگ کا اصولِ تکمیلیت (Law of Complementarity) اور نیلز بور کا نظریہ عدم تیقن (Law of Uncertainty)، یہ سب کے سب سادہ سے اصولِ متوازی معکوس (Law of Parallel Inversions) کی مدد سے واضح کیے جا سکتے ہیں۔ یہ وہی اصولِ وحدت ہے جو آئن اسٹائن کی عمر بھر کی تلاش کا مرکز رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ فطرت کی اس ظاہری بدنظمی اور انتشار کے پس پردہ جو ایک پراسرار تنظیم و ترتیب ہے یہ دراصل ایک ریاضیاتی پہیلی کے مترادف ہے جس کا جواب انتہائی سادہ اور آسان ہے۔ عالمِ شہادت اور عالمِ غیب متوازی حقیقتیں ہیں۔ ہماری روزمرہ کی دنیا کی حقیقت دراصل عالمِ غیب کا عکس ہے۔ دورُخی تصویر (reversible figure) کا

Marfat.com

بھی ایک وقت میں ایک ہی رُخ دیکھا جا سکتا ہے لیکن اس تصویر کے دونوں رُخ ایک دوسرے سے الگ الگ حقیقت نہیں رکھتے۔ یہ دونوں رُخ بھی ایک دوسرے کے متوازی قائم رہتے ہیں۔ایک دوسرے میں گتھے ہوئے، ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، مگر جدا جدا بھی۔ دونوں ہی ایک جتنے سچے اور حقیقی۔ لہٰذا حقیقت انسانی مرضی یا انتخاب پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ دونوں میں سے کسی ایک رُخ کی تفہیم و تعبیر ہے۔ حقیقت دراصل دو کو ایک کرنے کا نام ہے۔ یہ سادہ اور غیر مرئی نظریہ وحدت جسے جدید سائنس تلاش کر رہی ہے اور جو سائنس دانوں کے لیے اوکیم ریزر (Occam's Razor) کے مترادف ہو سکتی ہے، متوازیِ معکوس کا اصول (Law of Parallel Inversions) ہے۔

سائنس پوری کی پوری، حقیقت کا الٹا یا معکوس رُخ ہے لیکن ہے بالکل حقیقی۔۔۔ پرنٹر سے نکلے ہوئے پرنٹ شدہ ورق کی طرح جس پر کمپیوٹر سکرین کا معکوس رخ ہوتا ہے۔ کارڈز سے کیا جانے والا تجربہ ہو، مشین سے متحرک تصویریں دکھانے والا (cinematographer) ہو، مصور ہو، دست کار ہو، فلسفی ہو یا سائنس دان، کوئی بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ ان سب پر یکساں طور پر منطبق ہوتا ہے اور اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ظاہر فریب کیوں دیتا ہے، کیمرے سے لی گئی تصویر کی طرح انسانی فہم و ادراک بھی حقیقت کے برعکس کیوں ہوتا ہے؟ نظر آنے والی حقیقت (ظاہر)، اندرونی حقیقت (باطن) کا عکس معکوس ہوتی ہے۔ عالم شہادت (مرئی) عالمِ غیب (غیر مرئی) کا عکسِ معکوس ہے اس اصول کی مکمل تفہیم اور اطلاق آنے والے زمانوں کی تحقیق کے منتظر ہیں۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ مرئی دنیا تو علت اور معلول (cause and effect) کی دنیا ہے اور غیر مرئی دنیا معلول اور علت (effect and cause) کی دنیا ہے۔ مکمل سچائی بیک وقت ایک کے اثبات (+) اور دوسرے کی نفی (-) کا نام ہے۔

معلول ہی علّت ہے:
Effect is Cause

یہ اصول بہت سادہ ہے۔ اگر آپ کے پاس ڈش انٹینا ہے تو آپ جانتے ہیں کہ یہ ایک رسیور (receiver) یعنی لہریں وصول کرنے والا آلہ ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لہریں بھیجنے والا (sender) کون ہے؟ اسی سوال کے جواب سے بات مکمل ہوتی ہے۔ لیکن یہ دونوں حقائق ایک دوسرے سے الٹ

Marfat.com

ہیں۔ایک کے اصول دوسرے کے اصولوں کے الٹ ہیں لیکن پھر بھی یہ دونوں مل کر ہی تصویر کو مکمل کر سکتے ہیں۔اسی طرح نر اور مادہ کو دیکھیے ،ایک کا اصول دوسرے کے لیے الٹا ہو جاتا ہے۔یہ دونوں بھی متوازی معکوس ہیں؛ نہ تو ایک دوسرے سے الگ کیے جا سکتے ہیں، نہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے آگے نکل سکتا ہے، نہ دوسرے کو پیچھے چھوڑ سکتا ہے، نہ اسے دبا سکتا ہے، نہ برطرف کر سکتا ہے کیوں کہ یہ دونوں ایک ہی وحدت کے جزو ہیں۔''علت ہی معلول ہے''(Cause is effect)، یہ حقیقت کا معکوس رُخ ہے۔حقیقت کا اصل رُخ یہ ہے کہ''معلول ہی علت ہے''(Effect is Cause)۔اس بات کو آسانی سے سمجھنے کے لیے ایک عمدہ سلے ہوئے کوٹ کو دیکھیے۔نفاست سے سلے ہوئے کوٹ کی ظاہری ساخت اور ہیئت دراصل نتیجہ ہے درزی کی مہارت اور قابلیت کا جس سے وہ کپڑا کاٹتا ہے،اس کے مختلف حصوں پر نشان لگاتا ہے، پیائش کرتا ہے اور پھر اسے سیتا ہے۔لہٰذا کوٹ کے تخلیق کار کے لیے تو معلول ہی علت ہے(Effect is Cause)۔اس لیے کہ درزی کے لگائے ہوئے نشان تو صرف کوٹ کے اندرونی، الٹے حصے پر ہی دکھائی دیتے ہیں۔اسی الٹے حصے کا ترتیب وار تجزیہ کرنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اسے کیسے تیار کیا گیا ہے، کیسے ناپا گیا ہے، کیسے جوڑا گیا ہے؟ یہی حال سائنس دان کے مطالعے اور مشاہدے کا ہے۔سائنس بھی حقیقت کی الٹی طرف کے مطالعے کا نام ہے۔جب کہ مذہب اس کے متوازی سامنے کی طرف پیش کرتا ہے جو حقیقت کا اصلی رُخ ہے۔ابن رشد(Averroes)۱۱۹۰ء ہی میں ارسطو کے نظریات اور روایتی مذہبی تعلیمات میں مطابقت پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔اسے یقین تھا کہ مذہب (faith)اور عقلیت پسندی (reason)میں کوئی تضاد نہیں ہے۔دونوں ایک ہی حقیقت کو مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں اور دونوں ایک ہی خدا کی طرف دیکھتے ہیں۔ انسان کا ظہور وہ نتیجہ یا معلول ہے جس کی وجہ سے کائنات کا تمام تر ارتقا عمل میں آیا اور خدا وہ نتیجہ ہے جو انسان کی آسمانوں کی طرف واپسی کی وجہ بنتا ہے۔تمام تر حقیقت کو اسی رُخ سے دیکھنا چاہیے جو دراصل صحیح رُخ ہے۔لاروا ارتقا کے مختلف مراحل سے اس وجہ سے گزرتا ہے کہ وہ آخر کار تتلی بن سکے اور تتلی ہی اس کا حقیقی معلول اور نتیجہ ہے۔اسی طرح سورج ہی وہ نتیجہ ہے جو زمین پر مختلف افعال کی وجہ بنتا ہے نہ کہ اس کے برعکس۔

حرکت کے تیسرے قانون کے مطابق ہر عمل کا ایک مساوی مگر الٹ ردِعمل ہوتا ہے۔یہ اصول بے معنی ہو جاتا ہے، اگر ایک متوازی مگر الٹ حقیقت کا وجود تسلیم نہ کیا جائے جو عمل اور ردِعمل کی ان دو متضاد حقیقتوں کو ایک مسلسل وحدت میں پروتی ہے۔

Marfat.com

ابھی تک ہماری سائنس نے صرف مرئی اشیا(Tangible Reality) کی پیائش اور تعین کا عمل سیکھا ہے۔ یہ نیا اصول سائنس کو غیر مرئی (Intangible Reality) کی پیائش اور تعین سکھاتا ہے۔ یہ اصول نئے آفاق کے در کھولتا ہے اور مستقبل کی سائنس کو امکانات کی ان کہی اور ان سنی وسعتوں سے ہم کنار کرتا ہے۔ یہ انسان کو ایک نئے غیر مرئی عہد(Age of the Intangible) کی دہلیز پر لا کھڑا کرتا ہے۔ کائنات کی اس متوازی حقیقت کو تسلیم نہ کیا گیا تو تمام تر سائنس روز بروز بے معنی، نا کارہ، تضادات سے بھرپور اور عقل سلیم سے محروم ہوتی جائے گی۔ یہ نوشتۂ دیوار ہے۔ اب ہمارے پاس یہی واحد راستہ ہے۔

توازن کا اصول:
Principle of Balance

متوازی معکوس کا اصول دراصل توازن کا اصول ہے جس پر تمام تر اشیا کی بنیاد قائم ہے کیوں کہ ہر شے استحکام کی خواہاں ہے۔ اگر آپ کی کار میں ایکسلریٹر ہے تو اس میں بریک بھی ضرور ہونی چاہیے۔ یہ بالکل عام فہم بات ہے۔ ہائزن برگ اور نیلز بور کے نظریات گمراہ کن ہیں۔ یہ ان کا اصول تکمیلیت (Law of Complementarity) نہیں جو ان مساواتوں پر لاگو ہوتا ہے یعنی ایک کا نقصان دوسرے کا فائدہ ہے۔ اصل میں یہ باہمی طور پر مربوط متوازی معکوس کی مثالیں ہیں جو کوانٹم تضاد کی آخری اور حقیقی معنویت اور اہمیت ظاہر کرتی ہیں۔ اگر نقصان ہی فائدہ ہے تو فائدہ بھی نقصان ہوسکتا ہے۔ انسان بیک وقت دو متضاد حقیقتوں کا مرکب ہے۔ ان میں سے ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان ہے۔ وہ کون سی مساوات ہے جس کے ذریعے ان دونوں میں توازن قائم کیا جا سکے اور استحکام پیدا کرنے کے لیے انھیں مسلسل حالتِ توازن میں قائم بھی رکھا جا سکے؟ فطرت میں تو یہ توازن طے شدہ قوانینِ فطرت کے ذریعے قائم رکھا جاتا ہے۔ انسان کو ارادے کی آزادی حاصل ہے اس لیے اس توازن کو وہ اپنی مرضی اور ارادے سے قائم کرسکتا ہے۔ اگر وہ اپنے اختیار اور ارادے کے ذریعے یہ توازن قائم نہیں کرتا تو حالات کی قوت خود بخود اسے قائم کردے گی۔ ماحولیاتی اور معاشرتی ارتقا انسان کو مجبور کردے گا کہ وہ اس اصول کی پابندی کرے یا پھر معدوم ہونے کے لیے تیار ہو جائے؛ جیسا کہ پہلے بھی انسانی تاریخ کے سفر میں ہوتا آیا ہے۔ انسانوں کو اس ابھرتی ہوئی حقیقت کو لازماً اپنانا پڑے گا۔ ان کے پاس یہ واحد اختیار ہے۔ یا تو اس اختیار کو استعمال کریں یا پھر نابود ہو جائیں۔ یا تو جیت ہار میں کھوئے رہیں اور یا توازن

Marfat.com

کی راہ اختیار کر لیں۔ اگر زندگی ایک ایسا معاملہ ہے جس میں ہم یا جیت جاتے ہیں یا ہار جاتے ہیں تو اس کھیل میں برابر رہنے کے بارے میں کیا خیال ہے جو سب کے لیے فتح کے برابر ہوگا کیوں کہ نہ کوئی جیتے گا، نہ کوئی ہارے گا۔ زندگی میں بھی نہ کوئی جیتتا ہے نہ ہارتا ہے بل کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اس کشتی کی حفاظت کے لیے توازن قائم رکھنا بہت ضروری ہے۔ دوسری حقیقت کو دبا لینا یا برطرف کر دینا کشتی کا توازن بگاڑ دے گا اور انسانیت کو خطرے میں ڈال دے گا۔ یہ کوانٹم فزکس کی حقیقی اہمیت ہے جو مستقبل کی ابھرتی ہوئی سائنس ہے۔ صرف معاشرتی یا انسانیاتی علوم کا ماہر سائنس دان ہی اس ابھرتی ہوئی اعلا تر سائنس کی تعبیر و توضیح کر سکتا ہے۔

لوک ثقافت سے فلسفے تک:
Folklore to Philosophy

لوک ثقافت کے ماہر کی حیثیت سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے دوران میں نے پوسٹروں کے ذریعے تین اشتہاری مہمات ترتیب دی تھیں۔

پہلی مہم کے لیے عنوان تجویز کیا گیا تھا، ''لوک ورثہ ہماری آگہی ہے'' (Folklore is our Awareness)۔ اس عنوان میں تضاد نمایاں تھا کیوں کہ یہ مٹی اور شعور کا ملاپ تھا لیکن پھر بھی جملہ قبول کر لیا گیا۔ دوسرا جملہ آرٹ کے طالب علموں کو پوسٹر بنانے کے ایک مقابلے کے لیے بطور عنوان دیا گیا تھا۔ جملہ تھا، ''کاری گری علم ہے اور تخلیق کار جانتا ہے (Craft is Knowledge and the Creator Knows)۔ طالب علم اس جملے کی معنویت پوری طرح نہیں سمجھ سکے لیکن پھر بھی اس مقابلے میں اچھے پوسٹر تیار ہو گئے۔ تیسرا جملہ تھا، ''لوک ورثہ ہمارے قدموں تلے کی دھرتی ہے اور مذہب ہمارے سروں پر تنا آسمان ہے۔'' (Folklore is the Soil Below and Religion is the Sky Above) کوئی بھی اس مساوات کو نہ سمجھا۔ دانش وروں نے تیوریاں چڑھائیں اور نچلی سطح پر جو کچھ بھی سمجھا یا قبول کیا گیا تھا، اسے حقیقت کی بلند تر سطح پر نا قابلِ قبول قرار دے دیا گیا۔ یہ تجربہ میرے لیے بہت کار آمد ثابت ہوا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ دانش وروں کا فہم و ادراک کتنا دور کھا اور ناقص ہوتا ہے۔ سائنس دان بھی انسان ہوتے ہیں اور وہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔

Marfat.com

لوک گلوکاروں اور دستکاروں سے اپنے چالیس سالہ ربط ضبط کے دوران ہوا یہ کہ لوک گیتوں نے مجھے فلسفے کی طرف متوجہ کیا اور دست کاری نے سائنس کی طرف۔ جب میں نے فلسفے اور سائنس کے ارتقا کی تاریخ پڑھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارا فلسفہ لوک ادب سے برآمد ہوا ہے اور سائنس دست کاری کے فن سے۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ معکوس رشتے کی متوازی حقیقتیں۔

سائنس اور مذہب متوازیِ معکوس ہیں:
Science and Religion are Parallel Inversions

اسی طرح سائنس اور مذہب بھی متوازیِ معکوس ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی سلسلے کے دو انتہائی کنارے ہیں۔ یہ دیکھنے میں میکانکی فزکس اور کوانٹم فزکس کی طرح ایک دوسرے کے متضاد، برعکس، الٹ اور مختلف سمتوں میں سفر کرتی ہوئی منفرد اکائیاں معلوم ہوتی ہیں لیکن اندر سے دونوں ایک ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ سائنسی علوم کے ابتدائی اور عظیم ترین ماہرین سب کے سب عیسائی کلیسا کے پادری تھے۔ برونو اور کوپرنیکس حق کے سب سے بڑے متلاشی تھے اور انھوں نے سچے دل سے خود کو اس مقدس مقصد سے وابستہ کر رکھا تھا۔ انھوں نے مذہبی جوش و خروش سے اپنا کام کیا لیکن بد قسمتی سے کلیسا برگشتہ اور بد عنوان ہو چکا تھا۔ چارلس ڈارون کی بھی اپنے کام سے وابستگی اور مستقل مزاجی مثالی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ دراصل خدا کا کام کر رہا ہے۔ اسحاق نیوٹن، جو سترھویں صدی کے اواخر میں، اپنی وفات سے بہت پہلے، عظیم ترین سائنس دان کی حیثیت سے معروف ہو گیا تھا، انتہائی مذہبی آدمی تھا۔ بلکہ اس کی مذہب پسندی تو تقریباً انتہا پسندانہ اور کٹر، متشدد جذبات سے لبریز تھی۔ اس نے اپنا وقت فزکس سے کہیں زیادہ علم اکسیر اور انجیل کی توقیت میں صرف کیا تھا۔ نیوٹن کے خفیہ کاغذات کی ایک کثیر تعداد علم اکسیر، کلیسائی تاریخ اور انجیل کے موضوعات پر اس کے ہاتھ کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ نیوٹن در پردہ موحد (unitarian) تھا۔ اٹھارھویں صدی میں نیوٹن کو ایک ایسے اولین اور عظیم ترین جدید اور عقلیت پسند سائنس دان کی حیثیت سے بہت احترام اور ناموری حاصل ہوئی جس نے انسان کو غیر جذباتی رہ کر غور و فکر کرنے کی تعلیم دی، لیکن سچ یہ ہے کہ وہ عقلیت پسندی کے عہد (Age of Reason) کا پہلا آدمی نہیں تھا؛ دراصل وہ تو جادوگروں، اکسیر گروں، بابلیوں اور سمیریوں کے عہد (Last of Magicians) کا آخری آدمی تھا۔ البرٹ آئن اسٹائن ایک عارف تھا۔ وہ خدا کو نہایت محبت سے ''بڈھا'' (The Old one) کہہ کر

Marfat.com

مخاطب کرتا ہے اور ۱۹۲۶ میں کوانٹم تھیوری کو صرف اس لیے رد کر دیتا ہے کہ وہ عمومی فزکس (General Physics) کے قوانین کو کوانٹم اصول عدم تیقن (Law of Uncertainty) سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ فطرت اور سائنس میں عدم مطابقت ہو۔ اس کا یہ جملہ بہت معروف ہوا تھا کہ خدا پانسہ نہیں کھیلتا۔ اس کا اصرار تھا کہ کوانٹم مکینکس کے نوزائیدہ نظریات نامکمل ہیں کیوں کہ وہ ہمیں اس ذاتِ قدیم کے اسرار کے قریب تر نہیں لے جاتے۔ آئن اسٹائن کے نزدیک کائنات کی ہر چیز میں ایک عقلی ربط کا ہونا ضروری ہے۔ وہ کسی ایسے شخص کو سچا سائنس دان تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا جو ایک عقلی خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ ''سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی اور مذہب سائنس کے بغیر اندھا ہوتا ہے''۔ آئن اسٹائن کو پختہ یقین تھا کہ سائنس دان کی امیدیں اور اس کے کام کا سب سے بڑا محرک یہ عقیدہ ہے کہ کوئی نہ کوئی ایسی تھیوری (unifying theory) ضرور موجود ہے جو اپنی ہم آہنگی، اندرونی ربط اور ناگزیریت سے ہمیں کائنات کی فطرت کا زیادہ گہرا فہم عطا کرتی ہے اور یوں خود آئن اسٹائن کے اپنے الفاظ میں اس ذاتِ قدیم کے اسرار سے قریب تر لے جاتی ہے۔ اس کے بعد آئن اسٹائن نے اپنی باقی ماندہ زندگی دوسروں سے الگ تھلگ رہتے ہوئے تنہائی اور قدرے مایوسی میں گزار دی کیوں کہ وہ سائنس کے تناقضات میں کوئی وحدت یا مطابقت تلاش نہ کر پایا تھا۔ بے شک مذہب سائنسی جدوجہد کا سب سے بڑا محرک رہا ہے۔

سائنس ایک تخلیقی عمل ہے:
Science is a Creative Undertaking

اصل میں سائنس ایک تخلیقی عمل ہے۔ یہ ایمان اور استدلال، فرضیے (hypothesis) اور خارجی تجربے (experiment) کے باہمی ربط و تعامل کا نام ہے۔ اسی طرح مذہب نے بھی تخلیقی فنون کی ترقی میں عظیم کردار ادا کیا ہے۔ مذہب کے حوالے سے انسان کی لگن اور اس کے کارِ شوق کی عظمت، شان و شوکت، کثرت، حسن و جمال، اور لطافت و وقار کو دیکھنا ہو تو کلیساؤں، مندروں اور مسجدوں کے فنِ تعمیر کو دیکھیے، ان کے در و دیوار پر بنے نقش و نگار اور فن کے حسین و جمیل مرقعوں کو دیکھیے، گنبدوں اور چھتوں کو دیکھیے، ان کی عربی گل کاری، ان کی رنگ آمیزی اور ان کی تصاویر کو دیکھیے؛ تب معلوم ہو گا کہ مذہب نے تخلیقی فنون کی کیسے آبیاری کی ہے۔ بالکل اسی طرح مذہب نے سائنس کی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہمارے سائنسی نظریات اور تھیوریاں بھی کسی تاج

Marfat.com

محل سے کم نہیں جن کے ذریعے انسان نے ایمان اور استدلال میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

فلسفہ اور سائنس بھی ادراک کے روشاک ٹسٹ (Rorschach Test) جیسے ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں چناؤ کے دو راستے ایسے ہیں جو باقی راستوں کی نسبت زیادہ مستقل مزاجی سے سامنے آتے ہیں۔خارجی دنیا کا سائنسی فہم وادراک حاصل کرنے کے لیے رجحانات کے دو اسلوب ابھر کر سامنے آئے ہیں۔حقیقت اپنے آپ کو دو طرح کے انداز میں پیش کرتی ہے۔اب یہ سائنس دان کی اپنی مرضی اور اختیار ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھنے کے لیے ان دو میں سے کس انداز کو اختیار کرتا ہے۔حقیقت کی خارجی خصوصیت تو یہ ہے کہ بیک وقت دونوں انداز درست ہیں۔یوں گویا تمام تر سائنس دراصل ذاتی فہم وادراک (self perception) کا نام ہے اور سائنس دان حقیقت کا جیسا بھی مطالعہ کرتا ہے وہ اس کے ذاتی فہم وادراک کا نتیجہ ہوتا ہے۔عظیم سائنس دان آئن اسٹائن نے، جو فکر کے وجدانی سرچشموں (intuition) پر گہرا یقین رکھتا تھا، اکثر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تمام سائنس دان کسی حد تک خود اپنے ذہن کے تخلیق کردہ نتائج کو فطرت کی کارکردگی پر منطبق کر دیتے ہیں۔سائنس دان ایسے تجربات تشکیل دیتے ہیں جو فطرت کے بارے میں ان کے ذاتی نقطۂ نظر کی تصدیق کر سکیں۔برطانوی ماہرِ فلکیات سر آرتھر ایڈنگٹن (Sir Arthur Eddington) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''ہم نے نامعلوم کے سمندر کے کنارے ایک عجیب وغریب نقشِ پا دیکھا۔پھر اس کی حقیقت اور ابتدا کے بارے میں یکے بعد دیگرے کئی بڑی بڑی تھیوریاں تشکیل دیں۔آخر کار ہم نے اس تخلیقی عمل کو دوبارہ تشکیل دے ڈالا جو اس نقشِ پا کا باعث بنا تھا اور پکار اٹھے، 'دیکھو، یہ تو ہمارا اپنا ہی ہے'!''

سائنس صرف اداکِ ذات (self-perception) ہی نہیں، تکمیلِ ذات (Self-realization) بھی ہے۔جوں جوں انسانی ذات ترقی کرتی ہے، سائنس بھی بدلتی اور وسعت پذیر ہوتی رہتی ہے، نئی آگہی نئے اصول ساتھ لاتی ہے جو اکثر سابقہ اصولوں سے متضاد ہوتے ہیں۔یوں سائنسی ادراک بلند سے بلند تر کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔اگر سائنس ادراک ہی کا نام ہے تو پھر سائنس اصل میں نفسیات ہوگئی۔یہ مشینوں کی نہیں بلکہ انسانی ذہن اور انسانی آگہی کی سائنس ہے۔افسوس کہ ہم نے سائنس کو غلط سمجھا ہے۔سائنس ہمیشہ ذہن کا عمل رہی ہے مادے کا نہیں، خواہ دیکھنے میں یہ ایک جسمانی عمل ہی کیوں نہ لگتی رہی ہو۔اس تضاد نے ہمیشہ ہمیں گم راہ کیا ہے۔ابھی تک سائنس دان ہمیشہ اسے ایک میکانکی نظام

Marfat.com

(Mechanism) کے طور پر پیش کرتے آئے ہیں حالاں کہ یہ ہمیشہ سے ذہنی نظام (Mind) رہا ہے۔ یہ ہر اس شخص کا مسئلہ رہا ہے جو کسی خیال کو صورت عطا کرتا ہے۔ تمام تخلیقی مظاہر کرافٹ یا فن کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن درحقیقت نظریہ یا تھیوری ہی ہوتے ہیں۔

تضادات کی تقلیب:
Transformation of Polars

کیس سٹڈی کے طور پر ہمارے روایتی خاندانی نظام کی مثال لیجیے؛ اس نظام میں باپ کا کردار حاکمانہ اور آمرانہ ہوتا ہے جب کہ ماں شفقت، محبت اور اطاعت کا پیکر ہوتی ہے۔ باپ، سربراہِ خاندان کے طور پر روزی کمانے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور گھر سے باہر کے امور نمٹاتا ہے اور ماں گھر کے اندر رہ کر بچوں کی پرورش اور گھریلو امور کی نگران ہوتی ہے۔ یہ ہمارے روزمرہ تجربات کا حصہ ہے۔ لیکن مرد اور عورت کے یہ کردار وقت کے ساتھ ساتھ اتنے مختلف اور متضاد نہیں رہے اور اب ان میں اتنی واضح تقسیم نظر نہیں آتی۔ آج کل عورتیں بھی مردوں کے برابر ہیں۔ وہ باہر نکل کر مردوں کے دشوار گزار مشاغل اختیار کر رہی ہیں اور مرد گھر بیٹھے برتن دھونے، بچے سنبھالنے، جنسی امتیاز سے عاری لباس پہننے اور آرائشِ حسن کے مراکز میں وقت گزارنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ حالاں کہ ابھی کچھ عشرے پہلے ہی کی بات ہے کہ شجاعت اور طاقت سے بھرپور شریف، مہذب اور حسین دوشیزاؤں سے محبت جتانے والے جانبازوں (knights) کا شہرہ تھا۔ مردانگی پر اس قدر زور دیا جاتا تھا کہ کوئی مرد دوسروں کے سامنے آنسو بہانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آنسو مردانگی کے خلاف اور عورت کا ہتھیار سمجھے جاتے تھے۔ آج یہ سب نظریات کہاں گئے؟ اب سب کچھ بدل گیا ہے۔ ایک عہد تھا جو گزر گیا اور وقت قطبین میں تقسیم شدہ دور (Bi-polar age) سے آگے نکل آیا ہے۔ مرد کے حاکمانہ تسلط اور غلبے پر قائم خاندانی نظام جس میں باپ خدا کے مصداق تھا، مرد اور عورت کے درمیان مساوات اور ربطِ باہم سے بدل چکا ہے۔ گویا قطبین کا یہ تضاد ہی ترقی کا اصلِ اصول ہے۔ قطبین کے اس تضاد کا اصل کردار بس یہ ہے کہ اشیا میں ایک متحرک توازن (dynamic balance) قائم رکھنے کے لیے انضباطی کردار ادا کرے۔

کائنات کی ہر چیز ایک غیر محسوس طریقے سے، تدریجی انداز میں، رفتہ رفتہ اپنے الٹ کی طرف بڑھتی ہے اور یہ عمل عالمِ فطرت میں مسلسل جاری رہتا ہے۔ یوں غیر جان دار اشیا ارتقائی گردش میں جاندار اشیا بننے کے

Marfat.com

لیے متحرک رہتی ہیں اور بے جان مادہ زندگی کی طرف بڑھتا ہے۔ حیوان انسان بنتے ہیں اور انسان ذہن اور شعور کی قوت میں تبدیل ہو جانا چاہتا ہے۔ تو پھر ذہن اور شعور کیا بننا چاہے گا؟ سائنس وقت کے ساتھ ساتھ اپنے متضاد یعنی شاعری اور مذہبی صحیفوں کی طرف بڑھے گی۔ حیران مت ہوں؛ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب سائنس، مذہبی صحیفوں کی شاعرانہ پیش گوئیوں اور وجدانی والہامی پیغامات سے ہم آہنگ ہو جائے گی۔ سائنس مادی حقائق کا جوہر ہے جب کہ شاعری انسانی تجربے کا عطر ہے؛ اس لیے شاعری اعلاترین سائنس ہے۔ اسی طرح آواز خاموشی میں بدل جاتی ہے، تقدیر آزادی بن جاتی ہے اور جبر اختیار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پوری کی پوری کائنات تقلیب (transformations) کے سلسلوں سے عبارت ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حرارت، روشنی اور مقناطیسیت سب توانائی کی مختلف صورتیں ہیں۔ مقناطیسیت بجلی میں بدل جاتی ہے، بجلی روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے، روشنی حرارت میں ڈھل جاتی ہے اور حرارت کائناتی ارتقا میں سب سے زیادہ تبدیل کرنے، پگھلانے اور ڈھالنے والی قوت رہی ہے۔ مادہ خود بھی توانائی کا متوازیِ معکوس ہے جسے معروف مساوات E=MC2 سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ہم ایک ایسی کائنات میں رہتے ہیں جہاں مادہ مقناطیسیت کی ایک صورت ہے، زندگی بجلی کی ایک قسم ہے، سوچ روشنی کی ایک نوع ہے، محبت ایک طرح کی حرارت ہے اور انسان ایک طرح کا خدا۔ لیکن یہ سب کچھ متوازی معکوس کے تسلسل (Continuum of Parallel Inversions) پر موجود ایک ہی حقیقت کی کایا پلٹ اور درجہ بندی ہے۔ یہ بات ہمارے لاشعور کا حصہ رہی ہے اور اس کا اظہار ولیوں کی تصویروں میں ان کے سروں کے اردگرد روشنی کے ہالوں اور حضرت عیسیٰ کے دل سے نکلتی ہوئی روشنی کی لہروں سے ہوتا ہے۔ اپنی روزمرہ گفتگو میں، اپنے شعروں اور گیتوں میں، ہم اکثر محبت کو آگ کہہ کر پکارتے ہیں۔ مشرق میں ایسے کئی صوفیوں کی داستانیں لکھی گئی ہیں جو اپنی پھونک سے جھاڑیوں میں آگ لگا دیتے تھے۔ جذبہ، محبت، دل کی صفات، احساس، یہ سب احساس کی گرمی کے درجے ہیں اور انسان کو مکمل طور پر تبدیل کر دینے کا ذریعہ ہیں۔ مشرق کے صوفیوں کی یادداشتیں اور سوانح عمریاں ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہیں جن میں محبت، عشق، گرمیِ جذبات، اور اپنے محبوب سے وابستگی اور لگاؤ کے نتیجے میں ذات کی کایا پلٹ ہوگئی اور عاشق نے خود کو محبوب کی ذات میں گم کر لیا۔ ایسا ہی ایک جذبہ معروف صوفی شاعر بلھے شاہ نے یوں بیان کیا ہے:

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی

Marfat.com

سدو نی مینوں دھیدو رانجھا، ہیر نہ آکھے کوئی
رانجھا میں وچ، میں رانجھے وچ، ہور خیال نہ کوئی
جیہدے نال میں نیہوں لگایا، اوہدے ورگی ہوئی

دوسرا نقطۂ نظر:
The Other View

اب اسے دوسری طرف سے دیکھیے، محبت حرارت میں، حرارت نور (روشنی) میں، نور (روشنی) توانائی میں، توانائی مادے میں، مادہ زندگی میں، زندگی انسان میں اور انسان اعلاتر احساس میں تبدیل ہو گئے۔ اس اعلاتر احساس سے فکر (علم رسائنس) نے جنم لیا اور سائنس شاعری میں (Mind transforms to poetry) ڈھل گئی (پھر وہی محبت)۔ یہی وجہ ہے کہ موسیقی کے سُر پہلے اوپر جاتے ہیں پھر نیچے آتے ہیں۔ انسان کا عروج دوسری طرف سے اس کا زوال نظر آتا ہے۔ بالکل استنبول کی طرح جو مشرق کا دروازہ بھی ہو سکتا ہے اور مغرب کا بھی۔ یہ فیصلہ دیکھنے والے کی اپنی سمت اور مقام پر منحصر ہے۔ عروج اور زوال دونوں مل کر اس چکر کو پورا کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ڈارون کا ارتقائی چکر ہے۔ ارتقا کا یہ چکر ہزاروں سال سے چل رہا ہے؛ ایٹم سے لے کر ایک جاندار خلیے تک، اس واحد جاندار خلیے سے زندگی کی تمام تر نیرنگی اور حیرت انگیز تنوع تک اور پھر بالآخر انسان کے ظہور تک۔ یہ سارا چکر ایک وحدت ہے، ایک مسلسل حرکت ہے، بل کہ ایک تسلسل ہے (unitary and continuous movement)۔ اگر اس کی جزئیات پر غور کریں اور قریب سے دیکھیں تو لگتا ہے کہ ہر شے دوسری سے الگ ہے، ہر نوع کی اپنی منفرد خصوصیات اور الگ پہچان ہے۔ لیکن جب بلندی سے دیکھیں تو ہر شے ایک وحدت کا جزو دکھائی دیتی ہے اور ایک بلند ہوتی ہوئی مسلسل حرکت نظر آتی ہے۔ حقیقت ہر سطح پر تخلیق کے مرکزی اصول کو دہراتی ہے۔ یہ ایک واحد حرکت کا نام ہے؛ ایک مسلسل، بے جوڑ اور مربوط سمفنی کی طرح جو اپنے اصولِ تخلیق سے مسلسل مرتعش رہتی ہے۔ یہ تکرار (Recapitulation) اور تائیدی ارتعاش (Sympathetic Resonance) پورے عالمِ فطرت میں جاری و ساری ہے۔ یہ ایک آفاقی سائنسی عمل ہے۔ روشنی اور آواز کی لہریں، خوردبینی ذرے یا ایٹم کے الیکٹران اور یہ پوری کائنات اس تائیدی ارتعاش میں مصروف ہے۔ یہ تخلیق کی وہ فطرت ہے جسے خالق نے خود خلق کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ عالم کون

Marfat.com

و مکاں اسی وحدت اور ہم آہنگی کے اصول پر بنیاد رکھتا ہے۔کئی جدید ماہرینِ طبیعیات، مثلاً برائن گرین (Brian Greene) اپنی کتاب *The Elegant Universe* (باب: Tied up with a Srting) میں اس یقین کا اظہار کرتے ہیں کہ کائنات کو تائیدی ارتعاش کے نظریے کی مدد سے سمجھا اور بیان کیا جا سکتا ہے۔انھوں نے ایسے نظریات (TOE: Theory of Everything) پیش کیے ہیں جن کی مدد سے کائنات کو تائیدی ارتعاش کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔اس نظریے کو سٹرنگ تھیوری (String Theory) کا نام دیا گیا ہے۔یہ نظریہ اس بنیاد پر ٹی او ای (TOE) ہونے کا دعوے دار ہے کیوں کہ کائنات کا چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ، حتیٰ کہ تحتِ ایٹم ذرات بھی اس کائناتی نغمے کی تخلیق کے لیے تائیدی ارتعاش میں مصروف رہتے ہیں۔

ارتقا آہستہ رو، تدریجی تبدیلیوں، ان کی مختلف سطحوں اور مرحلوں اور زندگی کے مختلف مدارج کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں۔ ارتقا کی اعلاترین صورت فی الحال انسان ہے جسے اعلاتر احساس اور عقل و ادراک کی مجرد صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔زندگی خدا کی طرف لوٹ جانے کا نام ہے لیکن لوٹنے کا یہ عمل وقت کے پہیّے کو الٹی طرف چلانے کا نام نہیں بلکہ اور آگے بڑھنے کا نام ہے تاکہ اعلاتر مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ارتقا میں پسپائی کی کوئی گنجائش نہیں، انسان کبھی دوبارہ مچھلی نہیں بن سکتا۔یہ پہیہ الٹی طرف کبھی نہیں چلتا۔ ہیرا دوبارہ کوئلہ نہیں بن سکتا۔انسان کا ظہور ایک مسلسل پیش قدمی ہے۔خدا کی طرف لوٹنے کے لیے آگے بڑھنے کی مسافت۔یہ ہے انسان کے عروج و زوال کا نظریہ۔یہی ہے بھگوڑے بیٹے کی واپسی (Return of the Prodigal Son) کی انجیلی حکایت۔اللہ کی دو قوتیں مبدی (ابتدا کرنے والا) اور معید (روکنے اور تھامنے والا) مساوی طور پر بروئے کار آتی ہیں؛ ایک آگے دھکیلتی اور حرکت دیتی ہے اور دوسری اپنی جانب کھینچتی اور روکتی ہے۔

محبت ہی مرکز ہے:
Love is the Center

لیکن یہ سب محبت ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔محبت دل کی مانند، ایک غیر مرئی مرکز ہے اور باقی سب کچھ اس کا محیط ہے۔اللہ کی محبت، اس سے لگاؤ، اس کی جانب کشش (یہ سب ایک ہی شے کے مختلف مدارج ہیں) ہی ہے جو تمام مخلوقات کو قائم رکھتی ہے۔ماں کی ممتا کی طرح، محبت ہی ہے جو قائم و دائم رہتی ہے اور ہر شے کو سہارا دیتی

Marfat.com

ہے۔ایک نوجوان پاکستانی شاعر امجد اسلام امجد نے کسی وجدانی لمحے میں کہا ہے:

جو بھی کچھ ہے، محبت کا پھیلاؤ ہے

خدا محبت ہے اور محبت میں رقابت برداشت نہیں کی جا سکتی۔محبت کا ہر تجربہ خدا کے تجربے کا پیش خیمہ ہے۔آرٹ، شاعری اور موسیقی میں انسان کا اعلاترین سرمایہ، محبت ہی کا ثمر ہے۔ایک نظر محبت کے گیتوں، ترانوں اور کہانیوں، افسانوں، شعروں اور فلموں پر ڈال لیے تو یقین آ جائے گا کہ انسان محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔گود سے گور تک محبت ہی انسان کو سنبھالے ہوئے ہے۔انسان محبت سے محروم رہ کر نہ جی سکتا ہے، نہ پھل پھول سکتا ہے، نہ ترقی کر سکتا ہے۔بس ان بچوں کی زندگی کے ریکارڈ شدہ کوائف پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، جو محبت سے محروم رہے ہیں، فوراً معلوم ہو جائے گا کہ ان کی شخصیتوں کی نشوونما کتنی نامکمل رہتی ہے، ان کے طرزِ عمل میں کتنی کجی پیدا ہو جاتی ہے اور کس کس طرح سے یہ کجی ان کے برتاؤ، ان کے کردار کے مختلف پہلوؤں میں جھلکتی ہے۔سچی محبت کی طاقت کا کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔جب سچی محبت جاگ اٹھتی ہے تو دراصل وہ آپ کی ملکیت نہیں ہوتی، آپ اس کی ملکیت ہو جاتے ہیں۔محبت کو اس بات کی ضمانت درکار ہوتی ہے کہ محبوب کے لیے آپ کی طلب دوسری ہر طلب سے بالاتر ہو، پیشہ ورانہ ترقی، دولت، حکومت، زندگی، ہر شے کی آرزو سے شدید تر۔یہ محبت کی آزمائش کا اولین اور اہم ترین پیمانہ ہے۔اگر آپ محبت کو محسوس کر سکتے ہیں تو اللہ کی فطرت کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔اللہ کو بھی کوئی رقیب پسند نہیں۔محبت کی آزمائش ہوتی ہے اور اس آزمائش میں محبت کو ہر شے پر اولیت دینی پڑتی ہے۔محبت انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔یہ خدا کا عطا کردہ تحفہ ہے۔اس کا اظہار انسانی رشتوں میں ہوتا ہے۔اللہ کئی طرح سے ہماری زندگی میں نامعلوم طور پر شامل ہوتا ہے۔وہ نظر آئے بغیر ہمیں تھامے رکھتا ہے۔مادی پہلوؤں کی موت دراصل ذہن اور محبت کے خالصتاً تجریدی پہلوؤں کا جنم ہوتا ہے۔دانش کی انتہا بھی محبت ہی ہے جو حکمت و معرفت عطا کرتی ہے۔یہ عظیم الشان محبت کی کارفرمائی ہے۔

وکی پیڈیا ایک ایسا مفت رسائی دینے والا انسائیکلوپیڈیا ہے جو انٹرنیٹ کے ذریعے ہر ایک کی دسترس میں ہے۔وکی پیڈیا میں محبت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

’’محبت گہری ذاتی وابستگی کا شدید جذبہ ہے۔فلسفیانہ نقطۂ نظر سے محبت ایک انسانی قدر ہے جو انسان کی مہر و مروت اور شفقت کی خصوصیات کا اظہار کرتی ہے۔مذہبی حوالے سے

Marfat.com

> محبت محض ایک قدر نہیں بلکہ وجود (Being) کی اساس (خدا محبت ہے) اور قانونِ الٰہی (Divine Law) کی بنیاد ہے۔ جنس کے حیاتیاتی نظریات محبت کو، بھوک اور پیاس کی طرح، ایک حیوانی جبلت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ہیلن فشر (Helen Fisher)، جو محبت کے موضوع کی معروف ماہر سمجھی جاتی ہیں، محبت کے تجربے کو تین مراحل میں تقسیم کرتی ہیں جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں (Overlap)۔ یہ مراحل، ہوس، کشش اور لگاؤ کے ہیں۔ ایرانی تہذیب اور زبان میں محبت کے جذبے کے اظہار کے لیے رومیؔ، سعدیؔ اور حافظؔ ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ محبت کے لیے فارسی میں ''عشق'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو بنیادی طور پر عربی سے لیا گیا ہے۔ عجمی تہذیب و ثقافت میں ہر شے میں عشق کی کارفرمائی ہے اور ہر شے عشق کے لیے بنی ہے۔ یہ عشق دوستوں اور اہلِ خانہ، شوہر اور بیوی سے ہوتا ہوا آخر کار عشقِ الٰہی تک جا پہنچتا ہے جو انسان کا مقصدِ حیات ہے۔''

بدھ مت میں محبت ایک اساسی نوعیت کی انسانی خواہش اور ضرورت ہے جو خود غرضی سے لے کر بے غرضی اور نرگسیت سے لے کر ایثار تک پہنچتی ہے اور بالآخر روشن ضمیری (enlightenment) تک لے جاتی ہے۔ مسیحی عقائد کے مطابق محبت کی ہر صورت خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے اور خود غرضانہ محبت اور بے غرض محبت دراصل ایک ہی جذبے کے پست و بلند (Descending and Ascending Order) کا اظہار ہیں۔ عیسائی علمائے دین کا عقیدہ ہے کہ خدا تمام تر محبت کا منبع و ماخذ ہے اور اسی کا عکس انسانوں میں اور ان کے باہمی لگاؤ میں جھلکتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بقول، محبت یہودیوں کی توریت کا عظیم ترین حکم ہے (Gospel of Mark: باب ۱۲، آیت ۲۸۔۳۴) ویدک فلسفے کی رو سے بھکتی کا مطلب ہے خدا سے لو لگانا۔ یہ ایک سنسکرت اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے خدائے عظیم سے گہری محبت اور وابستگی۔ اسلامی تصوف کو عموماً مذہبِ عشق کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مسلمان صوفیہ اپنی شاعری میں اکثر اللہ کا ذکر تین طرح سے کرتے ہیں؛ عاشق، محبوب اور معشوق۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تمام مذاہب انسان کی جنسی جبلت پر شدید ترین پابندیاں بھی لگاتے ہیں۔ رومن کیتھولک کلیسا کا تجرد پر زور دینا تاریخ کا حصہ ہے۔ یروشلم کے معروف بشپ اوریجن (Origen) نے تو ۲۰۲ء میں خود کو آختہ کرلیا تھا۔ اسی زمانے میں کئی اور لوگوں نے بھی جنت کے حصول کے لیے خواجہ سرائی اختیار کرلی تھی یا پھر شاید وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ خدا تذکیر و تانیث سے

Marfat.com

بالاتر ہے۔

ہوس اور محبت ایک ہی تسلسل کا نام ہیں:
Lust and Love are a Continuum

ہوس اور محبت دونوں دراصل ایک ہی تسلسل (Continuum) کے نام ہیں۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو انتہائی کنارے ہیں جنھیں دونوں طرف سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک انتہا پر جسمانی حقیقت ہے تو دوسری انتہا پر ماورائے جسم آرزو یا روحانی لگن۔ اس رشتے کی دنیاوی تکمیل اگرچہ مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ سے ہوتی ہے لیکن اس رستے میں بے شمار تاثرات اور باہمی تعلق کے لاتعداد امکانات موجود ہیں۔ اس تسلسل کے پست یا سب سے نچلے مدارج جہاں محبت صرف جسمانی اظہار کا نام بن جاتی ہے، عارضی، ناپائیدار، تغیر پذیر اور گمراہ کن ہوتے ہیں کیوں کہ یہ انسان کو حرص و ہوس اور کئی دوسرے تحریفی راستوں کا شکار بنا دیتے ہیں۔ اس سلسلے کے بلند تر مدارج، جو جسم کی سطح سے بالاتر ہو جاتے ہیں، زیادہ پائیدار اور مستقل ہوتے ہیں۔ اعلاترین سطح پر محبت ابدی ہوتی ہے جو ارتقائے ذات، آرائشِ ذات اور تکمیل ذات کا سبب بنتی ہے۔ اصل میں محبت تکمیلِ ذات ہی ہوتی ہے۔ یہ اس کے انتہائی مقامات یعنی مثبت اور منفی کناروں کا اظہار کرتی ہے۔ اس کے پست مقامات یعنی محض جسمانی سطح سے چمٹ کر رہ جانا شخصیت کی نشوونما میں شدید رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔

ہر خالق اپنی تخلیقات سے محبت کرتا ہے:
Every Creator loves His Own Creation

ہر خالق اپنی تخلیقات سے محبت کرتا ہے۔ یہی محبت انسان اور خدا کو جوڑتی ہے۔ انسانی رشتوں اور جذبات میں بھی اسی محبت کی نمود ہوتی ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی کے کتنے ہی پہلو ایسے ہیں جن میں ہم محبت کی کارفرمائی دیکھتے ہیں۔ فن کار، جو تخلیق کرتا ہے اور ماں، جو بچے کو جنم دیتی ہے، خالق و مخلوق کے رشتے کی گواہی دیتے ہیں۔ براڈوے سٹیج کی ایک شاندار پیش کش *My Fair Lady* میں، جو برنارڈ شا کے ڈرامے *Pygmalion* کی ڈرامائی تشکیل پر مبنی ہے، پھول بیچنے والی لڑکی عالمِ غضب میں اپنا جوتا، اپنے خالق پروفیسر ہیگنز کے منہ پر دے مارتی ہے کیوں کہ اب وہ خود اپنی علیحدہ شناخت تسلیم کرانا چاہتی ہے۔ شاید ماڈرن انسان بھی اللہ کے معاملے میں

Marfat.com

ایسے ہی بحران میں مبتلا ہے۔

صوفی کا خدا سے وصال:
Mystical Union with God

تصوف میں نفس کی فنا کا تصور پست انسانی خواہشات کی تحدید کرتا اور انھیں پوتر بنا کر ترفع اور عظمت عطا کرتا ہے۔ صوفی کا منتہائے مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات اور نفس کو محبت میں کھو دے اور مکمل طور پر خدا میں جذب ہو جائے۔ یہ صوفیانہ جذبے کی آخری منزل ہے جسے تصوف میں ''فنا فی اللہ'' کہا جاتا ہے یعنی ذات خداوندی میں مکمل طور پر کھو جانا۔ اگر چہ اس رستے میں بھی لاتعداد مرحلے ہیں جن سے گزر کر انسان ''بقا باللہ''، یعنی خدا کے ساتھ واصل ہو کر ابدی زندگی، حاصل کر لیتا ہے۔ صوفی اپنے وجود کو ختم نہیں کرتا بلکہ خدا سے وصال کے ذریعے اپنی ذات کی زیب و زینت اور معرفت کے بلند تر مقامات حاصل کرتا رہتا ہے۔ محبت اس کا ایک وسیلہ ہے، ایک ذریعہ ہے جس کی مدد سے صوفی کی قلب ماہیت ہوتی ہے۔ محبوب سے گہری محبت، وابستگی اور شدید لگاؤ کے ذریعے، عاشق اور معشوق ایک ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے پہچانے جاتے ہیں۔ انسان کی محدود، ناسوتی صفات خدا کی لامحدود، لاہوتی صفات میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور حقیقت کے بلند تر آفاق میں ایک نئی زندگی کے لیے فرد کی بقا اور نجات کی ضمانت بن جاتی ہیں۔ مابعد الطبیعیاتی موضوعات پر لکھنے والے اکثر مصنفین کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ فنا سے حلول مراد ہے۔ یہ تو اپنی شخصی انا کو خدا کی اطاعت اور سپردگی میں دینے کا نام ہے۔ صوفی محبت کے پروں پر اڑ کر اس مقام بلند تک پہنچ جاتا ہے۔ انسان اور خدا، صوفی اور اللہ، نفی (-) اور اثبات (+)، تسلیم و سپردگی اور محبت کے درمیان مسلسل ربطِ باہم صوفی کی قلب ماہیت کر دیتا ہے اور اسے خدا کی زیادہ معرفت، زیادہ شعور اور اس سے یکتائی کی زیادہ گہری کیفیت عطا کرتا ہے۔ مختصراً یہ کہ تصوف میں یہی راہِ نجات ہے۔ اگر اس راہ میں سفر کے وسیلے گمراہ کن ہوں یا صوفی محبت کے پست مدارج ہی میں کھو کر رہ جائے تو وہ اپنی منزل پانے میں ناکام رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب سفلی جذبات، عریانیت، شہوت انگیزی اور محبت اور جنس کے گھٹیا اور گمراہ کن مظاہر پر پابندی لگاتا ہے اور اسی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ انسانی معاشروں میں محبت اور جنس کی اتنی جستجو کیوں رہتی ہے اور کیوں محبت کو ایک ارفع و منزہ تجربہ گردانا جاتا ہے، کیوں کہانیوں، افسانوں، حکایتوں، تمثیلوں اور گیتوں میں اس تجربے کی اتنی ستائش بلکہ پرستش کی جاتی ہے۔

Marfat.com

نجات کا تصور:
The Concept of Salvation.

نجات، رہائی اور شفاعت مذہبی تصورات ہیں جن کے مطابق خدا انسانوں کو حیاتیاتی موت سے بچا لیتا ہے اور خود اپنی ذات میں سمو کر ابدی زندگی عطا کر دیتا ہے۔ بہت سے مذاہب میں یہ عقیدہ ملتا ہے کہ انسان کو کسی خارجی وسیلے کے ذریعے ہی نجات یا مکتی حاصل ہو سکتی ہے؛ مثلاً خدا، یسوع مسیح، بدھ یا برہما۔ عیسائیت نجات کو عیسیٰ سے منسوب کرتی ہے۔ اس عقیدے کے مطابق انسانی وجود مسیح کے ذریعے، جو دراصل محبت ہے، خدا سے وصال حاصل کر کے اپنی ارفع و اعلا تکمیل کا سامان کر سکتا ہے۔ مسیح میں ڈھل کر انسان خدا کی جانب سے ایک نئی اور ابدی زندگی پا لیتا ہے۔ اس سے اپنی ذات کو فنا کر دینا مراد نہیں ہے، بلکہ یہ خدا سے وصال کے بعد ایک مکمل اور ابدی وجود میں ڈھل جانے کا نام ہے۔

اسی طرح کلاسیکی ہندومت میں بھی ''مکتی'' کی تلاش اہم ہے۔ مکتی کا مطلب یہ ہے کہ آتما (لغوی معنی: ذات) سنسار (موت اور زندگی کا چکر) سے آزاد ہو جائے اور محبت کے ذریعے ارفع ترین روحانی مقام حاصل کر لے۔ مکتی یہ ہے کہ محبت اور لگن کے ذریعے عملی دنیا کی ثنویت اور دوئی سے نجات پا کر اپنی ذات کو برہما کی آفاقی ہستی میں ضم کر دیا جائے لیکن یوں کہ فرد کی انفرادیت اور ہستی کا احساس بھی قائم رہے۔ اسلام بھی انسانیت کی نجات کے لیے سنت کی پیروی کو لازم قرار دیتا ہے؛ یعنی حضرت محمدؐ کی زندگی، اعمال اور کردار کی تقلید کرنا اور اپنے ذاتی کردار کے لیے ان کی زندگی کو بطور نمونہ پیشِ نظر رکھنا۔ حضرت محمدؐ کی زندگی، ان کے اخلاق، ان کے اندازِ محبت، شیوۂ گفتار و رفتار اور طرزِ عمل و کردار کو ایک مثال کے طور پر سامنے رکھنے اور اس کی پیروی کرنے سے آہستہ آہستہ انسان میں ایک خاص طرح کی بصیرت اور فطرت الٰہی سے ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس پیروی میں بیرونی اور جسمانی عناصر، حلیہ، حرکات و سکنات اور طور طریقے بذاتِ خود مقصود بالذات نہیں ہوتے بلکہ تقویٰ کے حصول کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں جن کی مدد سے انسان عشقِ رسول، سپردگی، ذکر اور یادِ خداوندی کے ذریعے عرفانِ الٰہی حاصل کر لیتا ہے۔

اسمائے حسنیٰ میں اللہ کو الودود (محبت کرنے والا) بھی کہا جاتا ہے۔ محبت کے اور بھی مدارج ہیں جن میں سے کچھ الرحمان اور الرّحیم کے اسما میں ظاہر ہوتے ہیں؛ جو اللہ کی بنیادی صفات ہیں۔ پھر وہ مہربان

Marfat.com

ہے، رحم کرنے والا ہے، شفیق ہے، خیال رکھنے والا ہے، حفاظت کرنے والا ہے، محبت کرنے والا ہے، درگزر کرنے والا ہے، عطا کرنے والا ہے، برداشت کرنے والا ہے، معاف کرنے والا ہے؛ یہ سب اللہ کی محبت کے مختلف مدارج اور اس کی نمایاں صفات ہیں۔عیسیٰ محبت ہیں۔اسی طرح حضرت محمدؐ کو قرآن میں رحمۃ اللعالمین کہا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب کے لیے محبت، رحمت اور شفقت کا پیکر ہیں۔الہامی مذہبی صحیفے انسان کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے ہیں اور یہ انسان کے لیے خدا کی انتہائی محبت کا ثبوت ہیں۔قرآن کے کئی حصے ایسے ہیں کہ انسان کے نام لکھے گئے، خدا کے محبت نامے معلوم ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر سورۂ رحمان میں اللہ پے در پے انسان کو عطا کی گئیں نعمتیں اور اس کے لیے اپنی محبت کے قرینے یاد کراتا ہے اور پھر ایک محبت کرنے والے ہی کی طرح انسان کی ناشکر گزاری اور بے قدری کا شکوہ کرتا ہے۔کسی محبت بھرے گیت کی طرح اس کا ٹیپ کا مصرع بھی یہی ہے کہ ''تم کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟''

شاید یہ سب باتیں ایک ثقہ، سنجیدہ اور شکی مزاج دانش ور کو بہت بعید از قیاس، خیالی، رومانی اور شیخ چلی کے خیالی پلاؤ جیسی ناقابلِ یقین محسوس ہوں اس لیے کہ محبت عقل و خرد سے ماورا ہوتی ہے۔لیکن پھر بھی سچ یہی ہے کہ یہ باتیں حقیقت کی مکمل ترجمانی کرتی ہیں۔یہ لوک ریت نہیں ہے، نہ اسے جعلی سائنس کہہ کر رد کیا جا سکتا ہے۔ویسے یہ الگ بات ہے کہ لوک ریت بھی اب جدید دنیا میں کوئی حقیر شے نہیں رہی بلکہ یہ کئی معنوں میں سائنس سے آگے ہے کیوں کہ انسان کی وجدانی صلاحیت اس کی تجزیاتی صلاحیت سے عظیم تر ہے۔اس بات کا سائنسی انداز میں تعین کرنے میں شاید ابھی کئی اور صدیاں لگ جائیں۔اس سائنسی اصول کی تفصیل، اس کی ریاضیاتی مساوات اور اس کی تجرباتی تصدیق آگے آئے گی اور یہ بیان فزکس کی کوانٹم تھیوری، نفسیاتی اور روحانی علوم کی روشنی میں ہوگا۔آخر ہم سب نے کتنی بار دیکھا ہے کہ فلسفیوں اور محققوں نے، الگ الگ، آزادانہ کام کرتے ہوئے، ایسی سچائیوں کی پیش بینی کر لی جو ان کے اپنے وقت سے بہت آگے کی باتیں تھیں۔

اللہ کی ذات کا مرکزی نقطہ:
The Core of Allah

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف واپس آتے ہیں۔اسماء الحسنیٰ یا اسمائے صفات (اللہ کی بہترین صفات کے مظاہر) دراصل اس کے اسمِ ذات (اللہ کی ذات کا مخفی مرکز) کے مختلف مظاہر ہیں۔کشش، محبت، لگاؤ یہ اس

Marfat.com

نادیدہ مرکز کی خصوصیات ہیں جو ہر شے کو اپنی جانب کھینچتی ہیں۔ یہی مرکز روشنی، توانائی، زندگی اور محبت کا منبع ہے۔ ہر شے جو وجود رکھتی ہے، اس کا سراغ آخر کار اسی مرکز سے ملتا ہے۔ ہر شے اپنے وجود اور اپنی بقا کے لیے اسی مرکزی حقیقت کی محتاج ہے۔ جیسے کوئلے کی توانائی اصل میں سورج کی توانائی ہوتی ہے، اسی طرح انسان کی زندگی، اس کا ارادہ، اس کی استعداد اور اس کی عظمت، ہر چیز اللہ کی ملکیت ہے۔ انسان کی تمام تر ذہانت، اس کی روشنیِ طبع جس سے وہ تابندہ ہے، دراصل اللہ ہی کی روشنی کا عکس ہے اور اس کا ماخذ بھی اللہ ہی ہے۔ کسی ایٹم کے پروٹون کی طرح جو اپنی برقی توانائی کی مدد سے الیکٹرونوں کو ان کے مدار میں قائم رکھتا ہے اور سورج کی طرح جو اپنی کشش سے تمام سیاروں کو ان کے مدار میں رکھتا ہے اور کائنات کی ہر چیز کو زندگی عطا کرتا ہے؛ اللہ اپنی محبت اور رحمت سے ہر چیز کو اپنے مرکز سے جوڑے رکھتا ہے۔ سورج، کرۂ ارض، ایٹم اور عالمِ کون و مکاں، حتیٰ کہ پوری کی پوری حقیقت، اسی بازگشت اور تائیدی ارتعاش کی عکاس ہے۔ ہر شے اللہ کی صفات کا مظہر اور اس کی ذات کی قلب ماہیت کا عکس ہے جو اللہ کی کشش، اس کی محبت، لگاؤ، وابستگی اور لامحدود رحمت سے جڑی ہوئی ہے۔

ترقی پذیر مراکز:
Progressive Centers

یہ حقیقت اسلام سے خاص نہیں۔ اور نہ ہی اللہ اسلام تک محدود ہے۔ سچ کئی لبادے پہنتا اور کئی روپ دھارتا ہے۔ اسمِ ذات اللہ کا مخفی مرکز ہے۔ یہ نادیدہ، غیر مرئی، تجریدی اور انسانی سائنس اور علم سے ماورا ہے۔ ہم انسان یہ امید نہیں رکھ سکتے کہ اللہ کو اسی طرح دیکھ لیں جیسے ہم پتھروں کو یا سورج اور ستاروں کو دیکھ لیتے ہیں۔ اللہ تخلیق کا ارفع ترین مرکز ہے۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہماری نوزائیدہ سائنس، جس کی عمر ابھی بمشکل تین سو سال ہے اور جو ابھی خود اپنے آپ کو سمجھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے، اس ارفع ترین مخفی مرکز تک رسائی حاصل کر لے۔ ہماری سائنس تو ابھی تک صرف طبعی اور عضویاتی پہلو ہی کا کھوج لگانے میں مصروف ہے۔ جب انسان نے کششِ ثقل، یعنی زمین کے مرکز کی اپنی طرف کھینچنے کی قوت دریافت کی تو ہماری سائنس ''زمین مرکز'' (Earth-Centered) ہوگئی۔ پھر پولینڈ کے کوپرنیکس نے دنیا کو اپنی اس دریافت سے حیران کر دیا کہ سورج ایک ارفع تر مرکز ہے۔ یوں سائنس اپنا تناظر بدل کر ''سورج مرکز'' (Sun-Centered) ہو گئی۔ ماہرینِ علمِ فلکیات نے اس سے بھی ارفع ایک مرکز یعنی کہکشائیں دریافت کر لیں تو سورج مرکز نظریے کی

Marfat.com

اہمیت کم ہوگئی۔ جدید سائنس دان نے بعد میں یہ حقیقت تلاش کی انسان کائنات کی ہر چیز کا پیمانہ ہے۔ یہ محیر العقول ستارے، سورج اور یہ کہکشائیں اگر چہ عظیم الشان ہیں لیکن انسان ان سب سے عظیم تر ہے۔ یوں ہم ایک اور بلند تر مرکز یعنی انسانی ذہن کی طرف بڑھے۔ آج ہماری سائنس ''انسان مرکز'' (Man-Centered) ہے۔ طبعی سے عضویاتی اور بے جان مادے سے زندگی کی طرف اس سفر نے ہمیں، کائنات کے بارے میں ہمارے علم اور ہماری سائنس کو بہت عروج عطا کیا ہے۔ بلند سے بلند تر مراکز کی بتدریج دریافت، انسانیت کی ترقی کا موجب بنی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ سفر اور آگے بڑھے اور ارفع ترین مرکز یعنی اللہ تک پہنچے، جو اس ''بڈھے'' (The Old One) کے تصور کے قریب تر ہے۔ جب ہم ''خدا مرکز سائنس'' (God-Centered Science) کی طرف مڑ جائیں گے تو ہمارے سامنے اعلا تر حقیقت کی ایک نا قابلِ بیان اور نا قابلِ ادراک دنیا کا دروازہ کھل جائے گا جو مخفی، پوشیدہ، لطیف اور نا قابل فہم حقائق کے بھید ہم پر آشکار کر دے گی اور انسان کو ماورا کے تعین کے قابل بنا دے گی۔ انسانی زاویۂ نگاہ کی یہ تبدیلی انسان پر خود اس کے وجود کے نئے آفاق اور مستقبل کے کئی امکانات روشن کر دے گی اور حقیقت کی اصل فطرت اس پر واضح ہو جائے گی۔ پھر اسے معلوم ہو جائے گا کہ کائنات کی ہر چیز کا پیمانہ اللہ ہے، انسان نہیں۔

کیا ہم اللہ کو جان سکتے ہیں؟
Can We Know Allah

جی ہاں، ہم اللہ کو اسماے صفات کے ذریعے جان سکتے ہیں۔ یہ اسما اللہ کی صفات کے مظاہر ہیں جن کی نمود ہر شے میں ہوتی ہے۔ اللہ کی تمام مخلوقات ایک ہی اصول کی گونج، پیروی، اس کی تائید اور بازگشت ہیں، اور ایک ہی قانون کے مختلف پہلوؤں کا اظہار کرتی ہیں۔ ویدک ہندومت کا مفروضہ ہے کہ آفاقی ہستی صرف ایک ہے، اسے برہما کہیں یا اوم کار۔ وہی ہے جو مختلف روپ دھار لیتی ہے؛ ہر روپ کا ایک الگ تشخص ہوتا ہے جو اسی عظیم ذات کے کسی نہ کسی پہلو یا صفت کا اظہار کرتا ہے۔ ویدک فلسفہ ''ناموٗ'' اظہار کی انھی صورتوں، انھی مظاہر کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن یہ مظاہر خدا نہیں ہیں۔

اس برتر سچائی تک رسائی کے لیے ہمیں اپنی سائنس کی سمت کا نئے سرے سے تعین کرنا ہوگا۔ ماورا تک پہنچنے کے لیے دوئی سے بالاتر ہونا ہوگا۔ ہماری ''انسان مرکز'' سائنس اپنی موجودہ صورت میں بلندیوں کی طرف نہیں

Marfat.com

بڑھ سکتی۔عیسائی کلیسا کی طرح، ہماری سائنس کو بھی آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے کچھ جھکنا پڑے گا۔اس متوازی ارفع تر حقیقت کی دنیا میں عجز ہی علم ہے اور تسلیم و سپردگی ہی ترقی۔سترھویں صدی کے خود پسند مسیحی کلیسا کی طرح، خود پسند سائنس بھی آگے نہیں دیکھ سکتی۔

جاننے کے لیے کر کے دیکھو۔یہ ہے علم حاصل کرنے کا تجرباتی طریقہ۔بچے کو یہ سمجھا کر دکھائیے کہ آگ کیا ہوتی ہے، اسے ڈانٹیں، گرم چائے دانی کو چھونے سے ڈرائیں، روکیں، مگر بچہ سمجھ نہیں پائے گا۔وہ آپ کی طاقت سے مرعوب تو ضرور ہو جائے گا لیکن آپ کی بات اسے صرف الجھا سکتی ہے۔بچے گرم شے کو چھوئے گا تو خود ہی اس کی حقیقت کو سمجھ جائے گا۔یہ بالکل بنیادی اصول ہے۔اگر آپ کو قبض رہتا ہے اور رفع حاجت کا معمول باقاعدہ نہیں تو صبح سویرے کوئی زبردست سی ورزش کریں اور پھر دیکھیں، کیسے آپ کا نظام درست ہوتا ہے۔جاننے کے لیے کر کے دیکھیں۔طرزِ عمل اہم ہوتا ہے اور عمل اور کردار ہی علم اور تجربے کی کنجی ہے۔اس لیے سمجھ لیجیے کہ خطا کرنا انسان کی پہچان ہے۔لہٰذا انسان کو حصول علم کے لیے اپنی تگ و دو کی بنیاد یا تو لاعلمی پر رکھنا ہوگی یا شک پر یا یقین پر۔عمل ہی سے علم کا وجود ہے۔انسان چوں کہ ایک سوچنے والا جانور ہے اس لیے وہ حصولِ علم کے لیے محض اندازوں سے کام نہیں لیتا بلکہ اپنے اعمال کی بنیاد کسی یقین، کسی خاص نقطۂ نظر پر رکھتا ہے۔جب ہم ایسے سوال کرتے ہیں کہ ''کیا ہم خدا کو جان سکتے ہیں؟'' یا ''کائنات اخلاقی ہے یا غیر اخلاقی؟''، تو ایسے سوالوں کا جواب دینے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ پہلے کسی بات پر یقین رکھا جائے، اس پر ایمان لایا جائے اور پھر اس کے مطابق عمل کیا جائے۔اس عمل سے جو تجربہ حاصل ہوگا صرف وہی ان سوالوں کا جواب دے سکتا ہے۔

تجربہ راہِ علم ہے۔کیک کا ذائقہ اسے کھا کر ہی معلوم ہو سکتا ہے۔کچھ باتیں ایسی ہیں جنھیں کیے بغیر ان کا پتا نہیں چل سکتا۔اللہ بھی ایسی ہی بات ہے۔صوفیوں اور مذہبی لوگوں نے بارہا اس طرف اشارہ کیا ہے۔ایک حساس دل اور سوچنے والا ذہن لے کر میدانِ عمل میں کود پڑنے کی ہمت کریں تو آپ کو خود بخود اپنے سب اندرونی سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔صوفی کا پیغام بھی یہی ہے اور مذہب کی روح بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔خدا کیا ہے؟ ایمان لائیں، یقین کریں اور پھر عمل کر کے دیکھیں، آپ کو جواب مل جائے گا۔ایمان اور عمل کے بغیر کوئی جواب نہیں ملتا۔یہی کلیہ آپ کی سائنس پر بھی لاگو ہوتا ہے۔سائنس دان بھی اپنی کوشش کے

Marfat.com

آغاز میں ایک فرضیے پر ایمان لاتا ہے، اور پھر اس پر عمل کرنے کی تگ و دو کرتا ہے۔ صرف یہی طریقہ ہے جس کی مدد سے سائنس دان اشیا کو سمجھتا اور جانتا بوجھتا ہے۔ خدا کو سمجھنے کا بھی یہی طریقہ ہے۔ ایمان، عمل اور علم ۔۔۔ یہ ہے خدا کی آگہی حاصل کرنے کے عمل کی درست ترتیب۔ اگر آپ اس ترتیب کو الٹ دیں اور اسے علم، عمل اور ایمان کر دیں تو آپ کبھی بھی حقیقت کو نہیں جان سکتے۔ جدید آدمی کا یہی مسئلہ ہے کہ وہ ترتیب الٹ کر حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے اور اسی لیے ناکام رہتا ہے۔

عقل اور حسیّت:
Intellect and Sensibility

عقل حسیّت، جذبے، احساس اور انسانی ردعمل کے متوازی مگر معکوس ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ اپنی عقل کو لطف و مروت کے انسانی جذبات کے تابع رکھے۔ یہ انسانی (Humanitarian) اور محبت بھرا نقطۂ نظر ہی تہذیب کی نشانی بھی ہے اور سچی آگہی کا راستہ بھی۔ عقل و خرد اور اس کی نشوونما کی بجائے نرم دلی اور نیک نفسی انسانیت کی تہذیب و تطہیر کرتی ہے اور حقیقی علم عطا کرتی ہے۔ جب بھی عقل اور احساس کا یہ رشتہ بگڑ جاتا ہے، عقل جیسی مثبت صفت تخریبی عفریت کا روپ دھار لیتی ہے اور افتراق و جدائی پیدا کر کے اللہ سے دور لے جاتی ہے۔ احساس اور عقل، سامنے اور عقب یا پیش منظر اور پس منظر کی طرح، عجیب و غریب طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اقدار کو الٹ دیں تو طلاق، علیحدگی اور جدائی واقع ہو جاتی ہے، خواہ یہ شادی کا معاملہ ہو یا کوئی اور رشتہ۔ خدا سے تعلق بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ شاعرِ مشرق سر علامہ محمد اقبال نے کسی وجدانی لمحے کی ترنگ میں کہا تھا:

جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

ہمارے تمام تر سائنسی اور فلسفیانہ آدرش دراصل نامعلوم خداؤں کی قربان گاہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ''اصولِ اتفاق'' (Principle of Causality) ہی کو لیجیے، جس پر سائنس کا دارومدار ہے؛ یہ محض ایک مفروضہ ہے، محض ایک نام جو اس خیال پر مبنی ہے کہ ایک نہ ایک دن واقعات کی ترتیب خود ہی ان بظاہر الگ تھلگ واقعات میں کوئی گہرا رشتہ دریافت کر لے گی۔ سائنس دان کو امید ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ جھول ختم ہو جائے گا اور یوں واقعات کی منطقی ترتیب کا سلسلہ جڑ جائے گا جو کسی نامعلوم وجہ سے ابھی ٹوٹا ہوا ہے۔ یہ کسی

Marfat.com

نامعلوم خدا کی قربان گاہ نہیں تو اور کیا ہے، بالکل ویسی ہی قربان گاہ جیسی سینٹ پال نے ایتھنز میں دریافت کی تھی۔ یہی حال وسیع ترتعیم (broader generalizations) اور اعلا تر تجرید و تحلیل (higher abstractions and synthesis) کے لیے سائنس اور فلسفے کی تلاش کا ہے۔

کوئی نئی شے کبھی تخلیق نہیں ہوتی:

Nothing New is Ever Created

کوئی نئی شے کبھی تخلیق نہیں ہوتی۔ ایسی کسی بات کا کوئی وجود نہیں کیوں کہ ایسی بات کبھی واقع ہی نہیں ہوتی۔ جسے ہم عام طور پر تخلیق کہتے ہیں، وہ دراصل پہلے سے موجود اشیا کی ترتیب و تنظیم نو ہے۔ موجد تو صرف اتنا کرتا ہے کہ پہلے سے موجود اشیا میں ایک نئی ترتیب پیدا کر کے ایک نئی صورت بنا دیتا ہے جسے ہم اس کی ایجاد یا تخلیق کہہ دیتے ہیں۔ کوئی بھی تخلیق کار کبھی کسی شے کو عدم سے وجود میں نہیں لا سکتا۔ فلسفی، سائنس دان، فن کار، ہنر مند، سب پہلے سے موجود اشیا کو بدل کر نیا کرتے رہتے ہیں۔ وہ موجود کی ترتیب و تنظیم نو کرتے ہیں۔

''کچھ نہیں'' سے تخلیق:

Creation 'ex-nihilo'

یہ ایک ناقابلِ تردید بنیادی قانون ہے جس کا اطلاق ہماری پوری کائنات پر ہوتا ہے۔ گردش، ترتیبِ نو اور کایا پلٹ (cycle, re-order and transform)۔ ارتقا یہی تو ہے، موجود کی ترتیبِ نو سے بتدریج تبدیلی۔ عالمِ کون و مکاں میں کبھی کوئی نئی شے تخلیق نہیں کی گئی۔ اللہ کی توانائی کا دائرہ (نور) کبھی نابود نہیں ہو سکتا، صرف اس میں تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ نام نہاد تخلیقات دراصل پہلے سے موجود اشیا کی تبدیل شدہ صورتیں ہیں۔ ستارے، سیارے، مادہ، عناصر، مرکبات، گیسیں، پانی، ٹھوس اشیا، زندگی، نباتات، کیڑے مکوڑے، جانور، انسان، ہر شے اس بنیادی حقیقت کی شہادت دیتی ہے۔ اللہ بھی، جو ان سب اشیا پر لاگو ہونے والا اصول ہے، اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اللہ نے بھی معدومیت ('ex-nihilo') سے کچھ تخلیق نہیں کیا، بالکل جس طرح ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ اس لیے جسے ہم اللہ کی تخلیق کہتے ہیں وہ بھی دراصل پہلے سے موجود حقیقت کی قلب ماہیت (transformation) ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی شے بھی وجود رکھتی ہے نہ کبھی رکھتی تھی، سوائے

Marfat.com

اللہ کی ذات کے۔ اسی حقیقت کو مذہب یوں بیان کرتا ہے کہ خدا کائنات کو عدم سے وجود (creation ex-nihilo) میں لایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی ذات کے سوا کوئی شے وجود نہیں رکھتی۔ تمام مخلوقات اللہ ہی کی ذات کی تبدیل شدہ صورتیں ہیں۔ اسی طرح انسان کی تمام تخلیقات، خود اس کی اپنی مختلف صورتیں ہیں۔ انسان بھی پہلے سے موجود اشیا کی ترتیب و تنظیمِ نو کرتا ہے۔ جدید سائنس شہادت دیتی ہے کہ وہ حالت جسے معدومیت (nothingness) کہتے ہیں کہیں وجود نہیں رکھتی۔ یہ صرف اللہ کی ذات کی درجہ بندی کی صفت کو ظاہر کرتی ہے۔ جیسے مثال کے طور پر ہومیو پیتھک دوا کی اعلاترین طاقت وہ ہوتی ہے جس میں اصل دوا کا جوہر سب سے کم ہوتا ہے۔

اس بات پر یقین کرنا کہ خدا نے کسی خارجی مادے جیسے مٹی وغیرہ کی تشکیلِ نو سے تخلیق کی، دراصل اس بات پر ایمان لانا ہے کہ دنیا میں حقیقی دوئی موجود ہے۔ یعنی ایک تو خدا وجود رکھتا ہے اور دوسرے وہ مادہ مثلاً مٹی جس سے تخلیق کی گئی۔ یہ بات سائنسی طور پر غلط ہے۔ اللہ کے سوا کوئی شے کبھی وجود رکھتی تھی نہ اب رکھتی ہے۔ اللہ کا عملِ تخلیق بس اس کی اپنی ذات کی نئی ترتیب و تنظیم اور قلب ماہیت (transformation) ہے جس کے نتیجے کے طور پر یہ سارا تنوع جنم لیتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آغاز میں کائنات ایک واحد ذرے میں سمٹی ہوئی تھی جو اتنا چھوٹا تھا کہ انسانی نظر اسے دیکھنے سے قاصر تھی۔ پھر یہ ذرہ پھیلتا گیا، پھٹ گیا، ترقی کرتا رہا، تبدیل ہوتا رہا اور مختلف صورتیں اختیار کرتا گیا۔ حقیقت کی ہر سطح پر اللہ کے اسی عملِ تخلیق کی تقلید ہوتی ہے۔ زندگی بطنِ مادر میں ایک خلیے میں سمٹی ہوئی ہوتی ہے۔ یہیں دو متضاد خلیوں کے ملاپ سے اس کا آغاز ہوتا ہے، پھر اس کی نشوونما ہوتی ہے اور یہ تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزر کر کئی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بالآخر اسے یہاں سے دیس نکالا مل جاتا ہے اور پھر یہ ارتقا کے مراحل طے کرتی ہوئی، جداگانہ شکلیں اختیار کرتی رہتی ہے۔ ہر ماں تخلیق کے اسی خدائی اصول کی پیروی کرتی ہے۔ تخلیق کا عمل یونہی، متضاد اصولوں کے ملاپ، اندرونی قوتِ تشکیل، نشوونما، خروج اور پھر مزید ارتقا کے لیے علیحدگی اور تنوع کے مرحلوں سے گزرتا ہے۔ سورج، چاند، ستاروں اور زمین کو دیکھیے، یہی اصول ہر طرف کارفرما نظر آتا ہے۔ ہر تخلیق اسی الوہی اصول کی تقلید کا نام ہے۔ ماں کے بطن میں جو ارتقائی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہ دراصل اس کی اپنی ہی ذات کی کایا پلٹ ہے اور بیضے (نفی) اور نطفے (اثبات) کے مسلسل باہمی تعامل اور حرکت کا نتیجہ ہے۔ تخلیق ہر حال میں حرکت سے وابستہ ہے۔ تخلیق کبھی غیر فعالیت یا مجہولیت کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ کمہار کا چاک تخلیق اور حرکت کے رشتے کی بہت اچھی مثال پیش کرتا ہے۔

Marfat.com

یہ تمام تر عالمِ کون ومکاں اللہ کے؛ جو محیطِ کل ہے، مسلسل حرکت کرنے اور تغیر وتبدل کے ذریعے نت نئی صورتوں میں ڈھلنے کا نتیجہ ہے۔ یہ ہر شے پر چھایا ہوا، ایک دو قطبی جوہر (all-pervading bi-polar essence) ہے جو ہمہ وقت حرکت میں رہتا ہے اور تغیر وتبدل کا ایک سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ یہ اس کائنات ہی کی نہیں، پورے عالمِ امکان اور زندگی کی وہ تصویر ہے جو جدید سائنس نے کھینچی ہے۔ یہ حرکت جاری ہے اور اس کا رُخ شعور کی اعلاتر سطحوں کی جانب ہے۔

وحدت کی سطحیں:
Levels of Unity

جوہر وہ شے ہے جو وجود رکھتی ہے، تمام صورتیں اسی کی کایا پلٹ ہیں۔ ارتقا کا عمل اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ تمام تر زندگی اور اس ساری ترقی کا آغاز ایک واحد خلیے سے ہوا ہے۔ اسی طرح جب ہم بلند تر مرکز کی جانب بڑھتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ تمام تر تخلیقات کی اصل اللہ ہے، سارے نام اسی کے نام ہیں، سارے تجربات، ساری سائنس اسی کے علم کا نام ہے۔ فلسفی کی تلاش کا حاصل کسی نہ کسی سطح پر وہ خود ہے یا اسی کا کوئی پہلو، اور کچھ نہیں۔ سائنس دان اس مادی زندگی کی تحقیق وتفتیش کے دوران اسی ذات کی نچلی سطح کی تصویر کھینچتا ہے۔ فن کار ہو، موسیقی کار ہو یا عالمِ دین، سب اسی ہستی کے کسی نہ کسی پہلو، کسی نہ کسی سطح کو، کسی نہ کسی نقطۂ نظر سے بیان کرتے ہیں۔ ہر ایک اپنے ہی پہلو، اپنی ہی سمت تک محدود رہتا ہے اور سب اپنی اپنی بولی بولتے ہیں لیکن سب ایک ہی حقیقت کے مختلف جلوے بیان کرتے ہیں، اسی کی نیرنگیاں دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ وہی ایک حقیقت جو ہست ونیست کے درمیان کی سطحوں پر مسلسل متحرک رہتی ہے۔

صوفی شاعر سچل سرمست نے کسی مستی میں کھو کر کہا تھا:

گھنڈ کھول دیدار کرادو، میں آیا مکھ ویکھن

(گھونگھٹ کھول کر دیدار کروادو، میں تمھارا چہرہ دیکھنے آیا ہوں)

I have travelled thus far to behold your countenance

دنیا بھر کی سب چیزیں ایک وحدت (unity) ہیں۔ ہر شے ہم آہنگی، یکساں روی (consistency) اور وحدت کے حصول میں کوشاں ہے۔ مثال کے طور جب ہم کوئی بات کرنا چاہیں تو ہماری بات میں ہم آہنگی

Marfat.com

ہونی چاہیے۔ سوچ رہے ہوں تو سوچ میں ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ فزکس اور کیمسٹری جیسے سائنسی علوم بھی ہم آہنگی اور یکسانیت قائم رکھنے پر زور دیتے ہیں۔ واحد خلیے سے لے کر پورے انسانی جسم تک اور ماحول، معاشرہ، فزکس، فلسفہ، موسیقی اور آرٹ تک ہر شے ہم آہنگی اور وحدت تک پہنچنے کی تمنائی ہے۔ یہ وحدت پوری کائنات میں کارفرما ہے لیکن اس ہر شے پر محیط عظیم ترین وحدت میں اختلاف اور نیرنگی بھی نظر آتی ہے۔ عدم موافقت اور تنوع کے یہ مظاہر جو بظاہر ایک دوسرے سے متضاد اور جدا جدا دکھائی دیتے ہیں، اصل میں ایک ہی حقیقت کے مدارج میں فرق کے علاوہ کچھ نہیں۔

اللہ ہر چیز ہے لیکن وہ ہر چیز سے بڑھ کر بھی کچھ ہے۔ اللہ ہر کہیں ہے لیکن اس کے مقام کا تعین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ تضاد جس کا حل تلاش کرنا ہماری سائنس کے بس کی بات نہیں۔ سب چیزیں اللہ کا جزو ہیں لیکن اللہ جزو نہیں ہے۔ کل اجزا سے بڑا اور ان سے آزاد ہوتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ انسان کی ذات اللہ کی ذات کا جزو ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ کسی نہ کسی طور انسان کا محتاج ہے۔ یہ حقیقت کا معکوس رُخ ہے۔۔۔ ایسی غلطی ہے جس کا ارتکاب انسان اکثر کر بیٹھتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی اصل میں انسان اللہ کا دست نگر اور اس کا محتاج ہے۔ اللہ اجزا کے عمل میں مساوی طور پر شریک ضرور ہو سکتا ہے جیسے ریاضی کی مساواتوں میں جب لامتناہی سے معاملہ پڑتا ہے تو جزو کل کے برابر ہو جاتا ہے لیکن اللہ اجزا کے مساوی نہیں ہے۔ انسانوں کا باہمی ربط و تعلق اللہ پر اثر انداز ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی لیکن اللہ کا انسانوں سے تعلق لازمی طور پر انسانوں کو متاثر کرتا ہے۔

حقیقت رویے پر منحصر ہوتی ہے:
Reality Depends on Attitude

اللہ ایسی حقیقت ہے جو بھی کچھ ہو، اور ایسی حقیقت سے انسانی ربط و تعامل بڑی حد تک ہمارے اپنے طرزِ عمل، ضروریات اور رخ بندی پر منحصر ہے۔ روزمرہ زندگی کی حقیقتوں کے بارے میں انسان کا رویہ اور برتاؤ بھی اسی کلیے کے تحت ہوتا ہے۔ مثال کے طور ہنرمندی (craft) کو لیجیے، ہم اس سادہ سی حقیقت کے بارے میں کیا کیا ممکنہ رویے رکھ سکتے ہیں؟ ہنرمندی انسانی مہارت ہے، ہنرمندی ٹیکنالوجی ہے، ہنرمندی حسن ہے، ہنرمند یفن ہے، دست کاری تعلیم ہے، دست کاری علم ہے، ہنرمندی صنعت ہے، ہنرمندی

Marfat.com

معاشیات ہے، ہنر مندی ورثہ ہے، دست کاری قدامت ہے، ہنر مندی تشخص ہے اور اس سے بھی زیادہ بہت کچھ۔ کتنے ہی زاویہ نگاہ، کتنے ہی رویے، کتنے ہی رُخ ہیں جو اللہ جیسی عظیم حقیقت ہم انسانوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔ انسان اپنی انسانی حد سے ماورا نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ہم انسانی نقطۂ نظر کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہی کلیہ سائنس پر بھی لاگو آتا ہے۔ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں دیکھتے ہیں کہ کیسے داخلی پہلو بروئے کار آتے ہیں۔ مثال کے طور پر سیب ہی کو لیجیے؛ دیکھنے میں یہ ایک سیب ہے لیکن جب ہم داخلی پہلو اپنے نقطۂ نظر میں شامل کرتے ہیں تو صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ یہی سیب کسی اور بچے کے لیے کچھ اور معنویت رکھتا ہوگا بلکہ ایک ہی بچے کے لیے بھی کسی اور وقت میں سیب کی معنویت کچھ اور ہوگی۔ کسی ناراض بچے کے لیے تو یہ اٹھا کر دے مارنے کی ایک چیز ہوگا، کسی بھوکے بچے کے لیے یہ کھانے کی شے ہوگا، اور کسی شریر بچے کے لیے کھیلنے والا ایک کھلونا۔ یوں داخلی پہلو کے بدل جانے سے ایک ہی حقیقت کے مختلف معنی سامنے آتے ہیں۔ حقیقت خود اپنے اندر ہی سب کچھ ہوتی ہے۔

ایٹم کی مثال لیجیے؛ کسی سائنس دان کے لیے ایٹم بیک وقت عنصر بھی ہے، مرکب بھی اور مادے کی تمام حالتیں اور صورتیں بھی اسی سے وجود میں آتی ہیں اسی طرح ایک کوانٹم سائنس دان کے لیے یہ بیک وقت مادی بھی ہے اور غیر مادی بھی۔ اب سائنس دان کسی خاص موقع پر ان میں سے کس نقطۂ نظر کو اپنائے گا یہ اس کے طرزِ عمل اور اس کی وقتی ضروریات پر منحصر ہے۔ حق یا خدا یا حقیقت، جو بھی آپ کہیں، اوزاروں کے ڈبے کی مثال ہے جس میں ہر طرح کے اوزار موجود ہوتے ہیں۔ عملیت پسندی (pragmatism) پر یقین رکھنے والے امریکی فلسفی ولیم جیمز نے حق کو اسی طرح، لامحدود امکانات کے ذخیرے کے طور پر بیان کیا ہے۔ اب یہ ہمارے لیے کیا معنویت اختیار کرتا ہے، اس کا دارومدار کسی خاص لمحے میں ہماری دلچسپی اور ہماری وقتی ضرورت پر ہے۔ یہی دلچسپی یا ضرورت ہمارے رویے کا تعین کرتی ہے اور اس کا انحصار ہماری رُخ بندی، ہماری استعداد اور ہماری آگاہی کی سطح پر ہوتا ہے۔

اللہ سب کچھ ہے اور اس سے بھی بڑھ کر بہت کچھ لیکن تاریخ کے کسی خاص عہد، کسی مخصوص وقت میں وہ ہمارے لیے کیا ہے، اس کا دارومدار ہماری اپنی تلاش اور کاوش پر ہے۔ اگر ہم خود اپنے آپ کو پانا چاہتے ہیں تو اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنا سر منڈا کر جوگی بن جائیں، ترک دنیا کر کے ویرانوں میں نکل جائیں اور کسی

Marfat.com

پرانے برگد کے نیچے بیٹھ کر راتیں جاگ جاگ کر گزاریں، فاقہ کشی اختیار کرلیں اور گہرے گیان دھیان میں کھو جائیں۔ ایک نہ ایک دن ہمیں خود اللہ کا عرفان حاصل ہو جائے گا۔ اب اگر یہ عرفان ہونے کے بعد ہم اسے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنے لگیں اور انھیں وہ بات سمجھانا چاہیں جسے انھوں نے خود دیکھا نہ سمجھا، تو یہ کوشش بالکل بے ثمر رہے گی؛ خواہ ہم اس میں اپنی ساری عمر صرف کردیں۔

دوسری طرف اگر ہم خارجی دنیا کا علم حاصل کرنے میں مصروف ہو جائیں تو ہم اس محیطِ کل (all-prevading) وجود کو کچھ عمومی قوانین اور نظریات، ریاضیاتی مساواتوں اور منظّم و منضبط سائنسی کلیوں تک محدود کر بیٹھیں گے لیکن ایک دن ہمیں محسوس ہوگا کہ اس تلاش میں ہم نے اللہ ہی کے چند پہلو دریافت کر لیے ہیں۔ اسی طرح کوئی شاعر خدا کو شاعری میں پالے گا، کوئی سورما شجاعت اور جانبازی میں اسے دیکھ لے گا۔ کسی صوفی کو عجز و انکسار، مثالیت پسند (idealist) شخص کو اخلاقیات اور مادیت پرست کو مشین میں ہی حق مل جائے گا۔ حق ہر شے میں ہے اور ہر شے سے زیادہ ہے۔ اللہ خود کو پورے کا پورا صرف اس وقت منکشف کرتا ہے جب ہم اس کو بحیثیت کل ڈھونڈنے نکلتے ہیں اور بس۔

مراکز کا درجہ وار تسلسل:
Graded Continuum of Centers

حق مراکز کا درجہ وار تسلسل ہے۔ یہ ہمیں مختلف نقطہ ہائے نظر، مختلف زاویۂ نگاہ، مختلف حوالوں، مختلف سمتوں میں مل سکتا ہے۔ دائرہ در دائرہ راستے، تعبیر و تشریح کے لاتعداد قرینے، استعمال کے بے شمار طریقے اور لامحدود امکانات ہمیں میسر ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی رستہ درست ہو سکتا ہے مگر جزوی طور پر۔ عملیت پسندی کے نظریے سے دیکھیں تو ان میں سے ہر ایک کی اپنی افادیت اور اہمیت ہے۔ لیکن پھر بھی اگر ہم جسمانی سطح پر اپنے وجود کا مطلق علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں سائنس سے رجوع کرنا ہوگا، نظریاتی سطح پر ذہن کے بارے میں حتمی بات جاننے کے لیے فلسفے سے استفادہ کرنا ہوگا، معاشرتی اور علمی میدان میں نفسیات اور عملیت پسندی کے علوم کی راہ اپنانی ہوگی، شاعری اور آرٹ کے لیے تخلیقیت اور حسن کے میدان میں قدم رکھنا ہوگا، انفرادی عرفان کے لیے تصوف اور اجتماعی معرفت کے لیے مذہب سے رجوع کرنا ہوگا۔ یہ سب ایک ہی حقیقت کو جاننے کے مختلف حوالے ہیں۔ حق ہمہ جہت ہوتا ہے۔ اسے کئی جہتوں، کئی سمتوں اور پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ غور

Marfat.com

کرنے کی بات یہ ہے کہ حق نہیں بدلتا، صرف اسے دیکھنے کا طریقہ، زاویہ بدل جاتا ہے۔ انسان کا حق کے بارے میں تصور بدلتا رہتا ہے اور ارتقا پاتا رہتا ہے۔

صوفی شاعر سلطان باہو نے سچ کہا ہے:

جے تن سارا اکھیاں ہووے، میں تینوں ویکھ نہ رجاں ہو
اک اک لوں مُدھ لکھ لکھ چشماں، میں اک کھولاں، اک کجاں ہو
اتنیاں چشماں میرے ہتھ نہ آون، میں کس بل ڈھونڈن بھجاں ہو
اگر میرا سارا بدن آنکھ بن جائے تو بھی میں اپنے محبوب کو دیکھ دیکھ کر سیر نہ ہو پاؤں
کاش میرے ایک ایک لوئیں پر لاکھ لاکھ آنکھیں ہوں، میں ایک کھولوں تو دوسری بند
کروں اتنی آنکھیں میرے ہاتھ نہیں آتیں، میں کہاں کہاں دوڑوں بھاگوں!

فزکس، کیمسٹری، فزیولوجی، بائیولوجی، سائیکولوجی، یہ سب علوم ایک ہی حقیقت کو مختلف زاویوں اور مختلف پہلوؤں سے دیکھنے کے طریقے ہیں اور شاعر کی زبان میں یہ سب ہماری آنکھیں ہیں۔

کلّی نقطۂ نظر:
Holistic View

تمام اشیا ایک واحد، عظیم ترین نامیاتی اکائی (Supreme Organism) میں وجود رکھتی ہیں۔ جیسے انسانی جسم میں موجود ہر شے، خلیے، ناخن، بال، ہڈیاں، اعضا، بیکٹیریا، کیڑے، فضلہ، دل، دماغ، شعور، سب انسانی اکائی کا حصہ ہیں۔ اسی طرح ہر جان دار اور بے جان شے اللہ کی ذات کا حصہ ہے مگر اللہ نہیں ہے۔ جیسے میرے ناخن، میرے بال، میرا فضلہ، میرے مردہ خلیے مَیں نہیں۔ فلسفے، سائنس، ماحولیات، موسیقی، آرٹ اور مذہب میں یہ کلّی نقطۂ نظر (holism) تیزی سے مقبول ہو رہا ہے اور اشیا کا نامیاتی پہلو (organismic) روز بروز زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا جا رہا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ سب اشیا اصل میں بدلی ہوئی صورتیں (transformations) ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر شے کسی اکائی کا جزو (single organism) ہے۔ یعنی اس کائنات میں کوئی چیز بھی الگ تھلگ اور خود مختار نہیں ہے کیوں کہ سب اشیا کسی اعلا تر ہستی کے جزو ہیں، مرحلے ہیں اور مدارج ہیں۔ اگر ہم کوئی ایک بھی ایسی چیز دریافت کر سکیں جو آزادانہ اپنا

Marfat.com

وجود رکھتی ہے اور دوسری اشیا سے الگ تھلگ اور خودمختار ہے تو ہمارا یہ قضیہ غلط ثابت ہو جائے گا کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس اکائی سے الگ بھی وجود ممکن ہے۔ لہٰذا اس پورے عالمِ کون ومکاں میں، اگر کہیں بھی کوئی چیز، مثلاً سورج، ستارے، سیارے، موسیقی، فلسفہ، سائنس، سماجیات، افراد اور قومیں دوسری تمام اشیا سے الگ اور آزاد ثابت ہو جائے تو وحدت کا وجود مشکوک ہو جائے گا۔ ہر ایک چیز دوسری سے باہمی طور پر مربوط ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگرچہ عالمِ کون ومکاں اور مخلوقات باہم مربوط اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں لیکن وہ کل جس کا یہ جزو ہیں، ان سب سے آزاد اور منفرد ہے۔ اللہ واحد حقیقت ہے جو آزاد اور خودمختار ہے (الصّمد)۔

اللہ کا قانون سائنس پر لاگو ہوتا ہے نہ کہ اس کے برعکس:
Allah's law will Apply to Science not Vice Versa

جب یہ طے ہو جاتا ہے کہ سب کچھ اصل میں ایک ہی ہے اور حقیقی دوئی کا کوئی وجود نہیں۔ یہ تضادات صرف ظاہری ہیں اور ایک ہی وحدت کے لازمی جزو ہیں تو اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جو قوانین اور اصول ہم خارجی کائنات کے مطالعے سے اخذ کرتے ہیں انھی کی مدد سے خدا کی روحانی ذات کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کے برعکس جن قوانین کا اطلاق روحانی پہلو پر ہوتا ہے، وہی خارجی کائنات پر بھی منطبق ہو سکتے ہیں۔ شاید آپ میں سے کچھ لوگ یہ سمجھیں کہ میں سائنس کی مدد سے خدا کی دلیل پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور یوں اللہ کی موجودگی کا دفاع (apology) کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ طبعی سائنس کے اصول اللہ پر، جو ایک برتر سچائی ہے، کبھی منطبق نہیں ہو سکتے کیوں کہ یہ متوازی معکوس کے اصول کے خلاف ہے۔ درحقیقت اللہ کے اصول سائنس پر لاگو ہوتے ہیں۔ ہماری روزمرہ استعمال کی گھڑیاں کبھی سماوی اجسام، مثلاً چاند اور سورج کی حرکت کا وقت نہیں بتا سکتیں مگر ہماری گھڑیوں کو ان سماوی اجسام کی حرکت کی مدد سے درست کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہماری یہ معمولی سائنس کبھی اللہ کے الوہی بھید نہیں کھول سکتی لیکن اللہ کے یہ بھید ہمارے مستقبل کی سائنس پر ضرور اثر انداز ہوں گے۔ اس لیے یہ طے ہے کہ ہم اللہ کی صفات اور فطرت کو جانے بغیر کبھی بھی حقیقت کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

ولیم ایس کہن (William S. Kuhn) اپنی کتاب *The Structure of Scientific Revolution* میں لکھتا ہے:

"Scientists, being only human, cannot always admit their errors,

Marfat.com

even when confronted with strict proof. I would argue, rather, that in these matters neither proof nor error is at issue. The transfer of allegiance from paradigm to paradigm is a conversion ience that is not to be forced."

''سائنس دان بھی تو محض انسان ہی ہوتے ہیں اس لیے ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرلیں؛ چاہیں انھیں اس کا واضح ثبوت ہی کیوں نہ مل جائے۔ میرا موقف تو یہ ہے کہ ایسے معاملات میں نہ تو غلطی اہم ہے اور نہ ثبوت۔ ایک نقطۂ نظر سے دوسرے نقطۂ نظر تک پہنچنا دراصل تبدیلیٔ مذہب کے مشابہ ہے جس میں زور اور زبردستی کا دخل نہیں ہوتا۔''

فلسفی اور سائنس دان صدیوں سے کائنات کا ایک بنیادی اصول تلاش کرنے کی فکر میں رہے ہیں۔ یونانی دور سے فلسفی اس بات پر یقین کرتے آئے ہیں کہ مظاہر کی ظاہری نیرنگی اور اختلاف دراصل کسی اندرونی وحدت کا پردہ ہے اور عین ممکن ہے کہ کائنات کی بنیادی قوتوں کی فہرست بہت مختصر ہو جس میں شاید صرف ایک ہی اندراج ہو۔

The term "monism" (from the Greek monas "one"), like "materialism" and "dualism", is rather ambiguous. In modern philosophy it is used to designate any metaphysical theory which states that there is only one reality, from which everything else came. Thus, the nineteenth century Darwinist philosopher Ernst Haeckel distinguished between dualism - the religious idea of a God separate from his creation - and monism - the thesis that there is "one sole substance in the universe, which is at once "God and Nature"; body and spirit...." [p.16]. Nowadays this position would be referred to as "Holism". Likewise, the psychologist, philosopher, and student of religious experience William James developed the theory of Neutral Monism, according to which mind and matter are ultimately reducible to the same reality [Evan Harris Walker, "The Nature of Consciousness", Mathematical Biosciences, 1971, 132-3]. In general then, and like Holism, Monism heals the split between mind and matter, or natural and supernatural, caused by Dualism. Thus, for example the Jewish philosopher Spinoza suggested that the radical duality of Mind and Matter proposed by Descartes

Marfat.com

constituted only two of an infinite number of attributes of a single substance, God. Spinoza was the first modern pantheist and was excommunicated and condemned by the Jewish community of the time for his trouble. In our own century though, Einstein, when asked by an important Rabbi what his conception of God was, replied that the only concept of God that made sense to him was the God of Spinoza, who was not an entity separate from the Cosmos.

''وحدانیت (Momoism یونانی لفظ مونو سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے ایک) کی اصطلاح بھی مادیت اور ثنویت کی اصطلاحوں کی طرح مبہم سی ہے۔ جدید فلسفے میں اس سے مراد ہے کوئی مابعد الطبیعیاتی نظریہ جس کے مطابق حقیقت صرف ایک ہے اور باقی سب اشیا اسی واحد حقیقت سے نکلی ہیں۔ انیسویں صدی کے ڈارونی فلسفی، ارنسٹ ہیکل (Emst Haeckel) نے ثنویت اور وحدانیت میں یوں فرق قائم کیا ہے کہ ثنویت (Dualism) ایک مذہبی نظریہ ہے جس کی رو سے خدا اپنی مخلوق سے الگ ہے، اور وحدانیت (Monism) یہ عقیدہ ہے کہ کائنات میں صرف ایک ہی مادہ موجود ہے جو بیک وقت خدا بھی ہے اور فطرت بھی، جسم بھی ہے اور روح بھی۔ اس نقطۂ نظر کو آج کل نظریۂ کلیت (Holism) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح فلسفی، ماہرِ نفسیات اور مذہبی تجربے کے طالب علم ولیم جیمز نے ایک نظریہ تشکیل دیا ہے جسے غیر جانب دار وحدانیت (Neutral Monoism) کا نام دیا گیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق ذہن اور مادہ آخر کار ایک ہی حقیقت میں ڈھل جاتے ہیں''۔

(The nature of Consciousness: *Mathematical Biosciences, 1971, 132-3*)

''عام طور پر نظریۂ کلیت کی طرح وحدانیت بھی مادے اور ذہن، فطرت اور مافوق الفطرت کے درمیان ثنویت کی پیدا کردہ خلیج کو پاٹ دیتی ہے۔ مثال کے طور پر یہودی فلسفی سپائی نوزا نے کہا تھا کہ ڈیکارٹ نے ذہن اور مادے کی جس اساسی ثنویت کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ خدائے واحد کے لاتعداد پہلوؤں میں سے صرف دو کو ظاہر کرتی ہے۔ سپائی نوزا جدید دور کا پہلا وحدت الوجودی فلسفی تھا۔ اس دور کے یہودیوں نے نہ صرف اس کی مذمت کی تھی

Marfat.com

بلکہ اسے اپنی برادری نے بھی خارج کر دیا تھا۔خود ہماری اپنی صدی میں، جب ایک اہم ربی نے آئن اسٹائن سے پوچھا کہ خدا کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے تو اس نے جواب دیا کہ اسے خدا کا صرف وہی تصور بامعنی معلوم ہوتا ہے جو سپائی نوزا نے پیش کیا تھا اور جس کے مطابق خدا کون ومکاں سے الگ کوئی اکائی نہیں ہے''۔

اللہ کا سائنسی اصول بھی سمت بدلنے (Paradigm Shift) کا نام ہے۔یہ وہ وحدت انگیز نظریہ (Unification Theory) ہے جس کی سائنس دانوں کو ہمیشہ تلاش رہی ہے۔تھیوری آف ایوری تھنگ (TOE) کی تلاش کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ صدیوں پرانی کوشش میں کامیابی کی عقلی تسکین حاصل ہو جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ،اس کی ایک اہم اور اساسی وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے پہلے کے تمام وحدت خیز نظریات نئے امکانات کی پیش گوئیاں کرتے رہے ہیں۔اس طرح ایک نئے اور اعلا تر نظریے کی جانب رُخ کرنے سے (Paradigm Shift) سائنس کو ایک نیا حوالہ مل جائے گا اور انسانیت کے لیے ایک نئے عہد کا دروازہ کھل جائے گا۔

میکس پلینک (Max Planck) نے اپنی خودنوشت میں نہایت افسوس سے اعتراف کیا ہے:

''کوئی نئی سائنسی سچائی اس لیے غالب نہیں آجاتی کہ وہ اپنے مخالفین کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور انھیں ایک نئی روشنی عطا کر دیتی ہے۔اس کی کامیابی صرف اس لیے ممکن ہوتی ہے کیوں کہ اس کے مخالفین رفتہ رفتہ مر جاتے ہیں اور نئی نسل آگے آجاتی ہے جو اس سے واقف ہوتی ہے۔''

رُخ بدلنے سے سائنسی بصیرت اور تحقیق میں کیسے انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور ماضی میں اس طرح رخ بدلنے سے فزکس، کیمسٹری اور نفسیات جیسی سائنسوں پر کتنے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں؛ اس حوالے میں ٹامس ایس کہن (Thomas S. Kuhn) نے اپنی سائنسی تصنیف *Structure of Scientific Revolution* (شکاگو پریس، ۱۹۶۲) میں جو لکھا ہے میں اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔

''سائنس کی تاریخ کا علم رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ جب رُخ بدلتا ہے تو اس کے ساتھ ہی دنیا بھی بدل جاتی ہے۔نئے رخ کے حوالے سے سائنس دان نئی تحقیقات کا آغاز کرتا

Marfat.com

ہے، نئے راستے اپناتا ہے اور نئے مقامات کھوجتا ہے۔ یوں بعض اوقات وہی پرانی حقیقت
بھی نئی نئی اور مختلف نظر آنے لگتی ہے۔"

انسانی نقطۂ نظر:
Human Point of Reference

کہن کا یہ مشاہدہ کوانٹم فزکس کی اس جدید دریافت کی تصدیق کرتا ہے کہ حقیقت کا تعین کرنے کے لیے انسانی حوالہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ نفسیات اور سائنس بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ انسان جب حقیقت کا تعین کرتا ہے تو یہ بات بہت اہم ہو جاتی ہے کہ حقیقت کو دیکھنے والا کون ہے؟ اس کا زاویۂ نظر کیا ہے؟ اور اس کی فوری ضرورت کیا ہے؟ یہ تجربہ انسان کے روزمرہ معمول اور اس کی عام بصیرت کا حصہ ہے۔ آپ کا ادراک (perception) اس بات پر منحصر ہے کہ اس خاص وقت میں آپ کی توجہ کا مرکز کیا ہے۔ حقیقت خود سب کچھ ہے اور اس سے بڑھ کر بھی کچھ ہے۔ حقیقت کبھی نہیں بدلتی، صرف انسان کا اسے دیکھنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ انسان کی تلاش، اس کے تصور اور نقطۂ نظر کا یوں بدل جانا اس کی آگہی میں اضافہ کرتا ہے اور حقیقت کی نئی نئی جہتیں اور سطحیں اس پر منکشف ہونے لگتی ہیں۔ یہی مذہب کا بھی فرمان ہے، "تلاش کرو گے تو پالو گے!" سائنس دان کی آگہی کے مطابق جو بطخیں تھیں وہ اب الٹی شبیہ کے تجربے (Reversible Figure Experiment) کے تحت خرگوش ہیں۔ اس تجربے میں شبیہ تو وہی رہتی ہے، بس سائنس دان اسے الٹی طرف سے دیکھتا ہے تاکہ ایک نئی حقیقت کو دریافت کر سکے۔ نفسیات میں ایسے گیسٹالٹ (Gestalt) تجربے یہ ثابت کرتے ہیں کہ زاویۂ نظر بدلنے سے کیسے ایک ہی چیز مختلف دکھائی دینے لگتی ہے حالانکہ خود اس چیز میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اللہ بھی ناقابلِ تغیر ہے۔ اللہ سب کچھ ہے، مگر اس کے بارے میں انسان کا ادراک، اس کا فہم، اس کا تصور ہمیشہ بدلتا رہا ہے اور یوں انسان نے حقیقت کی معرفت کے اعلا تر مدارج اور برتر سطحوں تک رسائی حاصل کی ہے۔

ہینوور انسٹی ٹیوٹ میں ابتدائی تجربات کے دوران، ایک شخص؛ جس نے الٹا دکھانے والی عینک پہن رکھی ہے، ہر شے کو الٹا دیکھتا ہے اور اپنی نظر میں ایک انقلابی تبدیلی محسوس کرتا ہے۔ شروع شروع میں شاید وہ کچھ بے سمتی، تحیر اور شخصی بحران کا شکار ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس کیفیت سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔

Marfat.com

ایمان اور تشکیک:
Faith and Doubt

ایسی طرح یہ بھی ہے کہ رُخ کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ ادراک کی لازمی شرط ہے۔ یوں ایمان نہ صرف مذہب کی، بلکہ سائنس کی بھی بنیاد ہے۔ لیکن مسلسل شک اور غیر یقینی کی بجائے شک اور یقین کا امتزاج ہی تلاش کو باثمر کرسکتا ہے۔ فریضہ (hypothesis) سائنس دان کا ایمان ہے اور تجربہ (experiment) اس کا شک۔ ان دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ کسی معروف معمے کو حل کرنے میں مسلسل ناکامی سائنسی بحران کو جنم دیتی ہے۔ ایسی صورت میں رُخ بدلنے اور تحقیق کا طریقہ کار تبدیل کرنے سے ہی مزید سائنسی ترقی اور پیش رفت ہوسکتی ہے۔ یوں رُخ بدل لینے سے نہ صرف ادراک بدل جاتا ہے بلکہ انسانی آگہی میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر نیوٹن نے حرکت کے ارضی قوانین کو سماوی اجسام کی حرکت پر بھی منطبق کر لیا تھا۔ آئن اسٹائن نے برقی تحرک کے علاوہ حرکت کے قانون کو اپنے نظریہ اضافیت (theory of relativity) سے ہم آہنگ کیا۔ اس نے اپنی معروف مساوات E=MC2 کے ذریعے مادے اور توانائی کو بھی ہم آہنگ کر دیا۔ اسی طرح اللہ کے سائنسی قانون نے بھی ہر طرح کی ثنویت کو، جو سائنس اور فلسفے دونوں کو گھن کی طرح چاٹ رہی تھی، وحدت میں بدل دیا ہے۔ اس قانون نے سائنس اور مذہب، عقل اور ایمان کو ہم آہنگ کر دیا ہے جن کا تضاد کئی صدیوں سے سائنس کو بحرانی کیفیت میں مبتلا کیے ہوئے تھا اور سائنسی دنیا کا سب سے بڑا معمہ بنا ہوا تھا۔ ایسی شدید الٹ پلٹ، تبدیلی اور پھر ہم آہنگی کی حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے علمِ موسیقی سے مدد لی جا سکتی ہے جس میں یہ الٹ پلٹ (Inversion) بھرپور طریقے سے واضح ہوتی ہے۔ موسیقی میں اس عمل (Inversion) سے مراد ہے، نچلے سر کو بلند کر دینا یا چکر مکمل کرتے ہوئے کسی بلند سر کو آٹھ سر نیچے لے آنا۔ یہ آٹھ سر (Octave) ایک تسلسل میں ہوتے ہیں۔ یہ ایسے چکروں کا تسلسل ہے جس میں ایک ہی سر کو الٹ پلٹ کر اونچا اور نیچا کرتے رہتے ہیں۔ ان میں فرق صرف درجے کا ہوتا ہے۔ حقیقت کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ موسیقی کے آٹھ سروں کا چڑھنا اور اترنا حقیقت کا عکس ہے اور بس یہی ساری کہانی ہے۔

ہر سائنس کے لیے؛ خواہ وہ طبعی ہو یا سماجی، اللہ کا پہلا قانون بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس کے اطلاق کی متنوع اور کثیر صورتیں ہیں۔ روحانی دنیا میں بھی یہ بہت اہم ہے اور روحانی عقائد، رویوں اور انسان کے الوہیت سے تعلق پر شدت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن فی الحال ہم ان پہلوؤں کی وضاحت نہیں کریں گے تاوقتیکہ اس

Marfat.com

قانون کی مزید تجرباتی شہادتیں حاصل نہ کرلیں اور اس کے اطلاق کی مزید صورتیں دیکھ لیں۔

اللہ کی دورُخی صفات:
Allah's Polar Attributes.

یہ دیکھنے کے بعد کہ وحدت کیسے تضادات میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے، استخراجی طریقے سے آگے بڑھتے ہوئے ہم فرض کر سکتے ہیں کہ وحدت بھی لازمی طور پر دورُخی ہے اور اس کی مثال مقناطیس یا برقی توانائی کی سی ہے جس کی اساسی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کشش اور گریز کی قوتیں ہوتی ہیں۔ کسی ایٹم یا کوانٹم ذرے کی طرح یہ دوراخا پن وحدت کی ناگزیر صفت ہے۔ اگر ہمارا یہ مفروضہ درست ہے تو لازم ہے کہ یہ سب سے بنیادی خصوصیت اللہ کے ناموں اور اس کی صفات میں بھی نظر آئے۔

اللہ کے ننانوے ناموں پر ایک نظر ڈالتے ہی اس حقیقت کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اللہ کے ناموں کے بیشتر جوڑے ایک دوسرے سے بالکل الٹ صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔

الغفار (معاف کرنے والا)	القہار (مغلوب کرلینے والا)
القابض (سکیڑنے والا)	الباسط (پھیلانے والا)
الخافض (قدر و قیمت گھٹانے والا)	الرافع (قدر و قیمت بڑھانے والا)
المعز (عزت دینے والا)	المذل (ذلت دینے والا)
الحافظ (حفاظت کرنے والا، بچانے والا)	الحسیب (حساب چکانے والا)
الکریم (کرم کرنے والا)	الرقیب (نگرانی کرنے والا)
المبدی (ابتدا کرنے والا)	المعید (واپس کھینچنے والا، بحال کرنے والا)
المحی (زندگی دینے والا)	الممیت (موت دینے والا)
المقدم (اگلا)	الموخر (پچھلا)
الاول (پہلا)	الآخر (آخری)
الظاہر (عیاں)	الباطن (نہاں)

Marfat.com

التواب (معافی دینے والا)	المنتقم (انتقام لینے والا)
المقسط (تقسیم کرنے والا)	الجامع (جمع کرنے والا)
النافع (فائدہ پہنچانے والا)	الضار (نقصان پہنچانے والا)

گنج العرش میں بھی اسی طرح اللہ کی دورخی صفات کے جوڑے بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن جو اللہ کا الہامی کلام ہے، ایسے متضاد معانی کے جوڑے دار الفاظ سے پُر ہے۔ ان میں چند ایک، جو بار بار دہرائے جاتے ہیں، یہ ہیں:

رب الارض و السموٰت	زمین اور آسمانوں کا رب
عالم الشہادۃ، عالم الغیب	مرئی دنیا، غیر مرئی، نادیدہ دنیا
سبحان ذی الھیبت والقدرۃ	پاک ہے وہ جو تعمیر و تخریب کا رب ہے
رب المشرقین و رب المغربین	مشرق کا رب اور مغرب کا رب

قرآن میں یہ خصوصیت تسلسل سے ملتی ہے کہ اس میں بار بار اللہ کی صفات، افعال اور تخلیقات کے دورُخے پن کی یاددہانی کروائی گئی ہے۔

سورۃ الفجر ۸۹:۱

اللہ قسم کھاتا ہے طاق اور جفت کی

سورۃ الاعلیٰ، ۸۷:۱

اللہ کے نام کی حمد و ثنا کرو جو سب سے اعلا ہے۔ جس نے سب چیزیں خاص تناسب سے پیدا کیں اور ان کی تقدیر طے کی اور انھیں ہدایت دی، وہ جو سرسبز چراگاہیں بناتا ہے اور پھر انھیں مرجھائی ہوئی گھاس میں تبدیل کر دیتا ہے۔

سورۃ الشمس، ۹۱:۱۔۱۰

اس سورۃ میں اللہ جب بار بار اپنی مخلوق کی قسم کھاتا ہے تو ایک بار بھی تضاد کی صفت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے:

سورج اور اس کی بڑھتی ہوئی روشنی کی قسم!

چاند کی قسم جو اس کے بعد طلوع ہوتا ہے!

Marfat.com

دن کی قسم جو شان و شوکت کو عیاں کرتا ہے!
رات کی قسم جو سب کچھ چھپا دیتی ہے!
آسمانوں کی قسم اور اس کی جس نے انھیں بنایا!
زمین کی قسم اور اس کی جس نے اسے بچھایا!
جان کی قسم اور اس کی جس نے اسے صورت عطا کی اور اس میں نیکی اور گناہ کی صفت رکھی!
اس شخص پر رحمت ہوگی جس نے اسے پاک رکھا اور وہ تباہ ہو جائے گا جس نے اسے خراب کیا۔

صوفیانہ قولِ محال:
The Sufi Paradox

اسی طرح مشرق کے صوفیانہ ادب میں بھی اکثر متضاد الفاظ کے جوڑوں کے ذریعے روحانی کیفیات و تجربات بیان کیے جاتے ہیں مثلاً ہجر اور وصال، طلب اور ہیبت، شمع اور پروانہ، شعلہ اور شبنم، لوح اور قلم، فنا اور بقا، قبض اور بسط، سالک اور مجذوب، تقدیر اور تدبیر، شریعت اور طریقت وغیرہ۔ مشرق کے مابعدالطبیعیاتی شعری ادب میں ایسے روحانی تصورات اور تجربات کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے جو بظاہر ایک دوسرے سے الٹ معلوم ہوتے ہیں لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ اس کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ خدا خود دورُخی صفات کا مالک ہے اور دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حقیقت خود ہی اپنے آپ کو دن اور رات، خزاں اور بہار، محبت اور نفرت، کشش اور گریز، دباؤ اور کھنچاؤ، مثالی اور حقیقی جیسے تضادات کے چکروں کے ذریعے ظاہر کرتی ہے۔ اسے کسی بھی زاویے سے دیکھا جائے، حقیقت یہی ہے کہ یہ دورُخاپن نہ صرف موجود ہے بلکہ حقیقت کی ہر سطح کے بارے میں انسان کے تصور کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

قانونِ مساوات:
THE LAW OF PARITY
نقطۂ اعتدال:
The Golden Mean

مساوی تعامل کا اصول (Principle of equal interactions) توازن اور استحکام قائم کرتا

Marfat.com

ہے۔ یہ تنظیمی نوعیت کا حامل ہے اور تمام اشیا کو ایک سطح پر لے آتا ہے۔ یوں یہ سب کے لیے انصاف اور مواقع فراہم کرنے کا ذمہ دار ہے۔ یہ انسانوں کو سختی، تشدد اور انتہا پسندی سے محفوظ رکھتا ہے اور زندگی کو معتدل منطقوں میں قائم رکھتا ہے۔ جنگل کے قانون سے لے کر انسانی خوراک، جسم کے نامیاتی استحکام کے رجحان، ماحول کی عمرانیات، ذہن کے محرکات اور تاریخ کی تحریکات تک، جنھوں نے ہیگل کو دعویٰ، جواب دعویٰ اور ترکیب (Thesis, anti-thesis, synthesis) کا نظریہ تشکیل دینے کی تحریک بخشی، ہر چیز میں توازن برقرار رکھا جاتا ہے۔ عالمِ فطرت میں یہ اصول قوانینِ فطرت کے ذریعے رونما ہوتا ہے جو ہر شے میں ایک متحرک توازن قائم کرتے ہیں۔ انسانوں میں اس کے اطلاق کی مثالی صورت یہ ہے کہ یہ آزاد ارادے کے ذریعے عمل میں آئے، نہ کہ بزور یا حالات کے جبر کے تحت۔

توازن کا مطلب یہ ہے کہ دو انتہائی قوتوں کے درمیان کوئی ایسا نقطہ جہاں دونوں میں سے کسی ایک قوت کو بھی دوسرے پر برتری یا فوقیت حاصل نہ ہو۔ جیسے مابعد الطبیعیاتی سطح پر قانون کا اطلاق اور بے نظمی کی حالت۔ قانون اپنی اصل میں غالب آنے والا ہے اور بے نظمی اپنی فطرت میں مغلوب نہ ہونے والی۔ ان میں نقطۂ توازن وہ ہوگا جہاں دونوں کے منفی اثرات ختم ہو جائیں گے۔ توازن کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ایک سے زیادہ متضاد قوتوں میں طاقت کا توازن قائم کیا جائے۔ اس توازن کی غیر موجودگی میں غالب قوت، مغلوب قوتوں کا استحصال کرتی ہے جن میں اپنا دفاع کرنے کی صلاحیت کم تر ہوتی ہے۔

فن کارانہ توازن: بیسویں صدی میں فن اور موسیقی کی دنیا میں قانون اور بے ترتیبی دونوں نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ فن پارے، جبلی یا جذباتی سطح پر ناقابلِ فہم ہونے کے درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ کئی موسیقاران دونوں انتہائی مقامات میں سے ایک کو دوسرے پر قابلِ ترجیح سمجھ بیٹھے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں میں توازن ہی وہ فیصلہ کن عنصر ہے جو فنی کمال پیدا کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہم تسلیم کر لیں گے کہ حسن کا جوہر، ہیئت (structur) اور جذبے (emotion) میں توازن قائم کرنے سے ہاتھ آتا ہے۔ یونانی ذہن کے مطابق توازن، حسن کی صفات میں سے ایک صفت تھا۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ حسن کے اجزائے ترکیبی تین ہوتے ہیں: توازن، تناسب اور ہم آہنگی (symmetry, proportion and harmony)۔ تثلیث کا یہ اصول ان کی زندگیوں میں نفوذ کر گیا تھا۔

Marfat.com

اخلاقی توازن: فلسفے میں اخلاقی توازن (moral balance) کا تصور کئی صورتوں میں سامنے آتا ہے؛ ان میں سے ایک صورت ''نقطۂ اعتدال'' (Golden Mean) کی ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وفور (extreme) اور فقدان (lacking) کے عین درمیان ہوتا ہے۔ افلاطون، ارسطو اور فیثا غورثیوں (جنھوں نے اخلاقی فضیلت کو ریاضیاتی کمال سے بیان کیا ہے) جیسے یونانی فلسفیوں نے اس اصول کا اطلاق اخلاقیات پر بھی کیا ہے اور سیاست پر بھی۔ ڈیلفی (Delphi) کے معبد پر جو تین اقوال کھدے ہوئے ملے ہیں ان میں سے ایک تھا: ''کثرت کسی شے کی نہیں (Nothing in excess)''۔ (وکی پیڈیا)

استحکام اور وحدت وسط میں آتے ہیں جہاں اللہ کی دو متضاد صفات میں توازن قائم ہوتا ہے۔ یہی نقطۂ اعتدال ہے۔ تمام مذاہب توازن کے حامی ہیں۔ بدھ مت میں یہ تصور ''وسطی راہ'' کہلاتا ہے۔ سنسکرت میں اسے ''مدھیاما پرتی پد'' کہتے ہیں اور سدھارت نجات کی طرف لے جانے والے راستے کو اسی نام سے بیان کرتا تھا۔ نروان حاصل کرنے کے بعد اس نے لوگوں کو جو پہلا درس دیا تھا وہ یہی تھا۔ اپنے ستہ (Divine Law) میں، جسے ''دھرم کا پہیہ چلانے کا رستہ'' کہتے ہیں، بدھا نے وسطی راہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ نفسانی تسکین اور نفس کشی کی انتہاؤں کے درمیان کا مقام ہے۔ مگر یہ درمیانی مقام کوئی ساکن و جامد نقطہ نہیں ہے بلکہ ایک متحرک راستہ ہے جس کی تبلیغ گوتم بدھ نے کی تھی۔ ہندومت میں تعمیر و تخریب کے درمیان وسطی اصول برہما ہے۔ کنفیوشس کی تعلیمات میں بھی یہی نظریہ ژونگ یونگ (Zhong Yong) یا وسط کے نام سے ملتا ہے۔ اس نظریے میں وسط یا نقطۂ اعتدال کو ایک مستحکم محور کی مثال سے بیان کیا گیا ہے جو لڑکھڑاتا ہے نہ ڈولتا ہے۔ چنگ (Chung) کا مطلب ہے جو ایک طرف جھکے نہ دوسری طرف اور ینگ (Yung) کا مطلب ہے ناقابلِ تغیر۔ اس وسطی نقطے کا اصل مقصد توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنا اور ذہن کو مسلسل حالتِ سکون میں رکھنا ہے۔ ارتقا کے چکر میں انسان بھی بے جان اشیا اور عظیم ترین جان دار ہستی کے درمیان کا وسطی نقطہ ہے۔ اسی لیے انسانی زندگی کی نشوونما اور بقا روشنی، آواز، درجۂ حرارت اور زمینی اور انسانی ماحول کے وسطی، معتدل منطقوں میں ہی ممکن ہے۔ اسے اور وضاحت سے سمجھنے کے لیے روشنی کے مرئی طیف (vib-g-yor) کی مثال لیجیے: اودا اور بنفشی انتہائی سرد ہیں، جب کہ نارنجی اور سرخ انتہائی گرم۔ سبز رنگ وہ درمیانی معتدل منطقہ تشکیل دیتا ہے جہاں انسان کی نشوونما ہوتی ہے اور جو دو انتہاؤں کا وسطی مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سبز رنگ امن، زندگی اور استحکام کی عالم گیر علامت سمجھا جاتا ہے۔

Marfat.com

فلسفے میں سقراط یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کو ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ کیسے اسے دونوں طرف کے انتہائی مقامات سے حتی الامکان بچتے ہوئے وسطی راہ اختیار کرنی ہے۔ ارسطو کے نزدیک نقطۂ اعتدال ہی قابلِ حصول مقام ہے اور یہ وہ نقطہ ہے جہاں وفور اور کثرت ہے، نہ فقدان اور قلت۔

اسلام صراطِ مستقیم کا سبق دیتا ہے جو دو انتہاؤں کے بیچ میں بالکل سیدھی راہ ہے۔ یہ راستہ دو متضاد صفات کے وسط میں واقع ہے۔ یہ اجتماعِ ضدین ہے اور اسی لیے متناقض بالذات (paradoxical) بھی ہے۔ متضاد اصولوں کی یک جائی ترکیبی عمل کی فطرت میں شامل ہے؛ یہی وجہ ہے کہ اعلاتر حقیقتیں، خواہ وہ سائنسی ہوں یا مذہبی، ہمیشہ متناقض ہوتی ہیں۔ متحرک توازن کی یہ کیفیت دہری اذیت کا باعث بنتی ہے کیوں کہ دونوں طرف انتخاب کا امکان کھلا ہوتا ہے؛ دنیا یا آخرت، انسان یا خدا، جسم یا روح، سائنس یا مذہب۔ اسلام میں اسے دو دھاری تلوار (الذوالفقار) سے مشابہ قرار دیا گیا ہے جو دونوں طرف سے کاٹتی ہے۔ یہ تلوار حضرت محمدؐ نے اپنے داماد حضرت علیؓ کو پیش کی تھی اور اب عام عقیدے کے مطابق مسلمانوں کی میراث سمجھی جاتی ہے۔ خود حضرت محمدؐ بھی مسلمانوں کے نزدیک دو جہانوں کے آقا ہیں۔

سائنس میں بھی ہر چیز توازن کی متلاشی رہتی ہے اور اسے قائم بھی رکھتی ہے۔ انٹرنیٹ پر ایسی کئی مجالس (Forums) ملتی ہیں جہاں سائنس دان اور ماہرینِ طبیعیات نئے نئے نظریات اور دریافتوں کے بارے میں بحث مباحثہ کرتے رہتے ہیں۔ ان مجالس میں فزکس اور مذہب کے درمیان گرما گرم بحث جاری رہتی ہے۔

> ''اس بحث کا نقطۂ عروج پولنگ ہورن (Pollinghorne) اور جارج گرین سٹائن (George Greenstein) کا نقطۂ نظر ہے جو کہتے ہیں کہ ہماری کائنات مختلف قوتوں کے محتاط توازن کے بغیر قائم ہی نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر یہ قوتیں بالکل اسی سطح پر نہ ہوتیں بلکہ اس سے ذرا بھی مختلف ہوتیں تو انسانی زندگی جنم ہی نہ لے سکتی۔ پولنگ ہورن کا کہنا ہے کہ تخلیقِ کائنات میں ہر چیز اتنے مکمل تناسب میں ہے کہ جو لوگ اس کائنات کے کسی نہ کسی خالق کے وجود پر اعتقاد رکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس بات کی خاصی گنجائش موجود ہے کہ وہ سائنسی نظریات کے ساتھ ساتھ کائنات کی تخلیق کی ظاہری بے ترتیبی کے پس پشت کسی ذہن یا خدا کی موجودگی کو محسوس کر سکیں۔ سائنس اور مذہب میں نہ صرف بقائے باہمی کا تعلق ہے بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کو فروغ بھی دے سکتے ہیں۔'' (www.harkess.org.uk)

Marfat.com

اصولِ تقدیم:
The Principle of Precedence

المقدّم اور المؤخّر:

اللہ کے اسمائے حسنیٰ کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ المقدم اور المؤخر اللہ کی دو اساسی صفات ہیں۔ مقدّم کا مطلب ہے سبقت لے جانے والا یا ترتیب کے اعتبار سے پہلے آنے والا اور مؤخّر کا مطلب ہے بعد میں آنے والا یا عقبی۔ گویا جوڑے دار متضاد صفات الٰہی میں سے ایک کو دوسرے پر سبقت یا فوقیت حاصل ہے۔ مثالی صورت حال تو یہ ہے کہ مستحکم اور مساوی تعامل کے ذریعے تضادات میں توازن قائم ہو جائے؛ تاہم اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے تو ان میں سے کسی ایک کو دوسری پر فوقیت دی جا سکے۔ مثال کے طور پر عالمِ شہادت (یہ دنیا) اور عالمِ غیب (وہ غیر مرئی دنیا) قانونِ مساوات کے ذریعے ایک دوسرے سے مربوط ہیں لیکن اگر کسی کو ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تو اصول تقدیم کی رُو سے دوسری دنیا یعنی عالمِ غیب کو عالمِ شہادت پر برتری حاصل ہو گی کیوں کہ ذہن کو جسم پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ ہے سادہ ترین الفاظ میں اصولِ تقدیم کی وضاحت۔

عربی میں مقدّم کا مطلب ہے فوقیت رکھنے والا؛ کوئی ایسی شے جسے دوسری پر ترجیح دی جائے اور اس لیے وہ زیادہ اہم ہو۔ دوسری طرف مؤخّر کا مطلب ہے پیچھے آنے والا، عقبی یا وہ جو بعد میں آتا ہے۔ یہ کسی چیز کے دیر سے آنے والے جزو کو کہتے ہیں۔ اللہ کے ناموں کا یہ جوڑا، یعنی المقدم اور المؤخر دونوں مل کر، اصولِ تقدیم و تاخیر (Principle of Prior and Posterior) کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ اللہ کی بنیادی صفات کی باطنی فطرت ہے جو تمام ترحقیقتوں میں ظاہر ہوتی ہے اور ان پر لاگو بھی ہوتی ہے۔ اللہ کے ننانوے ناموں پر اس اصول کا اطلاق کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ جوڑے دار صفات اگرچہ اپنے تعامل میں مساوی اہمیت کی حامل ہیں لیکن ان میں سے ایک دوسری پر فوقیت رکھتی ہے۔

مقدم	مؤخّر
الباطن (اندرونی)	الظاھر (بیرونی)
الاوّل (پہلا)	الآخر (آخری)

Marfat.com

الغفّار (معاف کرنے والا)	القہّار (پسپا کرنے والا)
المعزّ (عزت دینے والا)	المذلّ (ذلت دینے والا)
الوھاب (نوازش کرنے والا)	الرزاق (کفالت کرنے والا)
القابض (سکیڑنے والا)	الباسط (پھیلانے والا)
الرافع (درجہ بلند کرنے والا)	الخافض (خفیف کرنے والا)
الرّقیب (چوکس، نگران)	الکریم (کشادہ دل، فیاض)
المبدی (ابتدا و اختراع کرنے والا)	المعید (بحال کرنے والا)
المحی (زندگی دینے والا)	الممیت (موت دینے والا)
القیوم (قائم)	الحیمتحر ک)
التوّاب (توبہ دینے والا)	المنتقم (انتقام لینے والا)
النافع (فائدہ پہنچانے والا)	الضار (نقصان پہنچانے والا)
المغنی (وفور عطا کرنے واا)	المانع (منع کرنے والا، روکنے والا)

اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ الغفار اور القھار کے جوڑے میں سے ایک یعنی پہلی صفت مقدم ہے اور دوسری مؤخر۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ کی معاف کردینے کی صفت اس کی پسپا کردینے کی صفت پر حاوی ہے۔ گویا اللہ بنیادی طور پر شفیق اور مہربان فطرت کا مالک ہے۔ اسی طرح الاوّل کی صفت الآخر پر فوقیت رکھتی ہے کیوں کہ جب تک پہلا نہ ہو، آخری بھی نہیں ہوسکتا۔

مساوی تعامل کے اصول (Principle of Equal Interactions) اور اصولِ تقدیم (Principle of Precedence) کا منبع متوازی معکوس کا قانون (Law of Parallel Inversions) ہے۔ ان دونوں اصولوں کی مفصل وضاحت اور ان کے اطلاق کی متنوع صورتوں کا بیان فی الحال ہمارے موضوع کی حد سے باہر ہے۔ ابھی یہ طے کرلینا ہی کافی ہے کہ اللہ کی جوڑے دار صفات پر اصولِ تقدیم و تاخیر کا اطلاق ہوتا ہے اور اس اصول کی رو سے اسمائے حسنیٰ کے جوڑے دار ناموں میں سے ایک کو

Marfat.com

دوسرے پر فضیلت حاصل ہے۔ ہماری سائنس، فلسفے اور انسانی معاملات پر اس اصول کے اطلاق کی لاتعداد صورتیں ہیں۔

نیچے دیے گئے چارٹ میں حقیقت کی مقدم اور مؤخر صفات کے کچھ مظاہر بیان کیے گئے ہیں:

مقدم	مؤخر
عالم شہادت	عالم غیب
باطن	ظاہر
کوانٹم فزکس	عمومی فزکس
خدا	انسان
جان دار (زندگی)	بے جان (موت)
عینیت/مثالیت	تجربیت
نظریہ	تجربہ
تخلیق	ارتقا
مذہب	سائنس
ذہن	جسم
مذکر	مؤنث
فاعل	مفعول
جزا	سزا
فرد	معاشرہ
آزادی	اقتدار
وحدت	کثرت
تعمیر	تخریب

Marfat.com

اصول کے اطلاق کی صورتیں:
Applications of the Principle

پہلا کلمہ؛نہیں کوئی خدا(لا الٰہ) مگر اللہ (الاّ اللہ) نفی اور اثبات کی متضاد خصوصیات کو بیان کرتا ہے۔ یہ الٰہ کی کثرت یعنی عرب کے بہت سے خداؤں کی نفی کرتا ہے اور ایک خدا یعنی وحدت پرست مذاہب کے اللہ کا اثبات کرتا ہے۔اسی طرح یہ عرب کے مادی (ظاہر) بتوں کی نفی اور محمدؐ کے غیر مرئی ارفع واعلا (باطن) خدا کا اثبات کرتا ہے۔ تاہم اصول تقدیم وتاخیر اس پر بھی منطبق ہوتا ہے اور اس اصول کی رو سے اللہ کو الٰہ پر، وحدت کو کثرت پر، نہاں کو عیاں پر، غیر مرئی کو مرئی پر، ذہن کو مادے پر فضیلت حاصل ہے اور یہی سلسلہ تمام مظاہر میں درجہ بدرجہ چلتا رہتا ہے۔اس اصول کو پہلے کلمے پر منطبق کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک عظیم وحدت (Monoism) ہر طرح کی ظاہری تکثیریت (Pluralism) پر غالب ہے، جس کا اثبات کرنا ضروری ہے اور جو باقی ہر شے پر فوقیت رکھتی ہے۔ لا الٰہ (نہیں کوئی خدا) الاّ اللہ (مگر اللہ) کو اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ ''تکثیریت نہیں، وحدت!'' یا یوں کہ مظاہر کی دنیا کی نیرنگیاں، اپنی اصل میں ایک ہی ہیں اور اس لیے ان کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے۔اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت صرف باطن (نہاں) ہے، ظاہر (عیاں) نہیں۔اگر ہم اس جملے کو پڑھیں کہ ظاہر کچھ نہیں، بس باطن ہی ہے، تو یہ دونوں صفات مسلسل ایک فطری تضاد کو ظاہر کرتی رہیں گی۔ظاہر بیرونی ہے اور باطن اندرونی۔ظاہر عیاں ہے، باطن نہاں۔ظاہر کثرت ہے اور باطن وحدت۔ظاہر تکثیریت ہے اور باطن وحدانیت۔ظاہر حقیقی ہے اور باطن مثالی۔دونوں ہر سطح پر المقدم اور المؤخر کی صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔

اصول کا الٹ جانا:
Inversion of the Principle

اس الوہی اصول کو الٹ دیں تو ترجیحات بھی الٹ جائیں گی جس کا نتیجہ ثنویت، تفرقہ، تصادم، تنزلی، بے نظمی اور تخریب کی صورت میں نکلے گا۔مثال کے طور پر اگر یا جب بھی کوئی قوم اپنی قومی وحدت کی بجائے تکثیریت کو اپنا لیتی ہے تو تشخص کے بحران اور فرقہ وارانہ مفادات کا شکار ہو جاتی ہے اور اس قوم کا بنیادی ڈھانچہ متاثر ہونے لگتا ہے۔اسی طرح جب کوئی معاشرہ فرد کی آزادی کو ترجیح دیتا ہے تو نتیجہ جارحیت، ظلم، آمریت اور

Marfat.com

بغاوت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ انسانی تاریخ ایسے معاشروں اور گروہوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہے جنھوں نے اپنی ترجیحات کی ترتیب الٹ دی تھی۔ ہمارا روزمرہ کے سیاسی انتظامی امور کا مشاہدہ ہے کہ کیسے ایک بری انتظامیہ اچھی حکومت کی ترجیحات کو الٹ دیتی ہے۔ اہلیت کی بجائے اقربا پروری، انصاف کی جگہ بدعنوانی، قانون کی حکمرانی کی بجائے اپنی مرضی اور ریاست کے مفاد کی بجائے ذاتی یا سیاسی مفاد کو عزیز رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح خدا کی بجائے انسان کو اہمیت دینے سے جمہوریت پسند، مہذب معاشرے نہیں بلکہ ہٹلر اور فرعون جنم لیتے ہیں۔ جب اور جہاں بھی دو مفادات کا، فرد اور معاشرے کا، آزادی اور قانون کا، مذہب اور سائنس کا ٹکراؤ ہو تو قانونِ مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ انصاف کی خاطر ان دونوں کو مساوی طور پر متوازن کیا جائے لیکن قانونِ تقدیم یہ سفارش کرتا ہے کہ ایسے ہر معاملے میں ذاتی فائدے کو وسیع تر مفاد اور خیرِ کثیر کی خاطر قربان کر دیا جائے۔ ان قوانین کی عملی صورت ہمیں حضرت محمدؐ اور حضرت عیسیٰؑ جیسے پیغمبروں کی زندگی میں ملتی ہے۔

اسی طرح سائنس میں محض عملی تجربات اور ٹیکنالوجی ہی پر زور دینے اور کسی وحدت خیز نظریے کی تلاش کو نظر انداز کرتے رہنے سے کوئی قابلِ ذکر علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۳۸ میں البرٹ آئن اسٹائن نے کیلیفورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انھیں خبردار کیا تھا کہ سائنسی تگ و دو کو ہمیشہ انسانی بھلائی کے مقصد کے تابع رہنا چاہیے اور انسانی مقدر کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی جدوجہد کا اہم فائدہ گردانا جانا چاہیے تا کہ ہمارے ذہنوں کی تخلیقات بنی نوع انسان کے لیے نعمت بنیں، لعنت نہیں۔ اس نے طلبہ کو تاکید کی کہ وہ نقشے، خاکے اور مساواتیں بناتے ہوئے اس بات کو ہمیشہ یاد رکھیں۔ آئن اسٹائن سائنسی ترجیحات کے الٹ جانے اور پست تخریبی اور تجارتی مقاصد کا غلام بن جانے کے خطرے سے بہت اچھی طرح آگاہ تھا۔ اللہ کے الوہی قانون میں ایسی الٹ پھیر کا نتیجہ تنزلی، انحطاط، مایوسی، دل شکستگی، تباہی اور موت کی صورت میں نکلتا ہے؛ خواہ وقتی طور پر یہ فوری مادی اور استعماری مقاصد کے حصول میں کامیابی کی صورت ہی میں سامنے کیوں نہ آئے۔ ہم جانتے ہیں کہ نئی فزکس میں اگر فاعل کو مفعول پر ترجیح دی جائے تو یہ بے معنی ثابت ہوتا ہے کیوں کہ مفعول ہی فاعل کو اہمیت اور معنویت عطا کرتا ہے، نہ کہ اس کے برعکس۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مفعول نہ رہے تو فاعل کا وجود بھی ختم ہو جائے۔

Marfat.com

نظریہ توحید سے انکار:
Denial of the Doctrine of Unity

ایک طرف تو اللہ مکمل طور پر غیر متبدّل ہے کیوں کہ وہ مطلق اور قائم (القیّوم) ہے؛ دوسری طرف وہ مکمل طور پر متحرک بھی ہے (الحی) کیوں کہ وہ لامتناہی ہے اور ابد تک جاری وساری ہے۔ پہلی صفت استقلال کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری صفت مسلسل حرکت کو۔ یہ صفات ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور دونوں مل کر وحدت میں ڈھل جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ اللہ کی وحدت (توحید) کے ایسے پہلو ہیں جو ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ جدید فکر کی بہت سی سائنسی اور فلسفیانہ غلطیاں توحید کے انکار سے جنم لیتی ہیں۔ اصولِ وحدت سے انکار سائنس کو محض حسی تجربے کی منطق تک محدود کر دیتا ہے اور اعلاتر غیر مرئی اور سرّی علوم سے مکمل طور پر صرفِ نظر کر لیتا ہے۔ نتیجتاً انسان کے تصورِ حقیقت میں ایک گہرا خلا پیدا ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان کی شخصیت میں بھی انتشار جنم لیتا ہے اور اس کی انا الٹ جاتی ہے۔ ایک دفعہ انسان کی انا الٹ جائے تو اس کا پورا تصورِ حقیقت الٹ جاتا ہے۔ یوں اللہ کا وہی اصول جو ترقی اور پیش رفت کا ذمہ دار تھا، الٹ سمت میں کارفرما ہو جاتا ہے اور آخر کار تخریب اور فریب خوردگی پر منتج ہوتا ہے۔

اس اصول کو الٹ دیا جائے تو تضادات اور ترجیحات بھی الٹ جاتی ہیں۔ یہ قانونِ فطرت کی نامبارک تحریف ہے جس کا نتیجہ توانائیوں کے انتشار اور زیاں کی صورت میں سامنے آتا ہے؛ جیسے اگر آپ بیٹریوں کی سمت الٹ دیں تو ان کی توانائی ضائع ہو جاتی ہے۔

اللہ کے تضادات کی نوعیت:
Nature of Allah's Polarity

آیئے اب ہم اللہ کے تضادات کی نوعیت پر غور کرتے ہیں۔

تکملیت:
Complementary

سرخ اور سبز، نیلا اور پیلا عام طور پر ایک دوسرے کے الٹ رنگ سمجھے جاتے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ رنگ ایک دوسرے سے عدم مطابقت نہیں رکھتے۔ سرخ کسی طرح بھی سبز سے عدم توافق کا حامل نہیں ہے۔ کوئی

Marfat.com

عام سا فیشن ڈیزائنر بھی یہ بتا سکتا ہے کہ یہ دونوں رنگ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں رنگ مل کر ایک خوشگوار ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔اسی طرح کومل اور تیور سر بظاہر ایک دوسرے کے الٹ سمجھے جاتے ہیں مگر اصل میں موسیقی کی دھن میں دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

اللہ کی بہت سی جوڑے دار صفات بظاہر ایک دوسرے کی الٹ معلوم ہوتی ہیں مگر ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی ہیں جیسے بیرونی (الظاھر) اور اندرونی (الباطن)، تقسیم کرنے والا (المقسط) اور جمع کرنے والا (الجامع)۔

انتہائی مقامات:
Extreme Positions

جوڑے دار متضاد صفات عموماً ایک تسلسل (Continuum) کے انتہائی مقامات ہوتی ہیں یعنی ایک ہی حقیقت کے دو کنارے۔مثال کے طور پر آپ کے ٹیلی وژن میں تصویر کی روشنی اور تاریکی (Brightness and Contrast) دونوں ایک ہی سلسلہ کے آخری کنارے ہیں۔اچھی تصویر کے لیے ان دونوں کو ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے۔اسی طرح کار کا درجہ حرارت بتانے والے پیمانے کے ایک سرے پر گرم (Hot) اور دوسرے سرے پر سرد (Cold) کا نشان ہوتا ہے اور یہ دونوں یعنی گرم اور سرد مل کر ایک ہی قوس بناتے ہیں۔

اللہ کی بہت سے صفات بھی انتہائی نوعیت کی ہیں جیسے الغفّار (بہت معاف کرنے والا) اور القہّار (حاکمِ مجاز، لاگو کرنے والا)، العفو (بخشش دینے والا) اور المنتقم (انتقام لینے والا)، النافع (فائدہ پہنچانے والا) اور الضار (نقصان پہنچانے والا)، عالمِ شہادت (عیاں، مرئی دنیا) اور عالمِ غیب (نہاں، غیر مرئی دنیا) وغیرہ۔یہ سب ایک ہی صفت کی دو انتہائیں ہیں، جیسے محبت اور نفرت، جزا و سزا، نفع اور نقصان، طرب و کرب، دفاع اور تشدد۔ان تمام مثالوں میں ایک ہی حقیقت اپنے دو رُخ عیاں کرتی ہے۔مثلاً بعض اوقات مخصوص حالات میں نفع، نقصان میں بدل جاتا ہے، محبت نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جزا سزا بن جاتی ہے۔یہ صفات ایک دوسرے سے مربوط ہیں لیکن یہ ایک دوسرے کی تکمیل نہیں کرتیں بلکہ ایک ہی صفت کی انتہائی صورتوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ان کا باہمی تعامل معکوس نوعیت کا ہے یعنی ایک صفت کم ہوتی ہے تو دوسری بڑھتی ہے۔ایک صفت دوسری کی الٹ اور معکوس ہے۔تاہم ایسی متضاد صفات نظم و باقاعدگی پیدا کرنے

Marfat.com

کا موجب بنتی ہیں۔ یہ حرکت کا باعث بنتی ہیں اور متحرک توازن کو قائم رکھتی ہیں۔ کرۂ ارض ہی کو دیکھیے، کیسے اس کے شمالی اور جنوبی قطب کی برقی مقناطیسی توانائی کے میدان زمین کو اس کے مدار میں گردش کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

ابتدائی دور میں صوفیہ الوہیت کو مظاہر کے ذریعے پہچانتے تھے۔ تمام تر گردشیں اور زندگی کے سب نشیب وفراز، صوفی کے نزدیک سورج، چاند اور زمین کی حرکت کا نتیجہ تھے۔ سورج خدا کی علامت سمجھا جاتا تھا، زمین انسان کی علامت تھی اور چاند حقیقت کی۔ انسان کو خدا اور حقیقت کے درمیان کا مقام حاصل تھا۔ انسان خدا کا عکس تھا اور عورت مرد کا عکس تھی۔

سائنس میں کوانٹم مکینکس کو اب تک کا بہترین طبعی نظریہ سمجھا جاتا ہے جو طبعی دنیا کے بارے میں بنیادی اور آفاقی نوعیت کی صراحت کرتا ہے۔ بلاشبہ سائنس کے کلاسیکی فزکس سے کوانٹم فزکس کی طرف رُخ موڑ لینے سے طبعی دنیا کے بارے میں ہمارے فہم وادراک میں انقلابی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔

کوانٹم فزکس میں تکمیلیت کا نظریہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق روشنی ذرے کی مانند مادی بھی ہوسکتی ہے اور موج کی طرح غیر مادی بھی۔ کوانٹم فزکس کے مطابق وہ اشیا بھی ایک ساتھ موجود رہ سکتی ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہوں۔ اس مشاہدے کو ہائزن برگ (Heisenberg) کا قانونِ تکمیلیت (Law of Complementarity) یا دوسرے اور نیلز بور کے لفظوں میں قانونِ عدم تیقن (Law of Uncertainty) بھی کہتے ہیں۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ ذرے کو کس طرح دیکھتے ہیں اور یہ فطرت کے تجربی قانون کے طور پر لاگو کیا گیا ہے۔ یعنی تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ حقیقت بیک وقت دونوں طرف ہوتی ہے۔

ہائزن برگ نے اپنی خودنوشت *DerTeil und das Ganze* (۱۹۶۹) میں بیان کیا ہے کہ کیسے اس نے ان رشتوں کو آئن اسٹائن کے ایک جملے کی مدد سے دریافت کیا تھا۔ وہ جملہ تھا: ''یہ فیصلہ نظریہ (Theory) کرتا ہے کہ ہم کیا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔'' یوں وہ مشاہدے کو نظریے پر فوقیت دینے کی بجائے نظریے کو مشاہدے پر فوقیت دیتا ہے۔

تاہم حقیقت کی یہ تصویریں استثنائی ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی (compilmentary)

Marfat.com

نہیں ہیں۔ایک وقت میں ان میں سے صرف ایک ہی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یا تو آپ ذرے کو دیکھ سکتے ہیں یا موج کو۔ ہائزن برگ کا یہ کہنا غلط تھا کہ یہ اک دوسرے کی تکمیل کرنے والی (compilmentary) ہیں۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں ایک کا نفع دوسرے کا نقصان ہے۔مرئی اور غیر مرئی دونوں ایک معکوس مساوات میں بندھے ہوئے ہیں۔انھیں ایک دوسرے سے جوڑنے والا قانون متوازی معکوس کا اصول (law of parallel inversion) ہے، قانونِ تکمیلیت نہیں۔کائنات جیسی کہ وہ ہے، اس لیے ایسی ہے کیوں کہ مادہ اور توانائی میں یہ مخصوص خصوصیات موجود ہیں۔لیکن کیا اس بات کی توجیہ کی جاسکتی ہے کہ ان میں یہ خصوصیات کیوں ہیں؟ جی ہاں!اس سوال کی بھی سائنسی وضاحت کی جاسکتی ہے کہ مادہ اور توانائی میں یہ خصوصیات کیوں ہیں!اور یہ وضاحت چھپی ہے اس کائنات کے خالق یعنی اللہ کی فطرت میں۔سٹیفن ہاکنگ (Stephan Hawking) نے، جنھیں ۱۹۶۸ میں عالمی شناخت حاصل ہوئی تھی، اپنی کتاب *A Brief History of Time* میں لکھا ہے، ''اگر ہم ایک مکمل نظریہ دریافت کرسکیں تو یہ عقلِ انسانی کی ایک بہت بڑی کامیابی ہوگی کیوں کہ پھر ہم خدا کے ذہن کو سمجھ سکیں گے''۔

ایک ہی شے کے مختلف مدارج:
Gradations of the Same

کچھ تضادات کم وبیش مقامات یا مدارج ہوتے ہیں اور ایک ہی صفت کی مختلف سطحوں کو ظاہر کرتے ہیں۔اگر روشنی اور تاریکی ٹیلی وژن کی ایک ہی تصویر کے دو انتہائی پہلو ہیں تو پھر روشنی اور تاریکی کے مختلف مدارج ایک ہی تصویر کے مختلف تغیرات (Variables) کو ظاہر کرتے ہیں۔اسی مثال کی رو سے اللہ کی کچھ جوڑے دار صفات بھی ایک ہی صفت کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتی ہیں، مثلاً مہربان (الرحمان) اور رحم کرنے والا (الرحیم)، رزق دینے والا (الرزاق) اور عطا کرنے والا (الوھاب)۔یہ اللہ کی صفات کے مختلف مدارج ہیں۔

مثال کے طور پر ریاضی میں مطلق صفر کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ یہ اس ہندسے کو اہمیت عطا کرتا ہے جو اس کے ساتھ ہوتا ہے۔اسی طرح مطلق بے ترتیبی، بدنظمی اور عدم وجود نہیں رکھ سکتے تاآنکہ اس میں نظم وترتیب کا کوئی نہ کوئی درجہ پایا جائے۔اسی طرح ہر حقیقت کی درجہ بندی ہوتی ہے۔ارتقا درجہ بندی ہی کا عمل ہے۔سورج، چاند

Marfat.com

اور زمین ایک ہی مادے کے مختلف مدارج ہیں۔ اسی طرح یہ پورا عالمِ کون و مکاں انسان کا نچلا درجہ ہے۔ عدم (Ex-nihilo) سے وجود میں آنے والی تخلیق اللہ کا ایک درجہ ہے جو سب سے عظیم وجود ہے۔

ایک ہی شے کے مختلف پہلو:
Aspects of the Same

نظر اور سماعت انسانی حواس کے دو پہلو ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے الٹ نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔ اسی طرح اللہ کی بہت سی صفات ایک دوسرے کو کاٹنے والی، جدا جدا خصوصیات ہونے کی بجائے ایک ہی اصول کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتی ہیں؛ جیسے السامع (بہت سننے والا) اور البصر (بہت دیکھنے والا)۔ آیئے، اللہ کی صفات کے ایک سلسلے کو اس کی الہامی ترتیب میں دیکھیں، السّلام (سلامتی دینے والا)، المؤمن (ایمان والا)، المھیمن (حفاظت کرنے والا)، العزیز (طاقت رکھنے والا)، الجبّار (اختیار رکھنے والا)۔ یہ صفات ایک دوسری سے متضاد یا الگ الگ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے افعال کو ظاہر کرنے والی باہمی مربوط صفات ہیں۔

پوری کی پوری حقیقت اسی طرح ایک ہی شے کے باہم مربوط پہلوؤں پر محیط ہے اور مجھے اپنی بات دہرانے کی اجازت دیجیے کہ سائنس کی تمام تر غلطیاں اس وقت رونما ہوتی ہیں جب سائنس دان ان پہلوؤں کو ایک دوسرے سے علیحدہ اور جدا جدا سمجھ بیٹھتا ہے۔

اوپر بیان کی گئی ہر مثال میں ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ کے جوڑے دار اسما ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور اس کی صفات کی انتہاؤں یا درجوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ صفات اللہ کی اصل حقیقت کی تشکیل کرتی ہیں اور ایک دوسرے سے مطابقت رکھتی ہیں۔ جیسے مقناطیسیت کی بنیادی صفت مقناطیس کے منفی اور مثبت پہلوؤں سے تشکیل پاتی ہے۔ مقناطیس کی یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور مل کر ایک کل بناتی ہیں۔ اسی طرح اللہ کی متضاد صفات میں بھی وحدت پائی جاتی ہے تاہم ان صفات میں بھی روشنی کے طولِ موج کی طرح درجہ بندی ہوتی ہے۔

الاول (پہلا) اور الآخر (آخری) میں اور الازل (جس کا کہیں آغاز نہ ہو) اور الابد (جس کا

Marfat.com

کہیں اختتام نہ ہو) میں ایک مماثلت ملتی ہے۔ یہ ایک ہی تسلسل کے انتہائی کنارے ہیں۔ ریاضیاتی اصطلاحوں میں ہم الازل اور الابد کو اس طرح بیان کر سکتے ہیں:

لامتناہی اور کسی بھی مقدار سے زیادہ یا کسی بھی گنتی میں آنے والے عدد سے آگے، اس لیے کسی انتہا کے بغیر	(البد)
کسی بھی قابلِ تعین مقدار سے چھوٹا یا کسی بھی گنے جانے والے عدد سے کم، اس لیے بغیر کسی آغاز کے	(الازل)

لامتناہی، اور بڑا اور ہر مقدار سے چھوٹا اور سب سے کم؛ بظاہر متضاد معلوم ہوتے ہیں لیکن اصل میں ایک ہی اصول کے انتہائی پہلو ہیں۔

اللہ کچھ نہیں ہے:
Allah as Nothingness

کیلٹک (Celtic) فلسفی ڈنز سکاٹس اریگینا (Duns Scotus Erigena: 810-877) نے خدا کو منفی کے ذریعے بیان کرنے کا ایک طریقہ وضع کیا تھا کیوں کہ وہ یقین رکھتا تھا کہ خدا اپنے وجود سے کہیں زیادہ ہے اور اس کی موجودگی ویسی نہیں ہو سکتی جیسی اس کی مخلوق کی ہوتی ہے۔ خدا اپنی تخلیقات سے غیر معمولی طور پر مختلف ہے۔ کیرن آرم سٹرانگ اپنی شاندار تصنیف *The History of God* میں اریگینا کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''اصل میں خدا کچھ نہیں ہے۔ اریگینا کو معلوم تھا کہ یہ بات چونکا دینے والی ہے اور اس نے لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ اس بات سے گھبرائیں مت،! اس کا طریقہ کار یہ بتانے کے لیے وضع کیا گیا تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں ہے یعنی وہ ایسا وجود نہیں رکھتا جیسا ہم۔ ہمارا وجود کسی حیوان سے اور حیوان کا وجود کسی پتھر سے نکلا ہوا ہے مگر اس کی موجودگی کی وضع ہمارے وجود سے مختلف ہے۔ خدا ''کچھ نہیں'' ہے لیکن ''سب کچھ'' بھی ہے۔ اس عظیم موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ صرف خدا ہی حقیقی وجود رکھتا ہے۔ وہ ہر اس شے کا جوہر ہے جو اس میں شامل ہے۔ یوں اس کی مخلوق میں سے ہر ایک میں اسی کی تجلی ہے اور مخلوقات اس کی موجودگی کی علامت

Marfat.com

ہیں۔(باب: The God of Philosophers، ص۲۳۱)۔"

ایری گینا کی یہ متناقض دینیات، جس کے مطابق خدا کچھ بھی نہیں اور سب کچھ بھی ہے، دراصل پوری طرح متوازن ہے۔ یہ دونوں اصطلاحات ایک دوسرے کو پوری طرح متوازن کرتی ہیں جیسے فزکس میں ترتیب اور بے ترتیبی کائناتی توازن قائم کرتی ہیں۔ اسی طرح "کچھ نہیں" اور "سب کچھ" بھی اس اسرار کا بھید بتاتی ہے جسے صرف خدا کی علامت سے ہی ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

عدم سے وجود میں لانے والا عملِ تخلیق کا نظریہ یہودیوں کی خفیہ صوفیانہ روایت قبالہ (Kabbalah) کا حصہ بھی رہا ہے جس کی تعلیم گرو اپنے چیلے کو دیتا ہے۔ وہ خدائے مخفی کو *En Sof* کہتے ہیں جس کا مطلب ہے "لا انتہا"۔ تخلیق کی داستان (The Zohar) میں اس بحران کی نشان دہی کی گئی ہے جو خدائے مخفی کے اندر رونما ہوئی اور جس کے نتیجے میں خدا نے خود کو منکشف کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ اسے عدم (ayin) سے وجود میں آنے کا نام دیتے ہیں۔ لہٰذا الوہیت کی جس شکل کا ادراک انسان کو ہو سکتا ہے، اسے زیادہ سے زیادہ عدم ہی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کا کسی ایسی چیز سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا جو وجود رکھتی ہے۔ خدا کے دیگر تمام نام (یہودیوں میں اسمائے الٰہی کا شجر: *Sefiroh*) اسی عدم کے بطن سے پھوٹتے ہیں۔

پہلا قانون اسی بنیادی الوہی صفت کو بیان کرتا ہے کہ نہیں کوئی خدا (نفی) مگر اللہ (اثبات)؛ یعنی اللہ کے سوا کچھ نہیں۔ یہ کلمہ توحید کی بنیاد ہے۔ اس میں نفی (-) اور اثبات (+) ایک وحدت کی صورت میں مل جاتے ہیں۔ یہ حقیقت کا باہمی مربوط تسلسل (Continuum of Reality) ہے جو "کچھ نہیں" سے "سب کچھ" یعنی عدم سے وجود تک چلا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ارسطو کے خدا کے بارے میں مباحث کو *Met ta physics* یا مابعد الطبیعیات کا نام دیا گیا یعنی فزکس سے آگے۔ اس نام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا طبعی حقیقت ہی کا ایک تسلسل ہے، کوئی بالکل مختلف نظام نہیں ہے۔ جیسے دن اور رات دونوں مل کر چوبیس گھنٹے کا دورانیہ تشکیل دیتے ہیں، موسمِ گرما اور سرما دونوں مل کر ایک سال بناتے ہیں اور پہلا اور آخری ایک ہی تسلسل کے انتہائی کنارے ہیں۔ سائنسی علوم میں بھی تصدیق (Verification) اور تردید (Falcification) دونوں عمل ہی سائنسی نظریے کو ثابت کرتے ہیں۔ یہ متوازی معکوس کی مثالیں ہیں اور ایک وحدانی نظریہ پیش کرتی ہیں۔

ربی موسیٰ ابنِ میمون (*Moses ibne Maimon:* 1135-1204) جسے مغرب میں

Marfat.com

Maimonides کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ابن رشد (Averroes) کا ذہین شاگرد تھا۔ انھوں نے مغربی دنیا کے یہودیوں کو بہت متاثر کیا۔ میمون کا خیال تھا کہ مسلم فلسفہ مذہبی علوم کی انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے جس سے خدا کا عرفان حاصل ہوسکتا ہے۔ وہ اکثر خدا کے تصور کی وضاحت کے لیے نفی کا سہارا لیتا تھا۔ کیرن آرمسٹرانگ کی کتاب *The History of God* کا ایک اقتباس دیکھیے:

> ہم جانتے ہیں کہ خدا کا کسی ایسی چیز سے تقابل نہیں کیا جاسکتا جو موجود ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ خدا کے تصور کی وضاحت کے لیے نفی کی اصطلاح میں بات کی جائے۔ مثلاً بجائے یہ کہنے کے کہ وہ موجود ہے ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ وہ ناموجود نہیں ہے۔ اسماعیلیوں میں بھی منفی اصطلاحاتِ زبان کا استعمال ایک علم بن گیا تھا جو خدا کی ماورائیت کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا تھا اور ہمیں یہ احساس دلاتا تھا کہ حقیقت ہر اس تصور سے مختلف ہے جو ہم بے چارے انسان اس کے بارے میں قائم کرسکتے ہیں۔ خدا کے بارے میں مثبت تصور قائم کرنے کے لیے ہم براستہ منفی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ یوں جب ہم بجائے یہ کہنے کہ خدا طاقت ور ہے، یوں کہہ دیتے ہیں کہ خدا ناتواں نہیں ہے تو منطقی طور پر اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ خدا عمل کی طاقت رکھتا ہے۔ چوں کہ خدا ناقص نہیں ہے، اس لیے اس کے افعال بھی کامل ہوں گے۔ اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ خدا بے علم نہیں ہے (یعنی وہ صاحبِ علم ہے) تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا علم اور دانش کا مالک ہے۔ تاہم اس طرح کے بیانات صرف خدا کے افعال کے متعلق دیے جاسکتے ہیں، اس کی ذات کے متعلق نہیں جو انسان کے فہم وادراک سے ماورا ہی رہتی ہے (باب :The God of the Philosophers، ص ۲۲۷)''

اسمائے حسنیٰ کی بات کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ گنج العرش میں بیان کی گئی بہت سی صفات الٰہی میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً القدیم (جو شروع سے ہو) اور الدائم (جو ہمیشہ رہے)، المبدی (ابتدا کرنے والا) اور المعید (واپس اپنی طرف کھینچنے والا)، المقدم (آگے رہنے والا) اور المؤخر (پیچھے رہنے والا)، البدیع (عدم سے وجود میں لانے والا) اور الباقی (باقی رہنے والا)۔ یہ سب ایک ہی سلسلہ کے انتہائی کنارے ہیں۔

Marfat.com

یہ سب نام اللہ کی ماورائیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک دوسرے کا پیش قیاس ہے اور اس کی دلالت کرتا ہے۔ دونوں مل کر ایک وحدت بنتے ہیں۔ دونوں انتہائی کنارے ایک بلند ہوتے تسلسل میں ایک دوسرے سے تعامل کرتے ہیں اور ایک وحدت میں ڈھل جاتے ہیں۔ اللہ تمام تر حرکت کا حقیقی مرکز ہے، جیسے زمین جو قطبین (two poles) کے درمیان ہے لیکن ایک دائرے کی حدود میں سمائی ہوئی ہے۔ تاہم زمین خود مرکز نہیں ہے بلکہ اس سے بلند تر مراکز بھی موجود ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مراکز کا ایک بلند تر ہوتا ہوا سلسلہ ہے جو سورج، کہکشاؤں اور نظام ہائے شمسی سے بھی آگے جاتا ہے۔ انسان جو اس بلندی سے بہت نیچے ہے، مگر پھر بھی اپنی جگہ ایک مرکز ہے جو خدا اور حقیقت کے درمیان کی ایک کڑی ہے۔ اللہ سب مراکز کا مرکز ہے۔ تمام تر حرکت و تغیر، تمام ترقیاں، تمام تبدیلیاں اور ساری کایا پلٹ اللہ کے افعال کے ربطِ باہم کے مظاہر ہیں۔

کئی میں ایک:
One in Many
اصولِ تنوع:
The Principle of Diversity

اللہ ایک ہے مگر اس کی صفات کئی ہیں۔ یوں اللہ کثرت میں وحدت ہے۔ وہ منفرد ہے مگر متنوع بھی ہے۔ وہ منفرد متنوع ہے۔ ایک بھی ہے اور کئی بھی۔ یہی وہ تضاد ہے جو اس عظیم ہستی کا اصل بھید ہے اور یوں گویا ہر حقیقت کا بھید بھی یہی ہے۔ اللہ کی ذات کا صرف ایک ہی نام ہے اور وہ ہے "اللہ" جو اس کی وحدانیت (الاحد ہونے کی) کی شہادت دیتا ہے لیکن اس کے اٹھانوے نام اور بھی ہیں جو اس کی نیرنگی اور تنوع کی شہادت دیتے ہیں۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی شخصیت میں تنوع کی اتنی اہمیت کیوں ہے اور لیونارڈو ڈی ونچی (Leonardo de Vinci) اور حضرت امیر خسرو جیسی نابغۂ روزگار شخصیات اتنی ہمہ جہت کیوں تھیں۔ لیونارڈو کی یہی ہمہ جہتی تھی جس نے اس کے کلاسیکی تصویری خاکوں (Sketches) میں بغیر کسی مصنوعی کوشش کے سائنس اور آرٹ کو یکجا کر کے دکھا دیا تھا۔ آخر نابغہ ہمہ جہت کیوں ہوتا ہے؟

"ایک، کئی ہے" (One is Many) کا عمل جبری اور لازمی نوعیت کا ہے کیوں کہ وحدت کی فطرت ہی متضاد عناصر کے باہمی تعامل سے عبارت ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ اس وقت تک الواسع (سب پر محیط) یا

Marfat.com

الجامع (کل، سب کچھ، ہر شے پر مشتمل) جیسی صفات کا حامل نہیں ہوسکتا جب تک ''ایک، کئی ہے'' کی صلاحیت کا حامل نہ ہو۔ تاہم اللہ کی پہلی صفت یعنی ایک ہونے کو اس کی دوسرے صفت یعنی کئی ہونے پر سبقت حاصل ہے کیوں کہ ایک اور کئی ایک ہی دو قطبی وجود کا درجہ وار تسلسل ہیں۔ اسی طرح اس کا اسمِ خاص ''اللہ'' اس واحد اور یکتا خدا کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ نام بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اسے اللہ کے ان تمام دوسرے ناموں پر ترجیح اور فضیلت حاصل ہے جو اللہ کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں۔ شاید روشنی کے طیف کی مدد سے اس حقیقت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے جو خنک بنفشی سے لے کر آتشیں سرخ تک لاتعداد رنگوں کے تنوع کو ظاہر کرتا ہے حالاں کہ روشنی تو سفید یعنی بے رنگ ہوتی ہے۔

یہ اصول جو روشنی پر منطبق ہوتا ہے، عالمِ کون و مکاں کی ہر دوسری مخلوق پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ذرا ماحولیات پر ایک سرسری سی نظر ڈالیں؛ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کیسے ایک سے کئی کا ظہور ہوتا ہے۔ جنوبی بحر الکاہل میں موجود ہوائی کے قدیم جزائر میں ایک چھوٹی سی چڑیا کہیں سے اُڑ کے آ پہنچی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس ایک چڑیا سے چڑیوں کی اٹھاون انواع وجود میں آ گئیں۔ جہاں کہیں بھی حیات ہے، یا بے جان مادہ موجود ہے، وہاں قطبین کا مسلسل باہمی تعامل زندگی اور ماحول میں تنوع اور ترقی کا موجب بنتا ہے۔ تو کیا یہ سمجھنا بہت بعید از قیاس ہوگا کہ بنی نوع انسان کے اس تمام تر تنوع اور نیرنگی کا آغاز آدم و حوا سے ہوا ہوگا؟ اور کیا اب بھی یہ بات نا قابلِ فہم معلوم ہوتی ہے کہ تمام تر مخلوقات ایک ہی ہستی کا ظہور، پھیلاؤ، توسیع اور اسی کی کوئی نہ کوئی فریکوئنسی ہیں؟

تنوع اور نیرنگی ذاتِ واحد و یکتا کی اہم خصوصیت ہے۔ زندگی کے تحفظ اور بقا کے لیے تنوع کی بہت اہمیت ہے۔ اگر نئے جین نہ بنیں تو زندگی کے نئے مظاہر وجود میں نہ آئیں، اگر حیاتِ تازہ پیدا نہ ہو، نئے خیالات جنم نہ لیں، اظہار کی مختلف صورتیں وجود میں نہ آئیں، زندگی کے نت نئے انداز متعارف نہ ہوں، جدتِ فکر و عمل نہ ہو تو اس کا نتیجہ فرسودگی، کہنگی، بے دلی، بے زاری، تنزلی اور بالآخر معدومیت کی صورت میں سامنے آئے گا۔ تنوع اس لیے بھی بہت اہم ہے کیوں کہ ساری آموزش، تمام تر نشو و نما اور ساری ترقی کسی ''غیر'' (The Other) کے امتزاج سے ہی ممکن ہے۔ ''غیر'' نہ ہو تو قطبین میں تعامل بھی نہ ہو اور تنوع بھی جنم نہ لے۔ اللہ کا تنوع ہمیشہ نت نئے زاویے، نو بہ نو نمونے فراہم کرتا رہتا ہے تا کہ زندگی میں مفید تغیرات رونما ہوتے رہیں۔ یہ انسانوں کے

Marfat.com

زندہ رہنے، سمجھنے، برداشت کرنے، اختلافات کی اہمیت کو سمجھنے اور دشمنوں تک کے نقطۂ نظر کو رواداری اور شائستگی سے قبول کرنے کے لیے ایک بہتر ماحول فراہم کرتا ہے۔ تنوع ہیئت وصورت کی کثرت کا ذمہ دار ہے؛ جیسے زندگی کی انواع کی نیرنگی، اجسام کی نیرنگی، مختلف اشیا کے تناسب میں تنوع، علم کے مختلف شعبوں کی بوقلمونی اور انسانی خصوصیات کی گونا گونی۔ یہ تمام تر نیرنگی صحت مندانہ ثقافتی مظاہر اور مکمل تکثیریت (pluralism) کی طرف لے جاتی ہے۔ جدید دور کی جمہوری سیاست بھی اسی قدر پر بنیاد رکھتی ہے۔ بلاشبہ یہ تنوع اور کثرت کی صفت ہی ہے جو کسی بھی نظام کی صحت مندی کا پیمانہ ہو سکتی ہے؛ خواہ یہ نظام منطقی ہو یا غیر منطقی، نظریاتی ہو یا روحانی اور مذہبی۔ شرط صرف یہ ہے کہ یہ تنوع بنی نوع انسان کی وحدت یا اللہ کی وحدانیت (توحید) سے منحرف نہ ہو۔

اللہ کا یہ تنوع اشارہ دیتا ہے کہ دنیا میں اللہ کی معرفت اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے مختلف نقطۂ نظر، متعدد راستے، کئی مسالک، اور متنوع طریقے ہو سکتے ہیں۔ یہ تنوع دراصل اللہ کا، اپنی ذات میں ہر ایک کو، حقیقت کی ہر سطح پر شریک کر لینے کا ایک انداز ہے۔ اللہ کی طرف سے نازل ہونے والے تمام الہامی مذاہب کسی ایک مقرر راستے تک محدود نہیں ہیں۔ قانونِ الٰہی میں بڑی گنجائش ملتی ہے، انتخاب کے کئی راستے اور امکانات کھلے نظر آتے ہیں اور اگرچہ ان میں سے کچھ امکانات دوسروں سے بہتر ضرور ہوتے ہیں لیکن انھیں شدت پسندی کی بجائے عقل واستدلال کی مدد سے سمجھنا چاہیے۔ اس طرزِ عمل سے حقیقت کے بارے میں خیالات و نظریات اور رویّوں کی نیرنگی کا رجحان زور پکڑتا ہے۔ یہ عجز وانکسار، دوسروں کی سچائی کو قبول کرنے، اپنی حدود کے پار جا کر مکالمہ کرنے اور اختلافات کو سمجھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ صورت حال انسان کے لیے مفید ہی نہیں، ضروری بھی ہوتی ہے۔ یہ انسان کو عزت واحترام، صبر وتحمل، مساوی حقوق کا ادراک، امن، ہم آہنگی اور ثقافتی تکثیریت جیسی قدیم اور خالص اقدار سے روشناس کرتی ہے۔ یہ انسان کو نسل، رنگ، ذات، عقیدے، قبیلے، نظامِ اقدار اور ثقافتی اختلافات سے بلند تر ہونے پر آمادہ کرتی ہے کیوں کہ دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں کے بارے میں سیکھنے سکھانے سے انسان میں حقیقت کے مختلف پہلوؤں اور اللہ کے گوناگوں مظاہر کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مغرب میں احتراماً ٹوپی اتارنے کا رواج ہے، جب کہ مشرق میں نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم قوموں میں بھی صدیوں سے یہ روایت رہی ہے کہ بزرگوں یا مقدس اشیا کے ادب میں سر ڈھک لیتے ہیں۔ ہماری گھریلو زندگی میں یہ ایک پرانی رسم ہے کہ جب کوئی بڑا گھر میں داخل ہو، تو عورتیں، خواہ وہ مسلمان

Marfat.com

ہو، ہندو ہوں یا سکھ ہوں، احتراماً کسی کپڑے سے سر ڈھک لیتی ہیں۔ مشرق و مغرب کے قرینوں کا یہ تضاد ثقافتی تنوع کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن جب ملّا یا مسجد و منبر کی جانب سے اس رسم کو بزور نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ تشدد کی راہ ہوتی ہے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ پاکستان ٹیلی وژن نے اپنی کئی اہل اور قابل خواتین میزبانوں کے ٹیلی وژن پروگراموں میں شریک ہونے کی ممانعت کر دی کیوں کہ وہ براہ راست نشریات کے دوران جبراً سر ڈھکنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ دوسری طرف مغرب میں فرد کی آزادی اور خودمختاری کے دعووں کے باوجود لڑکیوں کو اسکولوں اور دفتروں میں سر ڈھکنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ دونوں خطوں میں ایک جیسی عدم برداشت نظر آتی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نے اللہ اور اس کے الہامی مذاہب کی درست انداز میں تفہیم و تفسیر نہیں کی۔

سائنس میں تنوع اس نقطۂ نظر کا مظہر ہے کہ ہر قابلِ مشاہدہ عمل کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ایک سے زیادہ توجیہات کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ صرف ایک سائنسی طریقہ ہر شے کی وضاحت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جیسے صحت کے شعبے میں ہمیں جڑی بوٹیوں، ہومیوپیتھی، آکوپنکچر اور ایلوپیتھی سے لے کر روحانی علاج کے مختلف طریقوں تک کئی متبادل طبی نظام ملتے ہیں۔ فلسفے میں یہ ایسے نقطۂ نظر کا نام ہے جس کی رو سے زندگی کا عمل متنوع جہات رکھتا ہے اور اسے کئی زاویوں سے دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ اللہ کی صفات کی اس نیرنگی نے کئی فلسفیوں اور مذاہب کو ایسے مغالطے میں ڈال دیا کہ وہ اصل حقیقت کی کثرت پر یقین کر بیٹھے۔ انھیں یہ غلط فہمی ہو گئی کہ وجود میں تکثیریت پائی جاتی ہے کیوں کہ وجود کی تشکیل جن بنیادی عناصر سے ہوئی ہے وہ ایک نہیں، زیادہ ہیں۔ یہ خیال حقیقت کے ناقص مطالعے اور ہستی کے نامعقول تصور پر مبنی ہے۔

کھلا۔ بند:
On-Off Position

تضادات کی اور بھی صورتیں یا نوعیتیں ہو سکتی ہیں جیسے کھلی۔ بند صورت جو صرف کسی چیز کی موجودگی یا غیر موجودگی کا اعلان کرتی ہے۔ روشنی اور تاریکی اس تضاد کی مثالیں ہیں۔ مگر یاد رہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی متخالف قوتیں نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک قوت دوسری قوت کی غیر موجودگی ہے اور بس۔ مثلاً رات سورج کی غیر موجودگی کا نام ہے اور سیاہی رنگوں کے نہ ہونے کی کیفیت۔ کوئی بالکل اناڑی مصور بھی بتا سکتا ہے کہ سیاہ کوئی

Marfat.com

رنگ نہیں بلکہ رنگ کی غیر موجودگی ہے۔اسی لیے سیاہ رنگ ہمیشہ موت اور ماتمی کیفیات کو ظاہر کرتا ہے۔اسی طرح کالا جادو خدا کی غیر موجودگی کو، اور زیادہ شدید صورتوں میں اقدار اور خدائی فطرت کے الٹ جانے کو ظاہر کرتا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ کچھ جھوٹے تضادات بھی ہوتے ہیں۔ یہ حقیقی نہیں ہوتے مگر انھیں غلطی سے ایسا سمجھ لیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر کاپی اور پین، سرخ اور سبز، سردیاں اور گرمیاں، روح اور مادہ۔ جدید انسان کی بہت سی غلط فہمیوں کی جڑ اس بات میں ہے کہ وہ دو امکانات کو ایک دوسرے کا متضاد اور متخالف سمجھ بیٹھتا ہے لیکن درحقیقت ایسا ہوتا نہیں ہے مثلاً طبعی سائنس اور انسانیات۔ گویا بہت سی سائنسی اور فلسفیانہ فروگزاشتوں کی بنیاد اس بات میں ہے کہ انسان نے ان اشیا کو متضاد سمجھ لیا جن میں حقیقی تضاد نہیں تھا جس کے نتیجے میں اس کا تصور حقیقت ثنویت یا دوئی کا شکار ہو گیا جب کہ ظاہر میں نظر آنے والی ثنویت دراصل ایک محیطِ کل دو قطبی وحدت کے پہلوؤں کو ظاہر کرتی ہے۔ انسانی فکر کے کچھ بہت بنیادی نوعیت کے تفرقات اسی غلطی کا نتیجہ ہیں جس میں دو پہلوؤں کو ایک دوسرے کا متضاد سمجھ لیا جاتا ہے حالاں کہ عین ممکن ہے کہ یہ دونوں متضاد نہ ہوں؛ محض ایسا فرض کیا جاتا ہو؛ مثال کے طور پر جیسے اشتراکیت اور سرمایہ داری نظام ہیں۔ مذہب اور سائنس بھی آخر کار ایسے ہی مفروضہ یا تخیلاتی متضاد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس بارے میں مزید بحث اگلے باب میں ہو گی جب ہم اللہ کے ناموں کی سائنسی اور فلسفیانہ اہمیت کی بات کریں گے۔ فی الحال ہم اپنے موضوع کو اللہ کی وحدانیت کی حقیقت تک محدود رکھتے ہیں۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اللہ کی وحدانیت اصل میں قطبین کی حامل ہے یعنی دو طرفہ ہے۔ اللہ کی صفات میں سے ہر ایک دو طرفہ ہے۔ اور اب یہ دیکھیں کہ یہ اطراف ایک دوسرے سے مل کر کیسے وحدت کا اظہار کرتی ہیں۔

ہمارے پاس ہستی (Being) کا تصور یہ ہے کہ وہ وحدت ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ بیک وقت دو طرفہ نوعیت (polarity) کی حامل بھی ہے۔ یہ ہے وہ پہیلی جو تمام الہامی مذاہب اور ہر حقیقت کو متناقض بنا دیتی ہے۔

اللہ ماورائی بھی ہے اور طبعی بھی۔

اللہ آغاز بھی کرتا ہے اور اپنی طرف کھینچتا اور روکتا بھی ہے۔

Marfat.com

اللہ مہربان بھی ہے اور انتقام لینے والا بھی۔

اللہ نگرانی کرنے والا بھی ہے اور آزادی دینے والا بھی۔

اللہ متحرک بھی ہے اور ساکن بھی۔

اللہ مقدم بھی ہے اور مؤخر بھی۔

اللہ عیاں بھی ہے اور نہاں بھی۔

اللہ ماورائی بھی ہے اور طبعی بھی۔ وہ پہلا بھی ہے اور آخری بھی۔ وہ پیچھے بھی ہے اور آگے بھی، وہ سامنے بھی ہے اور عقب میں بھی۔ اس کی یہ دونوں صفات ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں اور دونوں مل کر اللہ کی وحدت کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان جوڑوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور اکملیت کے اظہار کے لیے ان دونوں کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔

شیطان (ابلیس):
The Devil
قانونِ وحدت کا الٹ جانا:
Reversal of the Law of Unity

حافظ ابن کثیر (پ: ۷۰۱ھ، بصرہ) ، جو اسلامی فقہ، قانون اور علمِ تفسیر کے ماہر اور مستند عالم تھے، لکھتے ہیں کہ لفظ شیطان، شطنہ سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے دور دراز کی شے؛ کیوں کہ شیطان کی فطرت انسان سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ شطنہ عربی لفظ شطہ سے نکلا ہے جس کا لغوی مطلب ہے جلا ہوا اور یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کیوں کہ شیطان آگ سے بنا ہے۔ کچھ علما کا خیال ہے کہ یہ دونوں معانی درست ہیں۔ عرب باشندے اپنی روزمرہ زندگی میں شیطان اسے کہتے ہیں جس کی فطرت میں سرکشی اور بغاوت ہو۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شیطان کے پیروکاروں کا انجام بھی آگ ہی ہے۔

اب ہم اللہ کی دوطرفہ صفات پر بات آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس کی مکمل طور پر نفی کرنے سے دو یکسر مختلف اور متضاد بلکہ ایک دوسرے کو رد کرنے والی حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ اس تضاد کے نتیجے میں وحدت کی بجائے ثنویت پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً سچ اور جھوٹ کے متضاد امکانات۔ یہ سچائی کے اصول کا اس

Marfat.com

حد تک مکمل طور پر الٹ ہے کہ دونوں امکانات ایک دوسرے سے متصادم ہو جاتے ہیں۔ یہ امکانات ایک دوسرے سے باہمی تعامل نہیں کر سکتے اور نہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح خیر کا متضاد شر ہے اور شیطان خدا کا مصنوعی متضاد ہے۔ یہ ایک دوسرے سے متناقض ہیں اور اسی لیے اسمائے حسنیٰ میں ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ خدا شیطان نہیں ہے اور نہ وہ شر کی کسی بھی صفت سے متصف ہے۔ خدا شر نہیں ہے اور اس کا کوئی بھی فعل بیک وقت خیر اور شر نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی کوئی صفت بھی شر ہے نہ ان خاص معنوں میں اس کا متضاد جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔

خیر اور شر دو الگ الگ امکانات ہیں۔ یہ ایک ہی شے کے دو رُخ یا باہمی مربوط دو انتہائیں نہیں ہیں۔ ایک تعمیری کام بیک وقت تخریبی بھی ہو سکتا ہے؛ جیسے ایک گھر کی تعمیر کرنے کے لیے درخت کاٹنے پڑتے ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ خیر کا کوئی کام بیک وقت شر پر مبنی بھی ہو۔ ایسی ثنویت ممکن ہی نہیں۔ اسی طرح شیطان خدا کی صفات اور قوتوں کا الٹ ہوتا ہے۔ شیطان متناقض ہوتا ہے کیوں کہ وہ وحدت کے دوطرفہ اصول کو الٹ دیتا ہے۔ شیطان کا اللہ کے ناموں میں کوئی ذکر نہیں ملتا کیوں اللہ کی کوئی صفت ان معنوں میں متضاد یا شر پر مبنی نہیں ہے۔

اس کے برعکس دوطرفہ ہونا وحدت کی فطرت میں شامل ہے۔ یہ وحدت کی بنیادی خصوصیت ہے۔ جہاں تک وحدت کے دوطرفہ ہونے کی بات ہے تو اس کی مثال زندگی اور موت کی ہے۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کی دو انتہائیں ہیں۔ یہ وحدت کی اصلیت اور فطرت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اصل میں تضادات کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ کیسے یہ دو انتہائیں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور ایک ہی اصول کے ناگزیر اجزا اور درجات کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر روشنی اور تاریکی بالعموم ایک دوسرے کے متضاد سمجھے جاتے ہیں لیکن اصل میں تاریکی محض روشنی کی غیر موجودگی کا نام ہے۔ مطلق اندھیرا روشنی کے مطلق غیاب کو کہتے ہیں۔ یہ کسی صفت کی موجودگی یا غیر موجودگی کا درجہ ہی ہے جو اس کے ہونے یا نہ ہونے کے درجے کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے یہ دونوں قوتیں اس طرح ایک دوسرے کا الٹ نہیں ہیں جیسے عام طور پر انھیں سمجھا جاتا ہے۔ روشنی تاریکی کو زائل کر دیتی ہے لیکن تاریکی روشنی کو کبھی زائل نہیں کر سکتی بلکہ اسے اور روشن کر دیتی ہے۔ اسی طرح دولت اور مفلسی متضاد نہیں ہیں۔ انھیں صرف مال و زر کی موجودگی یا غیر موجودگی کے تعلق سے پہچانا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

ایسے متضاد جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور ثنویت پر مبنی قوتوں کے مظہر ہوں، وجود ہی نہیں رکھتے۔ یہاں کوئی ''غیر'' نہیں جو ایک علیحدہ وجود رکھتا ہو۔ یہ بات کوانٹم فزکس کی حالیہ دریافتوں میں تجرباتی طور پر ثابت ہو چکی ہے اور انسان کے تصور و تعبیرِ حقیقت پر اس کا گہرا اثر ہے۔ سائنسی علوم میں بھی اس کے اطلاق کی کئی صورتیں ہیں۔ خدا اور انسان، جسم اور روح، مادہ اور زندگی، دنیا اور آخرت، سائنس اور مذہب، ایک اور کئی، پہلا اور آخری، سکون اور حرکت، منفی اور مثبت، چاند اور سورج، مرد اور عورت ایک دوسرے کے الٹ نہیں ہیں بلکہ ایک حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر قانونِ تقدیم و تاخیر (law of prior and posterior) لاگو آتا ہے۔ چوں کہ یہ دونوں صفات باہمی تعامل کرتی ہیں اس لیے ان میں سے ایک دوسری پر سبقت اور فوقیت رکھتی ہے۔ یہ روزِ خاپن وحدت (توحید) کی باطنی نوعیت اور اصلیت کو ظاہر کرتا ہے اور اس پر اصولِ مساوات اور اصولِ سبقت و فضیلت کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ اصولِ وحدت ہے اور یہاں تضادات، یا ''غیر'' کا کوئی وجود نہیں۔

خدا اور شیطان ایک دوسرے کے الٹ ہیں مگر اس لیے نہیں کہ شیطان خدا سے الگ کسی قوت کا نام ہے، بلکہ اس لیے کہ شیطان خدا کی کچھ صفات کی ترتیب بدلنے کا باعث بنتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں شیطان اللہ کی ذات کا محل تبدیل کرنے کا نام ہے۔ شیطان کا اللہ کی ذات سے باہر کوئی وجود نہیں؛ وہ اسی سرچشمے سے فروغ پاتا ہے لیکن الٹی طرف سے۔ شیطان اللہ کی فطرت اور اصولِ وحدت کا الٹ ہے۔ خیر اور شر متضاد ہیں کیوں کہ شر خیر کی اقدار کو الٹ دیتی ہے۔ حکم اور نافرمانی ایسا ہی تضاد قائم کرتے ہیں کیوں کہ نافرمانی حکم کی تعمیل کو الٹ دیتا ہے۔ البتہ حکم اور اطاعت مکمل وحدت بن جاتے ہیں۔ اگر کوئی معاشرہ اچھے اعمال کی جزا اور برے اعمال کی سزا دیتا ہے تو برے افعال کی جزا اور اچھے اعمال کی سزا سے یہ نظام الٹ جائے گا۔ ایسی صورت میں جزا (النافع) اور سزا (الضار) کا اصول تو وہی رہتا ہے اور اس کی تعمیل کے لیے طاقت بھی استعمال ہوتی ہے لیکن ترجیح اور سمت بدل جاتی ہے۔ اسی اصول کا منفی انداز میں اطلاق ہوتا ہے جس کا نتیجہ انتشار اور خرابی کی صورت میں نکلتا ہے۔

قانون اور جرم ایک دوسرے سے متناقض ہیں کیوں کہ مجرم قانون کی بالادستی کو الٹ دیتا ہے۔ اگر کسی گاؤں کا تھانے دار مجرموں کے ساتھ مل جائے تو معاشرتی اعمال و کردار اور ترجیحات الٹ جائیں گی اور معاشرے کا نظم وضبط برباد ہو جائے گا۔ معاشرتی امن و امان برقرار رکھنے والے بنیادی قوانین کو دانستہ الٹ دینے سے ظلم، بے

Marfat.com

انصافی، تشدد، بدنظمی اور لاقانونیت پھیل جاتی ہے۔ یہی شر ہے۔ شیطان اسی طرح بروئے کار آتا ہے کہ اللہ کی اچھی فطرت کا رُخ الٹ کر اس کی عمدہ صفات کو بگاڑ دیتا ہے۔

جرم کی دنیا کو ''زیرزمین دنیا'' (Under world) کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ زمینی دنیا (Over world) کی اقدار کو الٹ دیتی ہے۔ عربی میں گناہ کو ''سفل'' کہتے ہیں جو گرے ہوئے، نچلے درجے والے، پست، گھٹیا، کمینے کو ظاہر کرتا ہے۔ سفلی علم (جس کا لغوی مطلب ہے زیرزمین دنیا کا علم، شر کی دنیا کا علم) کی اصطلاح کالے جادو کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ جو لوگ کالے جادو کا عمل کرتے ہیں وہ الہامی صحیفوں کی آیات پڑھتے ہیں اور یہی ان کی ساحرانہ قوتوں کا سرچشمہ ہے لیکن انھیں پڑھتے ہوئے وہ ان کے معانی کو الٹ دیتے ہیں۔ یہی مشق ہندومت کے منتروں کے ساتھ بھی کی جاتی ہے۔ عیسائیت میں جب بھی کوئی شخص ٹمپلروں کی جماعت (ایک متشدد مذہبی فرقہ) میں داخل ہوتا، تو وہ عیسیٰ کا انکار کرتا اور اسے صلیب پر تھوکنے، حتیٰ کہ اسے پیروں تلے مسلنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یہ بھی اسی اصول کے تحت تھا کہ عیسیٰ کو مخاطب تو کیا جاتا تھا مگر الٹ طریقے سے۔ گویا یہ سفلی عمل کرنے والے بھی قوت تو اسی منبع سے اخذ کرتے ہیں مگر قانونِ الٰہی اور خیر کی اقدار کو الٹ دیتے ہیں۔ اسی طرح شیطان (ابلیس) بھی خدا کی عمدہ صفات اور الوہی خصوصیات کا الٹ ہے۔ ابلیس کسی علیحدہ طاقت کا نام نہیں ہے اور نہ یہ خدا کی ذات سے باہر کوئی الگ وجود رکھتا ہے۔ یہ اسی قوت کو الٹ طریقے سے استعمال کرنے کا نام ہے۔ اللہ اور ابلیس دو علیحدہ قوتوں کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ ایک ہی قوت کے ادل بدل سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اللہ کا الٹا اطلاق کریں تو ابلیس کارفرما نظر آتا ہے۔ گویا شیطان اصولِ وحدانیت (توحید) کے برعکس ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

بابِ ہفتم

صفات درجہ وار ہوتی ہیں
افعال مرحلہ وار ہوتے ہیں

"تم خاک ہو اور خاک میں مل جاؤ گے"
"تم روح ہو اور روح کی طرف لوٹ جاؤ گے"
سائنس پہلی بات پر یقین رکھتی ہے
مذہب دوسری بات پر!

یہ آغاز اور انجام کا تعامل ہے؟
یا
ایک ہی حقیقت کے ادراک کی دو رُخی؟

Marfat.com

Marfat.com

اللہ کی صفات درجہ وار ہوتی ہیں

اللہ کے افعال مرحلہ وار ہوتے ہیں:

Allah's Attributes ("sifat") are Graded; Allah's Functions ("fa'l") are Phased.

اسمائے حسنیٰ اللہ کی ننانوے بہترین اور لازمی خصوصیات پر مشتمل ہیں۔ اسمائے الٰہی کی یہ روایت صرف عربی میں نازل ہونے والے قرآن سے مخصوص نہیں ہے۔ قدیم زمانے سے بیشتر مذاہب ان صفات کو اوتار، آواگون یا آرتی کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں۔ آریاؤں کے قدیم سنسکرت متن ''وشنو سہاسرانا ما ستوترا'' (Vishnu Sahasranama Stotra) میں وشنو کے ایک ہزار ناموں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ نام خدا کی آفاقیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ سہاسرانا ما میں مہاوشنو یعنی سب خداؤں سے بڑے خدا کو ہر شے پر محیط، واحد ہستی کے طور پر بیان کیا گیا ہے جو کئی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ ویشم جو سب کچھ ہے، ہر شے کی پیدائش اور کائنات کی بقا اور فنا کا موجب ہے۔ وہ براہم یعنی یکتا اور واحد اعلاترین ہستی ہے۔ سہاسرانا ما کے ابتدائی جملے اس کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: ''وہی ہے جس سے تمام چیزیں، وقت کی گردش کے آغاز پر، وجود میں آتی ہیں اور اس گردش کے اختتام پر، وہی ہے جس میں یہ سب چیزیں تحلیل ہو جاتی ہیں۔'' اسی بنیادی نظریے کو بہت سے ارفع تر مذاہب کئی ہزار سال بعد بھی دہراتے رہے ہیں۔ اسمائے حسنیٰ کی ابتدا میں لکھا ہے، ''وہ ایسی ہستی ہے جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے'' (ھو اللہ الذی لا الہ الا اللہ) اور وہی ہے جو ابتدا کرتا ہے (المبدی) اور وہی ہے جو واپس کھینچ لیتا ہے (المعید)۔

Marfat.com

اللہ کی صفات درجہ وار اور اس کے افعال مرحلہ وار ہوتے ہیں۔اس کی صفات اس کی اچھی خصوصیات (good properties) ہیں مثلاً روشنی (النّور)، مہربانی (الرّحمان)، امن (السّلام)، صبر (الصّبور) وغیرہ۔اللہ کے افعال سے مراد ہے اس کا کام، عمل، طریق وتخلیق، مثلاً ابتدا کرنے والا (المبدی) واپس کھینچنے والا (المعید)، تخلیق کرنے والا (الخالق)، بتدریج تیار کرنے والا (الباری)، صورت بنانے والا (المصوّر) وغیرہ۔تاہم اللہ کی صفات اور اس کے افعال کبھی کسی خاص تعداد یا مخصوص ناموں تک محدود نہیں ہوسکتے؛ یہ لامحدود ہیں۔

تقابلِ مذاہب کے ذریعے اسمائے حسنیٰ کی آفاقیت ثابت کرنا ہماری اس کتاب کے دائرۂ کار سے باہر ہے تاہم ہر زمانے، ہر زبان اور ہر مذہب میں اللہ کی صفات کو بے شمار ناموں سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔ایک مقتدر اور عظیم ترین خدا کا تصور بنی نوع انسان کی مشترکہ میراث رہا ہے۔اس تصور میں اگر کوئی اختلاف پایا جاتا ہے تو وہ محض لفظی یا لسانی ہوتا ہے۔اسی طرح کئی سائنسی مسائل بھی محض لفظی اختلافات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

مذہبی علما اس حقیقت کا شعور رکھتے ہیں کہ ایک نام کسی صفت کو اس کے مخصوص درجے کے حوالے سے ظاہر کرتا ہے جیسے مہربانی کرنے والا (الرّحمان) اور رحم کرنے والا (الرّحیم)، رزق دینے والا (الرّزاق) اور عطا کرنے والا (الوھّاب)، معاف کرنے والا (الرؤف) اور بخش دینے والا (العفو)۔ان صفات کی نوعیت میں اختلاف نہیں ہوتا، اختلاف صرف ان کے درجے میں ہوتا ہے۔یعنی ان کی نوعیت درجہ وار فضیلت رکھتی ہے۔اللہ کے جوڑے دار یا دوطرفہ (paired) نام دراصل ایک ہی صفت کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتے ہیں جیسے ''بہ، بہ تر اور بہ ترین'' ایک ہی خوبی کے مختلف مدارج ہیں۔اسی طرح وہ نام جو اللہ کے افعال کو ظاہر کرتے ہیں، ان افعال کے عمل پذیر ہونے کے مختلف مرحلوں یا منزلوں کے نام ہیں جیسے ابتدا کرنے والا (المبدی)، بتدریج تیار کرنے والا (الباری) اور صورت بنانے والا (المصوّر)۔عظیم محقق اور عالم امام غزالی لکھتے ہیں کہ تخلیق کا ہر عمل ان تین مرحلوں سے گزرتا ہے، خیال میں لانا، اس خیال کو ترقی دے کر عملی جامہ پہنانا اور پھر اسے ایک واضح شکل وصورت عطا کرنا۔مثال کے طور اگر کوئی مصوری کرنا چاہتا ہے تو اسے پہلے تو ایک تصویر کو تصوّر میں لانا پڑے گا۔یہ پہلا مرحلہ ہے یعنی خیال میں لانا۔پھر اسے رنگ، برش، ایزل اور کینوس حاصل کرنا ہوگا، یہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا مرحلہ ہے۔آخر میں تصویر بنانے کا مرحلہ آتا ہے جس میں وہ

Marfat.com

اسے ایک خاص صورت، رنگ اور ترکیب عطا کرتا ہے۔ اللہ کے بہت سے نام بھی کسی خیال کو روبہ عمل لانے کے ایسے ہی مراحل کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا عمل تخلیق مرحلہ وار مکمل ہوتا ہے۔ اسی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ کائنات بھی چوں کہ اللہ ہی کی تخلیق ہے اس لیے اللہ کے افعال کے مختلف مرحلوں، منزلوں اور مقامات کو ظاہر کرتی ہے۔ مزید برآں اللہ کی صفات بھی درجہ وار ظاہر ہوتی ہیں۔

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نام اور اس کے اوصاف مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں اور خود کو انسان کے اردگرد موجود مختلف طبعی، مادی اور روحانی حقیقتوں میں منکشف کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ انسان کا حقیقت کا تجربہ کرنے کا عمل بھی درجہ وار ہوتا ہے۔ انسان، خواہ منڈی میں مال لٹے بیچتا ہو، اعلا سرکاری ملازمت کرتا ہو، بین الاقوامی کارپوریشن میں کسی اونچے عہدے پر فائز ہو یا کائنات کے ارتقا پر تحقیق کر رہا ہو، اسے ہر جگہ عمدگی، فضیلت، بہتری اور تبدیلی کے مختلف مدارج سے واسطہ پڑتا ہے۔ صوفیانہ ادب اور مشرق کی بھگتی تحریک کا ادب بھی روحانی تجربات کو مقامات یا درجات اور مختلف عالموں کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ غوث، قطب، ابدال، ولی اور طالب جیسی اصطلاحیں صوفیانہ ادب میں عام ملتی ہیں جو روحانی مقامات یا مدارج کی علامت ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روحانی دنیا بھی اس اصول سے مستثنیٰ یا مختلف نہیں ہے۔ مخدوم علی ہجویری کی ''کشف المحجوب'' جو تصوف پر ابتدائی تصانیف میں سے ایک ہے، صوفی کے روحانی مقامات پر تفصیل سے روشنی ڈالتی ہے۔

اس بارے میں مزید بحث آگے چل کر ہو گی تاہم ابھی اس بحث سے یہ نتیجہ نکالنا ہی کافی ہو گا کہ اللہ کی صفات ہماری روزمرہ زندگی میں عیاں ہوتی ہیں اور اس کے افعال اس کی مخلوق اور ہمارے اردگرد موجود کائنات میں نظر آتے ہیں۔ چوں کہ اللہ کی صفات میں درجہ بندی ہوتی ہے اس لیے لازم ہے کہ ہر حقیقت میں درجہ بندی ہو۔ جیسے اللہ کے افعال مرحلہ وار ہوتے ہیں، اسی طرح لازم ہے کہ کائنات کی ہر حقیقت مختلف مرحلوں اور مقامات سے گزرتی ہو۔

وحدت کے مدارج:
Degrees of Unity

جہاں تک اللہ کی صفات کے انتہائی ہونے کا تعلق ہے، جیسے پہلا (الاوّل) اور آخری (الآخر)، تو یہ ان

Marfat.com

صفات کے انتہائی درجے ہیں اور ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان انتہائی درجوں کے درمیان بھی بے شمار مدارج ہوں گے۔اسی طرح ہر جوڑے دار یا دوطرفہ صفت، مثلاً معاف کرنے والا (الغفّار) اور مغلوب کر لینے والا (القہّار)، سکیڑنے والا (القابض) اور پھیلانے والا (الباسط)، فائدہ بخش (النافع) اور ضرر رساں (الضّار) کے انتہائی درجوں کے درمیان لاتعداد مدارج اور مقامات ہوں گے۔لیکن چوں کہ یہ درجہ وار صفات وحدت کو ظاہر کرتی ہیں اس لیے یہ مدارج بھی وحدت کے مدارج ہیں۔

اللہ کے ننانوے اسمائے حسنیٰ ثابت کرتے ہیں کہ وحدت متنوع نوعیت کی ہے۔ذاتِ واحد (الاحد) ایک ہے مگر اپنے آپ کو کئی صورتوں اور متنوع صفات میں منکشف کرتی ہے۔لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ایک کئی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔اس طرح ہم وحدانیت کو مختلف مدارج اور سطحوں کے حوالے سے دیکھ سکتے ہیں اور یہ مدارج اللہ کے ماورائی، لطیف اور غیر مرئی ہونے کی خصوصیت (الباطن) سے لے کر اس کے بیرونی، متحرک، کثیر الپہلو اور متنوع ہونے کی صفت (الظاہر) تک ناقابلِ تصور حد تک لاتعداد اور بے حساب منزلوں اور مراحل پر مشتمل ہیں۔

اللہ پہلا (الاوّل) بھی ہے اور آخری (الآخر) بھی۔ان دونوں میں سے پہلے کو فوقیت حاصل ہے کیوں کہ پہلا نہ ہو تو آخری بھی نہیں ہو سکتا۔جب تک کسی شے کی ابتدا نہ ہو، اس کی کوئی انتہا نہیں ہو سکتی۔لہٰذا ہم یہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اگلے (المقدم) اور پچھلے (المؤخر)، پہلے (الاوّل) اور آخری (الآخر) کے درمیان ہزار ہا درجات اور مقامات ہیں جو پہلے سے آخری تک وحدت کا ایک تسلسل (continuum) بناتے ہیں۔

Marfat.com

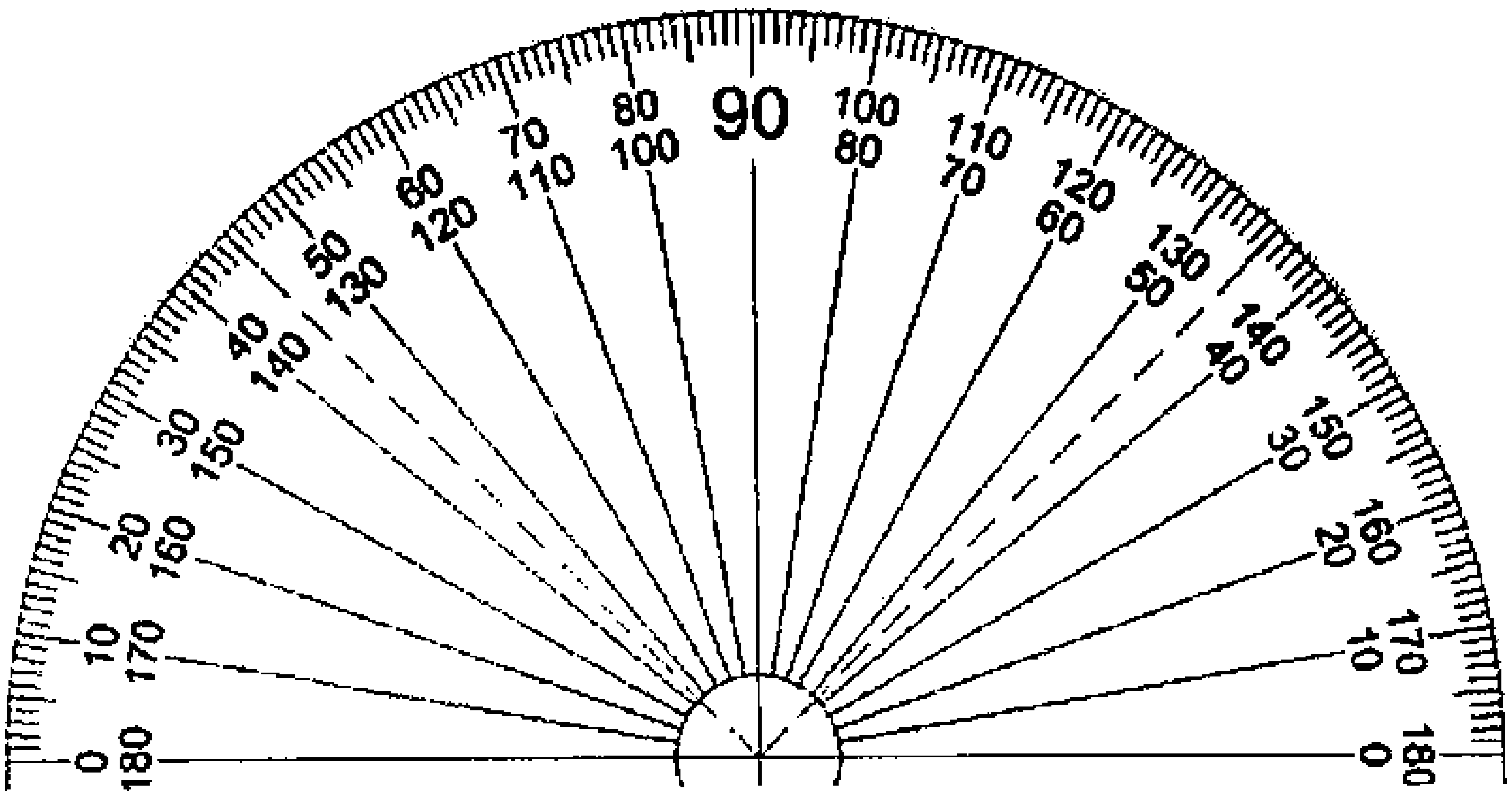

وحدت کا تسلسل:

Continuum of Unity

گویا الخافض (قدر و قیمت گھٹانے والا) اور الرافع (قدر و قیمت بڑھانے والا)، الکریم (کرم کرنے والا) اور الرقیب (نگرانی کرنے والا)، النافع (فائدہ پہنچانے والا) اور الضار (نقصان پہنچانے والا)، القابض (سکیڑنے والا) اور الباسط (پھیلانے والا) کسی صفت کی محض دو انتہائیں نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے تسلسل کو ظاہر کرتی ہیں جس میں کئی درمیانی مدارج ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کوئی سی بھی دو انتہائی صفات، ایک ہی سلسلے کے ''اوپر'' (up) اور ''نیچے'' (down) کے مقامات ہیں۔ جیسے کار کا درجۂ حرارت بتانے والے میٹر کے ''گرم'' (hot) اور ''سرد'' (cold) کے نقطے اسی ''اوپر'' (up) اور ''نیچے'' (down) کے انتہائی درجوں کو ظاہر کرتے ہیں جن کے درمیان ایک قوس پر درجۂ حرارت کے بے شمار مدارج ظاہر ہوتے ہیں۔ یا جس طرح غریب اور امیر کم یا زیادہ دولت کی ملکیت کے مدارج ہیں، حالانکہ عموماً انھیں ایک دوسرے کے متضاد سمجھا جاتا ہے۔

مثال کے طور یک خلوی جاندار سے لے کر جل تھلیے، رینگنے والے جانور، پرندے، ممالیہ جانور اور انسان زندگی کے بتدریج تسلسل کو ظاہر کرتے ہیں۔ یک خلوی جاندار اور انسان ایک ہی حقیقت کے ''اوپر'' (up) اور ''نیچے'' (down) کے مقامات ہیں۔ ہائیڈروجن کے ایک سادہ ایٹم سے لے کر تابکار یورینیم کی نمود تک کے تمام مراحل ایک ہی تسلسل کے مختلف مقامات ہیں۔ اسی طرح ہمارا دفتر، ہمارا اسکول، ہمارے کھیل، یہ سب

Marfat.com

ہماری ہی ذات کے تسلسل کے مختلف مقامات ہیں۔مختصر یہ کہ تمام تر حقیقت ایک ہی تسلسل کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتی ہے جس کے انتہائی کنارے اگر چہ ایک دوسرے سے مختلف معلوم ہوتے ہیں لیکن اصل میں ایک ہی ہیں۔حقیقت ایک تسلسل ہے۔ہر حقیقت درجہ بند اور مرحلہ وار ہوتی ہے۔اس تسلسل کو اوپر بڑھتا ہوا بھی کہا جا سکتا ہے اور نیچے اترتا ہوا بھی۔یہ ہمارے استخراجی مفروضے ہیں جنھیں سائنسی طریقے سے آزمایا جا سکتا ہے۔یہ صفات صورت اور تخلیق کی دنیا میں ظاہر ہوتی ہیں۔اللہ کی صفات کی آزمائش، پیمائش اور سائنسی تحقیق کے لیے میدان بالکل کھلا ہے۔

اللہ ایک (one) ہے (الاحد) لیکن اس کی مخلوقات کئی (many) ہیں، دوطرفہ (polar) ہیں اور جوڑے دار (paired) ہیں۔اللہ منفرد ہے (الواحد) لیکن اس کی صفات اور خصوصیات کئی ہیں، دوطرفہ ہیں اور جوڑے دار ہیں۔پہلی بات اللہ کے افعال کے مراحل اور منازل کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری بات اللہ کی صفات اور خصوصیات کے مدارج کا اظہار ہے۔

اوپر درج شدہ بیان کو کئی طرح کے الفاظ میں ڈھالا جا سکتا ہے جن کا مطلب یہی ہو گا کہ حقیقت دراصل ایک ہی ہے لیکن اس کی نمود کثرت میں، اور دورُخے جوڑوں میں ہوتی ہے جو باہم مربوط ہوتے ہیں۔لہٰذا اصولِ وحدت کو از سرِ نو اس طرح تشکیل دیا جا سکتا ہے کہ ’’ایک، کئی جوڑے دار صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے‘‘ یا یہ کہ ’’کئی اصل میں ایک ہیں‘‘ یا یوں کہ ’’ایک کئی ہے‘‘۔یا پھر اس اصول کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ’’کئی نہیں، صرف ایک‘‘ یعنی لا الہ الاّ اللہ۔

اللہ الباطن (اندرونی) ہے اس لیے نہاں ہے۔اندرونی طور پر اللہ مجرد ہے، نادیدہ ہے اور غیر مرئی ہے۔اللہ الظاھر (بیرونی) بھی ہے۔اس کا اندرون مخفی ہے مگر اس کی بیرونی متحرک سطح آشکار ہے۔اس بیرونی سطح کے مظاہر صرف ہویدا ہی نہیں مرئی بھی ہیں اور کثیر تعداد میں ہیں۔باطن اس کی اندرونی حرکت کا نام ہے اور ظاہر بیرونی حرکت کا۔باطن میں وہ غائب ہے اور ظاہر میں وہ حاضر ہے۔اس فقیر کی طرح جو پہلے کلمے کی معنویت بتانے کے لیے کبھی غائب ہو جاتا تھا اور کبھی حاضر۔اسمِ ذات مخفی ہے اور اسماے صفات آشکار ہیں۔یہ تمام مظاہر؛ جاندار، بے جان، طبعی، انسانی یا روحانی، حقیقت کے درجہ وار تسلسل کے مختلف مقامات اور مظاہر ہیں۔

Marfat.com

ایک دوسرے کے متوازی دنیاؤں کا تسلسل:
Parallel Worlds on a Continuum

ظاہر اور باطن حقیقت کے تسلسل کا ناگزیر جزو ہیں۔ باطن غیر مرئی ہے، ظاہر مرئی ہے، باطن اونچا کرنے والا ہے، ظاہر نیچا کرنے والا ہے، باطن ایک ہے، ظاہر کئی ہیں۔ یوں باطن اور ظاہر، الوہی اور مادی، لطیف اور کثیف، پراسرار اور زمینی، غیر مرئی دنیا (عالمِ غیب) اور مرئی دنیا (عالمِ شہادت)، ایک اور کئی، سب حقیقت کے اس تسلسل میں ایک دوسرے کے متوازی موجود ہیں۔ یہ عمل اور ردِعمل کی حقیقت کے تسلسل کے اوپر (up) اور نیچے (down) کے نقطے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ذہن دماغ کا ارفع عمل ہے یا دماغ ذہن کا نچلا درجہ ہے۔ یہ حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے کے دو نقطۂ نظر ہیں یعنی اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر۔ یہ دونوں نقطۂ نظر ہمیشہ استعمال ہوتے رہیں گے کیوں کہ یہ باہم مربوط ہیں اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ اسی طرح انسان اور خدا بھی ایک دوسرے سے ناگزیر طور پر جڑے ہوئے ہیں یعنی باہم مربوط اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ تاہم قانونِ سبقت (Law of Precedence) کی رو سے خدا انسان پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس انسان خدا پر منحصر ہے۔ لہٰذا حقیقت کو سمجھنے کا ایک تو ہے صحیح طریقہ اور ایک ہے اس کے الٹ اور غلط طریقہ۔ میری بوڑھی نانی ہمیشہ گھٹنوں کے جوڑ سخت ہو جانے کی شکایت کرتی رہتی ہیں اور کہتی ہیں کہ وہ اس وجہ سے چل نہیں سکتیں۔ یہ وہ عام روایتی طریقہ ہے جس سے ہم انسان حقیقت کو دیکھتے ہیں یعنی اوپر سے نیچے کی جانب۔ سچ تو یہ ہے کہ بوڑھی نانی نے چلنا موقوف کر دیا ہے اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ ان کے گھٹنوں کے جوڑ سخت ہو کر اکڑ گئے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اس کی روحانی صلاحیتیں، وقت کے ساتھ ساتھ کند ہو گئی ہیں۔ یہ سمجھنا کہ خدا کسی بھی طرح انسان پر منحصر ہے، اصولِ فطرت کی شدید خلاف ورزی ہے۔ اسی طرح انسان کو محض ایک جانور سمجھ لینا بھی اُس انسان کو سمجھنے کا الٹ یا معکوس طریقہ ہے جو بہت سی الوہی صفات کا مالک ہے۔

اوپر۔ نیچے کے مقامات:
UP-DOWN Positions

مذہب کا دعویٰ ہے کہ خدا نے انسان کو عام مٹی سے تراشا اور پھر اس میں اپنی روح پھونکی۔ گویا خدا روح ہے اور انسان مادہ ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا اور انسان، روح اور مادہ، خالق اور مخلوق ایک ہی تسلسل کے

Marfat.com

مختلف پہلو ہیں۔ یہ ایک ہی حقیقت کے اوپر اور نیچے کے مقامات ہیں، جیسے مادہ اور توانائی ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ اگر یہ بات سچ ثابت ہو جائے تو انسان کے تصورِ حقیقت پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے اور اس سے بڑھ کر ہماری طبعی اور سماجی سائنس متاثر ہو گی۔

''تم خاک ہو اور خاک میں مل جاؤ گے۔

تم روح ہو اور روح کی طرف لوٹ جاؤ گے۔''

یہ دونوں بیانات جو دیکھنے میں ایک دوسرے سے قطعی متضاد معلوم ہوتے ہیں، دراصل ایک ہی حقیقت کو اوپر یا نیچے کی جانب سے دیکھنے کا انداز ہیں۔ پہلا انداز مغربی سائنسی رویّے کی صفت ہے اور دوسرا مشرق کے روحانی طرزِ فکر کی۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کو دیکھنے کے دو انداز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق کا روحانی تجربہ اور اندازِ بیان مغرب کے کوانٹم فزکس کے بیانات کے متوازی قرار پاتا ہے اور اس تقابل کی نمایاں اہمیت نے ہی ڈاکٹر فریجوف کیپرا (Dr. Fritjof Capra) جیسے سائنس دان کو *The Tao of Physics* جیسی کتاب تصنیف کرنے پر مجبور کر دیا۔

اللہ کی نشانیاں:
Signs of Allah

ہم ایسے استخراجی بیانات کے ذریعے اپنے موضوع سے بھٹک کر بہت دور جا سکتے ہیں اس لیے ہمیں فی الحال اپنے فوری مقصد کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اللہ کی صفات اور اس کے افعال کے نام (اسماے صفات اور اسماے افعال) اللہ کا ظاہر ہیں۔ گویا ایسے سبھی نام اللہ کے مظاہر ہیں۔ مثال کے طور پر انسانی ذہانت ایک غیر مادی، غیر مرئی شے ہے لیکن یہ انسانی طرزِ عمل، رویے، ردِ عمل، اعمال و افعال، اس کی جدتِ طبع، اس کی لذتِ ایجاد اور اس کی گرمیٔ کار میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ سب باتیں اس کے اندر موجود مخفی اور غیر مرئی ذہانت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی ذہانت انسان کے کردار، اعمال اور اس کی خصوصیات میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ بھی خود کو ایسے ہی مظاہر میں منکشف کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کے نتیجے میں انسان اس حقیقت کو جادوئی یا مافوق الفطرت قوتوں کا نام دینے پر مائل ہو سکتا ہے اور بعض صورتوں میں فطرت کے ہوا اور پانی جیسے مظاہر کو دیوتا ماننے، قبائلی رسومات اور عقیدوں پر ایمان لانے اور تہواروں اور مذہبی رسم و رواج کو مقدس

Marfat.com

ماننے پر تیار ہو جاتا ہے۔ یقیناً ایسے سطحی مظاہر خدا نہیں ہو سکتے؛ یہ تو صرف اس کی صفات کے کچھ مدارج کا اظہار ہیں۔ ان نچلی سطح کے درجات سے چمٹ کر رہ جانا انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ یہ مظاہر اللہ کی فطرت کی علامت یا شہادت تو ہو سکتے ہیں لیکن اللہ کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔ علامت سازی ایک مخصوص انسانی صلاحیت ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ علامت اور اس شے کے درمیان، جس کی وہ علامت ہے، کوئی لازمی اور ناگزیر تعلق ہو۔ نشان کسی چیز کی علامت ہوتا ہے، خود وہ چیز نہیں ہوتا۔ علامت میں ایسی کوئی باطنی خصوصیت نہیں ہوتی جو اس کا اپنے محل سے تعلق ثابت کرے۔ لیکن انسان میں اس حقیقت کو نظر انداز کر کے علامت ہی کو اصل چیز سمجھ لینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک مشہور اداکار نے کسی فلم میں شرابی کا کردار ادا کیا تو کئی ایسی عورتوں نے اس کی بیوی کو خط لکھ کر اس سے اظہارِ ہمدردی کیا جن کے شوہر شراب کی لت میں مبتلا تھے۔ علامت اور حقیقت کو اس طرح ایک دوسرے میں آمیخت کر دینے کی اس عادت کا ذمہ دار معاشرہ ہوتا ہے کیوں کہ بعض اوقات معاشرے منظم طریقے سے اس رجحان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اپنے افراد کو علامات کا احترام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جاپان کے شہنشاہی دور میں اگر کسی عمارت میں آگ لگ جاتی تو شہنشاہ کی تصویر کو جلنے سے بچانا لازم سمجھا جاتا تھا خواہ اس کے لیے کسی شخص کی جان ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔ علامات کو ان اشیا کا متبادل سمجھنا جن کی وہ علامت ہیں، بہت سے مذاہب میں بت پرستی کے رجحان کو تقویت دینے کا باعث بنا ہے۔ علامت خود وہ شے نہیں ہوتی جسے وہ ظاہر کرتی ہے، لفظ خود چیز نہیں ہوتا اور کسی علاقے کا نقشہ، وہ علاقہ نہیں ہو سکتا۔ ہندومت میں ہمیں اس رجحان کی عملی مثال ملتی ہے کہ کیسے قبل از تاریخ ویدک عہد کا ایک سادہ اور ارفع تصورِ خدا، وقت کے ساتھ ساتھ مسخ ہوتا رہا اور کثرت پرستی کے وسیع تر نظام میں تبدیل ہو گیا جس میں بے شمار دیوی دیوتا، تناسخ اور آواگون کے عقیدے اور مذکر اور مؤنث خدا، یہاں تک کہ حیوان خدا بھی شامل ہوتے گئے۔

ہندومت کا معروف و مقبول مفروضہ یہ ہے کہ ایک آفاقی ہستی جسے برہما یا اومکار کہتے ہیں، کئی صورتیں اختیار کرتی ہے۔ ہر صورت کی اپنی مخصوص نوعیت ہے اور یہ کلی یا جزوی طور پر اسی عظیم ہستی کی صفات کا عکس ہوتی ہے۔ انھی صورتوں پر اعتقاد رکھنا کثرت پرستی، دیوی دیوتاؤں کی الوہیت اور ہمہ اوستی تصورات کی بنیاد بنتا ہے۔ رگ وید (X129) میں بیان کیا گیا ہے کہ خالق اپنی مخلوق کو مؤنث کے اصول (female principle) کے ذریعے تخلیق کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ یہ خیال پرش (آسمان) اور پراورتی (زمین) کی فرضی

Marfat.com

شادی کی صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ یوں متضاد اصولوں کا امتزاج اور خدا کا مادی دنیا میں نزول کرنا، ہندو عقیدے کے اہم پہلو ہیں۔ ہندومت غالباً اس امر کی سب سے نمایاں اور بہترین مثال ہے کہ کیسے ایک ارفع و اعلا تصور اور ایک انتہائی گہرا فلسفیانہ مذہب وقت کے ساتھ ساتھ، نچلے درجے کے مظاہر سے چمٹ کر رہ جانے (fixation) کے باعث بت پرستی اور رسوم و رواج کی اندھی تقلید کے مقبولِ عام طور طریقوں تک محدود رہ گیا۔

خدا کی شبیہ کی پوجا:
Worship of God Image

دوسرے مذاہب جیسے یہودیت اور عیسائیت مظاہر کی عبادت کرنے یا خدا کی شبیہ کو پوجنے پر سخت پابندی عائد کرتے ہیں۔ اسلام تو اس معاملے میں خاص طور پر شدت کرتا ہے کیوں کہ اللہ کی صفات کے مظاہر تو بہرحال دنیا میں موجود ہیں اور یہ مظاہر انسان کو متاثر و مسحور بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ مظاہر اللہ نہیں ہیں اور اسی لیے اسلام ان کی پرستش کرنے سے منع کرتا ہے۔ کئی مذاہب انھی مظاہر کی پرستش کے باعث بت پرستی اور کثرت پرستی جیسے فرومایہ اشغال میں بھٹک کر رہ گئے۔ پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ کی آمد سے قبل عربوں میں بھی ایک عظیم ترین ذاتِ خداوندی کا تصور موجود تھا جسے وہ اللہ ہی کہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ۳۶۰ دیگر بتوں کی پوجا بھی کرتے تھے؛ جن میں سے ہر ایک کو وہ اللہ کی نہ کسی صفت کا مظہر قرار دیتے تھے۔

انسان اور خدا متوازی معکوس ہیں:
Man and God are Parallel Inversions

انسان کو خدا نے مٹی سے بنایا۔ اس نے ایک شبیہ بنائی اور سب کو حکم دیا کہ اس کی اس تخلیق کے سامنے سجدہ کریں۔ انسان بھی یہی کرتا ہے تاکہ اپنے اندر خدا کے متوازی کوئی ذات تخلیق کر سکے۔ یہ بس اقدار کی الٹ پلٹ ہے اور خود کو خدا کے مرتبے تک پہنچانے کی کوشش ہے۔ یہ شرک ہے کیوں کہ یہ خود اپنی ہی تخلیق کی پرستش ہے۔ یہ بت نہیں بلکہ انسان ہے جو بت تراشتا ہے اور خود کو خدا کا مقام دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ معکوس انسان خدا کی جگہ لینا چاہتا ہے۔ اپنی تخلیق سے محبت کرنا دراصل خود سے محبت کرنے کے مترادف ہے اور اس کا حق صرف اور صرف اللہ کو ہے کیوں کہ وہ ہستیِ کامل ہے۔ ناقص سے چمٹ جانا غیر صحت مندانہ عمل ہے۔ اس سے

Marfat.com

نشو ونما کا عمل ساقط ہو جاتا ہے۔ خود پرستی سب سے بری عادت (fixation) ہے۔ یہ انسان کی نشو ونما میں رکاوٹ ڈالتی ہے اور اس کی انا کو خود اسی کی جانب الٹ دیتی ہے۔ سگمنڈ فرائیڈ اور اس کے مکتبۂ تحلیل نفسی کے ذریعے ایسی بے شمار مثالیں سامنے آتی ہیں کہ کیسے انا پرستی نے انسانی شخصیت کی نشو ونما پر انتہائی منفی اور ضرر رساں اثرات مرتب کیے۔ اس انا پرستی کی زیادہ شدید صورتیں اکثر انحرافی رویوں (abnormality) اور کبھی کبھی تو پاگل پن کی صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی لیے قرآن میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنی خواہش کی غلامی کرتے ہیں اور خود اپنے سوا کسی سے محبت نہیں کرتے۔ اسی طرح بت پرستی، غرور، ہر نوع کی انا پرستی، نرگسیت، خود پسندی، یہاں تک کہ اپنی اولاد سے بھی حد سے بڑھی ہوئی محبت پر قابو پانے کی مذہبی ہدایت اسی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔

اللہ کی صفات کو اپنانا:
Inculcation of Allah's Attributes

اس بات پر بار بار زور دیا جاتا ہے کہ انسان اپنے طرزِ عمل میں اللہ کی صفات پیدا کرے اور ان کی تقلید کرے۔ ایسا اس لیے ہے کیوں کہ خدا ترقی اور نشو ونما کی منزلِ مقصود ہے۔ اللہ اصولِ نشو ونما ہے۔ اللہ مہربان (الـرّحیم) ہے اس لیے انسان کو بھی مہربان (رحیم) بننا چاہیے تا کہ وہ اللہ کو نہ صرف سمجھ سکے بلکہ اس سے ہم آہنگی بھی پیدا کر سکے۔ رحیم سے الـرّحیم تک ایک بلند ہوتا ہوا تسلسل ہے۔ اللہ کو جاننے کے لیے، اس کی فطرت کو سمجھنے کے لیے، اسے محسوس کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم خود کو اس سے ہم آہنگ کریں، اس کو اپنے اندر محسوس کریں، آرزو کریں، کوشش کریں اور پھر اس کی آگہی حاصل کریں۔ یہ اوپر جانے والا زینہ ہے جو اوپر سے مزید اوپر لے جاتا ہے۔ لیکن اس کے متوازی ایک اور زینہ بھی ہے جو نیچے لے جاتا ہے اور نیچے سے نیچے لیے جاتا ہے۔ فطرت کا مطالعہ کریں اور پوری ایمان داری اور لگن سے سائنسی انداز میں قانونِ فطرت کو سمجھیں تو ایک دن آپ اوپر پہنچ جائیں گے۔ ہم انسانوں کے پاس بس یہی ایک راستہ ہے لیکن دونوں صورتوں میں کامیابی کی شرط یہ ہے کہ خلوص، لگن اور عزم و ہمت سے کام لیا جائے۔

اس طرح، اللہ کے نام انسان کے لیے باہمی تعامل کرنے والی (interactive) صفات ہیں۔ ان الوہی صفات کی انسان کے نزدیک بہت اہمیت ہے کیوں کہ صفات ہی اس کا رویّہ اور اس کی عادات ہوتی

Marfat.com

ہیں۔گویا رحمان سے الرّحمان، رحیم سے الرّحیم، قدوس سے القدوس، سلام سے السّلام، مہیمن سے المہیمن، خالق سے الخالق، مصور سے المصوّر، فتاح سے الفتّاح، عالم سے العالم، عدل سے العدل تک یہ تمام صفات انسانی کردار کی کلید ہیں۔انسان اگر خود اپنے ہی تسلسل کے منتہاے مقصود کو سمجھنا چاہتا ہے تو انھی صفات کو اپنی شخصیت کا جزو بنانا ہوگا اور زینہ بہ زینہ ارفع منازل کی طرف بڑھنا ہوگا۔

اگر ایک طرف اس ذاتِ عظیم کی اطاعت کا حکم ہے تو دوسری طرف خود کو اللہ سے ہم آہنگ کرنے اور اچھائی، نیکی، سچائی، اور کشادہ دلی جیسی صفات اپنا لینے کی ترغیب ہے۔ یہاں پھر انسان کو دو متضاد سمتوں کے درمیان رکھا گیا ہے، ایک جانب اپنی ذات کی نفی ہے (-) اور دوسری جانب اپنی ذات کا اثبات (+)۔نفی اور اثبات، انکار اور اقرار کا یہ باہمی تعامل انسان کی ترقی کا موجب بنتا ہے۔یہ بات دیکھنے میں تو یقیناً متناقض (paradoxical) معلوم ہوتی ہے۔آخر ہم اس ہستی کے سامنے اطاعت اور تسلیم وسپردگی کا اظہار کیسے کر سکتے ہیں جس کی ہم ایسی پرستش کریں کہ اس جیسا بن جانے کی کوشش کریں۔کسی کو اپنا آئیڈیل بنا لینا اور اس کی پرستش کرنا تسلیم وسپردگی اور اطاعت کی وہ انتہائی منزل ہے جہاں انسان کسی خارجی حکم یا مجبوری کے باعث نہیں بلکہ خود اپنی مرضی، محبت اور لگن سے پہنچتا ہے۔انسان کبھی اللہ جیسا نہیں بن سکتا لیکن اللہ کی طرح عمل کرنے سے، اس کی پیروی کرنے سے، اسے سمجھنے، محسوس کرنے، اپنے اندر جذب کر لینے سے اس کی معرفت ضرور حاصل کر سکتا ہے اور یوں خود کو پہچانو (Know Thyself) کے مقولے پر عمل کر کے اپنی مسخ شدہ ذات کو حقیقی ذات میں بدل سکتا ہے۔

مطلوب ومقصود اللہ:
Allah the Desired

اللہ کی جوڑے دار صفات میں سے ایک جوڑا المالک (خداوند) اور المقصود (مقصد) کا بھی ہے۔اللہ ان دونوں صفات یعنی خداوندی اور مقصدیت کو یکجا کر دیتا ہے۔وہ مالک وآقا اور خداوند ہے اس لیے انسان کبھی اس کے برابر نہیں ہو سکتا مگر چوں کہ وہ منزلِ مقصود، مثالی نمونہ، غرض وغایت، مدعا اور نصب العین بھی ہے اس لیے انسان کو ہمیشہ اس تک پہنچنے کی تگ ودو کرتے رہنا چاہیے۔اللہ زندگی کا منتہاے مقصود، اس کا نصب العین ہے۔نصب العین کا حصول ہمیشہ مرحلہ وار اور درجہ بہ درجہ ہوتا ہے۔انسان کی تمام تر تلاش، اس کے مقاصد،

Marfat.com

اس کا مدعا اسی نصب العین کے حصول اور دریافت کا وسیلہ ہے لیکن اس کے نتیجے میں جس حقیقت تک رسائی ہوتی ہے وہ اللہ کی ذاتِ کل نہیں، بلکہ اس کے کچھ پہلو، کچھ درجات، کچھ اجزا پر مشتمل ہے۔ آخرکار جب ہم مقاصد کے اس تسلسل (continuum) پر اوپر کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اللہ انسانی زندگی کا سب سے اہم، ضروری، اور مطلق مقصد ہے۔ نفسیات میں تحلیل نفسی کا نظریہ انسانی خواہشات، تمناؤں اور دبے ہوئے لاشعوری مقاصد کا مطالعہ کرتا ہے۔ اب اگر ہم انسانی خواہشات اور تمناؤں کی نفسیات کی طرف بڑھ گئے تو اپنے موضوع سے دور نکل جائیں گے اس لیے میں قارئین کو سی۔ جے۔ ژونگ (C.J.Jung) کی تصنیف School of Psychoanalysis سے رجوع کرنے کا مشورہ دوں گا جس میں کامیاب ترین انسانوں کی مخفی خواہشوں اور لاشعوری تمناؤں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ انسان درجہ بہ درجہ بڑھتے ہوئے مقاصد کی مدد سے نشوونما حاصل کرتا ہے۔ ایک شیر خوار ہی کو دیکھیے؛ کیسے وہ مرحلہ وار اور درجہ بہ درجہ نشوونما پاتا ہے۔ پہلے وہ رینگنا شروع کرتا ہے، پھر سیدھا کھڑا ہوتا ہے اور پھر چلنا شروع کرتا ہے۔ اس کی یہ حرکات ارتقا کے اولین ادوار کے انسان کی نقل معلوم ہوتی ہیں۔ پھر بچہ منہ سے آوازیں نکالنے لگتا ہے، آہستہ آہستہ ان آوازوں سے لفظ بناتا ہے، یہاں تک کہ باتیں کرنے لگتا ہے۔ پہلے پہل تو وہ کچھ طبعی اشیا یا افراد کے ناموں سے واقف ہوتا ہے، پھر جوں جوں بڑا ہوتا ہے، عمومی خیالات و تصورات اور مجرد نظریات کو سمجھنے کے قابل ہوتا جاتا ہے۔ بچے کی یہ نشوونما اس حقیقت کے درجہ بہ درجہ اور مرحلہ وار منکشف ہونے کی شہادت ہے جو بیضے (-) اور نطفے (+) کے ملاپ سے شروع ہو کر ارتقا کی مختلف منزلیں طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ بچہ زندگی کا آغاز حیوان کی سی جبلی سطح سے کرتا ہے، پھر ایک انسان نما دو پایہ بن جاتا ہے اور سب سے آخر میں، اعلاتر اور مجرد حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس کی ذہنی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ اس منزل پر کہیں جا کر بچہ مجرد حقائق کی تفہیم کے قابل ہوتا ہے۔ استعداد اور مقاصد میں یہ تبدیلی، یہ ارتقائی حرکت ٹھوس سے مجرد اور جسمانی یا طبعی سے غیر مرئی (physical to abstract) کی سمت میں ہوتی ہے۔ یہی انسان کی زندگی کے تمام تر مقصد اور نصب العین کا خلاصہ ہے۔ انسان کا منتہائے مقصود مجرد ہے۔ ان مقاصد کو بروقت اور درست طور پر حاصل کر لیا جائے تو انسان کی زندگی خوشگوار، خوش حال، صحت مندانہ اور ہم آہنگ ہو سکتی ہے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو وہ ناکام و نامراد ٹھہرتا ہے۔ یہ ناکامی انسان کو اضمحلال، افسردگی، بے اطمینانی، کم حوصلگی اور بلا کی ناخوشی، حتیٰ کہ خودکشی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ نفسیات، جو انسانی ذہن کی سائنس ہے، یہ بتاتی ہے کہ انسان کی زندگی کا نصب العین دراصل

Marfat.com

خود اپنی تکمیل اور اطمینان کا حصول ہے۔ انتہائی قابل اور ذہین ماہرِ تحلیلِ نفسی سگمنڈ فرائیڈ کو، اپنی زندگی کے آخری دور میں اپنے اس نظریے سے دست کش ہونا پڑا تھا کہ مسرت (pleasure) ہی زندگی کا اصلِ اصول ہے اور اس نے اپنی اس بات کی تصحیح بھی کر لی تھی۔ وہ انتہائی باریک بین دانش ور تھا اور اسے جلد ہی معلوم ہو گیا تھا کہ کرب (pain) اور مسرت (pleasure) لازم و ملزوم ہیں۔ فرائیڈ کے تجربی مطالعات، ایک مساوی مگر متضاد قوت، یعنی موت کی جبلت (Thanatos) کی دریافت کے ساتھ ہی غلط ثابت ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ پوری زندگی مختلف واقعات کے مشاہدات پر صرف کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان کی زندگی صرف اصولِ مسرت، جنس اور تعمیر و تخلیق (Eros) کے تحت ہی بسر نہیں ہوتی بلکہ وہ اصولِ کرب، موت اور تخریب و تحلیل (Thanatos) سے بھی اتنا ہی متاثر ہوتا ہے۔ اس نے جبلتِ موت کو انسان کے مساوی مگر متضاد نصب العین کے طور پر پیش کیا ہے جو ہمیشہ زندگی سے تعامل کرتا رہتا ہے اور اس نصب العین کی بروقت تکمیل انسان کی زندگی کی مسرت، نشو و نما اور ترقی کے لیے لازم ہے۔ فرائیڈ سے کئی ہزار برس پہلے، کائنات کے آغاز کا احوال بیان کرتے ہوئے، وادیٔ سندھ کی ایک قدیم تہذیب کے شہکار رگ وید میں بیان کیا گیا ہے کہ کائنات تخلیق کے خدا برہما اور تخریب کے خدا شوا کے باہمی تعامل سے وجود میں آئی ہے جو ایک ہی خدا کے دو مختلف پہلو ہیں۔ معروف ماہرِ نفسیات ژونگ نے ایک جگہ کہا تھا کہ سکے کی اصل قیمت اس کے خرچ کرنے سے معلوم ہوتی ہے۔ اس نے موت کو انسانی زندگی کا ایک مقصد قرار دیا تھا۔ فرائیڈ کی دلچسپی کے مرکز سے ہٹ کر ژونگ ان لوگوں میں افسردگی، رنج، بے چینی، کرب ناک مایوسی، ناامیدی اور اداسی کے جذبات کا سراغ لگانا چاہتا تھا جو دنیاوی طور پر کامیاب اور خوش حال زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی طبائع پر ایک بے نام افسردگی اور مایوسی سی کیوں چھائی رہتی ہے جیسے انھوں نے زندگی کی کوئی قیمتی متاع گنوا دی ہو جو ان کی اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آئیڈیل کیا ہوتا ہے؟ انسانی نصب العین کسے کہتے ہیں؟ سادہ ترین الفاظ میں نصب العین وہ چیز ہے جس کی انسان کو خواہش ہو۔ یعنی وہ چیز جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ نفسیات کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ کیسے انسان کے مقاصد اس کی خواہشات سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور ان کے حصول میں ناکامی اس پر کیسے کیسے اثرات مرتب کرتی ہے۔ یہ مقصد، یہ خواہش کچھ بھی ہو سکتی ہے، ایک کار، کوئی ساز، کوئی پیشہ ورانہ منصب، کوئی ملاپ، کوئی مقصد، کچھ بھی۔ مگر جو بھی ہو، نصب العین اصل میں وہی ہوتا ہے جس کی دل خواہش

Marfat.com

کرتا ہے، وہ شے جسے دل مانگے، وہ شخص جسے کوئی اپنا بنا لینا چاہے یا پھر وہ جس جیسا بن جانے کی خواہش ہو، جس کی انسان پیروی کرنا چاہے، چپکے چپکے اس جیسا ہو جانے کی تمنا پالے۔ اصل مقصد وہی ہوتا ہے جس سے انسان اپنی پہچان وابستہ کرتا ہے یہاں تک کہ اپنی انا بھی قربان کر دیتا ہے یا پھر اسے بھی اپنی انا کا جزو بنا لیتا ہے؛ جیسے قومیت۔ یہ مقصد انسان پر چھا جاتا ہے، اس کی ذات کا حصہ بن جاتا ہے، اگر کوئی چیز اس مقصد کے لیے خطرہ ہو تو وہ خود اس کے لیے بھی خطرناک ہوتی ہے، اگر کوئی بات اس کی ستائش یا تقویت کا باعث بنے تو خود اسے بھی تقویت اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ انسان کی انا، اس کی ترقی، اس کی ذات کا مرکز بن جاتا ہے۔ اکثر یہ اپنے اندر جذب کر لینے والا، انسان کو کھا جانے والا تجربہ ثابت ہوتا ہے۔ رزمیہ داستانوں کے رومانی قصے اور محبت کی کہانیاں بنی نوعِ انسان کی اپنے مقصد کے ساتھ ایسی ہی شدید اور گہری وابستگیوں کی کتھا بیان کرتی ہیں۔ مزید یہ کہ روشن خیالی کے ایک امام روسو (Rousseau) کا جدید سیاسی نظریہ اور سماجی معاہدہ بھی اسی اصول پر بنیاد رکھتا ہے۔ اس نظریے کے تحت معاشرے کا ایک ایک فرد اپنے ذاتی اور نجی مقاصد کو جمہوری سیاسی ریاست کے اعلاتر مقاصد کے لیے قربان کر دیتا ہے اور خود اپنے تشخص اور تکمیل کو اس سیاسی ریاست کے اجتماعی مقاصد کی تکمیل سے وابستہ کر لیتا ہے۔ یوں انا کے مراکز کے مختلف درجے اور زینے وجود میں آتے ہیں۔ خاندان مرکز، قبیلہ مرکز، نسل مرکز، قومیت مرکز، مذہب مرکز، انسانیت مرکز یا ان سب کے برخلاف خود مرکز مقاصد پر مبنی انائیں ابھرتی ہیں۔ ان مقاصد کا اعلاترین مرکز اللہ ہے جو انا کی نشو و نما کی ناگزیر اور آخری منزل ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان خود شناسی اور پھر خدا شناسی کی منزل کو پہنچ جاتا ہے۔ مذہب کا مقصد بھی یہی ہے۔ دراصل یہ انسانیت کا انفرادی اور اجتماعی آئیڈیل ہے۔ انفرادی سطح پر تو کئی لوگوں نے اس آئیڈیل کو حاصل کیا ہے، مگر اب وقت آ گیا ہے کہ انسانیت اجتماعی طور پر اس منزل تک پہنچ جائے۔ اگر کوئی فرد اس مقصد کو پانے میں ناکام رہے تو وہ افسردگی، نامعلوم سی یاسیت، بے لطفی، گہری اداسی اور بالآخر تنزل کا شکار ہو جاتا ہے لیکن اگر اس مقصد کے حصول میں اجتماعی طور پر ناکامی کا سامنا ہو تو نتیجہ انتشار، تخریب، معاشرتی بگاڑ اور بحران کی صورت میں نکلتا ہے۔ نظریاتی مملکت پاکستان کی صورت میں اس کی مثال پوری دنیا کے سامنے ہے جو اللہ سے وابستگی کے دعوے کی بنیاد پر وجود میں آئی تھی لیکن اس ارفع و اعلا مقصد کا حصول تو کجا، اس کی درست تفہیم کرنے میں بھی ناکام ثابت ہوئی ہے۔ یہ ناکامی ہر طرف پھیلی ہوئی بدنظمی اور معاشرتی افراتفری میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ آج اگر پاکستان کا مستقبل کسی شے سے وابستہ ہے تو وہ اس کے بنیادی مقصد کے حصول ہی میں

Marfat.com

پنہاں ہے۔

آئیڈیل یا نصب العین وہ شے ہے جس کی تمنا کی جاتی ہے اور جسے اپنی انا میں اس طرح شامل کر لیا جاتا ہے کہ یہی نصب العین انسانی انا کی نشوونما کا مرکز بن جائے۔ یہ مقصد انسان کے اندر اس طرح جذب ہو کر رہ جاتا ہے جیسے یہ انسانی نشوونما کا باعث بننے والی خوارک ہو۔ قدیم مردم خور معاشروں میں رونما ہونے والے ایسے کئی واقعات تاریخ کا حصہ ہیں جن میں محبت کی شدت سے مجبور ہو کر اپنے محبوب کو کھا جانے کی مثالیں ملتی ہیں۔ مہذب معاشروں میں اس رجحان نے دیگر صورتیں اختیار کر لی ہیں۔ مثلاً موسیقی کے مقبول برطانوی پاپ بینڈ کی صورت میں ڈھالی گئی ٹافیوں کی مقبولیت۔ ہماری روزمرہ کی زبان میں بھی اس رجحان کو ظاہر کرنے والے الفاظ اور تراکیب عام استعمال ہوتی ہیں، جیسے تجھے دل میں بسا لوں اور انگریزی میں suck you (چوس لینا) وغیرہ۔ اسی طرح محبوب کو اڑا لے جانے، والہانہ چومنے اور چوسنے جیسی حرکات انسان کی اپنے محبوب کو کھا جانے کی خواہش کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ فرائیڈ ایسے انسانی رویوں سے اس قدر متاثر ہو گیا تھا کہ اس نے یہ اعلان کر ڈالا کہ چوسنے کا عمل انسانی حظ اندوزی کا نقش اول (prototype) اور پوری بنی نوع انسان کی پیدائشی رغبت کا اظہار ہے۔ انسان کی اپنی محبوب شے یا ہستی کو اپنے اندر جذب کر لینے، کھا جانے اور اپنے آپ میں شامل کر کے اس کا تجربہ کرنے کی یہی خواہش جب اعلا و ارفع سطح پر پہنچتی ہے تو خود کو اللہ سے جوڑ لینے کے مقصد تک جا پہنچتی ہے۔ ایسے کئی صوفیوں، زاہدوں اور عابدوں کی مثالیں موجود ہیں جنھوں نے صرف اللہ کے ناموں کا ورد ہی نہیں کیا بلکہ اس کی صفات کو بھی اپنے اندر اتار لیا تا کہ خود کو اس سے ملا دیں۔ فرانسس آف ایسسی (Francis of Assisi) کی سچی کہانی دیکھیے جن کے جسم پر حضرت عیسیٰ کی شدید محبت کے نتیجے میں صلیب کا نقش (stigmata) ابھر آیا تھا یا مسلم صوفی منصور حلاج کا قصہ سنیے جنھوں نے جذب کے عالم میں اناالحق (میں خدا ہوں) کا نعرہ لگا دیا تھا۔ انھیں بھی اسی طرح شہید کر دیا گیا تھا جیسے گرڈانو برونو (Giordano Bruno) کو رومی مذہبی احتساب عدالتوں کی جانب سے الحاد اور کفر کا الزام لگا کر زندہ جلا دیا گیا تھا۔ برونو کے مقدمے میں اس کے کائنات کے بارے میں سائنسی خیالات کو بہانہ بنایا گیا تھا لیکن زیادہ اہمیت اس کے ہمہ اوستی تصورات کو دی گئی تھی جو خدا کے بارے میں کلیسائی تصور سے مختلف تعبیر پیش کرتے تھے۔ اس پر جو الزامات لگائے گئے تھے ان میں الحاد اور توہینِ کلیسا کے علاوہ، ایک متوازی کائنات (parallel universe) پر ایمان رکھنے کا جرم بھی شامل تھا۔ مقدمے کے دوران برونو شدید دباؤ اور جبر کے باوجود

Marfat.com

کائنات کے بارے میں اپنے نظریات پر ڈٹا رہا۔ کوپرنیکس اور گلیلیو کو بھی وقت سے پہلے سچائی کا اعلان کر دینے کی سزا کے طور پر ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

خدا کی بھوک:
On Eating God

مذہب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان جسم بھی ہے اور روح بھی۔ یہ کوانٹم حقیقت کی طرح مادی بھی ہے اور غیر مادی بھی۔ یہ دو عناصر، خاک (زمین) اور نفس قدسی (آسمان) کا مرکب ہے۔ ایسی دورُخی ہستی کی نشوونما کے لیے لازم ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کی پرورش کا بندوبست کیا جائے۔ ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق یہ دونوں پہلو ایک ہی تسلسل کے اوپر۔ نیچے کے مقامات (up-down positions) ہیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ انسان کی بھوک دو طرح کی ہو۔ جسم کی پرورش کے لیے، جو انسان کی ذات کا طبعی یا مادی پہلو ہے، اسے خوراک میں لحمیات، معدنیات، نشاستے، پانی اور دیگر ایسے خوردنی اجزا کی ضرورت ہے جو اس کی جسمانی کارکردگی کی بنیاد بنیں۔ ڈاکٹر ہمیشہ ہمیں یہ نصیحت کرتے ہیں کہ جسم کی صحت مندانہ نشوونما کے لیے متوازن خوراک لینی چاہیے۔ جدید دور میں تو خاص طور پر متوازن غذا پر بہت زور دیا جاتا ہے اور اس کی اہمیت سے سبھی واقف ہیں۔ اسی طرح جسمانی ذات کے متوازی، انسان کی اعلاوارفع ذات کی نشوونما کے لیے روحانی غذا کی ضرورت ہے۔ یہ روحانی غذا اللہ کی حمد وثنا اور اس کے ذکر سے ملتی ہے جو دراصل انسان کی اپنی ہی ذات کی ارفع ترین سطح کا ذکر ہے۔ اس سلسلے میں جسم اور روح کے درمیان توازن قائم رکھتے ہوئے، اللہ کی صفات کو اپنا لینے کی نصیحت کی جاتی ہے۔ اس غذا کے لیے کئی ترکیبیں اور نسخے تجویز کیے گئے ہیں۔ صوفیوں، عارفوں اور بزرگوں نے انسان کی روحانی نشوونما کے لیے اللہ کے اسمائے حسنیٰ کے امتزاج کے مختلف طریقے بیان کیے ہیں۔ ''گنج العرش'' بھی ایسا ہی ایک نسخہ ہے جسے بغداد کے معروف صوفی بزرگ حضرت عبدالقادر جیلانی نے بیان کیا ہے۔ اسی طرح قدرت اللہ شہاب نے اپنی کتاب ''شہاب نامہ'' کے آخری باب میں ایک ترکیب ''کن فیکون'' کے نام سے درج کی ہے۔ اللہ کو یاد کرنا، اس کی صفات کو اپنا لینا، اسے اپنے اندر سمو لینا، انسان کی روحانی پرورش کا ذمہ دار ہے اور اسے توازن اور تکمیلِ ذات کی طرف لے جاتا ہے۔ انسانی نشوونما کے اس اہم عنصر کو نظر انداز کر دینے سے انسان کسی نامعلوم بھوک، بے نام بے چینی اور بلا کے روحانی افلاس کا شکار ہو جاتا ہے اور عدم تکمیل

Marfat.com

ذات کے نتیجے میں ناخوش گوار اور تکلیف دہ زندگی گزارنے پر مجبور پر جاتا ہے۔اگر ہمارا یہ خیال درست ہے تو لازم ہے کہ یہ نامعلوم بھوک،علمِ نفسیات، غیر معمولی نفسیات (Abnormal Psychology)اور ماورائی نفسیات(Parapsychology) کے تحت انسانی رویوں کے تحقیقی مطالعات میں بھی ظاہر ہو اور بھوک کے اس چکر(hunger cycle) کی تمام خصوصیات کو منکشف کیا جائے۔بھوک کا یہ چکر بار بار پلٹ آنے والے عمل سے عبارت ہے۔جسمانی بھوک سے روحانی بھوک تک یہ ایک ہی تسلسل ہے۔ہر ماں جانتی ہے کہ کیسے نوزائیدہ بچہ بھوک سے کرب کا شکار ہو جاتا ہے لہٰذا اسے بھوک کی تکلیف سے بچانے کے لیے وہ پہلے ہی اسے خوراک فراہم کر دیتی ہے۔ایسے بار بار اور باقاعدگی سے ملنے والی خوراک، بھوک کو ایک بند تحریکی نظام(closed motivational system) کا پابند کر دیتی ہے۔اسی طرح ہر معاشرہ اپنے افراد کی جسمانی بھوک کے چکر کو باقاعدگی اور نظم وضبط میں ڈھالنے کے لیے دن میں تین بار کھانا کھانے، خوراک کو متوازن بنانے اور مقوی اجزا کا مناسب استعمال کرنے کا نظام بناتا ہے تاکہ بھوک ایک بند تحریکی نظام میں تبدیل ہو جائے اور معاشرے کے لیے خطرناک نہ بن جائے۔معاشرے کا یہ انضباطی کردار اس قدر اہم ہوتا ہے کہ قحط جیسی صورت حال میں جب یہ نظام بکھر جاتا ہے تو معاشرہ خود بھی انتشار و بدنظمی کا شکار ہو کر خطرے کی زد میں آجاتا ہے۔بھوک،خواہ وہ کسی بھی قسم کی ہو،اس وقت تک ایک خطرناک محرک ثابت ہوتی رہتی ہے جب تک اسے لگام نہ دی جائے اور ایک باقاعدہ نظام کے ذریعے اسے ایک رُخ یا سمت عطا نہ کی جائے۔اسی طرح مذہب بھی ایک جاندار معاشرتی وظیفہ سرانجام دیتا ہے۔یہ انسان کی پیدائشی بھوک کی مختلف قسموں اور اس کی بے شمار خواہشوں میں باقاعدگی پیدا کرتا ہے جیسے ملکیت، جنس اور تشدد جیسی جبلتیں۔سب سے بڑھ کر یہ کہ مذہب انسان کی روحانی بھوک کے چکر کو منضبط کرتا ہے تاکہ انسان اپنی اس اعلا وارفع بھوک کے شدید کرب واندوہ میں مبتلا نہ ہو جائے۔یوں خاص خاص مواقع پر اللہ کو یاد کرنا، مسجد یا گرجا کا باقاعدگی سے چکر لگانا، یوم تشکر منانا، روزانہ نماز پڑھنا، یہ تمام سرگرمیاں اسی بند تحریکی نظام(closed motivational system) کے ذریعے انسان کی روحانی زندگی میں باقاعدگی اور نظم وضبط پیدا کرنے کے ذریعے ہیں تاکہ انسان تکلیف سے بچ سکے۔ہم سب جانتے ہیں کہ صحت مند زندگی گزارنے کے لیے انسان کی خوراک کا متوازن ہونا بہت ضروری ہے۔لہٰذا ہر وہ شخص جو اپنی ذات کے اس دوسرے پہلو کو نظرانداز کرتا ہے وہ ناکام رہتا ہے،اس کی خوراک مکمل نہیں ہوتی اور وہ اپنی ہی متوازی حقیقت میں قحط کا شکار ہو جاتا ہے۔ایسا شخص خود اپنے لیے ناقابلِ تلافی نقصان

Marfat.com

کا موجب بنتا ہے کیوں کہ ارتقائی حرکت میں رجعت یا پیچھے کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ خود ہماری بقا کا اصول ہے۔ اللہ انسان پر انحصار نہیں کرتا البتہ انسان کی بقا اور مسلسل نشوونما مکمل طور پر اللہ پر منحصر ہے۔

اللہ کو خود میں سمو لینے، اس کی صفات کو اپنا لینے، اسے اپنے اندر جذب کر لینے اور اپنی زندگی کی منزلِ مقصود بنا لینے کا یہ صوفیانہ تصور انسانی زندگی کے دیگر پہلوؤں پر بھی منطبق ہوتا ہے جیسے محبت، علم اور سچائی کی تلاش۔ ایسی ہر تلاش کے سفر میں انسان کو آگے بڑھنے کے لیے یونھی اپنی طلب کو خود میں سمو لینا، جذب کر لینا پڑتا ہے۔ سچائی، علم اور فلسفہ، یہ سب پنیر کے بڑے سے پیڑے کی مانند ہیں جسے ایک سانس میں نہیں نگلا جا سکتا۔ ہرگز نہیں، انھیں تھوڑا تھوڑا کر کے کترنا چکھنا اور جذب کرنا پڑتا ہے۔ ان سے مکمل فائدہ تبھی اٹھایا جا سکتا ہے جب انھیں اچھی طرح دیکھ کر، سونگھ کر، چکھ کر آہستہ آہستہ جزوِ ذات بنایا اور اپنے اندر اتار لیا جائے۔ اللہ بھی، جو انسان کی روحانی غذا ہے، اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ ایک دم بہت بڑی روحانی خوراک بھی روحانی بدہضمی اور مخموری کا باعث بن جاتی ہے اور انسان کو مریض بنا دیتی ہے۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جو گہری معنویت اور وسیع اطلاق کی حامل ہے۔ سچا عاشق اپنے محبوب کو خود میں سمو لیتا ہے، فلسفی علم کو اپنے اندر جذب کرتا ہے، صوفی خدا کو تھوڑا تھوڑا چکھتا رہتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کے متوازی جسمانی نشوونما کے لیے ضروری غذا کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک طرح کی خوراک کھانے کے لیے دوسری طرح کی خوراک کو ترک کرنا لازم نہیں۔

انا پرستانہ مقاصد کی مذمت:
Condemnation of Ego Ideals

اسلام میں بت بنانے کی شدید ممانعت ہے اور زندہ ہستیوں کو بھی اپنی آئیڈیل انا میں بدل لینے سے روکا گیا ہے کیوں کہ اس طرح وہ خدا کی جگہ لے لیتی ہیں۔ اسلام کی اس شدید ممانعت کی بنیاد اس اصول پر استوار ہوتی ہے کہ تمام مظاہر اگرچہ رجھانے اور دل موہ لینے والے ہوتے ہیں لیکن اصل میں یہ سب لغویات (alluring but frivolous) میں شمار ہوتے ہیں۔ ہر وہ شے جو ممنوع ہو، انسان اس کا خواہش مند تو ہو سکتا ہے لیکن یہ اس کے روحانی ارتقا اور انا کی نشوونما میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ ممنوعہ اشیا زیادہ پرکشش ہوتی ہیں اور ان کی خواہش بھی زیادہ ہوتی ہے، لیکن ان سے چمٹ کر رہ جانا انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ کوئی بھی شے شدید

Marfat.com

ترین وابستگی اور پرستش کے قابل نہیں ہوتی سوائے اللہ کے جو ہماری اپنی ہی ذات کا ارفع ترین مقام ہے۔انسانی نفسیات میں آموزش اور پختگی (maturation and learning) کے عمل کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ رکاوٹ اور امتناع انسانوں اور حیوانوں کی نشوونما اور تربیت کے عمل کا لازمی جزو ہیں۔عام والدین ہی کو دیکھیے کیسے وہ روزمرہ زندگی میں اپنے بچوں کی تربیت کے دوران ہدایت اور ممانعت پر مبنی احکام کے ذریعے انھیں یہ باور کراتے ہیں کہ پابندی اور اس کا صلہ بچے کی متوازن نشوونما کے لیے کتنا ضروری ہوتا ہے۔بہر حال یہ تو طے ہے کہ ہر کھیل کے کچھ اصول اور کچھ پابندیاں ہوتی ہیں اور خدا کے مقابلے میں کسی اور کو اپنا نصب العین بنانے کی پابندی تمام اعلا مذاہب میں موجود رہی ہے۔

یہ مظاہر کئی مذہبی عقائد اور رسوم کا ماخذ بن جاتے ہیں۔نر (+) اور مادہ (-) کا ملاپ کئی قدیم مذاہب میں مذہبی عقائد اور جنسی نوعیت کی رسوم کا منبع رہا ہے۔متضاد اصول کے ساتھ جنسی ملاپ کا عمل بہت اہمیت کا حامل سمجھا جاتا رہا ہے۔مردانہ عضوِ تناسل کی پرستش بھی ان رسوم کا حصہ رہی ہے۔تین ہزار پانچ سو سال پہلے ویدک آریاؤں نے لذت و انبساط (ecstacy) کی سائنس مرتب کی تھی جسے انھوں نے تنترا (Tantrum) کا نام دیا تھا۔تنترا جنسی ملاپ میں اس مکمل ہم آہنگی اور وحدت کا نام ہے جس کا تجربہ مرد اور عورت، اپنی اپنی اناؤں سے بیگانہ اور ایک دوسرے سے بالکل یک جان ہو کر کرتے ہیں۔اس عمل میں وہ اپنی اپنی خود غرض ''میں'' سے چھٹکارا پا کر ''ہم'' کی منزل تک جا پہنچتے ہیں۔تنترا کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے تضادات میں توازن قائم کرنے سے تخلیق ہوتی ہے جیسے مثبت اور منفی میں توازن، سکون اور حرکت میں توازن۔نر اور مادہ کے ملاپ میں ان تمام تضادات کا مکمل امتزاج پیدا ہوتا ہے۔اس لیے تنتری یوگی جنسی ملاپ کے عمل کو زیادہ سے زیادہ دیرپا بنانا چاہتے ہیں تاکہ تکمیل اور تضادات کے امتزاج و ہم آہنگی کے اس تجربے اور علم کو اپنی روزمرہ زندگی کا حصہ بنا سکیں۔یہی وجہ ہے کہ بھارت کے کئی قدیم مندروں میں پتھروں پر جنسی ملاپ کی تصویریں اور نقش کندہ نظر آتے ہیں۔تنترا ایک خفیہ مشق ہے جو علامتوں، تمثیلوں اور دیومالائی پہلوؤں پر مشتمل ہے اور اسے اخلاقی حکایتوں، جانوروں کی کہانیوں اور تمثیلی قصوں کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے تاہم اسے صرف چند ایک پختہ کار لوگ ہی اپنا سکتے ہیں۔اس مشق کا مقصد یہ ہے کہ انسان وحدت کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہو سکے۔جہاں ہندومت کے راسخ العقیدہ فرقے نے تیاگ کو نیکی قرار دیا وہاں تنترا کے یوگیوں نے لذت اندوزی کی عادت کو اپنایا۔انھیں یقین تھا کہ تیاگ اور ترک کے منفی مسلک کے مقابلے میں ان کا مسلک زیادہ مثبت اور بہتر ہے۔عمر

Marfat.com

خیام جیسے کئی اسلامی صوفی بھی اپنے روحانی تجربے کو شراب اور عورت سے متعلق نفسانی علامات اور درد و لذت یا ہجر و وصال جیسی اصطلاحات کی مدد سے بیان کرتے ہیں۔ یہ معرفت کی حقیقت کو سمجھانے کا ایک انوکھا طریقہ تھا جسے نہ صرف غلط سمجھا گیا بلکہ بعض اوقات اس کے انتہائی غلط نتائج بھی نکلے۔

مقدس مظاہر سے تعلق رکھنے والی بیشتر رسومات، عقائد اور تہوار وغیرہ کا آغاز تو فطرتِ الٰہی کی تفہیم کے ایک ذریعے کے طور پر ہوا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان میں بگاڑ پیدا ہوتا گیا۔ اس علامتیت کی تفصیلی وضاحت اور ان مظاہر کی پوشیدہ اہمیت کو بیان کرنے کے لیے ایک سے زیادہ مقالات کی ضرورت پڑے گی اس لیے ہم اسے یہیں چھوڑ کر اللہ کے اسمائے حسنیٰ اور خارجی دنیا میں ان کے تجسیمی مظاہر کی طرف چلتے ہیں۔

اللہ کا حرکی نظام:
THE DYNAMICS OF ALLAH
افعال اور حرکات:
Functions and Motions

جب ہم اللہ کی جوڑے دار صفات (اسمائے حسنیٰ) پر غور کرتے ہیں تو ہمیں ایک جوڑا الحیّ (زندہ، جینے والا، جاندار، حرکت کرتا ہوا) اور القیوم (ساکن، قائم و دائم، مستقل) کا بھی نظر آتا ہے۔ یہ صفات پوری طرح ایک دوسرے کا الٹ ہیں۔ ایک صفت مستقل اور ساکن رہنے کی خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری جاندار، حرکت کرتی ہوئی شے کو ظاہر کرتی ہے لیکن پھر بھی یہ دونوں صفات اصل میں ایک ہی ہیں۔ یہ تضاد صرف اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ اللہ کی ذات کا قلب (core) تو مستقل اور ساکن ہے (اسم ذات) مگر اس کا محیط، اس کا قالب (periphery) جاندار اور مسلسل متحرک (اسمائے صفات) ہے۔ اللہ کی ذات کا نہاں اور غیر مرئی حصہ (اسم ذات) قائم و دائم رہتا ہے؛ یہ حصہ اس کی ذات کا قلب ہے، اس کا باطن ہے، اس کا نیوکلیس (nucleous) ہے اور وہ نقطہ ہے جس سے ہر شے پیوست و منسلک ہے؛ جب کہ اس کی ذات کا قالب یعنی بیرونی حصہ اور دوسرے لفظوں میں اس کی ظاہری صفات ہمہ وقت متغیر اور متحرک رہتی ہیں۔ پہلی صفت مقدم (المقدّم) ہے اور دوسری صفت مؤخر (المؤخر)۔ قلب اندرونی، مرکزی اور غیر مرئی ہے (الباطن) اور قالب یا محیط بیرونی اور مرئی حرکت (الظاھر) ہے۔ قلب اثبات (+) ہے اور قالب نفی (-)۔ یوں یہ صفات کھنچاؤ (push) اور دباؤ (pull) کے رشتے میں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان

Marfat.com

میں سے ایک قوت باہر کو نکل بھاگتی ہے (المبدی) اور دوسری اندر کی جانب کھینچتی اور روکتی (المعید) ہے۔ اللہ کی یہ دونوں قوتیں توازن کی حالت میں ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے مساوی تعامل کرتی ہیں اور اس لیے ایک درجہ وار بلند ہوتے ہوئے مرکز کے اردگرد مسلسل جاری رہنے والی گردش کا موجب بنتی ہیں۔ مخلوقات دور کھنچتی ہیں، باہر کو نکل بھاگتی ہیں مگر قلب اپنی قوت سے انھیں اندر کی جانب روکتا ہے یوں وحدت کی یہ حرکت ایک ابھرتے ہوئے مرکز کے گرد ایک مسلسل گردش پیدا کرتی رہتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسی گردشی حرکت (spiral) وجود میں آتی ہے جس کا نقطۂ آغاز اور نقطۂ اختتام ایک ہی ہے۔ اس لیے وحدت کی یہ حرکت بیک وقت پہلی (الاوّل) بھی ہوتی ہے اور آخری (الآخر) بھی۔ ہر اختتام، ہر انجام، ایک نئی ابتدا، نیا آغاز بن جاتا ہے مگر ایک بلند تر سطح پر۔ یوں ایک مستقل اور درجہ بند قلب کے گرد قالب کی یہ حرکت دائمی طور پر جاری رہتی ہے۔ سادہ الفاظ میں یہ وحدت کی حرکت کا بنیادی اصول ہے۔

تکرار، اعادہ اور تقلید

Repitition, Recapitulaion,Emulation

تمام زمینی اجسام، ہر ایٹم، ہر وجود، زندگی کی ہر سطح پر حرکت اور تبدیلی کے انھی اصولوں کی پیروی کرتا ہے۔ وحدت کی یہی حرکت تنوع کا سرچشمہ ہے؛ اسی سے غیر معمولی اور عظیم کثرت اور پیچیدگی جنم لیتی ہے، مسلسل جدت عمل میں آتی ہے اور ہر لحظہ نئی اشکال اور نئے مظاہر وجود میں آتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے کئی مذاہب میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ زمانۂ قدیم سے ویدک اور بدھ لاما، چکرا (wheel, cycle)، کنڈلی (spiral)، ناموّ (appearance of deity)، آواگون (incarnation)، تجدیدِ شباب (rejuvenation) اور نئے جنم (rebirth) وغیرہ کا تصور پیش کرتے آئے ہیں جو الوہی تجربے کو بیان کرنے کی کوششیں ہیں۔ بلند ہوتے ہوئے چکر دار مندر، گرجا اور مساجد کے گنبد اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ صوفیانہ شاعری اور کہانیوں میں اکثر چرخے اور چکی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ مذہب کا لوک اظہار (folkloric expression) ہے۔ ہندو ویدانتی صوفیوں کے نظریات خدا کے ابتدائی تصور کا پتا دیتے ہیں۔ وشنو تمام خداؤں کا خدا ہے۔ وہ سب سے بڑا خدا ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور، ہر شے کا علم رکھنے والا، ہر جگہ حاضر و موجود اور ہر شے کو قائم رکھنے والا ہے۔ وہ ہر شے کا باطن، اس کا مرکز ہے جو ہر شے کے اندر

Marfat.com

موجود ہے لیکن اس کے لاتعداد نام ہیں۔ وشنو کے ایک ہزار نام ایسے ہیں جن کا ورد کیا جاتا ہے اور ان ہزار ناموں کی لاتعداد تفسیریں ہیں جن میں ان کی معنویت بیان کی جاتی ہے۔ وشنو کا یہ غیر مرئی باطن کئی روپ دھار کر دنیا میں آتا ہے جنھیں اوتار کہا جاتا ہے۔ یہ اوتار وشنو کے محض دنیاوی مظاہر ہیں، وہ خود ابدی، ناقابلِ تغیر اور قائم و دائم ہے۔

See google images for spiral, cathederal, budhist temples, kundli

ایک مستقل باطنی مرکز کے اردگرد وحدت کی یہ مسلسل بیرونی گردش وحدت کی کئی منازل اور سطحیں پیدا کر دیتی ہے۔ اس گردش کے نتیجے میں وحدت کے کم و بیش پر مشتمل لامتناہی درجات (continuum of unity) وجود میں آتے ہیں۔ اس گردش کا حاصل مظاہرِ حقیقت کا ایک متنوع، کثیر جہتی، لحظہ بہ لحظہ بدلتا ہوا اور اسی لیے عارضی اور ناپائیدار تسلسل ہے۔ پائیدار اور مستقل صرف وہ اندرونی مرکز ہے؛ اس کے سوا کچھ نہیں۔ جوں جوں وحدت کی بیرونی گردش کا یہ سلسلہ وحدت کی نت نئی سطحوں اور درجوں کو بے نقاب کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے، توں توں پرانے مظاہر نئے مظاہر میں بدلتے جاتے ہیں۔ سورج کی گردش ہو، غیر محسوس طریقے سے موسموں کا بدلتے رہنا ہو، دن کا دھیرے دھیرے اور بتدریج آگے بڑھنا ہو، سمندر کی کیفیات ہوں یا کسی ایک زندگی کی آہستہ رو نشوونما ہو، ہر چیز اسی مسلسل حرکت اور تبدیلی کے اصول کی تابع ہے۔ ان سب چیزوں میں وحدت کے مختلف درجے رونما ہوتے ہیں۔ ہر شے بدلتی ہے، خواہ یہ تبدیلی کتنی ہی غیر محسوس اور بتدریج کیوں نہ ہو۔

دوطرفہ وحدت:
Bi-Polar Unity

وحدت کا چکر دو قطبی (bi-polar) ہے۔ مثبت (+) اور منفی (-) اس کے دو کنارے ہیں۔ حقیقت کا ذرہ ذرہ اللہ کی فطرت کے دوطرفہ یا دو قطبی ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ ان قطبین کی کھنچاؤ (pull) اور دباؤ (push) کی قوتیں کائناتی جنریٹر کی طرح عمل کرتی ہیں اور مسلسل گردشی حرکت کے ذریعے توانائی پیدا کرتی ہیں جیسے روشنی، حرارت اور نور یعنی روحانی توانائی۔ یہی کائناتی جنریٹر، کششِ ثقل، برقی مقناطیسی قوت، ایٹمی ری ایکٹر اور روحانی توانائی کے جنریٹر کائنات اور اس میں موجود ہر شے کی زندگی کے قیام کے ذمہ دار ہیں۔

Marfat.com

وحدت کے ابعاد:
Dimensions of Unity

صوفی اور عارف اللہ کے ننانوے ناموں کو چار ابعاد میں تقسیم کرتے ہیں:

ملال: یہ اسما اللہ کی ناخوشی، ناپسندیدگی اور رنج و آزردگی کے سبھی پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں۔

جلال: یہ وہ اسما ہیں جو اللہ کی عظمت، اس کی شان و شوکت، جاہ و جلال، طاقت و قوت اور اس کی سبھی مرعوب کن، امتیازی صفات کا اظہار کرتے ہیں۔

کمال: یہ وہ نام ہیں جو اللہ کے کامل، مطلق اور عمدہ ترین ہونے اور اس کے افعال، استعداد اور قوت کے بہترین، عظیم ترین، مکمل، پختہ ترین اور اتمامی ہونے کی صفات کو بیان کرتے ہیں۔

جمال: یہ نام اللہ کی ذات کے تمام جمالیاتی پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں اور اس کے حسن، مسرت انگیزی، نفاست، خوش وضعی اور شائستگی کا اظہار کرتے ہیں۔

عارف، یعنی وہ لوگ جو اللہ کی معرفت اور پہچان رکھتے ہیں، اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کے ننانوے ناموں کو مجموعی طور پر ان چاروں اقسام کے زمرے میں رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی خصوصیات کی بے پایاں وسعت، تحیر انگیز تنوع، مرعوب کن افراط، ناقابلِ رسائی فوقیت، ہنرمندی، قوت اور کمال اس چہار پہلو سلسلے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر حقیقت انھی چار الوہی ابعاد کا مظہر ہے۔ شمال، جنوب، مشرق اور مغرب کرۂ ارض کے چار ابعاد ہیں۔ اگرچہ گلوب پر اور بھی کئی ابعاد یا اطراف موجود ہیں مگر بنیادی سمتیں یہی چار ہیں۔ اسی طرح وحدت کے چار پہلو، محبت، نفرت، مہارت اور نفاست ہیں جو صورت و ہیئت کی دنیا میں رونما ہوتے ہیں۔ یہ پہلو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور چار ابعادی حقیقت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ صوفی بھی فنائے نفس کے سفر میں معرفت کی چار منزلوں سے گزرتا ہے؛ ۱۔ شریعت یعنی تقلیدِ پیغمبر ۲۔ طریقت یعنی چند منتخب افراد کی جدّت، ۳۔ حقیقت یعنی مرئی اور غیر مرئی کی فطرت کا حقیقی فہم و ادراک اور ۴۔ معرفت یعنی خدا کا براہ راست علم اور آگہی۔

ٹیٹرا (tetra) کا لفظ یونانی الاصل ہے اور اس کا مطلب ہے چار۔ یہودیت میں خدا کے لیے ٹیٹرا گرامتون (Tetragrammaton) کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا جو بعد میں تبدیل ہو کر ایک چار حرفی لفظ

Marfat.com

''یہوہ'' (YHWA) کی صورت اختیار کر گیا۔ یہ چار حرفی لفظ اس بات کا نشان سمجھا جاتا ہے کہ اس مذہب کی بنیاد توحیدِ ناقص (Henotheism) پر تھی جس میں ایک خدا کو برتر مان کر ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی شریکِ عبادت کر لیا جاتا ہے۔ انجیل کے کئی تراجم میں بھی لفظ لارڈ (LORD) تمام بڑے حروف میں لکھا جاتا ہے جس سے اس لفظ کا چہار ابعادی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ عیسائیت اور یہودیت دونوں چار ابعادی روحانی حقیقت پر ایمان رکھتی ہیں۔ ظرفِ عشائے ربانی (monstrance)، صلیب (cross)، انجیل کے چار دفتر (gospels) سب اسی عقیدے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ حضرت محمدؐ کے کئی قریبی اصحاب اور رفقا موجود تھے مگر ان میں سے چار ایسے ہیں جنھیں چار یار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان چاروں میں حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت ابوبکرؓ شامل ہیں جن میں سے ہر ایک امتیازی صفات کا مالک ہے بالکل جیسے کرۂ ارض کی چار سمتیں امتیازی خصائص کی مالک ہیں۔ عثمانؓ اپنی سخاوت اور غنا کے لیے، علیؓ علم و معرفت کے لیے، عمرؓ مجاہدے اور ابوبکرؓ مشاہدے کے لیے معروف ہیں۔ ویدک مذاہب میں تین اعلاترین دیوتاؤں یعنی گنیش، برہما اور وشنو کو چار بازوؤں والا دکھایا جاتا ہے اور یہ چاروں بازو ایک ہی ہستی کے چار پہلوؤں کی علامت ہیں۔ برہما کو چترمکھا کہا جاتا ہے جس کا لغوی مطلب ہے چار چہروں والا۔ وشنو کے چار بازو ہیں اور اس کے چاروں ہاتھوں میں ایک چہار پہلو علامتی نشان ہوتا ہے جو وشنو دیوتا کے چار چہروں اور افعال کو ظاہر کرتا ہے۔ بدھ مت میں بھی چار بے صورت اعلاتر آفاق پر یقین رکھا جاتا ہے اور بدھ مت کی کئی علامتوں میں سے ایک علامت کنول کے پھول کی ہے جس کی چار پتیاں ہوتی ہیں۔ یوں آریاؤں کی ابتدائی سواستکا سے لے کر جدید عیسائیت کے متنوع صلیبی نشانات، ظرف عشائے ربانی، اور ہمارے مذاہب کے بے شمار آثار، سب اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے مذاہب میں خدا کا تصور بھی چار پہلوؤں یا ابعاد پر بنیاد رکھتا ہے۔ ان پہلوؤں یا ابعاد میں باہمی فرق ان کی نوعیت (quality) کا نہیں، درجے (gradient) کا ہے۔ ہر شے جو وجود رکھتی ہے، اسی ایک عظیم ہستی کے کسی نہ کسی درجے یا اس کی تبدیل شدہ صورت کا اظہار ہے۔

Marfat.com

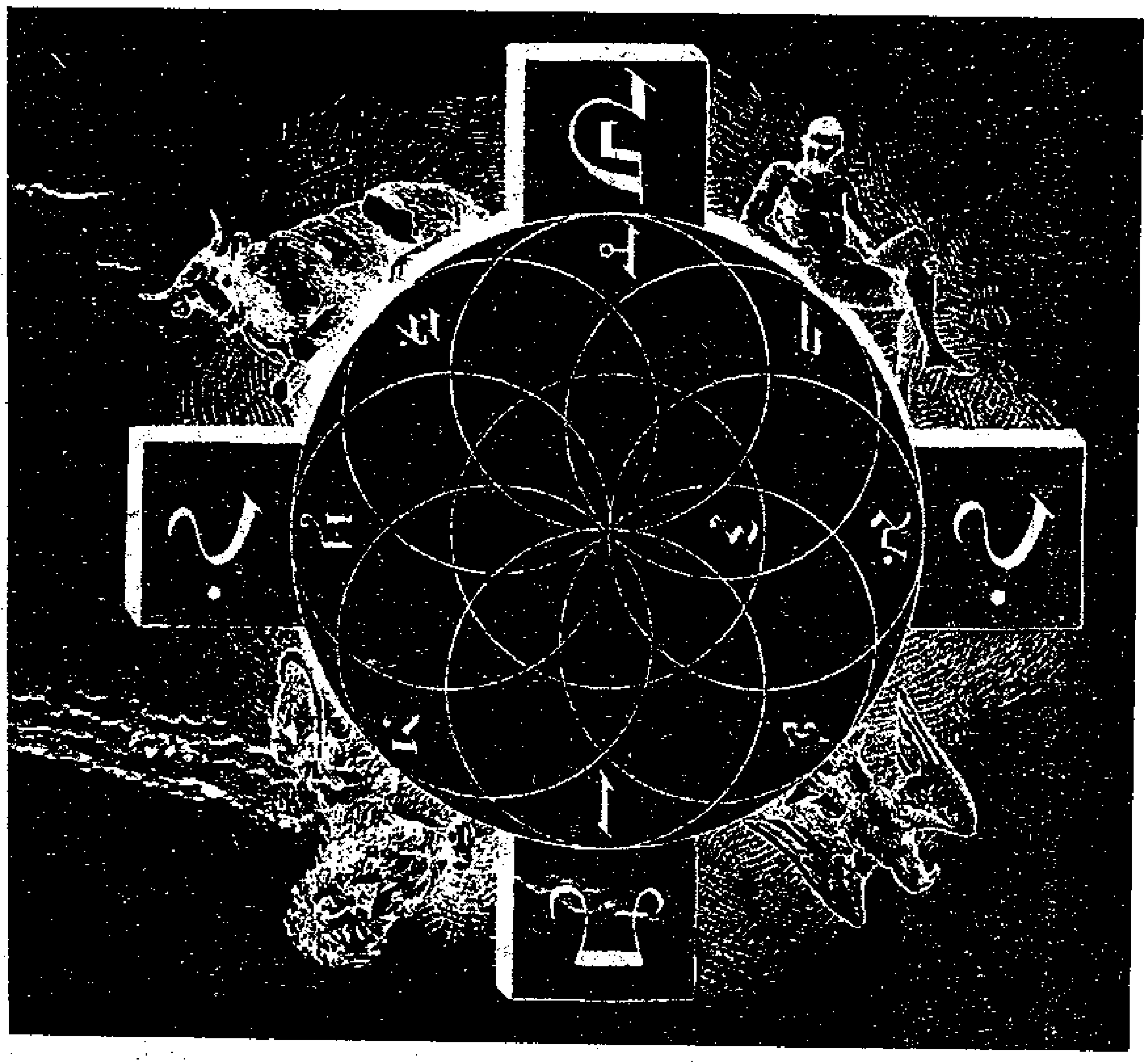

صلیب، دائرہ اور گلاب

دنیا کی تشریح وتوضیح کے لیے یہی تین علامات کافی ہیں، صلیب، دائرہ اور گلاب ۔ کئی پراسرار خفیہ تنظیموں اور مذاہب نے اس نوع کی علامتیت کو اختیار کیا ہے جو بہت پرکشش معلوم ہوتی ہے مگر اس کی بھرپور سائنسی معنویت ابھی تک روشن نہیں ہوئی۔

Cross, Circle and Rose

A cross , circle and rose are all that is needed to explain the world. Many secret societies and religions have cultivated such symbolism which is indeed fascinating but its full scientific significance is yet to be understood.

Marfat.com

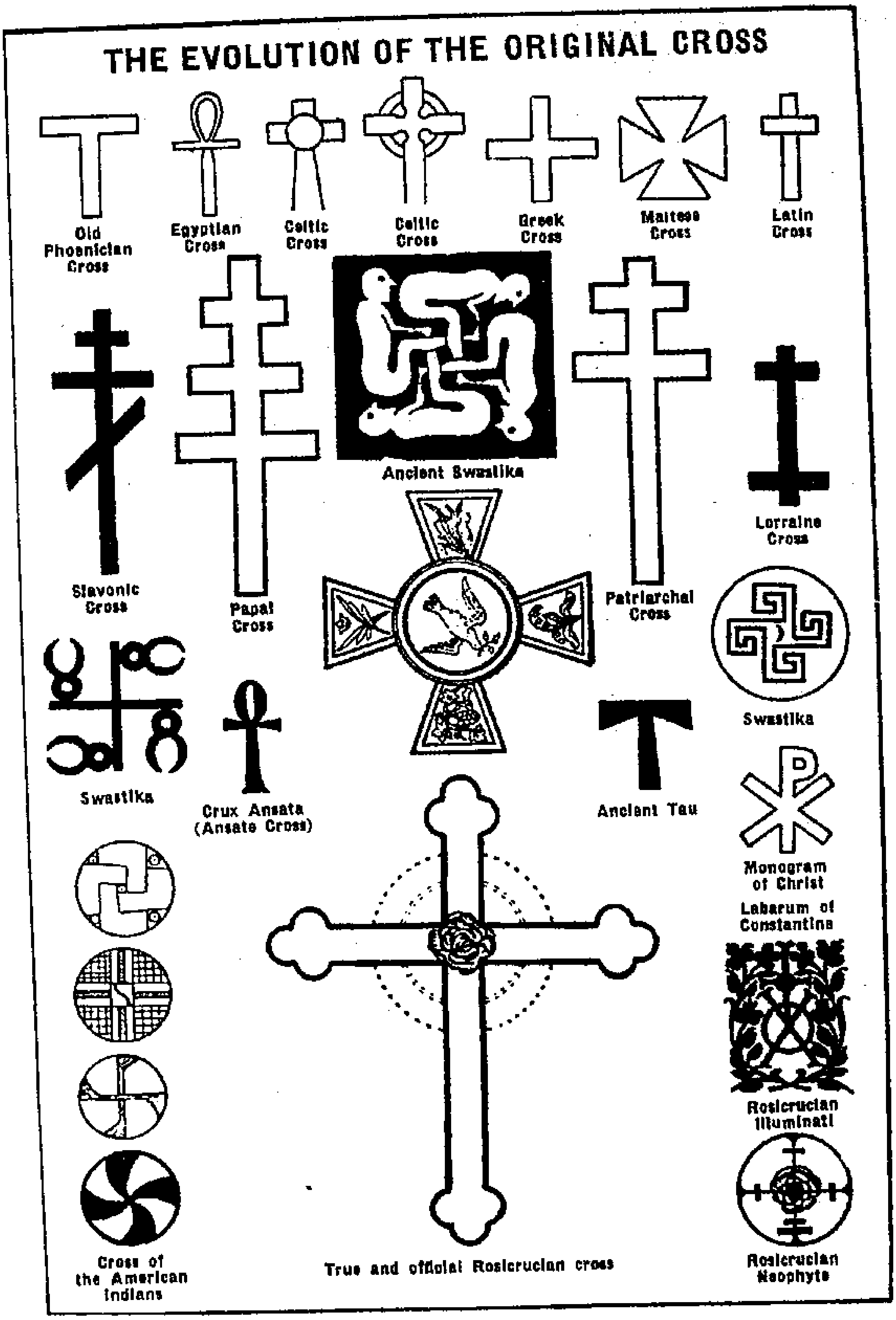

843

صلیب کا ارتقائی سفر

مسیحی اور Rosicrusian فرقے کی صلیب کے ارتقائی مراحل

Evolution of the Original Cross

The evolution of the Christian and Rosicrusian Cross.

Marfat.com

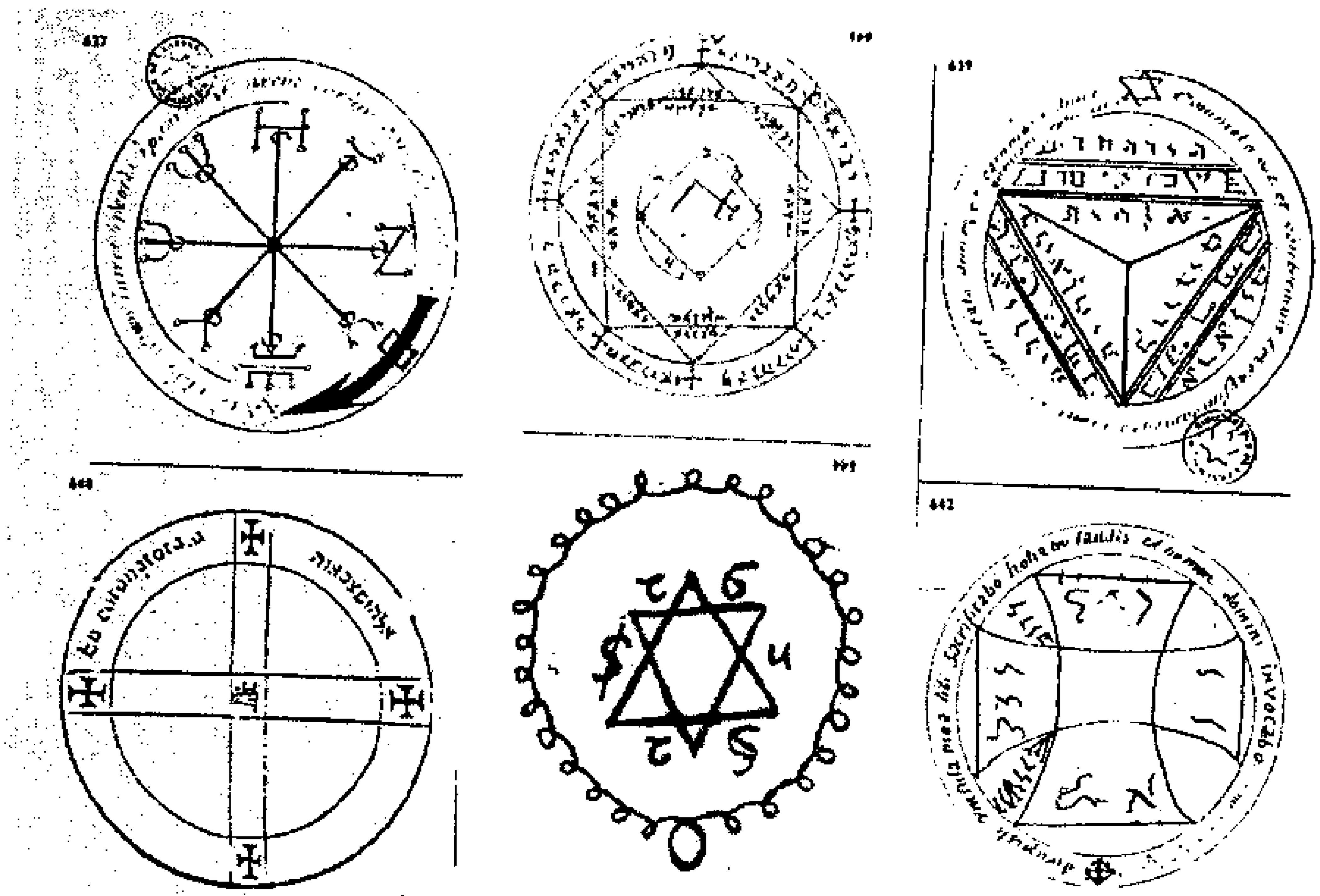

طلسم

انگریزی لفظ talisman عربی کے 'طلسم' سے نکلا ہے جس سے ایسی شے مراد ہے جو شر اور مرض کے خلاف مدافعت اور تحفظ کی ضمانت ہے۔ طلسم کا تصور زمانہ قدیم سے پتھروں میں کھدے ہوئے نقوش کے ذریعے ظاہر کیا جاتا رہا ہے۔ ان طلسمات کی اچھی خاصی تعداد کا ماخذ یہودیت ہے مگر یہ کسی ایک مذہب یا فرقے تک محدود نہیں رہے۔

Talism

The English word talisman comes from the Arabic 'talism' or tilsam meaning an object that is capable of ensuring protection , guarding against evil or desease. Talisman have been known from very ancient times covered with inscriptions. A good number of such talisman are of jewish origin but in no way limited to any one religion or cult.

کائنات اگرچہ اللہ نہیں ہے مگر یہ اس کی تجلی کے بتدریج اظہار کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ظاہری تنوع اور کثرت تو مختلف طرح کے امتزاج، عمل اور ردعمل، درجوں، اللہ کی صفات کی سطحوں اور اس کے افعال کے مرحلوں سے وجود میں آتی ہے جو خود بھی الوہیت کی تجلیات کے مظاہر ہیں۔ انسانی نسلوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ زرد، گندمی، سفید اور سیاہ فام ہیں۔ یہ انسانی نسل کے چار بنیادی ابعاد ہیں۔ انھی چار نسلوں کے حرکی امتزاج کے مختلف درجوں، منزلوں اور مرحلوں کے نتیجے میں، زبان، کلچر، ماحول اور مسکن کے بے شمار متنوع امکانات وجود میں آتے ہیں اور خدا کی اصل فطرت کو ظاہر کرتے ہیں۔

Marfat.com

تصوف کا نظریۂ وحدت الوجود:
The Sufi Doctrine of Wahdat-al Wujud

یہ وہ فلسفہ ہے جسے مشرق کے مکتبۂ وحدت الوجود نے بیان کیا ہے۔ وحدت الوجود کا لغوی مطلب بھی یہی ہے؛ یعنی اللہ کی ہستی کی وحدت۔ اس کا بنیادی تصور یہ نہیں ہے کہ ہر مظہرِ کائنات، خواہ وہ بلّی ہو، پھول ہو، سورج ہو یا چاند، اللہ ہے۔ اس کے بالکل برعکس جن فلسفیوں نے یہ نظریہ پیش کیا تھا وہ اس قدر کٹر توحید پرست تھے کہ کسی پیغمبر کو بھی خدا کے مساوی درجہ دینے پر تیار نہ تھے، یہاں تک کہ حضرت محمدؐ کو بھی؛ جنھیں وہ ہر ہستی سے زیادہ محترم سمجھتے تھے اور جن کے وہ پیروکار بھی تھے، خدا سمجھنے یا خدا کے برابر گرداننے سے انتہائی شدت اور سختی سے منع کرتے تھے۔ اسلام نے وقت گزرنے کے باوجود اس بارے میں کبھی کسی لچک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ان ابتدائی عارفوں اور صاحبانِ نظر نے انسانی تجسیم، الوہیت کے مادی مظاہر، تصویر کشی، بت تراشی اور پیغمبروں کو خدائی مقام دینے جیسی ہر حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ایسی باتوں کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ حضرت عیسیٰ پر یقین رکھتے تھے اور انھیں روح اللہ کے بلند مقام پر فائز کرتے تھے لیکن عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ کی شبیہ بنانے، اسے صلیب پر نقش کرنے اور کلیسا میں آویزاں کرنے کے سخت خلاف تھے۔

وحدت الوجود کا فلسفہ یہ تھا کہ اس ظاہری کائنات میں کوئی شے بھی خدا نہیں ہے لیکن ہر شے ایک ہی ہستی کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے اور اپنے وجود کے لیے اللہ ہی کی محتاج ہے جو ہر وجود کا مرکز ہے۔ جیسے پھول، زندگی، زمین اور چاند؛ یہ سب سورج نہیں ہیں لیکن اپنی ہستی کے لیے سورج کی توانائی کے محتاج ہیں۔

مشرقی صوفیہ حق کا تجربہ کرنے اور اسے اپنی زندگی میں سمونے کے لیے اللہ کے اسمائے حسنیٰ کا ورد کرتے ہیں (ذکر اللہ) اور انھوں نے اپنے اور وجودِ مطلق کے ایک ہو جانے کے اس تجربے کو بیان بھی کیا ہے۔ یہ صوفیہ اس بات پر متفق ہیں کہ وحدت کے چار درجے یا سطحیں ہیں۔ ان کی مثال کرۂ ارض سے ملتی ہے جس کے اردگرد کرۂ ہوائی کے چار طبقات موجود ہیں؛ یعنی کرۂ متغیرہ (troposphere)، کرۂ قائمہ (stratosphere)، کرۂ میان (meosphere) اور کرۂ حرارت (thermosphere)۔ یہ چاروں کرّے صعودی ترتیب (ascending order) میں ہیں جو مسلسل بلندی کی طرف بڑھتے ہوئے یکے بعد دیگرے، بتدریج نمودار ہوتے ہیں اور کئی میل تک کرۂ ارض کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ صوفیہ کے نزدیک ایسے ہی چار منطقے

Marfat.com

وحدت کے بھی ہیں:

عالمِ ناسوت: جسمانی دنیا

عالمِ ملکوت: جسمانی دنیا کے بالکل اوپر موجود منطقہ

عالمِ جبروت: قوت کی دنیا، عرش

عالمِ لاہوت اور ہاہوت: الوہیت اور اس لامتناہی ہستی کی دنیا

یہ تمام منطقے جو ہستیِ مطلق کا حصہ ہیں، اپنے وسیع ترین معنوں میں، اس پورے عالمِ کون و مکاں کی تشکیل کرتے ہیں۔ بدھ مت میں چار قسم کے آروپایے دھاتو دیواس (Arupyadhatu Devas) ہیں اور ان کے بالمقابل آروپادھایاناس (Arupadhyanas) ہیں۔ پہلا منطقہ وہ ہے جہاں ادراک ہے نہ عدم ادراک (neither perception nor non-perception)، دوسرا منطقہ معدومیت (nothingness) کا ہے، تیسرا منطقہ لامتناہی شعور و آگاہی (infinite consciousness) کا ہے اور چوتھا منطقہ لامحدود مکان یا عدم (infinite space or nothingness) کا ہے۔

ایک معاصر مشرقی صوفی Frithjof Schuan اپنی کتاب *Dimensions of Islam* میں لکھتے ہیں: ''کائنات خدائی اقلیموں کا نظامِ مراتب (hierarchy of divine dominion) ہے۔ اس نظام کا ارفع ترین درجہ وہ ہے جہاں خدا سب سے زیادہ موجود ہے اور ارضی یا جسمانی سطح وہ ہے جہاں خدا سب سے کم موجود یا سب سے زیادہ غیر موجود ہے۔'' ان چاروں اقلیموں میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ محض خدا کے ہونے یا نہ ہونے یا کم اور زیادہ ہونے (gradation) سے متعلق ہے۔

عظیم اسلامی عالم ابن عربی ان اقلیموں کی صرف دو مجموعی قسمیں بیان کرتے ہیں؛ عالم الملک یعنی مظاہر کی دنیا اور عالم الملکوت یعنی عالمِ اسرار۔ اس کے ہاں جبروت اور ملکوت باہمی طور پر متبدل پذیر ہیں اور لاہوت اور یاہوت عالمِ اسرار میں واقع ہیں۔ قرآن میں بھی بار بار عالمِ شہادت اور عالم الغیب کا ذکر ملتا ہے جو ابن عربی کی بتائی ہوئی اقسام سے مطابقت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صوفیہ کے بتائے گئے دیگر عالم انھی دو عالموں؛ یعنی مرئی اور غیر مرئی دنیا کے مختلف مدارج یا پہلو ہوں گے۔

اگر کچھ وسطی مقامات یا مدارج کو پیش نظر رکھا جائے تو صوفیہ کی اصطلاحات اور ان کے عالموں کی تعداد یا

Marfat.com

درجات میں کچھ اختلاف ہو سکتا ہے۔ کہیں وحدت الوجود کے دو مجموعی عالم تصور کیے جاتے ہیں، کہیں اس کے چار پہلوؤں کا ذکر ہوتا ہے، کہیں وحدت کے پانچ یا سات مراتب بیان کیے جاتے ہیں لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ یہ سب ایک ہی حقیقت کے مختلف ابعاد ہیں۔

چار ابعاد:
Four Dimensions

ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ اللہ کی صفات اس کی تخلیقات میں کیسے ظاہر ہوتی ہیں۔ شمسی نظام کی حرکت چاروں موسموں؛ گرما، سرما، بہار اور خزاں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک دن کے چار حصے ہوتے ہیں؛ رات دن، صبح، شام۔ زمین کی چار سمتیں ہیں؛ شمال، جنوب، مشرق اور مغرب۔ بنیادی عناصر چار ہیں؛ آگ، پانی، ہوا اور مٹی۔ عمر کی چار منزلیں ہوتی ہیں، پیدائش، موت، جوانی، بڑھاپا۔ اسی طرح سائنس میں بھی ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر کیمسٹری میں ٹیٹرا نیوٹرون (tetra neutron) چار نیوٹرونوں کے ایک گچھے پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنی جگہ اتنے مستحکم ہوتے ہیں کہ انھیں ایٹم کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ فزکس میں چار بنیادی قوتیں ہوتی ہیں اور جدید فزکس کا سب سے بڑا مسئلہ، جس پر آئن اسٹائن بھی غور کرتا رہا، یہ ہے کہ ان چاروں قوتوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیسے کیا جائے۔ ماحولیاتی سائنس چار بڑے حیاتی ۔ کیمیائی چکروں (bio-chemical cycles) کی بات کرتی ہے جنھیں سمجھنا ماحولیات کو جاننے کے لیے ناگزیر ہے؛ یعنی کاربن، پانی، نائٹروجن اور فاسفورس۔ بنیادی رنگ بھی چار ہیں؛ سرخ، سبز، نیلا اور پیلا۔ اگرچہ ان رنگوں کے امتزاج سے لاتعداد رنگ اور ان کے شیڈ وجود میں آ سکتے ہیں لیکن یہ سارے ہلکے اور گہرے رنگ انھی چار بنیادی رنگوں کے مختلف تناسب میں آپس میں ملنے سے بنتے ہیں جو ایک طرف ٹھنڈے ٹھنڈے سبز اور نیلے طیف سے شروع ہوتے ہیں اور دوسری انتہا پر گرمجوش سرخ اور نارنجی تک جا پہنچتے ہیں۔ اللہ کی تمام صفات بھی اسی طرح چار بنیادی نوعیت کی دو طرفہ صفات کے مختلف تناسب میں امتزاج سے وجود میں آتی ہیں اور ہر حقیقت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان پہلوؤں میں امتیاز یا اختلاف نوعیت یا ماہیت کا نہیں بلکہ ان کے درجے کا ہے۔ ہر شے جو وجود رکھتی ہے، وہ ایک ہی عظیم ہستی کی تبدیل شدہ صورت (transformation) ہے، ایک درجہ ہے، ایک لطیف اور نفیس امتزاج ہے۔

Marfat.com

اللہ کی صفات اسی حقیقت کا اظہار ہیں:
Allah's Qualities Reveal

اگر یہ سچ ہے تو لازم ہے کہ اللہ کی صفات ان چار ابعاد کو ظاہر کریں۔ اللہ کے ان ناموں میں سے کچھ طبعی خصوصیات کے مالک ہوں، کچھ حیاتیاتی نوعیت کے ہوں، کچھ انسانی صفات کے مظہر ہوں اور کچھ الوہی قوتوں کو پیش کریں۔ اسی طرح اللہ کے اسمائے افعال کا عکس اس کی تخلیق میں نظر آنا چاہیے۔ لہٰذا لازم ہے کہ اللہ کے اسمائے افعال سے حرکت، قوت، روشنی، توانائی، استقلال، وظائف، ارتقا، ہیئت، جدّت، سمٹاؤ، پھیلاؤ، قبض، بسط، بقا، تحفظ، بحالی، قدر پیمائی، قیمت، سبب، محرک، ترغیب، تقسیم، ضرب اور دیگر کارہائے نمایاں کا بھی اظہار ہو۔ میں قارئین کو دعوت دیتا ہوں کہ از راہِ مہربانی ایک مرتبہ پھر اللہ کے عربی اسمائے حسنیٰ کا مطالعہ کریں۔ یہ حقیقت کے مختلف پہلوؤں اور الوہی صفات کو بیان کرتے ہیں۔

سرگم:
The Octave

سرگم کے اتار چڑھاؤ کی طرح حرکت کے بھی سات مرحلے ہیں۔ سرگم میں جب ایک چکر مکمل ہو جاتا ہے تو ایک نئے بلند تر مرکز کے گرد ایک نیا چکر شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال پیانو کے سروں یا سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی کی طرح ہے یا پھر رنگوں کی قوسِ قزح (vibgyor) کی طرح جس میں جامنی، بنفشی، نیلا، سبز، پیلا، نارنجی اور سرخ رنگ اسی ترتیب سے نمودار ہوتے ہیں۔ یہ اسحاق نیوٹن کے قوسِ قزح کے سات رنگ ہیں۔ اگر ان کے درمیانی رنگوں (secondary colours) کو بھی شامل کریں تو قوسِ قزح کے بارہ رنگ بنتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانی نے تصوف کے موضوع پر اپنے ایک رسالے ''سرّ الاسرار'' میں اللہ کی صفات کو سات صعودی درجوں (ascending levels) میں تقسیم کیا ہے۔ ان بنیادی ناموں کو شیخ نے اسمائے توحیدی کہا ہے جس کا لغوی مطلب ہے ''وحدت کے نام''۔ سفید روشنی کی طرح؛ جو اپنے اندر قوسِ قزح کے ساتوں رنگ سمو لیتی ہے، اور جسے سب رنگوں کا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے، وحدت کے یہ نام بھی اسمائے الٰہی کے کئی اور سلسلوں کا ماخذ بنتے ہیں۔ ان میں سے کل بارہ اسما ایسے ہیں جن کا ورد مشتاق صوفی کرتا ہے۔ یعنی تین مراحل سے گزرنے کے دوران ہر مرحلے پر چار اسما کا ورد کیا جاتا ہے۔ یہ بارہ اسما، هُو، حیُّ، واحدُ، عزیزُ، ودودُ، حقُّ، قھّارُ، قیّومُ، وھابُ، مھیمنُ، اور باسطُ ہیں۔ ان ناموں کے آخر میں آنے والا

Marfat.com

''پیش'' (''او'' کی آواز) دراصل ندائیہ ہے جو کسی کو مخاطب کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ موسیقی کے سرگم اور رنگوں کی قوسِ قزح سے ان ناموں کی مماثلت بالکل واضح ہے۔ سرگم کے بھی سات بنیادی سُر ہیں۔ ویدک فلسفے میں اسے ''سپتک'' یعنی سات کہا جاتا ہے۔ ان سات بنیادی سُروں کی آواز سے پانچ درمیانی یا وسطی نصف سُر بھی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ پانچ نصف سُر سات بنیادی سُروں کے ساتھ مل کر بارہ سُر مکمل کرتے ہیں۔ یہ بارہ سر مختلف قسم کی صعودی (ascending) اور نزولی (descending) ترتیب، امتزاج، آمیزش اور درجہ بندی سے موسیقی کا ایک لامحدود جہان تخلیق کرتے ہیں۔ یوں اس صوفیانہ تصور کی مثال بن جاتے ہیں جس کے مطابق روحانی دنیا میں اللہ کے لاتعداد نام ہیں۔ قدیم ویدک عقیدے کے مطابق یہ کلیہ ہر حقیقت پر منطبق ہوتا ہے جیسے شادی کے سات پھیرے، سات جنم اور یوگا کے سات چکرا وغیرہ۔ شیخ کا کہنا ہے کہ اللہ کے بارہ بنیادی نام بارہ چشموں، حضرت ابراہیم کے بارہ قبیلوں اور؛ اسی کلیے کی توسیع کریں تو، حضرت عیسیٰ کے بارہ حواریوں اور حضرت محمدؐ کی بارہ بیویوں تک جا پہنچتے ہیں۔

See google images of Rose on Church windows and floor plans of cathederals

دوری جدول (periodic table) میں عناصر کی سات قطاریں ہیں جنھیں ماہرینِ طبیعیات نے بڑی محنت، ریاضت اور جدوجہد سے تحقیق کر کے، حقیقت کے طبعی پہلو کا سراغ لگانے کے لیے ترتیب دیا ہے۔ اسی طرح اسمائے حسنیٰ کے یہ درجے روحانی ماہرین پر وجدانی طور پر منکشف ہوئے ہیں جن کی تحقیق کے لیے مشرق کے صوفیوں نے اپنی زندگیاں صرف کر دی ہیں۔ یوں تحقیق اور کشف و وجدان ایک دوسرے کے متضاد پہلو بن جاتے ہیں جو مل کر وحدت بنتے اور وحدت کو مکمل کرتے ہیں۔ عناصر کی سات رویہ ترتیب اور اسمائے حسنیٰ کے سات درجے واضح طور پر ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ سائنس دانوں نے دو ہزار سال کے طویل عرصے میں جو ایک سو تین عناصر دریافت کیے ہیں وہ اصل میں ایک ہی بنیادی عنصر کی حرکت، اس کے امتزاج، آمیزش، ترتیب و درجہ بندی، اعلیٰ و ادنیٰ درجے کی یکجائی اور جدائی کا نتیجہ ہے جو اس پوری طبعی کائنات کو تعمیر کرتا ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ امتزاج و ترکیب کے یہ امکانات لامحدود ہیں اور ابھی دریافت کا عمل جاری ہے۔ اسی طرح اللہ کے یہ ننانوے نام جنھیں بغداد کے عظیم صوفی شیخ عبدالقادر جیلانی نے سات درجوں میں تقسیم کیا ہے، اللہ کی پوری اقلیم کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ یہ مرئی اور غیر مرئی دنیا کی دو متوازی حقیقتیں ہیں اور ان دونوں کے درمیان نمایاں مماثلت پائی جاتی ہے کیوں کہ یہ دونوں حقیقت کے ایک ہی تسلسل کے دو کنارے ہیں جو طبعی سے لے کر روحانی انتہا تک پہنچتا ہے۔ ''سات'' کے لفظ کو گوگل کر کے دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کیسے روم کی سات پہاڑیوں سے

Marfat.com

لے کر دنیا کے سات عجوبوں تک، عیسیٰ کے سات آخری الفاظ سے لے کر قرآن کی پہلی سورۃ الفاتحہ کی سات آیات تک، کنواری مریم کے سات دکھوں سے لے کر سات نیکیوں اور سات گناہوں تک، یہ ہندسہ عیسائیت، یہودیت، اسلام اور ہندومت کے مختلف مظاہر میں تسلسل سے استعمال ہوتا رہا ہے۔اسی طرح مینارِ موسیٰ (Menorah of Mosses) اور سات شاخوں والا شمع دان جو تین ہزار سال سے یہودیت کی علامت رہا ہے،اس کی مثال ہیں۔ ہندومت میں شادی کے سات پھیرے اور سات جنم ہوتے ہیں۔(مغل شہنشاہ بابر نے بھی اپنے بیمار بیٹے ہمایوں کی زندگی کی دعا مانگنے کے لیے اس کے بستر کے گرد سات چکر لگائے تھے۔) مسلمان خانۂ خدا یعنی کعبہ کے گرد طواف کرتے ہوئے سات چکر مکمل کرتے ہیں اور حضرت ابراہیم کی یاد میں صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے گرد بھی سات پھیرے لگاتے ہیں۔ بدھ مت کے معروف بوروبودر مندر کی سات منزلیں ہیں جو ہر پجاری کے دل میں اللہ کی فطرت اور ماہیت کا احساس جگاتی ہیں اور رسوم کے ظاہری آداب کو مقصود سمجھنے کی بجائے اس کی حقیقی معنویت پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔

میں انگریز راہبہ کیرن آرمسٹرانگ (Karen Armstrong) کا، جو ایک مصنفہ بھی ہیں، بہت مداح ہوں۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اپنی کتاب *Muhammad: The Prophet of Modern Times* میں وہ لکھتی ہیں کہ محمدؐ کا پیغام حالیہ تاریخ کا حصہ ہے اور انتہائی مستند طریقے سے محفوظ ہے۔محمدؐ کا پیغام یعنی قرآن اللہ کی طرف سے نازل کردہ آخری الہامی پیغام ہے۔اس کی ابتدائی آیات ''الفاتحہ'' کہلاتی ہیں یعنی کھولنے والی۔ اس سورۃ کی سات آیات ہیں جو روحانی سپتک ہیں۔یہ سات آیات ''امّ القرآن'' (Mother of Koran) کہلاتی ہیں اور اللہ اور انسان سے اس کے رشتے کو سمجھنے کی کلید ہیں۔سورۃ الحشر میں اللہ اپنی صفات کو بیان کرتا ہے اور اس ساری بات کو یوں بیان کر دیتا ہے:

هو اللّٰهُ الذی لا اله الاّ هُو

وہ اللہ ہے، جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے،

عالم الغیب و الشهادة

عالمِ غیب میں یا عالمِ شہادت میں،

هو الرّحمان الرّحیم

وہ اپنی اصل میں انتہائی مہربان اور رحم کرنے والا ہے

Marfat.com

یہ بنیاد قائم کرنے کے بعد اللہ ان الہامی آیات میں آگے بڑھتے ہوئے اپنے آپ کو ان آٹھ (Octave) یا سپتک الوہی صفات کے ذریعے بیان کرتا ہے جو صعودی ترتیب میں ہیں:

المالک	سب سے بڑا آقا، حکمران
القدوس	پاک، باوفا، حقیقی، سچا، منزہ
السّلام	امن دینے والا، سلامتی، ہمواری
مؤمن	صلح و آشتی قائم کرنے والا، جنگ و مبارزت سے نجات دینے والا، ہم آہنگی پیدا کرنے والا
مھیمن	بچانے والا، گواہی دینے والا، مشاہدہ کرنے والا
الجبّار	قوی، حکم دینے والا، غالب آنے والا
المقتدر	اعلا، عظیم، ارفع ترین، نافذ کرنے والا

اسمائے الٰہی کے اس نقشے پر ایک سرسری سی نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ صفات ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اللہ اس وقت تک سب سے بڑا حکمران نہیں ہوسکتا جب تک وہ سورۃ الحشر میں بیان کردہ دیگر صفات کا مالک نہ ہو۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر اللہ اپنی تخلیق کی نوعیت اور فطرت بیان کرتا ہے اور اس مقصد کے لیے اپنی صفات کے تین مرحلے بیان کرتا ہے:

هوالله هو	وہی اللہ ہے جو
الخالق	اختراع کرتا ہے، تخیل میں لاتا ہے، تخلیق کرتا ہے،
البارى	نشو ونما کرتا ہے، فروغ دیتا ہے، آگے بڑھاتا ہے،
المصوّر	صورت عطا کرتا ہے، نقش و نگار بناتا ہے، ظاہری ہیئت عطا کرتا ہے، روپ دیتا ہے، شکل بناتا ہے۔
لهُ الاسماء الحُسنیٰ	سب عمدہ صفات اسی سے تعلق رکھتی ہیں، اچھے اچھے سب نام اللہ ہی کے ہیں۔
يسبّح لهٗ ما في السمٰوٰتِ و الأرض	زمین اور آسمان سب اسی کے نام سے گونجتے ہیں اور اسی کا طواف کرتے ہیں۔
و هو العزيز الحكيم	وہ قادرِ مطلق، بسیط، ہر قید سے آزاد اور حکمت و دانش کا مالک ہے۔

Marfat.com

طبعی عناصر کے نقشے اور اسمائے الٰہی کو ایک دوسرے کو متوازی اور مماثل ثابت کرنا اور اس موضوع پر مفصل بحث کرنا اس کتاب کے دائرۂ کار سے باہر ہے۔ یہاں یہی کہنا کافی ہوگا کہ ان متوازی حقیقتوں کے تسلسل (continuum) پر اوپر۔ نیچے کے دو مقامات ہیں۔ قانونِ فطرت (natural law) حقیقت کا ادراک اس تسلسل کے نچلے سرے سے، یعنی علت اور معلول (cause and effect) کے حوالے سے کرتا ہے جب کہ قانونِ الٰہی (Divine Law) حقیقت کو اس کے اوپر کے سرے، یعنی معلول اور علت (effect and cause) کے رشتے سے منکشف کرتا ہے۔ پہلا یعنی قانونِ فطرت، دوسرے یعنی قانونِ الٰہی کا عکس ہے اور عکس ہمیشہ الٹا ہوتا ہے۔

ایک کی حرکت:
Movement of One

سرگم؛ جس کا انگریزی مترادف Octave (بمعنی آٹھ) لاطینی لفظ Octavus سے نکلا ہے، حرکت سے پیدا ہوتا ہے۔ موسیقی کے سُروں کا درمیانی وقفہ، جس میں یا تو آدھا سُر لگایا جاتا ہے یا دگنا، دوسُروں کو ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ اس کی مثال مرکبات بننے کے عمل سے دی جا سکتی ہے، یا پھر عالمِ فطرت میں موجود عناصر کے آمیزوں اور روشنی کے مختلف رنگوں کے امتزاج سے ہزار ہا شیڈ بننے کا عمل اس کے مشابہ ہے۔ سرگم کا یہ رشتہ ایک فطری عمل ہے جسے موسیقی کا کلیدی اعجاز ("basic miracle of music") سمجھا جاتا ہے۔ آپ اسے عناصر کا کلیدی اعجاز بھی کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ یہ بلاشبہ پوری تخلیق کا کلیدی اعجاز ہے۔ خواہ یہ رنگوں کا طیف (spectrum) ہو، موسیقی کا سرگم ہو، عناصر کا دوری جدول (Periodic Table) ہو، ہفتے کے سات دن ہوں، اللہ کے اسمائے حسنٰی کے سات درجے یا سات حصے ہوں یا خدا کی کل کائنات کی سات روزہ تخلیق، اللہ کی فطرت یکساں رہتی ہے اور اس کی یہی خصوصیت سائنس کو ممکن بناتی ہے۔ ہر حقیقت اللہ ہی کو بےنقاب کرتی ہے۔ کسی بھی الہامی کتاب کی طرح اللہ کے نام ورد کرنے کے لیے ہیں۔ اگر آپ عربی زبان میں اللہ کے ننانوے نام سنیں تو ان میں ایک آہنگ پائیں گے۔ اس آہنگ (harmonics) کی وجہ سے انسانی کان ہر نئے نام کو بالکل پہلے جیسا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ بالکل جیسے سرگم میں موسیقی کے سُر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گونج بنتے ہیں اور سننے والوں کی سماعت پر ایک خوشگوار اثر چھوڑتے ہیں یا پھر رنگوں کا ایک دوسرے میں ملتے جانا خوبصورت اور نئے نئے امتزاج پیدا کرتا ہے۔ ایک سُر کا دوسرے سُر سے بنیادی فرق محض شدت یا درجے

Marfat.com

(gradient) کا فرق ہوتا ہے۔اسی طرح ایک رنگ کا دوسرے رنگ سے اختلاف اصل میں طولِ موج (wave length) کے فرق کے علاوہ کچھ نہیں۔اللہ کی ننانوے صفات بھی اسی اصول کے تحت ایک ہی ہستی یعنی اللہ کے مختلف مدارج اور مظاہر ہیں۔اللہ کی دوسری تمام صفات یعنی اسماے افعال اور اسماے صفات جو اس کی مخلوق میں ظاہر ہوتے ہیں، اسی ''ایک'' کی حرکت، اس کے واقع ہونے کی شرح، اس کی صفات کے امتزاج، مدارج، ثقالت، تخفیف، ارتکاز، انتشار، جدائی، ملاپ، تعدد، شدت اور طول موج کا اظہار ہیں۔پوری کائنات اور اس میں موجود ہر شے اللہ کے وقوع پذیر ہونے کی شرح سے بنی ہے۔یہ وقوع پذیری ناپائیدار ہے اور اس لیے اللہ نہیں ہے لیکن اللہ کے بغیر کوئی شے وجود نہیں رکھتی۔اللہ ہر حرکت کی بنیاد بھی ہے اور اس کے عمل میں آنے کا نقطۂ آخر بھی۔اسماے حسنیٰ ایک تدریجی تسلسل (graded continuum) ہیں اور چوں کہ طبعی دنیا انھی اسما کا مظہر ہے اس لیے یہ دنیا بھی ایک تدریجی تسلسل ہے: ایک ایٹم سے لے کر پوری کائنات تک، اور یک خلوی جاندار سے لے کر زندگی کی تمام شکلوں تک۔اسی طرح الرّحمان اور الرّحیم کی بنیادی صفت سے لے کر ارفع ترین صفت الصّبور تک ایک صعودی تدریجی تسلسل ہے جس میں ہر اختتام ایک نئی اور بلند تر حرکت کا آغاز بن جاتا ہے۔اس حرکت کے سات درجے ہیں، جیسے سرگم کے سات سُر ہوتے ہیں۔لیکن اگر پہلے اور آخری دونوں کو گنیں تو یہ آٹھ ہو جاتے ہیں اور اسی سے انھیں Octave کہتے ہیں۔اگر ہم چکر مکمل کرنے کے لیے اتوار کو دونوں سروں پر رکھ کر گنیں تو ہفتے کے سات دن بھی octave ہوں گے۔لہٰذا آٹھ مکمل کرنے والا عدد ہے اور نو کا مطلب ہے نیا۔''فرانسیسی میں *neuf* کا مطلب نو بھی ہے اور نیا بھی۔جرمن میں نو کے لیے لفظ *neun* استعمال ہوتا ہے اور نئے کے لیے *neu* جب کہ ہسپانوی میں *nuve* اور *nuevo* کے لفظ استعمال ہوتے ہیں۔گنتی کرتے ہوئے جب آپ نو پر پہنچتے ہیں تو آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب ایک نیا آغاز سامنے ہے۔'' (www.richardphillips.org.uk) دس پر پہنچ کر آپ پھر ایک پر پہنچ جاتے ہیں لیکن اس ایک کی طاقت دس ہے۔بالکل اسی طرح جیسے دوا ایک ہو مگر اس کی طاقت یا پوٹینسی بڑھتی جائے۔یوں ہی بلند تر ''ایک'' تک پہنچنے کی سعی جاری رہتی ہے۔''ایک'' بنیاد ہے جو مسلسل حرکت کے دوران نئے اور بلند تر ''ایک'' تک پہنچتا رہتا ہے اور پہلے ''ایک'' اور بلند تر ''ایک'' کے درمیان مسلسل حرکت کے نتیجے میں ہر چیز اور سبھی کچھ تخلیق ہوتا رہتا ہے۔اسے اور وضاحت سے بیان کرنے کے لیے سرگم کی مثال بہت موزوں ہے۔سرگم کسی بھی راگ یا راگنی کے بنیادی آٹھ سروں کو کہتے ہیں۔یہ سُر ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ ہوتے ہیں کہ سرگم کی بنیاد بن جاتے ہیں۔یہ جس سُر سے شروع ہوتے ہیں اسی پر جا کر ختم

Marfat.com

ہوتے ہیں لیکن پھر وہی آخری سُر اگلے مرحلے کا پہلا اور اونچا سُر بن جاتا ہے۔ یوں اگلا چکر شروع ہوتا ہے جس کی آواز پہلی یا ہلکی آواز سے دگنی ہوتی ہے۔ اسے موسیقی کی زبان میں inversion کہتے ہیں کیوں کہ بلند آواز کی شدت ہلکی آواز میں بدلنے لگتی ہے۔ یہ فطرت، ارفع حقیقت اور انسان اور خدا کے درمیان موجود رشتے کی تفہیم میں مدد دیتی ہے۔ اس سے وہ بصیرت حاصل ہوتی ہے جو اعلاتر حقیقت کی نوعیت اور فطرت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ انسان؛ گو اللہ نہیں مگر اللہ کی ذات کا معکوس رُخ (inverted self of Allah) ضرور ہیں۔

چار ابعاد، سات حرکات، جو اپنی ذیلی حرکات کے ساتھ مل کر بارہ ہو جاتی ہیں، آٹھ کی صورت میں تکمیل اور پھر تجدید، یہ سب کچھ ''ایک'' کی حرکت کا نتیجہ ہے۔ یہ ''ایک'' ہر چکر کے مکمل ہو جانے پر واپس لوٹتا ہے اور نئے ''ایک'' سے نیا اور بلند تر چکر شروع کر دیتا ہے۔ ہر حقیقت اسی اصول کی پیروی کرتی ہے۔ چناں چہ سات دن کا ہفتہ، جس میں آخری دن آرام کا ہوتا ہے، عرش کے واقعے کی تقلید کرتا ہے۔ تو پھر کیا تعجب کہ octave حضرت عیسیٰ کے دوبارہ جی اٹھنے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت میں آٹھ کے عدد اور octave کے تصور کی وضاحت کے لیے دیکھیے: www.bible.com اور Betemunnah.org

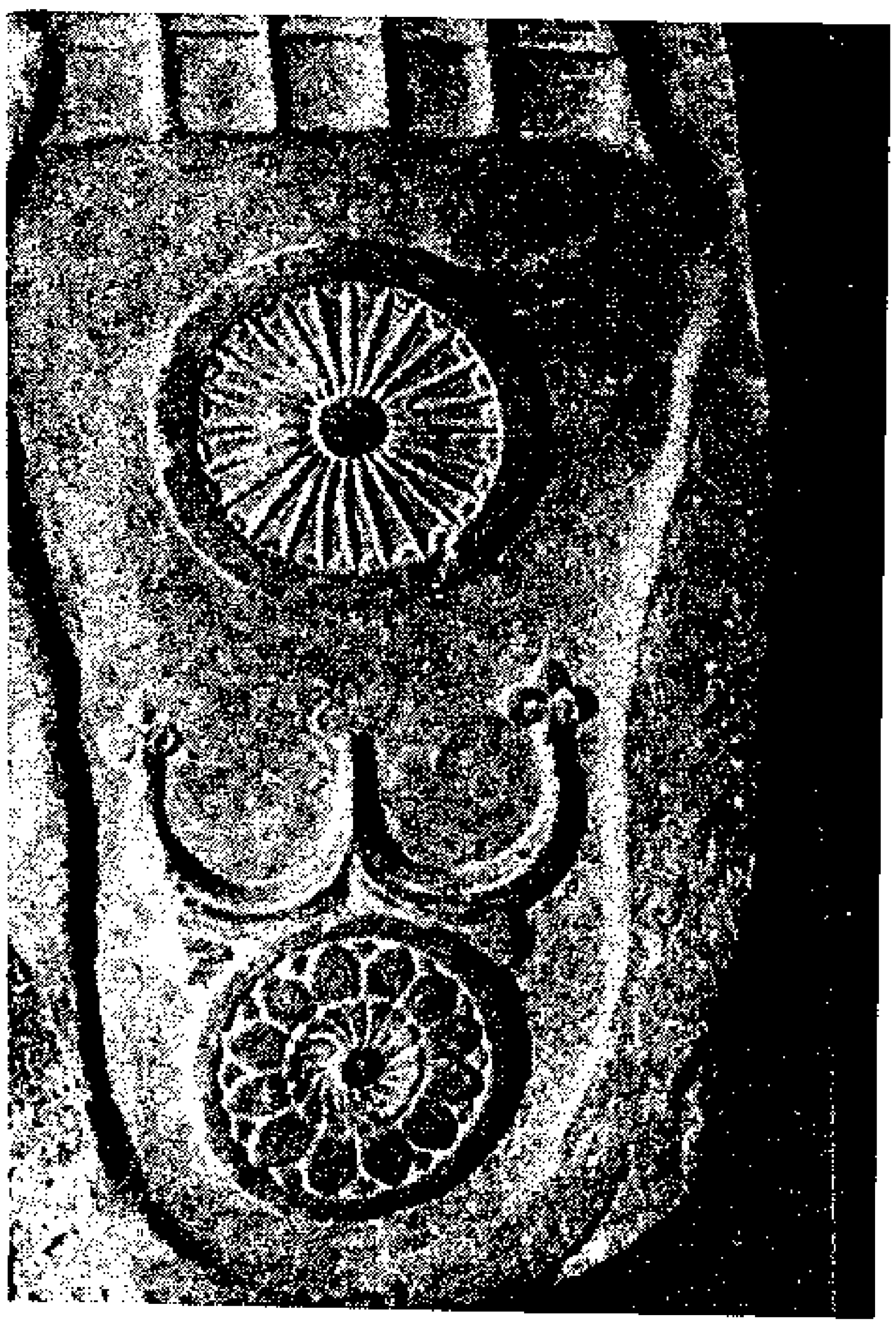

بدھا کا پاؤں جس میں گومتے ہوئے چکر ایک کی حرکت کی علامت ہیں

Marfat.com

''سبت،(Shabbat) یہودیوں کے ہفتے کا ساتواں دن ہوتا ہے اور آرام کا دن سمجھا جاتا ہے۔ سبت انجیل کے باب پیدائش میں درج اس بات کی یادگار ہے جس کے مطابق خداوند نے زمین اور آسمان کو چھے دنوں میں پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔ (باب پیدائش: ۱:۱۔۲:۳) زمین اور آسمان اور جو کچھ ان میں ہے مکمل کر لیا گیا۔ ساتویں دن خداوند نے سارا کام ختم کر دیا۔ اس نے ساتویں دن وہ کام کرنا ختم کر دیا جو وہ کرتا رہا تھا۔ پھر اس نے ساتویں دن پر رحمت نازل فرمائی اور اسے مقدس قرار دیا کیوں کہ یہ وہی دن تھا جب خداوند نے ہر کام مکمل کیا تھا (Melakha)۔ شاہ سلیمان نے پہلا مقدس معبد، جسے ہیکلِ سلیمان کا نام دیا جاتا ہے، اس نمونے پر تعمیر کیا تھا جو موسیٰ پر منکشف کیا گیا تھا اور اس میں یروشلم میں نو تعمیر شدہ معبد کے تمام عناصر استعمال کیے گئے تھے۔ توریت میں آتا ہے کہ menorah یا سات شاخہ شمعدان جو یہودی عبادت گاہوں میں صدیوں سے روشن کیا جاتا ہے، اس کا نمونہ خدا نے موسیٰ کو وحی کے ذریعے بتایا تھا۔''

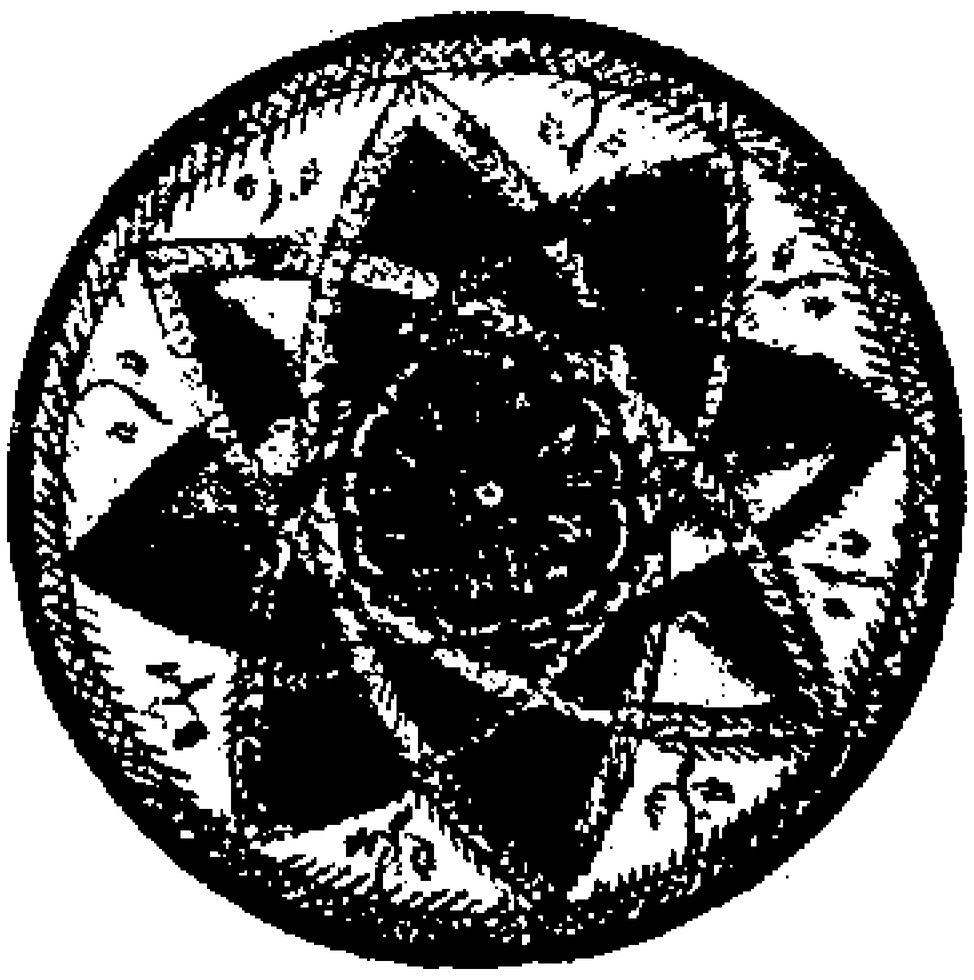

علم نجوم کا چکر

علم نجوم بھی الکیمیا اور تمام جادوئی اور سرّی علوم کی طرح علامات کا ایک نظام ترتیب دیتا ہے۔ ہشت پہلو پھول انسانی انا کی علامت ہے جو انسان کی کلیت کو ظاہر کرتا ہے۔

Astrology Circle

Astrology too employs a system of symbols similar to that of Alchemy and infact all magical and Occult disciplines. The Octagonal flower is the symbol of human Ego that represents the totality of man complete.

Marfat.com

صرف ''ایک'' کا اپنا وجود ہے، باقی تمام ہندسے ایک ہی کی حرکت سے وجود میں آتے ہیں؛ جیسے ایک اور ایک دو بنتے ہیں اور دو اور ایک تین۔ دو، تین، چار، آٹھ، سب ''ایک'' ہی کے مختلف نام ہیں جو اس کی حرکت سے وجود میں آتے ہیں۔ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں، دو اور ایک تین ہوتے ہیں اور یوں یہ سلسلہ آٹھ تک جاتا ہے۔ آٹھ کی تحریری صورت 8 لامتناہی کی دو علامتوں کو ملانے سے بنتی ہے۔ نو ایک نئی ابتدا ہے اور دس بلند تر ''ایک'' ہے۔ یعنی ایک کی طاقت دس۔ یہ ''ایک'' کا بلند تر درجہ ہے۔ صفر کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ کوئی وجود نہیں رکھتا اور کسی ایسی چیز کو ظاہر کرنے کی خصوصیت رکھتا ہے جو معدومیت کا رجحان رکھتی ہو۔ اس کی اپنی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اس کی قیمت صرف اس وقت ہوتی ہے جب یہ ''ایک'' یا اس کے کسی اور نام سے ملتا ہے۔ یوں ''ایک'' جمع (+) یعنی اثبات ہے اور صفر تفریق (-) یعنی منفی ہے۔ جب یہ مثبت (+) اور منفی (-) ملتے ہیں تو ''ایک'' کی قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔ آخری تجزیے کے مطابق یہی کائنات اور حیات کی ارتقائی ترقی کا راز ہے۔ یہ اللہ کی تخلیق کا تصویری نقشہ بھی ہے۔ ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸ ان سب کے اپنے اپنے نام اور اپنی اپنی مخصوص شناخت ضرور ہے لیکن ان میں سے ہر عدد ایک اعلا تر درجے کا نام ہے جو ''ایک'' کی تدریجی حرکت کا نتیجہ ہے۔ اس حرکت کا ہر چکر مکمل ہونے پر ''ایک'' کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ یوں تمام تر حرکت، تمام تر ارتقا ''ایک'' کی بلند سے بلند تر عمل پذیری کا نام ہے۔ ہر چند کہ صفر کی کوئی حقیقت نہیں لیکن یہ نشان لامتناہیت (infinity) کا ہے۔ اس لامتناہیت (infinity) کی بلند تر تکمیل 8 ہے جو لامتناہی (Infinity) کے دو نشانوں سے مل کر بنتا ہے۔ اس طرح ترقی کا عمل یا ارتقا کی چال لامتناہیت سے لامتناہیت تک ہے۔ صفر سے لے کر لامتناہی تک۔ یہ بھی اللہ کی تخلیقات کی تصویری پیش کش ہے۔ ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸ بلاشبہ اپنی ایک علیحدہ اور منفرد شناخت رکھتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک اعلا تر درجے کا نام ہے جو ''ایک'' کی شمولیت سے وجود میں آتا ہے۔ ہر چکر کے اختتام پر یہ سب عدد ''ایک'' ہی کی اعلا تر قیمت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ گویا ہر حرکت، ہر ارتقا ''ایک'' ہی کی زیادہ سے زیادہ قیمت کی طرف بڑھتا ہے۔

اس کتاب کے کئی تجزیاتی استدلال تصویروں کے ذریعے واضح کیے جا سکتے ہیں۔ میرا بہت جی چاہتا ہے کہ انھیں نقشوں اور تصویروں کے ذریعے واضح کروں اور پھر انھیں اپنے گرجوں کے رنگین شیشوں پر بنے موزیک (پچی کاری)، اپنی مسجدوں کے تعمیری نقشوں، چھتوں اور گنبدوں اور اپنی عبادت گاہوں کی کبالی انداز کے مظاہر (the cabalistic representations) اور منڈالا ساختوں (mandala forms) کے تعلق

Marfat.com

سے بیان کروں جو دراصل اللہ کی انسانوں سے ہم کلامی ہیں تاکہ وہ اللہ کی ذات کو سمجھ سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت محمدؐ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ ایک سادہ تصویر ہزار لفظوں سے بہتر ہوتی ہے۔ پھر بھی میں اللہ کو سمجھانے کے لیے کوئی تصویر یا خاکہ بناتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے قارئین میں سے کچھ لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اللہ کو تصویروں کی مدد سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اللہ مجرد ہے، غیر مرئی ہے اور ہر طرح کے تصویری اظہار سے ماورا ہے۔ اسی لیے ارفع مذاہب میں اللہ کی تصویر بنانے کی ممانعت ہے۔

جوتا دوسرے پاؤں میں ہے:
The Boot is on the other leg

اللہ کی توضیح وتشریح کرتے ہوئے میں نے جب بھی اور جہاں بھی اس کے متوازی طبعی حقائق کی بات کی ہے، جیسے موسیقی کے سُر، ہفتے کے دن، قوسِ قزح کے رنگ وغیرہ، اسے دیکھ کر شاید کوئی یہ خیال کر بیٹھے کہ میں نے اللہ پر طبعی قوانین کا اطلاق کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اللہ کسی نمونے کا پابند نہیں ہے اور نہ اسے طبعی حقیقت کی مدد سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے انسان کے شعور و ادراک کو کسی جانور کے ڈھانچے کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی جائے حالانکہ بات اس کے بالکل الٹ ہوگی۔ طبعی حقیقت کو صرف اللہ کی صفات اور اسمائے حسنیٰ کی مدد سے سمجھا اور بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسمائے حسنیٰ کی سائنسی اور منظم توضیح وتشریح انتہائی ضروری اور اہم ہے تاکہ انسان اس اعلا وارفع حقیقت کو سمجھ کر خود اپنی تقدیر کو عمل میں لا سکیں۔ آج ہم انسان اعلاتر حقیقت کی دہلیز پر کھڑے ہیں اور اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ اگر ہم نے مستقبل قریب کی اس زندہ وناگزیر معنویت کو پوری طرح نہ سمجھا تو ہم خود اپنے مستقبل کے امکانات سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ میں طبعی مثالوں کی مدد سے وضاحت کرنے پر مجبور ہوں کیوں کہ انسان کا تصورِ حقیقت معکوس یعنی الٹا ہے۔ انسان خدا کا عکس ہے۔ عکس ہمیشہ الٹا ہوتا ہے اور اسی لیے انسان ہمیشہ الٹ سمجھتا ہے۔ سائنس حقیقت کا الٹا تصور ہے۔ یہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو علت اور معلول (cause and effect) کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ معلول ہی علت (effect is cause) ہے۔

مشرق کے خدا رسیدہ صوفیوں اور پہنچے ہوئے بزرگوں نے، جو اس عکس کو راست دیکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں، اللہ کو راست طریقے سے بیان کیا ہے۔ مشرق کی حکمت و دانش پر مبنی کتابیں اللہ پر ایسی تحریروں سے بھری

Marfat.com

پڑی ہیں۔ یہ تحریریں خدا کے براہ راست تجربے کا نتیجہ ہیں جو انتہائی ترقی یافتہ شعور کے مالک افراد نے کیا ہے لیکن یہ کتابیں ہماری رسائی سے باہر، ناقابلِ فہم، تحیر انگیز، اور بعض اوقات ایک عام قاری کے لیے متناقض (paradox) معلوم ہوتی ہیں کیوں کہ ہم فانی انسان جو ابھی شعور و آگہی کے اس درجے تک ترقی نہیں کر پائے، حقیقت کا الٹ اور معکوس رُخ دیکھنے کے عادی ہیں۔ کسی محقق سائنس دان کے لیے پانی دو اجزا، ہائیڈروجن اور آکسیجن کے امتزاج کا نتیجہ ہوگا لیکن کسی پیاسے کے لیے یہ زندگی کی بقا کی لازمی شرط ہے جو زندگی بخشتا ہے، پیاس بجھاتا ہے اور حیات کے عمل کو بحال کرتا ہے۔ مشرق کے صوفی روحانی تجربے کا تجزیہ پیش نہیں کرتے، وہ تو بس سادگی سے اسے بیان کر دیتے ہیں اور اسے جیتے ہیں۔ خدا پر یقین رکھنے کے لیے سائنسی آلات کی مدد سے اس کے تصور کی چیر پھاڑ کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ لاکھوں لوگ ہیں جو اس پر یقین رکھتے ہیں، اس کا تجربہ کرتے ہیں، اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس تک براہ راست رسائی رکھتے ہیں۔ یہ تجربہ ہر ایک کر سکتا ہے۔ یقین کریں اور خود دیکھ لیں!

تخلیق میں درجہ بندی ہوتی ہے:
Creation is Tiered

اللہ کی تخلیقات کے کئی درجے، مرحلے اور زینے ہوتے ہیں اور اللہ کی صفات ان سب میں عیاں ہونی چاہییں۔ ہمارا نظریہ تبھی درست ثابت ہو سکتا ہے اگر اللہ کے ننانوے نام مکمل طیف، تمام مرحلوں، درجوں اور ابعاد پر محیط ہوں۔ تو چلیں اللہ کے ناموں میں یہ خصوصیت تلاش کرتے ہیں:

اللہ ایک ہے (الاحد)

یہ نام عددی وحدت کو ظاہر کرتا ہے اور اللہ کی یہ صفت ''اکائی'' میں موجود ہے۔

اللہ یکتا / بے نظیر / بے مثل ہے (الواحد)

یہ اسم یکتائی اور نرالے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ خصوصیات اس زندگی میں ظاہر ہوتی ہیں جس کا کوئی ثانی نہ ہو۔

یہاں پھر ہمیں ایک ہی صفت کے دو درجے دکھائی دے رہے ہیں۔ اگر باریک بینی سے تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ حقیقت کے چار پہلو، جن کا عام تجربہ ہم روز مرہ زندگی میں کرتے ہیں، اصل میں دو بڑی، عمومی قسموں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں: ۱۔ طبعی / حیاتیاتی ۔ ۲۔ انسانی / روحانی۔ تو آیئے اسمائے الٰہی میں ان دو اقسام کو

Marfat.com

تلاش کرتے ہیں۔

المتین ،یعنی ٹھوس، مضبوط،قوت رکھنے والا۔ یہ طبعی یا جسمانی صفات ہیں جو ان سب چیزوں پر لاگو ہوتی ہیں جن میں استحکام کا عنصر پایا جاتا ہے، جو مستقل نوعیت کی ہیں، طاقت ور اور قوی ہیں، مضبوط ہیں، توانائی رکھتی ہیں اور دبانے یا دھکیلنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

القوی یعنی مضبوط،قوت والا، طاقت ور۔ یہ وہ صفات ہیں جو غلبہ پانے ،تسلط حاصل کرنے ، چھا جانے ، راغب کر لینے کی بشری یا فوق البشری استعداد کو ظاہر کرتی ہیں۔

النور یعنی روشنی، چمک دار، تاباں، توانائی۔ یہ خصوصیات طبعی (physical) ہیں۔

الھادی یعنی ہدایت دینا، راستہ دکھانا، رہنمائی کرنا، قیادت کرنا، روحانی رہنمائی کرنا۔ یہ صفات بھی بشری یا فوق البشری روحانی صلاحیت کو ظاہر کرتی ہیں۔

تغیر میں استقلال:

Constancy within Change

اوپر گنوائے گئے ناموں کے جوڑے اصل میں ایک ہی حقیقت کے دو مدارج ہیں اور ایک ہی اصول کے دو نام ہیں۔ حقیقت کے مختلف مدارج کو مختلف نام ضرور دیا گیا ہے لیکن ناموں کا ہر جوڑ ادراصل ایک ہی صفت کی مختلف سطحوں کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ تبدیلی یا تغیر میں استقلال (constancy within change) ملتا ہے۔ ایک عنصر مستقل ہے، ایک بدل جانے والا ہے۔ مستقل رہنے والا عنصر اس جوڑے کی اصل اہمیت کا حامل ہے۔ جب کہ بدل جانے والا عنصر حقیقت کا وہ درجہ ہے جس پر اس کے نام کا اطلاق ہوتا ہے۔ مزید برآں اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ یہ جوڑے دار نام ایک ہی صفت کے تسلسل (continuum) پر موجود اوپر۔ نیچے (Up-Down) کے مقامات ہیں۔ ایک اس کے نچلے درجے کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرا بلند درجے کو۔ ایک کسی صفت کے کم ہونے کا اظہار ہے اور دوسرا اسی کے زیادہ ہونے کا۔ یہاں بجا طور پر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ان دو مقامات کے علاوہ ہر صفت کے اور بھی درجے (gradients and degrees of a quality) ہو سکتے ہیں جو ان دونوں کے بیچ میں کہیں واقع

Marfat.com

ہوں۔اسی لیے عام لوگوں کا اعتقاد ہے کہ اللہ کے نام ان گنت ہیں۔اللہ کے یہ نام ہر زبان اور ہر زمانے میں موجود رہے ہیں۔

'ایک' (الاحد) اور 'بے مثل' (الواحد) اللہ کے دو نام ہیں۔یہ دونوں ایک ہی حقیقت کی دو صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ایسا ہونا تبھی ممکن ہے جب 'ایک' کا، جو عددی وحدت ہے، طبعی سطح پر اطلاق ہو اور 'بے مثل' کا اعلیٰ شعوری سطح پر اطلاق ہو۔یہی معاملہ المتین (ٹھوس، مضبوط، استوار) اور القوی (طاقت ور، قوی، مقتدر) کا ہے اور یہی مثال النور (روشنی، تابانی، توانائی) اور الھادی (ہدایت دینے والا، رہنما، روحانی مرشد) کی ہے۔

لادین سے مقدس تک:
Profane to Divine

احد، واحد، متین، قوی، نور اور ہادی، یہ سب اصطلاحات اگرچہ اللہ کے اسمائے صفات ہیں مگر یہ عربی زبان کے عام الفاظ بھی ہیں جو روزمرہ زندگی میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ان اصطلاحات میں بذاتِ خود کوئی تقدس یا حرمت نہیں ہے۔یہ تو بس سادہ سے الفاظ ہیں جو انسان کے گردوپیش میں موجود حقیقت کی صفات، خصوصیات، رجحانات، اوصاف اور اختصاصی پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔یوں یہ نام فطری، حیاتیاتی، نفسیاتی اور نفسی عمل کا اظہار کرتے ہیں جو حقیقت کی طرح قابلِ مشاہدہ (الظاھر) بھی ہے۔تاہم جب ان الفاظ کے ساتھ حرفِ تخصیص ''ال'' لگا دیا جاتا ہے تو یہ عام الفاظ اس ذاتِ الٰہی کو ظاہر کرنے لگتے ہیں اور مقدس بن جاتے ہیں۔اس طرح لادین، مقدس ہو جاتا ہے اور یہ دونوں بھی ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔نور، ہادی اور متین کے الفاظ روزمرہ زندگی میں کبھی خدا کے لیے استعمال نہیں ہوتے البتہ طبعی خواص یا انسانوں کے لیے ضرور استعمال ہوتے ہیں اور ان میں سے اکثر تو مسلمانوں کے نام ہیں۔

اللہ کو ان ناموں سے مخاطب کرنے لیے ''ال'' کا سابقہ ضرور استعمال ہوتا ہے؛ جیسے النور، الہادی، المتین۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام اسمائے صفات محض صفات ہیں جن میں بذاتِ خود کوئی جوہر موجود نہیں۔یہ مظاہر اللہ کی کسی ایک یا ایک سے زیادہ صفات کو ظاہر کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں اور یوں خدا کو پہچاننے میں انسان کے مددگار بن سکتے ہیں؛ لیکن خود انسانی احترام، عقیدت یا پرستش کا محور نہیں بن سکتے۔ان الفاظ کی نہاد میں کوئی تقدس

Marfat.com

یا پاکیزگی یا جادوئی قوت نہیں۔ یہ محض اوصاف، صفات اور خصوصیات ہیں جو تبدیلی اور تغیر کی ناپائیدار دنیا کو ظاہر کرتی ہیں اور انسان اور کائنات کی ظاہری حقیقت بیان کرتی ہیں۔

حصولِ مقصد کے ذرائع:
Means to an End

اسمائے صفات اللہ کی علامت بنتی ہیں، اس کی خصوصیات کو ظاہر کرتی ہیں، اس کی تمثیل بنتی ہیں اور یوں اسے یاد کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اس طرح یہ ایک مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ضرور ہیں مگر خود مقصد نہیں ہیں۔ یہ صفات عالمِ شہادت میں منکشف ہوتی ہیں جو فانی دنیا ہے، جب کہ اللہ، جو غیر مرئی ہے، عالمِ غیب سے تعلق رکھتا ہے جو جاوداں دنیا ہے۔ اس دنیائے فانی میں اللہ سب سے کم موجود ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ اس فانی دنیا میں بالکل ہی غیر موجود ہے۔ اس کا کم موجود ہونا محض ایک اضافی صورت حال ہے۔ اس طرح اللہ کی زیادہ یا کم موجودگی کے باعث عالمِ شہادت اور عالمِ غیب کے درجے بنتے چلے جاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے صبح سے لے کر شام تک سورج کی روشنی کی شدت اور کیفیت مختلف ہوتی رہتی ہے۔

اللہ کے جوہر، اس کی ذات کے لیے صرف ایک ہی نام ہے اور وہ ہے اللہ۔ یہ نام صرف اور صرف اس کے لیے ہے۔ اس لفظ کا اور کوئی استعمال نہیں۔ دیگر تمام صفات عام چیزوں، کاموں، اوصاف اور انسانوں کے نام ہیں مگر اس نام سے کبھی کسی شخص یا چیز کو نہیں پکارا گیا۔ یہ بس اللہ ہی کی ذات کو بیان کرتا ہے۔ اللہ کا لفظ کسی صفت، کسی وصف، کسی امتیازی خصوصیت کو ظاہر نہیں کرتا۔ یہ نام جوہر ہے، سب سے مقدس ہے اور اللہ کا اسمِ ذات ہے۔ یہ ایک منفرد اور بے مثل اسم خاص ہے۔ یہ ایک ایسی زندہ ہستی کو ظاہر کرتا ہے جو ہر شے کا مرکز و محور ہے۔ اس کا نہ کوئی مترادف ہے، نہ اس کی جمع بنائی جا سکتی ہے۔ یہ عظیم ترین ذات ہے۔

نادیدہ، غیر مرئی اللہ، اسمِ ذات ہے اور قابلِ نظارہ، مرئی اللہ اسمائے صفات میں ہے۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ پہلے کی صفت باطن (نہاں) ہے اور دوسرے کی ظاہر (عیاں)۔ پہلا مقدم ہے، دوسرا مؤخر۔ پہلا ایک اور یکتا ہے، دوسرا کئی اور متنوع۔ لیکن یہ دونوں ایک ہی دوطرفہ وحدت کے دو کنارے ہیں۔ یہ حقیقت کے تسلسل (continuum) کے اوپر۔ نیچے کے مقامات ہیں اور بس۔ اگر ہم اس حقیقت کو انسان کے جسمانی وجود پر منطبق کر کے دیکھیں تو اس منفرد و بے مثال ہستی کو کسی حد تک سمجھنا ہمارے لیے آسان ہو سکتا

Marfat.com

ہے۔ انسان کے جسم کا بلند ترین عضو اس کا سر ہوتا ہے جسے وہ ہمیشہ فخر سے اوپر اٹھائے رکھتا ہے۔ سر ذہن، شعور اور اختیار کا مقام ہے۔ جب کہ جسم کا سب سے نچلا حصہ پاؤں ہوتے ہیں جو زمین سے جڑے رہنے پر مجبور ہیں۔ ذہن نہاں (باطن) ہے، پاؤں (ظاہر) عیاں ہیں۔ ذہن اختیار (تدبیر) کا مقام ہے، پاؤں جبر (تقدیر) کا۔ اس لیے کہ پاؤں کو ہمیشہ زمین سے جڑے رہنا پڑتا ہے۔ سر کو پاؤں پر فوقیت حاصل ہے کیوں کہ سر کٹ جائے تو انسان کی فوری موت واقع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا سر مقدم ہے اور پاؤں مؤخر ہیں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے ہم اربوں انسانوں میں سے ایک ہیں لیکن ہمارے چہرے کے نقوش بالکل منفرد ہوتے ہیں جو ہم میں سے ہر ایک کو بے مثل بنا دیتے ہیں۔ یوں ہم ایک بھی ہیں اور بے مثل بھی۔ لیکن یہ سب ایک ہی ذات کی اطراف و جوانب ہیں۔ یہ ذات ایک وحدت ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک ایک ہی تسلسل۔

خالق اور مخلوق:

Creator and Creation

صرف دو چیزیں وجود رکھتی ہیں؛ خالق اور اس کی مخلوق۔ لیکن یہ دونوں یہ ایک ناقابلِ تفریق وحدت میں جڑی ہوئی ہیں۔ اللہ خالق کا اسم واحد ہے۔ باقی سب نام صفاتِ الٰہی ہیں جو مخلوق میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اللہ ایک ہے، مخلوقات کئی ہیں۔ اللہ مطلق آزاد ہے اور مخلوقات پابند ہیں۔ اللہ باطن ہے، مخلوقات ظاہر ہیں۔ اللہ مقدم ہے، مخلوقات مؤخر ہیں۔ یوں اللہ اور اس کی مخلوق حقیقت کے ایک ہی تسلسل پر موجود اوپر۔ نیچے کے مقامات ہیں۔ ان دونوں کے درمیان بہت سے اور مدارج ہیں، زینے ہیں، انتقالات ہیں، ابعاد ہیں، مرحلے ہیں، جن کا انحصار اس عظیم ترین ذات کی موجودگی یا غیر موجودگی کے درجے پر ہوتا ہے۔

زندگی کے تمام مدارج، بے جان، جان دار، نباتات، حیوانات، انسان اور فوق البشر، سب اسی خالق کی تجلیات ہیں۔ تمام مخلوقات باہم مربوط ہیں، ایک دوسرے پر منحصر ہیں اور وجود کے ایک ہی تسلسل پر موجود ہیں لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے سے واضح طور پر مختلف ہیں۔ یہ اختلاف صرف صفاتِ الٰہی کی موجودگی یا غیر موجودگی کے درجے کا ہے۔ یہ اختلاف کمیتی (quantitative) نہیں، کیفیتی (qualitative) ہے اور ایک ہی وجود کی مختلف سطحوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اللہ کے سوا کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ (ولا الٰہ غیرك)۔ جو شے بھی وجود رکھتی ہے وہ اسی کے وجود کا ایک درجہ ہے۔ حالاں کہ اس شے میں بھی ایک اور یکتا ہونے کی صفات موجود ہیں۔

Marfat.com

چارلس ڈارون نے جب تخلیق کے بارے میں اپنا عظیم ترین نظریہ وضع کیا تو اپنی سائنسی دریافتوں کو کاپیوں میں لکھ لکھ کر محفوظ کرتا رہا اور بیس سال سے زیادہ عرصے تک انھیں چھپائے رکھا۔ اس کے بعد کہیں جا کر ان کاپیوں کو کھول کر پڑھا گیا اور اس کا انقلابی نقطۂ نظر سامنے آیا۔ کیمبرج میں وہ مذہبی علما کے ساتھ پڑھتا رہا جہاں اس کے مستقبل میں ایک عظیم عالمِ دین، خدا کا چاکر، بننے کی امید روشن تھی۔ لیکن اس نے کیمبرج کی تعلیم ترک کر دی اور عالمِ فطرت کا مطالعہ کرنے چل نکلا۔ خدا سے فطرت، خالق سے مخلوق کی طرف مڑ جانے کا یہ سفر ڈارون کی زندگی کا اہم ترین واقعہ بن گیا۔ وہ اس دنیا سے اپنے لیے نمونے چننے اور ان کا مطالعہ کرنے میں محو ہو گیا جو زندگی کی نت نئی انواع سے اٹی ہوئی تھی۔ وہ عالمِ فطرت کا صوفی بن گیا۔ جنگل اس کے اس مذہب کا معبد بن گئے۔ اگرچہ وہ اس کائنات میں جاری شعوری تخلیق (Intelligent Design) کے عقیدے پر پختہ ایمان رکھتا تھا لیکن جوں جوں وہ شہادتیں جمع کرتا گیا، اسے یقین ہوتا گیا کہ زندگی کی مختلف انواع ایک سست رفتار ارتقا، درجہ بندی (gradation)، توافق (adaptation) اور کایا پلٹ (transformation) کے تسلسل (continuum) کا نتیجہ ہیں خالق سے مخلوق تک اور شعوری تخلیق سے فطرت کے عملِ انتخاب تک کا سفر خود ڈارون کے ارتقا کا سفر بھی تھا۔ یہ اس کی ذہنی تربیت کا عمل تھا۔

قدیم ڈھانچوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ معدوم ہو جانے والے جانوروں اور موجودہ جانوروں میں ایک گہرا رشتہ پایا جاتا ہے۔ اس نے اس بات پر بھی غور کیا کہ کچھ انواع پوری کی پوری معدوم ہو جاتی ہیں، لیکن سوال یہ تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پھر اس کے باوجود مر جانے والوں اور زندہ بچ جانے والوں میں ایک واضح اور بین رشتہ بھی تھا۔ آخر نئی زندگی کہاں سے آتی ہے اور پھر کیوں ختم ہو جاتی ہے؟ یہ وہ سوال تھے جو ڈارون کے متجسس ذہن کو مضطرب رکھتے تھے۔ ڈارون کو پورا یقین تھا کہ انواع تبدیل نہیں ہوتیں لیکن اس نے یہ بھی دیکھا کہ ایک ہی نوع کے جانوروں اور پرندوں میں ان گنت قسمیں پائی جاتی ہیں۔ انھیں کیسے سمجھا اور بیان کیا جائے؟ آخر ایک دن ڈارون نے معروف برطانوی ماہرِ آثارِ قدیمہ چارلس لائل (Charles Lyle) کی کتاب *Principles of Geology* پڑھ لی جس میں لکھا تھا کہ سطحِ زمین پر رونما ہونے والی تبدیلیاں روزمرہ زندگی کے عام اور بتدریج ظاہر ہونے والے تغیرات جیسے ہوا، گرمی، سردی، بارش، آتش فشاں، تہ نشینی اور کٹاؤ وغیرہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ سادہ اور عام سی قوتیں ایک لمبے عرصے تک مل جل کر اپنے اثرات مرتب کرتی رہتی ہیں اور اس کے نتیجے میں زمین کی وہ شکل بنتی ہے جو آج ہمیں دکھائی دے رہی ہے۔ اس حقیقت نے ڈارون کے

Marfat.com

ذہن میں آج کی دنیا کو دیکھنے کا ایک نیا انداز پیدا کر دیا۔ڈارون پر اس حقیقت کا بہت نتیجہ خیز اثر مرتب ہوا۔زمین وقت کی روانی کے نتیجے میں بنی ہے۔قدیم ڈھانچے انواع کے درمیان موجود رشتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں، وقت کے ایک طویل عرصے پر محیط ہو کر کتنی بڑی ہو جاتی ہیں۔یہ وہ سبق تھا جسے ڈارون نے ہر شے پر منطبق کیا۔

چڑیوں پر تحقیق کرتے ہوئے ڈارون نے مشاہدہ کیا کہ انواع بدل جاتی ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں لیکن چڑیوں کی تمام تر قسمیں اصل میں ایک ہی نوع سے وجود میں آئی ہیں۔تاہم وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔اس مشاہدے سے انواع کے مستقل موجود رہنے کا امکان کم ہوتا گیا۔جب ایک طویل عرصے کے بعد اس تبدیلی کا تعین کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ انواع فنا ہو چکی ہیں اور کچھ نئی انواع نمودار ہو چکی ہیں لیکن یہ سب ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہیں۔۱۸۳۸ میں Malthus نے ان انواع کا مطالعہ کیا جو اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھیں، جس میں طاقت ور غالب رہتا ہے اور کمزور مٹ جاتا ہے۔اس بات سے ڈارون کو یہ نتیجہ نکالنے کی تحریک ملی کہ زندگی، موت وحیات کے درمیان مسلسل کشمکش کا نام ہے؛ خواہ یہ مختلف انواع کے درمیان بقا کی جنگ ہو یا ایک ہی نوع کے افراد کے درمیان بقا کی کشمکش۔حالات سے مطابقت پیدا کر لینے والی انواع اور خصوصیات باقی رہتی ہیں اور ناموافق رہنے والی انواع وصفات نابود ہو جاتی ہیں۔اس کے نتیجے میں نئی انواع وجود میں آتی ہیں۔ہر وہ صفت یا صلاحیت جو کسی نوع کے لیے ذرا سی بھی مفید ہو، اس کے نسل در نسل باقی رہنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ یہ صفت زیادہ عام اور زیادہ شدید یا گہری ہوتی جاتی ہے؛ یہاں تک کہ نوع میں تبدیلی پیدا کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔یوں ایک نئی نوع وجود میں آتی ہے۔اس طرح ڈارون نے اپنا اصول انتخابِ فطرت وضع کیا۔

ڈارون کا انواع کی قلب ماہیت (transformutation of species) کے بارے میں یہ نظریہ ہرگز قابلِ قبول نہیں تھا۔اس کے معاصر سائنس دانوں میں سے بہت سوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ڈارون نے پچاس سال کی عمر تک اپنی تصنیف *The Origins of Species* شائع کروانے کا انتظار کیا۔لیکن ڈارون یہ سمجھنے میں ناکام رہا کہ کسی خالق کی شعوری تخلیق کا عمل اور ارتقا دراصل ایک ہی حقیقت کو دیکھنے کے دو

Marfat.com

انداز ہیں۔

وہ اصول جو اتنے سادہ اور فطری ہیں کہ ہم انھیں اپنی روزمرہ زندگی میں کارفرما دیکھ سکتے ہیں، وقت کے ساتھ ایک متحرک تعامل کے ذریعے کائنات، زمین اور زندگی کے مکمل ارتقا کو بیان کر دیتے ہیں۔ اتنی سادہ سی ابتدا سے لے کر زندگی کی حسین ترین، شاندار اور لاانتہا صورتوں تک کا مکمل ارتقا۔ کیا یہ اب بھی بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے جو وجود رکھتی ہے، ایک کی حرکت کا نتیجہ ہے۔ اور یہ کہ سادہ ترین اصول اللہ کے عملِ تخلیق کو بیان کر دیتے ہیں۔

آواگون کا تصور:
Conc ept of Reincarnation

حضرت عیسیٰ سے پانچ سو سال پہلے بدھ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا رہا۔ اس نے زندگی کو ایک چکر سمجھا؛ دکھ، فنا اور موت کا چکر۔ وہ اس تلاش میں نکل کھڑا ہوا کہ انسان کو اس تباہ کن چکر سے کیسے نجات دلائے اور کیسے اس کی زندگی کی بقا کا راز ڈھونڈے۔ چھ سال تک خاک چھاننے اور انچاس (49) دن، وجدان و معرفت کی گہرائی اور مراقبے کی کیفیت میں ڈوبے رہنے کے بعد اس نے یہ نکتہ پالیا کہ انسانی رنج والم کا مداوا کیسے ہوسکتا ہے۔ چناں چہ اس نے ایک ہشت پہلو طریقہ؛ نجات کا دھرم چکر، وضع کر لیا۔ آواگون (reincarnation) تناسخ کا ایسا تصور ہے جسے عام طور پر ڈارون کے نوعی تغیر و تبدل (transmutation of species) کے نظریے کی طرح غلط سمجھا گیا ہے۔ زندگی کے چکر (cycle) میں انسان کو خدا اور حیوان کے درمیان رکھا گیا ہے۔ ان میں سے جو اس چکر سے ماورا ہو جائیں گے وہ اعلا تر مقامات کی جانب سفر جاری رکھیں گے اور جو برے اعمال کے مرتکب ہوں گے، وہ چکر کے گرداب میں پھنسے رہیں گے۔

اب ہم اپنے موضوع یعنی اللہ کے اسمائے حسنیٰ کی طرف لوٹتے ہیں اور اس بات کا مزید کھوج لگاتے ہیں کہ ہم نے جو نتائج اخذ کیے تھے، وہ اسمائے حسنیٰ میں ظاہر ہوتے ہیں یا نہیں؟ اللہ کی صفات کی اس تگرم کو ذرا غور سے دیکھیں؛ یہ صفات حقیقت کے ہر درجے میں ظاہر ہوتی ہیں اور یہی ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔

القابض (سکیڑنے والا) البَاسط (پھیلانے والا)

Marfat.com

الخافض (پست کرنے والا) الرافع (بلندی عطا کرنے والا)

المذّل (ذلت دینے والا) المعزّ (عزت دینے والا)

یہ بات بالکل عیاں ہے کہ یہ صفات ایک ہی اصول کے مختلف درجات کو ظاہر کرتی ہیں یعنی سکیڑنا اور پھیلانا، بلند کرنا اور پست کرنا، عزت و منزلت عطا کرنا اور ذلت و رسوائی دینا۔ اب ایک اور مثال دیکھیے:

الرّزّاق (وہ جو زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے ذرائع مہیا کرتا ہے)

الوھاب (وہ جو نعمتیں عطا کرتا ہے اور جود و سخا میں حد سے نکل جاتا ہے)

الحافظ (محافظ، جو حفاظت کرتا ہے، دیکھ بھال کرتا ہے)

المقیت (وہ جو بقا کا ضامن ہے، طاقت دیتا ہے اور قائم رکھتا ہے)

الغفار (وہ جو معاف کر دینے والا ہے)

الشّکور (وہ جو شکر گزاری قبول کرنے والا اور مہربان ہے)

الکریم (وہ جو بنا مانگے عطا کرتا ہے)

یہ سب نام اللہ کی فراخ دلی کی مختلف سطحیں ہیں کیوں کہ یہ سب نام دینے، بخشنے، فراہم کرنے، مہیا کرنے، عطا کرنے اور مرحمت کرنے جیسے افعال کو ظاہر کرتے ہیں۔ بنیادی لوازمِ حیات کی فراہمی سے لے کر کرم تک یہ سب مرحلے ''دین'' ہی کے مختلف روپ ہیں۔

معنی کی سطحیں:
Tiers of Meanings

ہم اسمائے حسنیٰ کے معانی کی مختلف سطحیں دریافت کرنے کا یہ عمل اسی طرح جاری رکھتے ہیں۔ عربی زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں الفاظ اور اصطلاحات کے معانی کی کئی کئی تہیں اور سطحیں ہوتی ہیں۔ کئی عربی الفاظ میں معانی کی یہ سطحیں کسی شے کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً عربی کے لفظ ''تلاوت'' ہی کو لیجیے جسے مسلمان قرآن پڑھنے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اس لفظ ''تلاوت'' کے معانی کی مختلف سطحیں درج ذیل ہیں:

☆ پڑھنا

Marfat.com

☆ بہ آوازِ بلند پڑھنا

☆ غور وفکر کرنا

☆ سمجھنا، تفہیم ہونا، جیسے انگریزی میں کہتے ہیں، ?Do you follow یا ?Do you understand

آخری دونوں معانی اس اصطلاح کے ذہنی اور عقلی پہلو کو ظاہر کرتے ہیں

☆ پیروی کرنا، تعمیل کرنا، پیچھے چلنا

اس میں ان لوگوں کے لیے ایک واضح پیغام ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تمام الہامی صحائف محض علامتی یا تمثیلی نوعیت کے ہیں۔ قرآن کے معاملے میں بھی بظاہر یہی لگتا ہے کہ یہ قصوں کہانیوں اور پرانے زمانے کی حکایات پر مشتمل ہے یا زیادہ سے زیادہ اس میں عرب میں پیدا ہونے والے پیغمبر محمد ﷺ کی زندگی کے واقعات کا بیان ملتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں معانی کی لاتعداد تہیں ہیں جو لغوی معنی سے لے کر مابعد الطبیعیاتی سطح تک جا پہنچتی ہیں۔ دنیا بھر میں سچائی کی آفاقی خصوصیت یہی ہے کہ اس کا اطلاق حقیقت کی ہر سطح اور ہر مرحلے پر ہو سکتا ہے۔ یہی سچائی کی اصل پہچان ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ قرآن کو اس کے لغوی معنی میں سمجھنا چاہیے۔ باقی سب معانی ان لغوی معانی کے بعد آتے ہیں۔

اسی طرح اللہ کے ناموں کی مختلف تعبیر و تفسیر ہو سکتی ہے جو عیاں اور نہاں حقیقتوں کے مختلف مدارج پر بیک وقت لاگو ہو سکتی ہے۔ "الجبّار" کے معنی ہیں قوت لیکن اس کا مطلب مجبور کرنے والا، قوت استعمال کرنے والا، مطلق العنان، طاقت ور، فاتح اور انتقام لینے والا بھی ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ یہ میرے چوکیدار کا نام بھی ہے۔ اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جبار اور الجبار ایک ہی حقیقت کا مربوط تسلسل ہیں۔

تماثل یا تجسیمیت:

Theomorphic or Anthromorphism

اللہ ہر شے میں ظاہر ہوتا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ انسانی صفات کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اللہ کے اسمائے حسنیٰ کی تجسیمیت (anthropomorphism) یعنی خدا میں انسان کو دیکھنے کا عمل ہے۔ جن لوگوں کو اسما کے الہامی ہونے پر یقین نہیں، وہ ان کے خلاف اسی بات کو بطور الزام استعمال کرتے ہیں۔ کئی صفات مثلاً معاف کرنا (غفور)، شکر گزار ہونا (شکور)، صبر کرنا (صبور)، بدلہ لینا (منتقم) پہلی نظر میں

Marfat.com

ہی انسانی اوصاف معلوم ہوتی ہیں۔اسمائے حسنیٰ کا انسانی اوصاف سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ ان میں سے بیشتر صفات عام مسلمانوں کے نام بن چکی ہیں۔اللہ کی صفات ظاہر ہوتی ہیں (manifest) لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسمائے الٰہی دراصل اللہ کی مخلوقات کی صفات کے نام ہیں۔

مسلمانوں کے نام اللہ کی صفات کے مظاہر کو انسانوں سے وابستہ کر دیتے ہیں جو اللہ کا عکس ہیں لیکن یہ انسانی صفات اللہ نہیں ہوسکتیں۔یہ اسمائے الٰہی جب تک صرف اللہ کی صفات کا اظہار کرتے ہیں، اس وقت تک انھیں انسانی صفات قرار نہیں دیا جا سکتا۔لیکن اس کا متضاد خیال یہ ہے کہ اسمائے حسنیٰ اللہ کے مماثل یا مشابہ (theomorphism) ہیں۔یہ خدا کو انسان میں دیکھنے کا عمل ہے۔مثلاً والجلال اور ولاکرام جیسی صفات انسانی نہیں اور صرف خدا سے تعلق رکھتی ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ صفات بیک وقت مماثل بھی ہوں اور تجسیمی بھی۔یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب اللہ اور اس کی مخلوقات حقیقت کے ایک ہی تسلسل میں جڑی ہوئی ہوں اور انسان اور اس کا خالق وحدت کے تسلسل کے مختلف مدارج میں بیک وقت موجود ہوں۔تجسیمیت انسان کو خدا کے حوالے سے دیکھتی ہے اور تمثیلیت خدا کو انسان کے حوالے سے دیکھتی ہے۔یہ ایک ہی خیال کے اوپر۔نیچے کے مقامات ہیں جو ایک تسلسل کے دو کناروں پر موجود ہیں۔اللہ رفیع واعلاترین مقام ہے جب کہ انسان اسی وجود کا سب سے نچلا مقام ہے۔دونوں ایک ہی حقیقت میں اس طرح گندھے ہوئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔بنی نوعِ انسان (-) کے ظہور، ارتقا، توسیع اور مسلسل پیش قدمی کا انحصار اللہ (+) سے اس کے تعامل یا ربط پر ہے۔مستقبل میں انسان کی پیش رفت اور ترقی کا تمام تر دارو مدار انسان اور اللہ کے بڑھتے ہوئے ربط و تعلق پر ہوگا۔اس سلسلے میں انسان کے لیے کلیدی اور بنیادی نوعیت کا سوال یہ ہوگا کہ اس ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہو اور اسے کس مساوات کے تحت سمجھا جائے؟

اس سے یقیناً قطبیت (polarity) کا رجحان ظاہر ہوتا ہے یعنی اللہ کے الہامی ناموں کی مختلف سطحوں اور قیمتوں (values) کا ایک تسلسل۔ان ناموں کی ایک سطح انسانوں کے لیے ہے اور دوسری اللہ کے لیے جیسے رحمان (مہربان) اور الرّحمان (سب سے زیادہ مہربان)۔اسی طرح ہر نام کے دو پہلو ہیں، ایک انسانی اور دوسرا الوہی۔اور یوں الوہی سے لے کر انسانی پہلو تک صفات کا ایک درجہ وار تسلسل (continuum of

Marfat.com

(graded values) قائم ہو جاتا ہے۔ ہر نام اپنی جگہ پر بیک وقت آفاقی معانی و مفاہیم کا حامل بھی ہے اور مطلوبہ صفات کے ارضی سے لے کر سماوی پہلوؤں تک مختلف درجات کا تسلسل بھی۔

قانونِ الٰہی سے مطابقت:
Allignment to Divine Law

اگر آپ مقناطیس کا ایک ٹکڑا لیں اور اسے ایک تار سے باندھ کر لٹکا لیں تو یہ خود بخود زمین کے قطب شمالی اور قطب جنوبی کا رُخ اختیار کر لے گا۔ قطب نما کی سبھی سوئیاں اسی اصول پر بنائی جاتی ہیں۔ یہ مقناطیس کی فطری خاصیت ہے کہ وہ خود کو عالمِ فطرت کے قطبین کے رُخ سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ اسی طرح انسانی فطرت بھی، اپنی خِلقی خصوصیت، جبلت، حیاتیاتی نسب (genes)، فطری صلاحیت اور پیدائشی میلان کے باعث، اللہ سے ہم آہنگ ہونے کا رجحان رکھتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان آزاد ارادے اور اختیار کا مالک ہے اور خدا اس معاملے میں کوئی جبر روا نہیں رکھتا۔ اپنی فطرت کے خلقی رجحان کی خلاف ورزی کرنے سے بے اطمینانی، ناخوشی اور بالآخر ایک گہری پشیمانی اور خجالت پیدا ہوتی ہے۔ سی۔ جے۔ ژونگ نے ایسے کئی افراد کی مثالیں (case histories) بیان کی ہیں جنھوں نے کامیاب مگر انتہائی ناخوش گوار زندگی بسر کی ہے۔ مقبول فلمی ستاروں کی رنگین اور چکا چوند زندگی کے الم ناک انجام کی کہانیاں بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ انسان کی خوشی اور احساسِ تکمیل کا دار و مدار قانونِ فطرت سے ہم آہنگ ہونے میں ہے۔ فطرت کی قانون شکنی کا نتیجہ صرف تباہی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جدید ماحولیاتی سائنس بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ انسان کو فطرت کے قوانین کی خلاف ورزی کی عادت کو ترک کرنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی زندگی کا، جو بالاتر حقیقت ہے، قانونِ الٰہی سے مطابقت اختیار کرنا لازمی ہے۔ تمام گرجوں اور ساری مسجدوں کا رُخ ایک خاص سمت کی طرف کیا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی جدوجہد اور زندگی کا بھی ایک خاص رُخ ہونا چاہیے۔ اگر آپ تھوڑا سا لوہچون یونھی بے ترتیبی سے کسی کاغذ پر پھیلا دیں اور پھر اس پر مقناطیس پھیریں تو آپ دیکھیں گے کہ سارا لوہچون مقناطیسی میدان (magnetic field) کے مطابق ایک خاص نمونے کی صورت میں ترتیب پا لے گا۔ انسانی زندگی، یعنی قبل از تاریخ سے لے کر آج تک کی تمام تر انسانی زندگی بھی اسی طرح ان جانے میں اللہ کی صفات اور فطرت کے مطابق ایک خاص نمونے میں ڈھلتی چلی آئی ہے۔ اگر آپ انفرادیت کی بجائے کلیت پر

Marfat.com

مبنی نقطۂ نظر اپنائیں اور اس کلی نمونے کو شناخت کرنے کی استعداد حاصل کر لیں تو یہ بات اور بھی وضاحت سے آپ پر عیاں ہو جائے گی۔ سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے متوازی حقیقتیں ہیں۔ ہمیں اعلا و ارفع حقیقتوں کا ادراک حاصل کرنے کے لیے اپنی سائنس کو ایک نیا رُخ عطا کرنا ہوگا۔ انسانی سائنس الوہیت کی تشریح و توضیح نہیں کر سکتی البتہ قانونِ الٰہی کا علم اعلاتر سائنسی حقائق کو سمجھنے میں انسان کا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ کل جزو کو معنویت عطا کرتا ہے، جزو کل کی تشریح و توضیح نہیں کر سکتا۔ معروف امریکی ماہرِ طبیعیات اور *Tao of Physics* نامی کتاب کے مصنف، فریجوف کیپرا (Fritjof Capra) نے نامیاتی حیاتیات (Organic Biology)، گیسٹالٹ نفسیات (Gestalt psychology)، ماحولیات، (ecology) زندگی کے سائنسی علوم اور نظریہ نظام (systems theory) جیسے جدید نظریات میں تبدیلی لانے کے لیے بنیاد فراہم کر دی ہے۔ وہ مصر ہے کہ مغربی دنیا کو خطِ مستقیم میں سوچنے کی روایت اور حقیقت کو سمجھنے کے مشینی نقطۂ نظر سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے۔ فریجوف اس تخفیفی کارتیسی (Cartesian) نظریے پر سخت تنقید کرتا ہے جس کے مطابق کسی بھی شے کی کلیت (wholeness) کا علم حاصل کرنے کے لیے اس کے الگ الگ اجزا کا مطالعہ کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس وہ اپنے قارئین کو کلّیت پر مبنی نقطۂ نظر (Holistic Approach) اپنانے کی ترغیب دیتا ہے۔ ۱۹۷۵ میں شائع ہونے والی اس کی کتاب *Tao of Physics* قدیم صوفیانہ روایات اور بیسویں صدی کی جدید سائنسی ایجادات کے درمیان حیرت انگیز مماثلتیں پیش کر کے روایتی عقل و دانش کو للکار رہی ہے۔ اس کی ایک اور کتاب *Turning Point: Science, Society and the Rising Culture* جو ۱۹۸۲ میں شائع ہوئی، کے آغاز میں سائنس اور معاشیات کی تاریخ کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اور پھر کارتیسی (Cartesian) زاویہ فکر، نیوٹن کے اندازِ نظر اور تخفیفی (Reductionist) نقطۂ نظر کی کوتاہیاں بیان کی گئی ہیں۔ یہ کتاب واضح کرتی ہے کہ کیسے یہ نقطہ ہائے نظر جدید ٹیکنالوجی اور ماحولیاتی ضرورتوں کے لیے ناکافی ثابت ہو رہے ہیں اور پھر استدلال کرتی ہے کہ سائنس کو مزید پیش رفت کے لیے کلیت پر مبنی نقطۂ نظر اور تصورات اپنانے کی ضرورت ہے تاکہ معاشرے کے پیچیدہ مسائل کا حل نکالا جا سکے۔

Marfat.com

ڈیوڈ بوم:
David Bohm

ڈیوڈ بوم (۱۹۱۷۔۹۴) اپنی نسل کے نظریہ ساز ماہرینِ طبیعیات میں سے ایک ہیں اور اس ابھرتے ہوئے مؤثر اور مقبول نقطۂ نظر کے حامل ہیں جس کی مدد سے دنیا کو ایک نئی طرح سے سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بوم نے کائنات کی تفہیم کے روایتی کوانٹم نظریے کو چیلنج کیا ہے اور اس کے نتیجے میں سائنس دان اپنے سائنسی نظریات اور طریق کار پر نظر ثانی کرنے پر مائل نظر آتے ہیں۔ انھوں نے فزکس کے ایک انقلابی نقطۂ نظر، ایک گہرے روحانی فہم اور انسانیت پر مبنی زاویۂ فکر کا امتزاج پیش کیا ہے۔ اپنی وفات (۱۹۹۲) سے پہلے انھوں نے دنیا بھر کے دورے کیے اور فزکس اور شعور (consciousness) کی معنویت کے موضوع پر لیکچر دیے۔ انھوں نے ان لیکچروں میں اپنا نظریۂ کلیت (theory of wholeness and the implicate order) اور اس کا مفہوم و مقصود بھی واضح کیا ہے۔ ان کی گفتگو کا مرکزی نکتہ دنیا کے بارے میں ایک نئے نقطۂ نظر کی تشکیل ہے جو مغربی دنیا کے ایک حصے میں ارتقا پذیر ہے۔ یہ نقطۂ نظر اجزا کے الگ الگ تجزیے کی بجائے کل کے مطالعے کو اہمیت دیتا ہے۔ اس انقلابی نوعیت کے نظریہ کلیت کے ذریعے بوم حقیقت کا ایک نیا اور انقلابی تصور (model) پیش کرتا ہے جو فزکس کے روایتی تصورات کو چیلنج کر رہا ہے۔ اس تصور کے تحت ہر عنصر ہولوگرام (hologram) کی طرح اپنے اندر پوری کائنات کی مکمل صورت لیے ہوئے ہے۔ بوہم کا کلیت کا تصور ذہن اور مادہ دونوں پر مشتمل ہے۔

بوم ان خطرات کا بھی ذکر کرتے ہیں جو ہمارے معاشروں کو درپیش ہیں اور ان تبدیلیوں کی بات بھی کرتے ہیں جو ان خطرات سے بچنے اور مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے ہمیں اپنے طرزِ فکر میں لانا ہوں گی۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں ماحولیاتی مسائل سے نمٹنے کے لیے اور زیادہ کلی نقطۂ نظر (holistic approach) اپنانا ہوگا اور زندگی میں اقتصادی ترقی کے علاوہ بھی کچھ تلاش کرنا ہوگا۔ اگر اقتصادی ترقی کی یہ دوڑ جاری رہی تو یہ ہمارے کرۂ ارض کو تباہ کر دے گی۔ انسان کے شعور میں یہ تبدیلی پیدا کرنا ہی اس مسئلے کا حل ہو سکتا ہے۔ ''ہمارے مستقبل کا دارومدار صرف اس بات پر ہے کہ ہم خود اس کو ایک اجتماعی زندگی، ایک کلیت کا حصہ سمجھنے پر آمادہ ہیں یا اس سے الگ سمجھنے پر مصر رہتے ہیں''۔

Marfat.com

ڈیوڈ بوم کوانٹم مکینیکل فزکس میں دنیا کے عظیم ترین سائنس دانوں اور فلسفیوں میں سے ایک ہیں اور جے۔ کرشن مرتی (J. Krishnamurti) اور آئن اسٹائن (Einstein) دونوں سے بیک وقت متاثر ہیں۔ایک بڑے مفکر کی طرح بوم نے وجدانی طور پر کائنات کی آفاقی صداقتوں سے آگاہ ہو کر انھیں ایک تخلیقی تصور کے طور پر فزکس اور فلسفہ دونوں کی زبان میں پیش کیا ہے۔ان کی فزکس اور تکوینی نظریات دونوں اس قدر وسعت کے حامل ہیں اور اپنے زمانے سے اتنا آگے ہیں کہ چند لوگ ہی ان کی تحسین کر سکے۔فزکس کے مرکزی دھارے سے وابستہ سائنس دانوں نے ان نظریات کو بالکل صوفیانہ قرار دے دیا اور صوفیہ ان کی گہری سائنسی منطق کو سمجھنے سے قاصر رہے۔(اس معاملے میں کرشنا مرتی ایک اہم استثنائی مثال ہیں)۔

بوم نے فزکس کی نئی تفہیم پیش کی ہے۔ان کے نزدیک فزکس محض پیش گوئی (prediction) یا اختیار (control) حاصل کرنے کا نام نہیں اور نہ یہ ریاضیاتی مساواتوں تک محدود ہے۔اگر چہ یہ بھی کاروبارِ فزکس کے اہم سروکار ہیں لیکن یہ اس کا جوہر، اس کا مرکزی نکتہ نہیں ہیں۔فزکس کا تعلق ایک تو فطرت سے ہے اور دوسرا اس بات سے کہ ہم فطرت کو کیسے سمجھتے ہیں۔بوم کے نزدیک فطرت کی معنویت اور اس کی مقصدیت کا تعلق تخلیقیت سے ہے؛ یعنی یہ ایک لامحدود کائنات کا سراغ، اس کا نقشہ ہے۔انھوں نے اسے ایک غیر منقسم کلیت کے طور پر دیکھا ہے جو ایک لامتناہی ماخذ سے پھوٹی ہے اور خود کو ہماری اس روزمرہ زندگی کی مرئی، مادی اور عارضی دنیا میں منکشف کرتی ہے۔انسانی فکر (thought) اس جزو کو تو سمجھ سکتی ہے جو خود کو ظاہر یا منکشف کر رہا ہے مگر اس جزو کا تجربہ کے لیے (experience) جو ظاہر نہیں ہو رہا، انسانی فکر سے ماورا کوئی صلاحیت، وجدان یا بصیرت درکار ہے۔ترتیب و تنظیم ،فکر اور زبان کی گہرائیوں میں کہیں کوئی ایک ایسا مقام آجاتا ہے جہاں ہم ناکام رہ جاتے ہیں اور صرف ایک مقدس خاموشی ہی سچائی کو منکشف کر سکتی ہے۔یہی خاموشی کُل کی زبان (language of the whole) ہے۔اور کُل کی یہ کائنات خود کو ہمارے ذریعے ایک متحد و ہم آہنگ زندگی میں پیش کر رہی ہے، نہ کہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی منقسم و منتشر زندگی میں۔ڈیوڈ بوم کا خیال یہ تھا کہ کوانٹم تھیوری اور نظریہ اضافیت (relativity) نے ایک دوسرے کی تردید (contradict) کر دی ہے۔اس تردید سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طبعی کائنات کی ایک اور بنیادی سطح بھی وجود رکھتی ہے۔ان کا دعویٰ ہے کہ کوانٹم تھیوری اور اضافیت دونوں نے اس زیادہ گہرے اساسی نظریے کی طرف اشارہ کیا ہے جو ایک غیر منقسم کُلیت (undivided wholeness) اور اس کی باطنی ترتیب و تنظیم کا (implicate order)

Marfat.com

اثبات کرتا ہے جس سے کائنات میں وہ ظاہری ترتیب و تنظیم (explicate order) پیدا ہوتی ہے جس کا ہم عملی طور پر تجربہ کرتے ہیں۔ یہ ظاہری ترتیب و تنظیم، اس باطنی نظم کی ایک مخصوص مثال ہے

سائنس کی نئی پیش رفت:
New leads being offered by Sciences

سائنس اور ریاضیات کے بارے میں میرا علم بالکل بنیادی نوعیت کا ہے، جو پرائمری سکول کی تعلیم کی حد سے زیادہ نہیں۔ یہ کام جدید سائنس دانوں کا ہے کہ وہ نئے اور متوازی راستے تلاش کریں؛ خاص طور پر فزکس، ریاضی، حیاتیات اور نفسیات کی پیش رفت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نظریات کو ہم آہنگ کر کے ایک اعلا و ارفع ترکیبی اور کلی نظریہ (higher synthesis) وضع کریں۔ میں تو زیادہ سے زیادہ لوک ثقافت کا ایک ماہر ہوں، جسے مغرب میں ایک ناکارہ شے سمجھا جاتا ہے، محض ایک فن کار، جس کا کوئی خاص امتیاز نہیں، اور ایک قسم کا سابقہ سماجی سائنس دان، جس نے اپنی پوری زندگی اللہ کی حقیقت اور فطرت کو سمجھنے کی کوشش میں صرف کر دی اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حقیقت کو سمجھنے کی چابی دراصل اللہ ہی کے پاس ہے۔ میں اپنے رہنما، اپنے روحانی پیشوا قدرت اللہ شہاب کا انتہائی احسان مند ہوں جنھوں نے میری اس عاجزانہ کوشش کے ہر مرحلے پر میری رہنمائی کی۔

علما اپنی تفاسیر میں اسمائے حسنیٰ کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے، ان کا ایک مطلب ایسا بیان کرتے ہیں جو ان کے الوہی پہلو کو ظاہر کرے اور دوسرا ایسا جو ان صفات کے انسانی پہلو کو بیان کرے۔ الرحمان اور الرحیم کی مثال لیجیے؛ علما اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ایک ہی صفت کے دو مدارج ہیں۔ وہ اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اللہ کے رحم و کرم کے کئی درجات ہو سکتے ہیں۔ کچھ علما کی رائے یہ ہے کہ رحم اللہ کی پہلی اور بنیادی صفت ہے جسے وہ اپنی ہر مخلوق پر یکساں ارزاں کرتا ہے لیکن کرم صرف منتخب اور برگزیدہ بندوں کے لیے مخصوص ہے۔ دوسروں کا خیال یہ ہے کہ اللہ کا رحم انسان کی ارضی زندگی سے متعلق ہے اور کرم کا تعلق اخروی زندگی سے ہے۔ جہاں تک ان کے انسانی پہلو کا تعلق ہے تو یہ صفات انسان کے لیے ایک قسم کی ترغیب یا ہدایت ہیں تاکہ وہ بھی اپنی ساتھی مخلوقات سے مہربانی کا برتاؤ کرے کیوں کہ اللہ ان لوگوں پر رحم کرتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں۔ یہ باہمی ربط و تعامل کا ایک چکر (cycle) ہے۔ زندگی کے اس باہمی مربوط چکر میں ''دینا'' شروع کریں تو ''پانا''

Marfat.com

نصیب ہوگا۔رحم کریں تا کہ آپ پر بھی رحم کیا جائے۔لہٰذا یہی نام انسانوں کے لیے بھی معنی کی ایک پرت کھول دیتا ہے۔

اوپر جانے والا زینہ:
Ladder of Ascension

اب اس بات کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں؛ اسمائے حسنیٰ کا اطلاق اللہ پر بھی ہوتا ہے اور مخلوقات پر بھی۔اس لیے الاوّل اور الآخر خدا اور انسان کو ظاہر کر سکتے ہیں۔اسی طرح اللہ باطن ہے اور انسان ظاہر۔اللہ مقدم ہے اور انسان مؤخر۔یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن اللہ ماخذ ہے، ابتدا کرنے والا ہے (المبدی) اور منزل بھی ہے جو اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے (المعید)۔لہٰذا اس تسلسل کو اگر اوپر سے، مطلق نظر سے دیکھیں تو سب کے سب نام صرف اور صرف اللہ کے ہیں۔یہ بات سچائی کی اس مخصوص فطرت اور صفت پر روشنی ڈالتی ہے کہ یہ ہمیشہ اضافی ہوتی ہے اور دیکھنے والے کے نقطۂ نظر پر انحصار کرتی ہے۔جتنے نقطۂ نظر ہوتے ہیں، اتنی ہی سچائیاں ہوتی ہیں۔ہر سچائی بس ایک نقطۂ نظر ہی تو ہے۔اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اسمائے حسنیٰ کی تعبیر وتفسیر کے بھی اتنے ہی نظریے ہو سکتے ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ کے نام اصل میں ''اعلیٰ اقدار'' اور ''نیک صفات'' کے مدارج ہیں۔یہ تسلسل الوہیت کی ارفع منازل تک پہنچنے کے لیے ایک زینہ فراہم کرتا ہے اور اللہ کا عرفان حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ کے نام بیک وقت اس کی مخلوقات پر بھی منطبق ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسمائے الٰہی کے معانی کی کئی پرتیں اور درجات ہیں جو مخلوق سے لے کر خالق تک ہر سطح پر منطبق ہوتے ہیں ان صفات کی مطلق قیمت (absolute value) تو اللہ سے منسلک ہے اور اس کے مختلف درجات انسانوں اور دوسری مخلوقات پر لاگو آتے ہیں۔لہٰذا ایک جانب تو ہے اقتدارِ اعلیٰ اور دوسری جانب ہے مطلق العنان۔اس طرح پوری کائنات میں ایک ہی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ان ناموں کے معانی ومفاہیم کی مختلف پرتیں اور سطحیں ہیں جو عیاں سے نہاں اور ارضی سے سماوی تک ہر شے پر منطبق ہو سکتی ہیں۔ایک طرف یہ اسمائے الٰہی، اللہ کی مطلق صفات کی علامت ہیں اور دوسری طرف انسانی اقدار کا مطلوبہ تسلسل فراہم کرتے ہیں۔یوں یہ اسمائے حسنیٰ؛ ایک تو طبعی دنیا میں اور دوسرے انسانوں کے طرزِ عمل میں، اللہ کی تلاش اور دریافت کا ایک ذریعہ

Marfat.com

بن جاتے ہیں۔یعنی یہ اسما؛ ان صفات کو پانے کے لیے، انھیں اپنانے اور اختیار کرنے کے لیے، اللہ کو جاننے اور اس کا تجربہ کرنے کے لیے اور اپنے آئیڈیل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اقدار کا ابد تک اوپر جانے والا ایک زینہ فراہم کر دیتے ہیں اور یہی ان کا الوہی مقصد ہے۔ یہاں اللہ مطلق سکون (القیوم) کو ظاہر کرتا ہے اور انسان اپنی ذات کی تکمیل کی آرزو، طلب، بھوک اور بے قراری کی علامت بن جاتا ہے۔اسمائے الٰہی انسان کے نام اللہ کا پیغام ہیں اور صفاتِ الٰہی انسان کی گہری باطنی آرزو کا اظہار ہیں۔

سچ کو اندر دریافت کریں:
Discover the Truth within

مشرقی صوفی اور روحانی طالب اپنے اندر صفاتِ الٰہی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیوں کہ ان کا اعتقاد ہے کہ اللہ اور اس کی فطرت کی الفاظ میں تعریف نہیں کی جاسکتی لہٰذا اللہ کا حقیقی ادراک حاصل کرنے کے لیے اس کی صفات پر غور وفکر کرنے اور انھیں اپنے اندر اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ان کا عقیدہ ہے کہ انسان پر یہ لازم ہے کہ وہ اس سچائی کو پہلے اپنے اندر تلاش کرے اور پھر اپنے گردوپیش میں پھیلی ہوئی کائنات میں دریافت کرے۔

القدوس: پاک:
Al-Qudus: The Pure

اللہ کی انتہائی اہم صفات میں سے ایک پاکیزگی، صفائی، راست بازی اور کاملیت (القدوس) ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک الوہی صفت ہے جسے حاصل کرنے کا حکم اللہ انسان کو دیتا ہے۔ بہت سے پارسا مسلمان اللہ کے اس حکم کی تعمیل کے لیے وضو، طہارت اور جسمانی پاکیزگی کے دیگر امور کی شدت سے پابندی کرتے ہیں۔لیکن وہ اس قدر کی سب سے نچلی یعنی جسمانی سطح کو اپناتے ہیں اور اس صفت کی اعلا وارفع سطحوں تک بلند ہونے میں ناکام رہتے ہیں۔ برعظیم پاک وہند میں ۱۹۴۷ میں مسلمانوں کے لیے جو علیحدہ مملکت قائم ہوئی تھی اس کا نام ''پاکستان'' رکھا گیا تھا جس کا مطلب ہے پاک لوگوں کی سرزمین ۔ یہ نام اس پاکیزہ ترین ہستی (القدوس) کے نام پر رکھا گیا تھا لیکن بدعنوان حکومتوں، مطلق العنان آمروں اور بددیانت حکمرانوں کی وجہ سے چند عشروں میں یہ ملک انحطاط، انتشار، قانون اور نظام کی تباہی اور مکمل انہدام کے کنارے پر پہنچ گیا ہے

Marfat.com

۔قانون شکنی اور بداعمالی روزمرہ کا معمول بن گئی ہے۔ ہر حکومتی نظام بگاڑ کا شکار ہو چکا ہے، ریاست کا پولیس جیسا اہم ستون گر چکا ہے اور کلیدی اہمیت کے حامل تمام ادارے؛ مثلاً ریلوے، بجلی اور ٹیلی فون کا نظام، کارپوریشنیں، فولاد کی صنعت، بنک، نظامِ تعلیم، طبی سہولیات، حتیٰ کہ کھیل کا شعبہ بھی، ایک ایک کر کے منہدم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ تکلیف دہ اور اذیت ناک تجربہ یہ سبق دیتا ہے کہ پاکیزگی، صفائی اور راست بازی کی صفات محض الوہی نہیں ہیں بلکہ انسانی زندگی اور اس کے نظام کو قائم رکھنے کے لیے بھی لازمی شرائط کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ صفات الوہی ہونے کے ساتھ ساتھ، اچھی انسانی زندگی اور پرامن بقا کی بھی اتنی ہی بلکہ شاید کچھ زیادہ عکاس و ترجمان ہیں۔ ایک آمر و جابر خدا، جو ڈنڈا ہاتھ میں لیے انسانوں سے اپنے احکام کی تعمیل اور صفائی، پاکیزگی اور راست بازی کا مطالبہ کر رہا ہو، خدا کا بالکل ناقص اور غلط تصور ہے۔ یہ صفات تو خود انسانوں کی بہتری اور بہبود کے لیے ضروری ہیں۔

ظاہر کا دور:
The Age of Zahir

دوسری طرف مغربی رویے صرف ظاہر پر زور دیتے ہیں۔۔۔یعنی عیسیٰ کے محض ظاہری پہلو کو ہی مقصود سمجھ لیا جاتا ہے اور انسان کے باطن سے اس کا پراسرار تعلق چھین لیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے مذہبی روایات و تہوار بھی ظاہریت میں کھوئے گئے ہیں۔ انھیں اس قدر کڑی رسوم اور تکلفات میں قید کر لیا گیا ہے کہ اب یہ انسان کی باطنی طلب اور اس کی اندرونی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ بہت سے مذاہب تو محض ظاہری رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان رسوم میں باطنی اقدار اور گہرے اندرونی تعلق کو بیدار کرنے کا اہتمام کیا جائے تاکہ حقیقت کی بلند تر سطح تک رسائی ہو سکے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تمام الہامی مذاہب باطنی پہلو پر اتنا زور دیتے ہیں۔ باطن کو ظاہر پر فوقیت حاصل ہے۔ انجیل کی اس آیت میں بھی کہ ''خدا کی سلطنت باطن میں ہے'' اسی بات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کی صفات پر غور کرو اور انھیں اپنانے کی کوشش کرو۔ اس بات کا مقصد یہ نہیں کہ انسان اللہ بن جائے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ انسان خود اپنے اندر اللہ کا تجربہ کر کے دیکھے اور یوں اس اعلا و ارفع حقیقت کا عرفان حاصل کرے۔ اسی سے یہ بھی علم ہو جاتا ہے کہ صفاتِ الٰہی کی زیادہ بڑی تعداد جسمانی یا طبعی دنیا کی بجائے انسانی اور نفسی کوائف سے متعلق کیوں ہے؟

Marfat.com

ظاہر ہے کہ انسان طبعی دنیا کے مقابلے میں فوقیت رکھتا ہے (مقدم)۔

اس خدا کو جس کا جوہر باطن میں ہے، مظاہر کی خارجی دنیا میں شناخت کرنا یا مظاہر کی دنیا (ظاہر) کو اندرونی دنیا (باطن) سمجھ بیٹھنا قانونِ وحدت کی سنگین خلاف ورزی اور اس کا الٹ یا معکوس رُخ ہے جو قانونِ فطرت کو مسخ کر دینے کے مترادف ہے۔ اسی لیے بیشتر مذاہب میں بت پرستی کی شدید ممانعت ہوتی ہے۔

حقیقت کی درجہ بندی انسان کو اللہ کی تخلیق کے ہر میدان میں کمال حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے؛ خواہ یہ مادی اور طبعی میدان ہو، یا انسانی اور نفسی میدان۔ جب مادے اور ذہن، جسم اور روح، دنیا اور آخرت کی متضاد سمتوں میں کھینچنے والی قوتوں میں زور آزمائی ہو رہی ہو تو توازن قائم رکھنا ضروری ہے۔ یعنی جب بھی طبعی اور نفسی دنیا میں کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو اصول تقدیم و تاخیر کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

اضافی غیر موجودگی اور موجودگی:
Relative Absence and Presence

درجہ بندی یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ یہ زندگی اور آنے والی زندگی اللہ کی موجودگی اور غیر موجودگی کے درمیان موجود تسلسل کا نام ہے۔ اللہ کبھی بھی مکمل طور پر غیر موجود نہیں ہوتا کیوں کہ وہ ہمارے گرد و پیش اور ہمارے اندر ہر شے میں موجود ہے لیکن وہ کبھی بھی مکمل طور پر موجود بھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ وہ ارفع ترین روح ہے۔ اس کا جوہر ہمیشہ ہم سے مخفی رہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہر شے اللہ کا مظہر ہے لیکن کوئی شے بھی اللہ کا مکمل مظہر نہیں ہے۔ سب اشیا اللہ کے مختلف مدارج کی مظہر ہیں لیکن کوئی شے بھی اللہ نہیں ہے۔

یہ مظاہر اصل میں وہ علامتیں ہیں جو اللہ کی فطرت کی شہادت دیتی ہیں اور انسان کو ترغیب دیتی ہیں کہ وہ ان کے ذریعے اللہ کو ظاہر و باطن میں تلاش کرے۔ ان میں ایک الوہی پیغام چھپا ہوا ہے کہ دنیا میں کچھ بھی اللہ کے مساوی نہیں ٹھہرایا جا سکتا لیکن دنیا میں اللہ کے سوا بھی کچھ نہیں ہے۔ مخلوق اللہ نہیں ہو سکتی لیکن مخلوق اللہ کے علاوہ بھی کچھ نہیں (والہ غیرك)۔ یہ انسانی وجود، اس کی سائنس اور فلسفے کا وہ تضاد ہے جو ہمیشہ دو طرح کے نقطۂ نظر پیدا کرنے کا باعث بنا رہے گا۔ یہی زندگی کی پہیلی ہے۔ اس کی مثال کوانٹم حقیقت کی سی ہے جو بیک وقت ٹھوس ذرہ بھی ہے اور غیر مرئی موج بھی، مادی بھی اور غیر مادی بھی، متعین بھی اور غیر متعین بھی۔ اسی طرح

Marfat.com

سائنسی مساوات E= MC2 یہ بتاتی ہے کہ مادہ اور توانائی ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ یہاں ہم اس سچائی کو بھی منکشف ہوتا دیکھتے ہیں کہ انسان بیک وقت خاک بھی ہے اور روح بھی، مادہ بھی ہے اور خدا بھی۔

اصل پیمانہ اللہ ہے:
Allah the Measure

یہ اسما انسان کو درست طرزِ عمل کا راز بتاتے ہیں کیوں کہ صفاتِ الٰہی انسانی فطرت میں منکشف ہوتی ہیں۔ انسانی رویہ، انسانی طرزِ عمل ہی اصل کلید ہے کیوں کہ بیشتر اسمائے الٰہی ایسے انسانی اوصاف کو ظاہر کرتے ہیں جو صرف انسانی برتاؤ میں رونما ہوتے ہیں۔ ان اچھے اعمال کو اپنا لیجیے تو آپ زندگی کی حقیقی معنویت تک پہنچ جائیں گے۔ کیوں کہ اس عارضی اور ناپائیدار، فنا پذیر اور لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی دنیا (عالمِ شہادت) میں یہ اسمائے حسنیٰ انسان کو ناقابلِ تغیر اور مستقل اقدار کی تلاش، دریافت اور ان سے وابستہ ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

اسمائے حسنیٰ انسان کو خدا کی تلاش کے لیے، زندگی کا اچھا رُخ دیکھنے اور اپنے ساتھی انسانوں میں صرف اچھائی اور نیکی تلاش کرنے کا درس دیتے ہیں کیوں کہ اللہ اچھی صفات کا مالک ہے اور خود کو صرف اچھائی میں منکشف کرتا ہے۔ یہ باہمی تعامل پر مبنی چکر ہے یعنی جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ اللہ کی صفات کی ترتیب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کی اچھی اور فائدہ بخش صفات تعداد میں اس کی ضرر رساں اور اصلاحی نوعیت کی صفات سے کہیں زیادہ ہیں۔ مثال کے طور پر یہ سلسلہ دیکھیے: البـــــــــــرّ (اچھا)، التوّاب (معاف کرنے والا)، المنتقم (انتقام لینے والا)، العفو (درگزر کرنے والا)، المرؤف (رحم دل)۔ یہ انسان کو اچھائی یا نیکی کی اصل نوعیت سے بھی آگاہ کرتا ہے اور اس بارے میں اس کے ناقص تصورات کی بھی اصلاح کر دیتا ہے۔ اچھائی (goodness) کیسے قائم کی جاسکتی ہے جب تک برے اور خراب کو سزا نہ دی جائے؟ ہم اچھائی کو کیسے سمجھ سکتے ہیں جب تک ہمیں یہ علم نہ ہو کہ اسے کن صفات میں اور کہاں تلاش کیا جائے؟ لہٰذا اسمائے حسنیٰ کا ایک کام یہ بھی ہے کہ یہ ایک پیمانہ، اعلیٰ اقدار کا ایک معیار مقرر کر دیتے ہیں جسے انسان اپنے گرد و پیش میں تلاش کر سکتا ہے۔ یہ حقیقت، کہ اسمائے حسنیٰ محض اللہ کی ذات کے ایک خاص درجے، ایک خاص طولِ موج کو ظاہر کرتے ہیں، اس طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ ان صفات کو پانے کی کوشش میں انسان جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ اللہ کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ جب ہم ان صفات کے کسی نہ کسی درجے کو حاصل کرنے کی

Marfat.com

سعی کرتے ہیں تو ہم اللہ کی اچھائی کا کوئی نہ کوئی درجہ پا لیتے ہیں۔ اس تلاش میں ہم اپنی ذات، اپنی طلب اور اپنی کامیابیوں کی ہر سطح پر اللہ کے سوا کچھ نہیں پاتے۔ کوئی کامیابی بھی ہماری آخری منزل نہیں بن سکتی بلکہ ہر منزل حقیقت کے اوپر جانے والے زینے پر، ایک برتر سطح کی جانب سفر کا نقطۂ آغاز بن جاتی ہے۔

اللہ کی صفات انسان کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان الوہی صفات کی انسانی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ یہی صفات رویہ یا کردار بنتی ہیں جیسے رحمان (اچھا)، رحیم (مہربان)، قدوس (راست باز)، سلام (امن پسند)، مہیمن (محافظ)، خالق (شروع کرنے والا)، مصور (خالق)، فاتح (پہل کرنے والا)، علیم (صاحبِ علم)، عدل (منصف)۔ یہ وہ اقدار ہیں جنھیں ذاتی اور سماجی سطح پر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ انسان کے لیے یوں ضروری ہیں تا کہ ان کی مدد سے وہ اس ذاتِ عظیم یا اپنی ہی ذات کے تسلسل کے آخری سرے یعنی الرحمان اور الرحیم وغیرہ کے مقام کو اچھی طرح سمجھ سکے اور اس کا حقیقی عرفان حاصل کر سکے۔ انسان کے تصورِ حقیقت پر ان صفات کا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔

الرحمان، الرحیم، القدوس جیسے نام وحدت کے درجہ وار، اوپر جانے والے زینے پر، جو انسان سے اللہ تک پہنچتا ہے، صفاتِ الٰہی کا ایک تسلسل قائم کرتے ہیں اور خدا کی آسمانی سلطنت، اس لافانی حقیقت کی غیر مرئی دنیا، تک رسائی حاصل کرنے کا سب سے مضبوط اور توانا وسیلہ بنتے ہیں جس کا وعدہ ہر مذہب کرتا ہے۔

یہ حقیقت کہ اسمائے الٰہی میں سے ہر ایک اسم اس ذاتِ عظیم کا محض ایک درجہ، ایک طولِ موج ہے، اور جس پر اکثر زور بھی دیا جاتا ہے؛ اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ صفات پرستش کے لائق نہیں کیوں کہ یہ خود اپنی ذات میں قائم و دائم نہیں ہیں۔ تمام اسمائے الٰہی ایک عظیم ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور وہی ذات اصل میں تمام تر پرستش اور عبودیت کی مستحق ہے۔ ان مخصوص مذاہب کی طرح نہیں جن میں کسی ایک نام سے متعلق کوئی مخصوص الوہی ہستی وضع کر لی جاتی ہے اور اس کا نتیجہ کثرت پرستی کی صورت میں نکلتا ہے۔ مسلمان بھی اللہ کے کسی ایک نام کا ورد کرتے ہیں لیکن ان کا مقصد اس صفت کی پرستش کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس مخصوص خدائی صفت کو اپنے اندر پیدا کرنا ہوتا ہے۔

ہم اسمائے الٰہی کے لطیف اور واضح مقاصد، ان کے استعمال اور اس زمان و مکاں اور انسان کے نفس میں ان کی عملی قدر کے بارے میں اس گفتگو کو بہت دیر تک جاری رکھ سکتے ہیں لیکن اس مشاہدے پر یہ بات ختم کی

Marfat.com

جارہی ہے کہ اسماے الٰہی انسان کی ترقی اور پیش رفت کا بہت مؤثر عملی ذریعہ ہیں۔

ان اسماے حسنیٰ کے روحانی پہلو کی گہری تحقیق اس تصنیف کی حدود سے باہر اور اس مصنف کی استعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا ہم ان اسماے حسنیٰ کے طبعی اور سماجی سائنس میں عملی استعمال کی طرف لوٹتے ہیں اور اللہ کے سائنسی اصول کی تشکیل کے لیے تجرباتی شہادتیں حاصل کرنے کی طرف بڑھتے ہیں۔

انسان کا مزاج، اس کی خصوصیات، جذبات اور صفات اس کے عمل اور رویے میں ظاہر ہوتی ہیں۔ غصہ، رحم دلی، محبت، نفرت، تعصب، بھوک، مسرت، اداسی، مایوسی جیسی ذہنی کیفیات جوں ہی طاری ہوتی ہیں، فوراً پہچانی جاتی ہیں۔ یوں مخفی کیفیات اور ذہنی حالتیں (باطن) رویے یا کردار میں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

کیسے چھپاؤں رازِ غم، دیدۂ تر کو کیا کروں
دل کی تپش کو کیا کروں، سوزِ جگر کو کیا کروں

اسی طرح اللہ کی صفات بھی حقیقت کے ہر میدان، ہر پہلو میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہاں یہ اعتراض صادق نہیں آتا کہ یہ خدا میں انسان کو دیکھنے کی کوشش ہے۔ یہ تو حقیقت کا معکوس رُخ ہوگا۔ اللہ کی صفات انسان میں ظاہر ہوتی ہیں نہ کہ اس کے برعکس کہ انسان کی صفات اللہ میں ظاہر ہوں۔ ظاہر ہے کہ اللہ؛ جو چاہتا ہے کہ اسے جانا جائے اور جو خود کو ایک مثالی نمونے، ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کرتا ہے، خود کو انسانی تجربات سے بالکل الگ اور بیگانہ نہیں رکھ سکتا۔ انسان اور اللہ ایک دوسرے میں گندھے ہوئے ہیں؛ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ یہ آخر کار ایک ہی تسلسل کے اوپر۔ نیچے کے مقامات ہیں۔ ہم ترقی کرتے ہوئے اوپر کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نوشتۂ دیوار ہے جس سے انحراف ممکن نہیں۔ اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے انسان کسی اور کی نہیں، خود اپنی ہی ذات کی برتر سطح کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔ خدا کی طرف بڑھتے ہوئے انسان اپنی ہی بلندیوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یہی وہ اصول ہے جو انسان کے ارتقا، ترقی، تہذیب، نفاست، حسن، عمدگی، اچھائی اور فوق البشر میں تبدیل ہو جانے کا راستہ بنتا ہے۔ یہی Know Thyself (خود کو پہچانو) کے فلسفیانہ مقولے کی اصل معنویت ہے جو صدیوں سے انسان کی تگ ودو کا مرکز رہا ہے۔ یہی جدید سیاسی ریاست جیسے سماجی و سیاسی ادارے کا بنیادی اصول اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی جمہوری تحریک کا پس پردہ محرک بھی ہے۔

انسان ہر شے کا پیمانہ ہے۔

Marfat.com

خدا ہر شے کا پیمانہ ہے۔

مغربی سائنس پہلی بات پر یقین رکھتی ہے۔ مشرقی مذاہب دوسری بات پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ تمام گرجوں اور خانقاہوں کا رُخ لازماً مشرق کی طرف ہونا چاہیے۔ مگر ابھی مشرق کا اس بات کو سائنسی طریقے سے ثابت کرنا باقی ہے۔ اوپر درج کیے گئے یہ بیانات ایک ہی حقیقت کے اوپر۔ نیچے کے مقامات بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

اللہ اور انسان کی مساوات:
Allah's Parity with Man

اللہ انسان سے مشابہ ہے کیوں کہ انسان اس کی سب سے عمدہ اور اعلیٰ ترین مخلوق ہے۔ باہمی ربط کی یہ مشابہت، حقیقت کی ہر سطح پر، ہر ربطِ باہم میں، خواہ لادینی ہو یا مقدس، ہر طرح سے مساوی ہے۔ یہ اللہ کا انسان سے جو اشرف المخلوقات ہے، پچاس فی صدی (fifty fifty) کا معاملہ ہے۔ اس باہمی ربط کا بالکل مساوی ہونا اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے دو ناموں اور صفات میں سے ایک صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے اور ایک انسان کے لیے۔ انسان کے پاس تدبیر کی صفت ہے تو اللہ کے پاس تقدیر کی۔ انسانی اور الوہی دونوں صفات کا باہمی تعامل بالکل مساوی ہے، مگر یہ متضاد اصول ہیں اور اصولِ تقدیم و تاخیر کی رو سے ان میں سے ایک مقدم ہے اور ایک مؤخر۔ تقدیر کو انسانی تدبیر پر فوقیت حاصل ہے لیکن عمل اور ردِ عمل کے اعتبار سے دونوں بالکل مساوی ہیں۔

انسان اچھا کام کرتا ہے، اللہ اس کی قسمت اچھی کرتا ہے۔
انسان برا کام کرتا ہے، اللہ اس کی قسمت بری کرتا ہے۔

آپ نے مجھے بالکل غلط سمجھا:
You Got Me All Wrong

اللہ کی منصف مزاجی اور انسان سے اس کے مساوی تعامل کے باعث اللہ نے انسان کی تقدیر اسی کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ جیسا تم کرو گے وہی اس کا فرمان ہوگا۔ یہ ہے تقدیر کی اصل حقیقت جس کا حقیقی مفہوم ابھی تک سمجھا نہیں گیا۔ یہ انسان کو ترغیب دیتی ہے کہ اپنی تقدیر خود اپنے اعمال کی مدد سے تشکیل دے۔ یہی صدیوں

Marfat.com

پرانی اور نہایت عمدہ کہاوت بھی ہے، جو بوؤ گے سو کاٹو گے۔

اصولِ مساوات میں انسان اور خدا باہم مساوی تعامل کرتے ہیں، برابر برابر، بروئے کار آتے ہیں، مساوی حقوق کے مالک ہیں، مساوات اور آزادی کی عظیم اقدار پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور خود اپنے اختیار اور ارادے کو استعمال کرتے ہیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود اگر دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو ان میں سے ایک دوسرے پر مقدم ہوگا۔ بہترین صورت یہ ہے کہ ان دونوں میں توازن رکھا جائے تاکہ انصاف اور استحکام پیدا ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کا اعلاترفرمان یہ ہے کہ انسان پر خدا کے حقوق اور فرائض عائد ہوتے ہیں لیکن خدا کا یہ حکم بھی ہے کہ انسان پر انسان کے حقوق اور فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسلامی صحائف میں اللہ حقوق العباد کو بھی مساوی اہمیت دیتا ہے۔ یہ اصولِ مساوات حقیقت کے تمام آفاق پر لاگو ہوتا ہے اور ان کے تمام درجات؛ جان دار، بے جان، پودے، حیوانات، حیوان اور انسان، چاند اور زمین، زمین اور سورج، مرد اور عورت، انسان اور خدا تک ہر شے پر محیط ہے۔

جدید انسان کی خدا کے خلاف بغاوت:
Revolt of Modern Man against God

سب سے پہلے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان اب پختہ کار ہو چکا ہے۔ اس کی آگہی، علم اور انا انفرادیت پسندی اور خود مرکزیت کی اس حد تک ترقی کر گئے ہیں کہ اب وہ اپنی مرضی اور اختیار کے علاوہ کسی طاقت، کسی قوت کی اطاعت نہیں کر سکتا۔ انسان اب کسی بھی غیر عقلی، غیر منطقی خدا کو تسلیم نہیں کر سکتا، ظالم و جابر خدا کا وہ تصور جو ہمیں اپنے آمرانہ آباؤ اجداد سے ورثے میں ملا ہے یا جسے ہمارے کلیساؤں اور مندروں پر تسلط جمانے والے مذہبی رہنماؤں نے تشکیل دیا ہے، اب انسان کے لیے قابلِ قبول نہیں رہا۔

برنارڈ شا کا ڈراما *Pygmalion* جسے بعد میں *My Fair Lady* کے نام سے فلمایا بھی گیا، اس انسانی ڈرامے کو نہایت خوب صورتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ پھول بیچنے والی لڑکی جب شہزادی بن جاتی ہے تو اپنا جوتا اپنے خالق، اپنے رہنما کے منہ پر دے مارتی ہے اور اس کا تجرباتی چوہا بننے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ مساوی حقوق اور ایک فرد کی حیثیت سے مساوی ربط باہم کا مطالبہ کرنا اپنا حق سمجھتی ہے۔ وہ اپنی علیحدہ شناخت منوانا چاہتی ہے، اپنی ذاتی شخصیت اور اقدار کی بنا پر اپنی قدر و قیمت کا تعین کرانا چاہتی ہے، ایک علیحدہ اور آزاد فرد کی

Marfat.com

حیثیت سے اپنی پہچان چاہتی ہے۔ وہ غلام بننے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ مساوی مقام کا مطالبہ کر دیتی ہے حالاں کہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اپنے خالق، اپنے استاد و رہنما کی زیر بار ہے۔

پروفیسر رچرڈ ڈاکن (Richard Dawkin)، جو The God Delusion جیسی کتاب کے مصنف ہیں، اور ملحدوں، انسان پرستوں اور لادینی افراد کی مختلف جماعتیں جو عصرِ حاضر میں پورے امریکہ اور یورپ میں پھیل رہی ہیں، اسی اعتماد اور تیقن سے خدا کا انکار کرتی ہیں جو پھول بیچنے والی لڑکی کو، خود آگہی اور خود انحصاری حاصل کر لینے کے بعد، نصیب ہوا تھا۔ اب وہ خود اپنی صفات کی بنا پر اپنا تشخص چاہتے ہیں۔ اللہ انھیں خاموشی سے، اپنی رحمت و مودت اور بے کراں تحمل اور وسیع الظرفی سے، اپنے مساوی حقوق دیے جاتا ہے۔

ادب اور شاعری کے ذریعے کسی وجدانی لمحے کی اڑان میں ایسی باتیں کہ دی جاتی ہیں جنھیں سائنس بعد ازاں برسوں کی ریاضت سے ثابت کرتی ہے۔ اس کی ایک مثال مشرقی شاعری میں دیکھیے:

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں
یا رب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

غالب

ہر ذرہ چمکتا ہے انوارِ الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

داغ دہلوی

یہ شاعرانہ بلند خیالی انسان اور خدا کے مساوی حقوق اور مساوی ربطِ باہم کا اظہار کرتی ہے۔ یہ بھی اللہ کی مساوات ہے کہ اس نے ایک صفت مشرق کو عطا کی ہے تو دوسری مغرب کو۔ شاعری مشرق کے حصے میں آئی ہے اور نثر مغرب کے۔ مذہب مشرق کو ملا ہے تو سائنس مغرب کو۔

Marfat.com

Marfat.com

باب ہشتم

اسمائے حسنیٰ کی فلسفیانہ اور سائنسی معنویت

خدا کو سمجھنے نکلیں،
تو انسان ہونے کا مطلب بھی سمجھ میں آجاتا ہے
کیوں کہ آخرکار
خدا ازل سے موجود رہا ہے
اور انسان کی سب سے گہری طلب اور تلاش بھی تو وہی ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

اسمائے حسنیٰ کا فلسفیانہ اور سائنسی مفہوم:

Philosophic and Scientific Import of Divine Names

یہ ثابت کرنے کے بعد کہ وحدت فطری طور پر دوطرفہ (bi-polar) ہوتی ہے اور چاروں ابعاد میں درجات کے ایک تسلسل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور یہ دیکھنے کے بعد کہ کیسے یہ جوڑے دار قطبین اللہ کی وحدت کو قائم رکھنے کے لیے ایک دوسرے سے حرکی تعامل (interact dynamically) کرتے ہیں اور کیسے اندرونی (باطن) اور بیرونی (ظاہر) عناصر مل کر وحدت کو بروئے کار لاتے ہیں؛ ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ حقیقت، خواہ جسمانی، طبعی اور حیاتیاتی ہو یا فلسفیانہ اور روحانی، ہر سطح پر ایک جیسی فطرت کا مظاہرہ کرتی ہے اور ایک جیسے اصولوں کے تحت عمل کرتی ہے کیوں کہ اللہ کی سلطنت ایک (الاحد) ہے، اس کی ذات اور اس کی مخلوق بھی ایک ہیں۔ زندگی کی تمام صورتوں کا ایک دوسرے پر منحصر ہونا، تمام تر علم کا یکساں اور یک رنگ ہونا اور سائنس کا مستقل اور آفاقی ہونا، یہ سب اصول اسی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں۔ کوانٹم نظریات کی جدید ترین تحقیق نے کائنات کی بنیادی وحدت کو ثابت کر دیا ہے۔ کوانٹم تجربات یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہم کائنات کو توڑ کر ایک دوسرے سے الگ اور آزاد اجزا میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ فطرت میں ایسے الگ الگ تعمیری ٹکڑے (building blocks) ہیں، نہ کوئی دوسرا (other) ہے اور نہ کوئی علیحدہ (separate)۔ یہ تو ایک باہم مربوط، ایک دوسرے سے جڑا ہوا، تانے بانے کی طرح ایک دوسرے میں پیوست اشیا سے بنا ہوا ایک پیچیدہ جال ہے جس میں جز اور کل کو ایک دوسرے سے الگ الگ کرنا ممکن نہیں۔ فطرت کا کلاسیکی مثالی تصور جس میں فطرت کی خارجی تصویر کھینچی جاتی تھی، اب ناکارہ ہو چکا ہے۔ جیسے کلاسیکی یوکلائیڈین چپٹی جیومیٹری (Euclidean flat geometry) یا کلاسیکی نیوٹنی مکینکی طبعیات (Newtonian

Marfat.com

(mechanical physics) کے نظریات اب کارآمد نہیں رہے۔ جدید سائنس ایک بار پھر کلیت یا اللہ کی وحدانیت کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اب آپ اسے جو نام چاہیں دے لیں۔

اسمائے حسنیٰ اللہ کی جانب سے نازل ہوئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اللہ موجود ہے۔ اللہ ایک حقیقت ہے اور وہ بنی نوع انسان سے ابلاغ کرنا چاہتا ہے۔ تمام مذاہب اسی خدائی ابلاغ کی صورتیں ہیں۔ اللہ انسانی ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔ وہ محض ایک تخیل نہیں، انسان کا تخلیق کردہ غیر مرئی بھوت نہیں۔ اللہ ہر شے پر محیط ایک حقیقت ہے۔ اس حقیقت میں عیاں (ظاہر) اور نہاں (باطن) سب کچھ شامل ہے بلکہ اسے یوں کہنا چاہیے کہ اللہ کی حقیقت ایک ہمیشہ بلند ہوتے ہوئے تسلسل پر، وحدت کے چاروں ابعاد میں، عیاں سے نہاں اور پست سے بلند تک ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ ''اللہ کے سوا کچھ بھی موجود نہیں (و لا الٰہ غیرك)'' اس کا فلسفیانہ مفہوم یہ ہے کہ تمام تر ظاہری حقیقت، حقیقتِ مرئی (دیدہ) سے لے کر حقیقتِ مطلق (نادیدہ) تک، مادی سے لے کر ماورائی تک، ایک تسلسل کا نام ہے۔ جوں جوں ہم ترقی کے زینے پر بلند ہوتے جاتے ہیں، حقیقت اتنی ہی مجرد، اتنی ہی غیر مرئی ہوتی جاتی ہے۔ فی الحال ذہن اس ارتقائی زینے کی بلند ترین منزل ہے۔ دوسری تمام حقیقتیں، جیسے ایٹم، عناصر، کائنات، بے جان، جان دار، زندگی، دماغ، ذہن، ثنویت، تکثیریت وغیرہ سب ایک ہی تسلسل کے مختلف درجات کو ظاہر کرتے ہیں۔

اللہ بہت سادہ سی حقیقت ہے جسے سمجھنا کسی گنوار دیہاتی سے لے کر جدید سائنس دان تک ہر ایک کے لیے نہایت آسان ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اللہ پیچیدہ ترین حقیقت ہے جو لاتعداد گنجلک نقطہ ہائے نظر پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اللہ وہی ہے جو آپ اسے سمجھتے ہیں کیوں کہ وہ سب کچھ ہے۔ ہر نقطۂ نظر، اللہ کا نقطۂ نظر ہے۔ آپ اسے جیسا سمجھیں گے، وہ آپ کے لیے ویسا ہی ہوگا۔ حقیقت کے ساتھ ہر رابطے میں رابطہ کار بھی لازمی طور پر شامل ہوتا ہے۔ یہاں وہ معروف صوفیانہ حکایت صادق آتی ہے جس میں پانچ اندھے ایک ہاتھی کو چھو کر دیکھتے اور بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ، ہاتھی کے جسم کے جس حصے پر بھی پڑتا ہے وہ اسے ویسا ہی سمجھتا اور بیان کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذاہب ہمیشہ اچھی بات سوچنے کا حکم دیتے ہیں۔ متعدد فلسفیانہ نظریات اور مکاتبِ فکر؛ وحدانیت (Monism)، ثنویت (Dualism)، مثالیت (Idealism)، اثباتیت (Positivism)، الحاد (Atheism)، لاادریت (Agnosticism)

Marfat.com

اور لادینیت (Secularism)، سب اگرچہ مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں مگر اصل میں یہ ایک ہی حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے کے مختلف انداز ہیں اور یہی حقیقت اصل میں سب کچھ ہے۔ ہر شخص، ہر مکتبۂ فکر، ہر معاشرہ اس نقطۂ نظر (paradigm) کے مطابق زندہ رہتا ہے جو اس کی انا کی تعمیر و ترقی کا ذریعہ بن جائے۔ یہی وہ مرکزی نکتہ، وہ محور ہے جو اس کے افکار و اعمال کا رخ متعین کرتا ہے۔ لہٰذا اس نقطۂ نظر (paradigm) میں رونما ہونے والی کوئی بھی تبدیلی اسے خطرے کی گھنٹی محسوس ہوتی ہے کیوں کہ اس تبدیلی سے اس کی انا کا بت ٹوٹنے کا خدشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یوں وہ ایک نوع کی خود پرستی (self-fixation) میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ہم اپنی اس خود پرستی (self-fixation) سے پرے کم ہی دیکھ پاتے ہیں۔ گویا خود شکنی یا نفی ذات (self-negation) اور کسی دوسرے (other) کے سامنے تسلیم و سپردگی اختیار کرنا انسان کی نشوونما اور اعلا تر ارتقا کے لیے بہت اہم ہے۔

جب برٹنڈ رسل کو گرفتار کیا گیا تو جیل کے پھاٹک پر متعین سپاہی کو اس کے بارے میں بنیادی معلومات جمع کرنے کا کام سونپا گیا۔ اس نے رسل سے پوچھا، 'جناب! آپ کا مذہب کیا ہے؟'، رسل نے جواب دیا، 'لاادریت' (Agnosticism)۔ سپاہی نے حیران پریشان ہو کر کہا، 'جناب، ذرا، اس کے ہجے بتا دیجیے!' اور زیر لب بڑبڑایا، 'ٹھیک ہے، مذہب تو بہت سے ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ سب ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں۔'

یہ سب انسانی ادراک کی مختلف صورتیں ہیں۔ اللہ مکمل اور عظیم ترین حقیقت ہے۔ وہ ایک کلیت ہے (Wholeness) جس میں سے کچھ بھی خارج نہیں ہے۔ کچھ خارج کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اللہ پورا نظارہ ہے۔ وہ پورا سچ ہے۔ اگر ہم حقائق کو خارج کرتے رہیں تو پورے سچ تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ ہماری سائنس بھی اگر غیر مرئی حقیقت کو اپنی اقلیم سے خارج کرتی رہی تو مزید پیش رفت نہیں کر سکے گی۔ اللہ موضوع (subject) بھی ہے اور معروض (object) بھی۔ میری تصنیف کا لب لباب یہ ہے کہ ظاہر اور باطن میں کوئی تفریق نہیں۔ یہ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ موضوع اور معروض باہم مربوط ہیں، منقسم نہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس پر مغربی سائنس گمراہی کا شکار ہوئی ہے۔ اللہ معروض ہے اور انسان موضوع۔ اس مساوات کا عکس یہ ہے کہ انسان موضوع ہے اور حقیقت معروض۔ اصولِ مساوات کے تحت ان دونوں کے درمیان باہمی ربط و تعامل (interaction) کی شرح نصفا نصف (۵۰/۵۰) ہے۔ موضوع، باطن (غیر مرئی) ہے اور معروض،

Marfat.com

ظاہر (مرئی)۔ انسان کے لیے حقیقت، تاریخ کے کسی بھی دور میں، کسی بھی لمحے میں، موضوع کے معروض کے ساتھ باہمی تعامل سے وجود میں آتی ہے۔ یہ ان قطبین کے درمیان، ہر لحظہ آگے بڑھتا ہوا، ہمیشہ مضطرب، سدا حرکت میں رہنے والا نقطہ ہے۔ اسی لیے اللہ ہر حقیقت کی حقیقت ہے، ہر سچائی کا سچ ہے اور اس حقیقت کے سوا کچھ حقیقت نہیں۔

سائنس مشرق کے صوفیانہ تجربے کو نظر انداز نہیں کر سکتی کیوں کہ مشرق کے صوفی کا علم تجربے پر مبنی ہے۔ سائنسی علم بھی اسی طرح تجربے پر مبنی ہے۔ صوفیانہ علم دیکھنے: اندروں پر نظر ڈالنے اور بیرون کا مشاہدہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ تضادات یعنی وجدان اور خارجی مشاہدے، کے باہمی تعامل سے جنم لیتا ہے۔ سائنسی علم بھی اسی طرح فرضیے (hypothesis) اور خارجی مشاہدے کے تعامل سے پیدا ہوتا ہے۔ تجربہ، علم کی بنیاد ہے۔ جاننے کے لیے عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس کوئی طریقہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ احساس (sensibility) بھی علم ہے لیکن جاننا (knowing)، احساس نہیں ہے۔ رُخ کا تعین، رویہ، احساس، عمل اور پھر علم۔ یہی ترتیب اصل کلید ہے۔ حقیقت کو صرف عمل اور تجربے کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جاننے کے لیے عمل کرنا ضروری ہے۔ اعلا تر حقیقت کو سمجھنے کے لیے اعلا کردار اختیار کرنا پڑے گا۔ تجرباتی علم کی کنجی تجربہ ہے۔ اسی طرح اللہ کا علم حاصل کرنے کی کنجی حسنِ کردار ہے۔

اس کلیے سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ سائنس اور فلسفے پر کئی صورتوں میں منطبق ہوتا ہے۔ تو چلیں، پہلے ہم ان مخصوص سائنسی اور فلسفیانہ قوانین، اصولوں اور تصورات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو ہم نے اسمائے حسنیٰ کے مفاہیم اور تجزیے سے اخذ کیے ہیں۔

وحدت کے قوانین:
The Laws of Unity

وحدت کا پہلا قانون یہ ہے کہ وحدت جوڑے دار اور دو قطبی (paired polarity) ہوتی ہے۔ یہ قانون اصول تضادات کے امتزاج کا اسرار کھولتا ہے۔ اسی امتزاج سے یعنی قطبین کے باہمی تعامل کے ذریعے مسلسل ترقی اور پیش رفت کا راستہ کھلتا ہے۔ یہ قانون اس بات کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ کیسے نفی (-) اور اثبات (+) کے قطبین کائناتی جنریٹر کا کام کرتے ہیں۔ قانونِ وحدت، متحد کرنے والا قانون بھی ہے۔ یہ ثبات و

Marfat.com

استقامت، میزان وتوازن، نشوونما اور توسیع، قلب ماہیت اور پیش رفت کا قانون ہے۔کائنات کی ہر چیز اس بنیادی اور اولین قانون کی پابند ہے، اس کی پیرو ہے اور اسی کی بازگشت سے گونج رہی ہے۔

راہِ سلوک کا مسافر صوفی اکثر ہجر (separation) اور وصال (union) کی دو باہمی متبادل (alternative) کیفیات اوران کے چکر(cycle) کا بیان کرتا ہے۔صوفیانہ ادب اور مشرقی شاعری ملاپ اور جدائی کی بدلتی ہوئی کیفیات کی ترجمان وعکاس رہی ہے۔ایسے تجربات، جن کی دستاویزی شہادت بھی ملتی ہے، تضادات (opposites) کی باہمی آمیزش اور تعامل کی اچھی مثال پیش کرتے ہیں۔صوفی کے لیے اس کے وجود کا جوہر، جدائی، تنہائی، علیحدگی اور خود ادعائی میں نہیں، سالم، حرکی اور غیر منقسم وحدت سے اتصال و پیوستگی میں کھلتا ہے۔اُس کے لیے ایک حرکی کل (dynamic Whole) سے کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔اس کا آزادنہ وجود اگرچہ ایک حقیقت ہے لیکن یہ ایک اضافی بات ہے۔اس کی اصل معنویت کُل میں اس کی مخصوص صورت اور ہیئت سے اجاگر ہوتی ہے اور یہی اس کی نشوونما اور شناخت کا باعث بنتی ہے۔ایک ہوجانے کے اس تجربے کے بغیر صوفی خود کو علیحدگی، جدائی اور معدومیت کے ایک خلا میں محسوس کرتا ہے۔صوفی اپنی آزادی (independence) اور اعلاتر اتحاد و یکجائی (unification) کے درمیان تعامل (interaction) کا ایک جزو ہے۔ان قطبین کے درمیان یہ ربطِ باہم جامد نہیں، حرکی ہے۔یہ باہمی ربط و تعامل ہجر اور وصال، شناخت اور آزادی، ادغام اور انفصال کے درمیان ہے اور یہ باہمی اثر ونفوذ کشش اور گریز، کھنچاؤ اور دباؤ، نفی اور اثبات کی قوتوں کے درمیان ہے۔راہِ سلوک کے کئی مقامات ہیں۔گویا صوفی کا تجربۂ حقیقت بھی درجہ وار ہوتا ہے۔یہ اللہ اور اس کی سمت بڑھنے والے صوفی کے درمیان، یعنی کُلی خودی (SELF) اور انسانی خودی (self) کے درمیان روز افزوں ربطِ باہم ہے جو وجود کی ہر سطح پر ہوتا ہے۔صوفی اس روزافزوں ربطِ باہم کا ایک جزو ہے۔وہ سائنس دان کی طرح اس عمل کا صرف ناظر (observer) نہیں ہوتا بلکہ ہجر و وصال کے اس جھولے میں خود بھی ہلارے لیتا ہے۔اس کی ذاتی شمولیت ہی ایک ہوجانے کے اس زندہ تجربے کو معنویت عطا کرتی ہے۔گویا اللہ (حقیقت) سے ربط وتعامل کے ہر تجربے میں شریک ہونے والا، خود بھی مساوی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔حقیقت کو صرف عمل اور باہمی تعامل، آزمائش اور تجربے (experiment and experience) کے ذریعے ہی جانا جاسکتا ہے۔جاننے کے لیے عمل کرنا (act to Know) پڑتا ہے۔اسی اصول پر اعلاتر حقیقت کو جاننے کے لیے اعلا کردار اختیار کرنا پڑتا ہے۔آزمائش تجرباتی علم کی کلید

Marfat.com

ہے۔میں پھر کہتا ہوں کہ عمل ہی اللہ کو سمجھنے کا ذریعہ ہے۔یہی اعلاتر حقیقت تک رسائی کا راستہ ہے۔اس کتاب کو لکھنے کے دوران میری ننھی بیٹی جس کی عمر اٹھارہ ماہ ہے، میرے کمپیوٹر کے کی بورڈ (key board) سے کھیل کھیل کر لطف اٹھاتی رہی۔اس آلے (key board) سے بار بار غلط پیغامات ارسال کرنے کا نتیجہ اس کے اپنے مرکز سے رابطہ ٹوٹ جانے کی صورت میں نکلا۔مرکزی مشین (processor) نے معلومات بھیجنے والے اس آلے (data input device) کو خود سے الگ کر دیا اور اس کی بھیجی گئی معلومات کو پہچاننے یا وصول کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ یہ آلہ (key board) نہ صرف درست تھا بلکہ پوری طرح چالو بھی تھا۔اسی طرح اگر عمل (input) درست نہ ہو تو نتیجہ (output) بھی درست نہیں نکلتا۔اگر عمل بالکل ہی غلط ہو جائے تو جدائی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔پس حقیقت سے ہر ربط، ہر تعامل میں شریک ہونے والا خود بھی اتنا ہی اہم ہوتا ہے۔جیسا عمل ویسا نتیجہ۔

صوفیانہ تجربہ ہمیں حقیقتِ مطلق (ultimate Reality) کی فطرت کی ایک اہم جھلک دکھاتا ہے جو ہماری سائنس کے لیے بہت اہمیت اور معنویت کی حامل ہے۔یہ تجربہ کوانٹم فزکس کے کچھ حالیہ تجربات کے متوازی اور مماثل ہے۔

گیسٹالٹ (Gestalt) نفسیات کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے ''ایک جامع کُل'' (unified whole)۔یہ ایک جرمن لفظ ہے جس کا عمومی ترجمہ ''کل'' (whole) یا ''ہیئت'' (form) جیسے الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔۱۹۲۰ میں جرمن ماہرینِ نفسیات نے بصری ادراک (visual perception) کے بارے میں کچھ نظریات وضع کیے جو یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم ایک جامع کُل میں کسی بصری عنصر کو کیسے سمجھتے ہیں۔لہٰذا آرٹ کی نفسیات میں گیسٹالٹ ان تصورات کی توضیح کرتا ہے جن کی مدد سے کسی نمونے (design) میں وحدت اور تنوع دونوں پیدا کیے جا سکتے ہیں۔گیسٹالٹ کا نظریہ کسی تصویر کے اجزا اور کل کے درمیان رشتے سے تعلق رکھتا ہے۔وہی اصول جو کلیت پیدا کرنے کا باعث ہے، الٹ کر اسے اجزا میں تقسیم کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔اس طرح یہ اجزا منفرد اور انوکھے معلوم ہوتے ہیں۔یوں یہی اصول تنوع پیدا کرنے کی بنیاد بھی بنتا ہے۔لہٰذا گیسٹالٹ مکتبۂ فکر کے مطابق بصری ادراکات کا تنوع کُلی نقطۂ نظر (whole view) کا الٹ ہے۔تنوع ''کل'' کا الٹا عکس ہے۔تخلیقی فنکار یہ راز جانتا ہے کہ وحدت اور تنوع میں توازن

Marfat.com

قائم رکھنا ہی اصل کمال ہے۔ اگر وحدت پر زیادہ زور دیا جائے تو نمونہ یکسانیت اور تکرار کے باعث بیزار کن ہو جائے گا اور اگر تنوع زیادہ ہو جائے تو بکھرا بکھرا اور بے ربط معلوم ہوگا۔ گیسٹالٹ کے تصور کو سمجھ کر فن کا روحدت اور تنوع کے معاملے پر قابو پا سکتا ہے۔ یہ سادہ سا روزمرہ زندگی کا بصری تجربہ، جسے گیسٹالٹ مکتبِ فکر نے سائنسی طور پر واضح کیا ہے، صوفی کے تجربے کے مماثل ہے اور سائنس میں اطلاق کی کئی صورتوں کا حامل ہے۔

گیسٹالٹ نفسیات (جرمن زبان میں گیسٹالٹ کا مطلب ہے کسی شے کا جوہر یا اس کی مکمل ہیئت اور صورت) یا گیستالتیت (Gestaltism) بھی ذہن اور دماغ کا ایک مسلمہ نظریہ ہے (دیکھیے: Berlin School of Experimental Psychology)۔ اس نفسیات کا عملی اصول یہ ہے کہ دماغ کلّی اکائی (holistic) ہے۔ لہٰذا برلن مکتبِ فکر ساختیات کی تردید کرتا ہے۔ گیسٹالٹ نظریے کو بیان کرتے ہوئے اکثر یہ جملہ دہرایا جاتا ہے کہ ''کُل، اجزا کے مجموعے سے بڑھ کر کچھ ہوتا ہے''۔

میکس ورداَئمر (Max Wertheimer:۱۸۸۰-۱۹۴۳) گیسٹالٹ مکتبِ فکر کے بانیوں میں سے ایک ہے۔ اس کا اہم کردار اس بات پر اصرار کرنے میں ظاہر ہوتا ہے کہ ''گیسٹالٹ'' ادراک کے معاملے میں بنیادی نوعیت کا حامل ہے۔ یہ ان اجزا کی توضیح کرتا ہے جن سے مل کر وہ بنتا ہے۔ اس کی نوعیت ثانوی نہیں جو ان اجزا کے آپس میں ملنے سے وجود میں آئے۔ یہ ونٹ (Wundt) کے منتشر مالیکیولی نظریے (fragmented molecularism) پر مبنی نفسیاتی نقطۂ نظر کے خلاف ایک طرح کی بغاوت تھی۔

ورداَئمر کے زرخیز فکر کے گیسٹالٹ نظریے (Gestalt Theory of Productive Thinking) نے یہ خیال پیش کیا کہ فکر کل سے شروع ہو کر جزو کی طرف چلتی ہے۔ یہ نظریہ مسئلے کو ایک کل کے طور پر لیتا ہے اور کل کو اجزا پر غالب آنے اور ان پر قابو رکھنے کا حق دیتا ہے۔ یہ ترکیبی عمل (synthesis) ہے جو اوپر سے نیچے کی جانب چلتا ہے اور تجزیاتی عمل (analytical) کے برعکس ہے جو نیچے سے اوپر کی جانب بڑھتا ہے۔ ورداَئمر کے مطابق باریک ترین تفاصیل تک محدود ہو کر رہ جانا اس کے زمانے کا بنیادی مسئلہ ہے۔ مزید تفصیل کے لیے:

lifecircles-inc.com/Learningtheories/gestalt/wertheimer.html

صوفیانہ تجربہ ایک اور طرح سے بھی زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ مغربی سائنس کل اور جزو کے رشتے کو الٹ

Marfat.com

کر جزو اور کل میں بدل دینے کی غلطی کی مرتکب ہو رہی ہے، اور جزو کو بھی بنیادی حقیقت سمجھ بیٹھی ہے۔ یعنی جزو کو کل سے علیحدہ کر کے دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے سائنس اس کُل کا مشاہدہ کرنے میں ناکام رہتی ہے جو اجزا کو معنویت عطا کرتا ہے۔ کوانٹم فزکس نے اب ثابت کر دیا ہے کہ ذرے کو اس کی علیحدہ حیثیت میں بیان تو کیا جا سکتا ہے مگر دیکھا صرف اس وقت جا سکتا ہے جب یہ اپنے کل سے تعامل کرتا ہے۔ سائنس اشیا کی تعریف اور انھیں مختلف گروہوں اور اجزا میں تقسیم (classifications and definitions) تو کر سکتی ہے لیکن آخری حقیقت دیکھنے سے محروم رہ جاتی ہے۔ ہماری سائنس حقیقت کے فعلیاتی پہلو (functional aspect) پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے ابھی تک اس کی ساخت کے نظریوں (structural view) کی قدیم سطح پر اٹکی ہوئی ہے۔ مشرق کے صوفی کی نظر میں سائنس ہجر کی دھوپ ہے اور عقل ایک حجاب ہے جو وصل کی استعداد سے محروم ہے۔

یہاں جزو اور کل کے بارے میں مشرق کا صوفیانہ فلسفہ کارآمد معلوم ہوتا ہے۔ جدائی (جزو) اور ملاپ (کل)، تحلیل اور ترکیب، ہجر اور وصال، تجلّی (وجدان) اور حجاب (دانش) جیسی متضاد انتہاؤں کے حرکی تعامل میں مستقل توازن قائم رکھنے سے ہی حقیقت کی اصل فطرت کا درست فہم حاصل ہو سکتا ہے۔ نئی فزکس اسی سمت میں بڑھنے والا قدم ہے۔ یہیں وہ تصورات جو ایک دوسرے سے متضاد، متناقض اور متخالف معلوم ہوتے ہیں، حقیقت کی نئی اور چونکا دینے والی تعبیروں میں یکجا نظر آتے ہیں۔ اس نوخیز سائنس میں ذرے قابلِ اتلاف (destructible) بھی ہیں اور ناقابلِ اتلاف (indestructible) بھی، علیحدہ (isolated) بھی ہیں اور یک جان (unified) بھی، غیر مسلسل (discontinuous) بھی ہیں اور مسلسل (continuous) بھی۔ وہ کسی بھی حالت میں ہوں، ہر حال میں ایک ہی عمل کا حصہ اور اس کا کوئی نہ کوئی پہلو ہیں۔ تاہم صوفی کی ارفع تر تلاش میں حقیقت ہجر ہے نہ وصال، جدا ہے نہ متصل، جاری ہے نہ منقطع۔ سائنسی اصطلاحات میں بات کی جائے تو یہ نہ ذرہ ہے اور نہ موج۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سائنس حقیقت کی گتھی سلجھانے میں ٹھوکر کھاتی ہے۔ حقیقت حرکی توازن ہے۔ (Reality is dynamic equilibrium) یہ آزادی اور یکجائی، یکتائی اور ایکائی، علیحدگی اور اتصال، انفرادیت اور تسلسل، ذرے اور موج، فنا اور بقا، موت اور زندگی کے مابین مسلسل تعامل ہے۔ اس حقیقت کا بہت خوبصورت اظہار دیکھنا ہو تو صوفی دست کاروں کے بنائے ہوئے عربی گل کاری جیسے اسلامی آرٹ کے نمونوں اور عیسائی گرجوں کے شیشوں پر بنی پچی کاری کے شاہ کاروں کو دیکھیے جن میں ایک

Marfat.com

ایک جزو کا تشخص اور اس کی انفرادیت اس طرح کل سے ہم آہنگ ہوتی ہے کہ ہر جزو کی اپنی انفرادی معنویت بھی برقرار رہتی ہے اور وہ ایک بہت بڑے کل کا حصہ بن کر اس کی وسعتوں میں بھی اس کا شریک اور ہم کار بھی ہو جاتا ہے اور یوں ایک تسلسل کو قائم کرتا ہے۔ ہر جزو ایک بڑے کل کا ناگزیر اور لازمی حصہ ہوتا ہے لیکن اپنی جگہ پر اپنی ایک علیحدہ شناخت بھی رکھتا ہے۔ اپنی روزمرہ زندگی کی ہما ہمی سے نکل کر تھوڑی دیر کے لیے اسلامی آرٹ کے ان حیرت انگیز نمونوں، گرجوں کے رنگین شیشوں پر بنے فن کے ان نادر مرقعوں کو دیکھیے: فنِ تعمیر کے ان بے مثال نمونوں کے ذریعے خدا ہم سے ہم کلام ہو رہا ہے۔

صوفی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذکر کرتا ہے۔ اللہ کی عمدہ صفات کا ورد کرتا ہے، انھیں اپنے اندر جذب کرتا ہے اور ان کا تجربہ کر کے دیکھتا ہے۔ اس عمل کا واحد محرک یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے، خود کو اس سے جوڑے، اسے اپنے لیے مثالی نمونہ بنائے، اس سے محبت کرے اور یوں اس کا براہِ راست عرفان حاصل کرے۔ اس تجربے کا سب سے اہم نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ثنویت اور کثرت ایک کبھی ختم نہ ہونے والے، درجہ وار تسلسل میں ضم ہو جاتی ہیں۔ صوفیانہ تجربے کا تعلق جدید سائنس سے بھی ہے کیوں کہ اس کے ذریعے صوفی اللہ یعنی حقیقتِ مطلق کا براہِ راست اور ذاتی علم حاصل کرتا ہے۔ صوفی یقین رکھتا ہے کہ خدا کا براہ راست علم وجدان اور تجربے کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ سائنس دان اور صوفی دونوں حقیقت کے متلاشی ہوتے ہیں اور اپنے مقصدِ آخری کے اعتبار سے دونوں ایک جیسے ہیں۔ صوفی یہ مقصد وجدان اور تجربے (experience) سے حاصل کرتا ہے اور سائنس دان فرضیے اور اس کی آزمائش (experimentation) سے۔ دونوں کا طریقِ کار مختلف ہو سکتا ہے مگر نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ تصوف حقیقت کے بارے میں اسلام کی باطنی اور صوفیانہ جہت ہے اور یوں گویا ایٹم یا کوانٹم حقیقت کے اندرونی رُخ کے متوازی ہے۔

انسان عالمِ اصغر (microcosm) ہے۔ اس کے داخلی اور خارجی پہلو انھی تمام عناصر کا مجموعہ ہیں جن سے یہ کائنات بنی ہے۔ علم حاصل کرنے کے کئی متبادل راستے ہو سکتے ہیں، اور ہیں بھی۔ مثلاً علم الادویہ ہے، کھانا پکانے کا علم ہے، ماحول کا علم ہے، طرزِ بود و باش کا علم ہے، یہاں تک کہ ٹریفک کے قوانین کا علم ہے جو دائیں یا بائیں ہاتھ پر گاڑی چلانے والوں کے لیے الگ الگ ہے۔ تاہم ہم امام غزالی جیسے صوفی کی فلسفیانہ سچائیاں قبول کرنے کو تو تیار ہیں، لیکن اس طریق کار کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں جس کے ذریعے انھوں نے ایسے چونکا دینے

Marfat.com

والے تصورات دریافت کیے۔ سائنس اس مفروضے کے بارے میں نہایت متشدد ہے کہ سائنسی طریق کار ہی حقیقت تک رسائی کا واحد طریق کار ہے۔ اس لیے اب صوفی کے تصور حقیقت کو سائنسی طریق کار سے تقویت دی جا رہی ہے۔ اب جدید سائنس دان اس طریق کار کی تصدیق و توثیق کر کے اسے مزید نکھار سکتا ہے۔

صوفی ازم کسی طرح بھی صرف اسلام کا ورثہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس بارے میں بار بار کہا جاتا ہے کہ اسلام نے یہ روایت مختلف سرّی علوم اور مذاہب سے مستعار لی ہے۔ تصوف ایک آفاقی تجربہ ہے جو ہر زمانے اور ہر مذہب کے لوگوں میں مشترک رہا ہے۔ صوفی ایک ہونے پر یقین رکھتا ہے اور تمام مذاہب کا ایک ہونا اس کی بصیرت کا مرکزی نکتہ ہے۔ اس کے لیے سچائی عالم گیر اور ایک ہی ہے، خواہ اس تک پہنچنے کے لیے مختلف ذرائع اور طریقے ہی کیوں نہ استعمال کیے جائیں۔

سائنس کے اولین شہیدوں برونو اور کوپرنیکس کی طرح منصور حلاج (وفات: ۹۲۲ء) بھی اپنے نعرۂ انا الحق کی وجہ سے معروف ہے۔ اس ''کافرانہ'' جسارت کا نتیجہ ایک لمبے مقدمے کی صورت میں نکلا۔ وہ گیارہ سال قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنے کے بعد ۲۶ مارچ، ۹۲۲ء کو بغداد میں سولی پر چڑھا دیا گیا۔ صوفیہ آج تک اس کا ذکر احترام سے کرتے ہیں کیوں کہ اس نے موت قبول کر لی لیکن اپنی سچائی سے منحرف ہونا قبول نہیں کیا۔ اپنی آخری نماز ادا کرتے ہوئے اس نے کہا: 'اے خدا! تو ہی ان لوگوں کو ہدایت دینے والا ہے جو وادئ حیرت میں بھٹک رہے ہیں۔ اگر میں کافر و ملحد ہوں تو میرے کفر و الحاد کو اور پھیلا دے!!

اس سے ہمیں سکون اور حرکت (rest and motion) کا فلسفیانہ مسئلہ یاد آتا ہے یعنی جمود اور تحرک۔ صوفی کے لیے علیحدگی سکون یعنی ٹھہر جانے کا نام ہے۔ یہ ہجر ہی ہے جو جمود، بے معنویت، خالی پن اور بتدریج معدومیت کی طرف لے جاتا ہے۔ دوسری طرف وصال ایک رواں دواں حرکت ہے جو تعامل، تبدل، نشو و نما اور زندہ ربط باہم پر منتج ہوتی ہے۔ اعلاتر حقیقت کا تجربہ جامد نہیں، زندہ اور حرکی ہوتا ہے۔ اللہ کی فطرت اور ماہیت کو تحرک کے ذریعے ہی فہم کی گرفت میں لایا جا سکتا ہے اور اسے اس کی روانی، حرکت، انجذاب، ارتعاش، تعامل اور تبدل کی مدد سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ تجربہ اپنی بنیادی ماہیت میں حرکی نوعیت کا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ حقیقت پر اس کا براہ راست اطلاق ہوتا ہے۔ ہر شے جو جامد رہے، گل سڑ جاتی ہے، ٹھہرا ہوا پانی متعفن ہو جاتا ہے اور آخر کار بخارات بن کر اڑ جاتا ہے۔ کسی زندہ جسم سے کٹ کر علیحدہ ہو جانے والا عضو مر جاتا

Marfat.com

ہے۔مردہ جسم حرکت کرنا چھوڑ دیتا ہے۔اللہ ایک حرکی اصول ہے(الحیّ) جو کائنات کے ہر رگ و ریشے میں مخفی ہے اور جان دار و بے جان ہر شے میں ظاہر ہے۔اس لیے ہر شے میں ایک جاری و ساری روانی ہے اور ہر چیز مسلسل حرکت میں ہے۔جدید فزکس بھی مادے کی جو تصویر کھینچتی ہے اس میں وہ جامد و ساکت نہیں بلکہ مسلسل مرتعش اور متحرک معلوم ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ایسے متوازن اور ہم آہنگ نمونے (rhythemic patterns) بنتے ہیں جن کا تعین کُل سے ہوتا ہے اور جن میں ایٹم ہیں، مالیکیول ہیں، نیوکلیر ساختیں ہیں اور جو جاری و ساری حرکت اور تبدیلی پر منتج ہوتے ہیں۔یہ حاضر و ناظر فنا پذیری اور ابدی تغیر و تبدل جس کا مظاہرہ ہم اپنے گرد و پیش میں ہر طرف دیکھتے ہیں، اصل میں وحدت کی لگاتار نقل و حرکت(dynamic movement of Unity) ہے جو تکمیل کے لیے مسلسل تعامل، کبھی ختم نہ ہونے والے ربط باہم، متواتر تبدیلی اور نشوونما میں مصروف ہے۔اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اللہ بدل جانے والا ہے، بھروسے کے قابل نہیں یا بے ربط ہے۔اللہ تو الدائم اور القائم جیسی صفات کا حامل ہے تاہم چوں کہ وہ حرکی قوت میں ظاہر ہوتا ہے اس لیے وہ الحیّ (زندہ، جان دار) بھی ہے۔

عالمِ شہادت یعنی مظاہر کی ناپائیدار دنیا تغیر و تبدل کی دنیا ہے، لگاتار حرکت کی دنیا ہے، حرکی قوت کی دنیا ہے، ارتقا، تنوع، تبدیلی اور کایا پلٹ کی دنیا ہے۔بدھ نے اسے سمسرا (samsara) کہا تھا جس کا لغوی مطلب ہے لگاتار حرکت میں رہنے والی، کبھی ختم نہ ہونے والے تغیرات کی دنیا۔اس نے یہ درس دیا تھا کہ ہر شے ناپائیدار ہے اور دنیا میں ہمارے سارے دکھوں کا سبب یہ ہے کہ ہم مستقل صورتوں سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ہم دنیا کو زندہ اور رواں دواں حرکت، پیش رفت اور تغیر و تبدل پر مبنی سمجھنے کی بجائے اشیا اور خیالات سے مستقل چمٹے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔دوسری طرف عالمِ غیب، یعنی ان دیکھی دنیا، سکون اور جمود کی دنیا ہے۔متوازیٔ معکوس کے اصول کے تحت یہ وہ دنیا ہے جہاں حرکت، ارتقا، تنوع، تبدیلی، ترمیم رک جاتی ہے، تھم جاتی ہے، مٹ جاتی ہے، ختم ہو جاتی ہے اور اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔اس دوسری دنیا میں اللہ سکون کی حالت میں رہتا ہے اور استقلال، استحکام، اثبات، استواری اور ابدیت کو یقینی بناتا ہے۔اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب کیوں خودکشی کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور کیوں انسانی زندگی کی اہمیت پر اتنا زور دیتے ہیں۔یہ زندگی اس فانی دنیا میں انسان کے ایسے سفر کا نام ہے جو انسان کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اچھے اعمال، عمدہ کردار اور بہترین طرزِ زندگی کے ذریعے خود کو بدل ڈالے اور ارتقا پائے۔تبدیلی کا موقع صرف حرکت ہی کے ذریعے مل

Marfat.com

سکتا ہے۔اس لیے حرکت سفر کا نام ہے اور سکون منزل کا۔نتیجہ یہی نکلتا ہے۔

خوش قسمتی سے یہ دونوں دنیائیں، سکون کی دنیا (عالمِ غیب) اور مستقل تبدیلی کی دنیا (عالمِ شہادت) ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور باہمی تعامل بھی کرتی ہیں۔آپ کو یاد ہوگا کہ عالمِ غیب اور عالمِ شہادت اللہ کی دو باہم مربوط قطبی صفات ہیں۔اس کی دیگر صفات جو یہاں صادق آتی ہیں، الحیّ (زندہ، جان دار) اور القیّوم (مستقل، قائم) ہیں۔یہ صفات ہر سطح پر ظاہر ہوتی ہیں۔دو صفات کے درمیان مسلسل تعامل کے باعث تبدیلی میں استقلال، ترمیم میں تسلسل، ہر حرکت کے بعد سکون، فنا میں بقا اور ناپائیداری میں پائیداری ملتی ہے۔یہ دو طرفہ قطبی صفات کا باہمی تعامل ہی ہے جو سائنسی اصولوں کی تشکیل ممکن بناتا ہے۔تمام سائنسی اصول، ہر لحظہ بدلتے ہوئے مظہر میں ایک مستقل تسلسل کی دریافت ہیں۔انسانی زندگی کا سب سے پیچیدہ معما، جو اسے ہمیشہ دعوتِ پیکار دیتا رہتا ہے، یہی تو ہے کہ ہر طرف جاری وساری تغیر میں پائیداری، روانی میں استقلال اور بوسیدگی اور زوال میں خیر کے پہلو کیسے دریافت کیے جائیں۔یہی معما سائنس کو بھی درپیش ہے۔

متوازیٔ معکوس کا قانون:
The Law of Parallel Inversion

یہ وحدت پیدا کرنے کا قانون ہے جو پہلے قانون سے نکلتا ہے۔یہ متوازی حقیقتوں کا قانون ہے جو معکوس ردعمل کی مساوات میں اِدھر سے اُدھر الٹ جاتی ہیں لیکن ایک دوسرے سے جڑی بھی رہتی ہیں۔اللہ اور انسان ایک دوسرے کے متوازیٔ معکوس ہیں۔ان کی متوازی حقیقتیں کی مثال ایک ایسی دو طرفہ تصویر (reversible figures) کی سی ہے جس کی ایک وقت میں صرف ایک ہی طرف دیکھی جاسکتی ہے حالانکہ دونوں اصل میں ایک ہی ہوتی ہیں۔جو قوانین ایک پر لاگو ہوتے ہیں وہ دوسرے پر منطبق نہیں ہوتے بلکہ اس کے بالکل الٹ ہوتے ہیں۔اور ظاہر ہے ان میں سے ہر ایک کی متنوع صورتیں، کئی سطحیں، متعدد کائناتیں (Multiple Universes) اور بے شمار مدارج ہیں۔

یہ قانون وجود کی ہر سطح پر ظاہر ہوتا ہے اور حقیقت کی اصل ماہیت کا عکس دکھاتا ہے۔دوسرے لفظوں میں حقیقت ہر سطح پر اس قانون کی شاہد ہے۔ایک زندہ خلیے کی مثال ہی لیجیے: یہ ایک مرکزے (nucleus) اور سائٹوپلازم (cytoplasm) پر مشتمل ہوتا ہے۔مرکزہ خلیے کی تعمیری سرگرمیوں کا ذمہ دار ہے اور سائٹوپلازم

Marfat.com

تخریبی سرگرمیوں کا۔ لیکن ان دونوں متضاد اور ایک دوسرے سے برعکس کام کرنے والے اجزا کا باہمی ربط ہی ہے جو ایک زندہ، دھڑکتی ہوئی، بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہوئی اکائی کی تشکیل کرتا ہے۔ خلیے سے لے کر ایٹم تک اور ارتقائی مراحل سے لے کر اعلا تر حقیقت کے سرّی، غیر مرئی، صعودی مراتب تک، متوازی معکوس کا قانون کائنات کی ہر شے پر لاگو ہوتا ہے۔ یہ قانون خالق و مخلوق کے درمیان موجود فطری رشتے کی عکاسی کرتا ہے، اس کی پیروی کرتا ہے اور اس کی شہادت بھی دیتا ہے۔ خدا اور انسان متوازی معکوس ہیں۔ جیسے زمین اور سورج متوازی معکوس ہیں؛ ایک دوسرے سے کس قدر مختلف، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بالکل متضاد، لیکن باہم مربوط اور ناگزیر طور پر ایک۔ مادہ اور زندگی بھی متوازی معکوس ہیں۔ اسی طرح پودے اور جانور بھی متوازی معکوس ہیں جیسا کہ درج ذیل جدول سے ظاہر ہوتا ہے:

پودے یک نوعی (Autotrophic) ہوتے ہیں یعنی اپنی غذا خود تیار کرتے ہیں۔	جانور مختلف نوعی (Heterotrophic) ہوتے ہیں۔
پودے کاربن ڈائی آکسائڈ جذب کرتے ہیں اور آکسیجن خارج کرتے ہیں۔	جانور آکسیجن لیتے اور کاربن ڈائی آکسائڈ خارج کرتے ہیں۔
پودے حرکت نہیں کرتے۔	جانور حرکت کرنے میں آزاد ہیں۔
نباتی حیات منجمد ہوتی ہے۔	حیوانی زندگی متحرک ہوتی ہے۔
پودوں میں خارجی مہیج کا ردعمل دھیرے دھیرے رونما ہوتا ہے۔	جانوروں میں خارجی مہیج کا ردعمل فوری ہوتا ہے۔
پودے فضلہ خارج نہیں کرتے۔	حیوان فضلہ خارج کرتے ہیں۔

اسی طرح جانور اور انسان بھی متوازی معکوس ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ بہت سی انسانی صفات، خصوصیات اور علامات جانوروں میں متضاد صورت میں رونما ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر جانوروں کی دنیا میں نر بلاشبہ زیادہ خوب صورت، آراستہ اور فطرت کے حسن و جمال، زیب و زینت اور رنگ و آہنگ کا مرقع ہوتا ہے۔ مور اور مرغ ہی کو دیکھ لیجیے، اس قانون کی شہادت مل جائے گی۔ انسانوں میں یہ خصوصیت الٹ جاتی ہے؛ عورت مرد سے کہیں زیادہ پرکشش، دلآویز اور مسحور کن ہوتی ہے۔

یہ قانون بلا استثنیٰ حقیقت کی ہر سطح پر لاگو ہوتا ہے کیوں کہ حقیقت اللہ کے انسان سے رشتے کا عکس

Marfat.com

ہے۔خالق ومخلوق قانون متوازیٔ معکوس کے ذریعے ایک باطنی تعلق میں بندھے ہوئے ہیں۔انسان اطاعت ہے، خدا حکم ہے۔ انسان نفی ہے، خدا اثبات ہے۔انسان قانونِ فطرت ہے، خدا قانونِ الٰہی ہے۔انسان کے پاس سائنس ہے تو خدا کے پاس مذہب ہے۔ انسان کے پاس ٹیکنالوجی ہے، خدا کے پاس معجزہ ہے۔انسان مرئی ہے، خدا غیر مرئی ہے۔انسان مٹی ہے، خدا روح ہے۔انسان میں حرکت ہے، خدا میں استقلال ہے۔ انسان ارتقا ہے، خدا تخلیق ہے۔انسان فانی ہے، خدا لافانی ہے۔انسان تدبیر ہے، خدا تقدیر ہے۔انسان ارادے کا مالک ہے، خدا قسمت کا مالک ہے۔گویا ہر طرح سے خدا اور انسان ایک دوسرے کے متوازی اور معکوس ہیں۔یہودیت میں خدا کو کیدوش (Kiddosh) کہتے ہیں جس کا مطلب ہے دوسرا (The Other) لیکن اس کے باوجود انسان اور خدا میں نمایاں مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ بہت سی خدائی صفات، اوصاف اور خصوصیات انسانوں میں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔یہ صفات الوہی (divine) ہیں اور جانوروں میں نہیں ملتیں مثلاً خیر، مہربانی، رحم، فراخ دلی، سچائی، محافظت، بقا، عفو ودرگزر، عطا، احسان، شفقت، پیش قدمی، بحالی، ارتقا، تخلیق، علم، عرفان، آگاہی، تجربہ کاری، صبر، شکر، عظمت، فضل، عزت، انفرادیت، احترام، انتقام، تعزیر، رہنمائی، موروثیت، لطافت، نفاست، بڑائی، عدل، تحمل اور اذیت۔ یہ تمام اوصاف، یہ اسمائے حسنیٰ انسان کے لیے مقصدِ حیات ہیں۔ یہ وہ صفات ہیں جو انسانوں اور خدا میں مشترک ہیں اور انسان کے لیے خدا تک پہنچنے کا ایک موقع اور ذریعہ ہیں۔ یہی وہ وسائل ہیں جو انسان کو اس لیے مہیا کیے گئے ہیں تاکہ وہ حیوانی سطح سے بلند تر ہوسکے۔یہی وہ امتیازی خصوصیات ہیں جو انسان اور جانور کی زندگی میں تمیز پیدا کرتی ہیں۔یہ وہ ڈھنگ ہیں، وہ راستے ہیں جن پر چل کر الوہیت کی ماہیت معلوم کی جاسکتی ہے اور اس سے تعامل کی راہ ہموار ہوسکتی ہے۔ان ارفع صفات کو فرد، معاشرے اور انسانی تہذیب وثقافت میں آہستہ آہستہ اپنا لینا، جذب کرتے رہنا، شامل کرتے جانا ہی وہ راستہ ہے جو بتدریج ترفع کی طرف لے جاتا ہے، حیوانی جبلتوں کی تہذیب کرتا ہے اور انسانی اور معاشرتی توانائیوں کو رُخ عطا کرتا ہے اور یوں انسانیت اور تہذیب وتمدن کو ممکن بناتا ہے۔یہی اصول تہذیبی وثقافتی تبدیلیوں کی بنیاد بنتے ہیں۔ ہر نوخیز بچہ ان تبدیلیوں کا نمونہ ہوتا ہے۔اسی اشتراک کے نتیجے میں بچہ اخلاقی ومعاشرتی خصائص کا حامل بنتا ہے۔ترقی اور نشو ونما کے اس پورے عمل کے دوران ترجیحات کا رُخ مادی سے نفسی ہوتا جاتا ہے۔ اگر انسانی شخصیت سے تہذیب کے اس عمل کو منہا کر دیا جائے تو باقی صرف مقدس رشتوں کی بے حرمتی، مردم خوری، لوبھ، قتال، بے لگام حرص وہوس، تشدد اور وحشیانہ حصولِ منفعت اور منہ زور خواہشات کی بلا

Marfat.com

روک ٹوک تسکین جیسی حیوانی جبلتیں بچ جاتی ہیں۔اللہ کی یہ اعلیٰ صفات (اسمائے حسنیٰ) انسانی وجود کا مثبت قطب ہیں۔ان صفات کو اپنانے اور بروئے کار لانے سے انسانی شخصیت،تہذیب وثقافت اور تمدن ترقی کرتے ہیں۔ حیوانی اوصاف کی نفی اور الوہی اوصاف کا اثبات ترقی وتمدن کا ضامن ہے۔ یہ صفات رفتہ رفتہ ہمارے ثقافتی عناصر اور معاشرتی رسوم ورواج میں اتنی گہری اتر جاتی ہیں کہ انسانی نشوونما کا لازمی جزو بن جاتی ہیں اور بتدریج ہمارے باطنی تقاضے کا روپ دھار لیتی ہیں۔ یہ ہماری اس ارفع واعلا ذہنی ساخت کا حصہ بن جاتی ہیں جو صرف انسانوں سے مخصوص ہے اور جسے فوقِ انا (Super Ego) کہتے ہیں۔ یہ صفات ہماری خودی میں جذب ہوکر اس کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہ فوق انا یا سپر ایغو ایک اعلاتر ذہنی صلاحیت کی حیثیت سے کسی بھی انسانی تہذیب کی روح اور اس کی سب سے قیمتی متاع ہوتی ہے۔اس فوق انا کے بہترین نمونے کسی بھی ثقافت کا سب سے بڑا روحانی اثاثہ ہوتے ہیں۔ کسی ثقافتی گروہ کی قدر و قیمت کا تعین کرنا ہو تو یہی دیکھا جاتا ہے کہ اس کے اجتماعی مقاصد کی روح کیا ہے، اس کا سب سے بڑا نصب العین کیا ہے، اور اس کے حصول میں اسے کیا کامیابی ملی ہے۔ یہی مقاصد اس خاص گروہ کی جدوجہد، اس کے اعمال وافعال اور اس کی کامیابیوں کا تعین کرتے ہیں۔ کوتاہ مقاصد اکثر مختلف ثقافتی گروہوں میں تصادم، محاذ آرائی اور جنگ وجدل کا باعث بن جاتے ہیں جیسا کہ ہم نے یورپ کی قومی ریاستوں (nation states) کے معاملے میں مشاہدہ بھی کیا ہے۔اسی سے ایک خدا (توحید) اور اس کی صفات کو اپنانے کی معاشرتی اہمیت، معنویت اور فضیلت واضح ہو جاتی ہے۔اسی سے اس مذہبی حکم کی لازمی پابندی کا راز بھی کھلتا ہے کہ ''تم قتل نہیں کرو گے۔کبھی نہیں''۔

اللہ ہمارے معاشرتی ڈھانچے میں، ہمارے ثقافتی نمونوں میں، ہمارے نظام اقدار میں، معاشرتی رسوم و رواج میں، مذاہب میں، رشتوں ناتوں میں، سماجی روابط میں، اخلاقی نمونوں میں، مثالی مقاصد میں اور ہماری ذہنی ساخت میں رچا بسا ہوا ہے۔اللہ کی صفات (اسمائے صفات) ان تمام اداروں کی باطنی ساخت میں نقش ہیں جن کے ذریعے ہم نمو پاتے ہیں۔اللہ کے افعال ووظائف (اسمائے افعال) ہمارے گردوپیش پھیلی ہوئی حقیقت کا ناگزیر اور لازمی جزو ہیں۔اللہ کی فطرت انسانی وجود میں منعکس ہوتی ہے۔ہم اس بات سے آگاہ ہوں یا نہیں مگر اللہ ہر شے پر محیط ایک درجہ بند حقیقت ہے۔ہمیں اللہ کا شعور صرف اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہم ثنویت اور کثرت سے بالاتر ہوکر وجود کی ارفع سطح کی جانب بڑھتے ہیں۔تب ہمیں وحدت (Oneness) اور ہر شے کے ایک ہونے کی حقیقت کا عرفان ہوتا ہے۔اللہ سے دور بھاگنا ممکن ہی نہیں؛ خواہ ہم اس کی محیط کل

Marfat.com

موجودگی کا شعور رکھیں یا نہ رکھیں، کیوں کہ اللہ ہر سطح پر ہمارے اندر ہے، ہمارا محرک ہے اور ہمارا مدعا و نصب العین ہے۔ اللہ خود ہماری اپنی ہی بقا ہے، ہماری مسلسل نشو و نما ہے، ہمارا مستقبل ہے۔ ڈارون کا ''کتا کتے کو کھا جاتا ہے'' والا نظریۂ ارتقا حقیقت کا جزوی اور معکوس رُخ ہے۔ یہ نظریہ جانوروں پر تو لاگو کیا جا سکتا ہے مگر اعلا و ارفع حقیقت یعنی انسان پر نہیں۔ انسانوں میں تہذیب و ثقافت تشکیل دینے، ہم آہنگ ہونے، معاشرتی ادارے قائم کرنے اور تمدن کی بنیاد رکھنے کی استعداد ہوتی ہے۔ انسانی ذہن اور انسانی معاشرہ ارتقا پذیر ہے۔ اس ارتقا کے دوران ایک جیسے مقاصد اور ایک جیسے آئیڈیل رکھنے والے افراد اکٹھے ہو کر جماعتیں تشکیل دیتے ہیں اور ان جماعتوں کی مدد سے بقا کے لیے زیادہ اہلیت اور زیادہ قوت حاصل کر لیتے ہیں۔ تنازع البقا (survival of the fittest) کا ارتقائی نظریہ حقیقت میں اس نامیاتی دنیا میں بقا کا کھیل ہے۔ اس کھیل میں جو بھی لغزش کھاتا ہے، غلطی کرتا ہے اور کھیل کے اصول نظر انداز کر دیتا ہے، معدوم ہو جاتا ہے۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں زندگی تو چلتی رہتی ہے لیکن انسان ہمیشہ رنج و الم میں مبتلا رہتا ہے۔ اس حقیقت سے فرار کی کوئی صورت نہیں۔ آخر کار ہر ایک کو اس حقیقت کے روبرو ہونا اور اسے قبول کرنا پڑتا ہے۔ یہ حقیقت سائنس پر بھی مساوی طور پر لاگو ہوتی ہے۔ مستقبل کی سائنس کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں کہ اللہ کی حقیقت پر ایمان لے آئے یا پھر غیر متوازن، بے ربط اور منتشر ہوتے ہوتے آخر کار ختم ہو جائے۔ اللہ کی سچائی سے نظر چرانا ممکن نہیں۔ ہم ہر طرف سے اللہ سے گھرے ہوئے ہیں۔

قانونِ متوازیِ معکوس کا اطلاق ہستی کی ہر سطح پر ہوتا ہے۔ سگمنڈ فرائیڈ، جو زندگی کا بہت باریک بینی سے مشاہدہ کرنے والا تھا، اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ خدا ایک طفلانہ نقشِ اول (prototype) ہے۔ انسان کا نوزائیدہ بچہ بالکل بے بس ہوتا ہے، ارتقا کے ابتدائی مراحل کے انسان کی طرح، جو فطرت کی قوت کے بالمقابل بے بس تھا۔ اس نوخیز بچے کا اپنے باپ سے رشتہ، جو بیک وقت خوف اور تحفظ کے احساس سے وابستہ ہوتا ہے، اس نقشِ اول کی بنیاد بنتا ہے۔ لہٰذا فرائیڈ کے خیال میں ہر الوہی مظہر کے تصور کے پس پشت باپ ہی کا تصور کارفرما ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہی تصور بعد میں خدا کا روپ دھار لیتا ہے۔ اپنے ایک سائنسی مضمون The Future of an Illusion میں وہ لکھتا ہے کہ 'ہر چیز میں باپ بیٹے کا رشتہ کارفرما ہوتا ہے۔ خدا باپ کی ارفع ترین صورت ہے اور باپ کی تمنا مذہب کی ضرورت کی بنیاد بنتی ہے'۔ سگمنڈ فرائیڈ کا یہ مشاہدہ حقیقت کے معکوس ادراک کی بہترین مثال ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس خیال کے بالکل برعکس، اللہ انسانی وجود میں منعکس ہوتا ہے۔ اسے

Marfat.com

اس خاندانی تجربے کا حصہ بنا کر سمجھا جاتا ہے جہاں ایک حکم چلانے اور تحفظ فراہم کرنے والا باپ بھی ہوتا ہے اور ایک محبت کرنے والی، تسکین پہنچانے والی ماں بھی۔ اس طرح ہر بچہ نشو ونما کے دوران خدا کا تجربہ اپنی خاندانی زندگی میں ہی کر لیتا ہے۔ لیکن یہ ایک زندہ تجربہ ہے اور فرائیڈ کا ایڈی پس کمپلیکس (Oedipus Complex) کا نظریہ جدید دور کے جمہوری خاندان پر عائد نہیں ہوتا جو بچے کو ابتدا ہی سے دوسروں پر انحصار کرنے کی پرانی روایت کی بجائے انفرادیت، پختگی اور احساسِ ذمہ داری سے آشنا کر دیتا ہے۔ یہ بات ایک بار پھر انسان کے خدا سے بدلتے ہوئے رشتے اور تعامل کی عکاسی کرتی ہے۔ انسان بھی اب پختہ کار ہو چکا ہے اور خدا سے اس کا رشتہ بھی اسی اعتبار سے تبدیل ہو جانا چاہیے۔

اللہ اور انسان ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں کئی صفات مشترک ہیں۔ ان کی مثال سورج اور زمین کی سی ہے؛ مختلف لیکن یکساں۔ اللہ اور انسان، لاشعور سے تحت شعور، شعور اور پھر ارفع اخلاقی شعور تک، اس درجہ وار حقیقت کے ہر درجے پر باہمی تعامل کرتے ہیں۔ یہ تعامل صدیوں سے جاری ہے اور اس کا ثبوت ہمیں مذاہب کے ارتقائی سلسلے سے ملتا ہے، صحائف کی صورت میں الہامی پیغامات کی شہادت سے ملتا ہے، نبیوں، پیغمبروں، رسولوں اور مسیحاؤں کی تعلیمات سے ملتا ہے، وجدانی صوفیانہ فلسفوں سے ملتا ہے اور سرّی، باطنی علوم سے ملتا ہے جو ہر زبان، ہر عہد اور ہر ماحول میں مشترک ہیں۔ حقیقت کے مابعد الطبیعیاتی تصورات، اللہ کے نام اور اس کی صفات جو انسانی تاریخ کے ہر عہد اور ہر زبان میں موجود ہیں، کثرت سے کی جانے والی روحانی ریاضتیں، بنی نوع انسان کے مافوق الفطرت اعتقادات، مذہبی فنِ تعمیر کی شاندار وراثت، ہمارے کلیساؤں، مسجدوں، مندروں سے جھلکنے والا بے مثال جمالیاتی ذوق اور مذہبی آرٹ کے نادر نمونے، تصویریں، عقیدت مندانہ نغمے، گیت، موسیقی، جدتیں اور اختراع، ہر مذہب میں ہر صدی میں ظاہر ہونے والے مجددین اور مارٹن لوتھر جیسے احیا پسندوں کی آمد۔۔۔ یہ سب اسی حقیقت کا اظہار ہیں۔ سائنس اس تمام تر شہادت کو یکسر نظر انداز کر دیتی ہے کیوں کہ سائنس جس شے کو سمجھ نہیں سکتی اسے آسانی سے ترک کر دیتی ہے۔ جیسے کوپن ہیگن نظریے کا مقولہ ہے کہ 'جو نظر نہیں آتا، وہ موجود ہی نہیں'۔ جو کچھ بھی سائنسی طور پر قابلِ فہم نہیں، وہ حقیقی نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی حیثیت تسلیم کی جا سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ وجود رکھتا ہے، وہ حقیقی ہے اور تاریخ اس کی گواہ ہے۔ یہ انسانی جذبے کا سب سے بنیادی اظہار ہے۔

Marfat.com

تمام مذہب کہتے ہیں کہ انسان خدا کا عکس ہے اس لیے کہ انسان خدا کا معکوس رُخ ہے۔ ہر عکس الٹا ہوتا ہے۔اس الٹے پن (inversion) سے نمٹنے کے لیے انسانوں کے پاس تین راستے ہیں:

ا۔ خود کو مکمل طور پر خدا کی ہستی سے مربوط و ہم آہنگ کر لے۔اسی جیسا ہو جائے، اسی کی طرح عمل کرے، اس کی صفات میں ڈھل جائے، اس کا اختیار بروئے کار لائے اور اسی کا اخلاق اپنا لے۔ الوہی قوت اور الوہی حقوق کو بر سرِ کار لانے کے لیے اس کا رحم، اس کا غضب، اس کا غصہ اختیار کر لے۔تاریخ میں ایسے واقعات کی کئی مثالیں موجود ہیں جب بادشاہوں، پادریوں یا پروہتوں نے اسی عقیدے کی بنا پر خدائی قوتوں کا استعمال کیا اور مخلوقِ خدا کے رنج والم میں اضافے کا باعث بن گئے۔ ایسی دیوانگی عموماً انتہا پسندی اور متشددانہ عقائد کا نتیجہ ہوتی ہے۔تاہم اسے زیادہ سے زیادہ ایک وہم کہا جا سکتا ہے کیوں کہ انسان ایسی طاقت کے مالک نہیں ہوتے۔خدا کے برگزیدہ رسولوں کے سوا، جنھیں الوہی قوتیں عطا کی جاتی ہیں، پروہتوں یا زاہدوں کا ایسا دعویٰ کرنا محض دیوانگی ہے۔

۲۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان مکمل طور پر خود اپنے آپ سے ہم آہنگ ہو جائے۔خود اپنے مقاصد اور خواہشات کی پیروی کرے، ذاتی بقا اور ترقی کو سب سے اولیٰ نصب العین بنا لے۔ہر چیز سے بڑھ کر خود اپنے ذاتی مفادات کا متلاشی رہے۔ان سب باتوں کے نتیجے میں شدید نوعیت کی خود پرستی (self-fixation)، انا اور خود غرضی پیدا ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ انسان کو ذہنی دباؤ، بے اطمینانی اور پراگندگی کی تنگ و تاریک سرنگ میں دھکیل دیتی ہے۔ہم نے تاریخ کے سفر میں بارہا دیکھا ہے کہ بادشاہوں اور پروہتوں کی الوہی طاقت کی جگہ فرد کی آزادی، انفرادیت پسندی، ذاتی تخلیے اور شخصی آزادہ روی کی متضاد تحریکوں نے لے لی جن میں ذاتی مفاد ہی عظیم ترین مفاد قرار پایا اور پر انبوہ صنعتی معاشروں کے سرتوڑ مقابلے بازی کے ماحول میں ذاتی تحفظ و بقا ہی کو غالب ترین محرک قرار دیا گیا۔

۳۔ تیسرا امکان یہ ہے کہ انسان مسلسل اپنی ذات کو قومی ریاست، شہری معاشروں، انسانیت یا اللہ کے اسمائے حسنیٰ (جو تمام انسانوں اور معاشروں کے لیے مستقل اور ناقابلِ تغیر آئیڈیل فراہم کرنے والی صفات کے نام ہیں) کے عظیم تر مقاصد اور مثالی نمونوں (ideals) کے حوالے سے پرکھتا اور جانچتا رہے۔ان صفاتِ الٰہی پر غور و فکر کرنا، اُن اقدار سے ربط پیدا کرنا جو ان صفات کی باطنی خصوصیات ہیں، اور اس طرح

Marfat.com

ذاتِ کل کے اندر رہ کر خود اپنی ذات کی ترقی، ارتقا، عروج اور فروغ کا سامان کرنا۔۔۔یہی وہ راستہ ہے جو تکمیل (wholeness) تک لے جاتا ہے اور حقیقی تشخص، انفرادیت اور شخصیت کی ترقی کا باعث بنتا ہے۔ یہ وہ حقیقی انفرادیت (individuation) ہے جس کا ذکر سی۔ جے۔ ژونگ (C. J Jung) نے تحلیل نفسی (psychoanalysis) اور شخصیت کی ترقی (personality development) پر اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

انسان خود متوازی حقیقت کے اس منصوبے میں وسطی مقام کا حامل ہے۔ حقیقت روح اور مادے کا ایک تسلسل ہے۔ یہ دونوں متوازی معکوس ہیں۔ اس کے اعلاترین درجے پر روح ہے اور ادنیٰ ترین درجے پر مادہ ہے۔ انسان ان دونوں انتہاؤں کے درمیان کے درجے پر پیدا ہوا ہے جہاں یہ دونوں مل جاتے ہیں۔ گویا متوازی معکوس کا یہ قانون آفاقی ہے۔ یہ سادہ سا قانون جو ماورا کا تعین کرتا ہے، وہی نظریۂ وحدت ہے جسے جدید سائنس کب سے ڈھونڈ رہی ہے۔ یہ قانون سائنس دان کے لیے Occam's Razor کی طرح ہے۔ سائنس کا ایک نیا قانون!

متوازی معکوس کا قانون:
The Law of Parity

یہ وہ قانون ہے جو قطبین کے مساوی تعامل کو یقینی بناتا ہے تاکہ ایک حرکی توازن قائم کیا جا سکے۔ یہ قانون بتاتا ہے کہ قطبین کا برابر برابر تعامل ہی ہے جو توازن، میزان، عدل اور استحکام پیدا کرنے کا ضامن ہے اور اسی کی ہر شے متلاشی ہے۔ یہ نظم پیدا کرنے والا قانون ہے۔ یہ ہر چیز کو، تمام اشیا کو ایک سطح پر لے آتا ہے اور ہر ایک کے لیے برابر مواقع اور عدل و انصاف کا حصول یقینی بناتا ہے۔ یہ انسان کو انتہائی صورتوں کی سختی، شدت اور تباہی سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس قانون کے تحت جنگل کے قانون، جسم کی قرار گیری (hoemostasis)، ماحولیاتی چکر (eco-cycle)، ذہنی محرکات اور تاریخ کے بہاؤ (movement of history) سمیت ہر شے کو ایک خاص توازن میں رکھا جاتا ہے۔ توازن اصل میں دو متضاد اور باہمی تعامل کرنے والی قوتوں کے درمیان ایک حرکی نقطے کا نام ہے، مثلاً قانون اور لاقانونیت کی مثال لیجیے، قانون کی ماہیت میں مطلق العنانی ہے جب کہ لاقانونیت کی ساخت ہی میں بدنظمی اور انتشار موجود ہوتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان توازن کا مقام وہ ہے جہاں

Marfat.com

دونوں کی انتہائی صورتوں کی منفی خصوصیت کم سے کم ہو جاتی ہیں۔

قانونِ سبقت:
The Law of Precedence

یہ تقدیم (مقدم) وتاخیر (مؤخر) کا قانون ہے جو بتاتا ہے کہ متضاد یا قطبی صفات کے حامل ہر جوڑے میں سے ایک کو دوسرے پر سبقت یا فضیلت حاصل ہوتی ہے کیوں کہ ان دونوں میں سے ایک، دوسرے کا سبب ہوتا ہے۔اس قانون سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ برابری کا تصور مرکز یا نیوکلیس پر لاگو نہیں ہوتا۔ اگرچہ نیوکلیس (nucleus) اوراس کے محیط (periphery) کے درمیان مسلسل اور مساوی باہمی تعامل ہوتا رہتا ہے، لیکن مرکز کو محیط پر سبقت حاصل ہے کیوں کہ مرکز ہی محیط کا سبب ہوتا ہے۔

اصولِ تقلیب:
The Principle of Inversion

یہ قانون بتاتا ہے کہ کیسے ایک جوڑے کے باہمی تعامل کرنے والے دونوں انتہائی مقامات یعنی مثبت (+) اور منفی (-) کو الٹ دینے سے قانونِ وحدت بھی الٹ جاتا ہے اور یوں ترقی یا ارتقا کا صحت مندانہ چکر الٹی طرف گھوم جاتا ہے۔اس کا نتیجہ پسپائی، فرسودگی، انتشار، ضعف، تنزلی، تحلیل، تباہی، بدنظمی اور بالآخر مکمل بربادی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔اس اصول کو جانچنے کا طریقہ بہت آسان ہے؛ اپنے کیمرے کی بیٹریوں کی جگہ ایک دوسرے سے تبدیل کر دیں اور دیکھیں کہ ان کی توانائی کس تیزی سے ضائع ہوتی ہے۔اسی طرح متضاد اشیا کے جوڑوں میں سے کسی ایک کی بھی تقدیم وتاخیر بدل دیں؛ اخلاقیات اور جمہوریت کو جمہوریت اور اخلاقیات میں، خدا اور انسان کو انسان اور خدا میں، کل اور جز کو جز و اور کل میں، ترکیب اور تحلیل کو تحلیل اور ترکیب میں، مذہب اور سائنس کو سائنس اور مذہب میں، فعل اور ساخت کو ساخت اور فعل میں تبدیل کر دیں، تو غلط نتائج برآمد ہوں گے جو انتشار اور تباہی پر منتج ہوں گے۔ یہ الٹ پلٹ تاریخ میں بھی ہوتا رہا ہے اور انسانوں کی زندگیوں میں بھی رونما ہوتا ہے کیوں کہ انسان خود بھی تو خدا کا معکوس رُخ ہیں اور اسی لیے اکثر حقیقت کو انسانی زاویے سے یعنی الٹ دیکھتے ہیں۔تاہم انسان میں یہ استعداد موجود ہے کہ تجربہ اور پختگی حاصل کرنے کے بعد اس غلطی کی تصحیح کر

Marfat.com

لے۔ مہذب معاشروں کا ابھرنا، انسان دوست اقدار کا مقبولِ عام ہونا، خواتین سے برتاؤ کا عمدہ طریقہ اختیار کرنا، مطلق العنانی کی بجائے برابری کی بنیاد پر قانون کا نفاذ، یہ سب اسی تصحیح کی مثالیں ہیں جو بنی نوع انسان نے تجربے اور ماضی کی غلطیوں کی بنا پر کی ہے۔

اصولِ انعکاسیت:
The Principle of Reversion

یہ اصول قوانینِ وحدت کی مکمل نفی کر دیتا ہے اور وحدت کی قوت کو متضاد سمت میں صرف کرنے کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی یہ اصول وحدت کے قوانین کو بالکل معکوس رُخ میں لاگو کرنے کی صورتِ حال کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اصولِ وحدت کی مکمل نفی کا نام ہے اور اس کا نتیجہ بنیادی اصولوں کے الٹ جانے یا تنزل کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ تنزل ایسے امکانات کے ظہور کا سبب بنتا ہے جو ایک دوسرے سے انتہائی مختلف، متضاد، ناموافق اور غیر مساوی ہوتے ہیں؛ جیسے سچ اور جھوٹ۔ اس میں اصول اس حد تک الٹ جاتا ہے کہ دونوں امکانات ایک دوسرے سے متصادم ہو جاتے ہیں اور یوں یہ دونوں نہ تو باہمی تعامل کر سکتے ہیں اور نہ ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ خیر کا حقیقی متضاد شر ہے۔ اسی طرح شیطان بھی اللہ کا ناموافق متضاد ہے کیوں کہ وہ اللہ کی صفات کی الٹ صورت اختیار کر لیتا ہے۔

شیطان اللہ کی عمدہ صفات کے الٹ جانے کا نام ہے۔ مثلاً شیطان خدا سے کھلی دشمنی اور محاذ آرائی کرتے ہوئے برائی یا شر پر مبنی افعال کا انعام دیتا ہے۔ شر اصل میں خیر کے انکار کا نام ہے۔ جیسے قانون اور لاقانونیت بیک وقت قائم نہیں رہ سکتے اور آزادی اور افراتفری ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ قانون ایک صفت کے موجود ہونے کا نام ہے اور لاقانونیت اسی صفت کے موجود نہ ہونے کو ظاہر کرتی ہے؛ جیسے سفید اور کالا۔ پہلی صورت میں ایک شے، یعنی روشنی موجود ہے اور دوسری صورت میں وہی شے غیر موجود ہے۔ گویا لاقانونیت اور بغاوت موجود بالذات نہیں ہیں بلکہ کسی اور صفت کی ارادی یا غیر ارادی عدم موجودگی کا اظہار ہیں۔ اسی طرح خدا ہستی کے موجود ہونے کا نام ہے اور شیطان اس ہستی کے ارادی انکار کا نام ہے جو خدا سے برسرِ پیکار ہو کر اس کی اعلا صفات کو الٹ طریقے سے اختیار کرنے اور اس کی قوت کو الٹ رُخ میں موڑ دینے سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب کوئی شخص یہودیوں کی تنظیم کا رکن (templar) بننے کے لیے آتا تھا تو اسے

Marfat.com

عیسیٰ سے انکار کرنا پڑتا تھا۔ اسے صلیب پر تھوکنے اور بعض اوقات پاؤں تلے روندنے پر بھی مجبور کیا جاتا تھا۔ کالے جادو اور دیگر سفلی علوم کی رسموں اور مشقوں میں بھی اسی طرح اللہ کی اعلا صفات کو الٹ کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک حالیہ خبر ہے کہ ایک بڑے قبرستان میں نوزائیدہ بچوں کی قبریں کھود کر ان کی لاشوں کو کالے جادو کے لیے استعمال کرنے والے شقی القلب رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں۔

شیطان بھی ذاتی طور پر وجود نہیں رکھتا۔ یہ اصل میں خدا کی ذات کا باغیانہ جزو ہے۔ جیسے انتشار (anarchy) بذاتِ خود موجود نہیں ہوتا، یہ نظم و ضبط کو توڑنے سے پیدا ہوتا ہے۔ میری اس بات پر کہ انتشار وجود نہیں رکھتا، اگر کوئی اعتراض کر سکتے تو وہ بجا ہوگا۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ انتشار معدومیت (nothingness) ہے۔ یہ موجودات کے سانچے (scheme of things) میں نہیں ہوسکتا۔ یہاں تاریخ کے اس زمانے کی، جب لاقانونیت اور انتشار عام ہو یا کسی نوعمر مجرم اور نفسیاتی مریض کے رویے کی مثال دی جاسکتی ہے۔ حتیٰ کہ جنگل میں بھی ایک قانون اور نظم و ضبط ہوتا ہے۔ معدومیت (nothingness) کی طرح مطلق لاقانونیت یا مطلق انتشار کا بھی کوئی وجود نہیں۔

جب بھی انتشار (anarchy) پیدا ہوتا ہے، قانون کی پابندی کے پیمانے پر نیچے کی سمت حرکت کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ قانون کی پستی اور پس پائی کی نشانی ہے۔ گویا انتشار معدومیت یا قانون کی عدم موجودگی کا نام ہے۔ عدم موجودگی کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ انتشار ایک خاص صفت کی پسپائی یا اس کے کم ہونے کا نام ہے۔ جب یہ پسپائی مکمل ہو جاتی ہے، انتشار (anarchy) کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ صرف اس وقت تک موجود ہے، جب تک کچھ نہ کچھ ترتیب، تنظیم اور قانون باقی ہے۔ کوئی سائنس دان یا فلسفی ایسی کسی کیفیت، خیال یا شے کا نام نہیں بتا سکتا جو ترتیب و تنظیم سے بالکل عاری ہو۔ جوں ہی ترتیب و تنظیم ختم ہونے لگتی ہے، اس شے کا وجود بھی ختم ہو جاتا ہے اور وہ عدم کی حالت میں داخل ہو جاتی ہے اور یوں مکمل طور پر معدوم ہو جاتی ہے۔ کسی مردہ جسم یا لاش کی مثال لیجیے؛ پہلے اس کے مادی عناصر کی تنظیم بگڑتی ہے اور پھر جب یہ بگاڑ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو لاش نظر سے غائب ہو جاتی ہے۔ اصل میں یہ وہ مرحلہ ہے جب وہ کسی اور حالت میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس بات کو ریاضی کی ذریعے بھی سمجھا جا سکتا ہے؛ الٹی گنتی کرتے جائیں تو آخر آپ صفر پر پہنچ جائیں گے جو کچھ نہیں ہے، عدم ہے۔ صفر کے بعد بھی صفر ہی ہے۔ مطلق صفر، مطلق معدومیت (nothingness)

Marfat.com

ہے جو کہیں وجود نہیں رکھتی۔ اگر اس کا وجود ہوتا تو ہر شے منہدم ہو جاتی۔ جسے ہم صفر کہتے ہیں وہ تو صفر کی جانب بڑھنے کا رجحان ہے۔ صفر عربی کا لفظ ہے۔ گیارھویں صدی کے قریب اسے اطالوی میں Zefiro کہا جانے لگا اور پھر یورپ میں مختصر ہو کر زیرو (Zero) بن گیا۔ قدیم یونانی صفر کے بارے میں بہت بے یقینی کا شکار تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ جو ''کچھ نہیں'' (لاشے) ہو وہ ''کچھ'' (شے) کیسے ہو سکتا ہے۔ چناں چہ صفر کی ماہیت کے بارے میں کئی فلسفیانہ اور مذہبی مباحث ہوتے رہے۔ فزکس میں بھی صفر توانائی، درجۂ حرارت یا آواز وغیرہ کے سب سے نچلے درجے کو ظاہر کرنے کا ایک آسان ذریعہ ہے۔ حرارت کی حرکی توانائی کا تیسرا قانون (third law of thermodynamics) یہ ہے کہ کسی بھی متناہی عمل کا سلسلہ مطلق صفر تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر کسی بھی چیز کے درجۂ حرارت کا صفر تک گر جانا ممکن ہوتا تو تمام تر حرکت رک جاتی۔ لیکن مطلق صفر کے درجے تک پہنچنا نظریاتی طور پر ممکن ہے نہ عملی طور پر۔ یہی وہ صفت ہے جو مکمل انہدام سے بچاتی ہے۔ اسی وجہ سے انسان مکمل طور پر اللہ سے جدا نہیں ہو سکتا، اس کی ذات سے گر نہیں سکتا۔ وہ آخری اور انتہائی درجے تک خدا کی ذات سے جڑا ہوا ہے۔ وہ مکمل طور پر معدوم نہیں ہو سکتا جیسے کہ سائنسی اصطلاح میں مطلق صفر کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔

انگریزی میں لاشے یا معدوم (nothing) کے معانی کے طور پر ''لا موجود'' (not being) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ ابتدائی یونانی فلسفیوں میں سے پانچویں صدی قبل مسیح کے فلسفی پارمینیڈس (Parmenidas) نے یہ تصور پیش کیا تھا کہ معدوم (nothing) کا کوئی وجود نہیں۔ پارمینیڈس ہرقلیطس (Heraclitus) کے نظریۂ جوہریت (atomism) کی بجائے وحدانیت (wholeness) پر یقین رکھتا تھا۔ وہ کہتا تھا، 'ہم صرف اس شے کے بارے میں بات کر سکتے ہیں جو وجود رکھتی ہے۔ اگر ہم ماضی کی کسی شے کے بارے میں بات کریں تو اسے بھی لازمی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہونا چاہیے'۔ اس کا کہنا تھا کہ تبدیلی محض فریبِ نظر ہے۔ اس فریبِ نظر کے پیچھے دوام ہے، ایک ایسا مادہ ہے جسے تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ''وجود میں آنا''، ''وجود سے نکل جانا'' اور ''غیر موجود ہو جانا'' ناممکن ہے۔

جان سکاٹ (John the Scot:۸۱۵۔۸۷۷) ہمہ اوستی (panthiest) تھا جس کے خیالات اپنے عہد کے اعتبار سے خاصے غیر رسمی تھے۔ اس نے شر کو 'لاموجود' (not being) میں شامل کیا تھا۔ اس کی

Marfat.com

وجہ اس نے یہ بتائی کہ شر، خیر کا متضاد ہے اور خیر خدا کی ایک صفت ہے۔ لیکن خدا کا کوئی متضاد نہیں ہوسکتا کیوں کہ ہمہ اوست (pantheist) کے فلسفے کے مطابق خدا سب کچھ ہے۔ اسی طرح اس خیال کی، کہ خدا کائنات کو عدم سے وجود میں لایا، اس طرح تعبیر کی جاتی ہے کہ عدم خدا کا مترادف ہے۔ لہٰذا لامتناہیت (Infinity) اور معدومیت (Nothingness) جب آپس میں ملتے ہیں تو وحدت میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب لامتناہی اور معدوم کی ماہیت میں کوئی فرق نہ ہو۔ ان میں فرق صرف ایک صفت کے ہونے (*Isness*) یا نہ ہونے (*aintness*) کے درجے کا ہو۔ یہ وجود (Being) کی اضافی (relative) موجودگی یا غیر موجودگی ہے۔ لامتناہیت ایسی مقدار کو کہتے ہیں جس کی کوئی حد ہو نہ اختتام جب کہ معدومیت کسی قدر کی تخفیف (depletion) کا نام ہے۔ بدھ مت میں لامتناہیت وجود کیکبھی ختم نہ ہونے والے چکر کا نام ہے جس میں پیدائش، موت، پھر پیدائش کا لامتناہی چکر چلتا رہتا ہے۔ دوسری طرف معدومیت کسی شے کی اتنی کم مقدار ہے، جسے دیکھنا یا ماپنا ممکن ہی نہ ہو اور جو کسی بھی قابلِ عمل پیمائش سے کم تر ہو۔ اس تعریف کی رو سے لامتناہیت (infinity) اور مطلق غیر موجودگی (nonexistence) دونوں تک کبھی نہیں پہنچا جا سکتا۔ مگر یہ سائنس دانوں کو حوالہ دینے کے لیے ایک پیمانہ ضرور فراہم کر دیتی ہیں جس کی مدد سے ہم اس فانی وجود کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ پس لامتناہیت اور معدومیت دونوں ابدی ہیں، کبھی ختم نہ ہونے والے ہیں اور زمانے کی حد سے باہر ہیں۔ اگر ہم لامتناہیت (infinity) کا کچھ حصہ اس سے نکال لیں یا کسی حصے کو اس میں شامل کر دیں تو جو کچھ باقی بچے گا وہ بھی لامتناہیت ہی ہوگا۔ یہی حال معدومیت کا بھی ہے۔

یہاں مغربی فکر کے ارتقا کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس کی ابتدا قدیم یونانی اور مشرقی نامیاتی (organismic) اور صوفیانہ (mystic) فلسفوں سے ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ مغربی فکر نے اس مابعد الطبیعیاتی رنگ سے منحرف ہو کر خالصتاً ذہنی اور دانشورانہ نہج اختیار کر لی۔ اب مغربی سائنس ایک بار پھر اپنی سمت بدل رہی ہے اور پلٹ کر قدیم یونانی اور مشرقی فلسفوں کی جانب رجوع کر رہی ہے۔ فزکس کے معروف عالم فریجوف کیپرا (Fritjof Capra) نے اپنی کتاب *The Tao of Physics* میں اپنا یہی مشاہدہ پیش کیا ہے؛ یعنی پہلے انحراف (divergence) تھا اور اب ارتکاز (convergence) ہے۔ قدیم ویدک اور یونانی فلسفے وجدان کا دور سمجھے جا سکتے ہیں جب کہ مابعد کا یورپی عہد عقل و خرد کا دور تھا۔ ان دونوں روایات کے امتزاج اور اس کے مزید ارتقا سے، یعنی کشف اور سائنس کی آمیزش سے ایک نیا عہد جنم لے

Marfat.com

سکتا ہے۔

لاسا (Lhasa) کی پوتالا خانقاہ (Potala Monastry) سے تعلق رکھنے والے پرانے تبتی لاموں میں سے ایک جس کا نام لوبسنگ راما (Lobsang Rampa) تھا، پچاس کی دہائی میں مغربی دنیا تک جا پہنچا۔ اس نے *The Third Eye* کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو ۱۹۵۶ میں شائع ہوئی۔ وہ بدھ مت کی ایک قدیم ریاضت کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ کیسے چند منتخب افراد کو دونوں آنکھوں کے بیچ میں ایک تیسری آنکھ کھول کر اس کے ذریعے غیر معمولی بصارت عطا کی جاتی ہے جس سے ان کی دیکھنے کی قوت عام انسانوں کی دوچشمی بینائی سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ لوبسنگ خود بھی تیسری آنکھ کھولنے کے اس کٹھن اور تکلیف دہ آپریشن سے گزرا۔ اس روحانی ریاضت اور تیسری آنکھ کھلنے کے عمل کا حاصل یہ ہے کہ انسان حقیقت کے دورُخے نظارے سے ماوراء ہو کر یک رُخی بصارت حاصل کر لے اور قطبین (Polarities) میں وحدت پیدا ہو جائے۔

فریجوف کیپرا (Fritjof Capra) اپنی کتاب *The Tao of Physics* کے دوسرے ایڈیشن کے پیش لفظ میں لکھتا ہے، ''ہم نے اجتماعیت پر انفرادی خود ادعائی، ترکیب پر تحلیل، وجدانی بصیرت پر عقلی علوم، مذہب پر سائنس، تعاون پر تقابل اور تحفظ پر توسیع کو ترجیح دی ہے۔ یہ یک طرفہ ترقی اب اس خطرناک حد تک پہنچ گئی ہے کہ جہاں معاشرتی، ماحولیاتی، اخلاقی اور روحانی اقدار بحران کا شکار ہو چکی ہیں''۔ یہ چکر کے الٹی طرف گھوم جانے کی مثال ہے جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا تھا۔

جدید فزکس میں معدوم (nothing) کا لفظ کسی تکنیکی معنی میں استعمال نہیں کیا جاتا۔ حتیٰ کہ اگر خلا (vacuum)، مکانِ تہی (empty space) یا روزنِ سیاہ (black holes) بھی ہوں تو انھیں معدوم سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ وہ بھی قابلِ تعین اوصاف کے مالک ہوتے ہیں اور کوانٹم مکینکی خلا (quantum mechanical vacuum) کے جزو کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ مغرب میں ایک سیکولر غلط فہمی بہت عام ہے کہ موت مکمل فراموشی میں ڈوب جانے کا نام ہے۔ آنجہانی اسحاق ایسیموف (Isaac Asimov) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک انٹرویو کے دوران کہا تھا، ''جب میں مروں گا تو جنت یا دوزخ میں نہیں جاؤں گا۔ وہ تو بس معدومیت ہوگی''۔ حیرت ہے کہ وہ شخصیت جو ہمیشہ سائنس کی ترویج و توثیق کے لیے کوشاں رہی، اتنا بھی نہ سمجھ سکی کہ معدومیت (nothingness) تک نہیں پہنچا جا

Marfat.com

سکتا چوں کہ معدومیت کا وجود ہی نہیں۔ ایسیموف کا یہ عقیدہ تمام سیکولر افراد میں مقبول اور مشترک ہے۔

۸۔ ۱۹۶۷ میں مجھے بطور طالب علم اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے لیے کمیونسٹ ملک چیکوسلواکیہ کے شہر پراگ میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ یہ تجربہ میرے لیے نہایت قابلِ قدر ثابت ہوا۔ وہاں میں ایک نوجوان روسی خاتون کے حسن و جمال اور تبحر علمی سے مسحور ہو کر رہ گیا تھا۔ ابتدا میں تو وہ مجھے سراپا تہذیب و شائستگی کا پیکر لگتی تھی۔ اسے کلاسیکی روسی ادب پر عبور حاصل تھا اور وہ دوستوفسکی، ٹالسٹائی، مارکس، ہیگل اور مادیت کے فلسفوں پر روانی سے اور بہت مرعوب کن انداز میں گفتگو کرتی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس سے بہت متاثر ہوا تھا اور قریب تھا کہ میرے قدم لڑکھڑا جاتے لیکن میرے تصور کا یہ بت اس دن پاش پاش ہو گیا جب ہفتے کے اختتام پر میری ممدوحہ نے رات کے کھانے اور شراب نوشی کے بعد ایک ہی رات میں چار مردوں کے ساتھ شب بسری کی۔ میں صدمے اور تعجب سے گنگ رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ایسے اعلا ذوق، ذہانت اور وقار کی حامل خاتون یوں خود کو بے قیمت کر سکتی ہے۔ چناں چہ میں خود پر قابو نہ پاسکا اور اس سے اپنی اگلی ہی ملاقات میں دانشورانہ گفتگو کے دوران پھٹ پڑا، کیوں؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ میں نے گستاخانہ لب و لہجے میں براہ راست پوچھ لیا۔ اس کا جواب بہت سادہ تھا۔

Bile- je- bude- a potom-konec
was- am- will be- and then- no more
تھا۔ ہوں۔ ہوں گا۔ اور پھر۔ کچھ نہیں

یہ ہے میری پہلی محبت کی دردناک کہانی! یہ اس کل کے تجربے کی ایک جھلک ہے جو جزو پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کیسے کوئی اجتماعی آئیڈیل فردی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ مارکس کا یہ مادی فلسفہ افراد کے طرزِ عمل پر حکمران ہو جاتا ہے جو کہتا ہے کہ انجام کار ایٹموں اور مکان کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور مذہبی اقدار اور مثالی نمونے صرف ایک فریبِ نظر ہیں، احمقوں کی جنت ہیں۔ یہ کہانی کمیونزم کے سمندر کا صرف ایک قطرہ ہے۔ اسی طرح کل جزو پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مارکسی مادیت مغرب میں پہنچ کر سائنس میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر جدید سائنس ایک نیا آئیڈیل ہے تو اسے بھی انسان کے طرزِ عمل پر حکمران ہونا چاہیے۔ اگر انجام موت اور معدومیت میں تحلیل ہو جانا ہی ٹھہرا تو پھر شادی سے پہلے، شادی کے بعد، شادی کے علاوہ کا لحاظ بے معنی ہے، جب تک جوانی کی توانائی باقی ہے، رنگ رلیاں، طلاقیں، شراب نوشی، خورد و نوش، آزادانہ جنسی اختلاط، نشہ آور

Marfat.com

ادویات، موقع پرستی اور عیش وعشرت، سب جائز ہے۔ پھر بڑھاپے کی اذیت شروع ہو جاتی ہے اور معدومیت کا انتظار باقی بچتا ہے جس کا وجود نہیں۔

''اسحاق ایسیموف کا بے فکرے پن پر مبنی یہ بیان ایک اور اتنی ہی عام غلط فہمی کا عکاس بھی ہے۔ وہ جنت اور جہنم کو معدومیت (nothingness) معدومیت کو جنت یا جہنم کا متبادل قرار دے کر اس خیال کا اثبات کرتا ہے کہ معدومیت موت کے بعد ہمارا انتظار کرتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ لفظ nothingness جس کا لاحقہ ness ہے، اس شے یا حالت کو ظاہر کرتا ہے جو وجود نہیں رکھتی۔ مگر یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے ہم بے ساختہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کوئی ایسی شے موجود ہے جو وجود نہیں رکھتی۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی تناقض نہیں ہے۔ ہمیں بس یہ دیکھنا چاہیے کہ معدومیت وجود نہیں رکھتی''۔

(www.naturalism.com/nothingness)

کوانٹم فزکس نے ثابت کر دیا ہے کہ تمام تر مادہ ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ تمام ذرات دوسرے ذرات میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ وہ توانائی سے پیدا کیے جا سکتے ہیں اور توانائی ہی میں دوبارہ مل سکتے ہیں۔ آپ اسے لامتناہیت کہیں یا معدومیت، مگر یہ بات انسان کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ انسان اللہ کے فضل وکرم سے باہر نہیں نکل سکتے، خواہ ہمارے گناہوں کا بار کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ ہمیں اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے، خواہ آپ اسے لامتناہیت کہیں یا معدومیت۔ اللہ ابدی طور پر بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا ہے کیوں کہ اس کا کہیں اختتام نہیں ہوتا۔ وہی سب کچھ ہے۔

دوسری طرف انہدام وانحطاط بھی موجود ہے جو پست تر سطح، کم تر مقدار یا نچلی حالت تک تنزلی کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر آپ طبعی سائنس، ماحولیات، نباتات، حیوانات اور انسانوں کے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہوئے چکروں کا بغور مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ہم سب طفیلیے (parasites) ہیں اور ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہوئے جی رہے ہیں۔ یہ چکر جب اوپر اٹھتے چلے جاتے ہیں تو آخر کار معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے خدا پر منحصر ہے کیوں کہ صرف اللہ ہی ہے جو خود انحصاری کے وصف کا مالک ہے۔ صرف وہی ہے جو موجود بالذات ہے۔ انسان اللہ کی ذات کے اندر رہتے ہوئے اس کا طفیلیہ ہے۔ اللہ زندگی کی ہر صورت کی بقا کا ذمہ دار ہے۔ اللہ کے الہامی ناموں میں سے ایک ''رب'' بھی ہے جس کا لغوی مطلب ہے پالنا، پرورش کرنا۔ اللہ الوہی

Marfat.com

ماں ہے جو پالتی ہے، پروان چڑھاتی ہے اور سہارا دیتی ہے۔ فطرت کو بھی، جو اس زمانی دنیا میں اللہ کے متوازی ہے، اکثر ماں کہا جاتا ہے۔ اللہ کا انکار کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان روحانی غذا کی کمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ قوانین فطرت کی پامالی انسان کو اسی طرح نابود کر دیتی ہے جس طرح خوراک کی کمی سے نوبت فاقہ کشی تک جا پہنچتی ہے اور انسان کا جسم آہستہ آہستہ ضعف و ناتوانی کا شکار ہو کر موت کی منزل کو پہنچ جاتا ہے۔ تاہم موت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ زندگی لازوال ہے اور توانائی کی طرح صرف شکل تبدیل کرتی ہے۔ موت معدومیت نہیں ہے۔ معدومیت کا کوئی وجود نہیں۔ جسے ہم موت کہتے ہیں اسے مشرق کی مابعد الطبیعیاتی زبانوں میں ''انتقال'' کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو جانا۔ روحانی فاقہ کشی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان تنزل کرتا ہوا ابدی طور پر وجود کی نچلی سطحوں تک گر جاتا ہے؛ بالکل ان پودوں کی طرح جنھیں پانی اور خوراک نہ ملے تو وہ سینۂ زمین سے چمٹے تو رہتے ہیں مگر مرجھائے ہوئے، کملائے ہوئے۔

وہ آزاد منش اور جرأت مند افراد جنھیں زندگی کی انتہاؤں اور شدتوں سے گزر جانے کا حوصلہ ہوتا ہے، اللہ کے پست و بلند، اس کے عرش و فرش کے گواہ ہوتے ہیں۔ اس کی رفعت و بلندی دیکھنا ہو تو پیغمبروں اور صوفیوں کی زندگیاں دیکھ لیجیے اور مذلت و پستی کا مشاہدہ کرنا ہو تو جدید عہد کی مخصوص اعصابی شخصیت کے مالک، باخبر، متمول مگر اکتاہٹ اور بیزاری کے شاکی اس فرد کو ملاحظہ کیجیے، جو اپنی زندگی کا خلا پر کرنے کے لیے عارضی خوش وقتیوں اور ہیجان انگیزیوں میں پناہ ڈھونڈتا پھرتا ہے اور نتیجے میں اور بھی خالی پن، معدومیت، بے معنویت، قنوطیت اور اذیت وصعوبت مول لے بیٹھتا ہے۔ یہ زندگی کی دو انتہائیں ہیں جن کا انسان تجربہ کرتا رہتا ہے۔ زندگی ارفع واعلا بھی ہے اور پست وادنیٰ بھی؛ مگر موت کہیں نہیں ہے۔ جنھیں ہم بے جان کہتے ہیں وہ مردہ نہیں ہوتے، صرف زندگی کی ادنیٰ صورت کا اظہار کرتے ہیں۔ جان دار اور بے جان کے درمیان فرق نوعیت کا نہیں، محض ساختیاتی ارتقا کے درجے، یا زندگی کی پیش رفت کا ہے۔ اب سائنس کو بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مادہ مردہ نہیں ہوتا۔ مادے کے ہر ذرے میں حرکت پائی جاتی ہے جس کے لیے توانائی استعمال ہوتی ہے۔ تمام تر مادہ زندہ ہے۔ مردہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی شے مر نہیں سکتی۔ صرف زندگی ہی تو ہے جو موجود رہتی ہے۔ موت کا کوئی وجود نہیں۔ ہر موت دراصل ایک قلب ماہیت، ایک کایا پلٹ ہے۔ وہ انسان جو زندگی کے ادنیٰ درجے میں ہیں، وہ بھی کبھی نہیں مریں گے، بس ابد تک اللہ سے جڑے ہونے کے باوجود، اس سے دوری کا شکار رہیں گے۔ یہی جہنم ہے۔ تمام تر زندگی اللہ سے؛ جو دائمی ہے، جڑی ہوئی ہے اس لیے ہر شے دائمی ہے مگر اس کے

Marfat.com

مختلف درجے اور سطحیں ہیں۔وہ، جو زندگی کے نچلے مدارج میں پڑے رہتے ہیں، ابد تک فاقہ کشی، کم خوراکی، ناتوانی، ضعف اور بے چارگی کی حالت میں رہتے ہیں اور جدائی، بے کلی، خالی پن اور ادھورے رہ جانے کا عذاب سہتے رہتے ہیں۔اس دوری سے بڑی کیا سزا ہو سکتی ہے، اس آگ سے بڑھ کر کیا آگ ہوگی!

متحد قوتوں کا اصول:
The Principle of Unified Forces

تمام تر حرکت وجود (existence) کی غیر موجودگی (nonexistence) کی جانب کھنچنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔یہ بات عمومی نظریہ معدومیت (General Nothingness Theory) میں منطقی انداز میں ثابت ہو جاتی ہے۔کائنات ایک ایسی حالت سے وجود میں آئی ہے جو زمان و مکاں، مادے اور توانائی، ہر شے سے خالی تھی۔اب یہ کائنات اسی معدومیت کی حالت کی طرف واپس لوٹ رہی ہے۔لامتناہی وقت کے تناظر میں، پھیلاؤ اور سکڑاؤ کے چکروں کی صورت میں، کائنات یہی کرتی آئی ہے اور ہمیشہ یہی کرتی رہے گی۔ فطرت کے تمام نظام اسی چکر کی پیروی کرتے ہیں۔(۱۹۸۹۔۲۰۰۷: Corey Kaup, Kaup Communications)

توازن:
Equilibrium

''کائنات کے پھیلاؤ سمیت، اس کی تمام تر حرکت توازن کے بگاڑ کا نتیجہ ہوتی ہے۔اس سادہ سے نقطۂ نظر کو اپنانے سے فزکس کے تمام قوانین اور اصولوں کو ایک ہی نظام میں منسلک کرنا ممکن ہو جائے گا۔ذرا تصور کیجیے، تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی پر ایک کشتی ساکن و جامد کھڑی ہے۔تالاب کا پانی اور کشتی دونوں ایک دوسرے کی نسبت سے سکون کی حالت میں ہیں۔اصولِ جمود (Law of Inertia) کی رو سے سکون کی یہ حالت اس وقت تک تبدیل نہیں ہو سکتی جب تک کوئی خارجی قوت، اس نظام کے توازن میں بگاڑ نہ پیدا کر دے۔اس بگاڑ کے نتیجے میں کشتی ڈولنے لگے گی اور تالاب میں لہریں ہی لہریں پھیل جائیں گی۔ پھر اصولِ انقطاعِ توانائی (Law of Entropy) کی رو سے یہی حرکت اس نظام کو سختی سے اسی حالتِ جمود کی طرف

Marfat.com

واپس لے آئے گی۔ مجموعی طور پر پوری کائنات سمیت، فطرت کا ہر نظام اسی اصول پر چلتا ہے۔ زمان اور مکان بھی انتشار (dispersion) کے ذریعے یکساں ہو جاتے ہیں۔ کائناتی سطح پر یہ انتشار دوسرے حرحرکی قانون (Law of Thermodynamics) کے تحت بروئے کار آتا ہے اور یکسانیت اور رجعت کا وہ عمل پیدا کرتا ہے جسے انقطاعِ توانائی (entropy) کہتے ہیں۔ ذروں سے ایٹم، ایٹموں سے مالیکیول اور مالیکیولوں سے پیچیدہ تر ساختیں تشکیل دینے کے لیے توانائی (حرکت) کی ضرورت ہوتی ہے۔ انقطاعِ توانائی کا عمل توانائی کی زندگی کو ایک مخصوص حد میں رکھنے کے لیے رفتہ رفتہ اس عمل کو الٹ دیتا ہے"۔

(Theory of Nothingness-Corey D. Kaup)

بقائے ذات کا اصول:
The Principle of Self Preservation

اللہ دوطرفہ (Bi-Polar) ہے۔ وہ کریم و شفیق تو ضرور ہے لیکن اس کے برعکس اوصاف کا بھی مالک ہے مثلاً خوف، تعجب، تباہی، فنا، انتقام، غصہ، نفرت اور جنگ وغیرہ۔ اس دوسرے رخ کے بغیر خدا ایک غیر محفوظ خدا ہوگا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو مدافعت کی ضرورت ہی کیا ہے جب کہ خدا کے سوا کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ کچھ لوگ شاید یہ سمجھ بیٹھیں کہ ایسا خدا جو اپنی مدافعت کی اہلیت رکھتا ہے، اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے علاوہ بھی کچھ قوتیں موجود ہیں۔ ایسی قوتیں جن سے خود کو بچانا خدا کے لیے لازم ٹھہرا۔ مگر ایسا سمجھنا ایک سنگین غلطی ہے جو اس کائنات کی اصل نوعیت و ماہیت سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ اللہ کے سوا کوئی شے وجود نہیں رکھتی لیکن اللہ کو مدافعت کی ضرورت ہے کیوں کہ اسے خود کو خود سے محفوظ رکھنا ہے۔ اللہ کو خود اپنی ذات کے باغی حصے سے نمٹنا ہے جو اس کے وجود میں کینسر کی طرح عمل کرتا ہے۔ سطحی نظر سے دیکھیں تو یہ بات بالکل بے معنی اور مضحکہ خیز لگتی ہے کہ خدا خود کو خود سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس موضوع پر مزید کچھ کہنے سے پہلے، آیئے، اپنے گردوپیش کے روزمرہ تجربات پر ایک نظر ڈالیں اور اس نمونے کو سمجھنے کی کوشش کریں جو کائنات میں جاری و ساری ہے۔ ہمیں اس بات کا ادراک حاصل کرنے کی ضرورت ہے کہ خدا کی فطرت اور ماہیت کس طرح ہمارے اردگرد کی حقیقت میں ظہور کرتی ہے۔ تو چلیں فرد سے شروع کرتے ہیں؛ علم الاعضا (physiolog) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر زندہ جسم کے اندر ایسے کیمیائی مادے ہوتے ہیں جو خود کو خود سے بچانے کے

Marfat.com

لیے حفاظتی کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ مادے انسان کا مدافعتی نظام تشکیل دیتے ہیں۔ یہ اصول انسانی ذہن پر بھی مساوی طور پر کارفرما ہوتا ہے۔ انسانی ذہن کے نفسیاتی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کیسے ذہن تباہ کن خیالات سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے انھیں دبا دیتا ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ کیسے معاشرہ خود کو خطرناک نظریات سے محفوظ رکھتا ہے۔ بے شک ایک ایسا نظریہ جو پورے معاشرتی ڈھانچے کو منتشر کر دے، ایٹم بم سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

اگر ہم عضویاتی سطح پر بات کریں تو قومی ریاست بھی کسی ذاتِ واحد کی طرح ہوتی ہے لیکن پھر بھی اسے پولیس کے محکمے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ خود کو خود سے بچا سکے۔ فوجیں اسی لیے پروان چڑھائی جاتی ہیں تاکہ بنی نوعِ انسان کو بنی نوع انسان سے محفوظ رکھ سکیں۔ سطحی نظر سے دیکھیں تو لگتا ہے کہ فوج کا اصل مقصد خود کو دوسروں سے بچانا ہے جیسے یہودیوں سے، مسلمانوں سے، کمیونسٹوں سے یا سرمایہ داروں سے لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاشرے اپنے دفاعی نظام اور افواج اس لیے قائم کرتے ہیں کہ خود کو خود سے بچا سکیں۔

حیوانات اور نباتات کی سطح پر بھی اصول مدافعت مساوی طور پر لاگو ہوتا ہے۔ ارتقا ان محرک قوتوں کی تاریخ کا نام ہے جو حیوانی جبلتوں کے مدافعت پر مبنی رویے کی گواہ ہیں۔ یہ جبلتیں ان خلقی رجحانات، ان پیدائشی اوصاف پر مشتمل ہیں جو کسی فرد یا نوع کی حیاتیاتی بقا کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جب کوئی انسان درخت کاٹتا ہے یا کوئی شیر کسی بھینس کو چیر پھاڑ دیتا ہے تو بادی النظر میں یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے علاوہ کسی اور کو مار رہا ہے لیکن یہ محض ایک فریبِ نظر ہے، دھوکہ ہے۔ وہ کسی اور کو نہیں، خود ہی کو فنا کرتا ہے۔ اصل میں وہ زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔ اسی لیے اعلا مذاہب میں، ایسی صورت حال کے سوا، جس میں خود اپنی بقا یا مدافعت کا سوال درپیش ہو، چیونٹی کو مارنا یا درخت کاٹنا بھی سنگین گناہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ وہ بصیرت ہے جو ہمارے تعزیراتی نظام میں بھی نظر آتی ہے۔ پوری کائنات ایک واحد زندہ جسم ہے۔ یہ باہم مربوط اور ایک دوسرے کے ماتحت عناصر کے تعامل سے بننے والی ایک پیچیدہ ساخت ہے۔ ان عناصر کی پہچان ان کے مخصوص اوصاف، وظائف اور اس مجموعی کل کی نسبت سے ان کے کردار اور مقام پر منحصر ہے۔

کئی اہم سائنسی تصورات ان کلیدی قوانین کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں مثلاً مرکز (Center)، چکر (Cycle)، افزائشِ نسل (Reproduction)، بازگشت (Recapitulation)،

Marfat.com

اعادہ(Repetition)، حرکت(Motion)، ترتیب(Order)، کایا پلٹ یا تبدیلی (Transformations)، درجات(Degrees)، درجہ بندی(Gradations)، ابعاد (Dimensions)، تسلسل(Continuum)، کلیت(Wholeness) اور صعودی سرگم (ascending Octave) وغیرہ۔ یہ تصورات حقیقت کو سمجھنے کی اہم کلید ہیں اور حقیقت کے مرئی سے غیر مرئی تک تمام پہلوؤں اور تمام سطحوں پر محیط ہیں۔

ان تصورات سے اور بھی بہت سے ذیلی اصول اخذ ہوتے ہیں لیکن ان ذیلی اصولوں کے بارے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ان ذیلی اصولوں کو علیحدہ اور آزادانہ طور پر لاگو نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ وحدت کے اوصاف ہیں اور کلیت کے مختلف پہلو ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی چکر، مرکز کے بغیر اور کوئی حرکت مدارج اور سمت کے بغیر نہیں ہوتی۔

اصولِ مدارج(Principle of Degree) یہ ظاہر کرتا ہے کہ وحدت ثنویت کی صورت میں منکشف ہوتی ہے لیکن یہ بظاہر بالکل متناقض دکھائی دینے والی صفت یعنی ثنویت اصل میں وحدت ہی کے دو انتہائی سروں کو ظاہر کرتی ہے۔ ان دونوں انتہائی سروں کے درمیان لاتعداد وسطی مدارج ہیں جو وحدت کی مختلف سطحوں کو منکشف کرتے ہیں۔ اصولِ تسلسل(Principle of Continuum) یہ بیان کرتا ہے کہ وحدت ایک متنوع اور ہمہ جہت تسلسل کی صورت میں اول سے آخر تک چلتی رہتی ہے اور اس اول و آخر کے درمیان بے شمار مقامات اور مراحل ہیں۔ اصولِ ابعاد (Principle of Dimensions) یہ بتاتا ہے کہ وحدت چار ابعادی ہے اور یہ چار ابعادی صورت میں ہی ظاہر ہوتی ہے لیکن ان ابعاد کے درمیان اختلاف نوعیت کا نہیں، محض درجے یا سطح کا ہے اور یہ تمام ابعاد ایک ہی حقیقت کے مختلف رُخ یا پہلو ہیں۔ اصولِ سرگم (Principle of Octave) بیان کرتا ہے کہ وحدت کی صعودی حرکت کی سات منزلیں ہیں۔ یہ ترتیب و تنظیمِ نو اور تغیر و تبدل کا اصول ہے۔

اصولِ کلیت(Principle of Wholeness) کا مفہوم یہ ہے کہ وحدت ہی سب کچھ ہے اور کوئی شے اس محیطِ کل وحدت سے باہر نہیں ہے۔ کسی بھی شے کو چھوڑا جا سکتا ہے، نہ نکالا جا سکتا ہے۔ مطلق انتشار اور مطلق صفر کا کوئی وجود نہیں۔ بس ایک ہی کلی مادہ (Sole Substance) ہے جو بیک وقت خدا بھی ہے،

Marfat.com

انسان بھی اور فطرت بھی۔ ایک مرتبہ ایک معروف ربی (Rabbi) نے آئن اسٹائن سے پوچھا کہ خدا کے بارے میں وہ کیا سمجھتا ہے؟ آئن اسٹائن نے جواب دیا کہ اسے صرف اسپائی نوز کا تصورِ خدا ہی بامعنی معلوم ہوتا ہے اور اس تصور کے مطابق خدا کائنات سے الگ کوئی اکائی نہیں ہے۔

کریکو، پولینڈ کی جگیلونین یونی ورسٹی کے پروفیسر اور فری یورپین اکیڈمی آف سائنس (ہالینڈ) کے رکن پروفیسر کانریڈ رڈنک (Conrad Rudnick) اپنی کتاب *The Cosmological Principles* (۱۹۹۵) میں لکھتے ہیں:

> With time, we are increasingly aware of the existence of ever older cultures. As recently as the 18th century, it was believed that human culture was something very recent - that the first roots of it are to be found only in the social and scholarly institutions of ancient Greece and Rome. The Europeans of that time thought that prior to ancient Greece there were only uncivilized customs and barbaric art and therefore ideas about nature, and particularly about the Universe, must have been quite primitive, too. Furthermore, it was commonly thought that though, to be sure, the Greeks had laid the foundations for modern science, true scientific research had actually begun only in the Renaissance era.'

'وقت کے ساتھ ساتھ قدیم تہذیبوں کے بارے میں ہماری آگاہی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اٹھارھویں صدی تک تو ہم یہ سمجھتے آرہے تھے کہ انسانی تہذیب بالکل تازہ اور حال ہی کا واقعہ ہے اور اس کی ابتدا قدیم یونان اور روم کے علمی و سماجی اداروں سے ہوتی ہے۔ اس دور کے یورپی لوگ یقین رکھتے تھے کہ یونانِ قدیم سے پہلے کا دور وحشی اور غیر متمدن تھا لہٰذا اس دور کے رسوم و رواج، فنون اور فطرت، بالخصوص کائنات کے بارے میں ان کا تصور بہت غیر ترقی یافتہ تھا۔ مزید برآں یہ بات بھی عام طور پر درست تسلیم کی جاتی تھی کہ اگرچہ جدید سائنس کی بنیاد یونانِ قدیم ہی میں رکھ دی گئی تھی لیکن اس بنیاد پر سائنسی تحقیق کی شاندار عمارت تعمیر

Marfat.com

کرنے کا کارنامہ یورپی نشاۃ ثانیہ کے دور میں سرانجام دیا گیا ہے۔'

پرانی تہذیبوں میں سے ایک انتہائی عظیم الشان تہذیب، جس کا تصورِ کائنات بہت ترقی یافتہ تھا، ڈھائی ہزار سال قبل مسیح میں قدیم وادی سندھ میں پروان چڑھی۔ یہ قدیم آریائی ثقافت کی روحانی نمود اور کشود کا دور تھا۔ اس دور میں ہندوستانی قوم، ہندوستان کے شمالی علاقے میں، جو اب پاکستان کہلاتا ہے، دریائے سندھ کے کنارے کنارے امن سے رہتی تھی۔ بعض اوقات اس دور کو ہندوستان کے عظیم رشیوں، عظیم استادوں کا دور کہا جاتا ہے۔

قدیم ہندوستانی ہر اس چیز کو مایا یا فریبِ نظر خیال کرتے تھے جسے حواس کی مدد سے جانا جاتا ہے۔ وہ اس مایا، اس فریب میں جینے کو بوجھ سمجھتے تھے۔ اس کی بجائے وہ روحانی حقیقت کے جویا تھے۔ وہ اس روحانی حقیقت تک، عقل و منطق (منطق ابھی ایجاد نہیں ہوئی تھی) سے نہیں، اپنے سوز و گداز اور جذبِ فراواں کے ذریعے رسائی چاہتے تھے اور اس کا تجربہ کرنے کے خواہش مند رہتے تھے۔

قدیم ہندوستانی طرزِ تفکر کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس زمانے میں ایسا فلسفہ نہیں تھا جس سے ہم جدید زمانے کے لوگ مانوس ہیں۔ وہ مسائل جنھیں ہم آج کل فلسفے کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس زمانے میں جمالیاتی اور فنی سرگرمیوں کے ذریعے اظہار پاتے تھے۔ فلسفہ ابھی شاعری کی آغوش میں سمٹا ہوا تھا یا پھر یوں کہ لیجیے کہ شاعری ہی فلسفیانہ نظریات کے بیان کا مؤثر ترین ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ لہٰذا یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب ہم قدیم ہندوستانی فلسفے کی بات کرتے ہیں تو اپنے ذہن کو فلسفے کے موجودہ تصور سے آزاد کر لینا بہت ضروری ہے ورنہ ہم ان تصورات کے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔ قدیم ترین ہندوستانی متون بیت کر دیکھنے کی ضرورت ہے، محض منطقی مباحث یا استدلال سے کام نہیں بنتا۔

بھگوت گیتا کے گیارھویں باب میں قدیم ہندوستانی تصورِ کائنات کی ایک جھلک دیکھیے:

کرشنا: اے زمیں زاد، پھر مجھے دیکھ
صورتوں کی کثرت میں، وحدت کی طرح
متنوع، الوہی فطرت کی طرح
لاتعداد، آسمانوں کے ستاروں کی طرح

Marfat.com

اسے ایک زندہ کل کی طرح سمجھ،
یہ پوری دنیا، اپنی تمام تر شکلوں اور صورتوں کے ساتھ،
یہ میرا جسم ہے، میں خود اس کی روح ہوں۔
اور ہر شے جو ''ہے''، سب مجھ میں ہے
پھر جب جہانوں کے آقا نے یوں کہا
اس نے زمیں زاد پر منکشف کر دیا
اپنا آپ، خود اپنے سچے روپ میں
ایک حاکم کی طرح جو کل جہانوں کا مالک ہے

معروف صوفی منصور حلاج جس نے عالمِ جذب میں انا الحق (میں خدا ہوں) کہہ دیا تھا اور اس 'کلمۂ کفر' کی سزا کے طور پر قتل کر دیا گیا تھا، جب عالمِ ہوش میں ہوتا تو کہا کرتا تھا ''میں نہیں ہوں، صرف اللہ ہے''، جو اپنی ذات کی مکمل نفی کر دینے والی دوسری انتہائی کیفیت تھی۔ لیکن یہ دونوں باتیں ایک ہی حقیقت کو بیان کرنے کے دو انداز ہیں۔ کل حقیقت تو بس یہی ہے کہ ''میں ہوں اور اس کے باوجود وہ ہے'' یا اس کے برخلاف یہ کہ 'میں نہیں ہوں اور میں ہوں'۔ اللہ ہمارے ماسوا کوئی وجود ہے اور پھر بھی ہم ہیں۔ اللہ ہر شے کا جوہر ہے۔ اسلامی تصور توحید یہی ہے کہ اس وحدت کو پہچانا جائے جو ایک دوسرے سے مربوط اور ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہوئی ہر شے میں جاری وساری ہے اور اپنی ذات کو ذاتِ واحد کے سپرد کر کے اس عظیم ذات کے اندر رہتے ہوئے اپنی بقا اور ارتقا کا سامان کیا جائے۔ توحید خود شناسی سے خدا شناسی تک کا سفر ہے۔ محمدؐ کے کئی ناموں میں سے ایک عبد الباری بھی ہے جس کا مطلب ہے خدا کی اطاعت کرنے والا۔ اس تصور کے مطابق جو شخص اپنی علیحدہ، منفرد اور الگ تھلگ موجودگی پر اصرار کرتا ہے وہ کفر کا مرتکب ہوتا ہے۔ 'کفر' توحید کی نفی کا نام ہے۔ تاہم خود اپنی شناخت اور شخصیت پر یقین رکھنا ایک فطری امر ہے اور اسے اصول شکنی نہیں سمجھا جاتا۔ اللہ ایک ایسا زندہ وجود ہے جو ہم سے بالاتر بھی ہے اور ہم میں بھی ہے۔ انفرادیت اور انوکھا پن اس کی اہم اور قابلِ قدر صفات ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جو خدا کے سامنے نہیں جھکتا، وہ اس کی نفی کرتا ہے اور یوں خود اپنی نفی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس طرح وہ خود اپنی ذات کے اعلاتر مدارج سے کٹ جاتا ہے۔ ایسا شخص خود اپنی ذات کی تحدید کر لیتا ہے اور خود اپنی ترقی اور نشوونما کا راستہ روک کر انجام کار دکھ اٹھاتا ہے۔ خدا سے انکار کا مطلب ہے نشوونما کا رک جانا، مائل بہ

Marfat.com

تنزل ہو جانا اور ایک ہی مقام پر رک کر گل سڑ جانا۔ یہاں تھوڑی سی وضاحت کی ضرورت ہے۔ ایسا شخص اپنے آئیڈیل تک پہنچنے کی کوشش میں تو رہتا ہے۔ مگر یہ آئیڈیل، اس کا نصب العین، اس کا خاندان، اس کا معاشرہ، اس کی قومیت اور اس کے دیگر گروہ یا کلب جن کا وہ رکن ہے، اسے مہیا کرتے ہیں۔ لیکن وہ ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ لہٰذا اس کی نشو ونما کی تکمیل نہیں ہوتی اور وہ ایک ہی مقام پر رک جاتا ہے اور اسے ایک بند گلی میں داخل ہونے کا شدید احساس ہونے لگتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جسے سی۔ جے۔ ژونگ نے اپنی کیس اسٹڈیز میں ریکارڈ کیا ہے۔ کامیاب ترین لوگ، فلمی اداکارائیں، معاشرے میں اعلا مقام رکھنے والے حضرات، سیاست دان، زندگی کے آخری ایام میں انتہائی مایوسی، اضمحلال اور بے مقصدیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ اصول صرف افراد پر نہیں، معاشروں اور تہذیبوں پر بھی صادق آتا ہے۔ اسی لیے جدید ترین معاشرے ایک حد تک ترقی کرنے کے بعد زوال کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ مسلسل نشو ونما پانے کے لیے آدرشوں (ideals) کی ضرورت ہوتی ہے جو انسان کو جدوجہد پر آمادہ کرتے ہیں۔ ترقی اور نشو ونما بھی ایک تسلسل (Continuum) ہے جس کی صحت کا دارومدار حرکت پر ہے۔ اگر یہ رک جائے تو انسان پر مایوسی چھا جاتی ہے۔

توحید جو ہر شے پر محیط ہے، انسانیت کی ترقی کے لیے عظیم ترین آدرش (ideal) فراہم کرتی ہے۔ یہ ہر حقیقت کی باطنی فطرت اور اس کی ماہیت ہے۔ بنی نوع انسان فطرت کے اس عظیم قانون کی درست تفہیم، مناسب ردعمل اور خوشگوار مطابقت کی مدد سے پھل پھول سکتا ہے اور بہت فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔ یوں فاعل (خدا) اور مفعول (خود) کی ثنویت کا مسئلہ اصولِ کلیت (Principle of Wholeness) کے ذریعے حل ہو جاتا ہے۔

یہ ان قوانین اور اصولوں کا مختصر سا تعارف تھا جو عظیم وحدت یعنی اللہ کی اس فطرت سے اخذ کیے گئے ہیں جو اسماے حسنیٰ کے ذریعے منکشف ہوتی ہے۔ یہ تمام قوانین اور اصول آزمائے جا سکتے ہیں۔ کسی بھی فرضیہ (hypothesis) کے مصدقہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں فطری طور پر مسترد ہونے اور جھٹلائے جانے کا امکان (falsifiable) موجود ہو۔ اس کے بعد ہی اس کی تصدیق (verification) کا مرحلہ آتا ہے اور تبھی اسے ایک سائنسی صداقت کے طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کوئی نظریہ بھی مکمل طور پر درست نہیں ہوتا تاہم اگر جھٹلایا نہ جائے تو اسے ایک حقیقت سمجھ لینا لازم ہو جاتا ہے۔ ان اصولوں کے اطلاق کی بات پوری طرح

Marfat.com

بیان کرنے کے لیے تو شاید روشنائی کے سمندروں اور بے شمار انسانی نسلوں کی ضرورت ہو، لیکن یہاں مختصر طور پر ان کی بنیادی اہمیت بیان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

قوانینِ وحدت کے اطلاق کی صورتیں:
Applications of the Laws of Unity

یہ قوانین بیان کرتے ہیں کہ جب بھی ہم اللہ کی جوڑے دار اور دوطرفہ (paired and polar) صفات، جیسے القابض (سکیڑنے والا) اور الباسط (کشادہ کرنے والا) کا ذکر کرتے ہیں تو قانونِ وحدت کی رو سے یہ الفاظ چاروں ابعاد میں رونما ہونے والے قبض وبسط (سکڑاؤ اور پھیلاؤ) کے تمام وسطی مدارج اور مراحل پر محیط ہوتے ہیں؛ خواہ یہ بے جان ہوں یا جاندار، حیوانی ہوں یا نفسی، گویا زندگی کے کسی بھی منطقے سے تعلق رکھتے ہوں مگر قانونِ وحدت کے مطابق ان کا باہمی تعامل، نوعیت وفطرت، اوصاف وخصائص، کردار وطرزِ عمل ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔

مزید برآں، قبض وبسط یا سکڑاؤ اور پھیلاؤ کا اصول اور عمل؛ جب بھی دیکھا گیا ہے یا رونما ہوا ہے اور اس کے فوری اسباب، طبعی یا غیر طبعی جو بھی رہے ہوں، بہر حال اللہ کی قوت کا اظہار کرتا ہے اور اسی کی صفت ہے۔ اس بات پر یقین نہ کرنا یا کسی ایسی بات پر ایمان لانا جو کسی اور شے کو اس عمل کا سبب قرار دے، اور اس مسبب الاسباب کو نظر انداز کر دے، وحدت اور اس کی صفات کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔ یہ تخلیق کی وحدت اور سائنسی اصولوں کی آفاقیت کو رد کرنے کے مترادف بھی ہے۔

الارم والی گھڑی کے سپرنگ کا مشینی سکڑاؤ اور پھیلاؤ، مثبت اور منفی برقی تاروں کے درمیان دوڑنے والی برقی رو، حرارت کے ناہموار سلسلے (convection currents) جو سکڑتے اور پھیلتے بھی ہیں، چٹانوں کا گرمی کی شدت سے پھیل کر تڑخنا اور سردی سے سکڑنا، زندہ انسانی جسم میں دل کا سکڑاؤ اور پھیلاؤ، علم فلکیات کے ماہرین کے مشاہدے کے مطابق اس لامتناہی کائنات کا سکڑاؤ اور پھیلاؤ اور صوفیوں کے ہاں قبض اور بسط کی کیفیات، ان سب پر اصولِ وحدت کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان وظائف کا فوری محرک اور سبب طبعی، عضویاتی، نفسیاتی اور روحانی کچھ بھی ہو، لیکن ان سب کا مسبب الاسباب اللہ ہی ہے۔ قبض اور بسط اللہ کے نام ہیں جو اس کے دوطرفہ افعال کو ظاہر کرتے ہیں۔ فزکس میں ہر ایٹمی ذرہ اس حقیقت کا عکس پیش کرتا ہے کہ ذرے کی خصوصیات

Marfat.com

صرف اس کے عمل یا فعل (activity) کے حوالے سے ہی سمجھی جا سکتی ہیں۔ اسمائے افعال ہمیں اللہ کی ساخت یا ماہیت (structure) کی بجائے اس کا فعلیاتی نظارہ (functional view) دکھاتے ہیں۔ اللہ کی ساخت یا ماہیت انسانی فہم سے ماورا ہے۔ سائنس دان کے لیے اس میں یہ اشارہ پنہاں ہے کہ اب خدا کو ایک جامد شے کی مانند سمجھنا ممکن نہیں رہا کیوں کہ وہ باہمی تعامل کے روابط کا ایک حرکی نمونہ (dynamic pattern of interactions) ہے۔ اللہ اگرچہ احد ہے لیکن کوئی علیحدہ اکائی نہیں ہے بلکہ ایک متحدو متصل کل (integral whole) ہے جس میں توانائی اور اس کے دائرہ کار کے انتہائی پیچیدہ عمل (processes) ہوتے رہتے ہیں جو خود اپنا اظہار بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ کی صفات کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔

قانونِ مساوات (law of Parity) (یہ قانون ترمیم شدہ انگریزی ٹیکسٹ میں سے غائب ہے۔ یعنی یہ عنوان) یہ بیان کرتا ہے کہ جوڑے دار طرفین کا باہمی تعامل ہمیشہ مساوی ہوتا ہے۔ یہ طرفین ہمیشہ برابر برابر بروے کار آتے ہیں۔ تاہم قانونِ سبقت کی رو سے ان میں سے ایک کو دوسرے پر سبقت یا فضیلت حاصل ہے۔ لہٰذا القابض اور الباسط میں سے ایک مقدم ہے اور مؤخر۔ اسپرنگ کو پہلے بھینچا جاتا ہے، پھر اس کی قوت، لچک اور تعدد میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس عمل کو الٹ دیا جائے تو ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اگر آپ اسپرنگ کو پھیلا دیں تو یہ اپنی قوت کھو بیٹھے گا۔ اسی طرح دل کا سکڑنا اس کے خون پمپ کرنے کے عمل کو مستعد رکھتا ہے، اس کا پھیلنا نہیں۔ قانونِ سبقت یہ بتاتا ہے کہ قبض کو بسط پر سبقت حاصل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علّت معلول (effect is cause) پر اثر انداز ہوتی ہے، معلول علت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اسپرنگ کا سکڑنا ہی اس کے پھیلنے کی وجہ ہے۔ اس قانون کو الٹ کر استعمال کرنا ممکن نہیں۔ دل کا ایسا پھیلاؤ، جو اس کے سکڑاؤ کے نتیجے میں نہ ہو، ایک بیماری بن جاتا ہے اور صحت کی خرابی کا سبب ہوتا ہے۔ اسی طرح معلول پر یقین رکھنا اور اس کی علّت کو نظر انداز کر دینا حقیقت کی الٹ تفہیم کا باعث بنتا ہے۔ یہ عقل کا وہ رُخ ہے جو اشیا کی سچائی تک پہنچا سکتا ہے نہ حقیقت کی ماہیت سمجھا سکتا ہے۔

سادہ الفاظ میں قانونِ وحدت کا مفہوم یہ ہے کہ حقیقت ایک ہے، تمام تر حقیقت متضاد جوڑوں پر مبنی ہے، یہ جوڑے ایک دوسرے کے مساوی ہیں، ایک دوسرے کی نسبت سے توازن کی حالت میں ہیں، ایک دوسرے کے

Marfat.com

مطابق ہیں اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ یہ ظاہری ثنویت جس کا انسان مشاہدہ کرتا ہے، مثلاً دن اور رات، گرمی اور سردی، گرم اور ٹھنڈا، سرخ اور سبز، محبت اور نفرت، شمال اور جنوب، عقل اور جذبہ، منفی اور مثبت، فاعل اور مفعول، سب ایک ہی تسلسل کے دو انتہائی مقامات ہیں جن کے درمیان لاتعداد وسطی مدارج بھی ہیں۔ یہ دونوں انتہائی مقامات وحدت کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے سے مساوی تعامل کرتے ہیں کیوں کہ وحدت کی فطرت میں ہی ثنویت پائی جاتی ہے جو کشش (+) اور گریز (-) کی قوتوں کے درمیان ایک حرکی توازن قائم رکھتی ہے۔ یہی شاعر کی بصیرت کا حاصل بھی ہے، اگر خزاں آتی ہے تو اس کے تعاقب میں بہار بھی ہوتی ہے۔ کیوں کہ خزاں اور بہار ایک وحدت میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اس قانون کی رو سے جوڑے دار حقیقت کی کوئی بھی مثال ہو، مثلاً دن رات، گرمی سردی، گرم ٹھنڈا وغیرہ، یہ حقیقت کے تسلسل پر ان جوڑوں کے انتہائی مقامات (اوپر۔ نیچے) ہیں اور کسی خاص صفت کی موجودگی یا غیر موجودگی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں (جیسے ان مثالوں میں سورج کی روشنی)۔ دیگر جوڑے دار انتہائیں، مثلاً سرخ اور سبز، مشرق اور مغرب، صبح اور شام، سب اسی تسلسل کے وسطی مقامات ہیں۔ اس قانون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک حقیقت کا دوسری حقیقت سے مختلف ہونا، نوعیت کے نہیں، صرف اس کے درجے یا مقام (gradation or station) کے اختلاف پر مبنی ہے۔ جیسے مشرق، مغرب، شمال اور جنوب چار الگ الگ، ایک دوسرے سے الٹ اور انحراف کرتی ہوئی سمتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے مختلف ابعاد ہیں، جن میں فرق صرف درجے کا ہے۔ اسی طرح سفید فام، سیاہ فام، زرد اور گندمی چار الگ الگ نسلیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی نسلِ انسانی کے مختلف پہلو ہیں۔ ان میں فرق صرف جلد کی رنگت اور کچھ خلقی خصائص کا ہے۔ نسلِ انسانی کو ان چار انتہائی مقامات کے علاوہ اور وسطی مدارج کا حصول بھی ممکن بنانا چاہیے۔

یہ قانون اس امر کی وضاحت بھی کرتا ہے کہ کائنات میں چار منطقوں کی درجہ بندی (hierarchy) پائی جاتی ہے اور اسی لیے ہر حقیقت چار ابعادی ہوتی ہے۔ لہٰذا بنیادی رنگ چار ہیں؛ سرخ، سبز، پیلا اور نیلا۔ مادے کی بنیادی صورتیں بھی چار ہیں، آگ ہوا، پانی اور مٹی۔ ان چار بنیادی رنگوں کے ملنے سے بہت سے اور رنگ وجود میں آتے ہیں اور ان چار بنیادی عناصر کی ترکیب سے ٹھوس، مائع اور گیس کی کئی صورتیں تشکیل پاتی ہیں۔ لیکن یہ تمام متنوع رنگ اور صورتیں ایک ہی حقیقت کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتی ہیں۔

Marfat.com

قانونِ وحدت کا مطلب یہ بھی ہے کہ ایک ہی قانون زمان ولازماں کے ہر منطقے پر لاگو ہوتا ہے جو ایک ہی حقیقت کے مختلف مدارج ہیں۔ اسی لیے خاص اور قابلِ احترام فرشتے بھی چار ہیں؛ جبرائیل، اسرافیل، میکائیل اورعزرائیل۔ صرف چار الہامی کتابوں کو ترجیح حاصل ہے، توریت، زبور، انجیل اور قرآن۔ حضرت محمدؐ کے قریب ترین صحابہ بھی چار ہیں، ابوبکر، عمر، عثمان اور علی جنھیں دیگر تمام صحابہ پر فوقیت حاصل ہے۔ اسلامی تصوف کے بنیادی مکاتب بھی چار ہیں؛ قادریہ، سہروردیہ، چشتیہ اور نقش بندیہ۔ ان کے علاوہ بے شمار فرشتے، کئی الہامی صحائف، حضورؐ کے اصحاب یا اسلامی تصوف کے مکاتبِ فکر اور بھی ہوں گے، اور یقیناً ہیں بھی، لیکن یہ چار چار قسمیں بنیادی ہیں کیوں کہ اللہ جو حقیقتِ عظمیٰ ہے، چار ابعادی صفات کا مالک ہے۔ اسی طرح عیسائیت کی صلیب بھی چار ابعادی ہوتی ہے۔

اسی لیے وقت کے متعلق سائنسی نظریات، جیسے نظریۂ اضافیت، بھی چار ابعادی مکانی زمان (spacetime) کے حوالے سے مرتب ہوتے ہیں۔ ۱۹۰۸ میں ہرمن منکوسکی (Hermann Minkowsky) نے وقت کو مکانی زمان کا چوتھا بُعد قرار دیا تھا اور یہی بعد میں آئن اسٹائن کے عمومی اور خصوصی نظریۂ اضافیت کی بنیاد بنا۔ یہ چوتھا بُعد یا چوتھی سمت مجرد (غیر مرئی) ہے اسی لیے ریاضی میں چوتھی سمت یا چار ابعادی مکان (4D) کے تصورات تجریدی ہیں جو سہ ابعادی مکان کے عمومی قواعد وضوابط سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ جیومیٹری میں چوتھی سمت سمیت اعلاتر ابعاد کو پہلے ہی تسلیم کیا جا چکا ہے۔ کئی حالیہ سائنسی نظریات یہ ثابت کرتے ہیں کہ برقی توانائی، مقناطیسیت، کششِ ثقل اور تمام غیر مرئی قوتیں اسی نادیدہ، غیر مرئی چوتھی سمت کی مظہر ہیں۔ سٹرنگ تھیوری (String Theory) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں دس، بارہ، حتیٰ کہ چھبیس ابعاد شامل ہیں۔

ایڈون ایبٹ (Edwin Abbot) نے اپنی کتاب *Flatland* میں اس ابعادی مماثلت کو استعمال کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک مربع (square) کی کہانی بیان کی گئی ہے جو کسی کاغذ کے ٹکڑے کی سطح جیسی، دو ابعادی دنیا میں رہتا ہے۔ اس مربع کی نظر میں ہر سہ ابعادی وجود خدائی قوتوں کا مالک ہے کیوں کہ وہ کسی شے کو اس کے محفوظ خانے (safe) کو توڑے بغیر، تیسری سمت میں اٹھا کر نکال سکتا ہے، ہر اس شے کو دیکھ سکتا ہے جو دو ابعادی نقطۂ نظر سے پس پردہ رہتی ہے اور تیسری سمت میں محض چند انچ کے فاصلے پر کھڑے ہوتے ہوئے بھی

Marfat.com

مکمل طور پر نادیدہ رہ سکتا ہے۔

ایڈون ایبٹ کی اس کتاب فلیٹ لینڈ میں اس دو ابعادی مربعے (square) کی زندگی ایک سہ ابعادی مکان سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ کہانی نقطۂ عروج پر تب پہنچتی ہے جب ایک کرّہ (sphere) اپنی سہ ابعادی دنیا سے نکل کر اس دو ابعادی مربعے (square) سے ملنے آتا ہے اور اسے سہ ابعادی دنیا کے بارے میں بتاتا ہے۔ مربع، ہماری توقعات کے عین مطابق، اس کی بات سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور کرّہ اپنے الفاظ کی ناکامی دیکھتے ہوئے افعال میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ (فلیٹ لینڈ، ص ۷۷)

تو پھر کیا تعجب کہ مشرق کے صوفیوں کی تحریریں، رگ وید کی دانش و بصیرت، ولیوں اور بزرگوں کے کشف و کرامت اور اللہ کے بھیجے ہوئے الہامی صحیفوں کی عبارت ہمیں متناقض، نامانوس، الجھی ہوئی اور ناقابلِ فہم معلوم ہوتی ہے کیوں کہ ہم سہ ابعادی دنیا میں رہتے ہیں لیکن آج چار ابعادی دنیا کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ اس غیر مرئی سمت کی سائنس کو سمجھ سکیں اور اس کی تشریح کر سکیں۔ یہ تصنیف اس سمت میں پہلا قدم ہے۔ یہ انسان کی اعلا تر حقیقت کی طرف پیش رفت کا پہلا زینہ ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ چار ابعادی وجود اسی طرح ناقابلِ یقین کارنامے سر انجام دینے کا اہل ہوگا جو ہماری سہ ابعادی دنیا کے لیے محیر العقول ہوں۔ رڈی رکر (Rudy Rucker) کے ایک اور افسانوی قصے *Spaceland* میں جب مرکزی کردار ایک چار ابعادی ہستی سے ملتا ہے تو اس کی حیران کن قوتوں کو دیکھ کر کچھ ایسی ہی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے۔

آج کے جدید سائنس دان پہلے ہی ارتقا کی چار ابعادی توضیح و تعبیر میں مصروف ہیں۔ (دیکھیے ایوا جبلونکا اور میریون لیمب کی *Evolution in Four Dimensions* by Eva Jablonka and Marion J. Lamb
http://sis.embl.org/repository/docs/evolution.pdf

ان لائق سائنس دانوں کے مطابق پہلے دو ابعاد پیدائشی اور برتولیدی (genetic and epi-genetic) ہوتے ہیں (جسمانی سطح)، تیسرا بُعد یا پہلو رویے (behaviour) کا ہوتا ہے کیوں کہ بچے کا رویہ پیدائشی نہیں ہوتا بلکہ اس کے والدین کی رہنمائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چوتھا بُعد اس علامتی موروثی نظام (symbolic inheritance system) پر مشتمل ہے، جس کے سب سے اہم پہلو زبان، نظریات

Marfat.com

اور نظامِ فکر ہیں اور یہ ارتقا کی مجرد، غیر مرئی سمت ہے۔ ارتقا کے اس چار ابعادی نظام کو بیان کرنے کے بعد، جبلونکا اور لیمب اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ یہ چاروں ابعاد کس طرح باہمی تعامل کرتے ہیں۔ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پیدائشی سطح کا ارتقا اپنی آخری منزل یعنی ایک ذہین ہستی کے وجود میں آنے کے بعد ختم ہو چکا ہوگا لیکن اعلا تر سطح کا ارتقا ابھی جاری ہے جو فکر، خیالات و نظریات اور معاشرتی ڈھانچے کی غیر مرئی سطح پر انسان کے شخصی و سماجی رویوں پر مبنی ہے۔ یہ انسانی زندگی کے مرحلے ہیں جو درجہ وار کھلتے ہیں۔ یوں انسان کا ارتقا چاروں ابعاد میں جاری رہتا ہے۔ سائنس دانوں کا یہ خیال کہ ڈاروِن کے نظریہ ارتقا کا اطلاق انسان کی صرف جسمانی افزائش تک محدود ہے، بالکل غلط ہے۔ ارتقا کا عمل آج بھی جاری ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے لیکن اب یہ ارتقا انسانی جسم نہیں اس کے دماغ، سوچ اور شعور کی ترقی اور ترویج کا باعث ہے۔

یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے چاند پر پہنچنے کے لیے درجہ وار سفر جاری رکھنا ہوتا ہے۔ پہلے زمین پر، پھر راکٹ میں اور پھر راکٹ کی ضرورت نہیں رہتی۔ منزل تک جانے کے لیے چاند گاڑی میں سفر جاری رکھنا ہوتا ہے۔ سفر کے اصول وہی رہتے ہیں، منزل بھی وہی رہتی ہے لیکن درجات بدلتے ہیں۔

بہت سے معاصر ماہرینِ حیاتیاتی ارتقا (evolutionary biologist) اب ڈاروِن کے فطری انتخاب (natural selection) اور مطابقت سے بقا حاصل کرنے (survival through adaptation) کے نظریے کی نئی تعبیر و تفسیر میں مصروف ہیں۔ رچرڈ ڈاکن (Richard Dawkin) جو آکسفورڈ یونی ورسٹی کے سائنس کی عمومی تفہیم (Public Understanding of Science) کے شعبے میں پروفیسر، اور کتاب ''خود غرض جین'' (*The Selfish Gene*) کے مصنف ہیں، *meme* یا *replicator* (تقسیم در تقسیم کے ذریعے اپنے جیسے دوسرے نقش بنانے والے مالیکیول) کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ یہ وہ ابتدائی مالیکیول ہے جو پہلی بار تولیدی عمل میں کامیاب ہوا اور اس قدیم مادہ میں اپنے ہم سر دوسرے مالیکیولوں کی نسبت زیادہ فائدے میں رہا۔ آج ڈاکن کا کہنا ہے کہ یہ *replicator* اصل میں جین (gene) ہیں جو ہر زندہ جسم میں موجود ہوتے ہیں۔ ڈاکن لکھتے ہیں کہ وہ جینی مجموعے (genetic combinations)، جو نامیاتی اجسام کی بقا اور تولید میں اہم کردار ادا کرنے والے ہوتے ہیں، خود ان کے اگلے جسم یا صورت میں منتقل ہونے کا بھی زیادہ امکان ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو جین بار بار اگلے جسم میں منتقل ہونے میں کامیاب رہتے ہیں وہ اس جسم کے لیے بھی مفید ثابت ہوتے ہیں۔ یوں پروفیسر ڈاکن نے

Marfat.com

جن جینوں کو خود غرض جین قرار دیا ہے وہ ہرگز اتنے خود غرض نہیں ہوتے بلکہ مہربان، مفید اور بقا کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں اور ان کا تحفظ اور بقا ہمارے وجود کی دلیل ہے۔ یہ خود غرض جین تقسیم در تقسیم کا ایک لمبا سفر طے کر کے آئے ہیں اور ہم انسان ان کی بقا میں مدد دینے والی مشینیں ہیں۔ یہ جین وہ بنیادی اینٹ ہیں جو انسان کی پرورش، بقا اور نشو ونما کے لیے لازم ہیں۔ یہ سوچ کسی دہریے سائنس دان ہی کی ہو سکتی ہے کہ یہ بنیادی جین خود غرض ہیں یا ان میں کسی قسم کا تصادم ہے۔ دراصل یہ بنیادی اینٹ مہربان ہے اور ہماری بقا چاہتی ہے۔ یہ نامیاتی جسم تبھی ان نسل در نسل منتقل ہونے والی جینوں (replicating genes) کی مہربانی سے واقف ہو سکتا ہے اور یہ سمجھنے کے قابل ہو سکتا ہے کہ ان میں موجود تنازع البقا کوئی حقیقی تصادم نہیں ہے، جب وہ اتنا ذہین ہو جائے کہ خود اپنے فائدے اور نقصان کو پوری طرح سمجھ سکے۔ اگر انتقال کے اس حیاتیاتی عمل میں واقعی تصادم ہو جائے تو متعلقہ اجسام کی صحت مندانہ اور معمول کے مطابق نشو ونما کا عمل متاثر ہوگا اور وہ بیماری کا شکار ہو جائے گا۔ مسلسل ارتقا کے اعلا تر ابعاد میں جہاں ایسے انتخابی اختیارات شعوری ہوتے ہیں اور انسان کو خود اپنی مرضی سے انھیں منتخب کرنا پڑتا ہے، ہمیں اس بات کا ادراک کرنا چاہیے کہ تولید، تکرار، اعادہ اور تقلید (reproduction, replication, recapitulation, emulation) جیسے عمل انسانی ارتقا کے مختلف درجوں یعنی جسمانی یا طبعی سے لے کر، غیر طبعی، ذہنی اور روحانی مدارج تک یکساں طور پر بروئے کار آتے ہیں۔

اسی کے متوازی ایک اور تحریک بھی ہے۔ برطانوی ماہر نفسیات اور Divided Self کے مصنف ڈاکٹر لی آنگ (Liang) نفسیاتی علاج معالجے کی اس مشق پر انگلی اٹھاتے ہیں جس میں ذہنی و نفسیاتی بیماریوں کو محض ایک حیاتیاتی عمل سمجھا جاتا ہے اور معاشرتی، فکری اور تہذیبی ابعاد کو سرے سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

اعلا تر ابعاد:

Higher Dimensions

ملال، جلال، جمال اور کمال، چار غیر مرئی ابعاد ہیں۔ اس لیے اللہ ہر معلول کی علت اور مسبب الاسباب ہے، نہ کہ اس کے برعکس۔ اللہ ابعاد کا ماخذ ہے۔ ان چاروں ابعاد کی آفاقیت اللہ کی ابعادی صفات کا سبب نہیں ہے بلکہ ایسا سمجھنا اصولِ وحدت کو الٹ دینے اور حقیقت کی قدر و قیمت گھٹا دینے کے مترادف ہوگا۔

Marfat.com

قانونِ وحدت یہ بتاتا ہے کہ قابلِ مشاہدہ حقیقت کے متفرق مدارج، ہر لحظہ بدلتی ہوئی پیچیدگی، تعجب انگیز تنوع، ناقابلِ یقین کثرت، الجھا دینے والی فراوانی اور ہمارے اردگرد ہر طرف بکھری ہوئی مٹ جانے والی حقیقتوں کی حیران کن تعداد کے باوجود ایک دائمیت، ایک ثبات، ایک یکسانی، ایک اٹل وحدت ہے جو ہر مرئی حقیقت کا بالاتر، ارفع واعلا اور نفیس ترین جوہر ہے۔

قانون وحدت یہ بھی بتاتا ہے کہ صفات کے دوطرفہ یا قطبی جوڑے میں سے ایک کو دوسرے پر اولیت اور فوقیت حاصل ہے لیکن دونوں کا تعامل بالکل مساوی ہوتا ہے۔ اس لیے گرمی کو سردی پر اور سورج کو چاند پر اولیت حاصل ہے کیوں کہ سورج توانائی کا ماخذ ہے۔ پہلا دوسرے کا سبب ہے۔ گرمی سردی کا سبب ہے اور سورج چاند کا سبب ہے۔ ان جوڑوں میں سے ہر ایک کا پہلا جزو دوسرے کا سبب ہے اور اسی لیے اسے اولیت حاصل ہے۔ یہ قطبی اصول سورج اور چاند کی طرح مساوی طور تعامل کرتے ہیں جس کے نتیجے میں رُت، آب وہوا اور چاروں موسم وجود میں آتے ہیں، لیکن اس باہمی تعامل کے باوجود یہ دونوں مساوی نہیں ہیں کیوں کہ ان میں سے ایک دوسرے کا سبب ہے؛ جیسے اس مثال میں سردی محض گرمی (سورج) کے نہ ہونے کا نام ہے۔ دائرے کا سبب اس کا مرکز ہے۔ اس لیے اللہ جو ارفع ترین مرکز ہے، ہر سبب کا سبب ہے، ہر علت کی علت (Cause of all causes) ہے۔ یہ وہ قانون ہے جو بتاتا ہے کہ صرف ''ایک'' ہی باقی سب کا سبب ہے(ONE causes the others)۔ یہ بہت اہم بات ہے اور انسانی علم پر اس کے گہرے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ ہم اس وقت ایک نئے عہد کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ ایک غیر مرئی عہد۔ کوپرنیکس کا یہ کہنا کہ سورج ایک اعلا تر طبعی مرکز ہے، سائنس کا کعبہ بدل دینے والی دریافت تھی۔ قانونِ وحدت بھی ایسی ہی ایک چھلانگ ہے جو مادی سے ماورائی مرکز کی سمت بڑھ جانے کا اشارہ دیتی ہے۔ یعنی اللہ کی سمت جو ماورا ہے۔

اصولِ تقدیم وتاخیر کا عمل اور ردِعمل برابر ہوتا ہے۔ گرمی اور سردی دونوں برابر عمل کر کے موسمِ گرما، سرما، بہار وخزاں کا سبب بنتے ہیں۔ اسی طرح دن اور رات کے مساوی تعامل سے صبح، شام، دوپہر اور آدھی رات اور ان کے تمام وسطی مراحل ظہور میں آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طرفین کا باہمی تعامل ہمیشہ مساوی ہوتا ہے۔ مقدم اور موٴخر کے متوازی معکوس اصول اپنے عمل اور ردعمل میں ہمیشہ برابر ہوتے ہیں۔ یہ نیوٹن کے سائنسی نظریات کی بنیاد ہے جس کے مطابق ہر عمل کا ایک مساوی مگر برعکس ردعمل ہوتا ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے، مگر

Marfat.com

ایک بات نیوٹن کی سمجھ میں نہیں آسکی اور وہ یہ ہے کہ طرفین کا تعامل تو ضرور مساوی ہوتا ہے مگر وہ دونوں خود ایک دوسرے کے مساوی نہیں ہوتے کیوں کہ ان میں سے ایک دوسرے کا سبب ہے۔ مقدم پہلو کے بغیر مؤخر پہلو وجود میں نہیں آسکتا۔ پہلا نہ ہو تو آخری بھی نہیں ہوگا۔ مرکز نہ ہو تو محیط بھی نہیں ہوسکتا۔ زمین سورج کے گرد نہ گھومے تو کوئی موسم ہو، نہ روز وشب۔ یوں یہ تضاد، یہ معمہ وجود میں آتا ہے کہ دونوں پہلو مساوی بھی ہیں اور غیر مساوی بھی۔ فزکس کی کوانٹم تھیوری کی طرح جو بتاتی ہے کہ روشنی کی شعاع بیک وقت مادی بھی ہے اور غیر مادی بھی۔ یا پھر آئن اسٹائن کے سائنسی نظریے کی طرح جو بتاتا ہے کہ ہر شے بیک وقت مادہ بھی ہے اور توانائی بھی۔ اسی طرح مذہب بھی کہتا ہے کہ انسان بیک وقت خاکی بھی ہے اور روحانی بھی۔

یہ ہے قانونِ وحدت کی سادہ اور مختصر سی تشریح جسے ہر ممکن حد تک آسان ترین زبان میں، بہت محتاط انداز سے، نہایت سادگی سے پیش کیا گیا ہے تاکہ ارفع ترین خدائی قوانین کے فانی اور زمانی دنیا کی معمولی حقیقت میں کھو جانے کا خطرہ نہ ہو۔ اس سادہ سے قانون کا اطلاق ثابت کرتا ہے کہ اللہ یا مذاہب کی بیان کردہ الہامی سچائیوں میں کوئی اسرار ہے نہ کوئی مخفی باطنی ابہام، کوئی خفیہ راز ہے نہ کوئی در پردہ ناٹک۔ نام نہاد ماہروں کے مخفی علوم، عاملوں کے پوشیدہ عمل، نجومیوں اور نفسیاتی شدتوں کے مارے لوگوں کے رسوم ورواج، صوفیوں اور مذہبی اشرافیہ کی تمکنت اور شان وشکوہ کے مظاہرے، سب فریب ہیں، جعل سازی اور جہالت کا مظہر ہیں۔

اللہ کا دین کسی کٹر عقیدے کا نام نہیں۔ یہ کسی مطلق العنان آمر کی دھونس نہیں جو اپنے احکامات کی اطاعت میں کسی چوں چراں کی گنجائش نہیں چھوڑتا، یہ تو ایک لطیف، ترغیب آمیز منطقی قوت (اللطیف) ہے جو ہماری روزمرہ حقیقت اور قانونِ فطرت میں مخفی ہے۔ یوں ایمان کے پس پشت عقل وخرد اور استدلال کی کارفرمائی ہے۔

بے جا نہ ہوگا اگر ہم یہاں انسان کے روزمرہ تجربات اور اس کے معمول کے رویوں کی کچھ مثالیں پیش کر دیں۔ میرا تین سالہ بیٹا اذن کارٹون دیکھنے کا اتنا شائق تھا کہ ہر وقت ٹیلی ویژن سے چمٹا رہتا تھا۔ کسی طرح کی سختی، ڈانٹ ڈپٹ اور ماما بابا کی فہمائش کہ آنکھیں خراب ہو جائیں گی، اسے ٹیلی ویژن سکرین سے نظریں ہٹانے اور باہر کھلی ہوا میں ناشتہ کرنے یا صحن میں فٹ بال کھیلنے پر آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔ الٹا اس نے ایسے رویے پر اپنی ناخوشی، بیزاری، ہٹ دھرمی، حتیٰ کہ لڑائی جھگڑے کا سا بلکہ کھلم کھلا حریفانہ انداز اختیار کر لیا۔ یہاں تک کہ آخر ایک دن ہم نے ہار مان لی اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب ہم اسے ناشتہ کرنے کے لیے ٹی وی لاؤنج میں

Marfat.com

اکیلا چھوڑ دیتے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ خود بخود ہمارے ساتھ آملا۔

میرا ایک راسخ العقیدہ دوست مشترکہ خاندانی نظام کی اقدار و روایات کو مثالی سمجھتا تھا چناں چہ اس نے زبردستی اپنی شادی شدہ بہنوں اور بھائیوں کو ایک بڑی سی حویلی میں اکٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔ نتیجہ خوف ناک نکلا۔ میرا پیارا دوست آخر کار عارضۂ قلب میں مبتلا ہو گیا۔ اپنے اہلِ خاندان کو، اپنے سارے پیاروں کو یکجا رکھنے جیسے نیک اور اچھے مقاصد بھی جب زبردستی، طاقت کے بل پر لاگو کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اپنی نیک نیتی کے باوجود ظالمانہ اور جابرانہ محسوس ہونے لگتے ہیں۔ اسی طرح ملاؤں کے شدت پسندانہ وعظ و نصیحت اور مذہبی احکامات کو زبردستی لاگو کرنے کی خواہش نے معاشرے کے جدید، آزاد خیال طبقے کے دل میں مذہب کے متعلق الٹا ردِعمل پیدا کر دیا ہے۔ جب کہ دوسری طرف، مغربی میڈیا سیکولر اقدار اور مغربی تہذیب و تمدن کے حق میں مسلسل یلغار کر رہا ہے جس کے ردِعمل کے طور پر کئی اسلامی ممالک میں مذہبی انتہا پسندی جڑ پکڑ رہی ہے۔ دنیا یوں ہی وحدت کے دو پہلوؤں، عمل اور ردِعمل کے درمیان تعامل کرتی رہتی ہے۔

اللہ مذہبی حکم ہے۔ Allah is a Religious Dogma

اللہ سائنسی قانون ہے۔ Allah is a Scientific Law

یہ حقیقت کے تسلسل (Continuum of Reality) پر اوپر۔ نیچے (UP/DOWN) کے مقامات ہیں اور بس۔ قانون اور حکم ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ انسانی قانون میں اختیار اور قوت معاشرتی نظام کے پاس ہے جب کہ قانونِ الٰہی (Divine Command) میں طاقت کی مالک وہ عادل و منصف ہستی ہے جو عظیم ترین ہے۔ اب یہ خود آپ کے نقطۂ نظر اور آپ کی دلچسپی کی نوعیت پر منحصر ہے کہ آپ اس حقیقت کو کیسے دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ جیسا آپ اسے دیکھیں گے وہ آپ کے لیے ویسا ہی ہوگا۔ یہ انسان اور خدا کے درمیان عمل اور ردِعمل کا قانون ہے۔

یہاں میں دنیائے کرکٹ کی معروف شخصیت عمران خان کے ایک مضمون سے اقتباس پیش کرتا ہوں:

> ''میری نسل اس زمانے میں پروان چڑھی جب نوآبادیاتی تسلط کا خوف عروج پر تھا، ہم سے پہلی نسل غلام رہ چکی تھی اور برطانویوں کے مقابلے میں شدید احساسِ کمتری کا شکار تھی۔ میں جس سکول میں پڑھتا تھا وہ بالکل پاکستان میں طبقۂ امرا کے بچوں کے دیگر

Marfat.com

اسکولوں کی طرح تھا۔ آزادی حاصل کرنے کے باوجود وہ طالب علموں کو پاکستانی بنانے کی بجائے ''پبلک اسکول کے لڑکوں کی نقل'' بنانے میں مصروف تھے اور آج تک یہی کر رہے ہیں۔ میں نے شیکسپئر پڑھا، بہت خوب ہوا۔ مگر علامہ اقبال کو نہیں پڑھا جو پاکستان کے قومی شاعر ہیں۔ مطالعۂ اسلام کی کلاس کو کوئی سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ پھر جب میں اسکول سے فارغ التحصیل ہوا تو ملک کے اشرافیہ میں شمار ہونے لگا کیوں کہ میں اچھی انگریزی بول سکتا تھا اور مغربی لباس پہنتا تھا۔ کبھی کبھی اسکول کی تقریبات میں 'پاکستان زندہ باد' کے نعرے لگانے کے باوجود میں اپنی تہذیب وثقافت کو پس ماندہ اور اپنے مذہب کو رجعت پسندانہ خیال کرتا تھا۔ ہمارے گروپ میں اگر کوئی مذہب کی بات کرتا، نماز پڑھتا یا ڈاڑھی رکھ لیتا تو ملاّ کہہ کر اس کا تمسخر اڑایا جاتا تھا۔ میڈیا کی طاقت کا اثر تھا کہ ہمارے ہیرو مغربی فلمی اداکار تھے یا پاپ سٹار۔ جب میں آکسفورڈ گیا تو یہی ورثہ میرے ساتھ تھا اور وہاں بھی زندگی بہتر نہ ہوسکی۔ آکسفورڈ میں اسلام ہی نہیں، تمام مذاہب کو تاریخ کی غلطی سمجھا جاتا تھا۔ سائنس مذہب کی جگہ لے چکی تھی اور دستور یہ تھا کہ اگر کسی چیز کو عقل واستدلال کے ذریعے ثابت نہ کیا جاسکے تو وہ گویا وجود ہی نہیں رکھتی۔ مافوق الفطرت واقعات صرف فلموں کا حصہ ہوسکتے تھے۔ مطالعہ اور احترام صرف ڈارون جیسے فلسفیوں ہی کا کیا جاسکتا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے اپنا نیم پختہ نظریہ ارتقا پیش کر کے نہ صرف نظریہ تخلیق بلکہ مذہب کو بھی رد کر دیا تھا۔ یورپی تاریخ میں بھی مذہب کا تجربہ نہایت ہولناک ثابت ہوا تھا۔ عیسائی دنیا میں پاپائیت کی احتساب عدالتوں کے جبر واستبداد نے مغربی ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ مغرب سیکولرازم یا لادینیت پر اتنا اصرار کیوں کرتا ہے، اسپین کے شہر قرطبہ میں ان عقوبت خانوں کو دیکھنا چاہیے جہاں احتساب کے دوران لوگوں کو اذیتیں دی جاتی تھیں۔ مذہبی علما کا سائنس دانوں پر کفر کے فتوے لگا کر انھیں سزائیں دینا بھی مغربی قوموں کو مذہب سے برگشتہ کرنے کا باعث بنا۔ لیکن سب سے بڑا عنصر، جو مجھ جیسے لوگوں کو اسلام سے دور کرنے کا باعث بنا، وہ اسلام کے مبلغین کا اسلام کے منتخب اور اپنی پسند کے جزو پر عمل درآمد کرنے کا رویہ تھا۔ ان کے قول وفعل میں بہت تضاد ہوتا تھا۔ اسلامی احکامات کی حکمت بیان

Marfat.com

کرنے کی بجائے وہ صرف رسومات کی ادائیگی پر زور دیتے تھے۔

میں سمجھتا ہوں انسان جانوروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ جانوروں کو مشق سے سدھایا جا سکتا ہے لیکن انسانوں کو عقل و منطق کی مدد سے قائل کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے قرآن مسلسل عقل سے کام لینے کی ہدایت کرتا ہے۔ لیکن اسلام کا قبیح ترین استحصال ان سیاسی افراد یا جماعتوں نے کیا جو اسے اپنی ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرتے رہے۔ لہٰذا یہ کوئی معجزہ ہی تھا کہ میں ملحد نہیں ہو گیا۔ یہ صرف میری ماں کی تربیت کا اثر تھا جس نے بچپن ہی سے مجھ میں مذہب سے لگاؤ پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ میرا مسلمان رہنا اپنے ایمان کی سچائی کی وجہ سے کم اور اپنی ماں کی محبت کی وجہ سے زیادہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں 'پکا کالا صاحب' بننے والا تھا۔ کیسے نہ بنتا، آخر اسکول، یونی ورسٹی اور سب سے بڑھ کر انگریز اشرافیہ میں قبولیت کا جو درجہ مجھے حاصل تھا اسے حاصل کرنے کے لیے کالے انگریز اپنی جان لٹانے کو تیار ہوتے۔ تو پھر کیا تھا جس نے مجھے کالے انگریزوں کی تہذیب میں ''لوٹا'' اور ''دیسی'' بن جانے پر مائل کر لیا؟

لیکن یہ کوئی راتوں رات ہونے والی کایا پلٹ نہیں تھی۔ پہلی بات تو یہ ہوئی میری نسل نے جو احساسِ کمتری ورثے میں پایا تھا، وہ میرے عالمی سطح کا کھلاڑی بن جانے کے بعد آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ مجھے دونوں تہذیبوں سے وابستہ رہنے کا موقع ملا اور میں نے دونوں معاشروں کے زشت و خوب کا گہرا مشاہدہ کر لیا۔

مغربی معاشروں میں ادارے مضبوط تھے لیکن ہمارے ملک میں وہ زوال پذیر تھے۔ البتہ ایک میدان ایسا ضرور تھا، اور آج بھی ہے، جہاں ہمیں فوقیت حاصل ہے اور وہ ہے ہمارا خاندانی نظام۔ میں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ یہ مغربی معاشروں کا سب سے بڑا زیاں ہے۔ کلیسائی پاپائیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے خدا اور مذہب دونوں کو اپنی زندگیوں سے نکال دیا تھا۔ سائنس اگرچہ بہت سے سوالوں کے جواب دے سکتی ہے لیکن، خواہ کتنی ہی ترقی یافتہ ہو جائے، دو سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں۔ پہلا یہ کہ ہماری زندگی، ہمارے وجود کا مقصد کیا ہے اور دوسرا یہ کہ مرنے کے بعد ہمارے ساتھ کیا ہوگا۔

Marfat.com

میرا خیال ہے یہی وہ خلا تھا جس نے مادیت اور لذتیت (hedonistic) پر مبنی تہذیب کو جنم دیا۔ اگر زندگی بس اتنی ہے تو پھر ہمیں جی بھر کے موج میلہ کر لینا چاہیے اور موج میلہ کرنے کے لیے پیسے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسی تہذیب لازماً انسانوں کو نفسیاتی عوارض کا شکار بنا دیتی ہے کیوں کہ جسم اور روح کے درمیان توازن کی کیفیت باقی نہیں رہتی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ امریکہ میں جہاں مادی ترقی کی رفتار سب سے زیادہ ہے، اور جہاں شہریوں کو بے شمار حقوق حاصل ہیں، تقریباً ساٹھ فی صد آبادی ماہرینِ نفسیات کے زیرِ علاج رہتی ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ جدید علمِ نفسیات میں انسانی روح کے مطالعے کی کوئی روایت موجود نہیں۔ سویڈن اور سوئٹزرلینڈ میں، جو اپنے شہریوں کو سب سے زیادہ مراعات فراہم کرتے ہیں، خودکشی کی شرح بھی سب سے زیادہ ہے۔ گویا انسان صرف مادی وسائل پر قناعت نہیں کر سکتا، اسے اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی چاہیے۔

مذہب چوں کہ اخلاقیات کی بنیاد ہوتا ہے اس لیے جب مذہب کو خارج کر دیا گیا تو بداخلاقی بھی عروج کو پہنچ گئی، خاص طور پر ستر کی دہائی کے بعد۔ اس کا براہ راست اثر خاندانی زندگی پر مرتب ہوا۔ برطانیہ میں طلاق کی شرح ساٹھ فی صد ہے اور ایک اندازے کے مطابق کنواری ماؤں کی تعداد پینتیس فی صد سے زیادہ ہے۔ جرم کی شرح تقریباً تمام مغربی معاشروں میں روز افزوں ہے لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ امر بڑھتی ہوئی نسل پرستی ہے۔ سائنس بھی ہمیشہ انسانوں میں عدم مساوات کے ثبوت فراہم کرنے میں مصروف رہتی ہے، مثلاً ایک حالیہ سروے میں ثابت کیا گیا ہے کہ امریکی کالے امریکی گوروں کے مقابلے میں کم ذہین ہوتے ہیں۔ یہ صرف مذہب ہی ہے جو انسانوں کی مساوات کا علم بردار ہے۔

اسی (۸۰) کی دہائی میں کچھ ایسے واقعات تسلسل سے رونما ہوئے جنھوں نے مجھے خدا کی طرف راغب کر دیا؛ جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ 'سمجھنے والے لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں'۔ ان میں سے ایک کرکٹ تھی۔ میں اس کھیل کا ایک طالب علم تھا چناں چہ جتنا میں اس کھیل کو سمجھتا گیا اتنی ہی شدت سے مجھے احساس ہونے لگا کہ جسے میں اتفاق سمجھتا رہا ہوں وہ

Marfat.com

اصل میں خدا کی منشا ہوتی ہے۔ یہ ایسا نقش تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ واضح ہوتا گیا۔ لیکن اسلام کے بارے میں میری سمجھ بوجھ نے اس وقت تک ترقی کرنا شروع نہیں کیا جب تک میں نے سلمان رشدی کی کتاب *The Satanic Verses* نہیں پڑھ لی۔

مسلم دنیا میں اس کتاب کے خلاف جو شدید ردعمل ہوا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ جیسے لوگوں کو جو مغرب میں رہتے تھے، اس اسلام دشمنی اور تعصب کا سارا بوجھ اٹھانا پڑا۔ ہمارے پاس دو ہی راستے باقی بچے تھے، لڑیں یا بھاگ جائیں۔ چوں کہ میں شدت سے محسوس کرتا تھا کہ اسلام پر یہ حملے ناروا اور ناجائز تھے اس لیے میں نے لڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اسلام کے بارے میں میرا علم ناکافی تھا۔ یوں میں نے تحقیق شروع کردی اور یہ میرے لیے روشنی طبع کی تلاش کا فکر افروز کا دور تھا، میں نے علی شریعتی، محمد اسد، اقبال اور گئی ایٹن (Gai Eaton) جیسے مفکروں کا مطالعہ کیا لیکن ظاہر ہے کہ سب سے بڑھ کر قرآن کا۔

پاکستان ان دنوں جن مسائل سے دوچار ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ دو گروہ ایک دوسرے سے حریفانہ کشاکش میں مصروف ہیں۔ ایک گروہ مغرب زدہ لوگوں کا ہے جو اسلام کو مغرب کی نظر سے دیکھتا ہے اور اسلام کے متعلق ان کا اپنا علم ناکافی ہے۔ یہ ہر اس شخص کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کرتا ہے جو معاشرے میں اسلام کے نفاذ کی بات کرتا ہے۔ یہ طبقہ صرف جزوی اسلام کو قبول کرتا ہے۔ دوسری انتہا پر وہ گروہ ہے جو جس نے اس مغرب زدہ اشرافیہ کے ردعمل میں دین کی حفاظت کا ذمہ اٹھا رکھا ہے اور اس مقصد کے لیے عدم برداشت اور بر خود غلط رویہ اپنائے ہوئے ہے جو اسلام کی حقیقی روح کے برخلاف ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان مکالمے کی فضا ہموار کی جائے۔ مفاہمت کی یہ فضا پیدا کرنے کی ذمہ داری اس گروہ پر عائد ہوتی ہے جن کی تعلیم پر اس ملک کے وسائل کا کثیر ترین حصہ خرچ ہو رہا ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اسلام کا گہرا مطالعہ کریں۔ ”خواہ وہ باعمل مسلمان بنیں یا اللہ پر ایمان لے آئیں، انھیں اس کا پورا اختیار حاصل ہے۔ قرآن واضح طور پر ہدایت کرتا ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔ لیکن انتہا پسندی سے مقابلہ کرنے کے لیے ان کا

Marfat.com

خود کو علم کے ہتھیار سے مسلح کرنا بہت ضروری ہے۔ انتہا پسندی سے منھ موڑ لینے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ قرآن مسلمانوں کو امتِ وسط کہہ کر پکارتا ہے، انتہا پسند نہیں قرار دیتا۔ پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ کو صرف پیغام پہنچادینے کا فرض سونپا گیا تھا اور اس بات کے بارے میں متفکر ہونے سے منع کیا گیا تھا کہ لوگ مسلمان ہونا قبول کرتے ہیں یا نہیں۔ لہٰذا اسلام میں اپنی رائے دوسروں پر تھوپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تمام پیغمبروں، دوسرے مذاہب اور ان کی عبادت گاہوں کا احترام کریں۔"

قطرے میں دجلہ:
The Ocean in the Drop

آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے روزمرہ کے معمولی اور عام تجربات، کہانیوں، حکایتوں اور مثالوں کے ذریعے اللہ کا سائنسی اصول بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس قدر ارفع کلیہ اور اتنی معمولی مثالیں! یہ کیسے ممکن ہے، کوئی بھی اس بات پر تعجب کرسکتا ہے۔ لیکن یہ تعجب اس وقت ختم ہو جائیگا جب وہ ہر قطرے میں وہی خصوصیات، وہی اوصاف دیکھ لے گا جو سمندر میں ہوتی ہیں۔

میں عمران خان کی قائدانہ صلاحیتوں کا بہت مداح ہوں۔ اپنے ایک انٹرویو میں انھوں نے قیادت اور رہنمائی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اچھا رہنما وہ ہوتا ہے جو دوسروں سے اپنی پیروی کا مطالبہ کرنے کی بجائے ان میں نئی روح پھونک دے۔ رہنما اپنی ٹیم کی رہنمائی استدلالی اور عقلی انداز میں اور اپنے عمل (فعل) کے ذریعے کرتا ہے۔ اس میں مستقل مزاجی، ثابت قدمی اور لوگوں کا دل جیت لینے اور اعتماد حاصل کر لینے کا ملکہ ہونا چاہیے، اسے بالکل کھرا ہونا چاہیے تاکہ دوسرے اس کی بات پر اعتماد کرسکیں اور اس کی دل سے عزت کریں۔ اسے اپنی پیروی کرنے والوں کی عزت نفس بڑھانے کا خیال ہونا چاہیئے۔ اس کے خیال میں یہ پہلو بہت اہم ہے۔ جونہی آپ اپنی ٹیم کے اراکین کی عزت نفس میں اضافہ کردیتے ہیں تو ان کی کارکردگی بہت بہتر ہو جاتی ہے۔

اللہ پوری انسانیت کا عظیم ترین قائد اور رہنما ہے۔ اب اگر ہم قیادت اور رہنمائی کی ان خصوصیات کو اللہ اور اس کے سائنسی قانون سے جوڑ دیں تو ہم دیکھیں گے کہ اللہ کے افعال اور اس کی مخلوقات (صفات) ایک ہی

Marfat.com

نظام میں جڑی ہوئی ہیں۔ اللہ کی ثبات واستقلال جیسی صفات کا حصول انسان کی تمام تر سائنسی جدوجہد کی بنیاد ہے۔ اس کی عدل وانصاف کی خصوصیات انسان میں ایمان اور یقین پیدا کرتی ہیں۔ اس کی مساوی تعامل اور برابری کی صفات انسان کو تخلیق میں اس کا شریکِ کار، اس کا نائب ہونے کا رتبہ عطا کرتی ہیں اور ان تمام لوگوں کی عزت نفس میں اضافے کا موجب بنتی ہیں جو خدا کی پیروی کرتے ہیں۔ عمران خان کا قائدانہ تجربہ، خدائی کے تجربے کا ہی ایک درجہ ہے؛ قطرے میں دجلہ ہے۔

کیمبرج یونی ورسٹی کے علم فلکیات اور تجرباتی فلسفے کے شعبے سے تعلق رکھنے والے پروفیسر فریڈ ہوئل (Fred Hoyle) اپنی کتاب Of Men and Galaxies میں اگرچہ آسمان کے ستاروں کے بارے میں بات کرتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ ان آسمانی معاملات کے مترادفات انسانی معاملات، سماجیات، نفسیات اور فلسفے میں بھی دیکھتے اور دکھاتے رہتے ہیں۔ عمران خان بھی اسی طرح قومی رہنما کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کرکٹ کے کھیل سے مثالیں ڈھونڈتا رہتا ہے۔ جدید سائنس دان، ایٹمی فزکس کے ماہر اور جینیاتی حیاتیات کے عالم بھی سائنس کے ذریعے مذہبی تصورات کو بیان کرتے ہیں۔ ایسا ہونا تبھی ممکن ہے جب حقیقت اصل میں ایک ہو، اس پر ایک جیسے قوانین کا اطلاق ہوتا ہو اور وہ یکساں تجربات وبصیرت کی حامل ہو۔ عجیب بات ہے کہ آپ جس شعبے میں بھی کمال حاصل کریں، ایک ہی آفاقی سچائی تک پہنچتے ہیں، بس زبان، اصطلاحات اور طرزِ اظہار مختلف ہوتا ہے۔

حقیقت کے ہر قطرے میں دجلہ ہوتا ہے، ہر تغیر پذیر مظہر کے پیچھے ایک مستقل اور ناقابلِ تغیر حقیقت پنہاں ہوتی ہے۔ ہر چیز ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے؛ سائنس کی آفاقیت، خدا کی حاضر وناظر ہستی اور اللہ کے مظاہر جو انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، حقیقت کی دنیا میں، ظاہر وباطن کی مختلف صورتوں میں نمودار ہوتے ہیں اور جو فاعل بھی ہیں اور مفعول بھی۔ اللہ کی سچائی سے مفر ممکن نہیں۔ اسے قائم رہنا ہے کیوں کہ یہ خود انسان ہی کی عزت نفس، اس کی خودشناسی اور کمالِ ذات کا عکس ہے۔ کوئی خود اپنے آپ سے نہیں بھاگ سکتا۔ علم ہو یا سائنس، نسان کے سب راستے اس کی خودشناسی کی منزل کی طرف جاتے ہیں۔

تخلیق کے مختلف درجوں اور سطحوں پر ایک ہی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ یعنی ہر تبدیلی کے اندر ایک مستقل آفاقی پہلو نہاں ہے جو تمام تر سائنس اور انسانی علوم کی بنیاد ہے۔ فلسفہ آفاقی سچائی کی تلاش میں ہے، تمام سائنسی

Marfat.com

تعمیمی کلیوں (scientific generalizations) کا مقصد یہی ہے کہ مخصوص پہلوؤں (particulars) میں آفاقیت تلاش کی جائے۔تمام فلسفیانہ سچائیاں عارضی کی بجائے مستقل کی متلاشی ہیں اور تمام مذاہب فنا اور زوال کی بجائے ثبات اور ابدیت کے حصول پر زور دیتے ہیں۔سائنس، فلسفے اور مذہب کی آخری منزل ایک ہی ہے؛ آفاقیت کی تلاش، ثبات و دوام کی جستجو، ہیشگی کی آرزو۔لیکن عجیب بات ہے کہ دوام کے مذہبی دعووں کو کٹر ادعائیت (dogma) قرار دے دیا جاتا ہے اور سائنس اور فلسفہ تغیر پذیر ہونے کے باوجود عقلی اور عملی دکھائی دیتے ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ بدھا، ہیگل، ڈارون اور آئن اسٹائن نے، حقیقت کی مختلف سطحوں پر سہی، مگر ایک ہی مقصد کے حصول کی تگ و دو کی ہے جو سائنس سے لے کر مذہب تک، وجودِ انسانی کے ایک ہی تسلسل (Continuum) کے مختلف مقامات کو ظاہر کرتی ہے۔

سائنس اور مذہب ایک ہی حقیقت، یعنی وحدت کی دو انتہائیں ہیں۔یہ اس تسلسل کے اوپر۔ نیچے (up-down) کے مقامات ہیں۔نظریاتی سائنس، حیاتیاتی سائنس، انسانیات اور نفسی و روحانی علوم اسی تسلسل کے مختلف مدارج ہیں جن کے ساتھ اور بھی کئی درجے، بے شمار سطحیں اور مراحل ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ لوک ورثے سے لے کر دیو مالا، فلسفے، طبعی سائنس، حیاتیات، علم الاعضا اور پھر ذہنی اور نفسی سائنسوں تک تمام تر علم ایک ہی تسلسل کے مختلف مدارج پر مشتمل ہے۔

اللہ کا سائنسی قانون یہ بتاتا ہے کہ تمام تر انسانی تجربات درجہ وار ہوتے ہیں۔اس طریقے سے ایک ہی حقیقت کو اس کے ظہور کے مختلف درجوں پر سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے مختلف الفاظ، مختلف اصطلاحات اور مختلف طرزِ اظہار کی ضرورت پڑتی ہے۔مختلف علوم میں جو فرق نظر آتا ہے، وہ اصل میں اسی وجہ سے ہے۔ہر سائنس کا ایک الگ مقام اور اس کے اطلاق کا الگ میدان ہے۔علم کا ہر شعبہ، سائنس کی ہر شاخ کے ضابطے کا تقاضا ہے کہ اس کی مخصوص اصطلاحات استعمال کی جائیں۔مثال کے طور پر ان اصطلاحات کو دیکھیے:

حرکت (Motion) :	مادی سطح
اضطراری عمل (Reflex Action):	عضویاتی سطح
رفتار (Movement) :	حیاتیاتی سطح
عمل (Action) :	انسانی سطح
تجربہ (Experience) :	شعوری سطح

Marfat.com

کردار (Conduct) : مذہبی سطح

یہ مختلف اصطلاحات اصل میں جسمانی سطح سے لے کر اخلاقی سطح تک، ایک ہی حقیقت کے مختلف مدارج پر ظاہر ہونے والے عمل (phenomenon) ہیں۔ یہ الفاظ ایک ہی شے کے اظہار کے مختلف پہلو ہیں لیکن ہر پہلو کے اظہار کے لیے مختلف اصطلاحات کا استعمال ضروری ہے تا کہ حقیقت کے درجے کا درست اندازہ کیا جا سکے۔ حرکت اور کردار اصل میں ایک ہی تسلسل کے دو انتہائی مقامات ہیں اور باقی سب ان کے وسطی یا درمیانی مدارج ہیں جو حقیقت کی مختلف سطحوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس تسلسل کی سب سے نچلی انتہا پر مادی سطح ہے جس کا تعین کیا جا سکتا ہے اور اسی لیے اس سطح کی حقیقت قابلِ پیش گوئی (predictable) ہوتی ہے۔ تسلسل کے اوپر کے مقامات، جو شعوری ہیں، نسبتاً آزاد ہیں اور اسی لیے صرف اضافی طور پر قابلِ پیش گوئی (relatively predictable) ہیں۔ نچلی سطح عضویاتی اور مشینی نوعیت کی ہے جب کہ اوپر کی سطح پر خود مختاری اور خود آگہی ملتی ہے۔ ہماری سائنس بھی اسی طرح متعین اور مکمل طور پر قابلِ پیش گوئی (predictable) سطح سے اضافی طور پر قابلِ پیش گوئی (relatively predictable) اور بالکل غیر یقینی سطح تک سفر کرتی ہے۔ مشینی سطح سے خود مختاری کی سطح تک کا سفر ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل ہونے کا عمل ہے۔ یہ ایک ہی درجہ وار حقیقت کی کایا پلٹ کا نام ہے۔ اس تسلسل کے نچلے اور اوپر والے سرے میں نوعیت کا فرق نہیں ہے، صرف درجے کا فرق ہے۔ نچلی سطح کم ترقی یافتہ ہے اس لیے قابلِ تعین (determined) ہے۔ یہ فرق صرف ایک صفت کے کم یا زیادہ ہونے کا ہے۔ اس مثال میں یہ صفت شعور اور خود مختاری کی ہے۔

اللہ کے سائنسی قانون میں، طبعی، عضویاتی، معاشرتی اور اخلاقی یعنی چاروں ابعاد میں انسانی علم کے لیے ناقابلِ تصور اشارے اور دلالتیں موجود ہیں۔ یہ سائنسی علوم ایک دوسرے سے مختلف قسم یا نوعیت کے نہیں ہیں، فرق صرف ان کے اطلاق کے درجوں کا ہے۔ علم کی سبھی شاخیں وحدت کو دیکھنے کے مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں جو ایک ہی تسلسل کے مختلف حصوں یعنی وحدت کے چاروں ابعاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی اصطلاحات ہیں، تکنیکی اور مخصوص زبان ہے، لیکن سب ایک ہی عمل کے مختلف حصوں یا سطحوں کو بیان کرتے ہیں۔ ان سب میں ایک نمایاں بنیادی یکسانیت ہے، ایک مخفی، باطنی مماثلت ہے کیوں کہ یہ سب کے سب ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں۔

Marfat.com

ان درجہ وار اصطلاحات کو ایک مرتبہ پھر دیکھیے۔ حرکت، اضطراری عمل، رفتار، عمل، تجربہ اور کردار۔ شاید آپ نے غور کیا ہو کہ یہ سب الفاظ تغیر پذیر صورتوں (mutants) کو ظاہر کرتے ہیں جو ارتقا (یعنی اللہ کی تخلیق کے مرحلوں اور درجوں) کے دوران اچانک ظہور میں آجاتی ہیں اور ہر بار ایک نیا زینہ (اللہ کی سلطنت کی ایک سرحد) عبور کرلیتی ہیں۔ تخلیق کا عمل طبعی کائنات سے لے کر انسان تک اور پھر شعور سے لے کر خدا تک ایک ہی وحدت میں گتھا ہوا ہے۔ ارتقا ہر شے کے اپنے ماخذ تک پہنچنے، اپنی اصل کو پلٹنے کا عمل ہے، خاک ہے تو خاک تک اور روح ہے تو روح تک۔ سورج زمین کی حرکت کو قابو میں رکھتا ہے، یہاں طبعی دنیا کی گردشی حرکت کا تعین سورج کی کھنچاؤ اور دباؤ (push and pull) کی قوت سے ہوتا ہے۔ یہاں سورج وہ طبعی مرکز ہے جو اللہ کی تخلیق کے ایک درجے، ایک مرحلے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی طرح انسانی جسم کا عضویاتی مرکز دل ہے، اس کا سکڑاؤ اور پھیلاؤ اور رگوں میں خون کی گردشی حرکت تخلیق کے ایک اور مرحلے کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی کا تمام تر ارتقا المبدی (ابتدا کرنے والا) کے دباؤ اور المعید (واپس کھینچنے والا) کے کھنچاؤ کی قوت کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی دباؤ (push) اور کھنچاؤ (pull) کی قوتیں ہیں جو ایک چکر کی صورت میں باری باری روبہ عمل آتی ہیں۔

عالمِ کون و مکاں سے لے کر زندگی تک، انسان کے ظہور سے لے کر ذہن کی کارفرمائی تک اور انا (شعور) سے لے کر خدا کی حقیقت مطلقہ تک، ارتقا (evolution) حرکت کے ایک تسلسل کا نام ہے؛ جی ہاں ایک ہی تسلسل کا نام ہے۔ یہ حرکت پہلے دور جاتی ہوئی اور پھیلتی ہوئی ہوتی ہے جو المبدی کے دباؤ کی قوت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پھر یہ اپنے ماخذ، اپنے مرکز کی طرف لوٹنے والی حرکت میں بدل جاتی ہے۔

انسان اور خدا ایک ہی تسلسل کے دو سرے ہیں جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور باہمی تعامل کرتے ہیں۔ نچلا سرا دائرے کا محیط ہے جو مرئی ہے، اوپر والا سرا دائرے کا مرکز ہے جو غیر مرئی ہے۔ محیط میں تغیر اور ارتقا ہے (الحی)، مرکز میں ثبات اور استقلال ہے (القیوم)۔ نچلا سرا نسبتاً آزاد ہے، اوپر والا سرا مطلق آزاد ہے۔ نچلا سرا قدرے خود مختار ہے، اوپر والا سرا مکمل طور پر خود مختار ہے۔ نچلا سرا اضافی سچائی ہے، اوپر والا سرا مطلق سچائی ہے۔ نچلے کنارے پر رحمان ہے، اوپر والے کنارے پر الرحمان ہے۔ انسان کا معجزوں سے لے کر ٹیکنالوجی کی ان جدید ترین ایجادات اور دریافتوں تک کا ارتقا المبدی (ابتدا کرنے والا، دھکیلنے والا) کی

Marfat.com

قوت کے اطلاق کا نتیجہ ہے۔ یہ وہ حرکت ہے جو عرش سے دور، زمین کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں انسان کا مستقبل سائنس سے مذہب اور تکنیکی دریافتوں سے نفسی اور روحانی علوم مثلاً ٹیلی پیتھی، کشف و الہام، عالمِ امثال کے سفر، روحانی قوتوں اور معجزوں کی جانب ہونے والی حرکت پر منحصر ہوگا۔ یہ المعید کی متوازی قوت کے اطلاق کا نتیجہ ہوگا جو واپس کھینچنے والی قوت ہے۔ یہ واپسی کا سفر ہوگا۔ اپنے ماخذ، اپنے سرچشمے کی طرف واپس لوٹنے کا عمل، فرش سے عرش تک کا اور مرئی سے غیر مرئی تک کا سفر۔ ہم کہہ سکتے ہیں معجزات مذہب کی ٹیکنالوجی ہیں اور دریافت و ایجادات سائنس کا معجزہ ہیں۔ معجزہ اور ٹیکنالوجی دو اصطلاحات ہیں جو انسانی ارتقا کے مختلف درجوں پر رونما ہونے والے ایک ہی عمل کو ظاہر کرتی ہیں۔ ماضی میں انسان کا مذہب سے سائنس کی دنیا میں نزول دراصل حقیقت کے ارضی پہلو (ظاہر) کی نمود تھی، انسان کا مستقبل سائنس سے مذہب کی طرف صعود سے وابستہ ہے جو اسی حقیقت کی بالاتر، نفسی اور روحانی سطح (باطن) پر دریافتِ نو ہوگی۔

خدا موجود ہے اور مخلوقات کے ہونے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک پہلو مستقل ہے اور ایک عارضی۔ یہاں استقلال بھی ہے اور پیہم حرکت بھی۔ ایک بھی ہے اور کئی بھی۔ ثبات بھی ہے اور تغیر بھی۔ مطلق بھی ہے اور اضافی بھی۔ اختیار بھی ہے اور جبر بھی۔ یہ دونوں پہلو ایک دوسرے میں گتھے ہوئے ہیں، ایک وحدت میں تانے بانے کی طرح پیوست ہیں۔ ثنویت وحدت کی فطرت میں شامل ہے۔ تمام مخلوقات اللہ کی ذات کا حصہ ہیں۔

لہٰذا یہاں علت و معلول ہیں بلکہ یوں کہیے کہ علت اور تعلیل (Cause and causations) ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ثنویت اور تضادات دکھائی دیتے ہیں جو بظاہر ایک دوسرے کے الٹ معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذہبی حقیقت کہ کائنات کو خدا نے تخلیق کیا ہے اور سائنسی حقیقت کہ کائنات ارتقا کا نتیجہ ہے، ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں جو ایک دوسرے سے علت اور تعلیل (Cause and causations) کے رشتے سے جڑے ہوئے ہیں۔ خدا کا منشا علت ہے اور ارتقا اس کا معلول ہے۔ تمام تر حرکت، تمام تر ارتقا اللہ کا فعل ہے۔ اللہ کے افعال مرحلہ وار ہوتے ہیں اور مخلوقات کے درجہ بندی کے ذریعے باری باری رونما ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کی بنیادی صفات مثلاً الخالق، الباری اور المصور کا حاصل ہیں۔

یہیں اسمائے الٰہی کی حقیقی معنویت اور ان کے سائنسی نتائج واضح ہوتے ہیں۔ کیا اب بھی یہ بات بہت عجیب، دور از کار اور بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے؟ فریڈ ہوئل (Fred Hoyle) اپنی کتاب *Of Men*

Marfat.com

and Galaxies میں لکھتا ہے:

''نئے خیالات جینی تغیرات (genetic mutations) کی طرح ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر خراب ہو جاتے ہیں، لیکن ان جینی تغیرات کے بغیر ارتقا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح نئے خیالات کے بغیر بھی ہم فنا ہو کر رہ جائیں گے''۔

یہ بظاہر متضاد نظر آنے والی دو طرفہ جہات دراصل وحدت کے دو پہلو ہیں۔ بالکل ایسی ہی جیسے، حرکتِ اضطراری اور حرکتِ ارادی دونوں بیک وقت انسانی صفات ہیں۔ انسان کے پٹھوں کا اچانک کھنچاؤ یا اس کا چھینکنا غیر ارادی ہوتے ہیں جو انسان کے متعین حیاتیاتی اضطراری عمل کو ظاہر کرتے ہیں لیکن اس کا مسکرانا یا تیوریاں چڑھانا اس کے ارادے اور منشا کے تابع ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی جسم کی فطری یا جبلی صفات ہیں اور ہم انھیں زندگی کے تمام اعلا تر مظاہر میں دو سطحوں یا جہتوں کی بیک وقت موجودگی کا اظہار سمجھ سکتے ہیں۔ قانونِ وحدت یہ بتاتا ہے کہ فطرت میں حقیقی تضاد کا کوئی وجود نہیں۔ فطرت ایک زندہ، نامیاتی کل ہے۔ ہر حقیقت کی اصل فطرت یا ماہیت تضاد پر نہیں، وحدت پر مبنی ہے جو ہر تضاد، ہر ثنویت، ہر تنوع کو کھا جاتی ہے۔ اللہ کی وحدانیت، اس کی قدرتِ کاملہ کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت کی مطلق ماہیت میں متضاد یا حریفانہ قوتیں وجود رکھتی ہیں نہ رکھ سکتی ہیں۔ دولت اور غربت ضرور وجود رکھتی ہیں لیکن یہ ایک دوسرے کے متضاد نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ایک دوسرے کی اضافی موجودگی یا غیر موجودگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی طرح روشنی اور اندھیرا دونوں وجود رکھتے ہیں لیکن اندھیرا محض روشنی کے نہ ہونے کا نام ہے۔ جسم اور روح بھی ایک ہی اکائی کے دو انتہائی سرے ہیں جن کی درمیانی حالت شعور کی ہے۔ یہ تصور جدید انسان کی بصیرت اور حقیقت کی تعبیر و تفسیر کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ انسان کے علم، سائنس اور فلسفے کے لیے اہم ہے جو فعلیت (functionalism) اور ساختیات (structuralism)، میکانیت (machanism) اور روحیت (vitalism)، مادیت (materialism) اور تصوف (Mysticism) وحدانیت (Monism) اور تکثیریت (Pluralism) کے درمیان نامختتم مباحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ سب ایک ہی تسلسل کے انتہائی کنارے ہیں۔

ذہن اور جسم، جبر اور اختیار، آزادی اور قانون، روایت اور انقلاب، سکون اور حرکت، فاعل اور مفعول،

Marfat.com

آفاقی اور مقامی، مستقل اور تغیر پذیر، ایک اور کئی، ایک دوسرے کے متضاد نہیں ہیں۔ یہ وحدت کی تکمیل اور ارتقا کا موجب بننے والے مساوی اور باہمی مربوط اصول ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر قائم رہتا ہے۔ اسی طرح تخلیق اور ارتقا، مذہب اور سائنس، خدا اور انسان، علت اور تعلیل، حکم اور قانون، نادیدہ اور دیدہ، غیر مرئی اور مرئی، زمانی اور روحانی، ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔ بظاہر یہ سب صفات ثنویت یا دوئی کا اظہار کرتی ہیں لیکن اصل میں ایک ہی مستقل حقیقت کے پہلو ہیں۔ یہ مستقل حقیقت اللہ کا قانون ہے۔ یہی ایک تصور انسانی فہم وادراک کی ایک لمبی چھلانگ کا موجب بن سکتا ہے اور اگر اس قانون کا اطلاق سائنس پر کر لیا جائے تو یہ ایک بہت بڑی پیش رفت ہوگی۔ یہ ایک اعلا و ارفع تغیر یافتہ (mutant) نظریے کی تشکیل، ایک منفرد اور انوکھی ترکیب کا باعث بن جائے گا جس کے نتیجے میں انسانی فکر و شعور کا ایسا ارتقا وجود میں آئے گا جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔

اللہ کا قانون تمام تضاد پیدا کرنے والے فلسفوں اور نظریوں کے خاتمے پر منتج ہوگا۔ ثنویت یا دوئی اصل میں حقیقت کی فلسفیانہ تعبیر سے پیدا ہوتی ہے جس میں ہر شے کی حقیقت کو دو خانوں میں تقسیم کر کے دیکھا جاتا ہے جیسے جسم اور ذہن۔ کئی فلسفیوں نے زمانوں کے غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ اشیا کی حقیقت کو عقل کی مدد سے سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ ہر حقیقت کو متضاد صفات کا ایک جوڑا خیال کیا جائے جو ایک دوسرے سے متصادم ہوں اور اس تصادم اور کشمکش کے ذریعے انسان حقیقت کا تجربہ کر سکے۔ یوں ہر انسانی تجربہ ناگزیر طور پر دو متصادم اصولوں کے درمیان کشمکش پر بنیاد رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر:

مثالی اور مادی	(ارسطو)
وجودِ ذہنی اور وجودِ مادی	(ڈیکارٹ)
ناقابلِ ادراک خارجی حقیقت اور حسی مادہ	(کانٹ)
زندگی کی جدت وانفرادیت اور میکانیت	(برگساں)

اللہ کا قانون ایسے تمام تضادات اور ہر ثنویت، تصادم، خلیج، انتہا پسندی اور کشمکش کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ٹوٹے اور ٹکڑوں میں بٹے ہوئے انسان کی داخلی شکست و ریخت کا مرہم بن جاتا ہے۔ یہ ان متضاد صفات کو ایک مساوی مگر معکوس ردعمل کے صحت مندانہ رشتے میں پرو دیتا ہے اور پھر اصول تقدیم و تاخیر کے ذریعے اس تعامل کی برابری کی بنیاد بھی فراہم کر دیتا ہے۔ یہ قانون بتاتا ہے کہ وحدت دو طرفہ ہے، یک طرفہ

Marfat.com

نہیں۔ یہ طرفین، یہ دو انتہائی سرے ایک دوسرے سے مل کر مساوی تعامل کرتے ہیں اور اعلاتر ترکیبی عمل سے گزرتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں تبدیلی اور ترقی کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔

اس قانون کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ کا قانون ثنویت کا اثبات کرتا ہے لیکن اس قانون کے مطابق یہ ثنویت دو متخالف اور معاندانہ قوتوں پر مشتمل نہیں ہے بلکہ وحدت کے دو ایسے خلقی پہلوؤں کو ظاہر کرتی ہے جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اللہ ایک ہے لیکن اس کا ظہور ثنویت میں ہوتا ہے کیوں کہ اس کی مخلوقات بھی اس کی ذات سے جڑی ہوئی ہیں۔ یہ مساوات دو نا قابلِ تخفیف اصولوں کے وجود کا اعتراف ہے۔۔۔ یعنی انسان اور خدا۔ یہ ایک دوسرے سے الٹ حقیقتوں کا ایک جوڑا ہے جو مساوی عمل اور ردعمل کے اٹوٹ رشتے میں بندھی ہوئی ہیں۔ اس باہمی تعامل میں یہ دونوں پہلو مساوی طور پر کارفرما ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایک پہلو، دوسرے کو نہ تو دبا سکتا ہے نہ اس کی جگہ لے سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کا سبب یا اس کی علّت بنتا ہے اور اسی وجہ سے دوسرا اس کی تعلیل (causation) ثابت ہوتا ہے۔ یہ دونوں اصول یا پہلو، ہر جگہ اور ہر سطح پر ظاہر ہوتے ہیں اور باہمی تعامل سے ارتقا اور تخلیق، اضافی اور مطلق، قانون اور حکم جیسے اصولوں پر قانونِ تقدیم و تاخیر کے اطلاق کے ذریعے عمل میں آتے ہیں۔ علّت مرکز ہے، یہ نیوکلیس ہے اور قانونِ مساوات کا (Law of Parity) اطلاق نیوکلیس پر نہیں ہوتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تناقض دکھائی دیتا ہے۔ دونوں اصول مساوی ہیں لیکن غیر مساوی بھی ہیں۔ یہی بنیادی سائنسی قانون ہے جو ہر حقیقت پر لاگو ہوتا ہے۔ کوانٹم فزکس کے بنیادی ذرّوں کے باہمی تعامل سے لے کر انسان اور کائنات اور خالق ومخلوق تک ہر چیز پر اسی متناقض قانون کا اطلاق ہوتا ہے کیوں کہ ہر حقیقت انسان اور اللہ، مرئی اور غیر مرئی، تعلیل اور علت، ارتقائی اور مستقل، اضافی اور مطلق، حقیقت اور حق کے ظہور کا نام ہے۔ یہ دونوں پہلو بقائے باہمی میں منسلک ہیں، متوازی، متصادم اور متخالف قوتوں کے طور پر نہیں بلکہ وحدت کی اصل نوعیت و ماہیت ہی دو طرفہ ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کا حقیقت کے ہر درجے اور ہر سطح پر ایک دوسرے سے پیوست ہونا اور باہمی تعامل میں جڑے رہنا قانونِ متوازی معکوس کی رو سے ناگزیر ہے۔ یہ آفاقی اصول ہیں۔

یہ اوپر۔ نیچے (up-down) کے مقامات ہیں۔ قانونِ متوازی معکوس ان کے ظہور میں تناقض کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ قانون ان کی وحدت کی مساوات کو بیان کرتا ہے۔ کسی ہنڈولے (seesaw) کی طرح

Marfat.com

جسم کی ضرورت سے زیادہ نشو ونما روح کے ضعف کا باعث بن جاتی ہے اور ارضی دنیا میں غربت اور تکالیف، روحانی دنیا کے عشرت و آرام کا سبب بن جاتی ہیں۔

یہ حقیقت کہ ایک تسلسل (continuum) کے یہ دو ایک دوسرے کے الٹ کنارے وجود کی ہر سطح اور ہر منطقے میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ ہر حقیقت کو دو مختلف نقطہ ہائے نظر سے دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے جو بظاہر ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ الٹ لگتے ہیں لیکن اصل میں ایک دوسرے کا ناگزیر جزو ہیں۔ مثال کے طور پر روشنی کو ذرہ بھی کہا جا سکتا ہے اور موج بھی۔ سائنس دان عام طور پر اپنی وقتی ضرورت یا حالات کے مطابق اسے کبھی ذرہ اور کبھی موج کہتے رہتے ہیں۔ اسی طرح مادے کو مادہ بھی کہا جا سکتا ہے اور توانائی بھی اور انسان جسم بھی ہے اور ذہن بھی۔ خاک بھی اور روح بھی۔

دو معروف فرانسیسی سائنس دان لوئی رالس (Louis Rauwels) اور ژاں برجے (Jacques Bergier) اپنی کتاب *The Dawn of Magic* میں لکھتے ہیں:

"Take a sheet of paper, if you pierce two holes in it, near together. Obviously, common sense tells us, an object small enough to go through these holes will go through either one or the other. By the same criterion, an electron is an object. It has definite weight and produces a ray of light when it strikes the television screen and a shock when it hits the microphone. Here then we have an object small enough to go through one of our two holes. Now the electronic the electronic microscope will tell us that the object has gone through both the objects at the same time. But indeed it has gone through both. It sounds crazy but the experiment has been made. Attempts to explain it has lead to the formation of various theories. But our rational explanations defy reality that does not lend itself to YES or NO answers, A or B interpretations. In order to understand it the very structure of our reason will have to be changed. Our philosophy (indeed our whole mental structure) is based on

Marfat.com

thesis and antithesis. But it looks as if, in the philosophy of electron, thesis and antithesis are both true at the same time. Are we talking of absurdities? The electron seems to obey laws the television is reality. Does the electron exist or not? What nature calls existence is not existence in our eyes. Is an electron something or nothing? The question is meaningless. And so at the extreme limit of knowledge, our normal methods of thought and philosophy, both born of an outdated outlook on the world, simply disappear."

''ایک کاغذ کا ٹکڑا لیں اور اس میں دو سوراخ کر دیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوں۔ اب عقل سلیم یہی بتاتی ہے کہ کوئی چیز جو اتنی چھوٹی ہو کہ ان میں سے گزر سکے تو وہ یا تو ایک سوراخ سے گزرے گی یا دوسرے سے۔ اسی اصول پر دیکھیں کہ الیکٹران بھی ایک چیز ہے۔ اس کا ایک متعین وزن ہوتا ہے اور اگر یہ ٹیلی ویژن کی سکرین سے ٹکرائے تو روشنی کی ایک شعاع پیدا ہوتی ہے، اگر مائکروفون سے ٹکرائے تو ایک جھٹکا لگتا ہے۔ الیکٹرانک خوردبین ہمیں بتاتی ہے کہ یہ چیز بیک وقت دونوں سوراخوں سے گزری ہے۔ یقیناً یہ دونوں سوراخوں سے بیک وقت گزری ہے۔ بادی النظر میں یہ بات عجیب وغریب معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔ اس عمل کی وضاحت کی کوشش میں کئی نظریات تشکیل پا چکے ہیں۔ لیکن ہماری منطقی یا عقلی وضاحت حقیقت کو جھٹلاتی ہے۔ حقیقت کے سوال کا جواب 'ہاں' اور 'نہیں' میں نہیں دیا جا سکتا اور نہ اسے 'الف' یا 'ب' کے ذریعے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ہمیں اپنی پوری فکری ساخت کو بدلنا ہوگا، ہمارا فلسفہ (اور یقیناً ہماری پوری فکری ساخت) دعوے (thesis) اور جواب دعوے (antithesis) کے تصور پر قائم ہے۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ الیکٹران کے فلسفے کی طرح دعویٰ اور جواب دعویٰ بھی دونوں بیک وقت درست ہو سکتے ہیں۔ کیا ہم لایعنی باتیں کر رہے ہیں؟ الیکٹران ٹیلی ویژن کے قوانین کی پابندی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کیا الیکٹران وجود رکھتا ہے یا نہیں؟ فطرت جسے وجود رکھنا کہتی ہے، ہماری نظر میں وہ وجود رکھنا نہیں ہے۔ الیکٹران ''کچھ'' ہے یا ''کچھ نہیں''

Marfat.com

ہے؟ یہ سوال بے معنی ہے۔اسی طرح علم کی آخری حدوں پر ہمارے فکر و فلسفے کا عام مستعمل منہاج (normal method) جو دنیا کے بارے میں ہمارے ناکارہ اور زائد المدت نقطۂ نظر کا حاصل ہے، بالکل مٹ جاتا ہے، غائب ہو جاتا ہے۔''

ہمارے اس دعوے کی آفاقیت کا ایک ثبوت فلسفے کے یہ متضاد مکاتبِ فکر ہیں جو حقیقت کی ماہیت اور نوعیت کے بارے میں پُر زور مباحث میں مصروف رہتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے نقطۂ نظر سے شدت سے چمٹا رہتا ہے اور اس کے حق میں نہایت صائب دلائل اور برحق مشاہدات پیش کرتا رہتا ہے۔ ہر حقیقت کی کئی طرح سے تعبیر و تشریح کی جاسکتی ہے لیکن ان میں سے نمایاں ترین تصور دو متضاد حقیقتوں کے اثبات کا ہے۔ لہٰذا مذہب اور سائنس، تخلیق اور ارتقا، دانش اور وجدان، سب ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ یہ سب پہلو بقائے باہمی کے اصول کے تحت قائم رہتے ہیں۔ ایسی ثنویت اصل میں ایک ہی درجہ وار تسلسل کے اوپر۔ نیچے کے مقامات کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ دونوں حقیقتیں، قانونِ مساوات کے تحت بیک وقت درست اور برحق ہوتی ہیں اور دونوں کا باہمی تعامل بالکل مساوی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں سے ایک دوسرے کا سبب یا اس کی علت ہوتی ہے اور اس لیے قانونِ تقدیم و تاخیر کے تحت ایک کو دوسری پر فوقیت اور فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

حقیقت ایک درجہ وار تسلسل کا نام ہے جس کے دو انتہائی مقامات ہیں اور ان انتہائی مقامات کے درمیان لاتعداد وسطی مدارج ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام تر حقیقت ایک وحدت (UNITY) ہے لیکن اس وحدت میں ثنویت (DUALISM) بھی ہے کیوں کہ ہر حقیقت کے دو الگ الگ انتہائی سرے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں بیک وقت تکثیریت (MULTIPLEX) بھی پائی جاتی ہے کیوں کہ یہ ہشت پہلو (OCTAVE) بھی ہے، چار ابعادی (TETRA-PLEX) بھی ہے اور تثلیث (TRIO) کی حامل بھی ہے۔ ان انتہائی مقامات کے درمیان کئی وسطی مدارج ہیں لیکن اس کے باوجود ان سب میں حقیقت کے مختلف اور مرتعش مدارج کے مابین ثبات (CONSTANCY)، ہم آہنگی (HARMONY) اور ہم آمیزی (SYMPHONY) ہے۔ ارتعاش (sympathetic resonance) کا یہ عمل سائنس میں بھی معروف ہے اور ہماری پوری کائنات میں بھی جاری و ساری ہے۔ روشنی اور آواز کی لہریں ارتعاش پیدا کرتی ہیں۔ تالاب میں کنکر پھینکیں تو پانی کی لہروں میں بھی ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے، مگر کچھ اس طرح کہ

Marfat.com

لہروں کے دائرے سے بننے لگتے ہیں، ان دائروں کا مرکز ایک ہی ہوتا ہے یعنی وہ مقام جہاں کنکر پانی سے ٹکراتا ہے، لیکن اس مرکز کے اردگرد بننے والے دائرے پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت کی نوعیت و ماہیت کو منکشف کرنے والا بنیادی تجربہ ہے۔ تمام ساز اسی اصول پر بنائے جاتے ہیں۔ پیانو کی کوئی بھی کنجی دبائیں گے تو ارتعاش پیدا ہوگا۔ کائنات بھی اسی اصول پر بنائی گئی ہے تو پھر کیا تعجب کہ ہمارے کچھ عظیم ترین ذہن مثلاً فیثا غورث، نیوٹن اور جدید فزکس میں سٹرنگ تھیوری (String Theory) پیش کرنے والے سائنس دان کائنات کو ایک سمفنی (symphony)، ایک خوش آہنگ نغمہ قرار دیتے ہیں۔ ارتعاش کا یہ عمل موسیقی اور آسمانی سیاروں کی حرکت تک محدود نہیں ہے، یہ ایک آفاقی عمل ہے۔ خالق نے اپنی تخلیق میں اسی اصول کو مدنظر رکھا ہے۔ روشنی اور آواز ہی نہیں، الیکٹران بھی مرتعش رہتے ہیں، جدید فزکس ہمیں بتاتی ہے کہ کیسے ایک زائد توانائی رکھنے والا الیکٹران ارتعاش کے ذریعے اپنی توانائی کسی اور یکساں تعدد (frequency) کو منتقل کر دیتا ہے۔ یہی اصول انسانی رشتوں پر بھی صادق آتا ہے اور انسان اور خدا کے رشتے پر بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ پوری کائنات ہی ہم آہنگی کے اس اصول پر قائم ہے۔ ایک اکیلا عمل، کسی ایک فرد کا خیال یا نظریہ اس کے اردگرد موجود لوگوں میں ارتعاش کی لہریں پیدا کر دیتا ہے اور اسی اصول کی بنیاد پر انسانوں کے اجتماعی عمل یا خیال سے پیدا ہونے والا ارتعاش خدا تک جا پہنچتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انسانی اعمال و افعال کی سمفنی جنم لیتی ہے جو ہمیں انسانوں کے شاندار کارناموں، عظیم افکار، خوب صورت مجسموں، فن تعمیر کے نادر نمونوں، شاعری اور مذہبی تحریکوں کی صورت میں سنائی دیتی ہے۔ اس کے برعکس اجتماعی ارتعاش کی ہم آہنگ لہروں میں ایک اکیلا فرد، بے محل سُر کی طرح ہوتا ہے، چاہے یہ سُر اونچا ہو یا نیچا۔ اگر ہر شخص اپنے الگ اور انفرادی سُر میں محو ہو جائے تو ہر طرف درہم برہم کر دینے والا شور برپا ہو جائے گا اور معاشرہ قائم نہیں رہے گا۔ اختلال، انتشار اور عدم موافقت کے عہد میں ایسا ہی منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ آرکسٹرا تب وجود میں آتا ہے جب سارے ساز ایک ہی دھن میں ہم آہنگ ہو جائیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اتوار کی مسیحی عبادت اور کلیسائی اجتماعوں، نمازِ جمعہ کی فضیلت، مذہبی اجتماعوں کی اہمیت، ایک مشترک مقصد کے لیے مجموعی جدوجہد اور اسلامی عقائد میں شریعت اور اجماع کی تاکید کی کیا معنویت ہے۔ انسان بھی موسیقی کے ساز جیسا ہے۔ موسیقی پیدا کرنے کے لیے ہر ساز کو سُر کرنا پڑتا ہے۔ کوئی تار بھی اس وقت تک مرتعش نہیں ہوتا جب تک اس کا تعدد (frequency) یکساں نہ ہو جائے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کی تصدیق ہم اپنے روزمرہ کے انسانی رشتوں میں بھی کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں انسان

Marfat.com

کا نقطۂ نظر دراصل اس کے اپنے رویے پر منحصر ہوتا ہے کیوں کہ حقیقت تو ہر چیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں تاریخ کے کسی بھی مخصوص لمحے میں، حقیقت کے بارے میں انسان کا اپنا نقطۂ نظر، اس کا اپنا انداز (posture) ہی اس بات کا تعین کرتا ہے کہ وہ حقیقت کو کیا سمجھتا ہے۔ حقیقت بذاتِ خود دوطرفہ انتہاؤں اور ان کے درمیان موجود تمام تر کثرت پر مشتمل ہے۔ جب یہ سائنس اور شاعری (مذہبی الہامی کتاب) ہو تو شاعرانہ نثر کے تمام اسالیب سے لے کر نثری شاعری کے تمام رنگ اس کے وسطی مدارج میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی اصول کی بنا پر اللہ کا یہ سائنسی قانون بھی ایک وسطی نثری درجہ ہے جو مذہب کی شاعری اور انسانی سائنس کی انتہاؤں کے درمیان ہے۔ یہ ایک تھڑا (podium) ہے جو دو سطحوں کو آپس میں ملاتا ہے اور مجھ جیسے اپاہج اور غیر معتبر دانش ور کے لیے مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

Cosmos is creation. کائنات تخلیق کا کرشمہ ہے۔

Cosmos is evolution. کائنات ارتقا کا نتیجہ ہے۔

Dust thou art to dust returnest. اگر تم خاک ہو تو خاک میں مل جاؤ گے۔

Soul thou art to Soul returnest. اگر تم روح ہو تو روح کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

Miracles are the technology of Religion. معجزے مذہب کی ٹیکنالوجی ہیں۔

Inventions are the miracles of Science. ایجادات سائنس کے معجزے ہیں۔

Ideal is real مثالیت ہی حقیقت ہے۔

Reality exists independent of ideas. حقیقت نظریات سے آزاد ہے۔

Man is the apex of all evolution. انسان ارتقا کی معراج ہے۔

Man is the crown of creation. انسان اشرف المخلوقات ہے۔

The inner is projected. یہ باطن کا خارج ہے۔

The outer is introjected. یہ خارج کا بطون ہے۔

Marfat.com

استنبول کا شہر مغرب کا دروازہ ہے۔. The city of Istanbul is the gateway to West

یہ شہر مشرق کا دروازہ ہے۔ The city is the gateway to East.

یہ وہ انداز ہیں، وہ رویے ہیں جو ادراک کرنے والے کی سمت، اس کے نقطۂ نظر کو ظاہر کرتے ہیں۔ حقیقت تو دونوں طرف ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ حقیقت نہ تو داخلی ہے، نہ خارجی۔ بلکہ یہ داخل اور خارج، موضوع اور معروض کا حرکی تعامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی رویہ اس پہلو کا تعین کرتا ہے جو اس نقطۂ نظر کے حامل کے لئے حقیقت ہوگا۔ رویہ ہی نقطۂ نظر ہوتا ہے جسے کوئی شخص اپناتا ہے۔ حقیقت کی تو متعدد تعبیریں کی جا سکتی ہیں کیوں کہ یہ سبھی کچھ ہوتی ہے۔ اسی لیے ہر دریافت دراصل خود اپنی ہی دریافت ہوتی ہے۔ ہر علم اصل میں اپنا علم ہوتا ہے۔ اسی لیے اعلاترین فلسفیانہ تلاش know thyself یعنی خود شناسی پر منتج ہوتی ہے۔ اسی سے انسان اور خدا کے درمیان مساوی تعامل کا اصول بھی طے ہو جاتا ہے، ''ڈھونڈو، اور پالو!''

۱۹۱۰ کی بات ہے نیویارک میں ایک آدمی رہتا تھا جو اپنے عہد سے الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ اس کا نام چارلس ہوئے فورٹ (Charles Hoy Fort) تھا۔ وہ، سمجھ لیجیے کہ ایک کباڑی تھا جو ان حقائق کو جمع کرنے میں محو تھا جنھیں سائنس نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ لائبریریوں سے، کتابوں کی دکانوں سے، سائنس دانوں سے، عجائب گھروں سے، وہ اصول، فارمولے، قوانین اور ہر قسم کے عمل (phenomenon) کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا رہتا تھا۔ اس نے چالیس ہزار نکات تلاش کر لیے تھے جنھیں اس نے تیرہ سو حصوں میں تقسیم کیا۔ یہ نکات اس نے ردی کاغذ کے ٹکڑوں پر پنسل سے باریک حروف اور اپنی ہی وضع کردہ زبان میں تحریر کیے۔ اسے یقین تھا کہ سائنس اصل میں ایک سازش ہے کیوں کہ یہ ان تمام حقائق کو نظر انداز کر دیتی ہے جو اس کے تصدیق شدہ مسلمہ نظریوں اور تصورات کو جھٹلاتے ہوں۔ لہٰذا سائنس نے جو کمال حاصل کیا ہے اس کی بنیاد انتخاب پر ہے۔ اس کے نزدیک سائنسی علم معروضی نہیں ہوتا۔ سائنس میں حقائق کی ایک کثیر تعداد محض اس لیے رد کر دی جاتی ہے کیوں کہ وہ پہلے سے تصدیق شدہ نظریات کو جھٹلاتی ہے۔ ہم تحقیق و تفتیش اور بازپرس کے دور میں جی رہے ہیں، جہاں غیر روایتی فکر کے خلاف سب سے زیادہ کثیر الاستعمال ہتھیار تمسخر اور تضحیک کا ہے۔ ان حالات میں ہمارے علم کی نوعیت اور اہمیت کیا ہو سکتی ہے۔ فورٹ نے کہا تھا، تعقل و تدبر کے جغرافیے میں جسے ہم علم کہتے ہیں وہ دراصل قہقہوں سے گھری ہوئی لاعلمی اور جہالت ہے۔ لہٰذا ہمیں آئین کی عطا کردہ آزادیوں

Marfat.com

میں ایک اور آزادی مانگنے کا حق بھی ملنا چاہیے اور وہ ہے سائنس پر یقین نہ کرنے کی آزادی'۔

سائنس ہر عمل کی تحلیل کر کے، اس کے ٹکڑے کر کے اسے دیکھتی ہے۔ چارلس فورٹ کا خیال یہ تھا کہ کسی چیز کو بھی دوسری چیزوں سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ جو چیز علیحدہ ہو جاتی ہے، کٹ جاتی ہے، وہ فنا ہو جاتی ہے۔

۱۹۱۹ میں چارلس فورٹ نے اپنی کتاب 'The Book of the Damned' شائع کی جس کا بعد میں فرانسیسی میں ترجمہ بھی ہوا۔ یہ کتاب ان حقائق پر مبنی ہے جنھیں سائنس نے رد کر دیا تھا۔ یہ کتاب سب سے پہلے نیویارک میں شائع ہوئی اور اس نے دانشورانہ حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ میں اس بارے میں لوئی پاوَل (Louis Pauwel) کی فرانسیسی اشاعت سے کچھ اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

''چارلس فورٹ جس بات پر حملہ کرتا ہے وہ دراصل تہذیب یافتہ انسان کی ذہنی ساخت ہے۔ وہ دو دھکوں کی محتاج مشین (two-stroke motor) سے کوئی مفاہمت نہیں کر سکتا جب کہ جدید عقل و خرد کا تمام تر انحصار اسی پر ہے۔ یہ دو دھکے 'ہاں' اور 'نہیں'، 'مثبت' اور 'منفی' کے ہیں۔ جدید علم اور جدید ذہانت کی بنیاد اسی دورُخے نظام (binary system) پر ہے؛ جیسے کھلا، بند؛ زندہ، مردہ؛ مائع، ٹھوس وغیرہ۔ فورٹ کو جس معاملے میں ڈیکارٹ کا مخالف سمجھا جاتا ہے، وہ اس کا اس بات پر اصرار ہے کہ عمومی (general) کو اس زاویے سے دیکھا جانا چاہیے جو اس بات کا موقع فراہم کرے کہ خصوصی (particular) کو بھی عمومی (general) سے تعلق کے حوالے سے یوں دیکھا جا سکے کہ ہر چیز دوسری چیزوں کے درمیان ایک وسطی درجے کے طور پر سامنے آئے۔ دوسرے الفاظ میں نظامِ استدلال جو کہ دورُخے نظام (binary system) سے اعلاتر ہے، ایسا ہو کہ ذہانت کے لیے تیسری آنکھ بن جائے۔ اس نئے ادراک کو ظاہر کرنے کے لیے، زبان (language) جو دورخی کی پیداوار (binary product) ہے، کافی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے فورٹ ایسے مقاصد پیش نظر رکھنے پر مجبور تھا جو دورُخے ہوں مثلاً حقیقی۔ غیر حقیقی (real-unreal)، غیر مادی۔ مادی (Immaterial-material)، قابلِ تحلیل۔ ناقابلِ تحلیل

Marfat.com

(soluable-insoluable) وغیرہ۔ مرنا کیا ہے اور جینا کسے کہتے ہیں؟ ان دونوں کے درمیان کتنے ہی وسطی مدارج ہوتے ہیں جنھیں پہچاننے سے ہم منکر ہیں‘‘۔

ریاضی میں دونمبروں کے درمیان ہمیشہ ایک اور تیسرا نمبر بھی ہوتا ہے جو چھوٹے نمبر سے بڑا اور بڑے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ قدیم یونانی فلسفیوں نے پہلی بار اس بات کا ادراک کیا تھا کہ حقیقت خود اپنے آپ سے بڑی اور یوں اپنے آپ سے چھوٹی ہوتی ہے؛ یہ فزکس کی ایک مشق ہے جس کے ذریعے کسی پیچیدہ بات کو سمجھنے کے لیے تجرید پیدا کی جاتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ہم کلیت (Wholeness) کو ظاہر کرنے کے لیے ایک انچ لمبی ایک لکیر کھینچتے ہیں۔ یہ لکیر بیک وقت ایک تسلسل بھی ہے اور نقاط پر بھی مبنی ہے، جیسے ذرہ اور موج ہوتے ہیں یا جیسے روشنی کا فائی عمل (phi-phenomenon) ہے جس میں روشنی کی مسلسل حرکت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ الگ الگ روشنیوں پر مشتمل ہے۔ یہی حال ارتقا کا ہے جو ایک مسلسل اور جاری وساری عمل ہے لیکن ہر نوع کے لیے الگ اور انفرادی نوعیت کا حامل ہے۔ یا پھر اللہ ہے جو ایک بھی ہے اور کئی بھی۔ ماہرین طبیعیات کے اندازے کے مطابق اس لکیر پر نقاط کی تعداد کائنات میں موجود ذروں کی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ یہ لکیر لامتناہی ہے۔ ہر دفعہ دو قریب ترین نقاط کے درمیان ایک اور نقطے کی موجودگی کا انکشاف ہو جاتا ہے اور یوں وسطی مدارج میں توسیع ہوتی رہتی ہے۔ خدا اور انسان بھی اسی طرح ایک وحدت اور ایک تشخص ہیں۔ اس صورت میں انسان بھی ایک وسطی درجہ ہے جو حقیقت سے بڑا بھی ہے اور حقیقت سے چھوٹا بھی۔ حقیقت بیک وقت اضافی (relative) بھی ہے اور مطلق (absolute) بھی، مستقل (constant) بھی ہے اور غیر مسلسل (discontinuous) بھی۔ یہ وہ نقطہ ہائے نظر ہیں جو فکرِ انسانی کی تاریخ میں ابھر کر سامنے آتے ہیں اور دیگر تمام نقطہ ہائے نظر ان دونوں کے درمیانی تعامل (intermediate interactions) کے مظاہر ہیں۔ یہ افلاطون تھا جس نے بغور مطالعے کے بعد یہ نظریہ تشکیل دیا تھا کہ کائنات میں کوئی شے بھی ایسی نہیں جو خوب صورت ہو مگر بدصورت نہ ہو، بڑی ہو مگر چھوٹی نہ ہو، عقل مندانہ ہو مگر احمق نہ ہو۔ انسان بن مانس کے مقابلے میں عقل مند ہے لیکن خدا کے مقابلے میں احمق ہے۔ عقل مندی اور حماقت جیسے تضادات گویا معروضی حقیقت میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ لیکن افلاطون کا اصرار تھا کہ ان دونوں کا اپنا جدا جدا وجود بھی ہونا چاہیے۔

Marfat.com

کیلی فورنیا یونی ورسٹی کے فریڈ ایلن وولف (Fred Alan Wolf) اپنی کتاب Parallel Universes میں لکھتے ہیں: ''ہمیں ابھی تک کوانٹم فزکس اور اضافی فزکس کو یکجا کرنے کی مشکل درپیش ہے اور ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ یہ کام کیسے کیا جا سکتا ہے لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ جو نظریہ بھی یہ کارنامہ سرانجام دے گا وہ ان لوگوں کے لیے بالکل منفرد، نرالا اور اوٹ پٹانگ سا ہوگا جو ابھی تک ایک گھڑی وار (clockwise) کائنات کے متمنی ہیں۔''

الیکٹران کوانٹم فزکس کے قانون کے تابع ہیں۔ وہ برقیائے ہوئے (electrically charged) ہوتے ہیں اور ایٹم کے مرکزوں (centers) کی جانب کھنچتے ہیں۔ ایٹم کے مرکز نیوکلیائی (nuclei) ہیں اور یہ بھی برقیائے ہوئے ہوتے ہیں۔ الیکٹران میں منفی چارج ہوتا ہے اور نیوکلیائی میں مثبت۔ اگر ایٹم کے اندر موجود الیکٹران کلاسیکی فزکس کے قوانین کے مطابق کام کریں تو نیوکلیائی الیکٹرانوں کو ہڑپ کر جائے۔ متوازی معکوس کے قانون کے تحت، حقیقت، چھوٹی سے چھوٹی، خوردبینی سطح پر بھی ایک جیسی خصوصیات کی مالک ہوتی ہے۔ جو اصول الیکٹران پر صادق آتا ہے وہی اصول ہر مادی حقیقت پر صادق آئے گا کیوں کہ ہر شے الیکٹران نما ذروں سے مل کر بنی ہے۔

ذرے اور موج کا جھگڑا نہ تو تکملیت (complementarity) کا ہے نہ عدم تیقن (uncertainty) کا۔ اسے قانونِ تکمیلی معکوس (Law of Complementary Inversions) یا قانونِ متوازی معکوس (Law of parallel Inversions) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ سائنس کے لیے ایک نیا قانون ہے جو ہر چیز کو ہم آہنگ کر کے اس میں وحدت پیدا کر دیتا ہے (unification law)۔ یہ قانونِ متوازی معکوس (Law of Parallel Inversions) ہے۔ اس قانون کے مطابق دونوں پہلو ایک جیسے درست ہوتے ہیں۔ علت معلول ہے اور معلول علت ہے۔ مادہ ذہن ہے اور ذہن مادہ ہے۔ ارتقا خلیق ہے اور تخلیق ارتقا ہے۔ لیکن پھر بھی دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت اور اولیت حاصل ہے۔ حقیقتیں متضاد کبھی نہیں ہوتیں، صرف متوازی ہوتی ہیں جو سچائی کا دوسرا رخ تشکیل دیتی ہیں۔

خود سائنس دان بھی حقیقت کو دیکھتے اس نظر سے ہیں کہ جیسے معلول علت ہے مگر اس کا تجربہ ایسے کرتے ہیں جیسے علت معلول ہے۔ تمام تر انسانی سائنس حقیقت کا معکوس رخ دیکھتی ہے کیونکہ انسانی نقطۂ نظر ہی معکوس ہے

Marfat.com

اور ایسا اس لیے ہے کہ انسان اللہ کا عکس ہے جو ہمیشہ الٹا ہوتا ہے۔ یہی عمومی فزکس اور کوانٹم فزکس کے درمیان موجود تضاد کا جواب ہے۔ قانونِ متوازی معکوس اس وحدت تک پہنچا دیتا ہے جس کی تلاش آئن اسٹائن سے لے کر آج تک کے سائنس دان کرتے آئے ہیں۔ اگر انسان حقیقت کو درست اور سیدھا دیکھنا چاہتا اور اعلا وارفع حقائق کا ادراک کرنا چاہتا ہے تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ واشگاف انداز میں قانونِ سبقت یا تقدیم و تاخیر (Law of Precedence) کا استعمال کرے جو ہر معکوس حقیقت کا سیدھا رُخ پیش کر دیتا ہے۔ موجودہ سائنسی نقطۂ نظر مکمل طور لایعنی ہے۔ یہ معکوس نقطۂ نظر ہے جو حقیقت کا متروک اور غلط رُخ پیش کرتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر مستقبل میں سائنس کو گم راہی کے سوا کچھ نہیں دے سکتا جس کے نتیجے میں سائنس کچھ پانے اور کسی منزل تک پہنچنے میں ہمیشہ ناکام رہے گی اور اس ناکامی کا سبب خود اس کی اپنی عدم استقامت (inconsistencies) ہے۔

جدید ماہرینِ طبیعیات حیران و سرگرداں ہیں۔ عالمِ فطرت کی محض نظریاتی تعبیر سے، جو کوانٹم فزکس پیش کرتی ہے، ہم اُس حقیقی اور مرئی دنیا کو کیسے سمجھ سکتے ہیں جس کا ہم خود تجربہ کرتے ہیں۔ کوانٹم فزکس اندرونی منظر (باطن) پیش کرتی ہے جب کہ عمومی فزکس بیرونی منظر (ظاہر) پیش کرتی ہے۔ یہ دونوں متوازی معکوس ہیں۔ باطن ظاہر میں الٹ جاتا ہے۔ یہی ہمارے سائنس دانوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ان میں سے ایک نظریہ ہے اور دوسرا حقیقت یا دوسرا نظریہ ہے اور پہلا حقیقت۔ یا پھر دونوں دونوں ہیں، نظریہ بھی اور حقیقت بھی۔ یہ متوازی سچائیاں ہیں اگرچہ معکوس ہیں۔

کوانٹم کا قانون غیر متعین (Indeterminate) ہے۔ یہ عدم تیقن کا قانون (Law of Uncertainity) ہے جو لامتناہی امکانات پیش کرتا ہے۔ دوسری طرف عمومی فزکس قانونِ تعین (Law of Determinism) ہے جو قابلِ پیش گوئی تیقن (predictable certainty) پر بنیاد رکھتا ہے۔ اس تمام تر ثنویت کی بنیاد صرف دو عوامل پر ہے؛ یعنی خدا اور انسان۔ حقیقت کی ہر سطح پر انھی دونوں عوامل کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک عنصر ہے خدا کی منشا (God's Will) اور دوسرا عنصر ہے انسان کی تقدیر (fate)۔ خدا کی مرضی کا معکوس رُخ انسان کی تقدیر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ گویا اللہ کی تدبیر کا معکوس رُخ انسان کی تقدیر ہے اور انسان کی تدبیر کا معکوس رُخ اس طبعی دنیا کی تقدیر ہے جو وہ اپنے گرد و پیش تعمیر کرتا ہے۔ یہ ایک انعکاسی چکر

Marfat.com

(cycle of inversions) ہے۔تدبیر اور تقدیر، اختیار اور جبر، ایک ہی تسلسل کے دو انتہائی کنارے ہیں۔یہ سادہ سی مساوات ہر حقیقت کی وضاحت کر دیتی ہے۔فزکس کا ایک مخفی مگر مسلمہ اصول یہ ہے کہ ہر چیز کی بنیاد انتہائی سادہ ہوتی ہے۔یعنی یہ خیال:

"Seems farcical, but an ingenious idea. In general metaphysical terms, continues Fort, our expression is that, like a purgatory, all that is commonly described as 'existence' which we call Intermediateness' is quasi-existence, neither real nor unreal, but expression of attempt to become real, or to generate for or recruit a real 'existence'. Such an enterprise is without a parallel in modern times. It foreshadows great change in the structure of the mind that are called today by the discovery of certain physico-mathematical realities. Where the particle is concerned for example, time moves in two directions at once. Equations are both true and false. Light is continuous and at the same time interrupted.

"But that all we call 'being' is motion; and that all motion is an expression not of equilibrium, but of equilibrating, or of equilibrium unattained; and to have what is called 'being' is to be intermediate to equilibrium and inequilibrium".

'All phenomenons in our intermediary state, or quasi-state of being, represent a movement towards organization, harmonization and individualization, in other words an attempt to attain reality. But, all attempts are thwarted by continuity, or by external forces, non-recognized facts, side by side with others that are recognized'.

'We conceive all things as occupying gradations or steps in series between realness and unrealness.' It was all the same to Fort whether he started with this fact or that, in trying to

Marfat.com

describe totality. But, our binary system of reasoning can only conceive duality. Fort was against the science of his day and against the very structure of our intelligence. It seemed to him that another kind of intelligence is needed partly mystical, and awakened to an awareness of the presence of Totality,"

''یہ خیال مضحکہ خیز لگتا ہے مگر ہے بہت کارآمد۔فورٹ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ عام مابعدالطبیعیاتی اصطلاح میں بات کریں تو ہمارا تاثر یہ ہوتا ہے کہ مقامِ برزخ کی طرح ، ہر وہ چیز جسے وجود (existence) کا نام دیا جاتا ہے اور جسے ہم وسطیت (Intermediateness) کہتے ہیں، اصل میں ''نیم وجود'' (quasi existence) ہے جو نہ تو حقیقی ہوتا ہے اور نہ غیر حقیقی بلکہ یہ حقیقی بننے، یا حقیقت کو پیدا کرنے اور حقیقی 'موجودگی' کی کیفیت تک پہنچنے کی کوشش ہے۔اس بات کی جدید زمانے میں کوئی مثال نہیں ملتی۔یہ ذہنی ساخت میں بہت بڑی تبدیلیوں کا اشارہ ہے جو آج کل کی جسمانی ریاضیاتی حقیقتوں (physico-mathematical realities) کی دریافت کے نتیجے میں ضروری ہیں۔مثال کے طور پر جہاں تک ذرے کا تعلق ہے، وقت ایک ساتھ دو سمتوں میں چلتا ہے۔مساواتیں بیک وقت درست بھی ہوتی ہیں اور غلط بھی۔روشنی مسلسل بھی ہے اور منقطع بھی۔

لیکن وہ سب جسے ہم ہونا (being) کہتے ہیں، حرکت کا نام ہے اور جسے ہم حرکت کہتے ہیں، وہ اصل میں توازن نہیں، توازن قائم کرنے کی جدوجہد ہے یا پھر کبھی قائم نہ ہوسکنے والا توازن ہے۔جسے ہم ہونا (being) کہتے ہیں اسے حاصل کرنے کے لیے ہمیں توازن اور عدم توازن کے درمیان رہنا ہوتا ہے۔''

یہ الفاظ ۱۹۱۹ میں کہے گئے تھے اور ایک معاصر ماہر حیاتیات وطبیعیات ژاں مانترے(Jacques Menetrier) کے یکسانیت کے معکوس رُخ (Inversion of Entropy) کے مشاہدات میں انھیں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

Marfat.com

"All phenomenons in our intermediary state, or quasi-state of being, represent a movement towards organization, harmonization and individualization, in other words an attempt to attain reality. But, all attempts are thwarted by continuity, or by external forces, non-recognized facts, side by side with others that are recognized".

"We conceive all things as occupying gradations or steps in series between realness and unrealness.' It was all the same to Fort whether he started with this fact or that, in trying to describe totality. But, our binary system of reasoning can only conceive duality. Fort was against the science of his day and against the very structure of our intelligence. It seemed to him that another kind of intelligence is needed partly mystical, and awakened to an awareness of the presence of Totality".

''ہمارے وسطی مقام (intermediary state) یا نیم وجود (quasi-state) ہونے کی کیفیت کے تمام عوامل ترتیب و تنظیم، ہم آہنگی اور انفرادیت کی جانب حرکت کو اور دوسرے لفظوں میں حقیقت (reality) کو حاصل کرنے کی کوشش کو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن یہ ساری کوششیں تسلسل (continuity) کے ہاتھوں، خارجی قوتوں کے عمل کے نتیجے میں اور جانے پہچانے یا انجانے حقائق کے باعث بے ثمر ہو جاتی ہیں۔''

''ہم سب چیزوں کو حقیقی پن (realness) اور غیر حقیقی پن (unrealness) کے تسلسل کے درمیان موجود زینوں یا مرحلوں کے طور پر دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ کلیت کو اس حقیقت کی مدد سے بیان کیا جائے یا اُس حقیقت کی مدد سے، فورٹ کے لیے برابر ہے۔ لیکن ہمارے استدلال کا دوطرفہ نظام (binary system of reasoning) صرف ثنویت کو سمجھ سکتا ہے۔ فورٹ اپنے زمانے کی سائنس کے خلاف تھا اور وہ ہماری ذہانت کی ایسی ساخت کا بھی مخالف تھا۔ اسے لگتا تھا کہ ایک اور طرح کی ذہانت کا ہونا ضروری ہے جو جزوی طور پر متصوفانہ بھی ہو اور کلیت (Totality) کی موجودگی کا شعور رکھتی ہو۔''

Marfat.com

اگر آپ سے اپنا ایک پاؤں اٹھانے کو کہا جائے تو آپ اپنی مرضی سے نہایت آسانی سے ایسا کر سکتے ہیں۔ آپ کو ایسا کرنے کا اختیار ہے، آزادی ہے، یہ آپ کی اپنی منشا ہوگی۔ لیکن اگر آپ کو دوسرا پاؤں بھی اٹھانے کو کہا جائے تو آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ آپ کا جبر ہے، آپ کی تحدید ہے۔ آپ آزاد ہیں، آپ پابند ہیں اور آپ ان دونوں کے درمیان لٹکے ہوئے ہیں۔ انسان مختار ہے، انسان مجبور ہے، آخر وہ ہے کیا؟ جدید تاریخ میں پہلی بار اللہ کا سائنسی قانون یہ بتانے کو موجود ہے کہ جبر اور اختیار کس طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں، ان کے باہمی تعامل کی مساوات (equation) کیا ہے؟ انسان کی تقدیر اور تدبیر کن اصولوں کی تابع ہیں؟ یہ سائنس کا سب سے بنیادی اصول ہے۔ ہر شے کا ماخذ ہمیشہ بہت سادہ، واضح اور بیّن ہوتا ہے، جسے مخصوص سائنسی اشاروں اور صوفیانہ اصطلاحات سے پاک، بالکل آسان زبان میں بیان کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی عملی جہات بے شمار اور اس کی حقیقی معنویت انتہائی پیچیدہ ہوتی ہے۔

اللہ کا سائنسی قانون انسان کے نقطۂ نظر (perception) میں بنیادی تبدیلی کا تقاضا کرتا ہے۔ مگر یہ تبدیلی اس کے اپنے ذہن اور طرزِ استدلال میں ہونی چاہیے، حقیقت میں نہیں۔ یعنی انسان کا ظاہر نہیں بلکہ باطن بدل جائے۔ جیسے انسان کو اپنی ذات سے ماورا ہونے کے لیے اپنی انا کو قربان کرنا پڑتا ہے؛ تہذیب یافتہ آدمی کو بھی اسی طرح اعلاتر صداقت کو پانے کے لیے خود اپنی ذہنی ساخت کو توڑنا پڑے گا۔ یہ علم کا تضاد (paradox) ہے۔ شک سائنس ہے، لاعلمی علم ہے۔ اپنے ذہن کو ترک کر دیں تاکہ اس سے ماورا دیکھ سکیں۔ مزید رسائی چاہتے ہیں تو اپنی ذہنی ساخت کو بدل ڈالیں۔ اعلاتر ادراک (higher perception) میں عقل سے پیچھا چھڑا لیں تو صوفیانہ حقائق روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ علم کی اعلاتر سطح ہے۔ یہ انسان کی سائنسی کامیابیوں کے حصول میں ترقی کا نام ہے۔ ہر موت ایک حیاتِ نو ہے۔ ہر کامیابی ایک نیا آغاز ہے۔ یہ دونوں دنیائیں، جن کے وسط میں انسان ہے، ایک دوسرے سے بالکل جڑی ہوئی ہیں۔ سائنس کا حقیقی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ دنیا کی ایک مربوط تصویر میں انسان کو ایک کلیت کے طور پر تسلیم کر لے۔ انتخاب کے ذریعے کاملیت (perfection through selection) حاصل کرنا ایک سازش ہے، ایک جزوی حقیقت ہے، مکمل سچائی نہیں۔

اللہ کا سائنسی قانون ہر طرح کی ثنویت (duality) کو ختم کر دیتا ہے اور انسان اور اس کی سائنس کے

Marfat.com

لیے مستقبل میں اعلاتر ترکیب و امتزاج کے امکانات کو جنم دیتا ہے۔ جدید انسان دو شدید انتہاؤں میں بٹ کر رہ گیا ہے، یعنی خود اپنی ہی بٹی ہوئی نظر اور منقسم رویے کی خلیج میں گھر گیا ہے۔ اللہ کا قانون اس کے کھوئے ہوئے توازن، ہم آہنگی، امن، استحکام اور کلیت کو بحال کرتا ہے۔ انسان جب پورا چکر مکمل (cycle) کر لے گا تو اس کی نظر میں پھر سے وحدت پیدا ہو جائے گی۔ پہلی یورپی تہذیب جس نے سائنس کی ترقی میں اہم ترین کردار ادا کیا تھا، یونان اور اس کے نواح میں، ۶۰۰ ق م میں پھلنے پھولنے والی تہذیب تھی۔ یونان کے بہت سے جرأت مند مفکر کائنات کو ایک واحد کلیت قرار دیتے تھے، انھیں آسمانی اور زمینی اجسام میں اور جان دار اور بے جان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ وحدانیت کی یہی اولین دریافت تھی، انسان کا یہی رویہ اور یہی نقطۂ نظر تھا جو فلسفے اور سائنس کے اس عظیم پھیلاؤ کا باعث بنا۔ اس نقطہ نظر کا اصرار یہ تھا کہ کم از کم سائنسی حدود میں وحدت اور ثبات حاصل کرنے کی کوشش ضرور کی جانی چاہیے۔ جدید سائنسی تلاش کا بھی یہ واحد مقصد نہیں تو کم از کم ایک بڑا مقصد ضرور ہے۔

اللہ کا سائنسی قانون ہی ایسی اعلا و ارفع ترکیب پیش کر سکتا ہے۔ اس قانون کو بدل دینے اور حقیقت کے فطری طرفین کو الٹ دینے کا نتیجہ ثنویت، انتشار، تنازع، تصادم، کشمکش، محاذ آرائی، بدنظمی اور مکمل بگاڑ کی صورت میں نکلتا ہے جو منقسم بصارت، بے ترتیب ادراک اور ناقص ردِعمل کی بنیاد بن جاتا ہے۔ انسان کی اندرونی بصیرت (باطن) کی دراڑ اس کے ظاہر میں بھی عیاں ہونے لگتی ہے۔ پھر یہ انسان کے گرد و پیش میں موجود حقیقت کے ادراک تک پھیلتی جاتی ہے۔ آخر کار اس منقسم رویے کو اپنانے سے انسان کا اپنے ظاہر کے بارے میں ادراک دھندلاتا چلا جاتا ہے۔ ایک منقسم آدمی کو ہر حقیقت متناقض معلوم ہوتی ہے۔ غیر فطری نفسیات (Abnormal Psychology) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی تضادات اور باطنی کشمکش انسان کے لیے کس قدر اذیت کا باعث بنتے ہیں، اور اعصابیت، ذہنی خلل، حتیٰ کہ نفسیاتی انتشار تک کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس بارے میں جاننے کے لیے ایک نظر *The Divided Self* نامی کتاب کو دیکھ لیجیے۔ مذہب اور سائنس، زندگی اور موت، مثالی اور حقیقی، اندرونی اور بیرونی، جو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہیں، تقسیم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ باطن ظاہر کا روپ دھار لیتا ہے اور ظاہر مساوی تعامل کے ذریعے انسان کے باطنی شعور کو تقسیم کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔ یوں ظاہر کی دوئی باطن کی دوئی میں تقسیم کا باعث بنتی ہے اور باطن کی دوئی ظاہر کی تقسیم کو مزید تقویت دیتی ہے۔ بس دونوں بٹ کر رہ جاتے ہیں۔ اندر (In) باہر (Out) نمایاں ہو جاتا ہے

Marfat.com

اور باہر (Out) پھر سے نہاں (In) ہو جاتا ہے۔ دیکھیے کہ علم نفسیات میں؛ جو انسانی ذہن کی سائنس ہے، کیسے کچھ چیزوں کو ظاہر میں لانے اور کچھ کو نہاں کر لینے کے عمل (process of introjection and projection) کے ذریعے انا کی تشکیل کی جاتی ہے۔ یہ انسان کی باہم مربوط حقیقت کا تناقض (paradox) اور اس کے منقسم ادراک (split perception) کا المیہ ہے۔ یکسو ہو کر تلاش کریں تو آپ پالیں گے، لیکن چوں کہ حقیقت درجہ وار ہوتی ہے اس لیے آپ صرف اتنا ہی پا سکتے ہیں، جتنا تلاش کرتے ہیں۔

بہر کیف ادراک کے آخری مرحلے پر حقیقت ثنویت ہے؛ انسان اور خدا، مرئی اور غیر مرئی۔ تو پھر اس بات پر کیا تعجب کہ فلسفہ ثنویت زدہ اشیا کی توضیح تو خوب کر لیتا ہے لیکن اس سے اوپر نہیں اٹھ سکتا۔ یہ مغربی فکر اور سائنس کی نمایاں ترین ناکامی رہی ہے جس نے ان کی مزید پیش رفت اور ترقی کا راستہ روک رکھا ہے۔ انسان اور خدا کی ثنویت اصل میں ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ نفی اور اثبات ناقابلِ تقسیم وحدت میں پیوست ہیں۔ یقیناً یہ وحدت کا بالکل پہلا قانون ہے۔ انسان کے لیے ایک نئے دور کا آغاز، عرش تک پرواز کرنے اور نئے آفاق کی سیر کا دور۔

اللہ کا سائنسی قانون واحد نقطۂ نظر ہے جو ہر سطح کی ثنویت کا مسئلہ حل کر دیتا ہے اور ایسا اصول فراہم کرتا ہے جس کا اطلاق یکساں طور پر حقیقت کی ہر سطح اور ہر تعبیر پر کیا جا سکتا ہے۔ یہ کلیت کا نقطۂ نظر (Whole point of view) ہے۔ دوسرے تمام تصورات، تمام نقطہ ہائے نظر، تمام اصول، تمام قانون، اللہ کی تخلیق میں پائی جانے والی ارتقائی حرکت کی وجہ سے، تغیر پذیر اور اس لیے ہمیشہ گردش میں رہتے ہیں۔

اب ہم اللہ کے اسماے حسنیٰ کی طرف پلٹتے ہیں۔ اللہ کی کئی صفات ایسی ہیں جن کا سائنسی اطلاق انسان کی جسمانی اور روحانی زندگی کے ہر شعبے میں ہو سکتا ہے۔

The Force	قوت	الجبار
The Strength, The Energy	طاقت، توانائی	القوی
The Constrictor	سکیڑنے والا	القابض
The Expander	پھیلانے والا، کھولنے والا	الباسط

Marfat.com

The Life	زندگی	المحی
The Death	موت	الممیت
The Animator	زندگی بخش	الحی
The Fixed, Stable, Self-sub sisting	قائم، مستحکم، خود مکتفی	القیوم
The Preceding, The Infinitesmal of Quantum Physics, the Begining of Everything	سب سے پہلے آنے والا، کوانٹم فزکس کی اصطلاح میں خردترین	المقدم
The First Principle, the Origin, The Foundation of Everything	پہلا، ماخذ، ہر چیز کی بنیاد	الاول
The Last Principle, The End, The Transcendental Reality, The Truth of Everything	آخری، انتہا، ماورائی حقیقت، ہر شے کی سچائی	الآخر
The Outer, The Manifest, The External Reality of Forms	بیرونی، عیاں، صورتوں کی خارجی حقیقت	الظاهر
The Inner, The Intangible, The Internal Reality, TheIntellect, The Psychic, Occult	اندرونی، غیر مرئی، باطنی حقیقت، دانش، نفس، عقیدہ	الباطن
The Divider, The Analyzer	تقسیم کرنے والا، تحلیل کرنے والا	المقسط
The Unity, The Collector, The Synthesis	اکٹھا، جمع کرنے والا، ترکیب دینے والا، جوڑنے والا	الجامع
The Profitble	فائدہ مند	النافع
The Distresser, The Loss	ضرر، نقصان	الضار
The Opener, The Innovator,The Pioneer	کھولنے والا، جدت پیدا کرنے والا، پیش قدمی کرنے والا	الفاتح
The Knowledgeable, The Omniscient	جاننے والا، ہمہ دان، عالم الغیب	العلیم

Marfat.com

اس معاملے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ کی صفات محض طبعی، حیاتیاتی اور جسمانی اصولوں میں تبدیل ہو کر رہ جائیں اور حقیقت میکانکی نوعیت کے قواعد و ضوابط کا مجموعہ بن جائے۔ اللہ غیر شخصی اور بے جان ساخت نہیں ہے۔ صفاتِ الٰہی وجودِ مطلق کی ایسی بے جان، میکانکی اور غیر انسانی تعبیر کی تصدیق نہیں کرتیں۔

خطرہ یہ ہے کہ کہیں کوئی ان صفاتِ الٰہی کو محض طبعی یا تجریدی اصول نہ سمجھ بیٹھے اور حقیقت کو دیکھنے کا بے معنی اور پست نقطۂ نظر قائم نہ کر لے جس کے مطابق اللہ کی صفات پھیلاؤ اور سکڑاؤ، تعمیر و تخریب، تحلیل و ترکیب، ظاہری و مخفی، نفع و نقصان جیسے طبعی اصولوں اور زندگی اور موت کی کیمیائی حقیقتوں تک محدود ہو کر رہ جائیں۔ جوں جوں اسماے حسنیٰ کو دہراتے جائیں، معلوم ہوتا جاتا ہے کہ ایسا تصور قائم کرنا درست نہیں۔ اللہ کو محض طبعی قوانین، مجرد اصولوں اور سائنسی قواعد و ضوابط کے مجموعے کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا، خواہ یہ مجموعہ کتنا ہی جامع اور آفاقی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی اسماے حسنیٰ میں اللہ کا کوئی ایسا نام آتا ہے جسے خالصتاً طبعی اور سائنسی اصول سمجھا جا سکتا ہے تو اس کے ساتھ ہی کسی ایسی صفت کا ذکر ضرور ملتا ہے جو اس کے زندہ، خود آگاہ، باشعور اور منفرد ہونے کا ثبوت پیش کر دیتی ہے۔

اسماے حسنیٰ کی ترتیب پر ایک نظر ڈالیے: القابض (The Constrictor) الباسط (The Expander)، الخافض (The Abaser)، الرافع (The Exalter)۔ ان صفات کے بعد السمیع (The All-Hearing)، البصیر (The All-Seeing) جیسی صفات کا بیان ہے۔ اسی طرح المبدی (The Source)، المعید (The Destiny)، المحی (The Principle of Life) اور الممیت (The Principle of Death) کے بعد الحی (The One who is Alive) اور القیوم (The One who is Self-Subsisting) آتے ہیں۔

اس حقیقت میں کہ اللہ ایک زندۂ جاوید (All-Living) ہستی ہے اور یہ کہ اللہ کلی شعور (Total Awareness) ہے، انسان کی سائنس کے لیے کئی اشارے پنہاں ہیں۔ اس بات سے اکثر یہ مطلب اخذ کیا جاتا ہے کہ سب اعلا و ارفع اشیا زندہ ہوں گی۔ ارتقا کی پیش رفت کے نتیجے میں اعلا سے اعلاتر

Marfat.com

زندگی، زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ شعور پیدا ہوتے رہنے چاہییں۔ ایسا المعید (وہ، جو ہر شے کو اس کے ماخذ کی طرف کھینچتا ہے) کی واپس کھینچنے والی قوت کے سبب ہوتا ہے۔ یوں خاک خاک کی طرف لوٹتی ہے اور روح روح کی طرف پلٹتی ہے۔ مستقبل میں ارتقا کے امکانات ورجحانات کے بارے میں ہم نہایت آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ دو ٹانگوں والے ممالیہ تک پہنچنے کے بعد انسانی ارتقا کا سفر رک نہیں گیا بلکہ ذہن کے نادیدہ مگر اعلاتر مدارج میں یہ عمل جاری و ساری ہے۔ لیکن ذہن ایک مزید اعلا تر درجے یعنی روح کا ایک وسطی مقام ہے۔ سائنس کے لیے اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمیں ایسے سائنسی علوم کو زیادہ اہمیت دینی چاہیے جس کا تعلق براہ راست زندگی سے ہے، اور ان میں بھی خاص طور پر وہ جو شعورِ انسانی کے ارتقا کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہمیں انسانیات (Humanities) اور طبعی علوم (Physical Sciences) کے درمیان موجود خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں بشریات (Anthropology)، نفسیات (Psychology)، ماورائی نفسیات (Parapsychology) اور طبعی، کیمیائی اور ریاضیاتی سائنس کی حالیہ پیش رفت کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ان علوم کے درمیان ربط باہم تلاش کرنے کی سعی کی جانی چاہیے۔ ان تمام علوم کو ہم آہنگ کرنے اور تجرباتی حقائق سے پیدا ہونے والے تمام تر سائنسی فرضیوں (Hypotheses) پر غور کرنے سے ہم ایک بالکل نئی سائنس تشکیل دینے کے قابل ہو جائیں گے۔ مستقبل کی اس سائنس کا نمایاں ترین رجحان کثیر العلومی (multi-disciplinary) اور مربوط و متحد (integrative) نوعیت کا ہوگا۔ سائنسی علوم کے درمیان موجود یہ حد بندیاں ختم ہو جائیں گی۔ تمام علوم آپس میں مل جائیں گے۔ سائنس دان زیادہ سے زیادہ یک جہتی پیدا کرنے والی اصطلاحات استعمال کریں گے۔ آنے والے برسوں میں سائنس ہمیں لامتناہیت (Infinite) کے ساحل پر لا کھڑا کرے گی، یہ مذہبی سچائیوں کی تصدیق کر دے گی جو ہر سائنس کا مرکزہ nucleus ہیں۔

اللہ کو محض ایک سائنسی قانون تک محدود کر دینا اور صرف طبعی اور مجرد اصولوں کی مدد سے اس کی تعبیر کرنا اللہ جیسی عظیم حقیقت کی سخت بے ادبی ہوگی۔ بلکہ اسے بے حرمتی (sacrilege) کہنا چاہیے۔ اللہ ایک بلند و بالا ہستی ہے، وہ زندہ ہے، ارفع و اعلا ہے اور اصولوں اور قوانین سے بالاتر ہے۔ اللہ انسان کے لیے ہمیشہ ایک ماورائی ہستی رہے گا لیکن اس کے باوجود وہ سائنسی اصول بھی ہے کیوں کہ وہ سب کچھ ہے۔

Marfat.com

اللہ ایک طبعی قانون کبھی نہیں بن سکتا کیوں کہ وہ غیر مرئی ہے۔لیکن اس کی مخلوق تو مرئی ہے۔اسی لیے اللہ ایک سائنسی قانون بھی ہے کیوں اس کی مخلوق اس کی ذات کا ایک حصہ ہے جو وحدت اور یکتائی کے اصول کے تحت اس کا جزو لاینفک ہے۔اعلاتر زندگی کے تمام مظاہر واحد ہیں اور منفرد بھی۔اسی لیے ہر انسان واحد اور منفرد ہوتا ہے۔یہ حقیقت اللہ کی صفات کی مظہر ہے جو عظیم ترین، منفرد اور یکتا ہے اور ہر انسان کی زندگی اس امر کی شہادت دیتی ہے۔

اللہ کا سائنسی قانون ارتقا کا اثبات کرتا ہے بلکہ اس کے اطلاق کا دائرۂ کار اللہ کی مخلوق کی ہر نوع، ہر قسم تک پھیلا دیتا ہے۔ماورائی اقلیم میں؛ جو ایک سرّی دنیا (عالمِ غیب) ہے اللہ کا فعل ''تخلیق'' ہے۔اصولِ متوازی معکوس کی رو سے اس مرئی دنیا (عالمِ شہادت) میں اس فعل کا عکس جو ہمیشہ الٹ ہوتا ہے، ''ارتقا'' کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔بلاشبہ ظاہری روپ فریب دیتا ہے۔کائنات سے لے کر زندگی تک، جسم سے لے کر ذہن تک اور شعور سے لے کر روح تک ایک مسلسل حرکت، ایک بہاؤ ہے جو جاری و ساری ہے۔۔۔ایک ہی سمفنی کے بتدریج ابھرتے ہوئے سروں کا دریا۔جسم سے روح تک ارتقا ایک ہی وحدت کا نام ہے۔بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ارتقا کے عمل کو اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ خیر و شر کی اخلاقی پرکھ کا ایک معروضی پیمانہ بھی فراہم کر دیتا ہے۔اس سے پہلے یہ پیمانہ معروضی نہیں، موضوعی تھا۔ارتقا کا عمل ہمیں ایک مستقل پیمانہ مہیا کرتا ہے؛ یعنی خیر صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں ہمیشگی اور باقی رہنے کی صلاحیت ہو۔اللہ کا سائنسی قانون یہ ثابت کرتا ہے کہ صرف وحدت ہی ہمیشہ باقی رہے گی۔سائنس میں اعلا سے اعلاتر وحدت سائنسی عمومیت یا سائنسی قانون (Scientific generalization or scientific law) کی صورت میں باقی رہتی ہے۔انسانی معاشروں میں بھی اعلا سے اعلاتر وحدت کا سفر جاری ہے اور اسی لیے ہم آج خود کو قومیت (nationalism) سے آگے نکل کر علاقائیت (regionalism) اور پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر عالمگیریت (universalism) کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔فلسفے میں بھی اعلاترین قضیہ صرف خدا ہے جو خیر مطلق ہے اور جو ہمیشہ باقی رہے گا۔انسان کے لیے اس میں ایک اہم پیغام ہے اور وہ یہ کہ وحدت کے قوانین سے ہم آہنگ ہو کر وہ اپنی زندگی کے واقعات کا رُخ بدل سکتا ہے۔خیر کی اصل حقیقت سمجھ لینے کے بعد انسان کے پاس دو راستے کھلے ہیں؛ یا تو اسے حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرے یا اس کے برخلاف عمل کر کے ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے۔بنی نوع انسان کو بس اتنا ہی اختیار حاصل رہا ہے۔یا تو وحدت پر ایمان لے آئے اور اصول

Marfat.com

وحدت پر عمل کر کے اپنی زندگی کے اعمال و افعال کو نیا رُخ دے دے یا اپنی روش پر بضد رہے یہاں تک کہ کوئی نئی لہر اسے بہا لے جائے اور یا پھر اس کی مخالفت کرے اور فنا ہو جانے کا انتظار کرے۔ یہ اعلاتر وحدت، یہ خیرِ مطلق فرد میں بھی پیدا کی جا سکتی ہے اور معاشرے میں بھی۔ یوں فرد اور معاشرے دونوں کو کل انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے۔ ایسا ہو جائے تو ایک عالمگیر، آفاقی اندازِ نظر پیدا ہو جائے گا اور یہ آفاقی نقطہ نظر آفاقی شعور بیدار کرنے کا سبب بن جائے گا۔

اس لاعلم، کم اصل، انا پرست انسان نے جو عداوت اور خود پرستی پر مبنی گروہوں میں تقسیم ہو چکا ہے، مذہب کے نام پر کئی جنگیں لڑی ہیں اور بہت سے جرائم کا مرتکب ہوا ہے۔ ہم ایسے تمام گناہوں کا الزام اللہ کو دیتے ہیں خواہ ان کے ذمہ دار کلیسا ہوں، مندر ہوں یا مسجد۔ بے شک ہر مذہب اپنی تعلیمات، اور بھلائی، اتحاد اور انصاف کے حوالے سے اپنے نقطۂ نظر میں عالم گیر (universal) ہوتا ہے۔ یہ عالمگیریت انسان کو اس کے ابتدائی قبائلی عہد میں ہی عطا ہو گئی تھی۔ عمل کرنا تو کجا، قبائلی تعصب کا مارا ہوا کوئی شخص اس کی اہمیت کو سمجھ بھی کیسے سکتا تھا۔ مذہب کے عظیم تصورات اس کے سامنے ایک آئیڈیل، ایک مثالی نمونے کے طور پر، وقت سے بہت پہلے پیش کر دیے گئے تھے تا کہ وہ ان تک پہنچنے کی کوشش کر سکے اور ان کی مدد سے اس دنیاوی زندگی میں ارتقا کا سفر جاری رکھ سکے۔ یہ مذہبی مقاصد، اصول، کلیے اور اخلاقیات ہمارے سماجی نظام میں، ہماری رسم و روایات میں، ہمارے

معاشرتی ڈھانچے میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ بیسویں صدی کے پہلے ربع تک انسان کچھ مخصوص اخلاقی تصورات اور سماجی ضابطوں میں ڈھل چکا تھا۔ سماجی ممانعت یا ترغیب کی قوت سے یہ اخلاقی اصول انسان کے غیر شعوری مقاصد اور اس کی تمناؤں میں تبدیل ہوتے گئے۔ انسان مذہبی سچائیوں کی حقیقی معنویت کو تو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن روایت کی قوت سے جذباتی طور پر ان سے وابستہ ہوتا چلا گیا۔ یوں مذہب اس وقت تک انسان کے تحفظ کا عظیم فریضہ ادا کرتا رہا جب تک انسانی عقل پختگی کی منزل کو نہیں پہنچ گئی۔ یہ انسان کے ذہنی ارتقا کے ابتدائی مراحل میں فطرت کی طرف سے اس کے تحفظ کا ایک بندوبست تھا۔ ذرا تصور کیجیے، اگر انجیل میں وضاحت سے کہہ دیا جاتا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے تو انسانی تاریخ کے اس غیر سائنسی دور میں کیا کوئی اس پر یقین کرتا؟ یہ سائنسی حقیقت اس وقت کے انسان کی ذہنی استعداد اور اس کے تجربے سے ماورا تھی۔ البتہ مذہبی رسوم و رواج اور ان کی اندھا دھند پیروی کے ذریعے فطرت اپنا فرض بخوبی ادا کرتی رہی اور انسان کو ارتقا کے

Marfat.com

مراحل سے گزار کر اس مقام تک لے آئی کہ وہ خود اس آدرش تک پہنچ سکے۔ اس دوران انسان کو اتنا وقت بھی مل گیا کہ وہ ایمان کی پوشیدہ حکمت سے آشنا ہو سکے اور خود اس آدرش کو ذہنی اور دانش ورانہ سطح پر سمجھ سکے۔ ایک لمحے کے لیے تصور کیجیے کہ اگر انسان ان رسوم و رواج کی زنجیروں سے اسی قبائلی دور میں آزاد ہو گیا ہوتا تو کیا وہ اس مقام تک کا سفر کر سکتا تھا جہاں آج ہم انسان کھڑے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ رسوم و رواج اور روایات اس کوتاہ نظر شخص کے لیے تھیں، جس کی انفرادیت، تشخص اور انا کی نشوونما ابھی قبیلے، قوم اور گروہ سے وابستہ تھی۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ یہ مجموعی روایات ایسے جبر کا باعث بنیں جس نے انسانی اختیار کو محدود کر دیا اور ذات اور انفرادیت کے اظہار کے مواقع بہت کم کر دیے۔ ان تمام صدیوں کے دوران انسان جبر کے پنجے میں قید رہا، چاہے یہ جبر کلیسا کا ہو، معاشرے کا ہو، والدین کا ہو یا ریاست کا۔ یقیناً یہ جبر کا عہد تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خیر اور تحفظ کا عہد بھی تھا۔ کچھ عجب نہیں کہ انسان ان دنوں آزاد نہیں تھا، کچھ عجب نہیں کہ کئی حریت پسند روحیں، شاعر اور ادیب اس جبر کے بوجھ تلے پستے اور کراہتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود جوں ہی انسان نے ذہنی پختگی اور بلوغت حاصل کر لی، تو یہ سارے رسوم و رواج کے بندھن، جن میں وہ اب تک ہنسی خوشی بندھا چلا آتا تھا، ٹوٹنے لگے۔ نشاۃ ثانیہ کے عہد میں عقل و خرد کا ایک دھارا بہ نکلا، فاصلے کم ہوتے گئے، رابطے بڑھتے گئے، تقابل و تحلیل کے ذریعے تہذیبیں ایک دوسرے کے بالمقابل آنے لگیں، انسان ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہونے لگے۔ سائنس، انسانی علم اور ٹیکنالوجی اور فطرت پر غلبہ پانے کی انسانی صلاحیت میں ایسی ترقی ہوئی جس کی اس سے پہلے کوئی نظیر نہیں ملتی۔ آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ انسان خود اپنی قوت سے اپنے مستقبل کی پیش بینی کر سکے۔ اب انسان طبعی قوتوں کا شکار نہیں رہا، تقدیر کے ہاتھ کا کھلونا نہیں رہا، بلکہ تقدیر کو سمجھنے اور اس کے قوانین کی تعبیر کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ اب انسان پختہ کار ہو چکا ہے۔

انسانی معاشرے کے ارتقائی عمل کا عکس ہمیں بچے کی نشوونما میں بھی نظر آتا ہے۔ بچے کی نشوونما کا ابتدائی مرحلہ والدین کے تحفظ پر انحصار کا ہے جس میں نئے نئے چیلنج قبول کرنے سے پروان چڑھنے اور بڑھنے کا عمل آگے بڑھتا ہے۔ ابتدائی مرحلہ جبر سہنے کا ہے اور پھر آہستہ آہستہ پختگی کے ساتھ ساتھ آزادی اور اختیار بھی ملنے لگتے ہیں۔ ہر قطرے میں دجلہ ہوتا ہے۔ حقیقت، ہر سطح پر ایک ہی نمونے کے مطابق ظاہر ہوتی ہے۔

ارتقا کا سفر ذہنی ترقی کی جانب ہے، اعلاتر استعداد کی طرف ہے، نسبتاً زیادہ آزادی اور زیادہ انفرادیت کی

Marfat.com

جانب ہے۔انفرادیت پسندی کی موجودہ صورت حال تبھی پیدا ہو سکتی تھی جب روایت پرست معاشرے کو اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کرنے کی مہلت مل چکی ہو۔فرد کو اپنی انفرادیت منوانے کی منزل تبھی مل سکتی تھی جب اس میں مناسب احساس ذمہ داری پیدا ہو چکا ہو اور وہ اس ذہنی پختگی کا حامل ہو چکا ہو کہ اپنے مستقبل کی راہوں کا تعین کر سکے۔تاہم انسانی معاشرہ یکساں رہتا ہے، نہ ارتقا کی راہ بنتا ہے۔اسی لیے جو فرد جبر کی اس منزل میں معاشرے کی راہ سے بھٹک جاتا تھا، اس کی حالت قابل رحم ہوتی۔اسے غلط سمجھا جاتا، جلاوطنی یا سماجی مقاطعے کی سزا بھگتنی پڑتی، اس پر بھروسہ نہیں کیا جاتا اور معاشرہ اسے کڑی سزا دیتا۔ایسے ناخوش و بیزار افرادان معاشرتی رسوم و رواج کو اپنی شخصی آزادی کی راہ میں رکاوٹ بننے والی بیڑیاں خیال کرتے تھے اور ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے رہے۔ایسے لوگوں نے اپنی شاعری اور ادب میں جان بوجھ کر، شعوری طور پر معاشرے کے خلاف افسانے گھڑے۔اسی طرح انفرادیت اور نویافتہ آزادی کے دور میں کچھ ایسی ڈھیلی ڈھالی، سست رو شخصیات بھی ملتی ہیں جو اسی پرانے جبرزدہ ماحول سے چمٹے رہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ایسی شخصیات کو بھی بالکل اسی طرح کے معاشرتی ردعمل کا سامنا کرنا پڑا جیسے قدیم روایتی معاشرے میں انفرادیت پسند افراد کو کرنا پڑتا تھا۔انھیں بھی اسی طرح غلط سمجھا جاتا رہا، رد کیا جاتا رہا اور زندگی کو ان کے لیے بے رحم اور ناقابلِ برداشت بنا دیا گیا۔صنعتی دور کے آغاز کی شاعری اور ادب اس حقیقت کے گواہ ہیں۔

ارتقا کی حرکت کا رُخ نسبتاً بے جان مشین سے شروع ہو کر ذہن اور مشین کے بلند سے بلند تر امتزاج کی جانب ہے۔ارتقا کا سارا زور ذہنی ترقی اور اعلا تر مجرد صلاحیتوں پر رہا ہے۔اس بیان کی صداقت کو ہم خود اپنے تجربات کی روشنی میں بھی پرکھ سکتے ہیں۔فقط چند صدیاں پہلے کی بات ہے کہ انسان جسمانی طاقت اور مضبوط عضلات کے دور میں جی رہا تھا، اعلاترین انعام واکرام کا سزاوار وہ شخص ہوتا تھا جو سب سے زیادہ بہادر اور جسمانی قوت کا مالک ہوتا۔جسمانی طاقت ہی اس دور میں فضیلت کا اصل معیار تھی۔مردانگی اور رکھ رکھاؤ انسان کی اعلیٰ ترین اقدار سمجھی جاتی تھیں۔جنگیں جسمانی طاقت کا مقابلہ ہوتی تھیں جن میں زیادہ جسمانی قوت کی مالک فوج جیت جاتی تھی۔آج یہ معیار بدل چکا ہے۔اب جسم کی بجائے ذہن کا دور ہے۔ہمارے معاصر ہیرو طاقت ور اجسام کے نہیں، عظیم ذہانت کے مالک ہوتے ہیں۔ہماری طاقت عضلات کی مضبوطی پر نہیں، ہماری قوتِ فکر، ہماری لذتِ ایجاد پر منحصر ہے۔ہماری جنگوں کا دارومدار ٹیکنالوجی کے استعمال پر ہے اور ہماری تہذیبی ترقی کا انحصار ہماری ذہنی استعداد پر ہے۔اور ان سب باتوں کے پس پشت ہمارے ذہن کی قوت کارفرما ہے۔

Marfat.com

ارتقا کا عمل ابھی جاری ہے۔ جسمانی سطح پر تو ممکن ہے کہ اس نے اپنی منزل حاصل کر لی ہو لیکن مشین سے ذہن کی سمت اس کا سفر ابھی جاری ہے۔ آج ارتقا کا مطلب ہے شعور کی وسعت اور انفرادی پختگی کا عمل۔ اس کی آخری منزل خدائی شعور (God Consciousness) ہے۔ یوں ڈارون کے اس ایمان کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے نظریات کی مدد سے خدائی احکامات کی پیروی کر رہا ہے۔ مطلق العنانیت ناکام ہو چکی ہے، زبردستی اور طاقت کی حکمرانی کا دور گزر چکا ہے۔ یہ انفرادیت کی فتح کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد انفرادیت اپنے لیے ایک متوازی زوج یعنی عالمگیریت (Universalism) کا عہد تشکیل دے گی۔ انسانی معاشرے کا ارتقا عالمگیریت کے دور کا متقاضی ہے۔ اسی طرح مثالیت پرستی (Idealism)، مادیت پرستی (Materialism) پر غالب آ جائے گی۔

مشین بھی حقیقت ہے اور ذہن بھی۔ ان دونوں کے وسطی درجے میں انسان آتا ہے جو مشین اور ذہن دونوں کا امتزاج ہے۔ لیکن ارتقا کے گزشتہ مرحلوں میں انسان نے خالصتاً مشین سے مشینی ذہن (*machine-mind*) تک کا سفر طے کیا ہے اور اب اس سے آگے بڑھ کر ذہنی مشین (*mind-machine*) کی طرف مائل بہ پرواز ہے۔ سب مشینیں فانی اور عارضی ہیں لیکن ذہن ابدی ہے۔ ذہن ہی تنازع اللبقا کی وہ بہترین (fittest) شے ہے جو باقی رہے گی۔ مشین ذہن کو پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ ہماری سائنس کی غلط فہمی اور حقیقت کا معکوس رُخ ہے۔ ذہن نے مشین بنائی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے تصورِ حقیقت کی تصحیح کر لیں۔ اگر ارتقا میں کوئی پیغام پوشیدہ ہے تو وہ یہی ہے کہ صرف ذہن ہی باقی رہنے والی بہترین (fittest) شے ہے۔ معلول علت ہے (effect is the cause) نہ کہ اس کے برعکس۔

زندگی کی جدوجہد مشین سے ذہن کی طرف سفر پر مشتمل ہے۔ لیکن ذہن حسیت (sensibility) کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا دل کی صفات، یعنی احساسات اپنائے بغیر ذہن بھی کچھ نہیں کیوں کہ ذہن بھی دوطرفہ (bi-polar) ہوتا ہے۔ حسنِ اتفاق سے یہ حقیقت، صدیوں پرانے اس نزاع کا حل بھی فراہم کر دیتی ہے جو میکانیت (mechanist) اور روحیت (vitalist) یا مثالیت (idealist) اور مادیت (materialist) کے پیروکاروں میں چلتا آیا ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق درست بھی ہیں اور غلط بھی۔ اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے فلسفیانہ مکاتب بھی ایک طرح کی فکری انواع

Marfat.com

(thought species) ہیں۔ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے عہد پر چھایا رہا، اسے متاثر کرتا رہا، آخر وقت کے ساتھ فنا کے گھاٹ اتر گیا اور اس کی جگہ کسی اور نظریے نے لے لی۔ تاریخ کے کسی ایک عہد میں مادیت پرستی کا رواج ہوگا، پھر ایسے فلسفے اس کی جگہ لے لیں گے جو مثالیت اور مادیت کے امتزاج پر مبنی ہوں گے۔ آہستہ آہستہ صرف مثالیت کی راہ ہموار ہوتی جائے گی اور آخر کار صرف یہی ایک اصول رہ جائے گا جو اس لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی حقیقت پر منطبق ہو سکے۔ یہاں تک کہ جیسے طبعی ارتقا مختلف مراحل پر مشتمل رہا ہے؛ مثلاً رینگنے والے جانوروں کا دور، ممالیہ جانوروں کا دور وغیرہ، اسی طرح انسانی ارتقا کو بھی مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، جیسے جسمانی قوت کا دور اور ذہن کا دور یا مادیت پرستی کا دور اور سرمایہ داری کا دور وغیرہ۔ لیکن سب سے آخر میں آتا ہے انسان دوستی، انسانیت اور عالمگیریت کا دور۔

جس طرح ذہن جسمانی ارتقا کا اعلاتر درجہ ہے، اسی طرح روح ذہنی ارتقا کا اعلاتر درجہ ہے اور تمام تر کائنات زندگی کے نچلے مدارج پر مشتمل ہے۔ تخلیق کے ایک مرحلے یا ارتقا کے ایک درجے پر جو سائنسی اصول منطبق ہوتے ہیں، وہ دیگر مدارج پر منطبق نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر حقیقت کی ایک سطح بے جان اشیا پر مشتمل ہے اور دوسری سطح جاندار انواع پر۔ ہر سطح اپنی جگہ پر منفرد و بے مثال ہے اور اس پر مختلف سائنسی اصطلاحات لاگو ہوتی ہیں جن کا تعین علم کے ایک مختلف اور مخصوص شعبہ کے تحت ہی کیا جاتا ہے۔ مسلسل تغیر اور یکتائی کا قانون اتنا مستقل ہے کہ تاریخ کے کسی ایک عہد میں وضع کردہ قواعد وضوابط، کسی اور زمانے اور عہد پر منطبق نہیں کیے جا سکتے۔ مثلاً طبعی سائنس کے قوانین، حرکت کے اصول، مادہ، توانائی وغیرہ جیسی اصطلاحات حیاتیاتی سائنس پر منطبق نہیں ہوتیں، بلکہ اس شعبے میں زندگی، علم الاعضا، حرکی نظریہ جیسی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ یہ اتنی ہی سادہ اور منطقی بات ہے جتنی یہ بات کہ جرمن زبان کی قواعد کے اصول چینی زبان پر لاگو نہیں ہو سکتے۔ کوئی سے دو تجربے، دو حقائق، دو پہلو، دو چہرے کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ اس بات نے سائنس اور فلسفے کو اتنا مایوس کر دیا کہ ان دونوں شعبوں میں اشیا و حوادث کی مطلق اور آفاقی تعبیر و توضیح پیش کرنے کی کوشش ہی ترک کر دی گئی۔ جان ڈیوی (John Dewey: ۱۸۵۹۔۱۹۵۲) جیسے جدید فلسفیوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ سچے فلسفے کو مطلق آغاز (First) وانجام (Last) کی تلاش ترک کر دینی چاہیے اور عملی، طبعی اور معاشرتی زندگی میں صرف مخصوص اور اضافی یا نسبتی اقدار (Specific and Relative Values) کا سراغ لگانا چاہیے۔ آغاز (Origin) اور انجام (Finality) کی تلاش فلسفہ واقعی ترک کر چکا ہے۔ اعلا وارفع امتزاج و ہم آہنگی سے

Marfat.com

رشتہ توڑ کر انسانی ذہن کو بنیادی اور اہم ترین سوالات سے ہمیشہ کے لیے بے نیاز اور اس کی تلاش وجستجو کو مذہبی سچائیوں سے بیگانہ کر دیا گیا ہے۔ جدید فلسفہ بھی جدید سائنس کی طرح ایک سازش ہے۔ یہ ہر اس چیز کو رد کر دیتا ہے جس کی تعبیر و توضیح سے قاصر رہے۔ مابعد الطبیعیات کو رد کر کے اس کی جگہ نچلے درجے کے عوامل؛ مثلاً معاشرے، سائنس، اثباتیت، تکثیریت اور عملیت پرستی کو اپنانا محض ایک دھوکہ ہے جو جدید فلسفہ خود اپنی بقا کے لیے انسان کو دے رہا ہے۔ فلسفہ اپنی کوتاہیاں اور کمزوریاں چھپانے کے لیے بنیادی سوالوں سے صرفِ نظر کر رہا ہے۔

نچلی سطح کی بنیاد پر بلند تر سطح کے بارے میں پیش گوئی کرنا ہمیشہ سودمند ثابت نہیں ہوتا حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ بنی نوع انسان کے معاملے میں بلند تر سطح نچلی سطح ہی کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔ انسانی ذہن انسانی جسم کی ارتقائی صورت ہے لیکن پھر بھی آپ علم الاعضا کے کلیے علمِ نفسیات میں استعمال نہیں کر سکتے کیوں کہ اعلا سطح ایک متغیر حقیقت (mutant) ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ارتقا کی بلند تر سطح ہے، وحدت کا اگلا درجہ ہے اور اس لیے منفرد و یکتا ہے۔

اسی طرح مقدم (اصولِ تقدیم) کا تعین مؤخر (اصولِ تاخیر) کی مدد سے نہیں کیا جا سکتا۔ کسی تسلسل (continuum) کا اوپر (up) کا مقام اس کے نیچے (down) کے مقام سے نہیں دیکھا اور سمجھا جا سکتا۔ یہ حقیقت سائنس کی دنیا بہت اہم ہے اور اس میں کئی مفاہیم اور اشارے پنہاں ہیں۔ اسی سے یہ اصول وضع ہوتا ہے کہ بلند تر حقیقت کو پست تر حقیقت کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ رینگنے والے جانوروں کا علم الابدان (anatomy) ممالیہ جانوروں پر صادق نہیں آتا کیوں کہ ممالیہ جانور ارتقا کے زینے کے بلند تر مقام پر فائز ہیں۔ اسی طرح عمر خیام کی روحانی شاعری کو مغرب کے مادیت زدہ نقطۂ نظر سے نہیں سمجھا جا سکتا جیسا کہ Fitzgerald کے ترجمے سے ثابت ہوتا ہے۔ روحانی حقیقتوں کو مادی مقاصد تک محدود کر دیا جائے تو سبھی اندازے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ ہم انسانی ذہن کو سراسر حیاتیاتی اصطلاحوں میں نہیں بیان کر سکتے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق انسان کو اگر محض جسم نہیں بھی قرار دیا گیا تو بھی اسے انسان نما جانور کی سطح تک ضرور گرا دیا گیا ہے۔ اعلا کو ادنیٰ کی مدد سے بیان کرنے کی کوشش میں انسان کو اس کی انسانیت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ یہی معاملہ اللہ کے ساتھ بھی روا رکھا جاتا ہے۔ اللہ جو بلند ترین اور مطلق ترین ہے، طبعی، سائنسی اور انسانی قوانین کی مدد سے

Marfat.com

نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اعلا کو ادنیٰ کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کرنا اس کی بے حرمتی کے مترادف ہے۔ اللہ یکتا ہے، وہ واحد ہے، وہ غیر مرئی ہے، وہ زندہ ہے، سب کچھ سننے والا ہے، سب کچھ دیکھنے والا ہے، وہ ہر چیز کو اپنے اندر سمو لینے والا ہے۔

اللہ غیر مرئی (Intangible) ہے مگر اس کی تخلیق صورت پذیر (tangible) ہے۔ خالق مخفی ہے، تخلیق عیاں ہے۔ اس لیے اللہ کے نام (صفات) اصل میں اس کی مخلوق کی صفات کے نام ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ نام اللہ کی مخلوق کی صفات، خصوصیات اور اوصاف ہیں اور اس لیے مرئی ہیں۔ اللہ کے سائنسی قانون کی مدد سے ان صفات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، تعین کیا جا سکتا ہے اور ان کی جانچ پرکھ کی جا سکتی ہے۔ لیکن خدا کی مخلوق اللہ کے سوا کچھ بھی نہیں کیوں کہ اس کی تمام تر مخلوق نفی (-) اور اثبات (+) کی وحدت میں اس کی ذات سے جڑی ہوئی ہے؛ جیسے لوہچون کسی طاقت ور مقناطیس سے اس طرح جڑ جاتا ہے کہ اس میں مقناطیس کی تمام صفات پیدا ہو جاتی ہیں لیکن پھر بھی لوہچون لوہچون رہتا ہے اور مقناطیس مقناطیس۔

انسان کو اللہ کے ساتھ جڑ جانے کے لیے، اس سے ربط قائم کرنے کے لیے، تمام انسانی اور مادی مظاہر کی نفی کرنا لازم ہے تا کہ وہ زندگی کی ہر سطح اور ہر مرحلے پر اللہ کا اثبات کر سکے۔ سائنسی اصطلاحات میں بات کی جائے تو انسان کو اللہ کے مثبت قطب (+) سے ملنے کے لیے خود اپنی ذات کو نفی (-) میں تبدیل کرنا لازم ہے۔ انسان اس باہمی تعامل میں مساوی طور پر شریک ہے۔ اس لیے انسان ایک مقناطیس کی طرح ہے جو کسی دوسرے مقناطیس سے جڑ کر ایک وحدت بنا لیتا ہے۔ مثبت (+) اور منفی (-) مل کر ایک وحدت تشکیل دیتے ہیں۔ لہٰذا اعلاتر ذات کا اثبات کرنے کے لیے خود اپنی ذات کی نفی کرنا ضروری ہے۔ اس نفی کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اپنی شناخت کھو بیٹھیں۔ اس سے مراد ہے انسان کی اللہ کے سامنے سائنسی تسلیم و سپردگی۔ یہ عمل متضاد کناروں کے درمیان موجود کشش کی توجیہ بھی پیش کرتا ہے یعنی متضاد طرفین (polarities) ایک دوسرے کی طرف اس لیے کھنچتے ہیں کیوں کہ دونوں کنارے اصل میں ایک ہی وحدت کا حصہ ہیں۔ اسی لیے مثبت اور منفی مل کر بجلی پیدا کرتے ہیں، ضرب اور تقسیم کے نتیجے میں اکائی حاصل ہوتی ہے، توانائی اور کمیت (mass) مل کر حقیقت کی تشکیل کرتے ہیں، مادہ اور موج مل جائیں تو روشنی پیدا ہوتی ہے، مثبت اور منفی مل جائیں تو تصویری عکس اتر آتا ہے، سورج اور چاند کے ملنے سے موسم بنتے ہیں اور مرد اور عورت کے ملنے سے زندگی جنم لیتی ہے۔

Marfat.com

نفئ ذات اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی ذات میں اپنی ذات کا اثبات اور اس کا ترفع ہو سکے۔ یہاں پھر وہی تناقض (paradox) نظر آتا ہے یعنی اپنی ذات کی اعلاتر سطح کے اثبات کے لیے اپنی ہی ذات کی نفی۔ نفی اصل میں اپنے آپ کو اپنی ہی متوازی مگر ارفع ذات سے وابستہ کر دینے کا ایک ذریعہ ہے اور اس کا راستہ ذاتِ مطلق کے سامنے اطاعت و سپردگی کا ہے۔ اسی لیے بنی نوع انسان کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے آپ کو ذاتِ مطلق سے ہم آہنگ کرنے کے لیے، عظیم تر انفرادیت، یکتائی اور آگاہی حاصل کرنے کے لیے اور اپنی شخصیت کو بھرپور بنانے کے لیے خود میں صفاتِ الٰہی پیدا کی جائیں۔ اللہ سے ہم آہنگ ہو کر اصل میں آپ خود اپنی ہی ذات کے عظیم تر پہلو سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ ذاتِ واحد کے سامنے تسلیم و سپرگی، کسی اور کی نہیں بلکہ خود اپنی ہی ذات کی اطاعت کا نام ہے۔ اطاعت کا اصل راز اور اصول یہی ہے۔ اس کے علاوہ ہر اطاعت تحقیر، تنزل، تذلیل، جبر، استبداد اور ظلم ہے اور اسی لیے قانونِ الٰہی میں ممنوع ہے۔

پس ہر نفی کسی اعلاتر سطح کے اثبات کے لیے ہونی چاہیے۔ یہی سائنسی اصول بھی ہے کہ نفی کسی اعلاتر کا اثبات ہے۔ یہ ادنیٰ سے انکار کا نام ہے تاکہ اعلا کا اقرار کیا جا سکے۔ ایسی نفی ترفع کا باعث بنتی ہے، اس کی جزا ملتی ہے اور یہ عظمت اور بڑائی کا باعث بنتی ہے۔ سچا صوفی کبھی اختلاف نہیں کرتا اور حقیقی دانش ور کبھی نزاع میں نہیں الجھتا۔ بڑی سچائیاں چھوٹی سچائیوں کی تصدیق کرتی ہیں، عظیم فلسفہ وہی ہے جو چھوٹے چھوٹے تمام نظریات کو ہم آہنگ کر دیتا ہے، بڑا قانون وہ ہوتا ہے جو سب قوانین کا مجموعہ ہو، اعلاترین سچائی وہی ہے جس میں سب چھوٹی چھوٹی سچائیاں مل جائیں، اور اسی اصول پر بلندترین مذہب وہی ہے جو دوسرے تمام مذاہب کا اثبات کرتا ہے۔

اللہ العلیم (All-Knowing) ہے لہٰذا اللہ کے قانونِ فطرت (Natural Law) کی اطاعت کرنا ہی اصل علم ہے۔ اطاعت ہی علم ہے۔ حقیقت کے بارے میں انسان کا علم اس کی اطاعت سے مشروط ہے اور ان دونوں میں تناسب راست (directly proportionate) ہے۔ جتنی زیادہ اطاعت، اتنی ہی علم کو سمونے اور جذب کرنے کی استعداد۔ عظیم چینی مفکر اور صاحبِ حال کنفیوشس نے کہا تھا، ''علم یہ جاننے کا نام ہے کہ تم کچھ نہیں جانتے''۔ اس کا یہ قول نفی اور اثبات کی تخلیق کی بہترین مثال ہے۔ تضادات کی باہمی ہم آہنگی کے بغیر نہ کوئی تخلیق ممکن ہے، نہ کوئی عظیم فلسفہ جنم لے سکتا ہے اور نہ سیاسی جمہوریت پھل پھول سکتی ہے۔

انسان کا علم اس کی اطاعت پر منحصر ہے۔ انسان اگرچہ باہمی تعامل میں مساوی ہیں، لیکن سبب (Cause)

Marfat.com

نہیں ہیں۔ہم خالق کے ساتھ تعامل میں مساوی شریک ضرور ہیں لیکن انسان کبھی اللہ کے مساوی نہیں ہو سکتے۔ اللہ ہمیشہ کے لیے بنی نوع انسان سے ماورا ہے۔اس لیے انسان کا علم کبھی بھی مطلق (absolute) کی حد کو نہیں چھو سکتا۔مطلق علم صرف الہامی ہو سکتا ہے۔صرف ایک مصدقہ الہامی صحیفہ ہی مطلق صداقت کا حامل ہو سکتا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ مطلق سچائی بھی موجود ہے اور اضافی سچائیاں (Truth and truths) بھی ہیں لیکن دونو ں ایک دوسرے کے ساتھ علت و معلول کے رشتے میں بندھی ہوئی ہیں۔ایک دوسرے کا ماخذ ہے جس کی طرف بالآخر اسے لوٹ جانا ہے۔لہٰذا تمام سچائیاں ایک ارتقائی راستے پر مطلق سچائی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ہر زندگی ایک ارتقائی راستے کا کوئی نہ کوئی مقام ہے جس کی منزل مطلق سچائی (الــحــق) ہے۔ایک حقیقت کا دوسری حقیقت سے فرق محض کم یا زیادہ سچائی کا ہے۔جو جھوٹ ہے وہ جھوٹ ہے اور اس لیے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔یہ بات انسانی علم کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہے۔اس کے تحت ہر زندگی، حقیقت کے ہر پہلو کا اثبات ہو جاتا ہے۔ہر حقیقت ایک پیمانہ ہے، سچائی کا ایک درجہ ہے لیکن اس کے باوجود یہ محض ایک سایہ (shade) ہے، کلی سچائی کے مکمل طیف (spectrum) پر ایک متغیر درجے (variable gradient) کا کوئی زاویہ ہے۔اس لیے مذہب اور سائنس دونوں سچائیاں ہیں۔لیکن ان میں سے ایک مقدم ہے اور دوسرا مؤخر۔دونوں مساوی تعامل کرتے ہیں لیکن ان میں سے ایک دوسرے کا ماخذ ہے، منبع ہے۔اصولِ مساوات مرکزے (nucleus) پر لاگو نہیں ہوتا۔یہ فزکس کا تصدیق شدہ قانون ہے جس کا اطلاق ہر میدان میں یکساں طور پر ہوتا ہے۔ لہٰذا مذہبی سچائی ہر متغیر سائنسی حقیقت کا ناقابلِ تغیر مرکزہ ہے۔یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے تسلسل پر بقائے باہمی کے تحت موجود ہیں۔اب سائنس کا فرض ہے کہ اپنی نوخیز عمر سے آگے بڑھ کر پختگی کی منزل کو پہنچے اور اعلا وارفع مذہبی سچائیوں تک رسائی حاصل کرے۔

ح اور جان لیں، اعلیٰ کردار اختیار کریں اور آخر کار حاصل (attain) کرلیں۔

حقیقت ہمیشہ قابلِ تغیر رہتی ہے۔یہ تغیر کے ایک مستقل عمل کا نام ہے لیکن اس عمل کے ہر مرحلے، ہر درجے پر، حقیقت کے ہر مظہر میں، انسان پر اللہ کی تلاش لازم ہے۔یہ تناقض (تخلیق) کہ اس سفر میں رد کیسے کیا جائے صرف اس صورت میں قابلِ قبول ہو سکتا ہے کہ جب ظاہری تغیر کے باطن میں کوئی ٹھہراؤ، کوئی استقلال، کوئی دوام موجود ہو۔جب تغیر پذیر عوامل میں کسی آفاقی عالمگیر ہستی کی موجودگی کا یقین ہو جائے تو یہ تناقض حل ہو جاتا ہے۔اللہ کی وحدت، صورتوں کی اس دنیا کے بہاؤ میں، روپ بہروپ کے اس فریب میں، اعلا سے اعلاتر

Marfat.com

قوانین، بلند سے بلند تر اصولوں، ارفع تر نظام، بہتر ترتیب و تنظیم اور ایک مستقل جوہر کی متقاضی ہے۔ اللہ کا سائنسی قانون ہر سائنس اور ہر فلسفے کی تصدیق کرتا ہے۔ سائنس اور فلسفے کی سچائی قائم رہے گی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ سچائیاں ایک عظیم تر سچائی یعنی مذہب کا جزو بن جائیں گی۔ انسان کی جستجو اس کے بعد بھی جاری رہے گی اور پھر وہ تخلیق کی غیر مرئی اقلیم کی بادیہ پیمائی میں مصروف ہو جائے گا۔

انسان اللہ سے پیوست ہے۔ جیسے کوئی نوزائیدہ بچہ اپنی ماں سے جڑا ہوتا ہے یا پھر جیسے زمین علت و تعلیل کی وحدت میں سورج سے جڑی ہوئی ہے۔ سورج نہ ہو تو زمین بھی نہیں ہوگی۔ لیکن زمین کے برخلاف انسان کے پاس ارادے اور اختیار کی قوت بھی ہے اور شعور بھی۔ وہ ارتقا کا اعلاترین مظہر ہے، اللہ کی تخلیق کا جھومر ہے۔ انسان کے پاس اللہ کے مساوی تعامل کی صلاحیت ہے لیکن مؤخر پہلو کی صورت۔ یہی انسانی حقوق میں مساوات کی دلیل ہے اور یہی اس کا منبع۔ لہٰذا اللہ کا پہلا قانون، پہلا کلمہ لا الٰہ (-) الا اللّٰہ (+) انسان اور خدا میں اس مساوات کا شعوری اور ارادی اثبات ہے۔ تمام بلند تر مناصب پر فائز ہونے سے پہلے ایک ارادی حلف اٹھانا پڑتا ہے۔۔۔ ایک شعوری عہد کرنا پڑتا ہے۔ کسی وزیر اعظم یا چیف جسٹس کی تقریبِ حلف برداری ان کے عہدوں کی ذمہ داریوں اور تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کا شعوری اقرار ہوتا ہے۔ انسان بھی اللہ کا مساوی نائب ہے اور اس کی اعلاتر مدارج تک ترقی بھی اس کی شعوری اور ارادی وابستگی پر منحصر ہے۔ اختیار انسان کے پاس ہے۔ یہی ہماری آزادی ہے۔ قانون اللہ کا ہے، یہی ہماری پہلے سے متعین تقدیر ہے۔

چوں کہ اللہ انسان کے وجود کا سبب، اس کی علت ہے اور اس کی ذات کا جوہر، اس کا عطر ہے، اس لیے اللہ کی شعوری اطاعت خود اپنی ہی اطاعت کے مترادف ہے۔ یہی اطاعت کا اصل اصول ہے۔ خود اپنی اطاعت کرتے ہوئے انسان ہر ایک کی اطاعت کرتا ہے لیکن پھر بھی اپنے سوا کسی کی اطاعت نہیں کرتا۔ روسو کے سماجی معاہدے (social contract theory) کی رو سے یہی جدید سیاسی ریاست کی بنیاد بھی ہے۔

تسلیم و سپردگی میں جبر نہیں ہو سکتا۔ وصال میں بھی جبر نہیں ہوتا۔ تمام جبری ملاپ ناپاک ہوتے ہیں۔ یہی قانون ہے اور اسی لیے ہر وصال، ہر اتحاد کے لیے شعوری اور اختیاری اجازت کی ضرورت ہوتی ہے؛ خواہ یہ شادی ہو، کسی کارپوریشن کے ملازم کا معاہدۂ ملازمت ہو، فرد اور ریاست کے درمیان کوئی عہد ہو (سیاست) یا خدا اور انسان کے درمیان کوئی رشتہ (مذہب) ہو۔ یہی حقوق کی آزادی (freedom of rights) کا

Marfat.com

منبع ہے۔

اس کائنات کی ہر چیز، ہر حقیقت اللہ کی صفات کا مظہر ہے۔ ہر تخلیق کی فطرت اللہ کے افعال کا اظہار ہے۔ اللہ کی صفات اور اس کے افعال انسان کے لیے اور ہر اس مخلوق کے لیے اللہ کا پیغام ہیں، جو خود اپنے وجود کا کوئی عظیم مقصد تلاش کرنا چاہتی ہے۔ باقی سب کے لیے حقیقت اپنے تحیر انگیز تنوع کے ساتھ اللہ اور اس کی صفات کا اظہار ہے۔

اللہ کی صفات اور اس کے افعال دراصل حقیقت کے ہر درجے میں مخفی منطق ہیں۔ یہ منطق انسان سے تقاضا کر رہی ہے کہ اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے، اس کی تفہیم و توضیح کی جائے، اور عقل و استدلال کی مدد سے اپنے خالق کی فطرت سے آگہی حاصل کی جائے۔ علم کا مقصد (import of knowledge) بس یہی ہے۔ اس طرح حاصل ہونے والا علم (علمِ نافع) انسان کے فائدے اور اس کی خود شناسی اور تکمیل کے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال میں آتا ہے۔ انسان کو تخلیق کر کے اور اسے ایسی ذہنی و عقلی صلاحیتوں سے نواز کر، جو انسان کے فکر و عمل کی رہبری کرتی ہیں، اللہ کے لیے، خود کو انسان کی ذہنی و عقلی صلاحیتوں سے بالاتر رکھنا، قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک ناقابلِ فہم خدا، جسے نہ دیکھا جا سکے، نہ جانا جا سکے، جو غیر منطقی ہو، اندھے عقیدوں کا مرکز ہو، اس ذہین مخلوق کا خدا نہیں ہو سکتا جسے انسان کہتے ہیں۔

متوازی فکر:
Parallel Thinking

ڈاکٹر ایڈورڈ ڈی بونو (Dr Edward de Bono) سوچنے کی تکنیک (thinking skills) سکھانے والے اساتذہ میں بہت ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ وہ آکسفورڈ، کیمبرج اور ہارورڈ میں پڑھا چکے ہیں۔ ان کی کتاب "*Parallel Thinking*" ۱۹۹۴ میں شائع ہوئی تھی جو تخلیقی سوچ کی عمدہ اور عملی رہنما کتاب ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر بونو کا خیال ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ مچھلی پکڑنے کے آلات میں تو کافی بہتری آ گئی ہے لیکن ہماری سوچ کے آلات ابھی تک وہی ہیں جو ڈھائی ہزار سال پہلے یونانیوں نے ڈھالے تھے۔ مغربی فکر نے ہمیشہ تنقیدی سوچ کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ لیکن وہ خود ذاتی طور پر تعمیری سوچ کو زیادہ ارفع سمجھتا ہے اور تخلیقی سوچ کو تو اس سے بھی اعلا قرار دیتا ہے۔ ڈاکٹر بونو کے مطابق تنقیدی فکر بالکل

Marfat.com

نامناسب سی شے ہے لہٰذا ہم سب کو تنقیدی فکر سے متاثر ہونے کی عادت کم کر دینی چاہیے۔ تنقیدی فکر کے نتیجے میں نئے خیالات و تصورات کے ابھرنے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کسی نئے خیال کو پرکھنے کے لیے کوئی نیا معنوی تناظر (paradigm) ضروری ہو اور پرانے نقطۂ نظر کے تحت اسے سمجھنا ممکن نہ ہو۔ اس لیے وہ متوازی سوچ (parallel thinking) کے عمل کی حمایت کرتا ہے جو دراصل نئے امکانات کی تلاش کا ایک ذریعہ ہے۔ متوازی سوچ کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ مختلف خیالات کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ قبول کر لیا جائے، ان کے درمیان کسی قسم کا تصادم، آزمائش، بحث یا جھگڑا اٹھائے بغیر۔ اس کے ہاں موضوع کی دریافت کی پرخلوص کوشش کو تنقید پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ گاف کھیلنے سے مشابہ ہے جس میں ہر شاٹ کے لیے مختلف اسٹک کی ضرورت ہوتی ہے۔ محض مخالفت کرتے رہنا ہی کافی نہیں ہوتا، ہمیں تعمیری انداز میں سوچنے اور تعمیری سوچ کی عادت اپنانے کی ضرورت ہے۔

مباحثے کے انداز میں سوچنے کا انداز مغربی معاشروں میں ایک لعنت بن چکا ہے پھر بھی اس طریق کار کو یہاں اتنی اہمیت دی جاتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر سوال کے دو رُخ ہونے چاہییں، یعنی دعوے (thesis) اور جواب دعوے (anti-thesis) کے درمیان کشمکش ہو۔ ٹیلی ویژن والے خاص طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک مباحثے کے دوران تصادم اور محاذ آرائی کی کیفیت پیدا نہ ہو، دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی۔ حالاں کہ اسی وقت کو موضوع کے مختلف امکانات کی دریافت میں زیادہ بہتر طور پر صرف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب کوئی ایک بار اس جنگ میں شریک ہو جاتا ہے تو انا اور فتح و شکست کا معاملہ موضوع اور اس کی تفہیم سے کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ بحث مباحثے سے صرف چالاکی پیدا ہوتی ہے بصیرت نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ بحث مباحثے کی یہ عادت مسیحی کلیسا کے مفکروں نے ملحدوں اور کافروں سے مناظرے کے لیے اپنا لی۔ لہٰذا ڈاکٹر بونو کے الفاظ میں متوازی طرزِ فکر کی اصطلاح اس کے لغوی معانی میں ہی استعمال ہوتی ہے۔ یعنی آپ کسی پرانے خیال کے متوازی اور اس کے ساتھ ساتھ کوئی نیا خیال متعارف کروائیں اور دونوں کے ایک ساتھ قائم رہنے کی گنجائش پیدا کریں۔ آپ لوگوں کو یہ اختیار دے سکتے ہیں کہ وہ ان میں سے جسے چاہیں چن لیں۔ اگر نیا خیال واقعی قابلِ قدر ہو گا تو وقت کے ساتھ ساتھ وہ قوت پکڑتا جائے گا۔ لیکن یہ سادہ سی ترکیب عملی طور پر تقریباً ناممکن لگتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ دونوں خیال یا طریقے بیک وقت درست نہیں ہو سکتے: ان میں سے ایک کو درست ہونا چاہیے اور دوسرے کو غلط۔ ہم یہ قبول کرنے کو تیار نہیں کہ سچائی کثیر الپہلو، کثیر سطحی اور کثیر جہتی بھی ہو

Marfat.com

سکتی ہے کیوں کہ ''ایک'' کئی ہے۔ ''ایک'' وہ حرکی، زندہ، توانا کُل ہے جو ہر تقسیم، ہر انتشار کو ختم کر دیتا ہے۔ حقیقت کثیر جہتی ہوتی ہے۔ اسے دیکھنے کے اتنے بہت سے نقطۂ نظر ہو سکتے ہیں کہ کوئی ایک نقطۂ نظر اسے پوری طرح بیان نہیں کر سکتا۔ کسی عام سی چیز کو لیں مثلاً ایک گھر کو سہ ابعادی (three dimensions) صورت میں دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسے دیکھنے کے کتنے زاویے ہو سکتے ہیں۔ اللہ تو ایک پیچیدہ ترین حقیقت ہے جسے دیکھنے کے ان گنت زاویے اور نقطۂ نظر ہیں۔ مذہب بھی اس سائنسی حقیقت سے مستثنیٰ نہیں۔ ہم چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے مختلف طریقے تلاش کر سکتے ہیں اور انھیں ساتھ ساتھ رکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ یہی متوازی فکر (parallel thinking) کا خلاصہ ہے۔ ایک طریق علاج کسی ایک مرض کے لیے مفید ہو سکتا ہے مگر کسی دوسرے مرض کے لیے انتہائی ضرر رساں ثابت ہو سکتا ہے۔ مشرق کے حکیم اور ماہرین طب اس حقیقت سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔ کائنات میں، درجات اور سطحوں پر مشتمل کئی کائناتیں ہیں جن کی ہر شے زمان و مکان اور مقامات و منازل سے متعلق ہے۔ لہٰذا اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ زیادہ پیچیدہ سطح پر ہمیں پورے کُلی نظام کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر بونو کے مطابق ایک زیادہ تعمیری طریقہ یہ ہے کہ ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد نقطہ ہائے نظر کو ساتھ ساتھ قائم رہنے کی اجازت دے دی جائے

اور پھر آگے بڑھنے کا امکان دریافت کیا جائے۔ جب کسی نظام کو اس کے جزوی عناصر میں تقسیم کر کے دیکھا جائے تو انسان اس کا کلی تعامل (holistic interaction) دیکھنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

بلاشبہ سائنس انسانیت کی عالمگیر زبان ہے۔ سائنس ایک اجماع ہے؛ یعنی حقیقت کی وہ بنیاد جس پر سب متفق ہوں۔ لیکن اس کے باوجود سب سے اہم بات یہ ہے کہ انتشار اور ثنویت سے آگے نکل کر کلیت (Wholeness) سے ہم آہنگ ہونے کی اہمیت تسلیم کی جائے۔ حقیقت گروہ بندی اور تقسیم (classification) کو رد کرتی ہے۔ یہ ایک حرکی قوت ہے۔ یہ زندہ شے ہے اور تقسیم و تفریق (categorization) کو رد کرتی ہے۔ تقسیم و گروہ بندی ایک انسانی فعل ہے جو آسانی کے لیے سرانجام دیا جاتا ہے اور جس کا کوئی حقیقی وجود ہے اور نہ اسے ہمیشگی حاصل ہے۔

بدقسمتی سے بہت سے سائنس دان یہ سمجھتے ہی کہ سائنس کا تعلق صرف گروہ بندی (classification) سے ہے لہٰذا گروہوں، جماعتوں، درجوں، فرقوں سے غیر معمولی لگاؤ محسوس کرتے ہیں۔ پراکرتیس

Marfat.com

(Procrustes) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس اپنے مہمانوں کے لیے صرف ایک پلنگ تھا۔ پراکرسٹیس یونانی دیومالا کا ایک قزاق ہے جو اپنے شکار کو اپنے پلنگ کے سائز کے مطابق کرنے کے لیے اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیتا یا انھیں کھینچ کھانچ کر لمبا کر دیتا تھا۔ جب کوئی مہمان بہت لمبا یا بہت چھوٹا ہوتا تو وہ اسے اپنے پلنگ پر سلانے کے لیے اس کی کتر بیونت کر دیا کرتا۔ مختلف اشیا یا خیالات کو گروہوں میں تقسیم کرنے میں بھی سب سے بڑا خطرہ یہی ہوتا ہے۔

نیا معنوی تناظر پرانے معنوی تناظر میں نہیں سما سکتا۔ مثال کے طور پر اس زیرِ نظر تصنیف کو کس خانے میں رکھا جائے گا، مذہب، علم کلام، مابعد الطبیعیات، فلسفہ، سائنس، نفسیات یا لوک ورثہ؟ کہن (Kuhn) جس نے سائنسی انقلابات پر بہت کچھ لکھا ہے، سائنسی انقلاب کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ سائنسی نقطۂ نظر میں بنیادی تبدیلی کا نام ہے جو پہلے سے موجود خیالات کے مجموعے کو رد کر کے بالکل نیا مجموعۂ خیالات ترتیب دیتا ہے۔ اس کی مثال علم فلکیات میں کوپرنیکس (Copernicus) کا نظریہ ہے جس نے زمین کے ساکن اور کائنات کا مرکز ہونے کے نظریے کو بالکل غلط ثابت کر دیا۔ اسی طرح آئن اسٹائن نے طبیعیات میں نیوٹن کے اس تصور کو باطل قرار دے دیا کہ حقیقت مکینکی نوعیت کی ہوتی ہے۔ حیاتیات میں ڈارون کے انقلابی تصور نے یہ خیال عام کیا کہ شعور ارتقا کے زینے کی ارفع تر منزل ہے۔ ہر سائنسی انقلاب کسی نہ کسی تصوراتی مفروضے (theoretical assumption) پر بنیاد رکھتا ہے۔ لہٰذا نیا نقطۂ نظر اختیار کرنے کے لیے کسی نئے سائنسی مفروضے پر ایمان لانا ضروری ہے۔ انھی بنیادی خیالی مفروضوں کے مجموعے کو سائنسی برادری کے تمام ارکان نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ اس پر متفق بھی ہو جاتے ہیں۔ مستقبل سائنس کو فطری سائنس کے طور پر ترقی کرنے کے لیے نئے نقطۂ نظر کو قبول کرنا ہوگا۔ یہ قبولیت کہن (Kuhn) کے نزدیک تبدیلیِ مذہب سے مشابہ ہے جسے جبراً نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شکست انا کے مترادف ہے کیوں کہ یہ آپ کی انا کا پہلا سانچہ توڑ دیتی ہے اور آپ کی آگہی کو ایک نئی سطح پر لے جاتی ہے۔ تمام سائنسی انقلابات شکست انا کا باعث بنتے ہیں اور اسی لیے تاریخ میں ہمیشہ انھیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تاہم انسانی انا کی پرورش اور اس کے شعور کی توسیع بھی انھی سائنسی انقلابات کی مرہونِ منت ہے جو ابتدا میں انا کی توڑ پھوڑ کا باعث بنتے ہیں۔ تو پھر کیا تعجب کہ تمام مذاہب ہر قسم کی انا پرستی کے مخالف ہوتے ہیں اور انا پرستی کو انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ خیال کرتے ہیں، خواہ یہ انا ذات سے متعلق ہو یا خاندان، قبیلے، گروہ، فرقے، قوم، مذہب یا کسی سائنسی نقطۂ نظر سے متعلق ہو

Marfat.com

اللہ الجامع ہے:
Allah is Al-Jamay

آخر میں میں ایک مرتبہ پھر یہ دہرانا چاہتا ہوں کہ اللہ الجامع ہے یعنی وہ ہر شے کو اکٹھا کر دیتا ہے، وہ کلیت ہے جو ہر شے کو آپس میں جوڑ دیتی ہے۔ اللہ سب سے آخری امتزاج (synthesis) ہے، کل ہے جو جز کو معنویت عطا کرتا ہے۔ ہماری ہفتہ وار نماز جمعہ جس مسجد میں ادا کی جاتی ہے اسے جامع مسجد کہتے ہیں یعنی وہ جگہ جہاں سب جمع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح گرجوں میں ہونے والے ہفتہ وار اجتماع انسان کو اللہ کی جامعیت کی صفت یاد دلاتے ہیں۔ یعنی اللہ کی یہ صفت ہے کہ وہ ہر شے کو جمع کرتا ہے، اکٹھا کرتا ہے، جوڑ دیتا ہے اور ایک واحد قوت میں بدل دیتا ہے۔

اللہ کی یہ اعلا صفت یعنی جامعیت سائنس اور فلسفے کے لیے بہت گہری معنویت کی حامل ہے۔ اللہ وحدت کا نقطہ ہے۔ اللہ کو اس کی جامعیت میں سمجھنے کی کوشش ہی سائنس اور انسانیات، ایمان اور استدلال کے درمیان موجود یہ خلیج پاٹ سکتی ہے۔ اللہ ہی وہ واحد اور یکتا آئیڈیل، وہ آدرش ہے جو پوری بنی نوع انسان کو تمام اختلافات اور انحرافات سے بالاتر ہو کر ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے۔ یہ کل (Whole) کی ایک بے مثال خصوصیت ہے جو اس کے اجزا (parts) میں نہیں ملتی۔ جیسا کہ امریکی ماہر طبیعیات اور فلسفی فریجوف کیپرا (Fritjof Capra) نے کہا ہے کہ شکر کا ذائقہ نہ تو کاربن میں ملتا ہے، نہ ہائیڈروجن میں نہ آکسیجن کے ایٹموں میں۔ حالاں کہ یہی شکر کے اجزا ہیں۔ یہ ذائقہ تو صرف شکر ہی میں مل سکتا ہے جو ان سب کا مجموعہ، ان سب کا کُل ہے۔

Marfat.com

حوالہ جات

مصنفین اور کُتب

Marfat.com

Marfat.com

مصنفین اور کتب جن کے حوالہ جات اس کتاب میں دیے گیے ہیں

باب 1
اللہ کی سائنس: تشریح وتوضیح
EXPLAINING THE SCIENCE OF ALLAH

بوہر، نیلز ہنرک ڈیوڈ (Bohr, Niels Henrik David) ...... (1962-1885) ڈینش طبیعات دان اور نوبیل انعام یافتہ، جس نے نیوکلیئر فزکس (جوہری طبیعات) اور ایٹمی ساخت کی تفہیم میں خاطر خواہ حصہ ڈالا۔ کوپن ہیگن میں فزیالوجی کے ایک پروفیسر کے ہاں پیدا ہوا اور کوپن ہیگن یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ 1911ء میں ڈاکٹریٹ کے بعد وہ کیمبرج انگلینڈ میں سر جوزف جان تھامسن کے پاس نیوکلیئر فزکس پڑھنے گیا، لیکن جلد ہی مانچسٹر منتقل ہو کر ایک اور طبیعات دان ارنسٹ ردرفورڈ کے ساتھ کام کرنے لگا۔ ایٹمی ساخت کے متعلق بوہر کی تھیوری 1913ء اور 1915ء کے درمیان اخبارات میں شائع ہوئی۔ 1922ء میں اسے اس تھیوری کی بنیاد پر نوبیل انعام برائے طبیعات ملا۔ 1916ء میں بوہر واپس کوپن ہیگن یونیورسٹی میں پڑھانے لگا اور 20ء میں یونیورسٹی کے نئے قائم کیے گئے انسٹی ٹیوٹ فار تھیوریٹکل فزکس کا ڈائریکٹر بنا۔ 1939ء میں اس نے جرمن سائنس دانوں اوٹو ہاہن اور فرٹز سٹراسمان کے انشقاقی (Fission) تجربات کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ بعد میں اس نے ثابت کیا کہ یورینیم 235- یورینیم کا مخصوص آئسوٹوپ ہے جو نیوکلیئر فشن کے عمل سے گزرتا ہے۔ تب بوہر ڈنمارک آیا اور ملک پر جرمن قبضے کے باعث 40ء تک وہیں رہنے پر مجبور ہوا۔ آخر کار وہ سویڈن اور پھر انگلینڈ سے ہوتا ہوا امریکہ پہنچا جہاں پہلا ایٹم بم بنانے کی کوششوں میں حصہ ڈالا۔ تاہم، اس نے منصوبے کو قطعی طور پر خفیہ رکھنے کی مخالفت کی اور اس نئی ترقی کے نتائج سے خوف کا اظہار کیا۔ وہ بین الاقوامی کنٹرول کا حامی تھی۔ اس نے 55ء میں جنیوا کے مقام پر پہلی ''ایٹمز فار پیس کانفرنس'' منعقد کی اور دو سال بعد ایٹمز فار پیس ایوارڈ حاصل کیا۔

کیکیولے، فریڈرک (Kekule, Friedrich August)...... (1896-1829) جرمن نامیاتی کیمیا

Marfat.com

دان۔ وہ 1850ء کی دہائی سے لے کر اپنی وفات تک یورپ میں ممتاز ترین کیمیا دانوں میں شمار ہوتا رہا، بالخصوص تھیوریٹیکل کیمیا کے حوالے سے۔ کیمیائی سٹرکچر کی تھیوری کی بنیاد رکھنے میں اس کا کردار اساسی نوعیت کا تھا۔

ثنویت (dualism) ...... یا ثنائیت۔ فلسفہ میں یہ تھیوری کہ کائنات کو دو ممیّز اور لازم وملزوم عناصر پر مشتمل ہونے کے حوالے سے ہی بیان کیا جا سکتا ہے۔ افلاطونی فلسفہ میں مطلق ثنویت ''ہست'' اور ''عدم'' کے درمیان ہے...... یعنی اعیان اور مادہ۔ سترہویں صدی میں ثنویت نے دو بنیادی جواہر میں یقین کی صورت اختیار کی: ذہن اور مادہ۔ فرانسیسی فلسفی رینے ڈیکارٹ کی جانب سے کائنات کی پیش کردہ تفسیر اس نظریے کی مثال ہے۔ اس نے جوہر (ذہن) اور توسیع شدہ جوہر (مادہ) کے درمیان ناقابل مفاہمت فرق پر زور دیا۔ اس نکتۂ نظر کی پیدا کردہ مشکل ذہن اور مادے کے باہمی تعلق (انسانی تجربہ میں) کی وضاحت کرنا تھی۔ اس الجھن کے باعث کچھ کارتیسیوں نے دونوں کے درمیان کوئی بھی تعلق موجود ہونے سے انکار کیا۔ انہوں نے زور دیا کہ ذہن اور مادہ خلقی طور پر ایک دوسرے کو متاثر کرنے کے قابل نہیں، اور یہ کہ دونوں کے درمیان کسی بھی باہم دگر عمل کی علت خدا ہے۔ ڈیکارٹ کے دیگر پیروکاروں نے ثنویت چھوڑ کر وحدانیت کو اپنا لیا۔ بیسویں صدی میں فلسفۂ عینیت کے وحدانی پہلوؤں کے خلاف ردعمل نے کچھ حد تک ثنویت کو بحال کیا۔ مثلاً اینگلو امریکی ماہر نفسیات ولیم مک ڈوگل نے کائنات کو روح اور مادے میں تقسیم کیا اور کہا کہ نفسیاتی کے ساتھ ساتھ حیاتیاتی شہادت بھی فزیالوجیکل عوام کی روحانی بنیاد کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں نے بھی اپنے عظیم فلسفیانہ تصنیف ''Matter and Memory'' میں ثنوی نکتۂ نظر اختیار کرتے ہوئے مادے اور ذہن میں فرق کیا۔ اخلاقیات میں ثنویت خیر اور شر کے خود مختار اور مخالف اصولوں کو بیان کرتا ہے۔ زرتشت مت اور مانی مت اس کی مثال ہیں۔

Marfat.com

باب 2
خدا کا روایتی تصور بکھر چکا ہے
Conventional Image of God is Shattered

نیوٹن، سر آئزک (Newton, Sir Isaac)...... (1642-1727) انگلش طبیعات دان، ریاضی دان اور فطری فلسفی جسے تاریخ کے اہم ترین سائنس دانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے ہمہ گیر کشش ثقل اور حرکت کے قوانین تشکیل دیے، بصریات کے جدید علم کی بنیاد رکھی اور اولین انعطافی دوربین بنائی۔ وہ کرسمس کے روز انگلینڈ کے مشرقی ساحل پر لنکن شائر میں وولستھروپ کے مقام پر پیدا ہوا۔ نیوٹن ایک نہایت متجسس آدمی تھا۔ وہ پیدائش کے وقت اتنا کمزور تھا کہ اس کے زندہ بچنے کی امید نہ تھی، لیکن 85 برس عمر پائی۔ اس نے ٹرینٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا اور 1665ء میں طاعون کے باعث یونیورسٹی سے فراغت کے دوران اپنے اساسی سائنسی تصورات تشکیل دیے۔ تن تنہا مطالعہ کے دوران نیوٹن نے سفید روشنی کا بھی مطالعہ کیا اور دریافت کیا کہ یہ بنیادی رنگوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اس نے کیلکولس تخلیق کی اور لیبنز کے ساتھ تنازعہ کا شکار ہوا۔ نیوٹن 30 سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی کیمبرج میں ریاضی کا پروفیسر بن گیا۔ بعد ازاں (1696ء) وہ شاہی ٹیکسال کا وارڈن اور پھر مالک بنا۔ وہ 1703ء سے اپنی موت تک رائل سوسائٹی کا صدر رہا۔ 1705ء میں اس کو سائنسی کامیابیوں کی بجائے ٹیکسال میں خدمات کی بنیاد پر نائٹ کا خطاب دیا گیا۔ نیوٹن کی عمومی شہرت کی وجہ قوت کشش ثقل اور حرکت کے قوانین دریافت کرنا ہے۔ اس کے قوانین حرکت یہ ہیں: ہر چیز اس وقت تک ایک سیدھی لائن میں حرکت کرتی رہتی ہے جب تک کہ کوئی قوت اس کی سمت بدل نہ دے؛ کسی جسم کی رفتار اس پر لاگو کی گئی قوت کے تناسب سے ہوتی ہے؛ اور ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ اس کی اہم ترین تصنیف ''Principles'' ہے۔

آئن سٹائن، البرٹ (Einstein, Albert)...... (1879-1955) نوبیل انعام یافتہ جرمن نژاد امریکی طبیعات دان جو نظریۂ اضافیت کے خالق کی حیثیت میں اور روشنی کے ذرات پر مشتمل ہونے کے حوالے سے اپنے

Marfat.com

واشگاف مفروضات کی وجہ سے مشہور ہوا۔ وہ غالباً بیسویں صدی کا مشہور ترین سائنس دان ہے۔ آئن سٹائن 14 مارچ، 1879ء کو Ulm میں پیدا ہوا اور جوانی کا زمانہ میونخ میں گزارا جہاں اس کا خاندان الیکٹرک مشینری بنانے والے چھوٹے سے کارخانے کا مالک تھا۔ وہ تین سال کی عمر تک بول نہ سکا، لیکن بچپن میں ہی مشکل ریاضیاتی مسائل کو سمجھنے میں بے مثال تجسس اور اہلیت کا مظاہرہ کرنے لگا۔ 12 سال کی عمر میں اس نے خود ہی یوکلیدی جیومیٹری پڑھی۔ کاروبار میں بار بار گھاٹا اٹھانے کے بعد آئن سٹائن کا خاندان جرمنی سے میلان، اٹلی چلا آیا۔ اس وقت 15 سالہ آئن سٹائن نے سکول چھوڑ دیا۔ 1900ء میں اس نے ایک ہم جماعت کے نوٹس کا مطالعہ کر کے گریجوایشن کا امتحان پاس کرلیا۔ پروفیسروں نے اسے یونیورسٹی میں عہدے کے لیے موزوں نہ سمجھا۔ آئن سٹائن دو سال تک بطور اتالیق اور متبادل استاد کے کام کرتا رہا۔ 1902ء میں اسے برن میں سوئس پیٹنٹ آفس میں ایگزامینر کا عہدہ مل گیا۔ 1905ء میں آئن سٹائن نے زیورخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کی۔ اس کا تھیسس مالیکیولز کی جہتوں کی تردید کے موضوع پر تھا۔ اس نے تین تھیوریٹیکل پیپرز بھی شائع کیے جو بیسویں صدی کی طبیعات کی ترقی میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔ ''اضافیت'' اس کتاب کا عنوان ہے جو خود آئن سٹائن نے اپنی دونوں اہم تھیوریز عام لوگوں پر واضح کرنے کیلئے لکھی: خصوصی نظریۂ اضافیت (1905ء) اور پھر عمومی نظریۂ اضافیت۔ اس کتاب کے 16 ایڈیشن شائع ہوئے اور اب بھی اس موضوع پر اسے بلا مقابلہ بہترین تحریر مانا جاتا ہے۔ آئن سٹائن نے دلیل دی کہ کائنات میں کوئی بھی مقام خصوصی نہیں۔ ہر مشاہدہ کرنے والے کے لیے قوانین طبیعات ایک ہی ہوں گے (چاہے وہ کسی بھی مقام پر ہو)۔ آئن سٹائن نے دریافت کیا کہ نیوٹن کے قوانین مخصوص رفتاروں کے لیے ہی کارآمد تھے، لیکن جب رفتار بہت زیادہ ہو (مثلاً روشنی کی رفتار) تو پیمانے سمٹ جاتے اور گھڑیاں سست رفتار پر چلنے لگتی ہیں۔ یوں کہہ لیں کہ آئن سٹائن نے سپیس۔ ٹائم کو سپیس اور ٹائم کے دو الگ الگ نظریات بنا دیا۔ آئن سٹائن کی تصانیف درج ذیل ہیں: His writings include Relativity: The Special and General ''Theory'' (16ء)، ''About Zionism'' (31ء)، ''Builders of the Universe'' (32ء)، ''Why War?'' (33ء)، ''The World as I See It'' (34ء)، ''The Evolution of Physics'' (38ء) اور ''Out of My Later Years'' (50ء)۔ (مزید دیکھیں ''اضافیت'')

ہیزنبرگ، ورنر کارل (Heisenberg, Werner Karl)...... (1901-1976) نوبیل انعام یافتہ جرمن ماہر طبیعات جس نے کوانٹم مکینکس کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ''اصول لاقطعیت'' کوانٹم مکینکس میں اس کی سب سے بڑی شراکت خیال کیا جاتا ہے، جس کے مطابق کسی ذرے کی درست پوزیشن اور ولاسٹی بیک

Marfat.com

وقت معلوم نہیں کی جا سکتی۔ وہ میونخ میں پیدا ہوا اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ 1920ء کے موسم گرما میں اس نے ایک میونخ جمنازیم سے گریجوایشن کی اور میونخ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ دو سال پڑھنے کے دوران اس نے طبیعات پر چار مقالے لکھے۔ اپنے کیریئر کی ابتدا میں اس نے کوانٹم مکینکس کے تین سرکردہ نظریہ سازوں کے ساتھ مل کر مطالعہ کیا: آرنلڈ سمر فیلڈ، میکس بورن اور نیلز بوہر۔ 1925ء میں اس نے کوانٹم مکینکس کا پہلا ورژن میٹرکس مکینکس بنایا۔ ہیزنبرگ نے محسوس کیا کہ کلاسیکی طبیعات کے قوانین کوانٹم کی سطح پر لاگو نہیں ہوتے تھے۔ مثلاً الیکٹران کلاسیکی فزکس کے قوانین کے تابع نہیں۔ ہیزنبرگ کی میٹرکس مکینکس نے پیشگوئی کی کہ مالیکیولر ہائیڈروجن دو الگ الگ صورتوں میں موجود ہوگی۔ یہ دو صورتیں ایٹموں کی spin نامی خاصیت کا نتیجہ ہیں۔ 1925ء میں اس نے پیش گوئی کی کہ دو ہائیڈروجن ایٹموں کا سپن پیرا ہائیڈروجن میں ایک جیسا اور آرتھو ہائیڈروجن میں ایک دوسرے کے مخالف تھا۔ دیگر سائنس دانوں نے اس پیشگوئی کو درست قرار دیا۔ 1932ء میں اسے نوبیل انعام برائے طبیعات سے نوازا گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ نے ہیزنبرگ کو جرمن ہتھیار سازی کے پروگرام میں کردار ادا کرنے کی بنیاد پر حراست میں لیا اور نو ماہ تک انگلینڈ میں قید رکھا۔ 1946ء میں واپس جرمنی آنے پر وہ میکس پلانک انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر بنا۔

ہیزنبرگ اصول لاقطعیت (Heisenberg uncertainty principle)...... دیکھیں "ہیزنبرگ، ورنر کارل۔"

ہاکنگ، سٹیفن ولیم (Hawking, Stephen William)...... (-1942) برطانوی طبیعات دان اور ریاضی دان جس نے اپنی تھیوریز کو لیکچرز، کتب اور فلموں کے ذریعے عوام تک پہنچانے پر بھی زندگی کا کافی حصہ خرچ کیا۔ ہاکنگ آکسفورڈ، انگلینڈ میں پیدا ہوا اور بچپن میں ہی ریاضی و طبیعات میں غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے 1958ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور تھرموڈائنامکس (حر حرکیات)، نظریۂ اضافیت اور کوانٹم مکینکس میں خصوصی دلچسپی لینے لگا۔ 1962ء میں اپنا انڈر گریجوایٹ کورس مکمل کرنے کے بعد اس نے طبیعات میں بیچلر ڈگری لی۔ پھر اس نے کیمبرج یونیورسٹی کے شعبۂ ریاضی میں عمومی نظریۂ اضافیت کے محقق طالب علم کے طور پر داخلہ لے لیا۔ ہاکنگ نے 1966ء میں ٹرینٹی کالج سے پی ایچ ڈی کی اور 1977ء میں وہاں پروفیسر تعینات ہوا۔ 1974ء میں وہ رائل سوسائٹی کے کم عمر ترین فیلوز میں سے ایک بنا اور 1979ء میں کیمبرج میں ریاضی کا لوکاسین پروفیسر تعینات کیا گیا۔ پوسٹ گریجوایٹ پروگرام کے دوران ہاکنگ کے Amyotrophic Lateral Sclerosis نامی مرض کا شکار ہونے کی تشخیص ہوئی تھی۔ اس مرض کا شکار لوگ حرکت کرنے اور بولنے سے معذور ہو جاتے ہیں۔ ابتدا سے ہی اس کی تحقیق کا اصل مرکز singularities کا تصور رہا ہے......یعنی

Marfat.com

زمان و مکان میں ایسے مقامات جب طبیعات کے قوانین قابل نفاذ نہیں رہتے۔ وقت اور سہ جہتی خلا یا سپیس کا امتزاج سپیس-ٹائم کہلاتا ہے۔ بلیک ہول اس کی عام ترین مثال ہے۔ 1970ء سے 74ء تک ہاکنگ اور اس کے ساتھیوں نے امریکی ماہر طبیعات جان وہیلر کے تشکیل دیے ہوئے مفروضے کا ریاضیاتی ثبوت مہیا کیا۔ 1974ء کے بعد ہاکنگ نے کوانٹم مکینکس کے ایک تھیورم کی بنیاد پر بلیک ہول کے اردگرد مادے کے طرز عمل کا مطالعہ کیا۔ 1990ء کی ساری دہائی کے دوران ہاکنگ ایک ایسی تھیوری پیش کرنے کی کوشش میں لگا رہا جو کائنات کی وضاحت کے لیے سائنس دانوں کی پیش کردہ مختلف تھیوریز کو مربوط کر دے۔ اس کی درج ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں: ''A Brief History of Time'' (88ء)، ''Black Holes and Baby Universes and Other Essays'' (93ء)، ''Universe in a Nutshell'' (2004ء) اور ''The Grand Design'' (2011ء)۔

ویلز، ایچ جی (Wells, Herbert George) (1866-1946)...... انگلش مصنف اور سیاسی فلسفی جو اپنے سائنسی فینٹسی والے ناولوں کی وجہ سے مشہور ہوا۔ یہ ناول ٹیکنالوجی کی پیش گوئیوں کے علاوہ بیسویں صدی کے خوفناک جنگ و جدل کی حیرت انگیز پیش گوئی بھی تھے۔ ویلز کنٹ میں پیدا ہوا اور لندن کے نارمل سکول آف سائنس میں تعلیم پائی اور سکالرشپ حاصل کیا۔ وہ معلم اور صحافی کے علاوہ اور بھی کئی قسم کی ملازمتیں کرتا رہا اور بالآخر 1895ء میں کل وقتی مصنف بن گیا۔ اگلے پچاس برس کے دوران اس نے 80 سے زائد ناول لکھے۔

Marfat.com

باب 3
متوازی معکوس سچائی کی کہانی
Story of Parallel Invertible Truth

استدلالیت (Rationalism)......فلسفہ میں ایک نظام فکر جو حصول علم میں عقل واستدلال کے کردار کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ تجربیت کی ضد ہے جس میں تجربے اور بالخصوص حس ادراک پر زور دیا جاتا ہے۔ استدلالیت مغربی فلسفے کے ہر مرحلے پر کسی نہ کسی صورت میں سامنے آتی رہی ہے، لیکن اسے بنیادی طور پر سترہویں صدی کے فرانسیسی فلسفی اور سائنس دان رینے ڈیکارٹ کے ساتھ شناخت کیا جاتا ہے۔ استدلالیت کو دیگر یورپی فلسفیوں نے آگے بڑھایا، جیسے ڈچ فلسفی باروک سپنوزا اور جرمن فلسفی وریاضی دان ولہلم لیبنز۔

تجربیت (empiricism)......فلسفہ میں ایک مکتبہ فکر جو زور دیتا ہے کہ تجربہ تمام علم کی بنیاد ہے، اور جو خود رو تصورات یا *a priori* فکر کے امکان کو مسترد کرتا ہے۔ بیسویں صدی تک تجربیت کی اصطلاح سترہویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں کے انگلش فلسفیوں کے لیے ہی استعمال ہوتی رہی۔ ان میں سے انگلش فلسفی جان لاک نے پہلی بار اسے باقاعدہ انداز میں متعارف کروایا، اگرچہ اس کے ہم وطن فرانسس بیکن نے پیشگی کچھ بنیادیں قائم کردی تھیں۔ تجربیت کے برعکس مکتبہ فکر منطق پسندی (Rationalism) ہے جس کی نمائندگی فرانسیسی فلسفی رینے ڈیکارٹ، ڈچ باروک سپنوزا اور لیبنز جیسوں نے کی۔ منطق پسندوں کا اصرار ہے کہ ذہن استدلال کے ذریعہ حقیقت کی شناخت کرنے کا اہل ہے اور یہ صلاحیت تجربے سے جداگانہ وجود رکھتی ہے۔ جرمن فلسفی ایمانوئیل کانٹ نے تجربیت اور منطق پسندی کے درمیان سمجھوتہ کروانے کی کوشش کرتے ہوئے علم کو صرف تجربے کی اقلیم تک محدود کیا۔ حالیہ برسوں میں تجربیت کی اصلاح نے زیادہ لچک دار مفہوم اپنا لیا ہے، اور اب اس کا استعمال کسی بھی ایسے فلسفیانہ نظام کے حوالے سے ہوتا ہے جو اپنے تمام مواد تجربہ میں تلاش کرے۔ امریکی ماہر نفسیات ولیم جیمز نے اپنے فلسفہ کو ریڈیکل تجربیت کا نام دیا، اور جان ڈیوی نے تجربہ کے متعلق اپنے نکتۂ نظر کے لیے براہ راست تجربیت کی

Marfat.com

اصطلاح وضع کی۔

عینیت (idealism)......فلسفہ میں حقیقت اور علم کی ایک تھیوری جو شعور یا غیر مادی ذہن کو تشکیل دنیا میں اولین کردار دیتی ہے۔ زیادہ دوٹوک انداز میں بات کی جائے تو مابعد الطبیعیات کے اندر عینیت یہ نکتۂ نظر ہے کہ تمام طبعی اشیا ذہن پر منحصر ہیں اور ذہن یعنی شعور سے باہر ان کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس مادیت کا نظریہ ہے جس کے مطابق شعور بذات خود خالصتاً طبعی عناصر اور عوامل کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ مادیت پسندانہ نکتۂ نظر کے مطابق دنیا کلیتاً ذہن پر منحصر ہے اور صرف طبعی اشیا یا طبعی عوامل سے مل کر بنی ہے۔ علمیات میں عینیت کی ضد حقیقت پسندی ہے، یعنی یہ نکتۂ نظر کے ذہن پر منحصر طبعی اشیا موجود ہیں جنہیں صرف حسیات کے ذریعے جانا جا سکتا ہے۔ مابعد الطبیعاتی حقیقت پسندی روایتی طور پر علمیاتی تشکیکیت پر منتج ہوئی جس کی رو سے حقیقت کا علم ناممکن ہے۔ یوں عینیت کی تھیوریز کے لیے ایک اہم تحریک مہیا ہوئی جس کا کہنا ہے کہ حقیقت ذہن پر مبنی ہے اور حقیقت کا حقیقی علم روحانی یا شعوری ماخذ پر انحصار کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح میں افلاطون نے اعیان کی دنیا کا تصور پیش کیا جس کا انعکاس عام تجربے کی مختلف اشیا میں غیر کامل طور پر ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے جرمن فلسفیوں جوہان گوٹ لیب فشٹے اور ایف شیلنگ، امریکیوں چارلس سانڈرس اور یوسیاہ روئس، اور بیسویں صدی کے اطالوی بینیڈیٹو کروسے کے ہاں عینیت کی مزید صورتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ثبوتیت (poistivism)......فطری مظاہر کے تجربے اور تجربی علم پر مبنی فلسفے کا ایک نظام جس میں مابعد الطبیعات اور الٰہیات کو علم کے ناکافی اور غیر کامل نظام خیال کیا جاتا ہے۔ ثبوتیت کو یہ نام پہلی مرتبہ فرانسیسی ریاضی دان اور فلسفی آگست کونت نے انیسویں صدی میں دیا، لیکن کچھ ایک ثبوتیت پسند تصورات کے ڈانڈے برطانوی فلسفی ڈیوڈ ہیوم اور سینٹ سائمن اور ایمانوئیل کانٹ سے بھی ملائے جا سکتے ہیں۔ کونت نے لفظ positivism اس بنیاد پر منتخب کیا کہ یہ ''حقیقت'' اور ''تعمیری رجحان'' کی جانب اشارہ کرتا ہے جو اس کے مطابق مسلک کے نظری پہلو تھے۔ وہ سائنسی علم کے ذریعے انسانیت کی بھلائی اور یوں فطری قوتوں پر قابو پانے کی خاطر سماجی تنظیم نو میں سب سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ بعدازاں آگست کونت نے ثبوتیت کے دو بنیادی عناصر یعنی فلسفہ اور خوش خلقی کو ملا کر تصور مذہب کے تحت ایک اکائی بنایا جس میں انسانیت معروض پرستش تھی۔ تاہم، کونت کے متعدد شاگردوں نے اس کے فلسفے کی یہ مذہبی ترقی قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ یہ اصل ثبوتیت کے منافی لگتی تھی۔ بعد میں جان سٹوارٹ مل، ہربرٹ سپنسر اور ارنسٹ ماخ نے کونت کے نظریات کو اپنا کر آگے بڑھایا۔ بیسویں صدی کے دوران جدید سائنس کی پیش رفت میں دلچسپی رکھنے والے فلسفیوں کے ایک گروپ نے روایتی ثبوتیت پسندانہ نظریات کو مسترد کیا جن میں ذاتی تجربے کو حقیقی علم کی بنیاد مانا اور سائنسی توثیق کی اہمیت پر زور دیا جاتا تھا۔ یہ فلسفی منطقی ثبوتیت پسند کہلائے اور ان

Marfat.com

میں لڈوگ وٹگنسٹائن، برٹرینڈ رسل اور جی ای مور شامل تھے۔ وٹگنسٹائن کی ''Tractatus Logico-philosophicus'' (1921ء) نے مابعد الطبیعات نظریات کو بے معنی قرار دے کر فیصلہ کن طور پر مسترد اور تجربیت کو منطقی لزوم کا معاملہ تسلیم کیا۔ فلسفہ کے اس ویانا مکتبۂ فکر کو مسترد کرنے والے موجودہ دور کے ثبوتیت پسند خود کو منطقی تجربیت پسند کہنے کو ترجیح دیتے ہیں تا کہ سائنسی توثیق پر سابق مفکرین کے اصرار سے لاتعلق ہو سکیں۔ ان کا کہنا ہے کہ توثیق کا اصول بذات خود فلسفیانہ اعتبار سے قابل توثیق نہیں۔

اضافیت (relativity) ...... بیسویں صدی کے اوائل میں ارتقا پذیر ہونے والا ایک نظریہ جو بالاصل نسبتی حرکت کے تصور میں موجود کچھ خامیاں دور کرنے کی کوشش تھی مگر جس نے طبعی سائنس (طبیعات) میں اہم ترین بنیادی تصورات میں سے ایک کی حیثیت اختیار کر لی۔ نظریۂ اضافیت کو صحیح معنوں میں جرمن امریکی ماہر طبیعات البرٹ آئن سٹائن نے وضع کیا اور بعد ازاں ماہرین طبیعات نے مادے و توانائی، زمان و مکاں اور کشش ثقل و اسراع کی قوتوں کی اساسی یگانگت بیان کرنے کے لیے اسے استعمال کیا۔ نظریۂ اضافیت ارتقا پذیر ہونے سے قبل بالعموم سائنس دانوں کے قبول کردہ ''کلاسیکی قوانین'' کی بنیاد سترہویں صدی کے اواخر میں انگلش ریاضی دان اور ماہر طبیعات آئزک نیوٹن کے بیان کردہ مکینکس کے اصولوں پر تھی۔ 1905ء میں پہلی مرتبہ آئن سٹائن نے نظریۂ اضافیت پر دو اہم ترین مقالے شائع کیے جن میں مطلق حرکت کے وجود سے انکار کیا۔ آئن سٹائن کے مطابق کائنات میں مکاں (سپیس) میں ساکت کوئی بھی مخصوص شے مطلق حوالے کے طور پر موزوں نہیں۔ نظام شمسی کے مرکز جیسی کوئی بھی شے موزوں حوالہ (فریم آف ریفرنس) ہے اور کسی شے کی حرکت اسی فریم کا حوالہ رکھتی ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بھی درست ہے کہ ٹرین حرکت کرتی ہوئی سٹیشن سے گزرے یا سٹیشن حرکت کرتا ہوا ٹرین کے پاس سے گزرا۔ یہ مثال اگرچہ پہلی نظر میں لگتی ہے لیکن حقیقت میں غیر استدلالی نہیں کیونکہ سٹیشن بھی حرکت کر رہا ہے کیونکہ کرۂ ارض اپنے محور پر اور مدار میں بھی گھومتا ہے۔ آئن سٹائن کے مطابق تمام حرکت اضافیاتی ہے۔ البتہ آئن سٹائن کے بنیادی مفروضات میں سے کوئی بھی انقلابی نہیں تھا۔ 1915ء میں اس نے عمومی نظریۂ اضافیت پیش کیا جس میں مسرع اشیا کو ایک دوسرے کے حوالے سے زیر غور لایا۔ اس تھیوری کی مدد سے اس نے قوانین اضافیت اور قانون کشش ثقل کے درمیان بدیہی تضادات کی وضاحت کی۔ ان تضادات کو حل کرنے کی خاطر اس نے کشش ثقل کے تصور کا ایک بالکل نیا انداز اختیار کیا جس کی بنیاد مساوات (equivalence) کے اصول پر تھی۔ اس اصول کے مطابق کشش ثقل کی پیدا کردہ قوتیں ہر سمت میں اسراع کی پیدا کردہ قوتوں کے مساوی ہیں۔ لہٰذا کشش ثقل اور اسراع کی قوتوں کے درمیان تمیز کرنا نظری طور پر ناممکن ہے۔ خصوصی نظریۂ اضافیت میں آئن سٹائن نے کہا ہے کہ بند کار میں بیٹھا یا نہایت ہموار پٹڑی پر بیٹھا شخص کسی بھی قابل ادراک تجربے کے ذریعے یہ تعین نہیں کر سکتا ہے وہ خود ساکت یا متواتر

Marfat.com

حرکت میں۔ 1915ء کے بعد نظریۂ اضافیت کو آئن سٹائن اور برطانوی ماہرین فلکیات جیمز ہاپ ووڈ اور ایڈورڈ آرتھر مل نے کافی ترقی دی۔ مزید دیکھیں ''آئن سٹائن، البرٹ۔''

ایثاریت (altruism)...... دوسروں کی فلاح کے لیے وقف ہونے کا جذبہ۔ انگلش کا altruism فرانسیسی لفظ altruisme کی بدلی ہوئی انگلش صورت ہے جو انیسویں صدی میں فلسفی اور ماہر عمرانیات آگسٹ کونت نے وضع کیا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ لفظ زیادہ عمومی سطح پر استعمال ہونے لگا۔ فلسفہ میں ایثاریت ایک ایسے طرز عمل کو بیان کرتی ہے جو دوسروں کی فلاح کو کسی بھی اخلاقی فعل کا مطلق مقصد سمجھتا ہو۔ اخلاقیات کی تھیوریز میں ایثاریت انانیت یا ایگوازم کا اینٹی تھیسس ہے۔

انانیت (egoism)...... یہ نکتۂ نظر کہ کسی شخص کے اپنے مفادات کسی بھی اور نظریے یا چیز کی نسبت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ انانیت پسندانہ نکتہ ہائے نظر کا تعلق ذات کے اصل مشمولات کے فلسفیانہ مسئلے سے زیادہ شخصیت اور پسندیدگیوں کے عام نظریے سے ہے۔ وہ انسان کے ذاتی مفادات کو سب سے آگے رکھتے ہیں۔ بہت سی اخلاقی تھیوریز میں انانیت پسندانہ تعصب موجود ہے۔

تکثیریت (pluralism)...... یہ نظریہ کہ حقیقت متعدد اجزا پر مشتمل ہے اور کوئی واحد توضیح یا نکتۂ نظر زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ تکثیریت کو کثرت پسندی کے معنوں میں بھی لیا جاتا ہے۔

جبریت (determinism)...... ایک فلسفیانہ نظریہ جس کے مطابق ہر طبعی اور ذہنی واقعہ بھی ایک علت رکھتا ہے، اور یہ کہ علت طے شدہ ہونے کے باعث واقعہ بھی طے شدہ ہوتا ہے۔ یہ نظریہ اتفاق کے عنصر کو مسترد کرتا اور عدم جبریت کا مخالف ہے جس کے مطابق انسانی ارادے کے مظاہر میں سابقہ واقعات آنے والے واقعات کو قطعی طور پر طے نہیں کرتے۔ اخلاقیات میں نظریۂ جبریت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

نتائجیت (pragmatism)...... ایک فلسفیانہ تحریک جس نے انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر موجودہ دور تک امریکی ثقافت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ نتائجیت کا اصرار ہے کہ نظریات اور تصورات کو عملی تجربے کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے تاکہ ان کے قابل خواہش یا ناپسندیدہ نتائج کا اندازہ لگایا جا سکے۔ نتائجیت پسندوں کے مطابق صداقت، علم، اخلاقیات اور سیاست کے تمام دعووں کو اس طریقے سے آزمانا ضروری ہے۔ روایتی مغربی فلسفہ میں نتائجیت کو اہمیت حاصل رہی ہے، بالخصوص اس خیال کو کہ مطلق صداقتیں اور مطلق اقدار موجود ہیں۔ اگرچہ نتائجیت کچھ عرصہ فرانس، انگلینڈ اور اٹلی میں مقبول رہی، لیکن زیادہ تر پیروکار یقین رکھتے تھے کہ یہ تکنیکی علم پر امریکی عقیدے کی نمائندہ ہے، اور عملاً تجریدی نظریات پر امریکی بے اعتمادی کی تصویر کشی کرتی ہے۔ نتائجیت پسندوں نے تمام

Marfat.com

نظریات اور دساتیر کو غیر قطعی مفروضات اور حل خیال کیا۔ اسی لیے وہ یقین رکھتے تھے کہ تعلیم یا سیاست وغیرہ کے ذریعے معاشرتی اصلاح کی کوششوں کا مقصد مسائل حل کرنا ہونا چاہیے۔ نظریے کو عمل سے ملانے پر اصرار کرنے کے ذریعے ان مفکرین نے فلسفے کے تمام شعبوں (مابعد الطبیعات سے لے کر اخلاقیات اور سیاسی فلسفہ تک) کی تقلید کرنا چاہی۔ نتائجیت نے حقیقت کی فطرت اور انکاریت وغیر استدلالیت کے ریڈیکل نظریات کے متعلق نظریات میں سے ایک درمیانی راہ تلاش کی۔ نیز، نتائجیت پسندوں کی جانب سے مطلق اصولوں کو ماننے سے انکار نے مذہب، حکومت اور مکتبہ ہائے فکر کی بنیادوں کو بھی دعوت مبارزت دی۔ نتیجتاً نتائجیت نے نفسیات، سماجیات، تعلیم، semiotics اور سائنسی طریقۂ کار کے ساتھ ساتھ فلسفہ، سیاسی تنقید اور سماجی اصلاح کی تحریکوں پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ مختلف سیاسی گروپس نے بھی نتائجیت کا اثر قبول کیا، بیسویں صدی کے اوائل کی ترقی پسند تحریکوں سے لے کر موجودہ سماجی اصلاح کے تجربات تک۔ 1980ء کی دہائی کے دوران امریکی فلسفی رچرڈ رورٹی نے نتائجیت کی روایت کو نئے سرے سے زندہ کیا۔

افادیت پسندی (utilitarianism)......اخلاقیات میں یہ نکتۂ نظر کہ ہر مفید چیز خیر ہے، اور نتیجتاً کسی رویے کا مفید ہونا ہی اس کی اخلاقی قدر جانچنے کا پیمانہ ہے۔ افادیت پسندی کی اصطلاح زیادہ تخصیصی طور پر اس قضیے پر لاگو ہوتی ہے کہ کسی اخلاقی اقدام کا اعلیٰ ترین مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ خوشی کا حصول ہے۔ اس مقصد کو تمام قانون سازی کا ہدف اور تمام سماجی دساتیر کی مطلق کسوٹی بھی خیال کیا جاتا ہے۔ اخلاقیات کا نظریہ اخلاقیات بالعموم ان اخلاقیاتی عقائد کے برخلاف ہے جن میں کوئی اندرونی احساس یا استعداد، یعنی ضمیر کو درست اور غلط کے درمیان تمیز کرنے والا ثالث بنایا جاتا ہے۔ افادیت پسندی کا نکتۂ نظر پہلی مرتبہ برطانوی ماہر الٰہیات ولیم پالے نے اپنی کتاب ''Principles of Moral and Political Philosophy'' (1785ء) میں پیش کیا اور فلسفی جیریمی بینتھم نے ''Principles of Morals and Legislation'' (1789ء) کے دیباچے میں اس کا تعارف کروایا۔ پالے کی تحریر میں افادیت پسندی کو انفرادی لذتیت پسندی اور الٰہیاتی مطلق العنانیت کے ساتھ مدغم کیا گیا، جیسا کہ نیکی کی تعریف سے ظاہر ہے: خدا کی اطاعت میں ابدی خوشی کی خاطر نوع انسانی کی بھلائی کے لیے کام کرنا۔'' بینتھم نے نظریۂ افادیت پسندی ایک اخلاقیات کے ساتھ ساتھ قانونی اور سیاسی اصلاحات کے نظام کے طور پر بھی استعمال کیا۔ اس نے بڑے فائدوں کی خاطر چھوٹے فائدوں کو قربان کرنے پر زور دیا۔

وجودیت (existantialism)......فلسفیانہ تحریک یا رجحان جو فرد کی ہستی، آزادی اور انتخاب پر زور دیتا ہے۔ اس رجحان نے انیسویں اور بیسویں صدی کے متعدد اہل قلم کو متاثر کیا۔ وجودیت سے منسوب نہایت متنوع

Marfat.com

نکتہ ہائے نظر کی وجہ سے اس اصطلاح کی کوئی دوٹوک تعریف پیش کرنا ممکن نہیں۔ تاہم، تقریباً سبھی وجودی مصنفین کے ہاں پائے جانے والے مشترکہ موضوعات کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ اصطلاح خود ایک اہم موضوع بجھاتی ہے: ٹھوس انفرادی وجود، اور نتیجتاً موضوعیت، انفرادی آزادی اور ارادے پر اصرار۔ افلاطون کے بعد بیشتر فلسفیوں نے کہا ہے کہ اعلیٰ ترین اخلاقی نیکی ہر کسی کے لیے ایک ہی ہے؛ یہاں تک کہ کوئی شخص اخلاقی کاملیت حاصل کرنے پر دیگر اخلاقی طور پر کامل افراد جیسا بن جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں وجودیت کے موضوع پر قلم اٹھانے والے پہلے مصنف، ڈینش فلسفی سورین کیر کیگارڈ نے اس روایت کے خلاف ردعمل دیتے ہوئے اصرار کیا کہ فرد کے لیے اعلیٰ ترین اچھائی بے مثال ذاتی دلچسپی تلاش کرنا ہے۔ کیر کیگارڈ، نٹشے اور دیگر وجودیت پسند مصنفین نے اپنے اپنے فلسفوں کی توضیح میں قصداً غیر استدلالی انداز اپنایا۔ انہوں نے تمثیلات، ڈائیلاگ، قصوں اور ادبی کہانیوں کو استعمال کرنا بہتر سمجھا۔ تاہم، ان کوششوں کے باوجود ان میں سے زیادہ تر کو غیر استدلالی نہیں کہا جاسکتا۔ انہوں نے استدلالی سوچ کے کارآمد ہونے سے انکار نہ کیا۔ البتہ وہ یہ ضرور کہتے تھے کہ زندگی کے اہم ترین سوالات منطق یا سائنس کے لیے قابل رسائی نہیں۔ وجودیت پسندوں کے خیال میں چونکہ انسان اپنا راستہ منتخب کرنے میں آزاد ہے، اس لیے انہیں اپنے نصب العین کی ذمہ داری اور خطرہ قبول کرنا چاہیے، چاہے اس کے نتیجے میں وہ کہیں بھی پہنچ جائیں۔ پاسکل اور کیر کیگارڈ کی طرح ہیڈ گر نے بھی فلسفہ کو نتیجہ خیز استدلالی بنیاد پر پرکھنے کی کوششوں کی مخالفت کی۔ پہلی مرتبہ سارتر نے ہی وجودیت کی اصطلاح کو عام سطح پر قبولیت دلوائی۔ اس کا فلسفہ دوسری عالمی جنگ کے بعد بین الاقوامی سطح پر مشہور ہوا۔ وہ واضح طور پر ملحدانہ اور یاسیت پسندانہ ہے؛ اس نے اعلان کیا کہ انسان اپنی زندگیوں کے لیے ایک منطقی بنیاد کے متقاضی ہیں، لیکن ناکامی کا سامنا کرنے کے باعث انسانی زندگی ایک ''بے کار جذبہ'' بن گئی ہے۔ بایں ہمہ سارتر نے اصرار کیا کہ اس کی وجودیت انسانیت پسندی کی ہی ایک صورت ہے۔

لاادریت (agnosticism) ...... یہ عقیدہ کہ خدا اور دیگر روحانی ہستیوں کی موجودگی قطعی اور نہ ہی ناممکن ہے۔ یونانی زبان کے لفظ ''agnostikos'' سے مشتق یہ اصطلاح 19 ویں صدی میں برطانوی ماہر حیاتیات تھامس ہنری ہکسلے نے متعارف کروائی۔ لاادری نکتۂ نظر الٰہیات (جو ان ہستیوں کی توثیق کرتا ہے) اور الحاد پرستی دونوں سے ہی علیحدہ ہے۔ عموماً تشکیکیت کی ہی ایک صورت خیال کیے جانے کے باوجود لاادریت کا دائرہ نسبتاً تنگ ہے کیونکہ یہ صرف مابعد الطبیعاتی اور دینیاتی عقائد کے قابل بھروسا ہونے سے انکار کرتی ہے۔ جدید لاادریت کی بنیادیں برطانوی فلسفی ڈیوڈ ہیوم اور جرمن فلسفی ایمانوئیل کانٹ کی تحریروں میں مضمر ہیں کیونکہ دونوں نے ہی خدا اور روح کی موجودگی کے بارے میں روایتی دلائل کے منطقی نقائص کی نشان دہی کی تھی۔

کرداریت (behaviorism) ...... نفسیاتی مطالعہ کا طریقہ کار جس میں انسان اور حیوان کے جملہ اعمال کسی

Marfat.com

مہیج کے ردعمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔اور اس کے کردار کے مطالعہ سے اس کے اعمال کے متعلق پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔نفسیات کا کرداریت پسندانہ نکتۂ نظر Associationist برطانوی فلسفیوں کی تحریروں میں اپنی جڑیں رکھتا ہے۔ڈارون کے نظریۂ ارتقانے بھی اس پر بہت گہرا اثر ڈالا۔کرداریت کا نفسیات پر ابتدائی اثر ذہنی عوامل، جذبات اور احساسات کے داخلی مطالعہ کو گھٹانا اور اس کی جگہ پر تجرباتی طریقوں سے ماحول کے ساتھ تعلق میں افراد کے معروضی طرز عمل کا مطالعہ کرنا تھا۔اس طرز تحقیق نے انسانی اور حیوانی تحقیق کو مربوط کر دیا اور نفسیات کو فطری سائنسوں مثلاً طبیعات، کیمیا اور حیاتیات کی صف میں لا کھڑا کیا۔موجودہ دور کی کرداریت نے تین حوالوں سے نفسیات کو متاثر کیا ہے۔اس نے مہیج اور ردعمل کے مشینی تصور کی جگہ ایک فعلیاتی تصور کو دی جو مہیج کے محرک بننے والے حالات پر زور دیتا ہے۔اس نے فرد واحد کے تجرباتی مطالعہ کے لیے تحقیق کا ایک طریقۂ کار متعارف کروایا۔ تیسرا اثر یہ کہ اس نے دکھایا ہے کہ کرداری تصورات اور اصولوں کو بہت سے عملی مسائل پر لاگو کیا جاسکتا ہے۔

گیسٹالٹ نفسیات (Gestalt psychology)......نفسیات کا ایک مکتبۂ فکر جو ادراک کے عوامل پر بحث کرتا ہے۔گیسٹالٹ نفسیات کے مطابق تصاویر کا ادراک الگ الگ اجزا کے مجموعے کی بجائے ایک نقش (pattern) یا کُل کے طور پر کیا جاتا ہے۔کسی تصویر کا سیاق وسباق بھی ادراک کے عمل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ گیسٹالٹ نفسیات کا آغاز ایک احتجاج کے طور پر ہوا۔بیسویں صدی کے آغاز میں ایسوسی ایشن ازم نفسیات پر غالب تھا۔گیسٹالٹ ماہرین نفسیات کے خیال میں ادراک سیاق وسباق یا ادراک کیے جارہے عناصر کی ترکیب سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔نیز انفرادی اجزا کو جمع کرنے کا سیدھا سادہ عمل ہی کُل کی بنیاد نہیں ہوتا۔سوچ، یادداشت اور جمالیات کے مختلف شعبوں میں گیسٹالٹ نفسیات کا طریقہ کار لاگو کیا گیا۔اس کے مطابق اپنی نجی ضرورتوں اور دنیا کا بالکل درست ادراک ذاتی تجربے کو متوازن بنانے کے لیے ضروری ہے۔

ورتھائمر، میکس Wertheimer, Max......(1880-1943) یورپ میں جنم لینے والا فزیالوجسٹ جو گیسٹالٹ نفسیات کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک تھا۔اس نے کرٹ کوفکا اور وولف گینگ کوہلر کے ساتھ مل کر کام کیا۔وہ پراگ، چیکوسلوواکیہ میں پیدا ہوا۔اس نے یونیورسٹی میں قانون پڑھنا شروع کیا لیکن جلد ہی فلسفہ اور نفسیات کی طرف راغب ہوگیا۔1904ء میں اس نے وورزبرگ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کی۔ایک ٹرین سٹیشن پر فلیش کرتی ہوئی لائٹوں سے پیدا ہونے والے بصری التباس کا مشاہدہ کرنے کے بعد وہ ادراک کے مطالعہ میں حد درجہ دلچسپی لینے لگا۔فرینکفرٹ سائیکولوجیکل انسٹی ٹیوٹ میں اوپر مذکور دو ساتھیوں کے ہمراہ کام کے نتیجے میں گیسٹالٹ نفسیات وجود میں آئی۔

Marfat.com

سپینوزا، بینیڈکٹ (Spinoza, Benedict) ...... (1632-1677) ڈچ استدلالیت پسند فلسفی اور مذہبی مفکر جسے ہمہ اوست کا سب سے زبردست جدید مبلغ خیال کیا جاتا ہے۔ وہ ایمسٹرڈم میں ہسپانوی پرتگیزی والدین کے گھر پیدا ہوا اور کلاسیکی یہودی تعلیمات کے مطابق تعلیم پائی۔ تاہم، بعد میں وہ طبعی سائنس اور انگلش فلسفی تھامس ہوبز اور فرانسیسی فلسفی و سائنس دان رینے ڈیکارٹ کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے باعث منظور شدہ یہودیت سے بیزار ہو گیا۔ اُس نے کنیسہ سے اپنا تعلق توڑ لیا اور 1656ء میں ربیوں نے اُسے دین بدر کر دیا۔ پانچ برس تک سپینوزا کو ایمسٹرڈم شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ ملی اور وہ گردونواح میں ہی بصری شیشے (آپٹیکل لینز) بنانے کا کام کر کے روزی کماتا رہا۔ اِس دوران اُس نے اپنی پہلی فلسفیانہ تحریر ''خدا اور انسان اور اُس کی مسرت پر مقالہ'' Treatise on God and Man and His Happiness'' لکھی۔ ''تھیولوجیکل پولیٹکل مقالہ'' اور '' بھی غالباً اِسی دور میں لکھا گیا۔ 1661ء میں سپینوزا لیڈن کے قریب ایک قصبے Rijnsburg اور دو تین سال بعد ہیگ کے قریب Voorburg گیا۔ پھر کچھ عرصے بعد ہیگ جانے پر الیکٹر چارلس لوئی نے اُسے ہیڈلبرگ یونیورسٹی میں فلسفہ کی چیئر پیش کی۔ وہ آزاد اِرادے کے عینیت پسندانہ نکتۂ نظر کو مسترد کرتا اور ارادے کا تعین تحریکوں پر منحصر ہونے کے طور پر کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُسے یقین تھا کہ آزادی کا وجود لازمی طور پر علم پر مبنی رویے میں ہی ممکن ہے۔ جرمن ایمانوئیل کانٹ کے سوا تقریباً سبھی جدید مفکرین نے اُس کا اثر قبول کیا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی مابعد الطبیعاتی مادیت پر سپینوزا کی گہری چھاپ ہے، اور اُس کی آزاد مذہبی سوچ نے الحاد پرستی کی ترقی پر اثر ڈالا۔ نہ صرف مابعد الطبیعاتی اہل فکر بلکہ گوئٹھے اور پی بی شیلے اور ولیم ورڈز ورتھ جیسے شعرا نے بھی اُسے پڑھا اور متاثر ہوئے۔

کوہلر، جیورجیز جے (Köhler, Georges J. F.) ...... (1946-96) نوبیل انعام یافتہ سائنس دان (immunologist) جس نے یک لونی (monoclonal) اینٹی باڈیز بنانے کی تکنیک وضع کیا۔ کوہلر میونخ میں پیدا ہوا اور 1974ء میں فریبرگ یونیورسٹی سے حیاتیات کی ڈگری حاصل کی۔ اس نے دو سال تک کیمبرج، انگلینڈ میں مالیکولر بایالوجی کی لیبارٹری میں کام کیا اور ارجنٹائنا کے ماہر مناعیات سیزار ملسٹائن کے ساتھ مل کر monoclonal اینٹی باڈیز بنائیں۔ 84ء میں اسے اور دو دیگر سائنس دانوں کو نوبیل انعام برائے فزیالوجی یا میڈیسن دیا گیا۔

کافکا، فرانز (Kafka, Franz) ...... (1883-1924) آسٹریائی (چیک) یہودی ناول و افسانہ نگار جس کے علامتی فکشن نے بیسویں صدی کے اواخر کی مایوسی اور پراگندگی کی پیش بینی کی۔ اسے جدید عالمی ادب میں نہایت نمایاں مقام حاصل ہے۔ فرانز کافکا پراگ (چیکوسلواکیہ) کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا

Marfat.com

(1883ء)۔اس کا باپ ایک خوش حال تاجر تھا۔ وہ سینہ زوری کرنے والا، درشت، تندرست، بیہودہ اور تندمزاج بھی تھا۔فرانز کی تینوں بہنیں ہٹلر کے کیمپوں میں ماری گئی تھیں۔فرانز کافکا نے نہایت منظم انداز میں سکول کی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد قانون کا مطالعہ کیا اور ڈگری حاصل کی۔ پھر پراگ کی جرمن یونیورسٹی میں ادب پڑھا (1901ء تا 1906ء)۔اس نے 1904ء میں لکھنا شروع کیا اور تقریباً اسی دور میں مہلک بیماری کا شکار ہوا۔ 1908ء میں کافکا نے ''ورکرز ایکسیڈنٹ انشورنس انسٹیٹیوٹ'' نامی سرکاری تنظیم میں ملازمت اختیار کی۔اس نے وہاں 14 سال تک ایمانداری سے کام کیا، حتیٰ کہ موت نے اسے ریٹائر کر دیا۔ وہ جون 1924ء میں ویانا کے نزدیک ایک سینےٹوریم میں فوت ہوا۔زندگی کے دوران اس کی متعدد محبوبائیں اور متعدد افیئرز تھے۔کافکا نے اپنی مختصر زندگی کے دوران کہانیوں کے چھوٹے چھوٹے کئی مجموعے شائع کیے جو بہت پسند کئے گئے مگر شہرت نہ دلا سکے۔ البتہ اسے ''بھٹی جھونکنے والا'' پر 1915ء میں فونٹین پرائز ملا۔اس کا سب سے قابل قدر ناول Das Schloss (دی کاسل؛ لیکن Schloss کا مطلب تالا بھی ہے) تھا، مگر اس میں کوئی اختتام نہیں۔ ''دی ٹرائل'' زیادہ متاثر کن ثابت ہوا۔کافکا کے خطوط اور ڈائریوں کے بھی متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جے پی سٹرن کے خیال میں ''دی ٹرائل'' کی ایک مذہبی تفسیر ناقابل گریز ہے۔کافکا نے نٹشے کا بغور مطالعہ کیا تھا۔

الکندی، ابو یوسف (Al-Kindi, Abu Yusuf)...... (801-870) پورا نام ابو یوسف یعقوب ابن اسحٰق الکندی۔ مسلمان دنیا کا پہلا فلسفی جسے ''عربوں کا فلسفی'' بھی کہا جاتا ہے۔الکندی نویں صدی کے عالی شان عباسی دربار (بغداد میں) کا حصہ تھا۔اُس نے تراجم کے ذریعہ یونانی فکر اور بالخصوص ارسطو کی گہری بصیرت حاصل کی۔الکندی کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات میسر ہیں۔ وہ بصرہ کے ایک ممتاز جنوبی عرب قبیلے کندہ میں پیدا ہوا۔اُس کا باپ کوفہ کا گورنر تھا۔لڑکپن میں وہ مسلم ثقافت کے مرکز بغداد میں رہنے گیا اور وہاں یکے بعد دیگرے کئی خلفا کی زیر سرپرستی کام کیا۔اُس کی زندگی کے ایک باعث دکھ واقعہ کی کہانی بتائی جاتی ہے جب الکندی کے خیالات سے اختلاف رکھنے والے دو درباریوں نے اُس کے خلاف سازش کی اور اُسے کچھ عرصہ کے لیے اپنی وسیع لائبریری سے محروم ہونا پڑا۔الکندی کا فلسفہ ارسطوئی اور افلاطونی تصورات سے لبریز ہے جو نویں صدی عیسوی میں مسلمان مفکرین پر بہت زیادہ اثرات مرتب کر رہے تھے۔اس کا بہترین رسالہ مابعد الطبیعاتی مطالعہ ہے: ''فی الفسلفۃ الاولیٰ''۔مخصوص عناصر (مثلاً چار علتیں) میں ارسطوئی اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔تاہم، وہ بس ایک حد تک ہی ارسطوئی ہے۔اختلافی نکتہ دنیا کے ماٰخذ کے سوال پر سامنے آیا۔ارسطو دنیا کو ازلی مانتا ہے، جبکہ الکندی نے عدم میں سے وجود کی بات کی۔الکندی نے اپنے متعدد رسالوں میں ''عقل'' کی اہمیت پر زور دیا اور اسے مادے کے ساتھ ممیز کیا۔اُس نے ''الصادق'' پر بھی بحث کی جو خدا کا ایک نام ہے۔اخلاقیات اور عملی فلسفہ کے بارے میں

Marfat.com

الکندی کے خیالات رسالہ بہ عنوان "فی الھل لی ضاف الاحزان" (دکھ دور کرنے کا فن) میں ملتے ہیں۔

الفارابی، محمد ابن ترخان (al-Farabi, Muhammad ibn Tarkhan)...... (873-950)
پورا نام ابونصر محمد ابن محمد ابن ترخان ابن اُزلغ الفارابی۔ اہل عرب اسے "اُستاد ثانی" (بعد از ارسطو) کے نام سے جانتے تھے۔ بعد کے فلسفیوں مثلاً ابن سینا نے اُس کی تب وتاب کم کردی۔ اُس کی فلسفیانہ میراث بہت وسیع ہے۔ مابعدالطبیعات کے میدان میں اُسے "اسلامی نوفلاطونیت کا بانی" قرار دیا گیا۔ اگرچہ وہ ارسطوئیت (ارسطا طالیسیت) سے لبریز ہے اور بلاشبہ ارسطوئی ذخیرۂ الفاظ سے کام لیتا ہے، لیکن نوفلاطونی نکتۂ نظر اُس کی سوچ پر سب سے زیادہ غالب ہے۔ اُس کی مشہور ترین کتاب "المدینة الفضیلة" میں یہ چیز بہت واضح ہے جو نوفلاطونی تصور خدا سے لبریز ہے۔ اُس کی شخصیت کے ساتھ بہت سے قصے منسوب کردیے گئے: مثلاً یہ کہ وہ 70 سے زائد زبانیں بول سکتا تھا اور راہبانہ انداز حیات اختیار کیے ہوئے تھا۔ ہمیں قطعی طور پر بس اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ ترکستان میں پیدا ہوا اور بعد ازاں بغداد میں عربی زبان کا مطالعہ کرتا رہا۔ غالباً اُس نے اپنی زیادہ تر کتب بغداد میں ہی لکھی تھیں۔ اُس نے دمشق، مصر، ہران اور حلب کے سفر کیے اور مؤخرالذکر شہر میں ہمدانی حکمران سیف الدولہ اُس کا سرپرست بنا۔ الفارابی نے فلسفہ اور منطق کے علاوہ موسیقی میں بھی مہارت حاصل کی۔ اُس کی ایک کتاب کا عنوان "کتاب الموسیقة الکبیر" ہے۔

الغزالی (Al-Ghazzali)...... (1111–1058) ابو حامد محمد الغزالی۔ طوس میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم طوس اور نیشاپور سے حاصل کی۔ نیشاپور میں سلاجقہ نظام الملک طوسی کے دربار میں پہنچے اور پھر مدرسۂ بغداد میں مدرس کی حیثیت سے مامور ہوئے۔ جب نظام الملک اور ملک شاہ کو باطنی فدائیوں نے قتل کردیا تو انہوں نے باطنیہ، اسمٰعیلیہ اور امامیہ مذاہب کے خلاف متعدد کتب لکھیں۔ اس وقت وہ زیادہ تر فلسفہ کے مطالعہ میں مصروف رہے جس کی وجہ سے مذہبی عقائد کی طرف سے توجہ ہٹ گئی۔ لیکن آخرکار جب علوم ظاہری سے ان کی تشفی نہ ہوسکی تو تصوف کی طرف راغب ہوئے۔ وہ بغداد چھوڑ کر تلاش حق میں نکل پڑے اور مختلف ممالک کی خاک چھانی۔ انہوں نے اشعری کے شروع کیے ہوئے فلسفۂ مذہب کو انجام تک پہنچایا۔ ان کی کتاب "المنقذ من الضلال" ان کے تجربات کی آئینہ دار ہے۔ دیگر مشہور تصانیف میں درج ذیل شامل ہیں: احیاء العلوم، تحافة الفلاسفہ، کیمیائے سعادت اور مکاشفة القلوب۔

ابن سینا (Avicenna)...... (980-1037) پورا نام ابوعلی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا۔ ایرانی طبیب، دنیائے عرب و اسلام کا مشہور ترین فلسفی، سائنس دان ہے۔ وہ خاص طور پر ارسطوئی فلسفے اور طب کے میدان میں

Marfat.com

اپنے کام کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ اُس کی ''کتاب الشفا'' ایک وسیع فلسفیانہ و سائنسی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ ابن سینا بخارا کے مضافات میں ایک مقام افشہ پر پیدا ہوا۔ وہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے قبل از وقت بالغ ہو گیا اور بخارا پہنچا جہاں فلسفہ اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ سترہ برس کی عمر میں شاہ نوح ابن منصور کا کامیاب علاج کرنے کے باعث اسے شاہی کتب خانے میں آنے جانے کی اجازت مل گئی۔ اس کے بعد وہ علم و عمل میں خود اپنا استاد بن گیا۔ کسی بڑے فرماں روا کی اطاعت اُسے گوارا نہ ہوئی۔ مدتوں ایک سے دوسرے دربار میں پھرتا رہا۔ آخر کار وہ ہمدان میں شمس الدولہ کا وزیر ہو گیا۔ اِس بادشاہ کی وفات کے باعث اس کے بیٹے نے اسے چند ماہ کے لیے ایک قلعے میں بند رکھنے کا حکم دیا۔ رہائی پانے کے بعد ابن سینا علاؤالدولہ کے پاس اصفہان پہنچا اور وہیں وفات پائی۔ ابن سینا کا سب سے بڑا کارنامہ اس کی دو کتابیں ہیں۔ ''کتاب الشفا'' غالباً آج تک واحد آدمی کی لکھی ہوئی اِس قسم کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ اس میں منطق اور نفسیات فطری علوم اور مابعد الطبیعات پر بات کی گئی ہے، لیکن اخلاقیات یا سیاست کی کوئی حقیقی تصویر نہیں ملتی۔ ابن سینا کا تصورِ کائنات راسخ العقیدہ مسلمان اہل فکر سے مختلف تھا۔ وہ کائنات کو واحد تخلیقی عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ازل سے موجود سمجھتا ہے۔ اُس کی تحریریں بارہویں صدی عیسوی کے دوران سپین میں لاطینی میں ترجمہ ہوئیں۔ اُنہوں نے نہ صرف ٹامس اکوئینس بلکہ بحیثیت مجموعی قرونِ وسطیٰ کے فلسفہ پر بھی اثر ڈالا۔ ابن سینا نے اسلامی الٰہیات کو روایتی یونانی فکر کے ساتھ مدغم کر دیا۔

ابن رشد (Averroes) ...... (1126-1198) اسلامی روایات کو یونانی فکر کے ساتھ مدغم کرنے والا نہایت مؤثر فلسفی عبدالولید محمد ابن احمد ابن محمد ابن رشد مغرب میں ''Averroes'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ الموحد (الموحاد) خلیفہ ابو یعقوب یوسف کی درخواست پر اُس نے ارسطو کی کتب اور افلاطون کی ''ری پبلک'' پر تفاسیر کا ایک سلسلہ شروع کیا جس نے کئی سو سال تک مسلمان اور یورپی دنیا پر اپنے اثرات جاری رکھے۔ اُس نے ماہرین الٰہیات کے برخلاف عمل کرتے ہوئے مذہب کے فلسفیانہ پہلو کے دفاع میں ''فصل المقال''، ''کشف المناہج'' اور ''تہافتہ التہافتہ'' نامی کتب لکھیں۔ ابن رشد قرطبہ میں فقہاء کے ایک ممتاز خاندان میں پیدا ہوا اور الموحاد سلطنت کے شمالی افریقہ دارالحکومت مراکیچ میں وفات پائی۔ روایتی مسلم علوم (بالخصوص تفسیر قرآن، حدیث اور فقہ) میں دسترس حاصل کرنے کے بعد اُس نے طب اور فلسفہ میں کمال حاصل کیا اور قرطبہ کا قاضی القضاۃ تعینات ہوا۔ 1169ء اور 1195ء کے درمیانی برسوں میں ابن رشد نے ارسطو کی بیشتر تحریروں کی تفسیروں کا سلسلہ لکھا۔ ارسطو کی ''Politics'' دستیاب نہ ہو سکنے کے باعث اُس نے افلاطون کی ''ری پبلک'' کی شرح لکھی۔ ابن رشد کی شرحوں نے آنے والی صدیوں کے دوران یہودیوں اور عیسائیوں پر کافی گہرا اثر ڈالا۔ ابن رشد نے طب پر اپنی پہلی کتاب ''کلیات'' 1162ء اور 1169ء کے درمیان لکھی۔ فقہ کے موضوع پر اُس کی چند ایک تحریریں ہی ہم تک پہنچی ہیں،

Marfat.com

جبکہ کوئی بھی دینیاتی تحریر اب موجود نہیں۔ اُس کا اہم ترین کام قریبی طور پر منسلک تین فلسفیانہ مقالے (یا رسالے) ہیں جو 1179ء اور 1180ء کے درمیان لکھے گئے: ''فصل المقال'' (فقہ اور فلسفہ کی مفاہمت)، ''کشف المناہج'' (مذہبی عقائد سے متعلقہ ثبوت کے طریق ہائے کار کا تجزیہ) اور ''تہافۃ التہافۃ'' (بے ربطیوں کی بے ربطی)۔

ہیزنبرگ کا اصولِ لاقطعیت (uncertainty principle. See Heisenberg)...... دیکھیں ''ہیزنبرگ، ورنر۔''

وحدت الوجود اور وحدت الشہود...... مسلم صوفیا کے دو نظریات۔ خواجہ باقی باللہؒ کی آمد سے پہلے ہندوستان میں مقبول تمام صوفیا ایران عراق کی پیداوار تھے۔ قادریہ سلسلہ کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بغداد کے رہنے والے تھے۔ سہروردی سلسلہ سہروردیہ سے متعلق ہے جو بغداد سے چند میل کے فاصلے پر ایک قریہ تھا۔ چشت بھی خراسان کی ایک بستی ہے۔ ان تینوں سلسلوں میں جزوی اور فروعی اختلافات تھے، لیکن ان کا روحانی پس منظر ایک تھا۔ اور ان سب میں وہ عجمیت موجود تھی جو دورِ عباسیہ کو دورِ اموی سے اور بغداد کے متکلمین اور فلسفیوں کو مدینہ منورہ کے محدثین وفقہا سے منفرد کرتی ہے۔ تینوں میں وہ ''صلح کل'' کا طریقہ مقبول تھا، جس کے تحت غیر مروجہ بلکہ غیر اسلامی طریقوں سے کلی پرہیز نہ کیا جاتا۔ تینوں میں شرع کے معاملے میں تھوڑی بہت آزادی تھی اور تینوں میں وحدت الوجود کا طریق رائج ہو گیا تھا۔ حضرت باقی باللہ جس سلسلے کو لے کر ہندوستان آئے، وہ ایران کی بجائے توران کا تھا اور ماوراالنہر کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ نقشبندیہ سلسلے میں شرع کی پابندی پر بڑا زور تھا، سماع کی ممانعت تھی۔ ذکر خفی کی تلقین کی جاتی اور فرائض شرعی کو نوافل پر واضح ترجیح تھی۔ نقشبندیہ سلسلہ، حضرت مجدد کے ظہور سے پہلے ہی کئی اہم امور میں قدیم صوفیا سلسلوں سے ممتاز اور شرع سے بہت قریب تھا۔ لیکن اس کا بنیادی فلسفہ دوسرے سلسلوں سے مختلف نہ تھا۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے دونوں فلسفے ذات باری اور مخلوقات کے تعلقات کو بیان کرتے ہیں اور ان کے مطالب کے لحاظ سے انہیں توحید عینی اور توحید ظلی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ''وجود یعنی ہستی حقیقی واحد ہے لیکن ایک ظاہری وجود ہے اور ایک باطنی۔ باطنی وجود ایک نور ہے جو جملہ عالم کے لیے بمنزلہ ایک جان کے ہے۔ اسی نور باطن کا پرتو ظاہری وجود ہے جو ممکنات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ہر اسم وصفت وفعل کہ عالم ظاہر میں ہے، ان سب کی اصل وہی وصف باطن ہے اور حقیقت اس کثرت کی وہی وحدت ہے۔ جیسے امواج کی حقیقت عین ذات دریا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جملہ افراد کائنات تجلیات حق ہیں۔ اور اس کثرت اعتباری کا وجود اسی وحدت حقیقی سے ہے۔'' وحدت الشہود کا بیان یہ ہے کہ ''وجود کائنات اور مختلف آثار وصفات کا ظہور واحد مطلق کی ذات وصفات کا عکس ہے، جو عدم میں منعکس ہو رہا ہے۔ اور یہ ظل عین صاحب ظل نہیں بلکہ محض ایک مثال ہے۔'' یہ دونوں رجحانات مختلف اور متضاد ہیں، لیکن حالات کے مطابق مختلف رجحانات برسرکار آتے ہیں اور جداگانہ حالات میں جداگانہ رجحانات ہی مفید

Marfat.com

ہوتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

ارسطو (Aristotle)......(384-322bc) فلسفی، سائنسدان اور عوامی مفکر ارسطو ہمارے موروثی انداز فکر میں اس حد تک سرایت کر چکا ہے کہ ہمیں اس کا نام کبھی اجنبی نہیں لگا۔ اگر ہم مذہبی شخصیات کو شمار نہ کریں تو دنیا پر ارسطو کا اثر کسی بھی اور فرد کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ لیکن چونکہ وہ افلاطون کا شاگرد تھا اس لیے ہمیں ان تمام موضوعات پر اسے ہی فوقیت دینی چاہیے جن پر وہ افلاطون کے ساتھ اختلاف رکھتا تھا۔ ارسطو 384 قبل مسیح میں تھریسی ساحل کے ایک چھوٹے سے قصبے ستاگرا (موجودہ Stavros) میں ایک طبیب نکوماکس کے گھر پیدا ہوا۔ اس کا باپ مقدونیائی دربار کے ساتھ تعلقات رکھتا تھا۔ ارسطو اٹھارہ برس کی عمر میں ایتھنز میں افلاطون کی اکادمی میں داخل ہوا۔ وہاں بیس برس گزارنے کے بعد وہ خود بھی ایک مقرر بن گیا۔ افلاطون نے اسے ''مکتبہ کی دانش'' اور ''القاری'' دونوں قرار دیا۔ تاہم، اس نے یہ بھی کہا کہ اسے مہمیز کی بجائے لگام ڈالنے کی ضرورت ہے۔ افلاطون کی وفات (347 ق م) کے بعد ارسطو کا دل اکادمی میں نہ لگا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اب اس کا رجحان ''فلسفہ سے ریاضی کی جانب'' ہو گیا ہے۔ 342 ق م میں مقدونیہ کے فلپ دوم نے ارسطو کو دعوت دی کہ وہ اس کے تیرہ سالہ بیٹے الیگزینڈر (سکندر) کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اٹھا لے۔ اس نے دو سال تک سکندر کو پڑھایا۔ ارسطو کی ''Ethics'' (اخلاقیات) کے بارے میں ایک ذہین عام آدمی کا نکتۂ نظر یقیناً یہی ہوگا۔ جب سکندر مر چکا تھا اور ایتھنز میں مقدونیہ مخالف حکومت آ گئی تھی، اس پر ''لادینی'' کا الزام عائد کیا گیا۔ ایک ہی برس بعد 322ء میں اس کی وفات ہوگئی۔ ارسطو کی تحریروں کو عموماً تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا حصہ ''خارجی'' تحریروں پر مشتمل ہے جو سب کی سب کھو چکی ہیں (لیکن اقوال کی صورت میں ضرور موجود ہیں)۔ ارسطو نے ان تحریروں کو Exoteric (یونانی زبان میں exo کا مطلب خارجی ہے) اس لیے کہا کیونکہ یہ اکادمی میں قیام کے دوران لکھی گئیں، اور یہ اکادمی کے ارکان کی بجائے بیرونی سامعین کے لیے تھیں۔ دوسرا حصہ لائسیئم میں محققین کی معلومات کے لیے لکھی گئی یادداشتوں پر مشتمل تھا۔ تقریباً یہ سب تحریریں بھی کھو چکی ہیں۔ ہم تک پہنچنے والی زیادہ تر تحریریں تیسرے حصے کی ہیں: مقالے، لیکچر نوٹس اور لائسیئم کے طالب علموں اور Esoteric (اندرونی) لوگوں کے لیے لکھی گئی ٹیکسٹ بکس۔ مختلف دھڑوں نے ارسطو کو اپنے اپنے نکتۂ نظر کی حمایت میں استعمال کیا۔ پہلی صدی قبل مسیح میں اس کی کتابوں کا یونانی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس طرح اس کے اثر کا پہلا دور شروع ہوا اور نتیجتاً 529ء میں جسٹینین نے ایتھنز میں فلسفہ پڑھانے پر پابندی لگا دی۔ اب عرب اس کی جانب متوجہ ہوئے: ابن سینا اور ابن رشد دونوں نے اسے مستند مانا، اور ان کی لکھی ہوئی تفسیروں کے ذریعہ ہی ارسطو کی تحریروں کے لاطینی تراجم سپین کے راستے واپس یورپ پہنچے۔ دانتے نے ارسطو کو ''اہلِ علم کا گرو'' قرار دیا۔

Marfat.com

باب 4

اصولیات

Methodology

ایلیاٹک مکتبۂ فکر (Eleatic School) ...... یونانی فلسفہ کا ایک مکتبۂ فکر جس نے چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح کے دوران شہرت حاصل کی۔ ایلیاٹک کی سوچ ایونیائی مادیت پسندانہ فلسفہ اور یونانی فلسفی ہیراکلیتس کی عالمگیر بہاؤ کی تھیوری دونوں سے اختلاف رکھتی ہے۔ اس کے مطابق کائنات بنیادی طور پر ایک غیر متغیرا کائی ہے، کہ یہ زمان اور مکان میں لامحدود ہونے کے باعث انسانی فہم کے دائرے سے باہر ہے۔ ایلیاٹک فلسفیوں نے زور دیا کہ فلسفیانہ غور وفکر کے ذریعہ ہی مطلق سچائی کو جانا جا سکتا ہے۔ حسیاتی مشاہدات حقیقت کا محض ایک محدود اور مسخ شدہ نظارہ ہی فراہم کرتے ہیں۔ ایلیاٹک کا نام جنوبی اٹلی میں یونانی شہر ایلیا سے ماخوذ ہے۔ ژینو اور پارمینائیڈز یہیں کے رہنے والے تھے جو مکتبۂ فکر کے مرکزی نمائندے بنے۔ اس بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ مکتبہ فکر کی بنیاد ژینوفون نے رکھی تھی یا پارمینائیڈز نے۔ بہت سے ایلیاٹک نظریات کی بنیاد ژینوفون کی تعلیمات پر تھی، جبکہ پارمینائیڈز نے ایلیاٹک نظریات کو مابعد الطبیعات کے ایک نظام کی صورت دی۔ ایلیاٹک فلسفہ افلاطون کے مابعد الطبیعاتی نظام کی بنیاد بنا۔

ہیراکلیتس (Heraclitus) ...... (540?-480?bc) مادیت پسند اور جدلیاتی طریقۂ کار اپنانے والا یونانی فلسفی۔ وہ ایشیائے کوچک میں ایک قدیم یونانی شہر ایفی سس میں پیدا ہوا (جو اب ترکی میں ہے)۔ یہ جگہ فلسفے کی جائے پیدائش ملیتس سے زیادہ دور نہ تھی۔ ہم ہیراکلیتس کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تمام قدیم سوانحات میں اس کے اقوال کی بنیاد پر ہی کچھ اندازے لگائے گئے۔ اگرچہ اس نے اپنے سیاسی خیالات کھل کر بیان نہیں کیے، لیکن غالباً وہ عوام کے لیے ارسٹوکریٹک جذبۂ تحقیر کا حامل اور چند دانا افراد کی حکومت کا حامی نظر آتا ہے۔ ہیراکلیتس نے اپنے پیش رووں اور ہم عصروں پر تنقید کی کہ وہ تجربے میں اتحاد کو شناخت کرنے میں ناکام رہے تھے۔

Marfat.com

وہ ایک ابدی لوگوس (Word) کے اعلان کا دعویدار ہے جس کے مطابق تمام چیزیں کچھ اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ افلاطون اور ارسطو دونوں کے مطابق ہیراکلیتس کے نظریات منطقی بے آہنگی پر منتج ہوتے ہیں۔ ہیراکلیتس کی مابعدالطبیعاتی خیال آرائیوں کی بنیاد ایک طبیعی تھیوری پر ہے۔ وہ ایک ہی جملے میں اپنی تکوینیات کے اصول بیان کر دیتا ہے: ''یہ نظام دنیا کسی دیوتا اور نہ ہی کسی انسان نے تخلیق کیا، لیکن یہ ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا۔'' یہاں اس نے پہلی مرتبہ لفظ Kosmos استعمال کیا جس سے نظام دنیا مراد ہے۔ اس نے پہلی بار فلسفہ میں انسانی اقدار کو مرکز بحث بنایا۔ اس کا تشبیہاتی انداز اور عمومی سچائیوں پر تحقیق کرنے کا طریقہ بے مثال ہے۔ رواقیوں (Stoics) نے ہیراکلیتس کے طبعی اصولوں کو اپنے نظریات کی بنیاد بنایا۔

فیثاغورث (Pythagoras)...... (582?-500?bc) یونانی فلسفی اور ریاضی دان، جزیرہ ساموس میں پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی ایونیائی فلسفیوں تھیلس، اناکسی ماندر اور اناکسی مینیز کی تعلیمات کا مطالعہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے پولی کریٹس کی استبدادیت سے تنفر کا اظہار کرنے کے باعث ساموس سے نکلنا پڑا۔ تقریباً 530 قبل مسیح میں وہ جنوبی اٹلی میں ایک یونانی کالونی کروٹونا میں رہنے لگا اور وہاں مذہبی، سیاسی اور فلسفیانہ مقاصد رکھنے والی ایک تحریک کی بنا ڈالی جسے ہم فیثاغورث اِزم کے نام سے جانتے ہیں۔ فیثاغورث کے فلسفہ کے متعلق ہمیں صرف اُس کے شاگردوں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے۔ فیثاغورث ازم کا مکتبہ تحریک کی صورت میں مختلف فلسفیوں کے ہاں فروغ پاتا رہا۔ فیثاغورث اور اُس نظریات کے متعلق کوئی ایسا بیان دینا مشکل ہے کہ جو تاریخ قرار پا سکے۔ فیثاغورث نے تناسخ (Transmigration) کے ایک عقیدے کی تعلیم دی: یہ انسانوں اور جانوروں کو زمین کے بچے ہونے کے ناتے ایک جیسا خیال کرنے کے قدیم اعتقاد کی ترقی یافتہ صورت تھی۔ اس کی بنیاد مخصوص اقسام کی خوراک کھانا ممنوع قرار دینے پر تھی' یعنی جانوروں کے گوشت سے پرہیز۔ اس کی اساس انسانیت پسندی یا مرتاضانہ وجوہ نہیں تھیں۔ اس نے اطاعت اور مراقبہ، کھانے میں پرہیز' سادہ لباس اور تجزیہ ذات کی عادت پر زور دیا۔ فیثاغورث پسند لافانیت اور تناسخ ارواح پر یقین رکھتے تھے۔ فیثاغورث پسندوں کی وسیع ریاضیاتی تحقیقات میں طاق اور جفت اعداد پر مطالعہ بھی شامل تھا۔ انہوں نے عدد کا تصور قائم کیا جو ان کی نظر میں تمام کائناتی تناسب، نظم وضبط اور ہم آہنگی کا مطلق اصول بن گیا۔

دیماقریطس (Democritus) ...... (460?-370?bc) ڈیماکریٹس۔ کائنات کا ایٹمی نظریہ پیش کرنے والا یونانی فلسفی، ابدیرا میں پیدا ہوا۔ کچھ محققین اس کا سن پیدائش 490 قبل مسیح بھی بتاتے ہیں۔ اس کے باپ کا تعلق ایک اعلیٰ اور امیر کبیر خاندان سے تھا۔ باپ کی وفات کے بعد وہ دانش کی تلاش میں سفر پر روانہ ہوا اور ترکہ میں ملنے والی ساری دولت اسی مقصد میں لگائی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مصر، ایتھوپیا، فارس اور ہندوستان گیا۔ قدرتی

Marfat.com

مظاہر کے علم نے اسے شہرت دلا دی۔ دنیا کے بدلتے ہوئے طبیعی مظاہر کو بیان کرنے کی کوشش میں دیما قریطس نے زور دیا کہ خلا یا لاشئے (Void) کو بھی موجود سمجھنا اتنا ہی بجا ہے جتنا کہ حقیقت یا ہستی کو۔ اس نے لاشئے کو ایک لامحدود خلا تصور کیا جس میں ہستی (یعنی طبیعی دنیا) کو بنانے والے ایٹم محدود تعداد میں حرکت کرتے ہیں۔ یہ ایٹم ابدی اور غیر مرئی ہیں؛ اس قدر چھوٹے کہ ان کی مزید تخفیف ممکن نہیں۔ (اسی وجہ سے ان کا نام ایٹم یعنی ناقابل تقسیم رکھا۔ عربی میں اس کا ترجمہ لاتجزیٔ بھی کیا جاتا ہے، یعنی جس کے مزید اجزا نہ کیے جا سکیں)۔ ایٹم بے مسام ہیں اور اپنی زیر قبضہ تمام جگہ کو پر کر دیتے ہیں۔ ان کے درمیان صرف شکل، ترتیب، مقام اور تعداد کا فرق ہے۔ لیکن مقدار میں اختلاف کے نتیجہ میں کیفیتی اختلاف محض ظاہری ہیں۔ ایٹموں کی مختلف ترتیب اور امتزاجات ہماری حسیات کو مختلف انداز میں متاثر کرتے ہیں۔

اپی قوریت (Epicureanism)...... فلسفہ کا ایک نظام جس کی بنیاد یونانی فلسفی اپی قورس کی تعلیمات پر تھی۔ اپی قوریت کا مرکزی اصول یہ ہے کہ مسرت اعلیٰ ترین نیکی اور زندگی کا مقصد ہے۔ عقلی مسرتیں شہوانی مسرتوں سے بالاتر ہیں جو ذہن کا سکون برباد کرتی ہیں۔ اپی قورس نے کہا کہ حقیقی مسرت دیوتاؤں، موت اور حیات بعد الموت کے خوف کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی متانت ہے۔ فطرت کے بارے میں تمام اپی قوری خیالات کا مطلق مقصد لوگوں کو اس قسم کے خوفوں سے نجات دلانا ہے۔ اپی قوری نفسیات نہایت گہرائی میں مادیت پسندانہ ہے۔ سترہویں صدی میں فرانسیسی فلسفی پیئرے گیساندی نے اسے اپنایا۔

رواقیت (Stoicism)...... فلسفہ کا ایک مکتب جس کی بنیاد قدیم یونان میں رکھی گئی۔ یہ زندگی اور فرض کے متعلق نکتۂ نظر میں اپی قوریت کا مخالف تھا۔ رواقی فلسفہ کلبیوں (Cynics) کے فلسفے سے شکل پذیر ہوا جس کے یونانی بانی اینٹی ستھینز کا شاگرد سقراط تھا۔ جب اپی قورس اور اس کے دوست باغ میں لطف اندوز ہو رہے تھے تو اسی دور میں سائپرس کا ایک ہیلینیائی رنگ میں رنگا ہوا شخص ژینو (370-342) ایتھنی احاطۂ عوام کے منقش دالان (Painted Stoa) میں تعلیم دے رہا تھا۔ چنانچہ وہ اور اس کے پیروکار Stoic کہلائے (جنہیں اردو میں رواقی کہا جاتا ہے)۔ یہ درست ہے کہ رواقیوں کو عوامی زندگی میں حصہ لینے اور دوسروں کی بھلائی کے لیے دل کھول کر کام کرنے پر ابھارا گیا۔ رواقیوں نے تعلیم دی کہ خود کو الوہی عمل سے ہم آہنگ کرنا تبھی ممکن ہے جب آپ سائنسی انداز میں سمجھ لیں کہ لوگوس نے اس کی پروگرامنگ کی ہے جسے بدلا نہیں جا سکتا۔

جیمز، ولیم (James, William)...... (1842-1910) امریکی فلسفی اور نفسیات دان، نتائجیت پسند فلسفیانہ تحریک اور فنکشنل ازم کی نفسیاتی تحریک کا ایک راہنما۔ وہ نیویارک میں پیدا ہوا۔ اس کا ایک بھائی ناول نگار

Marfat.com

ہنری جیمز تھا۔ اس نے لارنس سائنٹیفک سکول میں داخلہ لے لیا۔ کیمسٹری، اناٹومی اور ایسے ہی دیگر مضامین میں کورسز کرنے کے بعد وہ ہارورڈ میڈیکل سکول میں طب کا مطالعہ کرنے گیا۔ لیکن تعلیم بیچ میں ہی چھوڑ کر ممتاز فطرت پسند لوئی آگاسی کے ہمراہ بطور اسسٹنٹ امیزون میں ایک تحقیقاتی مہم پر گیا۔ 68-1867ء کے دوران طبیعات دان ہرمان واں ہیلم ہولٹز کے ساتھ کورسز کرنے گیا۔ نومبر 1868ء میں واپس وطن آنے پر وہ بیمار تھا۔ جون 1869ء میں ہارورڈ میڈیکل سکول سے ایم ڈی ڈگری حاصل کرنے کے باوجود پریکٹس شروع نہ کر سکا۔ وہ 1872ء تک اپنے باپ کے گھر میں ہی نیم معذوری کی زندگی گزارتا اور صرف مطالعہ کرتا ہے۔ 1872ء میں جیمز ہارورڈ کالج میں فزیالوجی کا انسٹرکٹر تعینات ہوا، لیکن 1876ء میں اپنی اصل دلچسپی یعنی نفسیات کی جانب رجوع کیا۔ 1880ء میں اُس نے نفسیات کے لیے ایک نصابی کتاب تیار کرنے کا معاہدہ کیا، لیکن یہ منصوبہ ایک مختلف صورت اختیار کر گیا اور "Principles of Psychology" کے طور پر سامنے آیا۔ اس کتاب نے نفسیات میں فنکشنل (فعلی) نکتۂ نظر متعارف کروایا۔ اس نے ذہنی سائنس کو حیاتیاتی طریقہ ہائے کار کے ساتھ متحد کیا اور فکر و علم کو جہد حیات میں بطور آلات تصور کیا۔ آزادی اور اختیار کے بارے میں اس کے نظریات 1893ء اور 1903ء کے درمیان مختلف مضامین اور لیکچرز اور بعد ازاں مختلف کتب میں سامنے آئے جن میں سے "The Will to Believe" (1897ء) اہم ترین تھی۔ 1898ء میں وہ کیلی فورنیا میں ایک لیکچر میں نتائجیت نامی طریقۂ کار کی تھیوری تشکیل دے چکا تھا۔ 1906ء میں جیمز نے بوسٹن میں لیکچرز دینے کے بعد اُنہیں "Pragmatism A New Name for Old Ways of Thinking" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس کے بعد اُس کی دیگر تحریریں بھی منظر عام پر آئیں: مثلاً "Does Consciousness Exist?"؛ "The Experience in Activity" اور "Essays in Radical Empiricsm"۔

ڈیوی، جان (Dewey, John)...... (1952-1859) امریکی فلسفی اور ماہر تعلیم، نتائجیت پسند مکتبۂ فکر کے بانیوں میں سے ایک، فنکشنل نفسیات میں پہل کار اور امریکہ میں تعلیم کے لیے ترقی پسند تحریک کا راہنما۔ اس نے نتائجیت کا شکاگو مکتبۂ فکر قائم کیا۔ اس کی پیش کردہ نئی نتائجیت انسٹرومینٹلزم یا انسانیت پسند فطریت کہلائی۔ جان ڈیوی برلنگٹن، ورمونٹ کے آرچی بالڈ ڈیوی اور لوسیانا کا بیٹا تھا۔ اس نے برلنگٹن کی ورمونٹ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ 1884ء میں جان ہاپکنز یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ڈیوی مشی گن یونیورسٹی گیا اور وہاں فلسفہ و نفسیات کا انسٹرکٹر تعینات ہوا۔ اس نے مشی گن میں اپنے آئندہ دس برس کے دوران ہیگل اور برطانوی نوہیگلیوں کے علاوہ جی سٹینلے ہال اور ولیم جیمز کی بیان کردہ نئی تجرباتی فزیالوجیکل نفسیات کے مطالعہ پر بھی توجہ مرکوز کی۔ ایک فلسفۂ تعلیم کی جستجو ڈیوی کی توجہ کا مرکز بن گئی اور اس کی سوچ نئی راہوں پر گامزن ہوئی۔ جان ڈیوی کی

Marfat.com

فلسفیانہ دلچسپیوں کا محور ''نظریۂ علم'' تھا۔ ڈیوی نے ایک نیا ماڈل بنانے کی ضرورت محسوس کی اور زندگی بھر اسے بہتر بناتا رہا۔ اپنی تحریروں، مثلاً ''Is Logic a Dualistic Science''(1890ء) اور ''The Present Position of Logical Theory''(1891ء) میں اس نے ہیگلی عینیت کی بنیاد پر علمیاتی مسائل کا حل پیش کیا۔ مگر 1890ء کی دہائی میں وہ آہستہ آہستہ اس نقطۂ نظر سے منحرف ہونے لگا۔ وہ اپنے نئے نقطۂ نظر کو ''Instrumentalism'' کا نام دیتا ہے۔ ڈیوی نے اس باہم متعامل فطرت پسندی کو واضح انداز میں پہلی مرتبہ اپنے چار مضامین ''Studies in Logical Theory'' پر لاگو کیا، اور نتائجیت کی جانب میلان دکھایا۔ جان کاری کے عمل کا ایک تفصیلی جنیاتی تجزیہ ''Studies'' میں اہم ترین چیز ہے۔ اس کی نظر میں مثالی معاشرہ وہ ہے جو اپنے اراکین کو تجربے کے ہر دم وسیع ہوتے ہوئے حالات مہیا کرے۔ فلسفہ اور نفسیات میں جان ڈیوی کا کام اس کی مرکزی دلچسپی یعنی تعلیمی اصلاح پر مرکوز تھا۔ تعلیمی کسوٹیاں اور مقاصد پیش کرتے ہوئے اس نے معاصر نفسیات کی پیش کردہ تفہیم کو بچوں پر لاگو کیا۔ اس موضوع پر اس کی تحریریں ''The School Society''(1899ء) اور ''The Child and Curriculum''(1902ء) جدید فلسفۂ تعلیم کا بنیادی مسلک بن گئیں۔

فنا (fana)...... فنا کا لغوی مطلب ہے 'تباہ کر دینا'۔ سائنسی لحاظ سے اس کا مفہوم annihilate میں ادا ہوتا ہے۔ جب مادہ اور ضد مادہ کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو دونوں فنا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جب ذرہ اور ضد ذرہ کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو دونوں فنا ہو جاتے ہیں۔

حقیقت پسندی (realism)...... آرٹ اور ادب میں انسانی رویوں اور گردوپیش کو بیان کرنے یا حقیقی زندگی کی اشیا اور شبیہوں کو جوں کا توں پیش کرنے کی کوشش۔ ساری تاریخ کے دوران فنون میں گاہے بگاہے حقیقت پسندی کی کوششیں ہوتی رہی ہیں؛ تاہم، یہ اصطلاح عموماً انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہونے والی ایک تحریک تک محدود ہے جو رومانویت کے نہایت موضوعی نکتۂ نظر کا ردعمل تھی۔ حقیقت پسندی اور فطرت پسندی کے درمیان فرق کو بیان کرنا مشکل ہے، اور دونوں اصطلاحات اکثر متبادل معنوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ امر انہیں ممیز کرتا ہے کہ حقیقت پسندی کا تعلق براہ راست حسیاتی معلومات سے ہے؛ جبکہ فطرت پسندی کی اصطلاح ادب پر زیادہ موزوں انداز میں لاگو ہوتی ہے اور یہ آرٹ پر سائنسی نظریات لاگو کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ آرٹ میں اگرچہ قطعی معنوں میں کبھی کوئی حقیقت پسند مکتبۂ فکر وقوع پذیر نہیں ہوا، لیکن مختلف ادوار میں ایک حقیقت پسندانہ طرز فکر اکثر آشکار ہوتی رہی۔ کسی فن پارے کو بیان کرنے میں استعمال ہونے والی ''حقیقت پسند'' کی اصطلاح سے اکثر ''خوب صورت'' کے برعکس ''بدصورت'' اشیا یا شبیہوں کو پیش کرنا ہوتا ہے۔

Marfat.com

ولیم ایس بیک (William S. Beck)......(-1923) ہیماٹالوجی کا ممتاز ماہر، ہارورڈ میڈیکل سکول میں میڈیسن کا پروفیسر، میساچوسٹس جنرل ہاسپٹل میں ہیماٹالوجی ریسرچ لیبارٹری کا ڈائریکٹر۔ وہ امریکہ میں پیدا ہوا، پنسلوینیا یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور بعدازاں مشی گن یونیورسٹی میں منتقل ہوگیا جہاں سے 1943ء میں بی ایس اور تین سال بعد ایم ایس کی ڈگری لی۔ اس دوران وہ ایٹامک انرجی پروجیکٹ کے ساتھ چیف آف ہیماٹالوجی اینڈ میڈیکل سیکشنز کے ساتھ منسلک رہا۔ 1955ء میں اس نے نیویارک یونیورسٹی میں اینزائم کیمسٹری کا مطالعہ کرنے کے لیے چھٹی لی اور تحقیق و تدریس میں مشغول رہا۔ اس نے ہارورڈ یونیورسٹی میں ہیماٹالوجی بھی پڑھائی اور بائیو کیمیکل سائنسز کا ٹیوٹر بھی رہا۔

Marfat.com

باب 5
اسمائے حسنیٰ
Appellations of "Allah"

توریت (Torah)...... عبرانی میں ''شریعت'' یا ''عقیدہ۔'' یہودیت میں خمسہٴ موسیٰ، بالخصوص جب وہ طومار کی شکل میں پڑھنے کے لیے کنشت میں رکھا جائے۔ توریت یہودوی مذہب اور شریعت کا سنگ بنیاد ہے۔ طوماروں کو مقدس ترین سمجھا جاتا ہے اور راسخ العقیدہ لوگ اسے عزیز رکھتے ہیں۔ ہر کنشت میں متعدد طومار رکھتے ہوتے ہیں اور ہر ایک کو نہایت قیمتی اور سجے ہوئے کپڑے سے ڈھکا جاتا ہے۔ توریت کے احترام میں ایک خصوصی دن سمرہت (شریعت کا جشن) منایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تمام یہودی صحائف مع تفاسیر کو مجموعی طور پر بھی توریت کہتے ہیں۔

زبور (Psalms)...... لفظی مطلب ''گیت۔'' عہد نامہٴ عتیق کی ایک کتاب جس میں 150 بھجن یا نظمیں ہیں۔ چند ایک گیت انفرادی گانے والوں کے لیے لکھے ہوئے لگتے ہیں۔ زیادہ تر پیشہ ور مغنیوں کے لیے لکھے گئے اور ان میں موسیقاروں کے لیے ہدایات بھی شامل ہیں۔ یسوع مسیح نے اکثر زبور میں سے حوالے دیے۔ سینٹ آگسٹائن نے اسے ''عقیدت کی زبان'' جبکہ مارٹن لوتھر نے ''ننھی بائبل'' قرار دیا۔

اناجیل (Gospels)...... یسوع مسیح کی زندگی اور تعلیمات کے چار بیانات جو عہد نامہٴ جدید کی ابتداء ہیں۔ عیسائی گرجا گھروں میں سروس کے دوران ان کتابوں سے اقتباسات پڑھے یا گائے جاتے ہیں۔ انگلش اصطلاح Gospel کا مطلب ''خوش خبری'' ہے۔ محققین عموماً اتفاق رکھتے ہیں کہ چاروں اناجیل (متی، مرقس، لوقا اور یوحنا) کی بنیاد آرامی کی زبانی یا لکھی ہوئی روایات پر تھی۔ پہلی تین اناجیل کو Synoptic اناجیل بھی کہا جاتا ہے (یونانی زبان میں synoptikos کا مطلب بہ نظر طائر دیکھنا ہے)، کیونکہ ان میں یسوع مسیح کی زندگی اور تعلیمات کا مختصر بیان دیا گیا تھا۔ وہ تقریباً ایک جیسے واقعات بیان کرتی اور متعدد جگہوں پر اتفاق بھی کرتی ہیں۔ جملے بھی ملتے جلتے ہیں۔ یوحنا کی انجیل میں مسیح کی زندگی کے متعلق بہت سی ایسی باتیں بھی ہیں جو دیگر اناجیل میں نہیں

Marfat.com

ملتیں۔

الکیمیا (Alchemy) ......عملی کیمیا کو انسان اور اس کائنات کے ساتھ اس کے تعلقات کے باطنی یا جادوئی تصورات کو یکجا کرنے والی ایک 'جعلی' سائنس۔ بالاصل غالباً تیسری صدی قبل مسیح سے پہلے چین اور مصر میں ترقی پانے والی الکیمیا ایشیا، یورپ اور اسلامی ملکوں میں پندرہ سو سال سے زائد عرصہ تک سائنس اور فلسفہ کی باقاعدہ ایک شاخ کے طور پر موجود رہی۔ یہ جدید کیمیا کی جد امجد ہے۔ الکیمیا (جو مسلمانوں کو مصر سے ورثہ میں ملی تھی) نے سینکڑوں اتفاقی دریافتوں کے ذریعہ کیمیا میں حصہ ڈالا۔ عملی لحاظ سے تمام مسلمان سائنس دان یقین رکھتے تھے کہ تمام دھاتیں ایک ہی نوع کی ہیں، لہٰذا ایک دھات کو دوسری میں تبدیل کرنا ممکن ہے۔ الکیمیا دانوں کا مقصد لوہے، تانبے، سیسے یا جست جیسی دھاتوں کو سونے یا چاندی میں تبدیل کرنا تھا۔ خون، بال، فضلے اور دیگر مرکبات پر مختلف کیمیائی تجربات کیے گئے تا کہ اُن کی جادوئی ''الاکسیر'' کا کھوج لگایا جا سکے۔ خیال تھا کہ اِس اکسیر کا حامل شخص طویل زندگی گزارنے کے قابل ہوگا۔ مشہور ترین الکیمیا دان جابر بن حیان (65-702ء) تھا۔ وہ کوفہ کے ایک ادویہ ساز کا بیٹا تھا، اُس نے بطور طبیب کام کیا اور اپنا زیادہ تر وقت کیمیائی تجربات میں گزارا۔ نامعلوم مصنفین کی لکھی ہوئی ایک سو یا زائد تصانیف اُس سے منسوب کر دی گئیں؛ اِن میں سے متعدد کتب کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور یورپی کیمیا کی ترقی پر گہرا اثر پڑا۔ دسویں صدی عیسوی کے بعد دیگر سائنسوں کی طرح کیمیا نے بھی علم الاسرار کی برتری کو قبول کر لیا اور کوئی تین سو سال تک دوبارہ اپنا سر نہ اُٹھا سکی۔

الاکسیر (Al-iksir/Elixir) ......زخم خشک کرنے کے لیے موثر دوا'' یہ شفاف اور میٹھے ذائقے والا مائع طبی مقاصد میں استعمال ہوتا ہے۔ اسے کھانے سے امراض دور ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی خیال کیا جاتا تھا الاکسیر پینے والا شخص ابدی زندگی یا ابدی جوانی حاصل کر لیتا ہے۔ بہت سے الکیمیا دانوں نے الاکسیر بنانے کی کوشش کی۔ انگلش کا لفظ Elixir الاکسیر کی ہی بدلی ہوئی صورت ہے۔

الرازی، (Al-Razi) ......(?925-?854) پورا نام ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی۔ مسلمان طبیب اور فلسفی جس کی طب سے متعلق تحریروں نے اسلامی دنیا کے ساتھ ساتھ قرون وسطیٰ کے مغربی یورپ پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ انسانیت پسند معالجوں میں الرازی کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ وہ تہران کے قریب رے میں پیدا ہوا، بغداد میں کیمیا، الکیمیا اور طب کا مطالعہ کیا اور کوئی 131 کتب تصنیف کیں (جن میں سے نصف طب پر تھیں اور زیادہ تر اب موجود نہیں)۔ بیس جلدوں پر محیط اُس کی ''کتاب الحیوی'' طب کی ہر شاخ کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ 1935ء میں پیرس یونیورسٹی کے شعبۂ طب کی ساری لائبریری میں موجود نو کتب میں سے ایک تھی۔ چیچک اور

Marfat.com

خسرے کے بارے میں اُس کا مقالہ براہِ راست مشاہدے اور کلینکل تجزیے کا شاہکار تھا۔ پہلی بار اِسی مقالے میں چھوت کی بیماریوں کا بالکل درست مطالعہ کیا گیا۔ 1498ء اور 1866ء کے درمیان اس کے چالیس انگریزی ایڈیشن شائع ہوئے۔ الرازی کی سب سے مشہور کتاب دس جلدوں پر محیط طبی سروے ''کتاب المنصوری'' تھی جو خراسان کے سلطان کے نام منسوب کی گئی۔ کریمونا کے جیرارڈ نے اِس کا لاطینی ترجمہ کیا؛ اِس ترجمے کی نویں جلد بعنوان ''Nonus Almansoris'' سولہویں صدی تک یورپ بھر میں ایک مقبولِ عام نصابی کتاب تھی۔ الرازی مسلم طبیبوں میں، اور قرون وسطیٰ کے ماہرین طبی علاج میں بھی عظیم ترین تھا۔ وہ نہایت مفلسی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہوا۔

لائینیس، کارل (Linnaeus, Carl) ...... (1707-78) سویڈش فطرت پسند جس نے پودوں اور جانوروں کی درجہ بندی اور تنظیم کے لیے دہرے ناموں والا طریقہ وضع کیا۔ لائینیس اپنے باپ کے وسیع وعریض باغ کی وجہ سے علم النباتات کی جانب مائل ہوا۔ 1730ء میں اس نے پودوں کی درجہ بندی کے لیے اپنا جداگانہ نظام وضع کر لیا تھا۔ 1751ء میں اس نے اپنی مؤثر ترین کتاب ''Philosophia botanica'' شائع کی جس میں دعویٰ کیا کہ درجہ بندی کا ایک فطری نظام بنایا جا سکتا ہے۔

ڈارون، چارلس رابرٹ (Darwin, Charles Robert) ...... (1809-1882) برطانوی سائنس دان جس نے جدید نظریۂ ارتقا کی بنیاد رکھی۔ اس کے کام نے زندگی اور علوم کے علاوہ بہ حیثیت مجموعی جدید فکر پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ وہ کئی حوالوں سے اپنے عظیم پیش رو گلبرٹ وائٹ (93-1720) سے مشابہ تھا۔ وائٹ کی طرح ڈارون نے بھی فطرت کو ''نہایت بھرپور'' تصور کیا اور تجسس و جوش وخروش کے ساتھ اس کا کھوج لگانے کی خواہش کی۔ وہ انگلینڈ اور ویلز کی سرحد کے قریب شروپشائر میں شریوبری کے مقام پر پیدا ہوا۔ وہ طبیب اور سائنس دان ایرا سمس ڈارون کا پوتا تھا۔ 1828ء میں جب چارلس ڈارون کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوا تو جلد ہی علم نباتات اور علم حیوانات میں دلچسپی لینے لگا۔ اس نے 1831ء میں گریجوایشن کی اور اسی سال کے آخر میں H.M.S. Beagle بحری جہاز پر سائنسی دریافت کے سفر کے لیے (بطور فطرت پسند) سوار ہو گیا۔ وہ پانچ سال بعد واپس آیا تو اس کا ذہن Tenerife، کیپ وردے جزائر، برازیل اور دیگر مقامات پر دیکھی ہوئی چیزوں سے لبریز تھا۔ اس مہم کے دوران اسے کوئی مرض بھی لاحق ہو گیا تھا جو تادم آخر ساتھ رہا (یہ نہیں معلوم کہ وہ مرض کیا تھا)۔ وہ تھک جانے پر وہیل چیئر میں پناہ لیتا۔ اس نے 1839ء میں اپنے پہلے سائنسی سفر کا حال بھی شائع کیا۔ بہت سے مقامات پر اپنے کیے ہوئے مشاہدات کے ساتھ ڈارون نے یہ نتیجہ اخذ کرنا شروع کیا کہ انواع کا جدامجد غالباً مشترکہ ہے۔ ڈارون سے پہلے فرانسیسی ماہر نباتات ژاں باپتست دی لیمارک (1829-1744ء) نے انواع میں تنوعات پر

Marfat.com

زور دیا تھا اور اپنی کتب میں انسانی ارتقا کی بابت بات کی تھی۔ ڈارون نے مالتھس سے جہد للبقا(Struggle for existence) کا اصول اخذ کیا اور ہربرٹ سپنسر کا ''موزوں ترین کی بقا'' کا تصور بھی مستعار لے لیا۔ 1840ء کی ساری اور 1850ء کی زیادہ تر دہائی کے دوران ڈارون انواع کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھنے کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ الفرڈ رسل والیس اور ڈارون نے تحریر یکم جولائی 1858ء کو Linnean سوسائٹی کے سامنے ایک مشترکہ پیپر پیش کیا اور اگلے ہی برس ڈارون کی ''انواع کا ماخذ'' منظر عام پر آئی۔ بعدازاں ڈارون نے ''توریث آدم'' اور ''انسان اور جانوروں میں جذبات کا اظہار'' (1871ء اور 1872ء) لکھ کر مزید وضاحت کی۔

وجودیات (Ontology)...... ہستی کا علم یا مطالعہ۔ اسے حقیقت یا وجود کی نوعیت پر تحقیق بھی کہا جا سکتا ہے۔ روایتی طور پر یہ مابعد الطبیعات فلسفہ کا ایک حصہ تھا۔ وجودیات کا تعلق ان سوالات سے ہے کہ آیا ہستیاں وجود رکھتی ہیں یا انہیں موجود قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور مشابہتوں اور فرق کی بنیاد پر ان ہستیوں کی گروپ بندی کیسے کی جا سکتی ہے۔

کیہونے، رابرٹ او (Keohane, Robert O.)...... (1941-) امریکی محقق جو اپنی کتاب ''After Hegemony'' (1984ء) کی اشاعت کے بعد بین الاقوامی تعلقات میں نیولبرل ازم کی تھیوری سے منسلک ہو گیا۔ وہ پرنسٹن یونیورسٹی کے ووڈ رو ولسن سکول میں پولیٹکل سائنس کا پروفیسر ہے۔

نائی، جوزف سیموئل (Nye, Joseph Samuel)...... (1937-) جس نے رابرٹ کیہونے کے ساتھ مل کر بین الاقوامی تعلقات کی تھیوری ''نیولبرل ازم'' کی بنیاد رکھی۔ یہ تھیوری 1977ء میں ان کی کتاب ''Power and Interdependence'' میں منظر عام پر آئی۔ انہوں نے ورائے قوم تعلقات اور عالمی سیاست پر بھی تحقیق کی۔ کلنٹن انتظامیہ اور اس کے بعد اوباما نے اس کے ''سمارٹ پاور'' کے تصور کو مقبولیت دلائی۔ نائی ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ 2011ء میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق جوزف نائی گزشتہ بیس برس کے دوران بین الاقوامی تعلقات کے شعبہ میں مقبولیت کے لحاظ سے چھٹے نمبر (1700 میں سے) پر ہے۔

کجیٹ، گریگوری (Cajete, Gregory A.)...... سانتا کلارا پوبلو، نیو میکسیکو سے تعلق رکھنے والا مصنف اور پروفیسر جس نے مغربی نوعیت رکھنے والی سائنسوں میں دیسی باشندوں کے تناظر کا امتزاج پیدا کیا۔ اس کی تعلیمات کا محور ''ثقافت پر مبنی سائنس'' ہے جس میں صحت مندی پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ Cajete نے نیو میکسیکو سے بایالوجی اور سوشیالوجی میں بیچلر آف آرٹس کی ڈگری حاصل کی اور پھر نیو میکسیکو یونیورسٹی سے ماسٹر آف آرٹس کیا۔ لاس کے انٹرنیشنل کالج کے نیو فلاسفی پروگرام کے تحت اس نے اپنی ڈاکٹریٹ مکمل کی۔ اس وقت وہ

Marfat.com

Albuquerque میں نیومیکسیکو یونیورسٹی میں تعلیم کا ایسوسی ایٹ پروفیسر ہے۔ اس نے سانتا فے کے امیریکن انڈین آرٹس انسٹی ٹیوٹ میں اکیس برس تک پڑھایا۔

ملحدیت (atheism)...... دیوتا یا دیوتاؤں کے موجود ہونے سے انکار یا ان پر یقین کا فقدان۔ انگریزی کی اصطلاح atheism کا مطلب ''معبود کا نہ ہونا'' ہے۔ عربی لفظ الحاد کا مطلب ''ایک طرف مڑنا'' بتایا جاتا ہے۔ دیوتاؤں کی موجودگی سے انکار زوردار یا مثبت جبکہ ان پر یقین کا فقدان منفی یا کمزور ملحدیت ہے۔ اگرچہ ملحدیت کو اکثر لاادریت --- یہ نظریہ کہ ہم دیوتا کے موجود ہونے یا نہ ہونے کو نہیں جان سکتے --- سے ممیز کیا جاتا ہے، لیکن دراصل یہ منفی ملحدیت کی ہی ایک صورت ہے۔ انسانی صورت حال کے لیے ملحدیت کے اثرات بہت دوررس ہیں۔ قدیم وقتوں سے ہی لوگ اپنے مخالف مذہبی نظریات کے حامیوں کے لیے ملحدیت کی اصطلاح استعمال کرتے آئے ہیں۔ اولین عیسائیوں کو ملحدین کہا گیا کیونکہ انہوں نے رومن معبودوں کے موجود ہونے سے انکار کیا۔ عہد روشن خیالی (1700-89ء) کے متعدد سرکردہ مفسرین علی الاعلان ملحد تھے، بشمول ڈینش مصنف ہولباخ اور فرانسیسی انسائیکلوپیڈسٹ ڈینس دیدرو کے۔ کلاسیکی مغربی ادب میں بھی عدم اعتقاد کے اظہارات ملتے ہیں، جیسے شعرا پی بی شیلے اور لارڈ بائرن؛ انگلش ناول نگار تھامس ہارڈی؛ فرانسیسی فلسفی وولٹیئر اور ژاں پال سارتر؛ روسی مصنف آئیوان ترگنیف؛ اور امریکی لکھاری مارک ٹوین اور اپٹان سنکلیئر۔ 19 ویں صدی میں مشہور ترین ملحدین اور مذہب کے نقاد لڈوگ فوئرباخ، کارل مارکس، آرتھر شوپنہاور اور فریڈرک نٹشے تھے۔ برطانوی فلسفی برٹرینڈ رسل، آسٹریائی ماہر تحلیلی نفسیات سگمنڈ فرائیڈ اور سارتر بیسویں صدی کے نہایت بااثر ملحدین میں شامل ہیں۔ کبھی کبھی ملحدیت کو مادیت پرستی وغیرہ جیسے دیگر نظریات کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔ تاہم، ان کے درمیان کوئی لازمی تعلق موجود نہیں۔ کچھ ملحدین نے کمیونزم کی مخالفت کی اور کچھ نے مادیت کو مسترد کیا۔ چونکہ ملحدیت دوٹوک مفہوم میں ایک انکار ہے، اس لیے یہ کوئی جامع نظریۂ دنیا مہیا نہیں کرتی۔

توحید پرستی (theism)...... ایک خدا پر یقین جو شخصی اور قابل پرستش ہے، جو دنیا سے ماورا ہوتے ہوئے بھی اس میں فعال دلچسپی لیتا ہے اور مخصوص افراد، معجزات اور مقدس کلام کے ذریعے انسانوں کے لیے اپنا مقصد آشکار کرتا ہے۔ توحید پرستی کا خدا شخصی ہے اگر اسے انسانی تجربے سے اخذ کردہ تشبیہات سے سمجھا جا سکے اور اگر بنی نوع انسان اس کے ساتھ ذاتی تعلق بنائیں اور عبادت میں اس سے التجا کریں۔ اس خدا کو عبادت کے لائق سمجھا جاتا ہے کیونکہ اسے اخلاقی لحاظ سے کامل اور قادر مطلق مانا جاتا ہے۔ عام فلسفیانہ اور الٰہیاتی اصطلاحات میں توحید وحدانیت کی ہی ایک صورت ہے۔ توحید کے برعکس وحدت الوجود میں خدا کو دنیا سے مشابہ یا دنیا میں جذب شدہ یعنی ہر چیز میں پنہاں سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے تین بڑے مذاہب عیسائیت، اسلام اور یہودیت بنیادی طور پر توحید پرستانہ ہیں اور آج

Marfat.com

ان کے تین ارب سے زائد ماننے والے ہیں۔ ہندومت میں بھی توحید پرستی کے کچھ شائبے ملتے ہیں، البتہ یہ مذہب عموماً خدا کی تعبیر ایک غیر شخصی اور وحدت الوجودی انداز میں کرتا ہے۔

رے ٹومز (Ray Tomes)...... فلکیات، ارضیات، تاریخ، معاشیات اور طبیعات جیسے شعبوں میں وسیع علم کا حامل محقق اور دانشور۔ وہ 42 سال کمپیوٹر کے شعبے سے وابستہ رہا۔ اس نے کمپیوٹروں کی مدد سے معاشی سائیکلز (چکروں) کی پیش گوئی کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ہارمونکس تھیوری وضع ہوئی۔ اب اس کی مدد سے کائنات کی ساخت کی وضاحت کی جارہی ہے۔ اس کے خیال میں کائنات ایک دیوقامت آلۂ موسیقی جیسی ہے جس کے سروں کے اتار چڑھاؤ کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ ہارمونکس کو بگ بونگ تھیوری بھی کہتے ہیں۔

ڈی این اے (DNA)...... ڈی آکسی رائبو نیوکلیک ایسڈ۔ تمام خلویاتی نامیاتی اجسام اور بیش تر وائرسوں کا جنیٹک مواد۔ ڈی این اے پروٹین کی تالیف اور نقول تیار کرنے کے لیے ہدایات جاری کرتا ہے۔ اگر ہم ایک جسیمے کے اندر داخل ہو جائیں تو ہمیں نظر آنے والے مالیکیولر دھبے پروٹین کے مالیکیول ہوں گے، کچھ ایک مضطربانہ سرگرمیوں میں مشغول اور کچھ دیگر محض انتظار کرتے ہوئے۔ اہم ترین اینزائمز (خامرے) ہیں، یعنی وہ مالیکیولز جو جسیمے کے کیمیائی تعامل کا ربط وضبط بناتے ہیں۔ ہر اینزائم مخصوص مالیکیولر کام میں تخصیص رکھتا ہے۔ لیکن اینزائمز اپنی ہدایات وصول کرتے ہیں اور خود بھی نگرانوں کی جانب سے بھیجے گئے احکامات پر تعمیر شدہ نیوکلیک ایسڈز اعلیٰ اختیاراتی مالیکیولز ہیں۔ وہ جسیمے کے مرکزے میں انتہائی اندرون میں ایک شہر ممنوعہ کے اندر الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اگر ہم کسی مسام میں سے گزر کر جسیمے کے مرکزے میں جا پہنچیں تو ہمیں سوئیوں کی فیکٹری میں ہونے والے دھماکے سے مشابہ کچھ دکھائی دیتا ہے۔ پیچوں اور بلوں کا ایک بے ہنگم ڈھیر جو نیوکلیک ایسڈز کی دو اقسام ہیں: ڈی این اے، جو اپنا کام جانتا ہے، اور آر این اے، جو ڈی این اے کی جانب سے بھیجی گئی ہدایات باقی کے خلیے میں پہنچاتا ہے۔

کاپرنیکس، نکولیئس (Copernicus, Nicolaus)...... (1473-1543) پولش قانون دان اور ماہر فلکیات جسے اہم اور بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ وہ پہلا ایسا شخص نہیں تھا کہ جس نے سورج کو نظام شمسی کے مرکز میں رکھا اور ایسا کرنے کی وجوہ (جو اس نے پیش کیں) متعدد حوالوں سے بے بنیاد تھیں۔ کاپرنیکس نے پولینڈ میں کراکو کے مقام پر اور پھر اٹلی میں بولونیا (Bologna) کے مقام پر تعلیم حاصل کی۔ تب اس نے مشرقی پروشیا میں فروئنبرگ کے مذہبی قانون دان کا عہدہ قبول کرلیا۔ اس کے فرائض میں کلیسیا کی املاک کا دھیان رکھنا شامل تھا۔ اس نے اپنا زیادہ تر وقت ایک چھوٹی سی رصدگاہ میں گزارا جو اس نے 1513ء میں تعمیر کی تھی۔ اپنا مضحکہ اڑنے سے خوفزدہ کاپرنیکس نے ''ایک چھوٹی سی شرح'' کو مشتہر کیا اور پاپائے وقت نے بھی اسے منظور کرتے ہوئے شائع

Marfat.com

کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ 1539ء میں کاپرنیکس نے عجلت میں اس نظریہ پر کام شروع کیا اور وٹنبرگ یونیورسٹی میں ریاضی کا پروفیسر جارج یوآکم بھی اس کے ساتھ مل گیا۔ کاپرنیکس اپنی کتاب شائع ہونے کا موقع آنے تک بستر مرگ پر جا پڑا تھا۔ کاپرنیکس اپنی تصنیف کو مکمل نہ کرسکا، اور اسے پایہ تکمیل کو پہنچانے کا کام ڈینش فلکیات دان تائیکو برا ہے، فیثا غورثی جوہانس کپلر اور اطالوی گلیلیو گلیلی اور بالآخر آئزک نیوٹن کے حصے میں آیا۔

ساگاں، کارل (Sagan, Carl)...... (1934-1996) امریکی ماہر فلکیات جس نے سائنس کو مقبول بنایا اور اسے عوام تک زیادہ قابل رسائی بنانے میں مدد دی۔ ساگاں کی تحقیق فلکیات، تکوینیات اور فلسفہ وسائنس کے کئی شعبوں کا احاطہ کرتی ہے، لیکن وہ کرۂ ارض پر حیات کے ماخذ اور کائنات میں دیگر جگہوں پر زندگی کے امکان میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے لیکچرز، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ اور کتب کے ذریعے سائنس کو عوام تک پہنچایا۔ ساگاں نیویارک سٹی میں پیدا ہوا، شکاگو یونیورسٹی سے 55ء میں فزکس کی ڈگری لی اور پھر 60ء میں پی ایچ ڈی کی۔ 62-60ء میں وہ برکلے کی کیلی فورنیا یونیورسٹی میں ایک ریسرچ فیلو رہا۔ 68-62ء میں اس نے ہارورڈ یونیورسٹی میں لیکچر دیے اور سمتھسونین آسٹروفزیکل لیبارٹری میں تحقیق کی۔ 68ء میں ساگاں اتھاکا کی کارنیل یونیورسٹی میں ڈائریکٹر تعینات ہوا۔ 1970ء میں وہ کارنیل میں فلکیات اور سپیس کا پروفیسر بنا اور موت تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس نے بہت سے عوامی لیکچر دیے اور عوام کے لیے کتب لکھیں۔ 1978ء میں اس کی کتاب ''The Dragons of Eden: Speculations on the Evolution of Human Intelligence'' کو پولٹزر انعام ملا۔ دیگر مقبول کتب میں مندرجہ ذیل شامل ہیں: ''Broca's Brain: Reflections on the Romance of Science'' (79ء)، ناول ''Contact'' (85ء)، ''Pale Blue Dot'' (94ء) اور ''The Demon-Haunted World'' (96ء)۔ 80ء میں ساگاں نے تیرہ قسطوں پر مشتمل ٹیلی ویژن سیریز ''کاسموس'' بنائی۔

برونو، گیارڈانو (Bruno, Giordano)...... (1548?-1600) اطالوی نشاۃ ثانیہ کا فلسفی اور شاعر جس کی ڈرامائی موت نے اس کی تحریروں کو ایک خصوصی اہمیت دلا دی۔ وہ نیپلز کے نزدیک نولا کے مقام پر پیدا ہوا۔ ڈومینیکیوں کے ساتھ شامل ہونے پر اس نے گیارڈانو کا نام اپنایا اور ان کے پاس ارسطوئی فلسفہ اور ٹامس آکوینس کی دینیات پڑھی۔ 1576ء میں وہ عقائد کے حوالے سے مقدمے سے بچنے کی خاطر سلسلہ کو چھوڑ کر بھاگ گیا اور باقی ساری زندگی گھومتے پھرتے ہوئے گزاری۔ وہ جنیوا، تولوسے، پیرس اور لندن گیا اور وہاں دو سال گزارے۔ 1592ء میں اٹلی واپس آنے پر عدالت احتساب نے اس پر مقدمہ چلایا اور استغفار کرنے کو کہا اور انکار پر زندہ جلایا گیا۔ اس کے فلسفۂ وحدت الوجودیت نے سپنوزا، ڈیکارٹ اور لیبنز پر عمیق اثرات مرتب کیے۔

Marfat.com

گلیلیو گلیلی (Galileo Galilei)......(1564-1642) اطالوی طبیعات دان اور ماہر فلکیات جس نے جرمن فلکیات دان جوہانس کپلر کی مدد سے اس سائنسی انقلاب کی بنا ڈالی جو انگلش ماہر طبیعات سر آئزک نیوٹن کے کام کی صورت میں انجام کو پہنچا۔ اس نے فلکیات کے میدان میں مشاہدہ کرنے کے لیے دوربین استعمال کی اور شمسی دھبے، چاند پر پہاڑ اور وادیاں، مشتری کے چار سب سے بڑے سیارے اور وینس کے مدارج دریافت کیے۔ طبیعات میں اس نے گرتے ہوئے اجسام کے قوانین اور پروجیکٹائلز کی حرکت کے متعلق وضاحت کی۔ ثقافت کی تاریخ میں گلیلیو آزاد تحقیق کی خاطر اتھارٹی کے خلاف جنگ کی علامت ہے۔ وہ اپنے تقریباً ہم عصر جوہانس کپلر کا مداح تھا۔ دونوں نے آپس میں خط و کتابت تو کی لیکن ملاقات نہ کر سکے۔ گلیلیو پیسا میں ایک پرانے فلورنسی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا سائنس اور ادب میں دلچسپی رکھنے والا ''ہر فن مولا'' باپ Vincenzo بنیادی طور پر ماہر موسیقی تھا۔ گلیلیو نے یونیورسٹی آف پیسا سے تعلیم حاصل کی جہاں نوجوانی میں ہی ریاضی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ بعد ازاں (1592ء) وہ ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے ہی پیڈوا آ گیا۔ اس نے اپنے مقالے ''حرکت کے بارے میں'' (On Motion) اجسام کی حرکت کے تصور میں انقلابی تبدیلی متعارف کروائی اور یوں جدید علم الحرکیات کی طرح ڈالی۔ اپنی آخری تصنیف ''دو نئی سائنسیں'' میں اس نے اپنے اس سارے کام کو نئے سرے سے دہرایا۔ مگر وہ ابتدا میں یہ محسوس نہ کر سکا کہ بیوروکریٹس کو اس قسم کی باتیں پسند نہیں۔ اس کے مشاہدات اور دلائل نے پرانی ارسطوئی فزکس کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ عدالت احتساب کے پرجوش کلرکوں کو یہ بات قطعی ناقابل برداشت نہیں لگ سکتی تھی۔ گلیلیو نے زبردست حوصلے کے ساتھ کلیسیا کو سورج کی مرکزیت والا تصور منوانے کی کوشش کی۔ 1616ء میں جب کاپرنیکس کو لادین قرار دیا گیا تھا تو گلیلیو کو سورج کی مرکزیت والے نظام کا پرچار کرنے سے روک دیا گیا۔ تاہم، ایک محقق نے قائل کر لینے والے انداز میں دلیل پیش کی ہے کہ کلیسیا کی نظر میں گلیلیو کا اصل جرم ڈیماکریٹس کا ایٹمی نظریہ اپنانا تھا۔ گلیلیو بدستور اصرار کرتا رہا کہ جو کچھ آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا اسے درست نہیں سمجھنا چاہیے۔ ''The Assayer'' میں گلیلیو نے اشیا کی ''بنیادی'' اور ''ثانوی'' خصوصیات کے بارے میں ڈیماکریٹس کے نظریہ میں نئی جان ڈالی۔ 1632ء میں اس نے اپنا شاہکار ''Dialogue'' شائع کیا۔ اس تصنیف کا مقصد سورج کی مرکزیت اور زمین کی مرکزیت والے مفروضوں کا ''موازنہ'' کرنا تھا، لیکن اس میں صاف ظاہر ہو گیا کہ گلیلیو سورج کی مرکزیت کو تسلیم کرتا ہے۔ ''ڈائیلاگ'' کو ضبط کر کے گلیلیو کو روم بھیجا گیا۔ وہاں اس نے رومی ماہرین افلاک کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا۔ معافی مانگنے کے باوجود اسے لامحدود عرصے کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا۔ وہ وہیں زندگی گزارتا اور کام کرتا رہا۔

جان پال دوم (John Paul II) ...... (1920-2005) پوپ (1978-2005ء)۔ اصل نام

Marfat.com

Karol Wojtyla۔ وہ 1523ء کے بعد پہلا غیر اطالوی پوپ تھا جس کی بلاتکان سرگرمیوں اور بے مثال عالمگیر دوروں اور مستحکم مذہبی کٹریت نے رومن کیتھولک کلیسیا اور غیر کیتھولک دنیا دونوں میں پاپائیت کا اثر ورسوخ بڑھایا۔ وہ پولینڈ میں پیدا ہوا اور جیگیلونیئن یونیورسٹی میں شاعری اور ڈرامہ کا مطالعہ کیا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران وہ ایک پتھر کی کان اور ایک کیمیکل فیکٹری میں کام کرتا اور پادریت کی تیاری کرتا رہا۔ 46ء میں اس نے روم کے اینگلیکم انسٹی ٹیوٹ سے پی ایچ ڈی ڈگری لی اور لبلن کی کیتھولک یونیورسٹی سے دینیات میں ڈاکٹریت کی۔ وہ 64ء میں Krakow کا آرچ بشپ اور 67ء میں کارڈینل بنا۔ اس نے دوسری ویٹیکن کونسل میں سرگرم حصہ لیتے ہوئے پولینڈ کی نمائندگی کی۔ اکتوبر 78ء میں جان پال اول کی جگہ اسے پوپ منتخب کیا گیا۔ 13 مئی 81ء کو ویٹیکن کے سینٹ پیٹرز سکوائر میں کسی شخص نے اس پر گولی چلائی مگر وہ پوری طرح صحت یاب ہو گیا۔ جان پال نے شاعری لکھی اور قلمی نام Andrzej Jawien سے ایک ڈرامہ ''The Jeweler's Shop'' (1960ء) شائع کیا۔ اس کی اخلاقیاتی اور دینیاتی تحریروں میں ''Fruitful and Responsible Love'' اور ''Sign of Contradiction'' (79ء) شامل تھیں۔ دیگر تحریروں میں سے درج ذیل قابل ذکر ہیں: ''Eastern Europe'' (85ء)، ''Marxism, materialism, and atheism'' (86ء) اور ''Virgin Mary as a source of Christian unity'' (87ء)۔ 80ء اور 90ء کے عشروں میں پوپ جان پال دوم نے افریقہ، ایشیا اور امریکہ سمیت متعدد ممالک کے سفر کیے۔

شاستر (Shastra)...... سنسکرت کا لفظ جس سے عمومی طور پر قواعد مراد لیے جاتے ہیں۔ اکثر یہ لاحقے کے طور پر استعمال ہوتا ہے، مثلاً رسائن شاستر (کیمیا)، جیوشاستر (حیاتیات)، وستوشاستر (فن تعمیر) وغیرہ۔ شاستر ایک علم ہے جس کی بنیاد وقت سے ماورا خیال کیے گئے اصولوں پر ہو۔

ہیول، ای بی (Havell, Ernest Binfield)...... (1861-1937) انگلینڈ کا ایک متاثر کن آرٹس ایڈمنسٹریٹر، آرٹ کا مورخ اور ہندوستانی آرٹ اور فن تعمیر کے بارے میں متعدد کتب کا مصنف۔ وہ 1896-1905ء کے دوران گورنمنٹ سکول آف آرٹ، کلکتہ کا پرنسپل رہا اور رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ مل کر مغربی ماڈلز کی بجائے ہندوستانی ماڈلز کی بنیاد پر ایک فن تعلیم وضع کیا۔ اس کے نتیجے میں بنگال سکول آف آرٹ کی اساس رکھی گئی۔

پیڈرو پیو، سینٹ (Pio, Saint)...... (1887-1968) اٹلی سے تعلق رکھنے والا کیپوچین کیتھولک پادری جسے کیتھولک کلیسیا بطور ولی احترام دیتا ہے۔ اصل نام فرانچسکو فوریونی تھا، لیکن کیپوچین میں شمولیت اختیار کرنے پر

Marfat.com

اسے پائیس (اطالوی میں پیو) کا نام دیا گیا۔ پوپ جان پال دوم نے 2002ء میں اسے کلیسیا میں خصوصی حیثیت دی۔

اپنشد (Upanishads)...... ہندوستان کی باطنی اور صوفیانہ تحریریں۔ اپنشد اصل میں تین الفاظ اُپ + نی + شد کا مرکب ہے جس کا مطلب استاد کے "قریب بیٹھ کر سننا" ہے۔ اپنشدوں نے ہندو فکر پر اہم ترین اثر ڈالا...... اور بودھی و مغربی فکر پر بھی۔ مغرب میں شوپنہاور اور بعدازاں وٹگنسٹائن وغیرہ نے اسے مقبول بنایا۔ یہ چھ راسخ العقیدہ ہندو مکاتب فکر میں سے ایک یعنی ویدانت کی اساس بنے۔ 150 کے قریب اپنشد موجود ہیں۔ مختصر ترین اپنشد کی طوالت تو ایک صفحے جتنی ہوگی اور طویل ترین کی 50 صفحات جتنی۔ حقیقی اور جاندار اپنشدوں کی گنتی 20 سے زیادہ نہیں۔ ہمیں ان کے مصنفین کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ اپنشدوں کا نفس مضمون یہ ہے کہ برہمن (برہما) اور آتما ایک ہی چیز ہیں۔ برہمن کائنات کا سچ ہے۔ آتما داخلی انفرادی سچ ہے۔

آریائی (Aryans)...... سفید رنگت والی ایک نسل کا نام جسے سفید فام نسل پرستوں نے دوسروں پر اپنی فضیلت جتانے کے لیے استعمال کیا۔ نازی جرمنی میں اس اصطلاح کا مفہوم گھٹا کر صرف "خالص" جرمن کر دیا گیا۔ لسانیات میں ہند یورپی خاندان کی کوئی بھی زبان بولنے والے لوگوں کو بھی کبھی کبھی آریائی کہا جاتا ہے۔

آریائیت (Arianism)...... چوتھی صدی عیسوی کی ایک مسیحی الحاد پرستی جس نے یسوع مسیح کی کلی الوہیت سے انکار کیا۔ اس کا نام اس کے مصنف آریئس یا ایریئس سے منسوب ہے۔ لیبیا کے رہنے والے ایریئس نے اینٹی اوک (انطاکیہ) میں لوسیان کے دینیاتی مکتبہ میں مطالعہ کیا جہاں آریائی تکفیر کے دیگر شاگردوں کو بھی تربیت دی گئی۔ اگرچہ اس کا مسلک رومن شہنشاہ تھیوڈوسیئس نے 379ء میں بالکل غیر قانونی قرار دے دیا تھا، لیکن یہ کوئی دو سو برس تک ان بربری قبائل میں موجود رہا جنہیں آریائی بشپس نے حلقہ بگوش عیسائیت کیا تھا۔ آریئس نے تعلیم دی کہ خدا غیر مولود اور بے ازل تھا۔ چنانچہ بیٹا مولود ہونے کی وجہ سے باپ کے برابر نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اس میں باپ والا الوہی جوہر ہے۔ بہ الفاظ دیگر بیٹے اور باپ کا تعلق فطری نہیں بلکہ اختیاری ہے۔

وید (Vedas)...... لفظی مطلب "علم"۔ ہندومت کا قدیم ترین مقدس ادب یا اس ادب سے تعلق رکھنے والی کتب۔ قدیم ادب کا یہ مجموعہ بنیادی طور پر چار مجموعہ ہائے مناجات پر مشتمل ہے۔ یہ الگ الگ نظمیں اور منتر ہیں۔ مجموعوں کے نام رگ وید، سام وید، یجر وید اور اتھرو وید ہیں۔ انہیں سمہتا (مجموعہ) بھی کہا جاتا ہے۔ چاروں وید سنسکرت سے پہلے کی ایک زبان ویدک میں لکھے گئے۔ یقین کیا جاتا ہے کہ قدیم ترین حصے کافی حد تک آریائی فاتحین نے لکھے ہوں گے جو 1500-1000 قبل مسیح کے درمیان ہندوستان میں آئے۔ تاہم، خیال ہے کہ اپنی موجودہ

Marfat.com

صورت میں وید تیسری صدی قبل مسیح سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ موجودہ صحائف کو ضابطہ تحریر میں لائے جانے سے قبل رشی صرف حافظے کے ذریعے ویدک مواد کو آگے منتقل کرتے تھے۔ رگ وید میں 1000 سے زائد بھجن (رگ) ہیں جنہیں مختلف اشعار اور دس ابواب میں ترتیب دیا گیا ہے۔ سام کا لفظی مطلب ''گیت'' یا نغمہ ہے۔ یجر وید میں اب دو نیم نثر اور نیم نظمیہ حصے ہیں، اور دونوں میں تقریباً ایک جیسا مواد ہے (البتہ مختلف ترتیب میں)۔ اس میں قربانی (یج یا یگیہ) کے منتر ادھوار یو پروہت قربانی انجام دیتے وقت یجر وید میں سے موزوں منتروں کا ورد کیا کرتے تھے۔ چوتھا وید یعنی اتھر و وید (جس کے کچھ حصے کا مصنف رشی اتھرون کو بتایا جاتا ہے) تقریباً صرف اور صرف بھجنوں اور منتروں کی نہایت متنوع اقسام پر مشتمل ہے۔ یہ کافی حد تک ذاتی اور گھریلو استعمال کے لیے تھا۔

اکوینس، سینٹ تھامس (Aquinas, St. Thomas)...... (1225-1274) اطالوی فلسفی اور ماہر الٰہیات، جس کی تصانیف نے اسے متکلمانہ تاریخ کی اہم ترین شخصیت اور رومن کیتھولک ماہرین الٰہیات میں ممتاز ترین بنا دیا۔ وہ نیپلز کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کاؤنٹ لینڈلف آف اکوینو فریڈرک دوم کا فرماں بردار تھا جس نے 1228ء میں خدا کا آلۂ کار ہونے کا دعویٰ کیا۔ پانچ برس کی عمر میں ٹامس کو بینیڈکٹی سکول (واقع مونٹ کاسینو) میں بھیج دیا گیا۔ وہ 1244ء میں ڈومینیکی سلسلے میں شامل ہوا اور کیتھولک تعلیم کے مرکز پیرس میں گیا۔ اس کا سب سے بڑا کام ''Summa Theologiae'' ہے جو اس نے 1266ء میں لکھنا شروع کی اور ابھی اسے مکمل نہ کر پایا تھا کہ دنیا سے چلا گیا۔

لوتھر، مارٹن (Luther, Martin)...... (1483–1546) جرمن ماہر الٰہیات اور مذہبی مصلح جس نے پروٹسٹنٹ اصلاح کی داغ بیل ڈالی اور جس کے عمیق اثرات مذہب کے علاوہ سیاست، معاشیات، تعلیم اور زبان پر بھی پڑے۔ اسے جدید یورپی تاریخ کی اہم ترین شخصیات میں سے ایک مانا جاتا ہے۔ لوتھر کا اصل نام Eisleben تھا اور وہ جرمنی میں ایک کسان ہانس لوتھر اور اس کی بیوی مارگریٹ کے ہاں پیدا ہوا۔ چودہ سال کی عمر کے بعد اسے Eisenach کے سینٹ جارج سکول میں منتقل کر دیا گیا۔ 1501ء میں اس کے خوش حال باپ نے اسے ایرفرٹ (Erfurt) یونیورسٹی میں داخل کروایا۔ وہاں اس نے تھوڑی سی یونانی اور اس سے بھی کم عبرانی سیکھی، اور زیادہ مشہور لاطینی کلاسکس کا مطالعہ کیا۔ 1505ء میں اسے ماسٹر آف آرٹس کی ڈگری ملی۔ 1506ء میں اس نے ناقابل تنسیخ عہد لیے، اور 1507ء میں پادری بنا۔ اس کی منتقلی وٹنبرگ کی خانقاہ میں ہوئی، اسے یونیورسٹی میں منطق اور طبیعیات میں معلم کا عہدہ اور پھر فلسفہ و دینیات میں نشست پیش کی گئی۔ جب مغفرت ناموں کے بارے میں ٹیٹزیل کی تقاریر کی خبریں اس تک پہنچیں تو اس نے محسوس کیا کہ مذہب کو مال تجارت بنائے جانے کے حوالے سے آواز اٹھانے کا وقت آ گیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی لاطینی زبان میں 95 تھیسس مرتب کیے جن کا عنوان ''مغفرت

Marfat.com

ناموں کی تاثیر و تشریح پر اعتراض' رکھا۔ 11 اکتوبر 1517ء کو اس نے ان تھیسس کی ایک نقل وٹنبرگ کے کاسل چرچ کے پھاٹک پر آویزاں کردی۔ Cajetan نے مطالبہ کیا کہ لوتھر سر عام اپنے کلمہ ہائے کفر سے توبہ کرے اور وعدہ کرے کہ آئندہ کبھی عیسائی دنیا کے امن کو خراب نہیں کرے گا۔ لوتھر نے انکار کر دیا اور وٹنبرگ میں اپنی کوٹھڑی میں واپس آ گیا۔ رائے عامہ لوتھر کی حمایت میں جانے لگی۔ یونیورسٹی کے بیش تر طلبا اس کے پر جوش حامی تھے۔ حوصلہ بڑھنے پر لوتھر نے 1520ء کے موسم بہار میں ایک "Epitome" (خلاصہ) شائع کیا جس نے عقیدے کے قطعی اصولوں کا مقابلہ تنقید کی مسرتوں سے کیا۔ 15 جون 1520ء کے ایک فرمان میں پوپ لیو دہم نے لوتھر کے 41 بیانات کو ملعون قرار دیا، ان تحریروں کو سر عام جلانے کا حکم جاری کیا اور اسے پیغام بھیجا کہ روم آئے اور عوام کے سامنے توبہ کرے۔ جواب میں لوتھر نے ایک ایسا اعلان جاری کیا جس کی مثال تاریخ میں بہ مشکل ہی ملتی ہے: "عیسائی جاگیر کی اصلاح کے حوالے سے جرمن قوم کی عیسائی اشرافیہ کے نام کھلا خط۔" لوتھر نے اپنے مذہبی پروگرام کی تفصیلات پیش کیں: جرمن مذہبی طبقے کو چاہیے کہ مینز کے آرچ بشپ کی زیر قیادت ایک قومی کلیسیا قائم کرے؛ مرتاض سلسلوں کی تعداد گھٹائی جائے؛ پادریوں کو شادی کی اجازت ہو؛ زیارتیں، تدفین کے جلسے اور مقدس دن (ماسوائے اتوار) منسوخ کیے جائیں۔ مذہبی جرائم کو سیکولر قوانین سے الگ تمام شریعت کو ترک کر دیا جائے۔ 19 جنوری 1522ء کو لوتھر واپس وٹنبرگ یونیورسٹی پہنچ گیا۔ اپنی ابتدائی تحریروں (مثلاً "On Christian Liberty") میں بنیادی الٰہیات بیان کرنے کے بعد اس نے 1529ء میں اپنی مشہور ترین کتاب "Small Catechism" شائع کی۔ 1534ء میں لوتھر نے عبرانی زبان سے بائبل کا ترجمہ شائع کیا۔

برہما (Brahma) ...... ہندو اسطوریات میں خالق دیوتا۔ علم اشتقاق کے لحاظ سے برہما کا نام برہمن سے مربوط ہے؛ برہمن ایک بے جنس اسم ہے جو مطلق کائناتی سرچشمے کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ برہما کو کبھی کبھی قائم رکھنے والے دیوتا وشنو اور مارنے والے دیوتا شیو کے ساتھ تثلیث میں بھی بتایا جاتا ہے، لیکن خالق دیوتاؤں والا وہ رتبہ نہیں رکھتا جو اسطوریات میں عموماً دیوتاؤں کو حاصل ہے۔ منوسمرتی میں برہما کو قائم بالذات اور دنیا کو ایک انڈے سے تخلیق کرنے والا بیان کیا گیا ہے اور اس کی ہستی ایک یگ پر محیط ہے جو عملاً ابدیت ہے۔ برہما کی روایتی ہندو مورتیوں میں برہما کو عموماً وشنو کی ناف سے اگے ایک کنول میں پیدا ہوتے دکھایا گیا ہے۔ بالاصل اس کے پانچ سر تھے، لیکن ایک شیو نے تباہ کر دیا۔ وہ راج ہنس پر سواری کرتا ہے۔ دیوی سرسوتی اس کی محبوبہ ہے۔ آج کے ہندو مذہب میں برہمن کا تقریباً کوئی بھی کردار ادا نہیں کرتا؛ عام طور پر وشنو اور شیو کی ہی پوجا کی جاتی ہے۔

وشنو (Vishnu) ...... ہندومت اور ہندوستانی اساطیر کا ایک اہم دیوتا جسے ہندو لوگ کائنات کو قائم رکھنے والا (قیوم) مانتے ہیں۔ قدیم مذہبی صحائف ویدوں میں وشنو کا رتبہ متعدد کمتر دیوتا کے برابر ہے اور عموماً اسے بڑے

Marfat.com

ویدک دیوتا اندر کے ہمراہ شیطانی قوتوں کے خلاف جنگوں میں مشغول دکھایا گیا۔ داستانوں اور پرانوں (ہندومت کے متاخر عہد کے صحائف) میں وشنو (بالخصوص اس کے اوتار) نمایاں حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ پرانوں کے کچھ ادب میں اسے ابدی، محیط کل روح بیان کیا اور ازلی پانیوں کے ساتھ منسلک کیا گیا جو تخلیق کائنات سے پہلے ہر طرف موجود تھے۔ چنانچہ وشنو کو اکثر انسانی صورت میں ایک شیش ناگ پر سوتے ہوئے دکھایا جاتا ہے جو پانیوں پر تیر رہا ہے۔ قائم رکھنے والے کی حیثیت میں وشنو کا تصور نسبتاً بعد کے دور کا ہے۔ اس کی بنیاد دو عقائد پر ہے: انسان اپنے فرائض کی ایماندارانہ بجا آوری کے ذریعے نجات حاصل کر سکتے ہیں، اور خیر و شر کی طاقتیں (دیوتا اور شیطان/اسور) دنیا پر اختیار پانے کے لیے باہم کشمکش کرتی ہیں۔ کبھی کبھار طاقت کا توازن شر کے حق میں بگڑ جاتا ہے تو تب وشنو اوتار کی صورت میں نوع انسانی یا دنیا کو بچانے زمین پر آتا ہے۔ اس قسم کے دس اوتار مانے جاتے ہیں جن میں سے رام اور کرشن اہم ترین ہیں۔ 9 اوتار آ چکے ہیں اور آخری دسواں اوتار ابھی آنا ہے۔

افلاطون (Plato) ...... (428?-347bc) یونانی فلسفی جسے مغربی فلسفے میں نہایت تخلیقی اور متاثر کن مفکرین میں سے ایک مانا جاتا ہے۔ 399 ق م میں جب سقراط کو موت کی نیند سلایا گیا تو اس کا شاگرد افلاطون تیس سال کا تھا۔ اس المیے نے نوجوان پر انمٹ نقوش چھوڑے اور اس کے فلسفے کو نہایت گہرائی میں متاثر کیا۔ اپنے ہیرو سقراط کے برعکس وہ ایک امیر کبیر ارسٹوکریٹک گھرانے سے تعلق رکھتا تھا؛ اس کا باپ ایتھنز کے آخری بادشاہ کی اولاد تھا؛ اس کا سوتیلا باپ پیریکلیز کا قریبی دوست رہا تھا؛ اور اس کے دو چچا پیلوپونیشیائی جنگ میں ایتھنز کی شکست کے بعد تیس آمروں کی حکومت میں سرگرم رہے تھے۔ سقراط کے مقدمے اور موت نے ان امیدوں کو اس درجہ تار تار کر دیا کہ وہ مایوس ہو گیا اور حقارت کے ساتھ عوامی زندگی سے کنارہ کر لیا۔ اسے یقین تھا کہ کسی رِشی کو صاحبِ عمل اور عوامی پالیسی پر اثر و رسوخ کا حامل ہونا چاہیے۔ مثالی طور پر فلسفی کو لوگوں پر خود حکومت کرنی چاہیے تھی۔ بدھ کی طرح افلاطون نے بھی اصرار کیا کہ بصیرت حاصل کرنے کے بعد رِشی کو بازار میں واپس جا کر انسانیت کی بہتری کے لیے کام کرنا چاہیے۔ اس نے مصر اور لیبیا میں سفر کیا اور سیراکیوسے کے آمر ڈایونی سیئس اول کے دربار میں وہ ڈایون سے ملا جو افلاطون کے خیالات سے متعلق بہت پُرشوق ہو گیا۔ افلاطون 387 ق م میں واپس ایتھنز پہنچا۔ اگلے تیس برس کے واقعات نے یونانی مین لینڈ پر بین البلاد سیاست کا شدید عدم استحکام عیاں کر دیا تھا۔ اس بدنظمی کے ردعمل میں افلاطون نے ریاضی اور فلسفے کا ایک سکول قائم کیا۔ اسے اکادمی (اکیڈمی) کا نام دیا گیا کیونکہ دانشور ایتھنز کے نواح میں واقع اکیڈمیس نامی سورما سے منسوب کردہ مقدس کنج میں ملا کرتے تھے۔ تعلیم دینے کے لیے لیکچرز کے بجائے سقراطی انداز میں بحث مباحثے کا طریقہ اپنایا گیا۔ افلاطون نے اپنی بصیرتوں کو عقائدانہ انداز میں ریکارڈ نہیں کیا، بلکہ مکالماتی صورت استعمال کی جس میں مختلف نکتہ ہائے نظر بیان کیے جاتے۔

Marfat.com

کپلر، جوہانس (Kepler, Johannes)......(1571-1630) جرمن ماہر فلکیات اور فطری فلسفی جو سیاراتی حرکت کے تین قوانین ثابت کرنے کی وجہ سے مشہور ہوا۔ یہ قوانین کپلر کے قوانین کہلاتے ہیں۔ کپلر جنوبی جرمنی کے علاقے سوابیا میں ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک لوتھری پادری تھا۔ وہ گلیلیو کی طرح ایک فیثا غورثی صوفی تھا جو یقین رکھتا تھا کہ کائنات کی تفسیر ریاضی کی مدد سے تفسیر کی جاسکتی ہے۔ اسے سچائی پر بھی یقین تھا۔ اس نے ایک سائنسی رویہ اپنائے رکھنے کو نیکی اور پاکبازی جانا۔ وہ سورج کو مرکز ماننے والی تھیوری کو کارآمد ثابت کرنے کے قابل ہوا۔ وہ 1601ء میں بادشاہ روڈلف کا شاہی ریاضی دان بنا۔ اس نے اپنے دور کی مقبول عام ارسطوئی بصیرت کے برعکس کام کیا۔ 1609ء میں کپلر نے ''نئی فلکیات'' شائع کی جس میں دو چیزیں ثابت کیں: کہ مریخ سیارہ سورج کے گرد کامل گول نہیں بلکہ ایک بیضوی مدار میں گردش کرتا ہے (اس دور میں بیضوی شکل کو ناقص خیال کیا جاتا تھا)؛ اور سیارے کی گردش کی رفتار کم زیادہ ہوتی رہتی ہے لیکن وہ سورج کی سیدھ کی لحاظ سے بیضوی شکل میں مساوی فاصلہ مساوی مدت میں ہی طے کرتا ہے۔ 1619ء میں کپلر نے ''دنیا کی ہم آہنگی'' میں اپنے تینوں قوانین کو بھرپور وضاحت کے ساتھ بیان کیا: آخری قانون یہ تھا کہ سیارے کے ایک سال (یعنی جتنی دیر میں وہ سورج کے گرد چکر مکمل کرتا ہے) کا مربع سورج سے اس کے درمیانی فاصلے کا مکعب ہے۔ یوں اس نے ماہر الٰہیات کو نہ صرف ریاضی بلکہ طبیعات سے بھی متعارف کروایا۔

سٹرنگ تھیوری (String Theory)......فزکس کی ایک تھیوری جس میں پارٹیکلز کو سٹرنگز پر لہروں کے طور پر بیان کیا جاتا ہے؛ یہ کوانٹم مکینکس اور عمومی نظریہ اضافیت کو یکجا کرتی ہے۔ اسے سپر سٹرنگ تھیوری بھی کہتے ہیں۔

ٹیگور، رابندر ناتھ (Togore, Rabindranath)......(1861-1941) نوبیل انعام یافتہ ہندوستانی شاعر، فلسفی جس نے ہندوستان اور مغرب کے درمیان باہمی ثقافتی تفہیم کو بڑھانے میں کردار ادا کیا۔ بنگالی میں اس کا نام روبندر ناتھ ٹھکرا ہے۔ وہ کلکتہ (کولکتا) کے ایک دولت مند خاندان میں پیدا ہوا۔ ٹیگور نے بچپن میں ہی شاعری شروع کردی۔ اس کی پہلی کتاب سترہ برس کی عمر میں منظر عام پر آئی۔ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی خاطر 1878ء میں انگلینڈ میں مختصر قیام کے بعد وہ واپس ہندوستان آگیا اور نوآبادیاتی دور کا اہم اور مقبول ترین مصنف بنا۔ اس نے شاعری، افسانے، ناول اور ڈرامے بھی لکھے۔ وہ سینکڑوں گیتوں کا مصنف ہے اور 1929ء میں مصوری بھی شروع کردی۔ اس نے 1901ء میں اپنی جائیداد پر ''شانتی نکیتن'' نامی ایک مدرسہ (1901ء) کھولا تاکہ مشرقی اور مغربی فلسفوں کا ملغوبہ پڑھا سکے۔ 1921ء میں اس کے سکول کو وسعت دے کر ایک بین الاقوامی یونیورسٹی 'وشو بھارتی' بنا دیا گیا۔ ٹیگور نے دنیا بھر میں سفر کیے اور لیکچر بھی دیے۔ اس نے زیادہ تر چیزیں بنگالی زبان میں لکھیں، لیکن متعدد تحریروں کو خود ہی انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ ٹیگور کے گیتوں کی کتاب ''گیتا نجلی'' کو خصوصی

Marfat.com

شہرت حاصل ہے۔

رومی، جلال الدین (Rumi, Jalal al-Din)...... (1207-1273) عظیم ترین صوفی اور فارسی زبان کا شاعر جو اپنی شاعری ''مثنوی معنوی'' کی وجہ سے مشہور ہے۔ ترک ثقافتی زندگی پر رومی کا اثر بے اندازہ ہے۔ اس کی موت کے بعد مولویہ فرقے میں منظم شاگردوں کو اہل مغرب نے گھومنے والے درویش کا نام دیا۔ جلال الدین رومی کا باپ بہا الدین ایک مشہور صوفی، مصنف اور استاد تھا۔ کافی حد تک منگولوں کی آمد کے خطرے کے پیش نظر بہا الدین کے خاندان نے 1218ء کے قریب اپنا آبائی قصبہ چھوڑا۔ ایک کہانی کے مطابق نیشاپور میں خاندان کی ملاقات فرانسیسی مصنف فرید الدین عطار سے ہوئی جس نے نوجوان جلال الدین کو دعا دی۔ حج بیت اللہ اور مشرق وسطیٰ بھر میں سفر کے بعد بہا الدین اور اس کے اہل خانہ اناطولیہ (روم) پہنچے جہاں سلجوق سلطنت کی حکومت کے ماتحت امن اور خوشحالی کا راج تھا۔ کرمان میں قیام کے دوران جلال الدین کی ماں فوت ہوگئی اور اس کا پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ 1228ء میں انہیں دارالحکومت قونیہ بلایا گیا۔ یہاں بہا الدین نے ایک مدرسے میں تعلیم دی اور 1231ء میں اس کی وفات کے بعد جلال الدین نے یہ عہدہ سنبھالا۔ وہ تقریباً 1240ء میں قونیہ سے رخصت ہوا۔ رومی کی زندگی میں فیصلہ کن لمحہ 30 نومبر 1244ء کو آیا جب قونیہ کی گلیوں میں اس کی ملاقات سیلانی درویش شمس الدین تبریزی سے ہوئی۔ انجام کار وہ فروری 1246ء میں شمس کے ہمراہ شہر سے چلا گیا۔ اس کی صوفیانہ نظمیں (تیس ہزار اشعار اور بہت سی رباعیات) محبت کے مختلف مدارج دکھاتی ہیں۔ اس نے عاشق اور معشوق کے کامل وصال کا اظہار شمس کا تخلص اختیار کر کے کیا۔ ''دیوان شمس تبریز'' اس کے تجربات کا شاعرانہ نچوڑ ہے۔ رومی کے مرکزی کام ''مثنوی معنوی'' میں قصے، کہانیاں، تمثیلات اور ضرب الامثال جابجا ملتی ہیں۔ صوفیا اور روم کے شاگردوں نے ان کی تصانیف کا وسیع پیمانے پر مطالعہ کیا۔

اقبال، سر ڈاکٹر علامہ محمد...... برصغیر کا شاعر اور مفکر جسے پاکستانی ریاست نے سرکاری سطح پر بطور قومی شاعر اپنایا۔ اقبال پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوا۔ اس نے مذہبی علوم، عربی، فارسی اور انگلش میں اپنی تعلیم سیالکوٹ سے ہی حاصل کی۔ لاہور اورینٹل کالج میں 97-1893ء کے دوران سر ایڈون آرنلڈ کے ساتھ تحصیل علم کرتے ہوئے ہی اس نے پہلی مرتبہ جدید فکر کا مطالعہ کیا تھا۔ 1899ء میں یہاں سے ایم اے فلسفہ کیا اور عربی و منظوم شاعری پڑھانا شروع کی اور معاشرتی و معاشی مسائل پر قلم اٹھایا۔ اس کی شاعری فارسی اردو کی کلاسیکی طرز کی ہے، لیکن یورپی ادب، بالخصوص ورڈزورتھ اور کولرج کے اثرات بھی دکھاتی ہے۔ یونیورسٹی آف کیمبرج سے لا کرنے کے لیے اس نے 1905ء میں ہندوستان چھوڑا، لیکن یہ فلسفہ ہی تھا جس نے اس کی سوچ پر غلبہ پالیا۔ ٹرینٹی کالج میں ہیگل اور کانٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ یورپی فلسفے کے بنیادی رجحانات سے واقف ہوگیا۔ فلسفے میں دلچسپی نے اسے 1907ء میں

Marfat.com

ہائیڈلبرگ اور میونخ پہنچا یا جہاں نٹشے نے اس پر عمیق اثرات مرتب کیے۔ اقبال نے وہیں ''ایران میں روحانی ترقی'' کے موضوع پر ایک مقالہ لکھ کر فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1922ء میں اسے 'سر' کے خطاب سے نوازا۔ اقبال کو اپنے ہم عصر مسلمان فلسفیوں میں عدیم المثال مقام حاصل ہے۔ اقبال کی شاعری کے مندرجہ ذیل مجموعے قابل ذکر ہیں: اسرار خودی (1915ء)، رموز بے خودی (1918ء)، پیام مشرق (1923ء)، زبور عجم (1927ء)، اسلامی فکر کے تعمیر نو پر چھ خطبات (1930ء)، جاوید نامہ (1932ء)، بال جبریل (1936ء) ارمغان حجاز (1938ء)، بانگ درا اور ضرب کلیم۔

علی ہجویری، شیخ ابوالحسن ...... (1009-1072) المشہور داتا گنج بخش۔ برصغیر کے مشہور صوفی بزرگ جن کا لاہور میں واقع مزار لوگوں کی عقیدت کا مرکز ہے۔ آپ غزنی کے محلے ہجویر میں طویل عرصہ تک رہنے کے باعث ہجویری کہلائے۔ آپ نے ظاہری علوم اپنے وطن میں ہی حاصل کیے۔ آپ کی تصنیف ''کشف المحجوب'' میں آپ کے اساتذہ کے نام ملتے ہیں۔ علوم باطنی سیکھنے کی غرض سے شیخ ابوالفضل محمد حسن ختلی کے مرید ہوئے جو حضرت خضری کے مرید تھے۔ آپ نے مختلف مسلم ممالک، مثلاً خراسان، ماوراالنہر، آذربائیجان، شام، بغداد، عراق، طبرستان، کرمان، خوزستان، ترکستان وغیرہ کا سفر کیا۔ اس دوران ریاضتیں اور مجاہدے بھی کرتے رہے اور تین ماہ بایزید بسطامی کے مزار پر گزارے۔ مرشد کے حکم پر آپ لاہور تشریف لائے۔ فوائد الفواد میں آپ کی لاہور آمد کا ذکر ملتا ہے۔ بعض محققین کی رائے میں آپ سلطان محمود غزنوی کے لشکر کے ہمراہ لاہور آئے تھے۔ آپ نے لاہور میں موجودہ مزار والی جگہ پر سکونت اختیار کی اور مدرسہ کھولا۔ آپ طریقت میں شریعت کی پابندی کو ضروری سمجھتے تھے۔ آپ کی دوسری تصنیف ''کشف الاسرار'' ہے۔ مندرجہ ذیل دیگر کتب کے نام بھی ملتے ہیں: منہاج الدین، البیان الاہل العیان، اسرار الخرف والمونات، الرعایۃ الحقوق اللہ، بحر القلوب، رسالہ درشرح کلام حلاج اور رسالۃ الایمان۔ ان کی کشف المحجوب فارسی زبان میں تصوف کی پہلی کتاب ہے۔ اس کی بدولت مسلم تصوف ہندوستان میں باقاعدہ متعارف ہوا۔

فرائیڈ، سگمنڈ (Freud, Sigmund) ...... (1856-1939) بیسویں صدی کا ممتاز ترین ماہر نفسیات۔ اکثر زور دیا جاتا ہے کہ فرائیڈ نے لاشعوری ذہن کو ''دریافت'' کیا۔ تاہم، لاشعور کا تصور بہت ابتدا کا ہے۔ فرائیڈ کی پیدائش فرائی برگ موراویا کے ایک یہودی گھرانے میں ہوئی، لیکن اس نے چار سال کی عمر کے بعد سے ویانا میں پرورش پائی۔ وہ 1938ء تک اسی شہر میں رہنے کے بعد لندن میں پناہ گزیں ہوا اور اگلے برس وہیں فوت ہو گیا۔ فرائیڈ ایک ذہین طالب علم تھا۔ اس نے 1881ء میں ویانا یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری (نیورالوجی میں) حاصل کی۔ وہ پیرس کے Salpetriere ہسپتال میں جین مارٹن کی زیرنگرانی پڑھنے کے لیے

Marfat.com

1885ء میں وہاں گیا۔ جین مارٹن ایک فزیشن اور ماہر ہپناٹزم تھا اور مخصوص مرض میں مبتلا افراد (سب کی سب عورتیں نہیں) کا انچارج تھا۔ بعد میں اس مرض کو ''ہسٹیریا'' قرار دیا گیا۔ جین مارٹن کے پاس آنے سے پہلے اس کی دلچسپی کا مرکز حیاتیات میں تھا۔ اس نے کچھ برس تک پروفیسر ارنسٹ بروکے کی لیبارٹری میں کام کیا تھا۔ پیرس سے واپس آنے کے بعد فرائیڈ نے ویانا جنرل ہسپتال میں جنرل فزیشن کے طور پر کام کیا۔ وہ یونیورسٹی میں ایک عہدہ چاہتا تھا لیکن یہودیوں کو اس کی اجازت نہ تھی۔ فرائیڈ نے 1886ء میں شادی کی اور اسی برس اعصابی مسائل کا سپیشلسٹ مشہور ہو گیا۔ فرائیڈ نے تحلیلی نفسیاتی تحریک کی بنیاد رکھی اور اس کی قیادت کی۔ فرائیڈین تھیوری کی بنیاد متعدد جبلتی تحریکات پر ہے جن سب کا مقصد بقا کو یقینی بنانا اور حصول مسرت یا تسکین ہے۔ تاہم، 1900ء میں اس کی کتاب ''خوابوں کی تفسیر'' (Interpretations of Dreams) منظر عام پر آئی۔ اسی کتاب نے فرائیڈ کو جرمنی اور آسٹریا کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی قابل ذکر بنایا فرائیڈ کی دیگر تحریروں میں مندرجہ ذیل شامل ہیں: ''Totem and Taboo'' (13ء)، ''Ego and the Id'' (23ء)، ''New Introductory Lectures on Psychoanalysis'' (33ء) اور ''Moses and Monotheism'' (39ء)۔

آمن (Amon) ...... مصری زبان میں ''مخفی''۔ قدیم مصری دیوتا، بالاصل پیداواری قوتوں کا ایک مقامی تھیبسی دیوتا جس کی علامت مینڈھا ہے۔ عامون، اس کی بیوی مت (ماں) اور بیٹے چاند دیوتا خون (آسمان گرد) نے تھیبس کی الوہی تثلیث تشکیل دی۔ بعد میں آمن کو ہیلیو پولس کے سورج دیوتا را کے ساتھ شناخت کر دیا گیا اور وہ آمن را یعنی دیوتاؤں کا باپ کہلانے لگا -- تمام موجودات کا خالق اور آقا۔ ایک ہمہ گیر دیوتا کی حیثیت میں وہ مصری قوم اور سلطنت کا دیوتا بنا۔ اس کے پروہت اعلیٰ کے اختیارات فرعون کے اختیارات جیسے تھے جس کے باعث سیاسی مسائل پیدا ہوئے، جیسا کہ آج ریاست اور کلیسیا کی مسابقت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ آج تک بنایا گیا سب سے بڑا معبد الکارناک میں آمن را سے منسوب تھا۔ سائی رینے کی یونانی بستیوں میں آمن کی پرستش کی جاتی تھی جہاں یہ زیئس کے ساتھ شناخت کیا جانے لگا۔ روم میں اسے جوپیٹر کے ساتھ منسلک کیا گیا۔

آمن حوتپ سوم (Amenemhotep III) ...... مصر کی اٹھارہویں سلطنت کا بادشاہ (1391-1353ء)، بڑی بڑی عمارات کا معمار (بشمول الاقصور معبد کے کچھ حصے اور کولوسی آف میمنن)۔ اس کا عہد امن اور خوش حالی سے عبارت تھا جب مصری طاقت اپنے عروج کو پہنچی۔ آمن حوتپ کی سفارتی خط و کتابت امارنا خطوط میں محفوظ ہے جو 400 الواح پر لکھی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ مصر کا عظیم مذہبی مصلح اخناتون اس کا بیٹا تھا۔

Marfat.com

آتن (Aton)...... سورج کا مصری دیوتا جسے اخناتون کے عہد حکومت (1353-1335 ق م) کے دوران واحد دیوتا قرار دیا گیا تھا۔ ایک خیال کے مطابق باقاعدہ توحید کا آغاز آتن کو واحد دیوتا ماننے سے ہی ہوا۔

ابراہیم، حضرت (Abraham)...... یا ابرہام/ ابرام۔ بائبلی پیغمبروں میں سے ایک، عبرانیوں کے جد امجد (دیکھیں کتاب پیدائش؛ 11:27) جن کا دور 2000 اور 1500 قبل مسیح کے درمیان تھا۔ مسلمان حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسمٰعیلؑ کے توسط سے عربوں کا جد امجد قرار دیتے ہیں۔ ایک دور میں انہیں بابل کے بادشاہ حمورابی کا ہم عصر خیال کیا جاتا تھا۔ چونکہ بائبل میں ابرام کے متعلق بیان تاریخی ریکارڈز کے بجائے زبانی روایات پر مبنی ہے، اس لیے جدید مفہوم میں کوئی سوانحی خاکہ پیش کرنا ممکن نہیں۔ بائبل کے مطابق ابرام یا ابراہیم تارح کا بیٹا تھا اور کالدیس کے شہر اُر میں پیدا ہوا۔

Marfat.com

باب 6
پہلا اصول
THE FIRST PRINCIPLE

چیٹک، ولیم سی (Chittick, William C.)...... کلاسیکی اسلامی فلسفے اور صوفیانہ کتب کا ممتاز مترجم اور مفسر۔ وہ رومی اور ابن العربی کے متعلق اپنے تاریخ ساز کام کی وجہ سے مشہور ہے۔ وہ ملفورڈ، کنیٹی کٹ میں پیدا ہوا اور تاریخ میں بی اے کرنے کے بعد ایران گیا جہاں 1974ء میں تہران یونیوسٹی سے فارسی ادب میں پی ایچ ڈی کی۔ اس نے انقلاب سے قبل تہران میں کچھ عرصہ پڑھایا بھی، لیکن جنوری 1979ء میں واپس امریکہ چلا گیا۔ وہ تین برس تک انسائیکلوپیڈیا ایرانیکا کا اسسٹنٹ ایڈیٹر رہا۔

صوفی (Sufi)......صوفی کی اصطلاح عربی کے لفظ صوف (کھردری اون) سے مشتق ہے جو نویں صدی میں مجاہدہ کرنے اور صوف پہننے والے نفس کشوں کے لیے استعمال کی گئی۔ جلد ہی تمام باطنیت پسندوں کو صوفی کہا جانے لگا، چاہے وہ مرتاضانہ دساتیر پر عمل کرتے ہوں یا نہ۔

ین اور یانگ (yin and yang)......چینی فکر میں متضاد اور ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی قوتیں، چینی زبان میں ان کا مطلب ''سایہ'' اور ''روشن'' بنتا ہے۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں چینی فلسفیوں نے ماحول کے حوالے سے ین اور یانگ کا استعمال شروع کیا۔ بالخصوص کسی پہاڑی کے سائے والے اور روشن حصے کو یہ نام دیے گئے۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے آخر میں ین ہر تاریک، نم، زمین، مؤنث چیز جبکہ یانگ ہر روشن، خشک، فعال، آسمانی اور مذکر چیز سے منسوب ہوگئی۔ یقین کیا جاتا ہے کہ ین اور یانگ مختلف مقداروں میں مل کر کائنات کی مختلف چیزیں پیدا کرتے ہیں۔ ین میں ہمیشہ یانگ کا ایک عنصر اور یانگ میں ہمیشہ ین کا ایک عنصر موجود ہوتا ہے۔ ان دونوں کو سفید اور کالے رنگ کے حصوں والے دائرے کی علامت سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ کالے حصے میں ایک سفید نقطہ جبکہ سفید حصے میں ایک کالا نقطہ ہے۔ یعنی یانگ کے بغیر ین اور ین کے بغیر یانگ کا وجود نہیں۔ چینی فلسفیوں نے دونوں کے درمیان

Marfat.com

توازن پر زور دیا تاکہ سماجی و سیاسی آہنگ یقینی بنایا جاسکے۔ بغاوت، سیلاب اور بیماری کو ین اور یانگ میں عدم توازن کا نتیجہ قرار دیا گیا۔ چین اور بعد ازاں جاپان میں مستقبل بین اور ڈاکٹر حکومتوں اور افراد کو ین اور یانگ کے باہمی تعلق میں ہم آہنگی بحال کرنے کے طریقے تجویز کرتے آئے ہیں۔

پاولوف (Pavlov, Ivan Petrovich)......(1849-1936) مشہور روسی فزیالوجسٹ۔ اس نے بہت بچپن میں ہی انتہائی ذہانت اور ورائے انسان توانائی کا مظاہرہ کیا۔ جب مشہور ترین روسی ادبی نقاد Pisarev اور روسی فزیالوجی کے بانی Sechenov کے خیالات 1860ء کی دہائی میں وسیع پیمانے پر مقبولیت حاصل کر رہے تھے تو پاولوف نے مذہبی کیریئر چھوڑ کر ساری توجہ سائنس کی طرف دینے کا فیصلہ کیا۔ 1870ء میں اس نے سینٹ پیٹرسبرگ یونیورسٹی کے شعبۂ طبیعات و ریاضی میں داخلہ لیا۔ پاولوف نے اپنی ساری زندگی فزیالوجی اور سائنس پر تحقیق کے لیے وقف کر دی۔ 1904ء میں اسے نوبیل انعام برائے فزیالوجی ملا۔

زیدی، مصطفےٰ......(1930-1970) اصل نام مصطفےٰ حسینی۔ اردو زبان کا مشہور شاعر۔ الہ آباد میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں تیغ آبادی کے تخلص سے مشہور ہوا۔ 1952ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگلش کیا۔ اسلامیہ کالج کراچی اور پھر پشاور یونیورسٹی میں لیکچرر رہا۔ 1956ء میں برطانیہ سے تربیت حاصل کرنے کے بعد تمام یورپ اور مشرق وسطیٰ کا سفر کیا۔ وطن واپس آکر سیالکوٹ، ڈیرہ غازی خان اور مری میں اسسٹنٹ کمشنر رہا۔ کچھ عرصہ لاہور میں ڈپٹی سیکرٹری تعلیم رہا۔ پھر جہلم، نواب شاہ، خیر پور، ساہیوال اور لاہور کا ڈپٹی کمشنر رہا۔ دسمبر 1969ء میں ملازمت سے معطل اور مئی 1970ء میں برطرف کر دیا گیا۔ 13 اکتوبر 1970ء کو وہ اپنے فلیٹ میں مردہ پایا گیا تھا۔ زیدی کی شاعری کے مجموعے یہ ہیں: یہ ہیں زنجیریں، روشنی، کوہ ندا، شہر آذر، موج مری صدف صدف، گریبان، قبائے ساز۔

اشتراکیت (communism)......سوشلزم۔ سماجی و سیاسی تنظیم کا ایک نظریہ اور نظام جو بیسویں صدی کے زیادہ تر حصے میں دنیا کی سیاست کی اہم قوت بنا رہا۔ ایک سیاسی تحریک کے طور پر کمیونزم نے مزدور انقلاب کے ذریعہ سرمایہ داری کو ختم کرنے اور ایک ایسا نظام قائم کرنے کی کوشش کی جس میں جائیداد افراد کی بجائے بحیثیت مجموعی عوام کی زیر ملکیت ہو۔ تھیوری کے مطابق کمیونزم نے وافر پیداوار اور آزادی پر مبنی ایک طبقات سے عاری معاشرہ تخلیق کرنا ہے جس میں تمام لوگ مساوی سماجی اور معاشی حیثیت کے مالک ہوں گے۔ عملی روپ میں کمیونسٹ حکومتوں نے جابرانہ اور مطلق العنان صورتیں اختیار کر لیں جنہیں مزدور طبقے کی حالت بہتر بنانے کی زیادہ پروا نہ رہی اور وہ اقتدار پر اپنا قبضہ مضبوط بنانے میں لگی رہیں۔

Marfat.com

سرمایہ داری (capitalism)......سماجی معاشیاتی تشکیل جس نے جاگیرداری نظام کی جگہ لی۔ سرمایہ داری کی بنیاد ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت اور اجرتی مزدور کے استحصال پر ہے۔ قدر زائد کا حصول سرمایہ دارانہ پیداوار کا بنیادی اصول ہے۔ پیداوار کی بدنظمی، مخصوص عرصہ بعد بحران، شدید بے روزگاری، عوام کی غربت اور مقابلہ بازی و جنگیں سرمایہ داری نظام کا خاصہ سمجھی جاتی ہیں۔ محنت کی سماجی نوعیت اور استحصال کی نجی سرمایہ دارانہ صورت کے درمیان بنیادی تضاد کا اظہار سرمایہ دار معاشرے کے بڑے طبقات میں ہوتا ہے: مزدور اور سرمایہ دار۔ سرمایہ داری کی ساری تاریخ مزدور اور سرمایہ دار کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ نہایت قدیم ماخذ رکھنے کے باوجود سرمایہ داری کی اساس یورپ میں ملتی ہے۔ اس نے متعدد مراحل میں ارتقا پایا اور انیسویں صدی میں اپنے عروج کو پہنچا۔ معاصر سرمایہ داری کی ترقی میں اہم ترین دانشورانہ واقعہ برطانوی ماہر معیشت جان مینارڈ کینز کی کتاب ''General Theory of Employment, Interest and Money'' (1936ء) کی اشاعت تھی۔ ایڈم سمتھ کے ابتدائی نظریات کی طرح کینز کی فکر بھی مغربی جمہوریتوں میں سرمایہ داری کے انداز عمل سے عمیق طور پر متاثر تھی۔

فریڈ ایلن وولف (Fred Alan Wolf)......(1934-   ) تھیوریٹیکل طبیعات کا امریکی ماہر جس نے کوانٹم فزکس میں خصوصی قابلیت دکھائی اور طبیعات و شعور کے درمیان تعلق پر بھی کام کیا۔ وہ کچھ عرصہ سان ڈیاگو سٹیٹ یونیورسٹی میں فزکس کا پروفیسر رہا اور ڈسکوری چینل پر سائنس کو مقبول بنانے میں مدد دی۔ وہ طبیعات کے متعلق متعدد کتب کا مصنف ہے، بشمول ''Taking the Quantum Leap'' (1981ء)، ''The Dreaming Universe'' (1994ء)، ''Mind into Matter'' (2000ء) اور ''Time Loops and Space Twists'' (2011ء)۔ شعور اور کوانٹم فزکس کے درمیان تعلق کے بارے میں اس کی تھیوریز موجودہ سائنس میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔

میکسویل، جیمز کلرک (Maxwell, James Clerk)......(1831-1879) برطانوی ماہر طبیعات، روشنی اور برقناطیسی امواج کے درمیان تعلق پر اپنے کام کی وجہ سے مشہور۔ اس نے دریافت کیا کہ روشنی برقناطیسی لہروں پر مشتمل ہے اور گیسوں کا حرکی نظریہ قائم کیا جو گیس میں مالیکیولز کی حرکت اور گیس کے درجۂ حرارت اور دیگر خواص کے درمیان تعلق کی وضاحت کرتا ہے۔ اس نے یہ بھی دکھایا کہ سیارہ زحل کے حلقے متعدد خفیف ذرات سے مل کر بنے ہیں۔ رنگین بصارت کے اصول بھی اسی نے منکشف کیے۔ میکسویل ایڈنبرگ، سکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا اور 1841-47ء کے درمیان ایڈنبرگ اکیڈمی میں پڑھنے کے بعد ایڈنبرگ یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ 1854ء میں اس نے کیمبرج یونیورسٹی سے ریاضی میں بیچلر ڈگری لی۔ 1856ء میں وہ ایبرڈین کے ایک کالج میں فطری فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہوا اور 1860ء میں لندن جا کر کنگز کالج میں فطری فلسفہ اور فلکیات کا پروفیسر بن گیا۔ 1865ء میں

Marfat.com

باپ کی وفات کے بعد وہ واپس سکاٹ لینڈ گیا اور تحقیق میں کھو گیا۔ 1871ء میں میکسویل کیمبرج منتقل ہوا اور تجرباتی طبیعات کا پہلا پروفیسر بننے کے علاوہ کیونڈش لیبارٹری قائم کی۔ 1879ء میں شدید علالت کے باعث اسے یہ عہدہ چھوڑنا پڑا۔

ایمپیئر ،آندرے ماری(Ampere, Andre Marie)......(1775-1836) فرانسیسی سائنس دان، برقی مقناطیسیت کے مطالعہ میں اپنی اہم حصہ داریوں کی وجہ سے مشہور ہوا۔ایمپیئر لیوں شہر کے ایک افسر کا بیٹا تھا۔ الیکٹرک کرنٹ کے یونٹ ایمپیئر کا نام اسی کی نسبت سے ہے۔اس کی برقی مقناطیسی تھیوری اور برقیات و مقناطیسیت کے درمیان تعلق کے بارے میں اس کے خیالات ''Collection of Observations on Electrodynamics''(1822ء) میں شائع ہوئے۔سب سے پہلے اسی نے ثابت کیا کہ ایک ہی سمت میں سفر کرتے ہوئے کرنٹس کے حامل دو متوازی کنڈکٹرز اگر مخالف سمتوں میں سفر کریں تو ایک دوسرے کو دفع کرتے ہیں۔

فیراڈے، مائیکل (Faraday, Michael) ...... (1791-1867) برطانوی طبیعات دان اور کیمیا دان، برقناطیسی انڈکشن اور برق پاشیدگی کے قوانین دریافت کرنے کی وجہ سے مشہور۔ وہ سرے، انگلینڈ میں پیدا ہوا۔ وہ ایک لوہار کا بیٹا تھا اور بہت کم باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ لندن میں کتابوں کے ایک جلد ساز کے پاس کام سیکھنے کے دوران اس نے سائنسی موضوعات پر کتابوں کا مطالعہ کیا اور بجلی کے ساتھ تجربات کیے۔ 1812ء میں اس نے برطانوی کیمیا دان سر ہمفرے ڈیوی کے لیکچرز سنے اور اپنے تیار کردہ نوٹس کے ساتھ ملازمت کی درخواست دی۔ ڈیوی نے اسے رائل انسٹی ٹیوشن میں اپنی کیمیکل لیبارٹری میں اسسٹنٹ رکھ لیا اور 1813ء میں ساتھ لے کر یورپ کے طویل دورے پر روانہ ہوا۔ 1824ء میں وہ رائل سوسائٹی کا رکن منتخب ہوا اور اگلے برس رائل انسٹی ٹیوشن کی لیبارٹری کا ڈائریکٹر بن گیا۔ 1833ء میں وہ ڈیوی کی جگہ انسٹی ٹیوشن میں کیمیا کا پروفیسر تعینات ہوا۔ دو سال بعد اسے تاحیات 300 پونڈ پنشن جاری ہوئی۔ اسے متعدد سائنسی اعزازات ملے۔ فیراڈے کی ابتدائی ترین تحقیقات کیمیا کے شعبہ میں تھیں۔ کلورین پر تحقیق کے دوران اس نے کاربن کے دو نئے کلورائیڈز اور بینزین بھی دریافت کی۔ فیراڈے نے بصری شیشے کی متعدد اقسام پر کام کیا۔ فیراڈے کو ممتاز سائنس دان کا رتبہ دلانے والی تحقیق بجلی اور مقناطیسیت کے شعبوں میں تھی۔ 1821ء میں اس نے برقی رو کے حامل کنڈکٹر کے گرد مقناطیسی میدان کا کھوج لگایا؛ مقناطیسی میدان کی موجودگی کا مشاہدہ پہلی مرتبہ ڈینش طبیعات دان ہانس کرسٹیان نے 1819ء میں کیا تھا۔ 1831ء میں فیراڈے نے الیکٹرومیگنیٹک انڈکشن دریافت کی اور اُسی سال ایک سے دوسرے الیکٹرک کرنٹ کی انڈکشن کا مظاہرہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے برق پاشیدگی کے مظاہر پر بھی تحقیق کی اور دو بنیادی قوانین دریافت

Marfat.com

کیے۔ اس نے ممتاز جرائد کے لیے متعدد مضامین کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب تصنیف کیں: ''Chemical Manipulation''(1827ء)، ''Experimental Researches in Electricity'' (1844-1855ء) اور ''Experimental Researches in Chemistry and Physics''(1859ء)۔

گرین، برائن (Greene, Brian)...... (1963-) امریکی تھیوریٹیکل طبیعات دان اور سٹرنگ تھیوری کا ماہر۔ وہ 1996ء سے کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ گرین نے کالابی-یاؤ اشکال پر کام کیا اور سٹرنگ تھیوری کے علاوہ سپر سٹرنگ تھیوری کو بھی اپنی کتب کے ذریعے عام لوگوں تک پہنچایا۔ اس کی قابلِ ذکر تصانیف میں درج ذیل شامل ہیں: ''The Elegant Universe''؛ ''Icarus at the Edge of Time''؛ ''The Fabric of the Cosmos'' اور ''The Hidden Reality''۔

امجد اسلام امجد...... (1944-) شاعر، ادیب، ڈرامہ نگار، معلم۔ لاہور میں پیدا ہوئے۔ 1957ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کی ڈگری لی۔ امجد کی تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے۔ شاعری کے مجموعے یہ ہیں: برزخ، ساتواں در، فشار، ذرا پھر سے کہنا، خزاں کے آخری دن، اس پار، اتنے خواب کہاں رکھوں گا۔ ڈراموں میں وارث، دہلیز، وقت، دن، رات، سمندر شامل ہیں۔ امجد نے دنیا کے اکثر ممالک کے سفر کیے۔ اپنے مخصوص اسلوب میں ایک سیاحت نامہ ''شہر در شہر'' بھی لکھا۔ متعدد انعامات و اعزازت سے نوازا جا چکا ہے۔ 1987ء میں صدر پاکستان کی جانب سے ''حسن کارکردگی'' کا اعزاز ملا۔ مجموعۂ کلام ''فشار'' پر نیشنل ہجری ایوارڈ (1403ھ) دیا گیا۔ امجد اسلام امجد پنجاب کونسل آف آرٹس، فلم سنسر بورڈ، الحمرا آرٹس کونسل، کمیٹی رائٹرز فنڈ حکومت پنجاب اور مجلس ترقی ادب کا رکن ہے۔ پنجاب کونسل آف آرٹس کا ڈپٹی ڈائریکٹر (1975-79ء) رہ چکا ہے۔ گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور میں اردو کا پروفیسر ہے۔ اردو سائنس بورڈ لاہور کا ڈائریکٹر جنرل بھی رہے۔

سعدی (Sa'di)...... (1213?-1292?) اصل نام مشرف الدین ابن مصلح الدین عبداللہ۔ فارسی شاعر جو رواقی دانش اور ہمدردی کا امتزاج پیش کرنے کی وجہ سے اور خوب صورت شاعری کی وجہ سے سراہا جاتا ہے۔ اُس کا باپ شیراز میں اتابیگ سعد ابن زنگی کے دربار میں ایک عہدے پر فائز تھا؛ باپ کے مرجانے پر اتابیگ نے بیٹے کو گود لے لیا؛ اور سعدؔی نے مسلم روایت کے مطابق اُس کا نام اپنے نام کے ساتھ جوڑ لیا۔ اُس کے دورِ حیات کے بارے میں محققین کی آرا مختلف ہیں...... 1184-1283ء، 1184-1291ء، 1193-1291ء۔ بہر صورت اُس کی زندگی کوئی ایک صدی کے برابر تھی۔ نظامیہ کالج بغداد سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد (1226ء) اُس

Marfat.com

نے مشرقِ قریب و وسطیٰ، ہندوستان، ایتھوپیا، مصر اور شمالی افریقہ میں تیس برس غیر معمولی آوارہ گردی کرتے ہوئے گزارے۔ وہ صلیبیوں کے خلاف لڑا، ''کافروں'' کا قیدی بنا اور تاوان دے کر رہا ہوا۔ اُس کی تمام تحریریں کُنج میں گوشہ گیری اختیار کرنے کے بعد لکھی گئیں۔ ''پند نامہ'' ایک کتابِ دانش ہے؛ ''دیوان'' مختصر نظموں کا ایک مجموعہ ہے۔ سعدؔی کا عمومی فلسفہ ''بوستان'' میں ہے۔ ''گلستان'' (1258ء) پند ونصائح اور خوب صورت شاعری کا امتزاج ہے۔

بدھ مت (Buddhism) ...... ایک اہم عالمی مذہب جس کی بنیاد شمال مشرقی ہندوستان میں گوتم بدھ کی تعلیمات پر رکھی گئی۔ اس کا آغاز اس دور کی غالب برہمن روایت کے اندر ہوا اور پھر ایک جداگانہ سمت اختیار کر لی۔ بدھ نے نہ صرف ہندو فلسفہ کے نمایاں پہلوؤں کو مسترد کر دیا، بلکہ برہمنوں کی حاکمیت کو بھی چیلنج کیا، ویدک صحائف کو مستند ماننے سے انکار کیا اور ان پر مبنی قربانیوں کے مسلک کو نظر انداز کر دیا۔ نیز اس نے اپنی نئی تحریک میں تمام ذاتوں کے افراد کو شامل کیا۔ موجودہ دور کا بدھ مت دو بڑی شاخوں میں منقسم ہے: تھیرواد (بڑوں کا راستہ) اور مہایان (بڑی گاڑی)۔ مہایان کے پیروکار تھیرواد کو ازراہِ تحقیر ہین یان (چھوٹی گاڑی) کہتے ہیں۔ بدھ مت نہ صرف ہندوستان بلکہ سری لنکا، تھائی لینڈ، کمبوڈیا، میانمر (برما) اور لاؤس میں بھی اہمیت کا حامل رہا ہے جہاں تھیرواد کو غلبہ حاصل ہوا۔ مہایان نے چین، جاپان، تائیوان، تبت، نیپال، منگولیا، کوریا اور ویتنام کے علاوہ ہندوستان میں بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ دنیا بھر میں بودھیوں کی تعداد اندازاً 15 اور 30 کروڑ کے درمیان بتائی جاتی ہے۔

عیسائیت (Christianity) ...... یا مسیحیت۔ عالمی مذاہب میں سب سے زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا مذہب۔ 1990ء کی دہائی کے اواخر میں کوئی 1.9 ارب لوگ عیسائیت کے پیروکار تھے۔ ایمان اور اقدار کے کسی بھی اور نظام۔ عیسائیت ایک برادری، ایک اندازِ حیات، ایک نظامِ اعتقادات اور روایت کا نام ہے۔ عیسائیت کا ان میں سے ہر ایک پہلو دیگر عقائد کے ساتھ بھی مشابہتیں رکھتا ہے، لیکن ہر پہلو واضح امتیازی عیسائی ماخذوں کا بھی حامل ہے۔ چنانچہ، عیسائی نظریات اور دساتیر کا مقابلتاً تجزیہ کرنا اور انہیں دیگر مذاہب کے ساتھ تعلق میں بیان کرنا ناگزیر اور مفید بھی ہے۔ عیسائیوں نے مسیح کو امتیازی یا بے مثال ماننے پر کبھی سودا نہیں کیا۔ یقیناً وہ سب مانتے ہیں کہ ان کی زندگی اور مثال پر عمل کرنا چاہیے اور محبت و بھائی چارے کے متعلق ان کی تعلیمات کو انسانی تعلقات کی بنیاد بنانا چاہیے۔ ان کی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ ربیوں کے اقوال میں بھی مل جاتا ہے یا پھر سقراط اور کنفیوشس کے ہاں بھی ایسی دانش موجود ہے۔ عیسائی تعلیمات میں یسوع مسیح کی حیثیت اخلاقی زندگی کے مبلغِ اعلیٰ اور مثالی راہنما والی ہے، لیکن بیشتر عیسائیوں کی نظر میں اس طرح ان کی زندگی اور کام سے صحیح معنوں میں انصاف نہیں ہوتا۔ تاریخی اعتبار سے یسوع مسیح کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہے وہ بائبل کے عہد نامۂ جدید کی اناجیل میں بتایا گیا ہے۔ عہد نامۂ جدید

Marfat.com

کے دیگر حصے ابتدائی مسیحی کلیسیا کے اعتقادات کے متعلق بتاتے ہیں۔ پولوس (پال) اور دیگر مصنفین کو یقین تھا کہ یسوع مسیح ایک صاحب کشف تھے، نہ کہ محض ایک کامل انسان۔ معتقدین کی پہلی نسل نے یسوع مسیح کو باپ اور انجام کار روح القدس کا ہم پلہ قرار دیا جسے باپ نے ''یسوع کی جانب بھیجا تھا۔'' اختلاف رائے اور غور فکر کے بعد اس اقبال نے خدا کی تثلیث کے عقیدے کی صورت اختیار کی (دیکھیں ''روح القدس'')۔ باپ اور بیٹے کے نام پر بپتسمہ ابتدا سے ہی عیسائیت میں داخلے کا ذریعہ رہا ہے۔ ابتدا میں غالباً صرف راسخ الایمان بالغوں کو ہی بپتسمہ دیا جاتا تھا، لیکن بعد میں بچوں کے ساتھ بھی یہ رسم ادا کی جانے لگی۔ عیسائیوں کے ہاں ہمہ گیر طور پر قبول کردہ دوسری رسم یوخرست (Eucharist) یا خداوند کی ضیافت ہے جس میں عیسائی روٹی اور شراب میں شریک ہوتے اور ان کے توسط سے اپنے درمیان یسوع مسیح کی موجودگی کی حقیقت کو بیان اور تسلیم کرتے ہیں۔ عیسائی عقیدے اور طرز عمل کا ایک اور بنیادی عنصر بذات خود عیسائی برادری ہے۔۔۔ یعنی کلیسیا۔

یسوع ناصری (Jesus) ...... یسوع مسیح۔ عیسائیت کی مرکزی شخصیت جنہیں مسلمان بھی بطور پیغمبر خصوصی احترام دیتے ہیں۔ مسیح ناصری 8 یا 4 قبل مسیح میں بیت اللحم (یہودا) میں پیدا ہوئے۔ عیسائی عہد کے واقعات کی زمانی ترتیب کو چھٹی صدی میں مسیح کے پیدائش کے سال سے شمار کیا گیا۔ جدید تحقیق کے مطابق اس حساب کتاب میں چار یا آٹھ برس کی غلطی ہوئی اور مسیح کا اصل سن پیدائش چار یا آٹھ قبل مسیح بنتا ہے۔ روایتی طور پر عیسائی یسوع مسیح کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں جن کی کنواری والدہ حضرت مریم الوہی برکت سے حاملہ ہوئی تھیں۔ وہ ناصرۃ کے بڑھئی جوزف کی بیوی تھیں۔ یسوع یا Joshua کا عبرانی نام یونانی میں Jesus کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کے علاوہ عبرانی کے Mashiakh یا مسیح کا یونانی ترجمہ christos کیا گیا۔ ابتدائی پیروکاروں نے 'کرائسٹ' یا عیسیٰ کا نام استعمال کیا جسے وہ اسرائیل کا موعودہ نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ بعد ازاں کلیسیا نے Jesus کو ساری انسانیت کا نجات دہندہ قرار دیا۔ مسیح کی زندگی کے بارے میں معلومات کے مرکزی ذرائع اناجیل ہیں جو پہلی صدی عیسوی کے نصف آخر میں لکھی گئیں۔ سینٹ پال کے مراسلے اور نبیوں کے اعمال نامی کتب میں بھی مسیح کے متعلق معلومات موجود ہے۔

بھگتی (bhakti) ...... گہری مذہبی عقیدت اور محبت کا جذبہ۔ وحدانیت پرست ہندومت میں بھگتی یا بھگتی سے مراد پجاریوں کا ایک شخصی خدا سے عقیدت کا جذبہ ہے۔ بھگوت گیتا میں خدا سے محبت اور دلی لگاؤ ہی مرکزی موضوع ہے۔ لیکن اس تصور کو قرون وسطیٰ کے ہندومت میں اہمیت ملی۔ بارہویں تا اٹھارہویں صدی کے دوران سارے ہندوستان میں بھگتی رنگ میں رنگے ہوئے شعرا ملتے ہیں۔ پنجاب کے کئی شعرا کے کلام میں یہ جذبہ واضح نظر آتا ہے، جیسے بابا فرید، گورونانک، شاہ حسین، وارث شاہ اور بلھے شاہ وغیرہ۔

Marfat.com

اوریگن (Origen)......(185-254) قدیم دور کا مشہور عیسائی مصنف، استاد اور ماہر الٰہیات۔ وہ اوری جینز اور ایڈامانٹینس کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اوریگن سکندریہ، مصر میں پیدا ہوا اور کلیمنٹ کا شاگرد تھا۔ اٹھائیس سال کی عمر میں وہ شہر کے عیسائیوں اور بت پرستوں کو تعلیم دینے لگا۔ اس نے اپنے اہم عقائدانہ مقالے وہیں لکھے اور تنقیدی تصانیف کا آغاز کیا۔ اوریگن سیزاریا (قیصریہ) میں مقیم ہوا اور وہاں ادب، فلسفہ و دینیات کے ایک مکتبۂ فکر کی بنیاد رکھی۔ 250ء میں جب شہنشاہ ڈیسیئس نے عیسائیوں کو ایذا دہی کا آغاز کیا تو اوریگن کو قید کیا اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ 251ء میں رہائی ملنے پر وہ تشدد سے بدحال تھا اور تین سال بعد الصور میں مر گیا۔

برنارڈ شا، جارج (Shaw Bernard, George)......(1856-1950) آئرش نژاد مصنف جسے ولیم شیکسپیئر کے بعد اہم ترین برطانوی ڈرامہ نگار مانا جاتا ہے۔ اس نے پچاس سے زائد سٹیج ڈرامے لکھے۔ وہ ڈبلن میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک ناکام تاجر تھا۔ ماں اضافی آمدنی کے لیے پڑھایا کرتی تھی۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک سکولوں میں پڑھنے کے بعد شا نے سولہ برس کی عمر میں کلرکی شروع کی؛ بعدازاں وہ خود ہی پڑھتا تھا۔ ماں باپ کی ازدواجی زندگی ناکام ہونے پر ماں اور بہنیں لندن چلی گئیں اور شا بھی 1876ء میں ان کے پاس چلا آیا۔ اگلا عشرہ مایوسی اور فلاکت سے بھرپور تھا۔ موسیقی پر تنقید اور نہ ہی ٹیلی فون کمپنی میں ملازمت زیادہ عرصہ تک چل سکی۔ نیز 1879-83ء کے درمیان شا کے تصنیف کردہ پانچ میں سے صرف دو ناول پبلشروں نے طباعت کے لیے قبول کیے: "Cashel Byron's Profession" (1882ء) اور "An Unsocial Socialist" (1883ء)۔ 1880ء کی دہائی کے وسط میں شا کو کارل مارکس کی تصانیف پڑھنے کا اتفاق ہوا اور وہ سماجی مسائل اور تنقیدی صحافت کی جانب آیا۔ وہ سبزی خوری کا قائل، ایک مسحور کن خطیب اور متذبذب طور پر ڈرامہ نگار بھی بنا۔ وہ نو قائم شدہ "فیبیئن سوسائٹی" (1884ء) کی روح رواں تھا جو انگلش حکومت اور معاشرے میں تبدیلی لانا چاہتی تھی۔ شا کا پہلا ڈرامہ "Widowers' Houses" (1892ء) ابسن کے انداز میں رومانویت پسند پابندیوں کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ شا نے "Man and Superman" (1903ء) میں ڈان جوآن کی داستان کو ڈرامائی روپ دیا۔ دیگر تصنیف کردہ قابل ذکر ڈراموں میں درج ذیل شامل ہیں: "Major Barbara" (1905ء)، "The Doctor's Dilemma" (1906ء)، "Getting Married" (1908ء)، "Misalliance" (1910ء)، "Fanny's First Play" (1911ء)، "Androcles and the Lion" (13ء)، "Pygmalion" (13ء)، "Heartbreak House" (19ء)، "Back to Methuselah" (21ء) اور "For Saint Joan" (23ء) جسے نوبیل انعام برائے امن ملا۔

Marfat.com

لا شئے، عدم (Ex-Nihilo)......قدیم فلسفے میں یہ اصطلاح ''عدم سے وجود'' میں آنے کے حوالے سے استعمال ہوئی ہے۔ الٰہیات میں ex-nihilo سے کسی پہلے سے موجود، ازلی مادے میں سے تخلیق مراد ہے۔

سرمست، سچل......(1739-1826)......سندھ کے صوفی بزرگ اور شاعر۔ موضع درازہ، ضلع خیر پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام میاں عبدالوہاب اور والد کا نام میاں صلاح الدین تھا۔ آپ کا شجرۂ نسب 38 ویں پشت میں حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی آپ کے ہم عصر تھے۔ چنانچہ ان سے روحانی فیض حاصل کیا۔ شاہ بھٹائی کی وفات کے بعد ان کی گدی پر میاں نجی قبول محمد بیٹھے تو سچل سرمست ان سے رجوع ہوئے اور خرقۂ خلافت انہی سے حاصل کیا۔ چودہ برس کی عمر میں فارسی اور عربی سیکھ لی۔ پھر ویرانوں اور جنگلوں میں پھرتے رہے۔ سچل سندھ کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے سندھی، سرائیکی، فارسی اور اردو چار زبانوں میں شاعری کی۔ ان کا سندھی، سرائیکی اور اردو کا مجموعۂ کلام ''سندھی ادبی بورڈ'' سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کا فارسی کلام ''دیوان آشکار'' الگ سے چھپ چکا ہے۔ دیگر تصانیف یہ ہیں: وحدت نامہ، رہبر نامہ (مثنوی)، راز نامہ (مثنوی)، قتل نامہ، مرغ نامہ۔

بلھے شاہ...... (1680-1757) اصل نام عبداللہ شاہ جو بگڑ کر بلھا یا بلھے شاہ ہوگیا۔ ریاست بہاول پور کے گاؤں اچ گیلانیاں میں پیدا ہوئے۔ بلھے شاہ کی چھ ماہ کی عمر تک ان کے والدین اسی گاؤں میں آباد تھے۔ بعدازاں کسی سبب سے وہ گاؤں ملک وال (ضلع ساہیوال) چلے گئے جہاں ان کی برادری کے کئی گھرانے آباد تھے۔ وہاں آئے ابھی انہیں زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ گاؤں پانڈو کے ملک کو اپنے گاؤں کی مسجد کے لیے امام کی ضرورت پڑی۔ وہ ملک وال کے لوگوں کی سفارش پر بلھے شاہ کے والد شاہ محمد درویش کو پانڈو کے لے آیا۔ گاؤں کی مسجد میں امامت کے علاوہ آپ کو بچوں کی ابتدائی تعلیم کا کام بھی سونپا گیا۔ شاہ محمد درویش کو عربی اور فارسی میں دستگاہ حاصل تھی۔ بلھے شاہ کا اپنی بہن کے ساتھ خصوصی تعلق تھا جس نے ساری زندگی مجرد رہ کر اور پرہیز گاری میں گزاری۔ مذہبی کتب نے بلھے شاہ میں سوچنے سمجھنے کی چنگاری سلگائی۔ وہ مطلق حقیقت کے دیدار کی جستجو میں لگ گئے۔ اسی جستجو میں راہنمائی کے لیے انہوں نے شاہ عنایت قادری کو مرشد بنایا۔ بلھے شاہ نے شاہ عنایت کا دامن کبھی نہ چھوڑا۔ ان کے کلام میں مرشد کے عشق اور اس کی تعریف میں عقیدت سے لبریز جو بیان ملتے ہیں ان میں مستی بھی ہے اور رنگینی بھی۔ اس کے علاوہ عقائدانہ تشبیہات اور مثالوں کا بھی بھرپور استعمال کیا۔ اس کے باوجود بلھے شاہ کا کلام ایک مخصوص غیر مذہبی وصف رکھتا ہے۔

پلانک، میکس کارل ارنسٹ لڈوگ (Planck, Max Karl Ernst Ludwig)...... (1858-1947) نوبیل انعام یافتہ جرمن طبیعات دان جس نے کوانٹم تھیوری کی بنیاد رکھی۔ پلانک Kiel میں پیدا

Marfat.com

ہوا اور میونخ و برلن یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ 1885ء میں سے مقامی یونیورسٹی میں طبیعات کا پروفیسر تعینات کیا گیا اور 1889ء سے 1928ء تک وہ برلن یونیورسٹی میں اسی عہدے پر فائز رہا۔ 1900ء میں اس نے خیال پیش کیا کہ توانائی چھوٹی چھوٹی اکائیوں کوانٹا کے ذریعے تابکاری کرتی ہے۔ اپنی کوانٹم تھیوری کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے اس نے فطرت کا ہمہ گیر مستقلہ دریافت کیا جو پلانک مستقلہ کہلایا۔ پلانک کی دریافتیں طبیعات کے ایک بالکل نئے شعبے کی بنیاد بنیں جسے کوانٹم مکینکس کا نام دیا گیا۔ انہوں نے ایٹمی توانائی جیسے شعبوں میں تحقیق کی بنیاد مہیا کی۔ پلانک کے 1918ء کے نوبیل انعام برائے طبیعات سمیت متعدد اعزازات اور انعامات ملے۔ اس کی تحریروں میں درج ذیل شامل ہیں: پانچ جلدوں میں ''Introduction to Theoretical Physics''(1932-33ء) اور ''Philosophy of Physics''(1936ء)۔

کوہن، تھامس ایس (Kuhn, Thomas Samuel) ...... (1922-1966) امریکی مورخ اور سائنس کا فلسفی جس کی متنازعہ کتاب ''The Structure of Scientific Revolutions'' (1962ء) نے اکیڈمک اور عوامی حلقوں پر زبردست اثرات مرتب کیے۔ اس نے اس کتاب میں ''پیراڈائم شفٹ'' کی اصطلاح متعارف کروائی جو انگلش زبان میں مستقل حیثیت اختیار کرگئی۔ کوہن نے سائنسی علم کی ترقی کے حوالے سے کئی مشہور دعوے کیے: کہ سائنسی شعبوں میں مخصوص عرصے بعد ''پیراڈائم شفٹس'' آتی ہیں اور یہ ایک ہی سمت میں مسلسل آگے نہیں بڑھتے؛ کہ یہ شفٹس تفہیم کے نئے در وا کرتی ہیں جنہیں سائنس دانوں نے قبل ازیں قابل قدر نہیں سمجھا ہوتا؛ اور یہ کہ صرف معروضی کسوٹی کو بنیاد بنا کر کسی مخصوص موقعے پر سائنسی صداقت کا تصور ثابت نہیں کیا جاسکتا، بلکہ یہ سائنسی کمیونٹی کے اتفاق رائے سے طے پاتی ہے۔

ہیگل، جارج ولہلم فریڈرک (Hegel, George Wilhelm Freidrich) ...... جرمن مثالیت یا عینیت پسند فلسفی جو انیسویں صدی کے نہایت اثر انگیز فلسفیوں میں سے ایک بنا۔ وہ Stuttgart کے مقام پر ایک ادنیٰ سرکاری افسر کے ہاں پیدا ہوا۔ Tubingen کی یونیورسٹی سے وہ ایک لوتھری پادری بن کر نکلا۔ وہ ساری عمر لوتھری مذہب کا ہی پیروکار رہا تھا لیکن اس کا نظام فکر اس کی نفی کرتا ہے۔ البتہ اس نے فلسفہ کی راہ اختیار کر لی۔ 1801ء میں اس نے Jena یونیورسٹی میں ایک عہدہ حاصل کرلیا اور یہیں ''روح کی مظہریات'' لکھی۔ 1806ء میں یونیورسٹی بند ہوگئی اور اسے نیورمبرگ جانا پڑا۔ وہ کچھ عرصہ تک لڑکوں کے نیوربرگ جمنازیم کا ہیڈ ماسٹر رہا۔ ہیگل 1818ء سے لے کر 1831ء میں ہیضہ کی وبا پھیلنے پر اپنی موت تک برلن یونیورسٹی میں رہا۔ اس نے اپنی زندگی میں ہی چار بنیادی کتب شائع کیں: مظہریات، ''منطق''(1812ء تا 1815ء) ''انسائیکلوپیڈیا''(1817ء) اور ''راستی کا فلسفہ''(1821ء)۔ اس کے مسودات اور لیکچر کے نوٹس میں موجود مواد فکری مسائل سے بھرپور ہے۔

Marfat.com

سقراط (Socrates) ...... (469-399) افلاطون کے وسیلہ سے مغربی فلسفہ کو نہایت گہرائی میں متاثر کرنے والا فلسفی۔ وہ ایتھنز میں ایک سنگ تراش سوفرونسکس کے ہاں پیدا ہوا۔ اُس نے ادب، موسیقی اور جمناسٹکس میں باقاعدہ ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں وہ سوفسطائیوں کے علم بدیع و معانی (Rhetoric) اور جدلیات سے واقف ہوا، ایونیائی فلسفیوں کے افکار اور ایتھنز کے عمومی کلچر سے آشنائی پیدا کی۔ شروع میں سقراط نے اپنے باپ والا پیشہ اپنایا اور تین گریسز (دیویوں) کا مجسمہ بنایا۔ سپارٹا کے ساتھ پیلوپونیشیائی جنگ میں وہ پیدل فوج میں شامل ہوا اور پوٹیڈیا (430-432ق م)، ڈیلیم (424ق م) اور ایمفی پولس (422ق م) کی لڑائیوں میں غیر معمولی شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ سقراط زبانی بحث کو تحریر پر فوقیت دیتا تھا، لہٰذا اپنی بالغ زندگی کا زیادہ تر عرصہ ایتھنز کی گلیوں اور بازاروں میں دلیل بازی کرتے ہوئے گزارا۔ سقراط کی سب سے بڑی کامیابی سننے والوں کو سوچنے اور مسلمہ قوانین اور دستوروں کے بارے میں سوال اُٹھانے اور اُن پر شک کرنے کی تحریک دینا تھی۔ اُس کی شخصیت اور اندازِ فکر کے بارے میں تمام قطعی معلومات کا ماخذ اُس کے دو ممتاز ترین شاگردوں کی تحریریں ہیں۔ ایک شاگرد افلاطون تھا جس نے کہیں کہیں اپنے نظریات بھی سقراط کے کھاتے میں ڈال دیئے۔ دوسرا شاگرد ژینوفون، ایک نثر نگار تھا جو اُستاد کے متعدد عقائد کو سمجھنے میں غالباً ناکام رہا۔ فلسفے میں سقراط کی حصہ داری بنیادی طور پر اخلاقی نوعیت کی تھی۔ سقراط کی دوستی اور اثر میں آنے والا ایک مفکر اینٹی ستھینز تھا جس نے رواقی فلسفیانہ مکتب کی بنیاد رکھی۔ سقراط ارستی پس کا بھی اُستاد تھا جو تجربے اور مسرت کے سائرینیائی (Cyrenaic) فلسفے کا بانی بنا۔ 399 قبل مسیح میں اُس پر ریاست کے دیوتاؤں کو نظر انداز کرنے اور نئے معبود متعارف کروانے کا الزام عائد کیا گیا۔ (یاد رہے کہ سقراط اکثر ''باطنی داخلی آواز'' کا ذکر کیا کرتا تھا)۔ اُسے نوجوان نسل کا اخلاق بگاڑنے اور انہیں جمہوریت کے اصولوں سے دور ہٹانے کا مورِدِ الزام بھی ٹھہرایا گیا۔ وہ بڑی بے باکی اور نڈری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے نظریات پر ڈٹا رہا۔ ''منصفوں'' نے اُسے موت کی سزا دی۔ اس نے زندگی کا آخری دن دوستوں اور مداحوں کے درمیان گزارا اور شام کے وقت بڑے سکون سے زہر کا پیالہ پی لیا۔

دونز سکوٹس، جان (Duns Scotus, John) ...... (1266?-1308) قرونِ وسطیٰ کے آخری دور میں اہم ترین اور نہایت مؤثر فلسفی۔ دینی علما میں سے ایک، علم الکلام (Scholasticism) کے سکاٹ ازم نامی مکتبہ کا بانی۔ اس کی شان دار طور پر پیچیدہ سوچ کی وجہ سے اس کا نام ہی دقیق معالج (Subtle Doctor) پڑ گیا۔ اس کے پیدائشی گاؤں کا نام بھی دونز تھا جو انگلینڈ کی سرحد سے چند میل دور واقع ہے۔ 1291ء میں وہ نارتھیمپٹن، انگلینڈ میں سینٹ اینڈریوز پرائری میں فرانسسکی سلسلے کا رکن بنا۔ اس نے آکسفورڈ اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی اور بعد ازاں ان دونوں یونیورسٹیوں میں اطالوی دینی عالم پیٹر لومبارڈ کی دینیاتی

Marfat.com

نصابی کتب ''Sentences'' پر لیکچر دیے۔ 1303ء میں شاہ فرانس فلپ چہارم کی حمایت سے انکار کرنے پر اسے پیرس سے جلاوطن کیا گیا۔ کچھ عرصہ جلاوطنی کاٹنے کے بعد وہ واپس پیرس آ گیا اور 1307ء تک وہاں پڑھاتا رہا۔ اس سال کے آخر میں اسے کولون بھیجا گیا جہاں وہ 8 نومبر 1308ء کو دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کی اہم ترین تحریریں ''Commentaries on Sentences''؛ اور تین فلسفیانہ مقالے ہیں: ''Questions on Metaphysics''؛ ''First Principle'' اور ''Quodlibetic Questions''۔ اس کی موت کے بعد کئی صدیوں تک اس کے پیروکار ''Scotists'' اکوئنس کے پیروکاروں کے ساتھ جھگڑتے رہے۔

آرم سٹرانگ، کیرن (Armstrong, Karen) ...... (-1944) برطانوی مصنفہ اور مفسر جس نے تقابلی مذاہب پر درجن بھر کتب تصنیف کیں۔ کیرن نے اپنی زندگی کے سترہ سال بطور رومن کیتھولک نن بسر کیے۔ 1969ء میں وہ مذہبی سلسلے کو چھوڑنے کے بعد آکسفورڈ میں داخل ہوئی اور ڈگری حاصل کر کے جدید ادب پڑھایا۔ وہ برٹش براڈ کاسٹر برائے مذہبی امور کے فرائض بھی انجام دیتی رہی۔ اسے ایسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنسز کا اعزازی رکن بنایا گیا۔ اس کی اہم تصانیف درج ذیل ہیں: ''Muhammad PBUH''؛ ''Beginning the World''؛ ''Holy War'' اور ''A History of God''۔

میمونائیڈز، موسس (Maimonides, Moses) ......(1135-1204) یہودی فلسفی اور طبیب۔ وہ سپین میں بمقام کارڈوبا پیدا ہوا۔ اسے ربی موسس بن میمون کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق کارڈوبا (قرطبہ) کے ایک ممتاز گھرانے سے تھا۔ نوجوانی میں اس نے اپنے عالم باپ میمون اور دیگر اساتذہ کے پاس تعلیم حاصل کی۔ میمونائیڈز نے یہودی علوم میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ مروّج سائنسی عقائد سے بھی واقفیت حاصل کی۔ جب قرطبہ میں دوہری زندگی گزارنا مزید ممکن نہ رہا تو میمون خاندان نے شہر کو الوداع کہا اور فاس (Fez) مراکش میں رہائش اختیار کی (1159ء)۔ میمونائیڈز نے اپنے پسندیدہ موضوعات -- ربانی اور یونانی فلسفے -- میں مطالعہ جاری رکھا اور طب میں بھی دلچسپی لینے لگا۔ تاہم، فاس بھی ایک عارضی پناہ گاہ ثابت ہوا۔ 1165ء میں ربی یہوداہ ابن شوشان (جس کے پاس میمونائیڈز پڑھا کرتا تھا) کو یہودیت کی پیروی کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے مار ڈالا گیا۔ میمون خاندان نے اس مرتبہ فلسطین جانے کا فیصلہ کیا جو نہایت خراب معاشی حالات سے دوچار تھا۔ وہ فلسطین میں چند ماہ گزارنے کے بعد مصر گئے اور قاہرہ کے نزدیک ایک بستی فستات میں قیام اختیار کیا۔ طبیب کے طور پر اس کی شہرت تیزی سے پھیلی اور وہ جلد ہی مشہور مسلمان سپہ سالار صلاح الدین ایوبی اور پھر اس کے بیٹے کا درباری طبیب بنا۔ اس نے نجی طور پر بھی طبابت جاری رکھی اور ریاستی شفاخانے میں ساتھ اطبا کو لیکچر دیا کرتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہودی برادری کے ایک سرکردہ رکن کے طور پر ممتاز ہوا۔ میمونائیڈز کی تحریریں

Marfat.com

متعدد اور متنوع تھیں۔ اس نے اپنی پہلی کتاب 16 سال کی عمر میں عربی میں لکھی: ''منطق اصطلاحات پر مقالہ۔'' اس کی پہلی بڑی تصنیف مشنہ کی شرح تھی: ''کتاب السراج۔'' اگلی بڑی تصنیف پر 1176ء میں کام شروع کیا اور 15 برس تک اس پر محنت کی: ''پریشان حالوں کے لیے راہنما کتاب'' جو مذہبی فلسفہ میں ایک کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں وہ یہودیت کے فلسفہ کی منطقی بنیادیں واضح کرتا ہے۔

لیونارڈو دا ونچی (Leonardo de Vinci)...... (1452-1519) فلورنسی آرٹسٹ، نشاۃ ثانیہ کے عظیم اساتذہ میں سے ایک جس نے مصور، مجسمہ ساز، معمار، انجینئر اور سائنس دان کے طور پر شہرت حاصل کی۔ مصوری کے شعبہ میں اس کی جدت طرازیوں نے عمیق اثرات مرتب کیے۔ وہ اٹلی میں صوبہ ٹسکنی کے ایک گاؤں وِنچی میں پیدا ہوا۔ اس کی پرورش ددھیال میں ہوئی۔ وہ نواح میں واقع ایک سکول میں داخل ہوا، بڑے ذوق وشوق سے ریاضی، موسیقی اور ڈرائنگ پر توجہ دی۔ بہتر سے بہتر خاکہ بنانے کی خاطر اس نے تجسس، تحمل اور غور کے ساتھ تمام فطرت کا مطالعہ کیا۔ جب وہ تقریباً پندرہ برس کا ہوا تو باپ اسے فلورنس میں ویروکیو کے سٹوڈیو میں لے گیا اور بہ اصرار شاگرد بنوایا۔ 1472ء میں اسے سینٹ Luke کی کمپنی میں رکنیت ملی۔ اس بنائی ہوئی ''آخری ضیافت'' اور ''مونا لیزا'' دنیا کی مشہور ترین تصاویر ہیں۔ لیونارڈو ایک آرٹسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ مفکر اور انجینئر بھی تھا۔ اس نے میلان کے ڈیوک کے لیے ناٹکی تماشوں کا جو منصوبہ بنایا تھا ان میں ذہین و فطین خودکار مشینیں بھی شامل تھیں۔ اس نے گودیاں صاف کرنے اور گہرائیوں سے پانی اوپر لانے کے طریقہ کار وضع کیے۔ اس نے پیچوں کی چوڑیاں بنانے کی مشین تیار کی۔ اس نے ایک آبی پہیہ (water wheel) بنانے کے لیے بالکل درست خطوط پر کام کیا؛ گاڑیاں روکنے کے لیے زبردست بریکیں اختراع کیں۔ اسی نے اولین مشین گن ڈیزائن کی، اور دور تک گولے پھینکنے والی توپیں بھی؛ ایک ملٹی پل بیلٹ ڈرائیو؛ تھری سپیڈ ٹرانسمشن گیئرز؛ ایک ایڈجسٹ ایبل مانکی رینچ؛ دھات کو گولائی میں موڑنے والی ایک مشین؛ پرنٹنگ پریس کے لیے ایک نقل پذیر (موو ایبل) بیڈ؛ سیڑھی اوپر اٹھانے کے لیے سیلف لاکنگ worm گیئر۔ اس نے زیرِ آب بحرپیمائی کا منصوبہ سوچا تھا، لیکن اس کی وضاحت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے ایک دُخانی انجن کے لیے سکندریہ کے ہیرو والا تصور دوبارہ پیش کیا اور دکھایا کہ بندوق میں بھاپ کا دباؤ ایک آہنی ٹکڑے کو کیسے 12 گز دور تک پھینک سکتا تھا۔

خسرو، امیر (Amir Khosrow) ...... (1253?-1325) ہندوستان کا فارسی مصنف جو 1277ء سے لے کر اپنی موت تک دربار دہلی سے منسلک رہا۔ وہ اس دور کے مقبول ترین مصنفین میں شامل ہے جنھوں نے فارسی ادب تخلیق کیا۔ وہ پٹیالہ میں ابوالحسن خسرو کے ہاں، ترک النسل گھرانے میں پیدا ہوا جو تیرہویں صدی کے اوائل میں ہندوستان آیا تھا۔ خسرو نے فارسی کلاسکس کے علاوہ سائنس اور فلسفہ کا بھی مطالعہ کیا اور اس کی شاعرانہ

Marfat.com

صلاحیت اوائل جوانی میں ہی آشکار ہونا شروع ہو گئی۔ امیر خسرو نے ابتدائی تعلیم دہلی کے مدارس میں حاصل کی۔ اپنے پہلے دیوان کے دیباچے میں امیر خسرو نے لکھا، ''میرے استاد خواجہ اسدالدین محمد مجھے خطاطی سکھانے کی کوشش کرتے تھے، مگر میں خط و زلف کی تعریف میں شعر نظم کرتا رہتا تھا۔'' انہوں نے اس زمانے کی روایت کے برعکس فن عروض بھی نہ سیکھا اور نہ ہی کبھی کسی استاد کی شاگردی اختیار کی۔ عمادالملک کی سرپرستی کے زمانے میں امیر خسرو کی ملاقات خواجہ نظام الدین اولیا سے ہوئی اور ان کے معتقد بن گئے۔ 1273ء میں عمادالملک کا انتقال ہونے تک امیر خسرو کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی اور اس کا شمار چوٹی کے شعرا میں ہوتا تھا۔ وہ یکے بعد دیگرے چار بادشاہوں (جلال الدین خلجی، علاؤالدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ اور غیاث الدین تغلق) کا درباری شاعر رہا اور مسلسل 36 سال تک یہ عہدہ برقرار رکھا۔ امیر خسرو کی ہم تک پہنچنے والی زیادہ تر تصانیف مختلف درباری سرپرستوں کی خدمت میں لکھی گئیں۔ کچھ تذکروں میں ان کی تصانیف کی تعداد 99 بتائی گئی ہے، لیکن ابھی تک صرف اڑھائی درجن کتب کا سراغ ملا ہے۔ امیر خسرو نے قصیدے، مثنویاں، مرثیے، قطعات، رباعیاں، فارسی و ہندی غزلیں، حمدیں، دو سخنے، مکرنیاں اور پہیلیاں بھی لکھیں۔

Marfat.com

باب 7

صفات درجہ وار ہوتی ہیں، افعال مرحلہ وار ہوتے ہیں

Attributes are Graded

فریجوف کیپرا (Fritjof Capra)...... (‎-1939‎) آسٹریائی نژاد امریکی طبیعات دان جو برکلی، کیلی فورنیا میں ''سنٹر فار Ecoliteracy'' کا بانی ڈائریکٹر ہے اور شوماخر کالج میں پڑھاتا ہے۔ اس نے متعدد کتب تصنیف کیں جن میں درج ذیل خصوصی اہمیت رکھتی ہیں: ''The Tao of Physics'' (1975ء)، ''The Turning Point'' 1982ء)، ''Uncommon Wisdom'' (1988ء)، ''The Web of Life'' 1996ء) اور ''The Hidden Connections'' (2002ء)۔

رگ وید (Rig Veda)...... دیکھیں ''وید'' (نوٹس باب 5)

ینگ، کارل گستاو (Jung, Carl Gustav) ...... (1875-1961) سوئس ماہر نفسیات جس نے نفسیات کے تجزیاتی مکتبۂ فکر کی بنیاد رکھی۔ ینگ نے سگمنڈ فرائیڈ کے نظریۂ تحلیل نفسی کو وسعت دیتے ہوئے ذہنی اور جذباتی مسائل کو شخصی و روحانی تکمیل پانے کی ایک کوشش قرار دیا۔ اس نے فرائیڈ سے ہی اپنے زیادہ تر بنیادی تصورات مستعار لیے۔ ینگ کا نکتۂ نظر بہ حیثیت مجموعی بہت متاثر کن ثابت ہوا اور یہ کافی حد تک ''نفسیاتی اقسام'' میں مجسم ہے۔ اس نے اصطلاح ''کمپلیکس'' (مثلاً ایڈی پس کمپلیکس) وضع کی اور الفاظ پر مشتمل ٹیسٹ کے ذریعہ مریض کی داخلی پریشانیوں کا کھوج لگانے کا طریقہ اپنایا۔ ینگ کینٹن Thurgau کے علاقہ Keswil میں ایک پروٹسٹنٹ پاستور کے ہاں پیدا ہوا۔ 1905ء میں وہ زیورخ یونیورسٹی میں نفسیاتی معالجے کے موضوع پر لیکچرز دے رہا تھا۔ اس سے قبل وہ دماغی امراض کے ہسپتال میں عملی تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ 1907ء اور 1913ء کے درمیانی برسوں میں اس نے فرائیڈ کی معاونت کی جو اس کا بڑا مداح تھا۔ لیکن 1913ء میں وہ فرائیڈ سے الگ ہو گیا۔ اس کی پہلی قابل ذکر کتاب (1906ء) شیزوفرینیا کے بارے میں تھی۔ ینگ نے اجتماعی لاشعور کا نظریہ پیش کیا: ذہن کی

Marfat.com

ایک زیادہ گہری تہ جو محض شخصی/ ذاتی تہ کے نیچے ہوتی ہے۔ اس کی بہترین اور اہم ترین کتاب "Psychological Types" (نفسیاتی اقسام) ہے جو 1921ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ینگ نے "extroverts" اور "introverts" کے درمیان امتیاز پیش کیا یعنی بروں بیں اور دروں بیں۔ ینگ سے متاثر ہونے والی شخصیات مختلف قسم کی ہیں: ناول و ڈرامہ نگار پی بی پریسٹلے، نقاد اور شاعر ہربرٹ ریڈ، ناول نگار پی ایچ نیو بائی اور طبیعیات دان وولف گینگ پاؤلی۔

روسو، ژاں ژاکس (Rousseau, Jean Jacques) ...... (1712-1778) فرانسیسی فلسفی، مصنف اور سیاسی نظریہ ساز جو عہد روشن خیالی کے نہایت فصیح اللسان اہل قلم میں سے ایک ہے۔ وہ جدید فلسفیوں کے درمیان سب سے کم اکیڈمک اور متعدد حوالوں سے مؤثر ترین تھا۔ روسو جنیوا میں پیدا ہوا اور خالہ کے پاس پرورش پائی کیونکہ ماں زچگی کے دوران ہی مر گئی تھی۔ 1742ء میں وہ پیرس گیا۔ وہاں فرانسیسی فلسفی ڈینس دیدرو کے ساتھ اس کی گہری دوستی ہوگئی جس نے اسے فرانسیسی انسائیکلو پیڈیا کے لیے موسیقی پر مضامین لکھنے کو کہا۔ روسو نے میوزک کے ساتھ ساتھ اپنا ایک اوپیرا "مکار آدمی" (1752ء) بھی لکھا۔ 37 برس کی عمر میں وہ "بصیرت" حاصل کر چکا تھا۔ اپنی کتاب "اعترافات" میں وہ بتاتا ہے کہ "ایک خوفناک جھماکے" کے ساتھ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ جدید ترقی نے انسان کو بہتر بنانے کے بجائے بگاڑ دیا ہے۔ اس نے اسی بصیرت کی پیروی میں اپنا پہلا اہم مضمون "A Discourse on Science and Arts" (1750ء) لکھا۔ یہ تحریر اس کی آئندہ تمام تحریروں کی پیش بندی کرتی ہے۔ اپنے دوسرے مضمون "Discourse on the Origin and Foundation of Inequality Among Mankind" (1755ء) میں وہ دو قسم کی نابرابریوں کے درمیان تمیز کرتا ہے -- فطری اور مصنوعی۔ اس نے اپنی مشہور کتاب "معاہدۂ عمرانی" (دی سوشل کنٹریکٹ، 1762ء) میں کہا کہ انسان مستقبل میں اپنی آزادی کو بحال کر سکتے ہیں۔

فرانسس آف اسیسی (Francis of Assisi, St)...... (1182-1226) اطالوی باطن پرست اور مبلغ جس نے فرانسسکی سلسلے کی بنیاد رکھی۔ وہ اسیسی، اٹلی میں پیدا ہوا اور اصل نام جووانی فرانچسکو برنارڈونے تھا۔ اس نے نوجوانی میں دنیاوی زندگی کے مزے اٹھائے۔ اسیسی اور پیروجیا کے درمیان ایک لڑائی کے بعد وہ ایک سال تک پیروجیا میں قید رہا۔ قید میں بیماری کے دوران اس نے اپنی زندگی کی ڈگر تبدیل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ 1205ء میں واپس اسیسی پہنچ کر اس نے کوڑھیوں میں خیرات کی اور بدحال گرجا گھروں کی بحالی کے کام میں لگ گیا۔ نتیجتاً باپ نے اسے عاق کر دیا۔ فرانسس نے اپنا امیرانہ لباس ترک کر کے بشپ والا چوغہ پہن لیا اور تین سال تک کوڑھیوں اور بیماروں کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ 1208ء میں عبادت کے دوران اسے ایک غیبی آواز سنائی دی جس

Marfat.com

میں اسے واپس دنیا میں جانے اور نیکی کی زندگی گزارنے کو کہا گیا تھا۔ وہ اسی سال واپس اسیسی آیا اور تبلیغ کرنے لگا۔ اس نے اپنے گرد بارہ شاگرد جمع کیے جو برادری کی بنیاد بنے۔ 1212ء میں اونچے خاندان کی ایک راہبہ کلیئر بھی فرانسسکی برادری میں شامل ہوگئی اور غریب خواتین (Poor Clares) کا سلسلہ قائم ہوئی۔ 1219ء میں فرانسس مصر گیا اور تبلیغ میں کچھ کامیابی حاصل کی، لیکن سلطان کو عیسائی نہ بنا سکا۔ تب فرانسس ارض مقدس گیا اور دو سال وہیں گزارے۔ اس نے زندگی کے آخری سال اسیسی میں تقریباً اندھے پن اور جسمانی اذیت میں گزارے۔ 1228ء میں اسے کینا نائز کیا گیا۔ 1980ء میں پوپ جان پال دوم نے اسے ماہرین ماحولیات کا سرپرست ولی قرار دیا۔

عبدالقادر جیلانی (Abd al-Qadir al-Jilani)......(1078-1166) قادریہ مسلم صوفی سلسلے کے بانی۔ فارس میں پیدا ہوئے، بغداد میں اسلامی شریعت کی تعلیم حاصل کی اور بعدازاں تصوف سے متعارف ہوئے۔ وہ پہلی مرتبہ 1127ء میں بطور مبلغ ظاہر ہوئے۔ ان کی بڑی وجۂ شہرت بطور مبلغ و استاد تھی۔ جلد ہی ساری اسلامی دنیا سے مریدان کی جانب آنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے متعدد یہودیوں اور عیسائیوں کو مسلمان کیا۔ بطور مفکر ان کی کامیابی تصوف اور اسلامی شریعت کے متین تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ انہوں نے تصوف کو نفس و دنیا داری کے خلاف ایک مقدس جنگ یا جہاد اور خدا کی مکمل اطاعت کے طور پر تصور کیا۔ ان کی وفات کے بعد بہت سے قصے کہانیاں بن گئیں اور انہیں ایک الوہی وسیلہ مانا جانے لگا۔ ان کی وفات بغداد میں ہی ہوئی۔

شہاب، قدرت اللہ......(1920-1986) ادیب، اعلیٰ سول افسر۔ گلگت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سری نگر اور جموں میں حاصل کی۔ خالصہ ہائی سکول انبالہ سے میٹرک کیا۔ بی ایس سی پرنس آف ویلز کالج جموں سے کی۔ 1941ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (انگریزی) کی ڈگری لی۔ اسی سال انڈین سول سروس کے لیے امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ ابتدا میں بہار اور اڑیسہ میں خدمات انجام دیں۔ قیام پاکستان کے بعد پہلے حکومت آزاد کشمیر کا سیکرٹری جنرل اور پھر وزارت امور کشمیر کا ڈپٹی سیکرٹری رہے۔ اس کے علاوہ وزارت اطلاعات ونشریات میں ڈپٹی سیکرٹری، ضلع جھنگ کا ڈپٹی کمشنر اور پنجاب کا ڈائریکٹر صنعت وحرفت رہے۔ 1954ء میں گورنر جنرل کا سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس عہدے پر انہوں نے ایوب خان کے دور تک غلام محمد، سکندر مرزا اور خود ایوب خان کے ادوار کو قریب سے دیکھا اور مشاہدات مشہور آپ بیتی ''شہاب نامہ'' میں تحریر کیے۔ 1967ء میں سیکرٹری وزات تعلیم بنے۔ یحییٰ خان کے برسراقتدار آنے پر سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور یونیسکو سے وابستہ ہو گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے برسراقتدار آنے پر دوبارہ وزارت تعلیم کا سیکرٹری اور بعدازاں ثقافتی ڈویژن کا سیکرٹری رہے۔ قابل ذکر تصانیف یہ ہیں: یا خدا، نفسانے، ماں جی، سرخ فیتہ، شہاب نامہ۔

Marfat.com

یہوواہ (Jehovah) ...... عبرانی لوگوں کے خدا کا نام جسے عبرانی صحائف سے غلط طور پر ماخوذ کیا گیا۔ لفظ حروف صوت JHVH یا JHWH پر مشتمل ہے، اور الگ لفظ Adonai کے vowels استعمال ہوئے۔ یہ محض قیاس ہی ہے کہ اصل vowels کیا تھے۔ خروج (20:7 اور احبار 24:11) کی تفسیر کی بنیاد پر نام کو پاک سمجھا جانے لگا اور اسے بولنے سے گریز کیا جاتا؛ منشی تلاوت کرتے وقت اس کی جگہ لفظ خداوند (Lord) استعمال کرنے لگے اور یوں انہوں نے اسے JHVH کے طور پر لکھا۔ عبرانی کے مترجمین نے منشیوں کے مقصد کو سمجھے بغیر لفظ کو جوں کا توں ہی پڑھا اور یہواہ کا لفظ مستعمل ہوا اور بدل کر Jehovah بنا۔

فریتجوف شوان (Frithjof Schuon) ...... (1907-1998) سوئٹزرلینڈ کا باشندہ جس نے بیسل میں جرمن والدین کے گھر جنم لیا۔ وہ ایک فلسفی، مابعد الطبیعات کے ماہر اور مذہب و روحانیت کے متعلق متعدد کتب کے مصنف کے طور پر شہرت رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ تدریسی دنیا کے ساتھ باقاعدہ طور پر منسلک نہیں رہا، لیکن اس کی تحریریں تحقیقی اور فلسفیانہ جرائد میں شائع ہوئیں اور تقابلی مذہب و روحانیت کے محققین نے اسے اہمیت دی۔ جدید تدریسی دنیا کی اضافیت پسندی پر اس کی تنقید قابل ذکر ہے۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اس نے اپنی مادری زبان جرمن میں شاعری کے متعدد مجموعے شائع کیے۔ اس کے مضامین بیس مجموعوں کی شکل میں شائع اور ترجمہ ہو چکے ہیں۔

لائل، سر چارلس (Lyell, Sir Charles) ...... (1797-1875) سکاٹش ماہر ارضیات جس کی تحریروں نے جدید ارضیات کی ترقی پر گہرا اثر ڈالا۔ اس نے قانون کا مطالعہ کیا اور بار کا رکن بنا، لیکن جلد ہی سائنس اور بالخصوص ارضیات کے مطالعہ میں لگ گیا۔ اس کی پیش کردہ تھیوری کے مطابق کرۂ ارض کو زمانۂ حال میں تبدیل کرانے والے فطری عوامل نے ماضی میں بھی اسی شرح سے عمل کیا۔ اس نے اس تھیوری کے لیے ارضیاتی مشاہدات پیش کیے۔ لائل کو کرۂ ارض کی سطح کی تہوں کے مطالعہ کی شاخ کا بانی بھی سمجھا جاتا ہے۔ ارضیاتی ادوار کو اس کے دیے ہوئے نام -- ایوسین، مائیوسین اور پلائیوسین -- آج بھی استعمال ہوتے ہیں۔

مالتھس، تھامس رابرٹ (Malthus, Thomas Robert) ...... (1766-1834) برطانوی ماہر معیشت۔ وہ لندن کے جنوب میں ڈورکنگ کے مقام پر پیدا ہوا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں اپنے باپ کے منتخب کردہ متعدد اتالیقوں سے پڑھنے کے بعد وہ Jesus کالج کیمبرج میں داخل ہو گیا۔ اس کا باپ ایک کھاتا پیتا جنٹل مین اور ''روشن خیالی'' کا مفکر Marquis de Condorcet (1743-94ء) تھا۔ اس نے ایک کتاب ''انسانی ذہن کے ارتقا کا تاریخی پس منظر'' لکھی جو اس کی موت کے ایک سال بعد انگریزی میں ترجمہ ہوئی۔ کونڈورسیٹ نے

Marfat.com

فرانس کی جیل میں قید کے دوران خودکشی کر لی تھی اور تھامس مالتھس نے ''نظریۂ آبادی'' میں اسے خاص طور پر ہدف بنایا۔ اس نے گریجوایشن کی، فیلوشپ کے لیے منتخب ہوا، 1798ء میں پادری بنا اور 1804ء میں شادی کی۔ تب تک اس نے اپنے بنیادی نظریات تشکیل دے لیے تھے، بلکہ ان پر تھوڑی بہت نظر ثانی بھی کر چکا تھا۔ 1805ء میں مالتھس ہیلی بری (Hailey Bury) کے نئے تربیتی کالج (جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ملازمین کو تیار کیا جاتا تھا) میں سیاسی معیشت کا پروفیسر بنا۔ وہ اس قسم کے عہدے پر تعینات ہونے والا پہلا انگریز تھا۔ وہ ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں اپنی اچانک موت تک وہیں رہا۔ ''اصول آبادی پر مضمون'' کا بنیادی جوہر یہ ہے: آبادی geometric انداز میں بڑھتی ہے اور ذرائع روزگار arithmetical صورت میں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر آبادی پر کوئی روک ٹوک نہ ہو تو یہ 25 برس میں دوگنی ہو جاتی ہے۔ صرف جنگ، قحط اور وبائیں ہی اس تباہی کا تدارک کرتی ہیں۔ (جیومیٹرک انداز کا مطلب 1، 2، 4، 8، 16، 32...... ہے اور ریاضیاتی انداز 1، 2، 3، 4، 6، 8، 10...... ہے) چنانچہ ایسے حالات یقیناً پیش آئیں گے جب مفید جنگوں، خشک سالیوں اور وباؤں کی عدم موجودگی میں فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑے گا اور یوں کھاتے پیتے طبقے کے خلاف مختلف صورتوں میں تشدد ہو گا۔ ضرورت ہو گی۔ خراب سلوک اور فلاحی کاموں میں کمی کے لیے مالتھسی نظریے کا استعمال اب متروک ہو رہا ہے۔

آواگون (transmigration)...... موت آنے پر روح کا کسی اور جسم اور نئے قالب میں چلے جانا۔ تناسخ اور تجسیم نو کافی حد تک ہم معنی ہیں۔ قدیم یونانیوں کے ہاں تناسخ کا عقیدہ فلسفی فیثاغورث کے نظریات کے ساتھ نہایت قریبی طور پر منسلک تھا۔ افلاطون نے کہا کہ روح ازل سے موجود اور مکمل طور پر روحانی ہے، جبکہ جسمانی جذبات کے ساتھ تعلق اسے آلودہ کرتا ہے۔ مگر روح سابق جنموں کا قلیل سا علم قائم رکھتی ہے۔ تناسخ کے عمل سے گزر کر ہی روح کو نجات ملتی ہے۔ اگر روح کا کردار اچھا رہا ہو تو اسے وجود محض میں واپس جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ تاہم، اگر اس کا کردار خراب رہا ہو تو یہ تارتارس یعنی ابدی لعنت کی جگہ پر پہنچتی ہے۔ تناسخ ارواح کا نظریہ راسخ العقیدہ یہودیت اور عیسائیت نے کبھی اختیار نہیں کیا۔ مشرقی مذہبی فکر و فلسفہ میں تناسخ ارواح پر یقین ہندوستانی مذہبی صحائف اپنشدوں میں ظاہر ہوا۔ تاہم، تب کے بعد سمسار تین بڑے مشرقی مذاہب ہندومت، بدھ مت اور جین مت کے مرکزی عقائد میں سے ایک رہا ہے۔ چنانچہ جدید عوامی ہندومت کے مطابق روح کے آئندہ قلب کا انحصار اس جنم میں اس کے اچھے یا برے کاموں (کرم) پر ہوتا ہے۔ مثلاً برے کرم کرنے والی روحیں کمتر حالتوں میں جنم لیتی ہیں، جیسے جانور، حشرات اور درخت)۔ انجام کار جب برے کاموں کا کفارہ ادا ہو جائے تو سمسار اور کرم سے نجات ملتی ہے۔

چکر (chakra)...... ہندو صحائف اور تانترک و یوگی روایات میں ملنے والا ایک تصور۔ اس لفظ کا ماخذ ایک

Marfat.com

سنسکرت لفظ "چکرم" ہے۔ روایتی ہندوستانی طب کے مطابق زندہ اجسام کے جسم لطیف کی سطح میں یہ چکر موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے توانائی نکلتی ہے اور سارے جسم پر حاوی ہو سکتی ہے۔ توانائی کے یہ چکر گرداب یا بھنور کی طرح ایک محور پر گھومتے ہیں۔ چکروں کی تصویر کشی پھول یا پہیے جیسی اشکال کی مدد سے کی جاتی ہے۔

تجسیمیت (anthropomorphism)...... عقیدۂ بشر پیکری۔ کسی غیر انسان کو انسانی ہیئت یا خصوصیات سے متصف کرنا۔ تاریخ مذہب میں تجسیمیت سے مراد خدا کو انسانی صورت میں، انسانی جسم اور جذبات (مثلاً رشک، غصہ یا محبت) کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ اسطوریات بالتخصیص طور پر تجسیمی دیوتاؤں سے تعلق رکھتی ہے، لیکن دیگر مذاہب کے خیال میں ایک عالم مطلق اور قادر مطلق دیوتا کو انسانی قرار دینا غیر مناسب ہے۔

بوہم، ڈیوڈ (Bohm, David) ...... (1917-1992) امریکی نژاد برطانوی کوانٹم طبیعات دان جس نے تھیوریٹیکل طبیعات، ذہن کے فلسفہ اور عصبی نفسیات میں گراں قدر حصہ ڈالا۔ اسے بیسویں صدی کے اہم ترین نظریہ دانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی اہم تصانیف درج ذیل ہیں: "Quantum Theory" (1951ء)، "Causality and Chance in Modern Physics" (1957ء)، "The Special Theory of Relativity" (1965ء)، "Wholeness and the Implicate Order" (1980ء)، "Science, Order, and Creativity" (1987ء) اور "Changing Consciousness" (1991ء)۔

ڈاکنز، رچرڈ (Dawkins, Richard) ...... (-1941) برطانوی ارتقائی سائنس دان، جانوروں کے طرز عمل کا محقق اور مصنف۔ ڈاکنز نے الحاد پرستی اختیار کی، برطانوی انسان دوست انجمن کا نائب صدر بنا۔ وہ نظریۂ تخلیق اور ذہین منصوبہ سازی کے تصور پر اپنی تنقید کی وجہ سے مشہور ہے۔ 1986ء میں چھپنے والی کتاب "The Blind Watchmaker" میں اس نے اپنے دلائل واضح طور پر پیش کیے۔ اس کے خیال میں ارتقائی عوامل اندھا دھند عمل کرتے ہیں۔ وہ 1995ء سے 2008ء تک آکسفورڈ میں بطور پروفیسر برائے Public Understanding of Science کام کرتا رہا۔ ڈاکنز نے اپنی کتاب "The God Delusion" (2006ء) میں دلیل دی کہ مافوق الفطرت خالق ہرگز موجود نہیں اور مذہبی عقیدہ ایک سراب ہے۔ جنوری 2010ء تک اس کی بیس لاکھ کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔

Marfat.com

باب 8
اسمائے حسنیٰ کی فلسفیانہ اور سائنسی معنویت
Philosophic & Scientific import of Divine Name

رسل، برٹرینڈ آرتھر ولیم (Russell, Bertrand Arthur William) ...... (1872-1970)

نوبیل انعام یافتہ انگلش استدلالیت پسند اور فلسفی جو ریاضیاتی منطق میں اپنے کام اور سماجی و سیاسی مہمات کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ منطقی تجزیے پر اس کے اصرار نے بیسویں صدی کے فلسفے پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ وسکاؤنٹ ایمبر لے کے دوسرے بیٹے رسل کے ہاں پیدا ہوا۔ لارڈ ایمبر لے جان رسل کا بیٹا تھا جو دو مرتبہ وزیر اعظم بنا اور فرسٹ ارل رسل قرار پایا۔ برٹرینڈ رسل کی ماں کیتھرائن 1874ء میں مرگئی اور اٹھارہ ماہ بعد باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ ایمبر لے گھرانہ بہت جدید خیالات کا مالک تھا۔ رسل کی دادی سیاسی طور پر آزاد ذہن کی مالک اور نہایت سخت گیر تھی۔ اس نے رسل کو گھر پر ہی تعلیم دلوائی جس کے باعث وہ دوسرے بچوں سے کٹ گیا اور داخلی مابعدالطبیعیاتی افکار میں غلطاں رہنے لگا۔ گیارہ برس کی عمر میں وہ مذہب کے بارے میں شکوک کا شکار ہو گیا۔ اس نے یونیورسٹی آف کیمبرج کے ٹرینٹی کالج میں تعلیم حاصل کی؛ 1894ء میں گریجوایشن کے بعد فرانس، جرمنی اور امریکہ گیا۔ اوائل عمر سے ہی اس میں سماجی شعور کا زبردست جاگزیں ہو گیا۔ اس نے خود کو منطقی اور ریاضیاتی سوالات کے مطالعہ میں منہمک کر لیا اور دنیا بھر کے متعدد اداروں میں لیکچر دیے۔ اس نے اپنی پہلی اہم کتاب ''The Principles of Mathematics'' (1902ء) کے ذریعہ امتیاز حاصل کیا جس میں ریاضی کو مجرد فلسفیانہ خیالات کی اقلیم سے باہر نکالنا اور قطعی سائنسی دائرۂ کار میں رکھنا چاہا۔ اس کے بعد رسل نے برطانوی فلسفی اور ریاضی دان الفرڈ نارتھ وائٹ ہیڈ کے ساتھ آٹھ برس تک محنت کر کے ''Principa Mathematica'' (1910-13ء) لکھی۔ اس اپنے اگلے بڑے کام ''دی پرابلمز آف فلاسفی'' (1912ء) میں رسل نے اپنے عہد کے غالب فلسفیانہ مکتب عینیت کے عقائد کو مسترد کرنے کے لیے سماجیات، نفسیات، طبعیات اور ریاضی سے خیالات مستعار لیے۔ اس کی

Marfat.com

تصنیف ''Human Knowledge, Its Scope and Limits'' (1948ء) کو زیادہ پذیرائی نہ مل سکی۔ 1954ء میں ایک ریڈیو پروگرام میں اس نے ہائیڈروجن بم ٹیسٹ کرنے پر زبردست تنقید کی۔ نیوکلیئر اسلحہ ترک کرنے کی مہم چلانے کی وجہ سے اسے سات روز جیل بھگتنا پڑی۔ 1960ء کی بقیہ دہائی کے دوران اس نے ویتنام میں امریکہ کی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ 60ء کے عشرے کے آخری تین برس میں اس کی خوب صورت خود نوشت سوانح عمری کی تین جلدیں شائع ہوئیں۔ ''Our Knowledge of the External World'' اور ''Inquiry into Meaning and Truth'' میں اس نے بلاواسطہ تجربات کی بنیاد پر حقیقی علم کی وضاحت پیش کی۔

حسین بن منصور حلاج (Hussein bin Mansur Al-Hallaj) ...... (858-922) ابوالمغیث الحسین ابن منصور الحلاج۔ متنازعہ مصنف اور اسلامی تصوف کا استاد۔ وہ جنوبی ایران کی بستی طور میں پیدا ہوا۔ روایت کے مطابق اس کا دادا زرتشتی مذہب کا پیروکار اور صحابی ابوایوب کی اولاد میں سے تھا۔ اس نے اپنا بچپن واسط شہر میں گزارا جو ٹیکسٹائلز، تجارت اور عرب ثقافت کا اہم عراقی مرکز تھا۔ اس کے باپ نے اسلام قبول کیا اور روئی دھننے کا پیشہ اختیار کر لیا۔ الحلاج کم عمری میں ہی راہبانہ زندگی کی جانب رجحان دکھانے لگا۔ اسے قرآن کو محض زبانی یاد کر لینے کے بجائے اس کے باطنی اور داخلی مفہوم کو سمجھنے کی خواہش ہوئی۔ اس نے گوشہ گیری اختیار کر کے صوفی اساتذہ سے ہدایت لینا شروع کر دی۔ اس کے اساتذہ سہل التستری، عمر ابن عثمان المکی اور ابوالقاسم الجنید کو تصوف میں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ پہلے اس نے تستری کی شاگردی اختیار کی جو خوزستان میں تستر شہر کے قریب مرتاضانہ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ بعدازاں حلاج بصرہ کے المکی کا شاگرد بنا۔ اپنی زندگی کے دوسرے دور (895-910ء) میں الحلاج نے طول وعرض میں سفر کیے، پڑھایا اور لکھایا۔ اس نے مکہ کا حج کیا اور ایک سال تک وہاں زہد وریاضت کرتا رہا۔ فارس، خوزستان اور خراسان میں واپس آ کر اس نے قربت الٰہی کی ایک راہ کا پرچار کیا اور اشعار لکھے۔ اسفار کے دوران اس کے متعدد شاگرد بن گئے جن میں سے متعدد دوسری مرتبہ حج کے وقت اس کے ہمراہ تھے۔ بعدازاں وہ بغداد واپس آیا اور پھر سمندر کے راستے ہندوستان اور ترکستان کی جانب روانہ ہوا۔ تیسرا حج کرنے کے بعد وہ 908ء کے قریب دہ واپس بغداد پہنچا۔ حلاج کی تحریریں سماجی، معاشی، سیاسی اور مذہبی تناؤ کی عکاس ہیں۔ یہی چیزیں آگے چل کر اس کی گرفتاری کا باعث بنیں۔ الحلاج کے شوق سیاحت اور مشتاق افراد کو اپنے تجربات بتانے کو صوفی اساتذہ نے خلاف طریقت خیال کیا۔ الحلاج کو مجذوب صوفی کہا جاتا ہے۔ مجذوب صوفیا حالت وجد وکیف میں ڈوب کر ذاتی شناخت بھول جاتے ہیں اور فنافی اللہ کا تجربہ کرتے ہیں۔ گرفتاری کو ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ الحلاج نے ''انا الحق'' کا نعرہ بلند کیا۔ اس حرکت نے اسے الوہی ہونے کے کافرانہ الزام کا مورد بنا دیا۔ بیشتر مسلمان انا الحق کو سنگین درجے کی

Marfat.com

گستاخی خیال کرتے تھے۔ اس کے خلاف مقدمے کی طویل کارروائی غیر نتیجہ خیز رہی۔ سوس میں اس کی گرفتاری اور بغداد میں قید کے طویل دور (922-911ء) کے بعد الحلاج کو سولی پر چڑھایا اور خوفناک تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

پارمینائیڈز (Parmenides) ...... (515-450bc) یونانی فلسفی اور شاعر، 515 اور 510 قبل مسیح کے درمیان زیریں اٹلی میں ایلیا کے مقام پر ایک اعلیٰ گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ ایلیاٹک (Eleatic) فلسفہ کا سرکردہ نمائندہ ہے۔ اس کی شاندار قانون سازی کی وجہ سے ساتھی شہری اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس کی مثالی زندگی کو بھی بہت سراہا جاتا تھا۔ یونانیوں کے ہاں ''پارمینائیڈین زندگی'' ایک ضرب المثل بن گئی۔ عام طور پر اسے ژینوفینز کا شاگرد بتایا جاتا ہے۔ پارمینائیڈز کی تحریریں ہیراکلیتس سے بعد کی ہیں اور ان میں ہیراکلیتس کا واضح ذکر ملتا ہے۔ وہ مادیت اور عینیت دونوں قسم کے نظام ہائے فکر کو متاثر کرنے کا باعث بنا۔

ایزی موف، آئزک (Asimov, Isaac) ...... (1920-92) روسی نژاد امریکی مصنف جو اپنی سائنس فکشن اور سائنس پر مختلف حوالوں سے تحریروں کے باعث مشہور ہوا۔ ایزی موف پیٹرووچی میں پیدا ہوا۔ جب وہ تین برس کا تھا تو اس کا خاندان ہجرت کر کے امریکہ چلا گیا اور بروکلین، نیویارک میں آباد ہوا۔ سائنس فکشن جرائد کے ساتھ ایزی موف کے تعارف نے اُسے لکھنے اور سائنس کے دوہرے کیریئرز کی جانب مائل کیا۔ وہ 15 برس کا تھا جب کولمبیا یونیورسٹی میں داخل ہوا اور 18 برس کی عمر میں ''Amazing Stories'' کو اپنی پہلی کہانی فروخت کی۔ دوسری عالمی جنگ میں خدمات انجام دینے کے بعد ایزی موف نے 1948ء میں کولمبیا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی؛ 1949ء سے 1958ء کے دوران اس نے بوسٹن یونیورسٹی سکول آف میڈیسن میں حیاتیاتی کیمیا (بائیوکیمسٹری) پڑھائی۔ اس کا پہلا سائنس فکشن ناول ''Pebble in the Sky'' 1950ء میں منظر عام پر آیا اور پہلی سائنسی کتاب 1953ء میں شائع ہوئی۔ 1958ء میں وہ کل وقتی مصنف بن گیا۔ اس نے نوجوان اور بالغ قارئین کے لیے 400 سے زائد کتب تصنیف کیں جن میں سائنس اور سائنس فکشن کے علاوہ پراسرار، مزاحیہ، تاریخی اور ادبی کہانیاں بھی شامل تھیں۔

لوبسانگ رامپا (Lobsang Rampa) ...... (1910-1981) اصل نام سیرل ہنری ہوسکن۔ ایک برطانوی مصنف جس نے تبت میں لاما ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کی کتاب ''The Third Eye'' نومبر 1956ء میں یوکے سے شائع ہوئی جس میں اس نے بتایا کہ وہ سات سال کی عمر میں تبت کی ایک خانقاہ میں گیا اور وہاں کئی قسم کے مذہبی تجربات سے گزرا۔ اس نے کہا کہ ایک آپریشن کے ذریعے اس کی پیشانی میں چھوٹا سا سوراخ کیا گیا جس کی بدولت اس کی تیسری آنکھ بیدار ہوگئی۔ اس کی کچھ تصانیف درج ذیل ہیں: ''Doctor from Lhasa''

Marfat.com

“Living with the Lama”،(1960ء)“The Rampa Story”،(1959ء)
“I”اور(1975ء)“Twilight”،(1971ء)“Feeding the Flame”،(1964ء)
Believe“(1976ء)۔

کونرڈ رُڈنِکی (Konrad Rudnicki) ...... (1926-   ) ایک پولش ماہر فلکیات، کراکو کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر اور کلیسا کا پادری۔ وہ یورپیئن اکیڈمی آف سائنس کا رکن بھی ہے۔ اس نے دوسری عالمی جنگ میں حصہ لیا۔ بعدازاں ایک یہودی خاندان کو اپنے پاس پناہ دی اور ان کی جان بچائی۔ جنوری 1996ء میں اسے اور اس کی ماں کو اسرائیل نے خصوصی اعزاز دیا۔ رڈنکی نے کئی سال کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اور رائس یونیورسٹی میں گزارے۔ کئی انفجاری ستارے (سپرنووا) اس کی دریافت ہیں۔ اس نے ایک سپرنووا کے درمیان میں دو کہکشائیں بھی دریافت کیں جو فلکیات کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی دریافت تھی۔ اس نے کہکشاؤں کے جھرمٹ کی ساخت کے متعلق نیا مفروضہ بھی پیش کیا۔

منکووسکی، ہرمان (Minkowski, Hermann) ...... (1864-1909) مشہور ریاضی دان جس نے اعداد کی جیومیٹری بنائی اور اسے ترقی دی۔ منکووسکی نے نمبر تھیوری، ریاضیاتی طبیعات اور نظریۂ اضافیت میں مشکل مسائل حل کرنے کے لیے جیومیٹریکل طریقے بھی استعمال کیے۔ وہ لیتھوینیا کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا اور بعدازاں عیسائیت اختیار کر لی تاکہ تعلیم جاری رکھ سکے۔ 1907ء میں اس نے محسوس کیا کہ دو سال قبل البرٹ آئن سٹائن کے پیش کردہ خصوصی نظریۂ اضافیت کو چار جہتی سپیس میں سمجھنا بہترین ہے، تبھی سے چار جہتی سپیس کو ”منکووسکی سپیس ٹائم“ کہا جانے لگا۔ اس کے مطابق چار جہتی سپیس ٹائم میں ٹائم اور سپیس الگ الگ وجود نہیں رکھتے۔

رکر، رڈولف (Rucker, Rudolf) ...... (1946-   ) امریکی ریاضی دان، کمپیوٹر سائنس دان، سائنس فکشن کا مصنف اور فلسفی۔ وہ سائبر پنک ادبی تحریک کے بانیوں میں بھی شامل ہے۔ اس نے فکشن کے ساتھ ساتھ نان فکشن بھی تخلیق کیا اور اپنے ناولوں کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے، مثلاً ”Software“ اور ”Wetware“۔

جبلونکا، ایوا (Jablonka, Eva) ...... (1952-   ) نظریہ ساز اور جنیات کی ماہر جو epigenetic وراثت میں اپنی دلچسپی کی وجہ سے جانی جاتی ہے۔ وہ پولینڈ میں پیدا ہوئی اور 57ء میں ہجرت کر کے اسرائیل چلی گئی۔ اس نے تل ابیب یونیورسٹی کے کوہن انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر کے طور پر پڑھایا۔ وہ تحقیقی میدان میں آزادی کی قائل ہے اور ان معاملات میں سیاسی وتدریسی مسائل کو الگ رکھنے پر زور دیتی ہے۔

لیمب، ماریون جے (Lamb, Marion J.) ...... لندن کی ایک یونیورسٹی کی سینئر لیکچرر جس نے ایوا جبلونکا

Marfat.com

کے ساتھ مل کر "Evolution in Four Dimension" (2005ء) لکھی۔اس کتاب میں زندگی کی تاریخ میں ہونے والی جنینیاتی اور کرداری تبدیلیوں پر بات کی گئی ہے۔اس نے حرارت، تابکاری اور آلودگی کی وجہ سے تحول (metabolism) پر پڑنے والے اثرات پر تحقیق کی۔وہ 1980ء کی دہائی کے بعد سے ایوا جبلونکا کے ساتھ مل کر تحقیق کر رہی ہے۔کچھ لوگوں کے خیال میں ان کی تحقیقات ارتقائی حیاتیات میں ایک جاری انقلاب میں نمائندہ کردار رکھتی ہیں۔

خان، عمران...... (-1952) کرکٹ کا سابقہ آل راؤنڈر کھلاڑی اور تحریک انصاف کا سربراہ۔لاہور میں پیدا ہوا۔معروف ماہر تعلیم سابق ٹیسٹ کرکٹر ڈاکٹر جہانگیر خان کا بھانجا اور سابق دو کپتانوں ماجد خان اور جاوید برکی کا کزن۔فرسٹ کلاس کرکٹ کا آغاز 1969-1970ء میں کیا۔کپتان کی حیثیت سے عمران خان کی کارکردگی تمام کپتانوں سے زیادہ نمایاں اور بہتر ہے۔پاکستان کو پہلی بار ورلڈ کپ دلوانے میں بطور کپتان بہترین اور یادگار کردار ادا کیا۔اس کے بعد مکمل طور پر کرکٹ سے سبک دوش ہوکر "شوکت خانم میموریل کینسر ہسپتال" کی تعمیر اور ترقی کے کام سے منہمک ہوگیا۔1996ء میں "تحریک انصاف" قائم کی۔

ہوئلے، فریڈ (Hoyle, Fred)...... (1915-2001) انگلش فلکیات دان اور ریاضی دان جو ستاروں کے درمیان nucleosynthesis کی تھیوری میں اپنی تحقیق کی وجہ سے مشہور ہے۔دیگر تکوینیاتی اور سائنسی امور پر اس کا نکتۂ نظر کافی متنازعہ رہا۔مثلاً اس نے بگ بینگ تھیوری کو مسترد کیا۔اصل میں بگ بینگ کی اصطلاح اس نے اپنی تھیوری کے حریف کا مذاق اڑانے کے لیے وضع کی تھی۔ہوئلے نے بطور فلکیات دان کام کرنے کے علاوہ سائنس فکشن بھی لکھا۔اس نے متعدد کتب اپنے بیٹے جیوفری ہوئلے کے ساتھ مل کر بھی لکھیں۔اس نے اپنی زندگی کا زیادہ تر عرصہ کیمبرج کے انسٹی ٹیوٹ آف ایسٹرونومی میں کام کرتے ہوئے گزرا۔

پاؤلز، لوئس (Pauwels, Louis)...... (1920-1997) فرانسیسی صحافی اور مصنف۔1954ء میں وہ Bibliothèque Mondiale کا ڈائریکٹر تھا جب اس کی ملاقات ژاکس برجیئر سے ہوئی۔دونوں نے مل کر 1960ء میں "The Morning of the Magicians" اور 1970ء میں "The Eternal Man" تصنیف کیں۔Encyclopédie Planète میں ان دونوں کی متعدد مشترکہ تصانیف شائع ہوئیں۔وہ 1993ء تک ہفتہ وار "Figaro-Magazine" کا سربراہ رہا۔اس نے 1992ء میں گابریئل ویرالڈی اور ریمی شووین کے ساتھ مل کر جنیوا میں سائیکوفزیالوجی کی ایک انجمن بھی قائم کی۔

برجیئر، ژاکس (Bergier, Jacques)...... (1912-1978) روسی کیمیکل انجینئر، فرانسیسی مدافعتی

Marfat.com

تحریک کارکن، جاسوس، صحافی اور مصنف۔ لوئس پاؤلز کے ساتھ مل کر لکھی ہوئی اس کی کتاب ''The Morning of the Magicians'' کو خصوصی شہرت ملی۔ وہ اوڈیسا میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک دکان چلاتا تھا اور ماں سابقہ انقلابی تھی۔ برجیئر غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے دو سال کی عمر میں پہلی مرتبہ اخبار پڑھا اور چار سال کی عمر میں روسی، فرانسیسی اور عبرانی زبانیں بڑی آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں تک وہ روزانہ چار تا دس کتابیں پڑھنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ برجیئر نے کبھی سکول میں داخلہ نہ لیا، بلکہ نجی طور پر ہی ٹیوشن لیتا رہا۔ 1925ء میں وہ گھر والوں کے ہمراہ پیرس منتقل ہو گیا اور بقیہ زندگی وہیں گزاری۔

فورٹ، چارلس ہوئے (Fort, Charles Hoy)......(1874-1932) امریکی مصنف اور غیر معمولی مظاہر کا محقق۔ اب اس قسم کے مظاہر کے لیے Fortean اور Forteana کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ اس کی کتب اچھی فروخت ہوئیں اور آج بھی چھپتی ہیں۔ اس نے خود کو ایک حقیقی متشکک خیال کیا اور ہر قسم کی عقیدہ پرستی کے خلاف تھا۔ اس نے اپنی بالغ زندگی کا ایک خاصا بڑا حصہ نیویارک کی پبلک لائبریری میں اخبارات، مضامین اور سائنسی جرائد پر غور کرتے ہوئے گزارا۔ دراصل وہ ایسے انوکھے یا پراسرار واقعات کے متعلق رپورٹس تلاش کر رہا تھا جو مروج سائنسی تھیوریز سے مطابقت نہ رکھتے ہوں، مثلاً مینڈکوں کی بارش، اڑن طشتریاں، بھوت، انسانوں کے جسم کو خود بخود آگ لگ جانا، وغیرہ۔ اس نے اس قسم کی خبروں اور واقعات کو چار جلدوں میں شائع کیا: ''Book of the Damned'' (1919ء)، ''New Lands'' (1923ء)، ''Lo!'' (1931ء) اور ''Wild Talents'' (1932ء)۔

خیام، عمر (Khayyam, Umar)......(1048-1131) پورا نام غیاث الدین ابوالفتح عمر ابن ابراہیم النیشاپوری الخیامی۔ فارسی ریاضی دان، ماہر فلکیات اور شاعر جو اپنے ملک اور دور میں سائنسی کارناموں کی وجہ سے جانا جاتا تھا لیکن اہل مغرب اسے اس کی رباعیات کے حوالے سے جانتے ہیں۔ خیام کا لفظی مطلب ''خیمہ ساز'' بنتا ہے۔ غالباً اس کا باپ اس پیشے سے منسلک تھا۔ وہ نیشاپور، خراسان میں پیدا ہوا اور فلسفہ و سائنس میں بنیادی تعلیم وہیں پر حاصل کی۔ اور پھر سمرقند گیا جہاں الجبرا پر اپنا ''رسالہ فی البراہین علیٰ مسائل الجبر والمقابلہ'' مکمل کیا جو اس ریاضی میں اس کی وجۂ شہرت ہے۔ اس مقالے میں اس نے ابوفا کے پیش کردہ اصولوں کا عملی اطلاق دکھایا۔ وہ اس قدر مشہور ہو گیا کہ سلجوق سلطان ملک شاہ نے اسے اصفہان آنے اور فلکیاتی مشاہدات کرنے کی اجازت دی تاکہ کیلنڈر مکمل کیا جا سکے۔ یہ کام کرنے کی خاطر وہاں ایک رصدگاہ بنوائی گئی اور نیا جلالی کیلنڈر بنایا گیا جس میں ہر 33 برس بعد 8 دن کی ''چھلانگ'' رکھی گئی۔ یہ موجودہ گریگورین کیلنڈر کی نسبت زیادہ درست تھا۔ 1075ء میں ملک شاہ نے یہ کیلنڈر رائج کیا۔ اصفہان میں عمر خیام نے متوازی خطوط کے متعلق یوکلید کے نظریے پر تنقید بھی لکھی۔ 1092ء

Marfat.com

میں سر پرست کی وفات کے بعد سلطان کی بیوہ خیام کے خلاف ہوگئی۔عمر خیام حج کرنے مکہ گیا اور پھر واپس نیشا پور جا کر دربار سے بطور ماہر فلکیات منسلک ہو گیا۔اسے فلسفہ، قانون، تاریخ، ریاضی، طب اور فلکیات سبھی میں دسترس حاصل تھی۔یورپی دنیا انیسویں صدی کے وسط میں اس وقت عمر خیام سے واقف ہوئی جب ایڈورڈ فٹز جیرالڈ نے اس کی رباعیات کے انگلش تراجم کا مجموعہ شائع کیا (1859ء)۔ہر رباعی اپنی جگہ ایک پوری نظم ہے۔اس کی عظیم ترین تصنیف ''احیا العلوم الدین'' ہے۔''مشکوٰۃ الانوار'' میں اس نے بصیرت کے باطنی تجربے اور ''منقض الضلال'' میں مرتاضانہ زندگی اختیار کرنے پر بحث کی۔اس کی فلسفیانہ تحقیقات منطق پر مقالوں کے ساتھ شروع ہوئیں اور ''تحافۃ'' پر عروج کو پہنچیں۔دیگر تصانیف درج ذیل ہیں: مقاصد الفلسفہ؛ المستصفیٰ؛ الاقتصاد فی الاعتقاد اور نصیحۃ الملوک۔

فٹز جیرالڈ، ایڈورڈ (Fitzgerald, Edward)...... (1809-1883) انگلش شاعر اور مترجم، ووڈ برج، سفولک میں پیدا ہوا اور کیمبرج یونیورسٹی سے تعلیم پائی۔فٹز جیرالڈ فارسی شاعر عمر خیام کی رباعیات کے ترجمہ کی وجہ سے خصوصی شہرت رکھتا ہے۔ابتدا میں منظوم ترجمہ کو پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔تاہم، انگلش شاعر دانتے گابریئل روزیٹی نے اسے دریافت کیا، اور اس کے ذوق وشوق کی بدولت 1868ء میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔نظم کی مقبولیت میں کسی بھی اور سیکولر ایشیائی شاعری کے انگلش ترجمے سے بڑھ کر ہے۔فٹز جیرالڈ کلاسیکی یونانی ڈرامے کے انگلش ورژن کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔

بونو، ایڈورڈ ڈی (Bono, Edward de)...... (-1933) مالٹا سے تعلق رکھنے والا طبیعات دان، مصنف، موجد اور کنسلٹنٹ۔وہ اپنی کتاب ''Six Thinking Hats'' کی وجہ سے شہرت رکھتا اور اس نظریے کا حامی ہے کہ سکولوں میں سوچنے کی تربیت ایک خصوصی مضمون کے طور پر دانستہ دینی چاہیے۔بونو نے مالٹا کے سینٹ ایڈورڈز کالج سے تعلیم حاصل کی اور 15 سال کی عمر میں گریجوایشن کرلی۔پھر وہ آکسفورڈ کے کرائسٹ چرچ کالج سے نفسیات اور فزیالوجی میں ایم اے کرنے گیا۔اس نے کھیل کے میدان میں بھی عمدہ کارکردگی دکھائی۔اس کے بعد ٹرینیٹی کالج کیمبرج سے میڈیسن میں پی ایچ ڈی اور ڈی فل کیا۔آکسفورڈ، کیمبرج، لندن اور ہارورڈ کی یونیورسٹیوں میں اسے مختلف عہدوں پر پڑھانے کا موقعہ ملا۔2005ء میں اس کا نام نوبیل انعام برائے معاشیات کے لیے زیر غور آیا۔وہ 82 کتب کا مصنف ہے اور 41 زبانوں میں اس کی کتب ترجمہ ہو چکی ہیں۔

Marfat.com

FURTHER READING

باب1:

EXPLAINING THE SCIENCE OF ALLAH

نیلز بوہر:

www.nobelprize.org/nobel_prizes/physics/laureates/1922/bohr-bio.html

ثنویت: http://serendip.brynmawr.edu/Mind/Descartes.html

باب2:

Conventional Image of God is Shattered

ہیزنبرگ: www.aip.org/history/heisenberg/p08.htm

سٹیفن ہاکنگ: www.hawking.org.uk/

باب3:

Story of Parallel Invertible Truth

استدلالیت، تجربیت: www.theology.edu/logic/logic4.htm

عینیت، حقیقت پسندی:

kingswayfalcon.tripod.com/writings/idealismvsrealism.html

ورتھائمر، گیسٹالٹ تھیوری: www.instructionaldesign.org/theories/gestalt.html

ابن سینا، ابن رشد، الکندی، الفارابی، الغزالی: www.muslimphilosophy.com/

Marfat.com

وحدت الوجود اور ابن العربی:

www.scribd.com/mausyahida/d/24560984-Wahdatul-wujud-ibn-Arabi

باب4:

Methodology

اپی قورس:philosophy.lander.edu/ethics/epicurus.html

رواقیت:www.abu.nb.ca/courses/grphil/stoic.htm

جان ڈیوی، نتائجیت:dewey.pragmatism.org/

باب5:

Appellations of "Allah"

الکیمیا:www.levity.com/alchemy/

خدا پرستی:www.theism.info/

شاستر، چکر، اپنشد، وید، برہما، وشنو:indianphilosophy.50webs.com/

سٹرنگ تھیوری:superstringtheory.com/

مولانا رومی:www.rumi.org.uk/

علی بن عثمان الہجویری:www.amirgilani.com/

باب6:

THE FIRST PRINCIPLE

ین اور یانگ:www.thegreattao.com/html/introyingyangtheory.html

امجد اسلام امجد:amjadislamamjad.net/

برائن گرین:www.briangreene.org/

سعدی شیرازی:www.iranchamber.com/literature/saadi/saadi.php

بھگتی:www.britannica.com/EBchecked/topic/63933/bhakti

Marfat.com

کیرن آرم سٹرانگ:

www.enlightennext.org/magazine/bios/karen-armstrong.asp

لیونارڈو دا ونچی:www.leonardoda-vinci.org/

امیر خسرو:www.poetry-chaikhana.com/K/KhusrowDehla/

باب 7:

Attributes are Graded

قدرت اللہ شہاب:en.wikipedia.org/wiki/Qudrat_Ullah_Shahab

دھرم چکر:www.religionfacts.com/buddhism/symbols/wheel.htm

تجسیمیت:anthropomorphism.org/

رچرڈ ڈاکنز:richarddawkins.net/

باب 8:

Philosophic & Scientific import of Divine Name

برٹرینڈ رسل:www.mcmaster.ca/russdocs/russell.htm

حسین بن منصور حلاج:www.sufimaster.org/husayn.htm

لوبسانگ راماپا:www.lobsangrampa.net/lobsang_rampa.html

کونرڈ روڈنیکی:www.southerncrossreview.org/22/rudnicki.htm

روڈی رکر:www.rudyrucker.com/

لوئس پاویلز:en.wikipedia.org/wiki/Louis_Pauwels

عمر خیام:www.okonlife.com/

ایڈورڈ ڈی بونو:www.edwdebono.com/

Marfat.com

تلاش

اللہ ماورا کا تعیّن

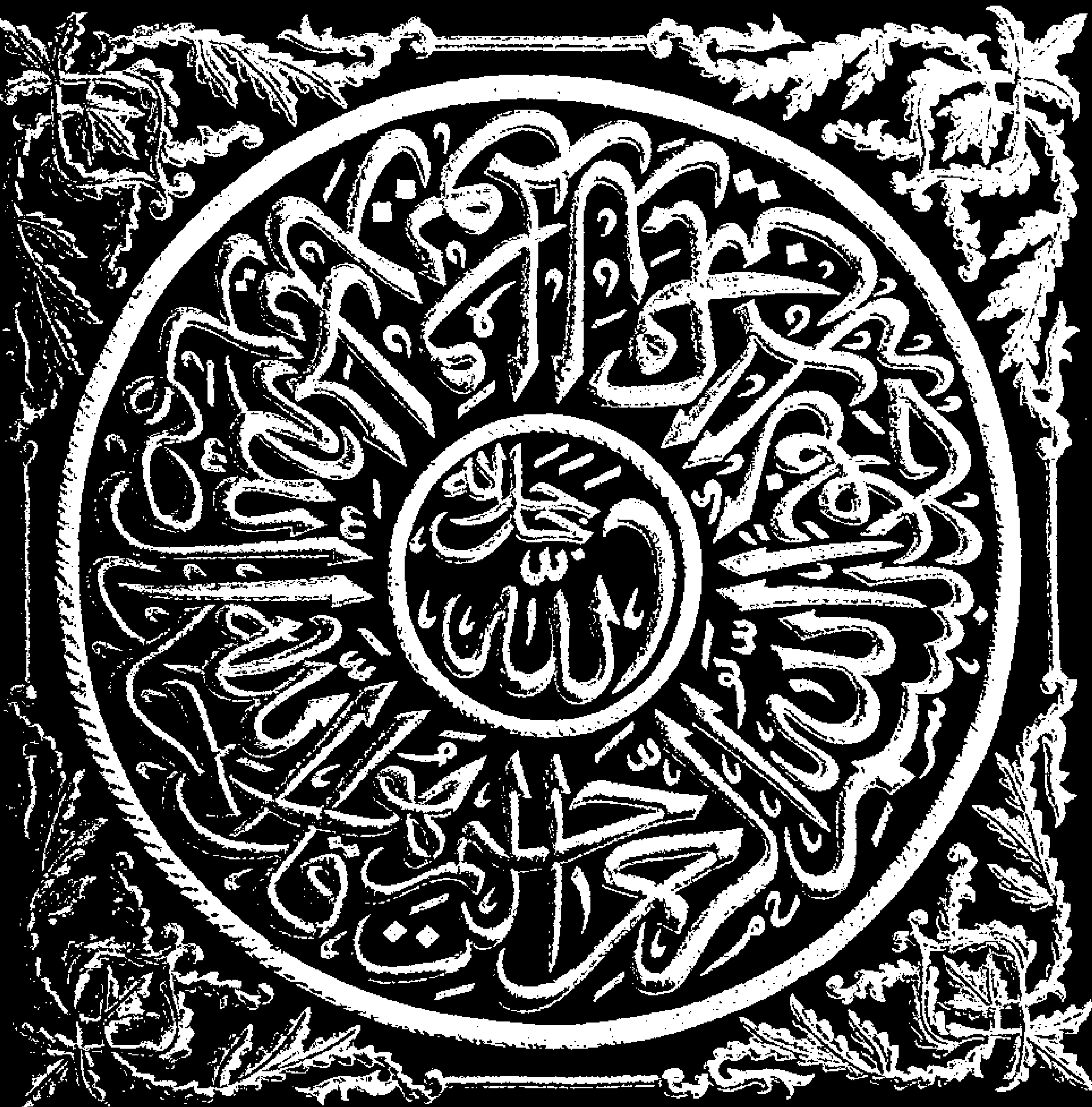

عکسی مفتی

Marfat.com